سب رس

نشان ٹپہ برطانیہ M3950
ٹیلیفون نمبر (۲۲۰۹)
نشان ٹپہ آصفیہ (۱۵۳)

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

سب رس

زیر نگرانی

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

مجلس ادارت

صاحبزادہ محمد علی خاں میکش — سکینہ بیگم

خواجہ حمید الدین شاہد — عبدالحفیظ صدیقی بی۔ ایس۔ سی

معین الدین احمد انصاری

جلد ۳ شمارہ ۳ — مارچ ۱۹۴۰ء

فہرست تصاویر

۱۔ نٹشے۔ ۲۔ گوئٹے۔ ۳۔ شوپنہار

فہرست مضامین

سب رس کی قیمت .... چار روپے سالانہ علاوہ محصول ڈاک ۸ر

بچوں کے سب رس کی قیمت .... ایک روپیہ سالانہ علاوہ محصول ڈاک ۸ر

سب رس معلومات کی قیمت .... ،، ،، ،، ،، ،، ،، ،،

(۱) رسالہ پہنچنے کی اطلاع ۱۵ تاریخ کے اندر دیدیجئے۔ دیر سے اطلاع آنے پر یا تو پرچے ختم ہو جاتے ہیں یا گزشتہ مہینے کے پرچوں پر زیادہ محصول ڈاک ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے تاریخ مقررہ کے بعد اطلاع آئے تو پرچہ روانہ کرنے میں تامل ہوگا۔

(۲) مراسلت کرنے والے اصحاب اس امر کا ضرور خیال رکھیں کہ اگر ادارے سے جواب حاصل کرنا ہو تو جوابی کارڈ یا ایک آنے کے اسٹامپ لازماً روانہ کریں۔ ورنہ ادارہ پر جواب کی ذمہ داری نہیں رہتی۔

(۳) اردو مطالعہ کا ذوق ہو تو ادارہ کے سب رس کتاب گھر کی فہرست منگوائیے۔

(۴) اگر اردو کتابیں خریدنی ہوں تو پہلے سب رس کتاب گھر سے مشورہ لیجئے۔

خواجہ حمید الدین شاہد کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپ کر دفتر ادارہ "رفعت منزل خیرت آباد دکن" سے شایع ہوا۔

اداریہ

اس ماہ کے اوائل میں ادارے میں نامی معزز مہمان تشریف لائے۔ افضل العلماء مولانا عبدالوہاب بخاری ایم اے، ایم ایل سی (سابق پرنسپل جمالیہ کالج مدراس) نے ادارہ کے کاموں کی تفصیل معلوم کرکے خود کو بھی علمی خدمت کے لئے پیش کیا اور توقع ظاہر کی کہ ادارہ کے امتحانات کی مقبولیت صوبۂ مدراس میں بھی صوبۂ بمبئی سے کم نہ ہوگی۔ ان کی خواہش پر صوبۂ مدراس کے چند بڑے شہروں میں ادارے کی شاخوں کے قیام کا مسئلہ زیر غور ہے اور توقع ہے کہ بہت جلد وہاں بھی کام شروع ہو جائے گا۔

اس سے پہلے سب رس میں ذکر کیا گیا ہے کہ علامہ سید سلیمان ندوی نے گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود ادارہ کا رفیق بننا قبول فرمایا تھا۔ اس دفعہ جب وہ حیدرآباد تشریف لائے تو ادارہ میں ان کو ایک عصرانہ پر مدعو کیا گیا اور ان کے علاوہ حضرت امجدؔ، مولینا مناظر احسن، مولوی عبدالباری ندوی اور مولوی سید ہاشم ندوی وغیرہ نیز شعبہ جات ادارہ کے داعیان و اراکین عاملہ کو بھی دعوت دی گئی تھی۔ ادارہ کے قلمی نسخوں اور نایاب قدیم اردو رسائل کو دیکھ کر علامہ ندوی نے مسرت کا اظہار کیا اور رسائل سے متعلق معلومات نوٹ فرمالیے۔ بڑی پر لطف صحبت رہی۔

علامہ ندوی اور سر شیخ عبدالقادر کو ایک ساتھ ادارہ کا رفیق منتخب کیا گیا تھا اور عجیب اتفاق کی بات ہے کہ وہ بھی سلیمان ندوی صاحب کے ایک ہفتہ بعد ہی بلا اطلاع یکایک ادارے میں تشریف لائے اور کارکنان ادارہ کی ہمہ وقتی مصروفیت پر حیرت و مسرت کا اظہار کیا۔ ادارہ کی نئی مطبوعات کے بارے میں اپنی مفید رائے ظاہر کی اور آئندہ کے نظام العمل میں مشورے دیئے۔

نئی کتابیں اس ماہ ادارہ نے اور تین نئی کتابیں شایع کیں۔ عماد الملک ۲۔ اردو مثنوی کا ارتقا اور ۳۔ کاغذ کی ناؤ۔

"نواب عماد الملک" ادارہ کے شعبۂ تالیف و ترجمہ کی طرف سے شایع ہوئی ہے۔ اس کے مرتب مولوی فیض محمد صاحب بی اے ٹوپ ایڈ ہیں مختار الملک سر سالار جنگ اعظم کی طرح یہ کتاب بھی بچوں اور عوام کے لئے نہایت سلیس و سادہ اسلوب میں لکھی گئی ہے۔ عماد الملک کے حالات زندگی کے مطالعہ سے نیک دلی، علم و فضل کا ذوق اور حق پرستی کے جذبات موجزن ہونے لگتے ہیں یہ کتاب بڑی نفیس اور پاکیزہ چھپی ہے۔ سرورق پر عماد الملک کی تصویر ہے اور قیمت بچوں کے لئے صرف ۱ر رکھی گئی ہے۔

"اردو مثنوی کا ارتقا" بڑی عالمانہ و محققانہ تالیف ہے جس کے افادہ و معیار کے اظہار کے لئے صرف اس کے مصنف پروفیسر عبدالقادر سروری کا نام ہی کافی ہے۔ سروری صاحب کی نظر اردو شاعری کی تاریخ پر اتنی وسیع اور باریک بین ہے کہ اس خصوص میں عہد حاضر کے کسی محقق و ادیب کو ان کی ہمسری نصیب نہیں۔ اردو شاعری کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ بڑی سائز نہایت دبیز کاغذ پر بہت ہی پاکیزہ چھپی ہے۔ قیمت عہ/ ۲ر رکھی گئی ہے۔ اس کے عنوانات سے اس کی اہمیت اور تلاش و جستجو کا اندازہ ہو سکے گا۔ ۱۔ مثنوی کا درجہ اصناف شعر میں۔ ۲۔ اردو مثنوی کے اولین نمونے۔ ۳۔ طویل نثر مثنویاں۔ ۴۔ قدیم مثنوی کا سنہری زمانہ۔ ۵۔ بیجاپور کی مثنویاں۔ ۶۔ گولکنڈے کی مثنویاں۔ ۷۔ مغلیہ عہد کی متصوفانہ اور مذہبی مثنویاں۔ ۸۔ دور متوسط کی ابتدائی مثنویاں۔ ۹۔ دور متوسط میں مثنوی کی ترقی اور ۱۰۔ مثنوی جدید دور میں۔ ہر موضوع پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور مکمل معلومات درج ہیں۔

"کاغذ کی ناؤ" مدیر سب رس کی مختصر نثری تمثیلوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں چھ مختصر ڈرامے شامل ہیں جن میں سے پہلے دو کاغذ کی ناؤ اور قیدی دو ایکٹ کے ہیں اور بقیہ چار یعنی تماشا، اہل کرم

۲۔ ہند۔ ۳۔ بھیک اور ۴۔ گناہ ایک ایکٹ کے۔
یہ سب غریبوں کی زندگی کے عکس ہیں۔ ان کے ذریعہ سے "انسان دوستی" کے احساسات کو جگانے کی کوشش کی گئی ہے جو ہر انسان کے دل میں ہیں۔ تمام ڈرامے طبعزاد ہیں۔ البتہ "گناہ" قاضی نذر اسلام کی نظم "طوالف" سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔ ان ڈراموں میں مصنف کے دل کی دھڑکن اور روح کی تڑپ نے لفظی پیکر اختیار کر لیا ہے۔ کتاب ۱۲۰ صفحات پر جدید طرزِ طباعت و ترتیب کے ساتھ شایع ہوئی ہے اس کا سرورق بھی شاعرانہ ہے قیمت صرف ۱۲؍

سب رس کے آئندہ شمارے | افسوس ہے کہ کاغذ کی گرانی کی وجہ سے ہم اسّی صفحات سے زیادہ شایع نہیں کر سکتے ورنہ ایسے اعلیٰ پایہ کے اور دلچسپ مضمون اور مقالے ہمارے ہاں موجود ہیں کہ ہم ہر ماہ دو دو سو صفحوں کا رسالہ شایع کر سکتے ہیں آئندہ دو شماروں کے چند مضمونوں اور نظموں کے نام یہ ہیں۔ ۱صحافت اور اردو۔ بدر شکیب۔ ۲۔ دہلی۔ سیماب اکبرآبادی۔ ۳۔ گنج کمالات۔ سراج الدین احمد نیر۔ ۴۔ تماشش کی دنیا۔ مبارز الدین احمد ۵۔ فلسفہ کی شکست صابر کوسگوی ۶۔ سراج اورنگ آبادی کا عرس اور تکیہ۔ ڈاکٹر زور۔ ۷۔ رائج اردو کی اصلاح۔ ضیاء الدین انصاری۔ ۸۔ اشتہار بازی کا سید و باج الدین شمیم ۹۔ پیشۂ وکالت۔ نواب اکبر یار جنگ۔ ۱۰۔ ننھا کچہ۔ سجاد مرزا۔ ۱۱۔ ان دیکھی دیوی کے گیت۔ حفیظ جالندہری ۱۲۔ محبت سے پہلے اختر انصاری۔ وغیرہ ان کے علاوہ متعدد دلچسپ افسانے بھی۔

سب رس کا اردو نمبر | ہم نے لکھا تھا کہ اس سال کا پہلا شمارہ ہماری توقع سے زیادہ مقبول ہوا۔ اس کے ثبوت کے طور پر ہم اپنے بعض ہمعصروں کے خیالات ذیل میں نقل کرتے ہیں۔

معارف ۔ فروری ۱۹۴۰ء ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد، اردو زبان کا خدمت گزار ادارہ ہے، اسی سلسلہ میں اس نے سب رس کا یہ اردو نمبر نکالا ہے، اس میں اردو زبان اور ادب سے متعلق بہت سے مضامین ہیں جو بیشتر تاریخی اور اولی پہلوؤں کے متعلق ہیں اب اردو کے خدمت گزاروں کو ایسے تعمیری مسائل پر لکھنے کی ضرورت ہے جو اردو زبان کی زندگی اور اس کی ترقی و توسیع کے لئے مفید ہو۔ ادبیاتِ اردو کام کرنے والا ادارہ ہے۔ اس کا یہ نمبر اس قسم کے مضامین سے خالی نہیں ہے" ادب اردو کا مطالعہ" ڈاکٹر حفیظ سید "خواتین دکن کی ادبی خدمات" نصیر الدین ہاشمی" دکن کے چند کالیستھ شعرا" ہندو راج سکسینہ "ضلع" مرزا عصمت اللہ بیگ" ہندوستان کی دیانی" ایم اسلم، مفید مضامین ہیں نئی مطبوعات کے تعارف کا سلسلہ بھی مفید ہے، مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب کا افسانہ "حیدرآباد تا دلی" بھی دلچسپ ہے۔ ان کے علاوہ اور بہت سے متعدد دلچسپ مضامین و معلومات ہیں نظم کا حصہ بہت اچھا ہے۔

پروفیسر حامد حسن صاحب قادری (آگرہ)

اردو نمبر آپ نے خوب نکالا ہے، بعض خطوط اور بعض تصویریں سب سے زیادہ قابلِ قدر ہیں، مختلف معلومات خوب جمع کر رہے ہیں، بلاشبہ ادارہ نے بڑی کوشش و کاوش سے یہ مجموعہ مرتب کیا ہو گا۔ مسکش صاحب نے بہت اچھا کیا کہ ڈاکٹر زور صاحب کا "علی الرغم" مضمون چھاپ دیا۔ ان کا نوٹ بہت خوبصورت ہے۔ رسالہ کی کامیابی پر مسکش صاحب کو پرجوش مبارک باد دیجیے۔ (باقی)

"مدیر ادارہ"

نٹشے گوئٹے شوپنہار

حیدرآباد کے عاشور خانے

"تاریخوں کے مطالعہ اور حیدرآباد کے عاشور خانوں اور عَلموں کے دیکھنے کے بعد یہ پتہ چلتا ہے کہ یہاں سب سے پہلے سنہ ۱۰۰۱ھ میں عاشور خانے بنائے اور علم مبارک استاد کیے گئے۔ سب سے پہلا اور اہم تاریخی عاشور خانہ وہ ہے جو اس وقت بادشاہی عاشور خانہ کہلاتا ہے، اور جس کے وسطی محراب میں کارکاشی میں بخطِ طغرا یہ کتبہ لکھا ہوا ہے۔ "نصرٌ من اللہ وفتحٌ قریب وبشرِ المؤمنین غلام علی محمد قلی قطب شاہ سنہ احدی والف"۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا آغاز سنہ ۱۰۰۱ھ میں ہوا اور ساتھ ہی غربی دیوار کے ایک کتبہ سے یہ پتا چلتا ہے کہ اس کی تعمیر اور آرائش سنہ ۱۰۰۵ھ تک جاری رہی چنانچہ وہاں بھی آیۃ الکرسی کے بعد ابوالمظفر محمد قلی قطب شاہ خلد اللہ ملکہٗ وسلطانہٗ کے ساتھ ہی سنہ ۱۰۰۵ھ مکتوب ہے۔ یہ اصل تعمیر کا زمانہ ہے، یوں تو بعد کو عبداللہ قطب شاہ نے بھی اس کی تزئین و آرائش میں اضافہ کیا۔ اس عمارت کی تعمیر میں ساٹھ ہزار روپے صرف ہوئے اب اس کا صرف اندرونی دالان موجود ہے۔ بیرونی دالان بعد کو منہدم ہو چکا تھا اور نواب میر نظام علی خان آصفجاہ ثانی کے عہد میں اس کو دوبارہ میر نوازش علی خاں شیدا کے زیرِ اہتمام بنایا گیا۔ یہ عمارت ۱۲ گز یعنی ۳۶ فٹ بلند تعمیر کی گئی تھی اور اس میں چودہ معصوموں کے نام کے جو چودہ علم استاد کیے گئے تھے ان کو عہدِ محمد قلی کے استادانِ نادر اور ہنرمندانِ ماہر نے اپنے اپنے کارناموں کے طور پر بنا کر پیش کیا تھا۔ چودہ گز کے زربفتی تھان جن میں شاہی شعر بافوں نے قرآنی آیتیں اور ادعیۂ ماثورہ نہایت کمال کے ساتھ بُن دی تھیں، ان کو چڑھائے جاتے تھے۔ اور عاشور خانے کے صحن میں طاقچوں کی دس صفیں ایک دوسرے کی متوازی قائم کی گئی تھیں۔ ہر صف میں تقریباً ایک ہزار طاقچے بنائے گئے تاکہ اتنے چراغ روشن ہوں، پہلی شب میں پہلی صف روشن کی جاتی، دوسری میں پہلی اور دوسری، اسی طرح دسویں کی رات کو پوری دس صفیں روشن ہو جاتی تھیں اور دس ہزار چراغوں کی روشنی سے عاشور خانہ بقعۂ نور بن جاتا۔ ان کے علاوہ بڑے بڑے چراغ دان بھی بصورتِ اشجار پر شاخ بنائے گئے جن میں ہر ایک میں ایک سو بیس (۱۲۰) شمعوں اور چراغوں کی روشنی کا انتظام کیا گیا۔ ان پیتلی جھاڑوں کو عاشور خانوں کے دالانوں کے برابر رکھا جاتا تھا اور خود ایوان میں اور حوض کے اطراف قدِ آدم سے بھی بلند کافوری شمعیں ہر رات روشن کی جاتی تھیں۔ عصر کے وقت خود بادشاہ بنفشئی رنگ کا لباس پہن کر آہستہ رفتار سواری میں یا سیاہ مخمل کے سنگاسن میں بیٹھ کر جملہ سیاہ پوش مقربین، مجلسیوں، امیروں، اور وزیروں کے ساتھ الاوہ میں آتا اور دو خوش آواز ذاکرانِ شاہی سنگاسن کے دونوں طرف خود بادشاہ کے مصنفہ مرثیے پڑھتے ہوئے آتے جب بادشاہ عاشور خانے کے دروازہ میں داخل ہوتا تو سواری سے اُتر کر برہنہ پا آتا اور اپنے ہاتھ سے علموں پر پھول چڑھاتا اور شام کے وقت تمام کافوری شمعوں اور ایوان کے برابر کے چراغوں کو بھی اپنے ہاتھ ہی سے روشن کرتا۔ اس وقت مرثیہ خوانی ہوتی رہتی اور ائمہ معصومین کی مدحیں پڑھی جاتیں۔ چراغ روشن کرنے کے بعد ایک فصیح و بلیغ خطیب کھڑے ہو کر شہدائے کربلا کی امداح کے لئے بآوازِ بلند فاتحہ پڑھتا جس کے بعد بادشاہ دولت خانۂ عالی کی طرف واپس ہو جاتا اور وہاں کے عاشور خانے میں

امرا و وزرار کے ساتھ آدھی رات تک ماتم و مرثیہ خوانی میں بسر کرتا۔ یہاں کندوری (جو بغیر گوشت کے قسم قسم کے تکلفات سے تیار کی جاتی) اور شربت اور سک مک وغیرہ کی تقسیم عمل میں آتی۔

ابھی یہ ذکر گزرا کہ دولت خانۂ عالی میں بھی ایک عاشور خانہ بنایا گیا تھا۔ یہ اس وقت موجود نہیں ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ محمد قلی قطب شاہ نے جب بادشاہی عاشور خانہ کی بنیاد رکھی اس کے ساتھ خود دولت خانۂ عالی میں بھی ایک خاص عاشور خانہ تعمیر کیا جو غالباً اُس جگہ واقع تھا جہاں اب مٹی کا شیر موجود ہے۔ کیونکہ اسی کے اطراف اکناف میں شاہی محلات بنائے گئے تھے۔

اس عاشور خانہ کے علم کوتوال شہر کے اہتمام میں رہتے تھے اور چھٹی محرم کو میدانِ دلکشائے وسیع الفضائے داد محل میں لائے جاتے تھے اس میدان میں اب چوک کی گھڑی مسجد اور محبوب چوک واقع ہے۔ اس میدان کے اطراف و اکناف کے بازاروں اور راستوں پر چراغاں کئے جاتے اور تابوتوں اور تعزیوں کو بہترین زیب و زینت اور قسم قسم کی نقاشی اور تکلفات سے آراستہ کرکے اور ان کے اندر اور باہر بہت سی شمعیں روشن کرکے لے آتے تھے۔ فانوسوں مشعلوں اور چراغوں کا ایک انبوہ علموں کے سامنے چلا آتا۔ داد محل کے نیچے دونوں طرف چراغ روشن رہتے اور درمیان میں علم۔ داد محل کی چوتھی منزل پر سے جب بادشاہ اس چراغ زار کو نظر ڈالتا تو عزاداروں کے شور و شیون سے اس پر بھی رقت طاری ہو جاتی اور وہ ان کے لئے اپنے یہاں سے نان ریزے کے خوان روانہ کرتا اسی طرح اس عاشور خانہ و دولت خانۂ عالی کے علم ایام عاشورہ کے ختم تک اس میدان میں لائے جاتے تھے لیکن نویں محرم کی رات میں بجائے میدانِ داد محل میں لے جانے کے اس عاشور خانے کے علموں کو میدانِ دربار خسروی یعنی چارکمان کے میدان میں لے آتے تھے۔ اس رات بادشاہ پھول چڑھانے اور علموں کو آراستہ کرنے کے بعد خاصے کی کافوری شمعیں جملہ مجلسیوں مقربوں اور حجاب عظیم الشان کو اپنے ہاتھ سے تقسیم کرتا اور اس طرح تمام مجلسی، سردار، اعیان، و اکابر اور دولت خانۂ شاہی کے جملہ چھوٹے بڑے ملازم اس عاشور خانہ سے ہاتھوں میں شمعیں لئے ہوئے نکلتے اور میدانِ چارکمان میں پہنچتے۔ اس میدان کے ایوانوں کے سامنے چالیس پینتالیس فیٹ بلند ہاتھی۔ شیر اور درختِ سرو وغیرہ کی عجیب دل پذیر شکلیں بنا کر روشن کی جاتی تھیں۔ اور چاروں کمانوں پر بھی سر سے پاؤں تک طاقوں محرابوں اور طرح طرح کے درختوں کے نقشے اتار کران میں روشنی کی جاتی تھی۔ جب محل کے عاشور خانہ سے علم باہر نکلتے تو بادشاہ تقریباً پانچ سو (۵۰۰) قدم علموں کے ساتھ اُس چوڑی دیوار پر سے جاتا جو اس کمان پر پہنچتی تھی جو چار مینار کے مقابل ہے اور جس کو آج کل میوے والوں کی کمان کہتے ہیں۔

دسویں محرم کی صبح کو مقربین وزرا و امرا، اور ملازمین اور خاص غلام علموں کے آگے مرثیے پڑھتے ہوئے محل کے عاشور خانے کی طرف آتے تو بادشاہ بھی ماتم کرتا ہوا ایوان الاوہ کی قریب کی مسجد میں پہنچتا۔ یہ مسجد اب بھی مٹی کے شیر کے قریب موجود ہے اس مسجد میں قصۂ شہادت و گرفتاری حرم محترم سنایا جاتا اور شہدا کے لئے فاتحہ اور بادشاہ کے لئے دعا پڑھی جاتی اس کے بعد حکم دیا جاتا کہ دو سو یتیم سید زادوں کو پیش کیا جائے۔ ان کو نفیس لباس اور رقم دی جاتی تھی۔

ان دو عاشور خانوں کے سلسلہ میں ہمیں قلعہ گولکنڈہ کے اس تاریخی عاشور خانے کی طرف اشارہ کر دینا بھی ضروری ہے

جو ابھی محفوظ ہے۔ اور جو **حسینی علم کا عاشور خانہ** کہلاتا ہے۔ اس میں جو علم مبارک اس وقت تک محفوظ ہے وہ موجودہ معلومات کی بنا پر حیدرآباد کا قدیم ترین تاریخی علم ہے کیونکہ شہر کے بادشاہی عاشور خانے کے علم قدیم نہیں ہیں۔ بلکہ حضرت آصفجاہ ثانی کے عہد کے ہیں۔ قلعہ کے حسینی علم کے درمیانی حصہ میں طغرے کی شکل میں "نصر من اللہ و فتح قریب و بشر المومنین غلام علی محمد قلی قطب شاہ سنہ احدی والف" بطور جالی کے کھدا ہوا ہے۔ یہ علم پیتل کا نہیں بلکہ مرکب فولادی دھات کا بنا ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں پیتلی علم نہیں بنائے گئے۔ بلکہ سفید فولادی علم۔ اور بادشاہی عاشور خانہ کے علم بھی ایک روایت کے مطابق اگر قیمتی پتھروں یعنی جواہر کے نہ تھے تو فولادی ہی ہوں گے۔

قلعہ میں شاہی **مسجد صفا** کے برابر جو **شاہی عاشور خانہ** اب بھی موجود ہے۔ اس کے علم مبارک پیتلی ہیں۔ اور نہایت شان دار۔ ان کی بناوٹ اور سجاوٹ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ عاشور خانہ اور علم دونوں بعد کے بنائے ہوئے ہیں۔ کیونکہ سنہ ۱۰۰۱ھ کا وہ علم مبارک جس کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے نسبتاً سادہ ہے۔ البتہ اس کی درمیانی مذکورہ عبارت کے اطراف مدور جالیاں ہیں جن میں ائمہ معصومین کے نام بنائے گئے ہیں۔

ان چار عاشور خانوں کے بعد **پانچواں قدیم عاشور خانہ حیدرآباد کا حسینی علم** ہے۔ یہ علم سلطان محمد قلی قطب شاہ ہی کے عہد میں اس کے ذوق و شوق کو دیکھ کر لایا گیا تھا۔ لکھا ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی سیف دستی کو ایک علم میں لگا کر علی آقا ایرانی حیدرآباد لے آئے تھے جب ان کی آمد کی خبر بادشاہ کو ہوئی تو اس نے استقبال کیا اور اسی مکان میں استادہ کرنے کا حکم دیا جو اب عاشور خانۂ حسینی علم کہلاتا ہے۔ علی آقا نہ صرف انعام و اکرام سے مالا مال ہوئے بلکہ اس علم کی خدمت گزاری بھی انہی کے تفویض ہوئی اس عاشور خانہ سے ملحقہ مسجد اور باؤلی انہی علی آقا کی بنائی ہوئی ہے۔ ان کے نواسے داراب بیگ نے بعد کو سنہ ۱۱۵۱ھ میں اس قدیم عاشور خانہ کی اصلی عمارت کو بدل کر مشرق رویہ بنا دیا اس وقت سے یہ عاشور خانہ اسی حالت میں اب تک موجود ہے۔ اس کے مصارف کے لئے سرکار سے سالانہ چار ہزار روپے کی جاگیر بھی دی گئی ہے۔ یہ علم بھی غرہ سے عاشورۂ محرم تک ہر سال استادہ ہوتے ہیں۔

حسینی علم کے بعد بی بی کا علم نعل مبارک دار الشفاء اور پنجہ شاہ کے عاشور خانے حیدرآباد میں مشہور تاریخی اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن یہ سب سلطان عبد اللہ قطب شاہ کے عہد کے ہیں۔ چنانچہ پنجہ مبارک کے سلسلے میں جو فرمان نافذ ہوا تھا وہ اب تک موجود ہے۔ اور پنجہ شاہ کے عاشور خانے میں ایام عاشورہ میں آویزاں کیا جاتا ہے۔ اس پنجۂ مبارک کو درویش علی ابن شیر علی اپنے ساتھ نجف اشرف اور کربلائے معلیٰ سے لے آئے تھے اور ان کے استقبال کے لئے عبد اللہ قطب نے حکام کرام اور وزرائے عظام کو روانہ کیا تھا اور ایک بہت اچھے مکان میں اس کو نصب کیا گیا تاکہ ہر جمعرات کو لوگ اس کی زیارت کر سکیں اس عاشور خانہ کے خرچ لنگر کے لئے بھی بادشاہ نے احکام جاری کر دیے۔

(باقی آئندہ)

سید محی الدین قادری زور

سلام بدرگاہِ امام ہمام

السلام اے مہرِ افلاکِ امامت السلام — السلام اے نیّرِ برجِ شرافت السلام
السلام اے وجہِ تخلیقِ زمین و آسماں — السلام اے سِرِّ پنہانِ حقیقت السلام
السلام اے باغبانِ گلشنِ دیں السلام — السلام اے سالکِ راہِ طریقت السلام
السلام اے رہنمائے اولیا و اصفیا — السلام اے ہادیٔ خضرِ ہدایت السلام
السلام اے لالۂ بستانِ زہرا و علیؑ — السلام اے بلبلِ باغِ نبوت السلام
السلام اے کشتۂ تیغِ رضائے لم یزل — السلام اے تشنۂ جامِ شہادت السلام
السلام اے بادشاہِ انس و جاں کون و مکاں — السلام اے مالکِ روزِ قیامت السلام
السلام اے مبتلائے گردشِ چرخِ زبوں — السلام اے رہروِ دشتِ حقیقت السلام
سر کٹا کر امتیازِ حق و باطل کر دیا — السلام اے گوہرِ بحرِ صداقت السلام
راکبِ دوشِ محمدؐ شافعِ روزِ جزا — السلام اے صاحبِ تاجِ شفاعت السلام
نورِ چشمِ فاطمہ ابنِ علی سبطِ نبی — السلام اے جلوۂ نورِ رسالت السلام
حاضرِ دربار والا ہے اثیمہ دلفگار — باریابی کی ملے اس کو اجازت السلام

لطف النسا بیگم صاحبہ اثیمہ

اردو امتحانات ادارۂ ادبیاتِ اردو کی چند نصابی کتابیں جو سب رس کتاب گھر سے مل سکتی ہیں۔

اردو دانی

- اردو دانی کی پہلی کتاب ۲/۶
- اردو دانی کی دوسری کتاب (زیرِ طبع) ۱/۶

اردو عالم

- انتخابِ اردو (نظم و نثر) عہ
- سیپارۂ دل عال
- قواعدِ اردو: حصہ دوم ۱۰/
- مجموعۂ نظمِ حالی ۱۳/
- تلخیصِ عروض و قافیہ عہ

- تاریخِ ادبِ اردو (زیرِ طبع) عہ
- فنِ انشا پردازی عہ
- دنیا کی تاریخ یا دنیا کی کہانی عال
- سائنس کے کرشمے عہ
- دفتری معلومات (زیرِ طبع) ۱۲/

اردو فاضل

- توبۃ النصوح ۱۵/
- صبحِ وطن عال
- پردۂ غفلت ۱۰/

- کیمیاگر اور دیگر افسانے عہ
- یادگارِ غالب عہ
- بانگِ درا عال
- فکر و نشاط عہ
- دیوانِ غالب ۱۲/
- انتخابِ کلامِ میر ۱۰/
- سراجِ سخن ۱۲/
- تاریخِ ادبِ اردو (زیرِ طبع) عہ
- آبِ حیات آزاد ۱۲/

- مقدمۂ شعر و شاعری حالی عہ
- موازنۂ انیس و دبیر شبلی ۱۲/
- روحِ تنقید ڈاکٹر زور ۱۲/
- معاشیات ڈاکٹر ذاکر حسین ۵/
- اجتماعی زندگی کی ابتدا محمد عاقل ۱۰/
- معلوماتِ سائنس آفتاب حسن ۱۲/
- فلسفۂ جذبات عبدالماجد عال
- آئینِ حکومت مجید سالک عال
- محاسنِ کلامِ غالب ڈاکٹر عبدالرحمن عہ
- سرگذشتِ غالب ڈاکٹر زور عہ

دنیا کے ہر حصے میں برس کے بارہ مہینوں میں ایک زمانہ ایسا ضرور آتا ہے جو اُس مُلک کا موسم بہار کہلایا جاسکتا ہے۔ ہمارے ملک میں برسات کا زمانہ "موسمِ بہار" کہلاتا ہے۔ لیکن میرے خیال میں ہمارے ملک میں جاڑوں کے دن دیہات والوں کے لئے موسمِ بہار سے کم نہیں۔ اس زمانہ میں فصلِ ربیع وتابی کی کھیتیاں لہلہاتی نظر آئینگی۔ اور دیہاتیوں کے موسمی تحفے بوٹ (چنے)، گنّے، بیر وغیرہ جو اُن کے لئے نعمت ہوتے ہیں بہ افراط ہوں گے۔ اس زمانہ میں بڑے اور بچوں کی خوشی کا عالم بیان نہیں کیا جاسکتا۔

میں شہری ہوں، اور اُس پہ فخر بھی ہے۔ مگر گاؤں پر رہنے سے دیہاتوں کے حالات سے واقف ہوں۔ اور گاؤں کی زندگی میں جو لطف ہے اُس سے بہرہ اندوز ہوں۔ میں تو کہوں گی: موسمی تبدیلیوں ۂ جو لطف دیہاتی اٹھاتے ہیں، وہ ہمارے شہر والوں کو میسر نہیں۔

میں "بیر" پر کچھ عرض کرنا چاہتی ہوں۔ مگر مجھے ڈر ہے کہ ہم میں سے بہت سے لوگ ہوں گے، جو بیر کے نام سے ناک بھوں چڑھائینگے۔ دراصل یہ گاؤں والوں کے حصّے کے ہوتے۔ آپ انہیں کے "نقطۂ نظر" سے دیکھیے۔ جن کے نزدیک یہ ہندوستانی آلو بخارے اور ایک بڑے موسمی میوے سے کم نہیں۔ ایک قصّہ سنئے، جس سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہوگا۔ مجھے یاد ہے۔ میرے بچپن میں میرے والد صاحب کے دورہ کے زمانے میں اُن کے پاس ایک مقدمہ پیش ہوا تھا۔ ایک بہت بڑا اور پرانا بیر کا درخت تھا جو گاؤں کے غریب دھیڑوں کی ملکیت تھا۔ مگر گاؤں کے دوسرے مرفہ الحال لوگوں نے اپنا قبضہ کر لیا تھا۔ جسکی بڑی لڑائی تھی۔ آخر والد نے غریب دھیڑوں کو قبضہ دلا دیا تھا۔ جس سے غریب بہت ہی خوش ہو گئے تھے۔

شاید آپ کو بیر پسند نہ ہوں۔ مگر کیا کسی سرسبز کھیتوں کے درمیان یا کسی ٹیلے (وہ دیہاتی باغ جو باؤلی کے دامن میں ہمیشہ شاداب رہتا ہے) میں گھنے بیر کے درخت کے نیچے، لال لال، پیلے پیلے گدرے گدرے کھٹے میٹھے بیر دیکھکر یکبارگی آپ چند دانے ہی چننے پر مجبور نہ ہو جائینگے؟

یہاں مزرعہ (Farm) پر جہاں دور دور تک کھیتیاں چلی گئی ہیں۔ ہمارے مکان سے کوئی دو ایک فرلانگ پر کچھ ایسے ہی موقع پہ ایک بہت گھنا بیر کا درخت ہے۔ چنانچہ اسے دیکھکر دل میں گدگدی سی پیدا ہوئی۔ اور جی چاہا کہ چند بے تکلف بہنوں کو اس سے لطف اندوز ہونے کے لئے مدعو کروں۔

۱؎ پچھلے سال بزمانہ قیام صدر مزرعہ پر بھی یہ مضمون حوالہ قلم کیا گیا تھا۔

ظاہر ہے کہ زندگی میں زندہ دلی، خوش طبعی، اور خوشگوار تبدیلیاں ضروری ہوتی ہیں۔ تاکہ انقباض اور فکر مندی کا ردعمل ہو کر عام صحت برقرار رہے۔ جو انسان زندہ دل ہوتا ہے، اُسے باغوں کی سیر، تفریحی سیر و سفر۔ پکنک وغیرہ نئی نئی باتیں سوجھتی ہیں۔ ان سے انسان کے افکار و آلام میں کچھ خوشگوار تبدیلی ضرور ہوا کرتی ہے۔

کہتے ہیں یورپ میں ایسی خوشکن تبدیلیوں کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ تعطیل کے دن، اور چھٹیوں کے زمانے وہاں کے لوگوں کے لئے "پیام نشاط" ہوتے ہیں۔ فرصت کے اوقات اس لطف و مسرت سے گذارے جاتے ہیں، کہ حیات میں تازگی اور طبیعت میں اولوالعزمی پیدا ہوتی ہے اور زندگی کی کشمکش انسان کے لئے بار نہیں ہو جاتی۔

مگر ہمارے غریب ملک میں ان باتوں کو ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ اور نہ اسے کوئی اہمیت حاصل ہے۔ یہی باعث ہے کہ ہمارے جذبات ہمارے احساسات اور ہماری زندگیاں پژمردگی سے معمور اور جینا ہمارے لئے دُوبھر ہوتا ہے۔

ہاں تو میرا جی چاہا کہ اپنی اُن بے تکلف بہنوں کو جو چار دیواری کے اندر پر تکلف و سراپا تمکنت زندگی بسر کرنے کی عادی ہوتی ہیں، کھُلی فضا میں "چہل پہل" کا موقع اور ایک سادہ تفریح بہم پہونچاؤں۔ اس کے لئے میں نے شنبہ کا دن موزوں سمجھا۔ کیونکہ اُس دن فارم کے آدھے دن کی تعطیل کی وجہ دوپہر سے کوئی آدمی نہیں ہوتا۔ جس سے مستورات آزادی سے پھر سکتی اور کھُلی فضا میں سانس لے سکتی ہیں۔

چنانچہ شنبہ کے ایک دن سہ پہر میں بیر کھانے کے لئے چند بہنیں میرے گھر تشریف لے آئیں۔ پانچ بجے سے پہلے ہم نے درخت کا رخ کیا۔ راستہ میں دو طرفہ تور، جوار، گیہوں کے لہلہاتے کھیت عجب بہار دے رہے تھے۔ بہنوں کی سبک خرامی نے شام ہی کر دی، دو ایک فرلانگ کا فاصلہ اُن کے لئے ایک مسافت تھی۔

میں نے ایک لڑکے کو بیر گرانے کے لئے پہلے ہی بھجوا دیا تھا۔ اُس نے سب کو آتا ہوا دیکھکر درخت پر پتھر برسانے شروع کئے۔ جس سے بہنوں میں امنگ پیدا ہوئی، اور جلد جلد درخت کے نیچے جا پہونچیں۔ دیکھا! کہ نیچے بیروں کا بچھونا ہو رہا ہے۔ پھر سب نے جس شوق و مسرت و عجلت سے بیر چننا شروع کئے، وہ میرے لئے قابل دید منظر تھا۔ جسے دیکھکر میں بیحد مسرور ہو رہی تھی۔

ایک بہن نے کہا کہ میں ایک بڑی دستی اسی لئے لائی ہوں کہ خوب سے بیر جمع کروں۔

ایک نے کہا کیا ہی کھٹے میٹھے بیر ہیں!

میں نے کہا یہ لطف بھی دیکھئے بیر کتنی وضع کے ہیں۔ کوئی بڑا کوئی چھوٹا۔ کوئی پکا، کوئی گدرا، کوئی کھٹا، کوئی میٹھا۔ ایک اور بہن نے کہا بیر تو کچھ ایسے قابلِ تعریف نہیں ہیں۔ میں نے کہا کہ نہ بیر ہی قابل تعریف ہیں اور نہ بیر کھانا ہی پسندیدہ ہے۔ مگر اس کیفیت کو دیکھئے۔ اس سادگی و بے تکلفی اور آزادی کا اندازہ کیجئے۔ کیا آپ نے ایسی کھُلی فضا میں درخت کے نیچے خود کبھی بیر بھی چنے ہیں؟

اتفاق سے مدارسِ نسواں (مرہٹی اور اردو) کی صدر معلمات بھی موجود تھیں۔ میں اُن کے بیر کھانے پر بہت محظوظ ہو رہی تھی۔ کیونکہ مدرسوں میں اِن لوگوں کا وہ رعب داب ہوتا ہے کہ خدا کی پناہ! اُن کی تمکنت اُن کی تادیب کی بدولت معصوم بچیاں اپنی سادگی اور طفلانہ حرکتوں کو بھول جاتی ہیں۔ مگر اِن کی اس تفریح میں بھی کتنی سادگی تھی!

غرضکہ مغرب کے وقت سب بیحد مسرور جلد جلد گھر لوٹے' تو میں نے کہا کہ بھئی! آپ لوگ بھی عجیب ہیں۔ میں نے جو کہا تھا کتنے قسم کے بیر ہیں تو اِس پر کسی نے توجہ نہیں کی۔ بات یہ ہوئی کہ ہم نے آپ بہنوں کو یہ "انوکھی دعوت" تو دیدی' مگر بعد میں یہ معلوم کر کے کہ ابھی اس درخت کے بیر نہیں پکے ہیں۔ ہمیں فکر ہوئی بالآخر ہمکو اور اور جگہ سے بیر منگوانے پڑے جو ملازم لڑکے نے بڑی خوبی سے درخت کے نیچے بکھیر دیئے تھے۔

بہنوں نے خوب قہقہے لگائے۔ اور بعض نے مذاقاً اُس لڑکے کو بُرا بھلا بھی کہنا شروع کیا جس نے اپنا پارٹ بڑی خوبی سے ادا کیا تھا۔ سب کو دور سے آتا ہوا دیکھکر درخت پر پتھر برسانے شروع کئے تھے۔ اور آخر میں مزید بیر گرانے کی خواہش پر کہا تھا کہ "آپ کے آنے سے پہلیچ میں سب بیراں گرادیا"

شاید یہ ایک دہوکا تھا۔ مگر پر لطف و خوشگوار اور دلچسپ بھی۔ جسے میں نے روا رکھا۔

حفیظہ جمال (مسز برہان الدین حسین)
(ناندیڑ)

غزل

بہارِ گل کے دن ہیں' بات رکھ لے باغباں میری
دعاؤں سے بدل جائے گی یہ آہ و فغاں میری

یقیں مانو! نہ خالی جائیگی آہ و فغاں میری
بہت بیتاب کر دیں گی تمہیں بیتابیاں میری

اٹھائیں عشق کی کڑیاں خوشی سے آخری دم تک
مبارکباد کے قابل ہے جانِ ناتواں میری

بجا ہے ناز ہو جتنا مجھے اس سرفرازی پر
تمھاری کاکلیں بڑھکر بنی ہیں بیڑیاں میری

تری گردش سے میں ڈرتا نہیں' قوت دکھا ایسی
جو قسمت میں بھی رخنے ڈالدے اے آسماں میری

فدا کر دی ہے اپنے دل کی دنیا تیرے جلووں پر
ترے الطاف کا باعث بنیں تبدیلیاں میری

جو مجھ کو بھولے بیٹھا ہے کبھی تو آ ہی جائے گا
اُسے بیتاب کر دیں گی یہ اک دن ہچکیاں میری

اسی باعث تو میں بھی جانشینِ قیس بن بیٹھا
زمانے کی زباں زد ہو چکی ہے داستاں میری

مزا کچھ آئیگا جوشِ جنوں کا موسمِ گل میں
اڑا لے جائیں گے کانٹے قبا کی دھجیاں میری

میں اپنے جذبۂ دل کو دبائے ہوں اسی ڈر سے
کہیں رسوا نہ کر دیں آپ کو رسوائیاں میری

محبت میں فنا ہونے پہ یہ عقدہ کھلا عارفؔ
مبارک باد دیتی ہے حیاتِ جاوداں میری

قاضی میر لطف علی عارف

سوئٹزرلینڈ کی دیہاتی زندگی

۲۱ر اگست تا ۱۹ر ستمبر

(گو اس ایک سال میں یورپ کی سیاسی بساط میں بہت کچھ تبدیلی ہوگئی ہے تاہم کیفیات مندرجہ اسلئے دلچسپ ہیں کہ ان سے جرمنی کے الحاق چیکوسلوفاکیہ سے پہلے کی وسطی یورپ کے امن و امان کی یاد تازہ ہوتی اور وہاں کی دیہاتی زندگی کا ایک مرقع سامنے آجاتا)

اس موجودہ جنگ سے پہلے شاید یورپ کے کسی ملک کے داخلے میں اسقدر آسانی نہ تھی جتنی سوئٹزرلینڈ کے داخلے میں۔ سرحدی قصبے والورب کے اسٹیشن پر پاسپورٹ افسر نے بالکل میکانی طریقے پر پاسپورٹوں پر مہر لگادی اور کسی سے یہ بھی نہیں دریافت کیا کہ تمہارے منہ میں کتنے دانت ہیں۔ والورب سے لوزان (وہی لوزان جہاں موجودہ صدر جمہوریہ ترکیہ عصمت انونو نے اغیار کے حلق سے اپنے ملک کی آزادی کی دستاویز نکالی تھی) ایک گھنٹہ میں پہونچ گئے۔ لوازن پر ریل بدلنی تھی اور یہیں اس ملک کی مرفہ الحالی اور اعلےٰ معیار زندگی کا پہلا تجربہ ہوا۔ جنگ سے پہلے فرانس اور سوئٹزرلینڈ کے سکّے قدر و قیمت میں بالکل مساوی تھے، یعنی ایک انگریزی پونڈ کے معاوضے میں دونوں ملکوں کے فرانک ۲۵، ۲۵ آتے تھے، لیکن اب فرانسیسی فرانک کی قیمت اسقدر کم ہوگئی ہے کہ ایک پونڈ کے ۱۰۰ آتے ہیں لیکن سوئس فرانک کی قدر پہلے سے بھی زیادہ ہے چنانچہ ۲۱ سوئس فرانک ایک پونڈ کے معاوضے میں ملتے ہیں۔ مرفہ الحالی کا ادنےٰ مظاہرہ یہ ہے کہ جب ہم نے ایک گاڑی سے دوسری میں اپنا اسباب رکھنے کے لئے قلی کیا تو معلوم ہوا کہ قلی کی مزدوری ہلکے اسباب ڈھونے کی نصف فرانک یعنی ۶ر فی بیگ ہے اور بھاری بکس اٹھانے کے پون فرانک یعنی تقریباً ۹ر دینے پڑتے ہیں۔

مجھے Bauernschmied (B) نامی ہوٹل جانا تھا جو (Seengen) نامی گاؤں میں واقع ہے اس لئے کہ میں نے اپنی اہلیہ کے مستقل قیام اور علاج کے لئے پہلے سے یہ مقام تجویز کیا تہا۔ لوازن سے ہمارا راستہ فرائی برگ اور سوئٹزرلینڈ کے صدر مستقر برن ہوکر تھا، اور صرف چند گھنٹے ہی کے سفر میں اس عجیب و غریب ملک کی بوقلمونی عیاں ہوگئی۔ والورب اور لوزان میں فرانسیسی زبان بولی جاتی ہے، فرائی برگ میں فرانسیسی اور جرمن دونوں زبانیں اور برن میں صرف جرمن۔ ان زبانوں کے علاوہ ملک کے جنوب و مشرقی گوشے میں اطالوی اور اقصائے مشرق میں ایک خاص زبان یعنی رومانش بولی جاتی ہے جسے حال ہی میں ملک کی چوتھی "قومی" زبان کی حیثیت حاصل ہوئی ہے۔ اس نسلی اور لسانی تضاد کے باوجود سوئس لوگوں میں آپس میں ایسا اتفاق و اتحاد ہے کہ بیان سے باہر ہے۔

ہم لوگ (Aarau) کے اسٹیشن پر اترے جہاں ہم نے تار دیکر بریسٹن برگ سے موٹر منگائی تھی۔ آراؤ سے بریسٹن برگ تقریباً ۶ میل ہے۔ ہم دوپہر کے بارہ بجے نہایت درجہ بارش اور سردی کے عالم میں بریسٹن برگ پہونچے۔ ہوٹل زمانہ وسطیٰ کے پرانی گڑھی میں ایک نہایت ہی پُرفضا جھیل (Hallwiler See) پر واقع تھا۔ اس گڑھی

میں ایک قدیم کتبہ اسوقت تک محفوظ ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسکی بنیاد ۱۱۳۵ء میں رکھی گئی تھی۔ اسی کے متعلق بیس ایکڑ کا باغ تھا جسمیں سیکڑوں درخت سیب، ناشپاتی اور انگور کے تھے۔ اس نواح میں سیب ناشپاتی اس افراط سے پیدا ہوتے ہیں کہ اُن کا مشکل سے کوئی پرسان حال ہے اور سیکڑوں کچے پھل ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔ جو سیب ہمارے یہاں روپیہ کے ۸، ۱۰ آتے ہیں وہ سوئٹستان کے اس حصے میں کوڑیوں کے مول ملتے تھے۔ تیز رو موٹر کی کھڑکیوں سے جب ہم نے ہزاروں درخت ایسے دیکھے جن پر لاتعداد سرخ سبز اور زرد پھل لگے تھے۔ تو ہم سمجھے کہ کسی پھلدار درخت کی کوئی قسم ہوگی اور نکلے وہ سیب اور ناشپاتی کے درخت! ہوٹل کے باغ کے ایک حصے میں ایک قدرتی چشمہ ابلتا تھا جسے ایک نہایت نفیس فوارے کی شکل میں مقید کر لیا گیا تھا۔ اور قریب ہی اس چشمے کے پانی کے کیمیاوی اجزا کا نقشہ آویزاں تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اسکا پانی نہایت ہاضم اور بہت سی بیماریوں کے لئے ایک قدرتی علاج ہے۔

سوئٹستان کے اس گاؤں سے اس ملک کی مرفہ الحالی اور تمدنی معیار کا اظہار ہوتا تھا۔ ہمارے گاؤں (Seengon) کی آبادی صرف بارہ سو تھی، لیکن اسمیں بھی بڑے بڑے شہروں کی سی تمدنی آسانیاں، صفائی اور نفاست پائی جاتی تھی۔ گاؤں کی سڑکیں سب کی سب سیمنٹ کی تھیں اور مکانات جنمیں سے بعض پندرہویں اور بعض سولھویں صدی کے بنے ہوئے تھے، نہایت ہی صاف شفاف تھے۔ کوئی ایسا مکان نہ ہوگا جسکے سامنے نفیس ترین پھولوں سے بھرا ہوا باغیچہ، ترکاری کی کیاریاں نہ ہوں اور بعض میں مرغیوں کے لئے تار کی جالی کے بڑے بڑے احاطے بنے ہوئے تھے۔ موچی کی دوکان اور اسکا مکان ایسا کہ ہمارے یہاں کے بعض امیروں کو بھی میسر نہیں، لہار کی دوکان میں بجلی کی مشین جسمیں نفیس پہیے دار ہل بنائے جاتے تھے، گاؤں میں کئی نانبائی خانے، اسباب خانہ داری کی دوکانیں اور تین چار ہوٹل تھے، اور راستہ میں مجھے بڑا ہی اچنبھا ہوا کہ آخر اس چھوٹے سے قصبے میں خریداری کون کرتا ہوگا۔ لوگ نہایت درجہ خلیق ہیں اور ہر شخص جب دوسرے سے ملتا ہے تو (Gruss Gott) یعنی "آپ پر خدا کی برکت ہو" صرف کہتا ہے اور جاتا ہے تو (Adieu) یعنی خدا کی سپرد" کہہ کر رخصت ہوتا ہے۔

جتنے دن اس گاؤں میں رہنے کا اتفاق ہوا روز نت نئے انکشافات ہوتے گئے۔ تیسرے دن یہاں کا مطبع دیکھا جسمیں کسی چیز کی کمی نہیں۔ یہاں تک اس مطبع سے ایک ہفتہ وار اخبار (Seethaler) بھی نکلتا ہے جسکی کافی اشاعت ہے۔ میں نے ڈاکٹر سے اپنی اہلیہ کے لئے دوا لکھوائی تو یہاں کے مقامی دواساز نے اس تمیز سے دوا دی کہ ہمارے ملک کے بڑے بڑے دواساز بھی شاید نہ دیتے۔ ایک معمولی بات ہے کہ آنکھ میں دوا ڈالنے کی قطرہ پچکاری شیشے کے نلکے میں رکھی آئی تاکہ باہر کی گرد و غبار نہ لگے۔

یورپ والے تاریخی آثار کو نہایت احتیاط سے رکھتے ہیں بلکہ مایۂ ناز سمجھتے ہیں۔ گاؤں میں دو مکان بھی ہیں جسمیں کسی زمانے میں یہاں کے امراء رہا کرتے تھے اور جسمیں کسی زمانے میں آسٹریا کے خاندان ہاپسبرگ کا بانی روڈولف

بھی رہا تھا، چنانچہ اس مکان پر ایک کتبہ بھی نصب ہے۔ گاؤں سے تقریباً ایک میل پر اس نواح کا مشہور قلعہ
(Schloss Hallwil) جسکے بعض حصے ایک ہزار سال پرانے ہیں اور متعدد ایوانات سنہ ۱۱۱۳ء
کے بنے ہوئے ہیں۔ جب پرانا حصہ سکونت کے قابل نہ رہا تو یہاں کے امیر نے سنہ ۱۵۵۸ء میں اسکی تجدید کی۔ اس قلعہ
میں یہاں کے کاؤنٹ حال حال یعنی سنہ ۱۸۷۴ء تک رہتے تھے۔ اور جائے عبرت ہے کہ انکے قبضے میں قرب وجوار میں چالیس
ایسی ہی گڑھیاں تھیں جو رفتہ رفتہ سب کی سب ہاتھ سے نکل گئیں۔ اب اس قلعہ کی نگہداشت حکومت کرتی ہے اور اس کی
دیکھ بھال کے لئے دربان وغیرہ مقرر ہیں۔ قابل ذکر یہ بات ہے کہ حالانکہ اس گڑھی میں نہ کوئی بادشاہ رہا نہ شہنشاہ
لیکن محض ایک تاریخی مقام ہونے کی وجہ دور دور سے دیکھنے کے لئے لوگ آتے ہیں اور بعض کمروں کو حکومت نے اسی
طرح آراستہ کر رکھا ہے جیسے وہ اپنی شان کے زمانے میں آراستہ تھے۔

ہال ویل سے ذرا آگے بونس ویل کا چھوٹا سا گاؤں تھا جسکی آبادی مشکل سے (۸۰۰) ہوگی، لیکن یہاں بھی ایک
اعلیٰ درجہ کا بجلی سے چلتا ہوا بسکٹ اور چاکلیٹ کا کارخانہ اور ایک بجلی سے چلتا ہوا دودھیل کے صندوقوں کا کارخانہ
دیکھا۔ یہ ہے اس خطے اور براعظم یورپ کی ذہنی اور مادی دولت کا مظاہرہ کہ اس ذرا سے ملک میں، جسکی آبادی
ہمارے ممالک محروسہ سرکار عالی کی آبادی سے صرف ایک چوتھائی ہے، گاؤں گاؤں کارخانے قائم ہیں اور کہیں
فقیروں اور منگتاؤں کا پتہ نہیں۔

دیہات سوئستان کے دوران قیام میں میرا وطیرہ رہا کہ حتے الامکان روزانہ دس ساڑھے دس بجے
نکل جاتا اور ۱۲ بجے کے وقت واپس آتا تاکہ دیہاتی زندگی اور قرب وجوار کے گاؤں کا تھوڑا بہت مطالعہ کر سکوں۔
ہمارے ہوٹل کے سامنے جو جھیل ہے اسپر صبح کے وقت عجیب وغریب منظر ہوتا تھا یعنی جھیل کے اوپر چار پانچ گز کی
بلندی تک بادلوں کا جھرمٹ ہوتا ہے اور یہ سب دھوپ نکلتے ہی ہوا میں مل جاتے تھے۔ اس کے کنارے کنارے
نہایت ہی پرلطف سڑکیں ہیں۔ میں ایک سڑک پر ہولیا اور قریہ (Tennwil) ہوکر (Meisterschwanden)
نامی گاؤں تک چلا گیا جسکی آبادی مشکل سے ایکہزار ہوگی۔ اول الذکر قریہ میں زیادہ سے زیادہ دس بارہ گھر ہوں گے
جمیں کاشتکار رہتے ہیں۔ لیکن کیا مجال کہ کوئی گھر ایسا ہو جسمیں پھول کے باغیچے اور سیب ناشپاتی کے درخت
نہ ہوں۔ ایک آدھ "کاشتکار" کے گھر میں ریڈیو کی بلیاں بھی نظر آئیں اور ہر مکان میں برقی روشنی اور کھڑکیوں
پر نہایت سلیقے سے پردے لگے ہوئے دیکھے۔ قریب ہی دخانی کشتیوں کا اسٹیشن تھا جہاں سے مختلف سمتوں
میں چھوٹی چھوٹی دخانی کشتیاں جھیل کے مختلف سمتوں میں جاتی تھیں۔ ماسٹر شوانڈن کے قریب ہی گرجا ہے
اور اسکے محاذ میں قبرستان جو کچھ اعلیٰ درجہ کے چمن کی طرح بنچوں، کرسیوں، پھولوں کے تختوں اور سرو وغیرہ کے درختوں
سے سجا ہوا تھا اور خواہی نخواہی اسمیں بیٹھنے سے بجائے کسی طرح کے خوف کے مسرت اور فرحت ہوتی تھی۔ ایک ہمارے

یہاں کے ٹوٹے پھوٹے قبرستان ہوتے ہیں۔ مانا کہ اسلام میں مقبرے بنانا خالی از کراہت نہیں، لیکن کیا چمن لگانا بھی ممنوع ہے ؟

۲۶ر اگسٹ کو ٹہلتا ٹہلتا (Eglisau) گاؤں گیا جہاں کا چھوٹا سا گرجا ان اثرات کے اعتبار سے جو یقیناً اسلام کا یہاں کے مذہب پر پڑا ہے، نہایت دلچسپ نکلا۔ گرجا تیرھویں صدی کا بنا ہوا ہے اور اسکی محرابیں ہماری پرانی مسجدوں کی طرح بالکل گول تھیں۔ گرجا میں نہ بت نظر آئے نہ تصویریں نہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی صورت نہ صلیب، بلکہ ایک طرف کو منبر رکھا تھا اور سامنے قطار در قطار بنچیں پڑی تھیں۔ سوئٹسنان کے اکثر گرجاؤں کی تنظیم زونگلی یا کالون کے اصول پر ہے، اور ان دونوں پر اسلامی توحید کا بڑا اثر پڑا، چنانچہ گو انھیں طرح طرح کی اذیتیں پہونچائی گئیں، دیس نکالا دیا گیا، لیکن یہ اپنے اپنے حلقوں کے گرجاؤں سے بت پرستی کے تمام لوازمات نکال دینے میں کامیاب ہوئے۔ شمالی سوئٹستان میں رومن کیتھولک آبادی بھی ہے لیکن مختلف مذاہب والوں میں مکمل رواداری کا جذبہ ہے اور کہیں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ توحید پرستوں اور مورتی پجاریوں کے درمیان شمہ بھر بھی مذہبی کشمکش پائی جاتی ہو۔

سوئٹستان کے دیہاتی راستوں میں ایک خاص بات دیکھنے میں آتی ہے کہ جنگل میں جگہ جگہ یک بیک پانی کی ٹونٹیاں لگی ملتی ہیں جنمیں سے مسلسل پانی بہتا ہوا نظر آتا ہے۔ میں نے پہلے تو اسپر بڑا تعجب کیا کہ اسقدر تنظیم کے باوجود اسکا انتظام نہیں ہے کہ جو شخص پانی لے چکے وہ ٹونٹی کو بند بھی کر دے، اور جب بعض ٹونٹیاں بالکل کھلی ہوئی ملیں جنھیں بند ہی نہیں کیا جا سکتا تو میرا تعجب اور بھی بڑھ گیا۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ اس پانی پر ایک حبہ بھی خرچ نہیں ہوتا بلکہ یہ وہ پہاڑی چشمے ہیں جنھیں مقید کر لیا گیا ہے اور موقع محل کے اعتبار سے نل لگا دئے گئے ہیں تا کہ پینے کے پانی کی قلت نہ ہو اور زمین بھی سیراب ہوتی رہے۔ پانی بہ افراط سوئٹستان کے چپے چپے پر نظر آتا ہے۔ مجھے فوراً خیال ہوا کہ ہمارے ملک میں بھی اللہ تعالےٰ کا دیا ہوا سب کچھ موجود ہے لیکن ہم اس کی نعمتوں سے کام نہیں لیتے اسلئے روز بروز ہماری حالت گرتی جاتی ہے۔ اس ذرا سے ملک کی ذہنی قابلیت کی یہ حالت ہے کہ جنگلی بہتے ہوئے پانی کو قبضے میں کر کے اس سے کام لیا جاتا ہے !

ہمارے نواح میں ۶ر۷ر ستمبر سے بڑی چہل پہل تھی اسلئے کہ خبر تھی کہ آیندہ ہفتہ دنیا کے سب سے بڑے کشتی ران سر میلکم کیمبل یہاں آکر خود اپنی کشتی رانی کا ریکارڈ توڑنے کی کوشش کرینگے۔ ہماری جھیل (Hallwilersee) کے کنارے کئی روز تک بڑھئی اور معمار کشتی گھر بنانے میں لگے رہے اور اسمیں بجلی، ٹیلیفون وغیرہ لگا کر مکمل کر دیا۔ جب یہ مکمل ہو گیا تو سر میلکم کی مشہور آفاق کشتی (Bluebird II) بھی ٹھیلے میں لدی ہوئی انگلستان سے آگئی اور اپنی جگہ پر رکھ دی گئی۔ ساتھ ہی چار مستریوں نے، جو انگلستان سے آئے تھے۔

رولز رائس (Rolls Royce) کا ایک نیا انجن جسکی قیمت ۶ ہزار پونڈ یعنی (۸۴۰۰۰ روپیہ) تھی لگادیا۔ صرف کشتی کی قیمت ۵ ہزار پونڈ کی تھی اور اس نئے انجن لگنے کے بعد کشتی (جسمیں صرف ایک ہی بیٹھک ہے) تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپیہ کی ہوگی۔ لطف یہ ہے کہ کشتی گھر بھی بن اور ہر ضرورت سے لیس ہوگیا کشتی بھی آگئی ایک دوسری کشتی جس میں اخبارات کے نمائندے بیٹھتے وہ بھی آگئی نیا انجن بھی لگ گیا یہ سب سوئستان کے ایک غیر معروف قریہ میں ہو رہا تھا اور خود سر میلکم کیمبل جو چند ہی روز میں اپنی جان جوکھوں میں ڈالنے والے تھے برابر انگلستان میں بیٹھے رہے اور دوسرے کاموں میں مشغول رہے!!

یہ ہے عجیب وغریب تباین یورپ کے احساس فرائض اور ہمارے دیس کی باہمی بے اعتباری کے درمیاں ڈیڑھ لاکھ تو ڈیڑھ لاکھ ہمارے یہاں تو کوئی شخص معمولی اثاثہ بھی کسی کے سپرد نہیں کریگا اور کریگا بھی تو جسکے سپرد کریگا وہ اس اثاثہ کی ریڑھ لگا دے گا۔ یہ وہ تباین ہے جسکی وجہ سے دنیا کا سب سے چھوٹا براعظم سب سے بڑے براعظم پر حکومت کر رہا ہے۔ مالک کئی سو میل پر بیٹھے ہیں اور ملازموں کا یہ حال ہے کہ مالک کیا اتنی دیکھ بھال کریگا جو یہ کرتے ہیں۔ پھر ہر چیز یہاں تک کہ پٹرول، تیل، جس لاری پر کشتی آئی ہے وہ غرض ہر چیز پر انگریز تھا۔ غرض حب وطن، باہمی اعتبار اور تنظیم کا یہ عجیب وغریب تماشا نظر آیا۔

سر میلکم کے چار ساتھی پہلے ہی سے ۱۰ ستمبر کو آگئے۔ کشتی گھر پر انگلستان کا یونین جیک اور سوئستانی سادہ صلیب کے نشان والا باؤٹا اڑنے لگا اور دور دور سے لوگ جوق جوق کشتی کو دیکھنے آنے لگے۔ ہمارے ہوٹل میں انکی آمد کی خبروں سے بڑی چہل پہل رہی خیال تھا کہ ۱۰ ارکو وہ بھی آجائینگے اسلئے سیکڑوں کی تعداد میں دوپہر کا کھانا اور شام کی چائے کے لئے لوگ ہمارے ہوٹل میں جمع ہوے۔ اگر ہندوستاں میں ایسا ہوٹل ہوتا جسمیں صرف ۴۰، ۵۰ کے لئے انتظام ہو اور یک بیک سیکڑوں آجائیں تو خیر انتظام تو جیسا ہوسکے ہو جائے لیکن کیا غل غپاڑا ہوگا۔ یہاں ہر چیز خاموشی سے طے ہوتی ہے ہمیں تو اتنے آدمیوں کے کھانے کا پتہ اسوقت لگا جب میں چہل قدمی کے لئے باہر نکلا اور چبوترہ اور باغ مرد عورتوں سے بھرا دیکھا۔ ۱۳ ستمبر کو آخر سر میلکم بھی آگئے۔ ۱۰ ار سے لیکر انکے قیام کے دوران میں مسلسل (Seengen) کا گاؤں اور بالخصوص ہمارے ہوٹل میں عید کا سماں تھا۔ خود سر میلکم نہایت خوش خلق تھے اور ان کی بات چیت نشست و برخاست سے معلوم نہ ہوتا تھا کہ دنیا کے چوٹی کے جانبازوں میں سے ایک ہیں۔ ہمارے ملک میں کسی کو سر کا خطاب مل جائے تو اکثر ایسے لوگوں کی نظریں آسمان کی سیر کرنے لگتی ہیں اور یہ فانی انسانوں کو کمتر درجہ کا تصور کرنے لگتے ہیں کیمبل اتنا نامی گرامی شخص ہے لیکن تفاخر اسمیں جھوٹ موٹ کو بھی نہیں ہے۔ ۵۳ برس کی عمر ہے اور کشتی رانی کا ریکارڈ توڑنے پر ۴۰ سال کی عمر میں بادشاہ نے سر کا خطاب دیا تھا۔ خود نہایت محتاط زندگی بسر کرتے ہیں۔ کم کھاتے، کم پیتے اور تقریباً روزانہ میلوں سائیکل پر سواری کرتے ہیں۔ ۱۴ ستمبر کو انہوں نے پہلی مرتبہ اپنی کشتی کو جسے انکے ملازموں نے تیار کرکے رکھ دیا تھا ہاتھ لگایا اور اسے جھیل پر لے گئے۔ اس سے پیشتر کا خود انکا ریکارڈ ۹، ۱۲۹ میل فی گھنٹہ تھا۔ پہلے ہی دن ۱۲۵ میل تک کی رفتار کشتی کی ہوگئی۔

ہوا کی تیزی کم ہوجائیگی اس وقت ریکارڈ توڑنے کی امید ہے۔ مجھ سے ان سے ملاقات ہوگئی۔ کہتے تھے کہ ایک نیا انجن تیار کر رہا ہوں جو اس نئے (Rollo Royce) سے بھی ہلکا اور تیز رو ہوگا۔ کیمبل نے آخر خود اپنا ریکارڈ، ار ستمبر کو توڑ دیا اور ۱۳۱ر۵ میل فی گھنٹہ کے حساب سے کشتی چلانے میں کامیاب ہوگئے۔ میں نے جب سر میلکم کو اس کی مبارکباد دی تو وہ اپنے فطری انکساری سے پیش آئے اور کہا کہ خدا نے چاہا تو اس سے بھی زیادہ رفتار کی امید ہے۔ یہ ہیں یورپ والوں کے عزم۔ کیا ضرورت تھی کہ کیمبل نے خود اپنے آپ جو ریکارڈ قایم کیا تھا اسے خود ہی توڑنے کی کوشش کرتے۔ صرف وجہ یہ تھی کہ انھیں خطرہ تھا کہ کہیں کسی دوسرے ملک والا ۱۴۹ر۷ کے ریکارڈ کو توڑ نہ دے اس لئے خود ہی اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر اپنا ہی معیار پہلے سے بھی بلند کر دیا۔

(باقی آیندہ)

ہارون خاں شیروانی

غزل

نظر فریب مثالِ حباب ہو کے رہی　　ہماری عمرِ رواں نقش آب ہو کے رہی

یہ جس کے دل میں ہی پیچ و تاب ہو کے رہی　　طلسم۔ کاتری کاکل جواب ہو کے رہی

شرابِ عشق کے جلووں سے ہے جہاں روشن　　جہاں کہیں بھی رہی آفتاب ہو کے رہی

تری نگاہ کی مستی کو کیا کہوں ساقی　　جو اتری شیشۂ دل میں شراب ہو کے رہی

نقاب بنکے رہا لمعۂ ظہور ان کا　　خودی ہماری، ہمارا حجاب ہو کے رہی

جواب حسن کا ان کے کہاں زمانے میں　　جو لاجواب تھی شئے لاجواب ہو کے رہی

جو دل سے نکلی دعا رحمتوں نے گھیر لیا　　لبوں تک آئی نہ تھی مستجاب ہو کے رہی

کسی کی مست نگاہی سے زندگی اپنی　　خراب ہوتی تھی آخر خراب ہو کے رہی

تمہاری آنکھ سے دیکھا تھا تم کو خاطرؔ نے
جبھی تو اس کی نظر کامیاب ہو کے رہی

غلام دستگیر خاطرؔ

اُردو ادب کا باغ

ایک عرصہ سے میرے دل میں تلاطم پیدا ہوگیا تھا کہ مَیں ایسی زبان کی نسبت چند خیالات کا اظہار کروں، جس کا دائرہ بہت وسیع ہے اور آج کل کم و کاست ہندوستان کے تمام صوبہ جات میں اسی کا دور دورہ ہے۔

اس اثناء میں کئی مرتبہ میرے دل کے ساگر میں لہریں اُٹھتی تھیں اور ساتھ ہی بُجھ جاتی تھیں۔ چنانچہ اس ادب کے میدان میں بڑے بڑے باکمال نظر آتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر میرے من میں ایک قسم کی گھبراہٹ پیدا ہوگئی اور کلیجا تھرانے لگا، حافظہ اپنے کام کرنے سے رہ گیا، کِھلا ہُوا دل مُرجھا گیا، جمائے ہوئے خیالات بکھر گئے، سُلجھا ہُوا مضمون اُلجھ گیا، چہرے پر اُداسی چھا گئی کیونکہ اس میدان میں بہت سے گھڑ سوار ہیں، جن میں مَیں پیادہ ہُوں، وہ بھی لنگڑا۔ بھلا ایسی صورت میں گھڑ سوار کے آگے کہیں پیادہ ٹِک سکتا ہے "کہاں وہ اور کہاں یہ" بقول نسیم۔

آگے اُن کے فروغ پانا سُورج کو چراغ ہے دکھانا

مطلب یہ ہے کہ جس طرح سُورج کے آگے چراغ کی روشنی ماند ہو جایا کرتی ہے اُسی طرح اُن باکمالوں کے سامنے اپنا کمال ہیچ ہے، لیکن پھر بھی ہمت کو بڑی برکت ہے۔ اس لئے مَیں نے ہمت کے میدان کا بغور جائزہ لیا تو دل جوش کھانے لگا، قلم کو جنبش ہُوئی، رہبر نے اولوالعزمی کا راستہ دکھایا۔ بقول دیگر۔

انسان سے دنیا کا سفر ہمیں نے کرایا ہر منزلِ دُشوار کو آسان بنایا

بس پھر کیا تھا یک لخت پژمردہ دل شگفتہ ہُوا، بکھرے ہوئے خیالات اکٹھے ہوئے، اُلجھا ہُوا مضمون سُلجھ گیا، دل باغ باغ ہُوا لہٰذا اب قلم یوں مضمون آغاز کرتا ہے۔

مختصر بیان یہ ہے کہ ہندی اور فارسی کے ملاپ سے اُردو زبان نے جنم لیا۔ احتیاج کی ماں نے اسے لاڈ سے پالا ہوگا اور اپنی آنکھ سے اوجھل رہنا پسند نہ کیا ہوگا۔ لیکن لاڈلے بچے کا پاؤں ایک جگہ نہ ٹکا ہوگا۔ احتیاط کی ماں نے اس پر نگرانی رکھی ہوگی۔ پہلے پہل یہ ننھا بچہ اپنے ادھورے جملہ سے سب کے دلوں کو بھاتا ہوگا اور اپنے چھوٹے چھوٹے فقروں سے ہر ایک کا مطلب ادا کرتا ہوگا اور بے جوڑ جملے بھی بولتا ہوگا۔ یہ نئی ایجاد ہر ایک کو بھاتی ہوگی۔ یہ ہونہار بانکے سپاہی کی مانند گلی کوچوں میں ترچھی نظر ڈالتے ہوئے لوگوں کے دلوں پر تیر کا نشانہ بناتا ہوگا۔ لوگ اس کو دیکھنے کے لئے ماہیِ بے آب کی طرح تڑپتے ہوں گے وہ اپنی بے رُخی سے لوگوں کو تڑپاتا ہوگا جس سے لوگ گھائل ہوتے ہوں گے اور اس کے مرہم کی فکر بھی کرتے ہوں گے۔

ایک دن یہ نونہال مصروفِ ادب کے سرِ راہ پریم کا جال بچھا کر بیٹھا ہُوا تھا کہ کوئی آشفتہ مزاج میرے پھندے میں آجائے۔ حُسنِ اتفاق سے اس کی مایا جال میں ولی پھنس گئے۔ اس کی نگاہیں، ادائیں دیکھ کر وہ تڑپ اُٹھے۔

ولی کو اس کی ادا بہت بھائی۔ انہوں نے جھٹ اس کو اپنی گود میں اٹھالیا اور اپنے گھر لے آئے۔ چونکہ اس کے خیالات کا لباس بازاری تھا اس لئے ولی نے شائستہ گھرانوں کا لباس پہنایا اور حسن و عشق، ہجر و وصال کی غزلیں کہہ کر لطف اٹھانے لگے اور دیوان مرتب کر کے دہلی بھیجا۔ شعرائے دہلی کو رشک پیدا ہوگیا۔ دیوان، دہلی پہنچتے ہی گھر گھر اس کا چرچا ہوگیا۔ شعرائے دہلی نے اس ہونہار لڑکے پر ایک گہری نظر ڈالتے ہوئے سر سے پاؤں تک جائزہ لیا۔ اس میں ایسی ایسی نزاکتیں، لطافتیں، ادائیں نظر آئیں، جن کو دیکھ کر وہ خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ لہٰذا انہوں [illegible]

دے کر بلایا۔ چونکہ شعرائے دکن کی صحبت میں رہنے سہنے سے اس کی زبان غیر مانوس ہوگئی تھی اس لئے انہوں نے اس کو دہلی کے امرا کی زبان سکھائی اور فصاحت و بلاغت کی وردی پہنائی اور غزلیں، قصائد، مثنویاں، مرثیے وغیرہ کہہ کر لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ ان کا کلام جس مشاعرہ میں پڑھا جاتا تھا اس کے صلہ میں بجانب محفل تحسین و آفریں کے پھول برستے تھے۔ خصوصاً میر تقی اور مرزا غالب کی غزلیں، سودا اور ذوق کے قصائد، میر حسن اور پنڈت نسیم کی مثنویاں، میر انیس اور مرزا دبیر کے مرثیے سب کا پایہ بہت بلند ہے۔ انہوں نے اردو ادب کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔ جن کا احسان اردو زبان جب تک زندہ ہے، بھولا نہ جائیگا۔ اور حضرت آزاد دہلوی، نثر اردو میں بہت بڑے ادیب ہوئے ہیں، انہوں نے آب حیات اور نیرنگ خیال کو نظم کا ہم پایہ بنا دیا ہے۔ اس ایجاد کا سہرا آزاد کے سر رہے گا۔ اور جب تک نثر اردو کا وجود رہے گا۔ اس موجد کا نام ہندوستان کے ماتھے پر سنہری حرفوں سے لکھا جائے گا۔ گو اردو زبان میں بہت کچھ ترقی ہو چکی ہے۔ لیکن حیدرآباد ریاست کے اکثر تعلیم یافتوں کی بول چال کا نرالا ڈھنگ ہے۔ اس کا زیادہ تر سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ دکن میں اکثریت کی زبان مرہٹی، تلنگی اور کنڑی ہے اس لئے میزبانوں کا اثر مہمان پر پڑا تو کوئی عجب نہیں۔ اس کا مزاج ایسا ملنسار واقع ہوا تھا کہ جس ٹاپو میں رہا اسی ٹاپو کے الفاظ استعمال کیا کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ قایم نے یوں تصویر کھینچی ہے۔

قایم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ
اک بات لچر سی بزبان دکنی تھی

ف ۱:۔ پیڑ یا درخت کی بجائے جھاڑ اور ست کی جگہ نکو بولا جاتا ہے

ف ۲:۔ ماضی متعدی معروف کے افعال، ماضی فعل لازم کے قیاس پر بولے جاتے ہیں مثلاً میں درخواست لکھا ہوں وغیرہ جو غیر صحیح ہے جس کا صحیح استعمال یوں ہے جیسے میں نے درخواست لکھی یا میں درخواست لکھ چکا ہوں۔

ف ۳:۔ تم کے ساتھ جو افعال لائے جاتے ہیں وہ غیر صحیح ہوتے ہیں مثلاً تم آتے ہو، آؤ گے، آئے ہو، ہوگے کی بجائے تم آتے ہیں، آئیں گے، آئے ہیں، ہوں گے وغیرہ۔

ف ۴:۔ ہمیں یا ہم کو، مجھے یا مجھ کو وغیرہ کی بجائے ہمارے کو، میرے کو وغیرہ بولنا غلط ہے را، رے، ری کے ساتھ حروف سالمہ یعنی کو، سے، پر، میں وغیرہ نہیں لائے جاتے ہیں۔

ف ۵:۔ عورتوں کی نسبت بات چیت کی جاتی ہے تو ان کے افعال جمع مذکر لائے جاتے ہیں مثلاً بیگم صاحبہ کہاں

جاتی ہیں، لڑکیاں کیا کرتی ہیں وغیرہ کی بجائے بیگم صاحب کہاں جاتے ہیں، لڑکیاں کیا کرتے ہیں وغیرہ
اسی طرح بے جان چیزوں کا ذکریوں کیا جاتا ہے مثلاً بنڈیاں آئی ہیں وغیرہ کی بجائے بنڈیاں آئے ہیں۔

ف۶ :- اتنا، کتنا کی بجائے اتا، کتا میں نون کو حذف کر کے ان پر تشدید دے کر بولنا غیر صحیح ہے۔

ف۷ :- وہ، یہ کی بجائے اُنے، اِنے بولا جاتا ہے مثلاً وہ آیا، اس نے لیا کی جگہ اُنے آیا اِنے لیا وغیرہ

ف۸ :- ق کی آواز خ کی مانند نکالی جاتی ہے مثلاً قبر بولنا ہو تو خبر کی آواز کی مانند نکالی جاتی ہے

ف۹ :- اُردو زبان میں مرہٹی کے ہند سے لائے جاتے ہیں مثلاً انتالیس، تیتالیس، چون، تہتر، چوتہر وغیرہ کو انچالیس، ترتالیس، چوپن، ترتر، چواتر وغیرہ

ف۱۰ :- فعل مجہول کے ساتھ کو کا لانا خلاف قاعدہ ہے۔ مثلاً جوان بھیجا گیا کی بجائے جوان کو بھیجا گیا

ف۱۱ :- دستخط کا لفظ دست اور خط سے مرکب ہے یہ دونوں لفظ مفرد کی حالت میں مذکر بولے جاتے ہیں اور مرکب کی صورت میں جمع مذکر۔ مثلاً میں نے دستخط کئے۔ لیکن ہمارے دفاتر میں دستخط واحد مونث استعمال کیا جاتا ہے مثلاً مین نے دستخط کی۔

ف۱۲ :- پاؤں، چاول، گاؤں وغیرہ بروزن جاؤں، آؤں صحیح ہیں لیکن ان کو بروزن جانوں، مانوں لکھنا صحیح نہیں ہیں۔

ف۱۳ :- اُس، اُن، کتابت میں الف کے بعد واؤ زیادہ کر کے اوس، اون لکھا جاتا ہے جو درست نہیں بلکہ صرف الف پر پیش دینا کافی ہے۔ کیونکہ ہندی میں اُس، اُن، اِس، اِن کے وزن پر بنائے گئے ہیں جب اوس، اون (ہندی میں اس کو دیرگ کہتے ہیں) صحیح ہے تو اِس، اِن کی بجائے ایس، این کیوں نہ لکھا جائے۔

ف۱۴ :- کہا (कहा) اور کھار (खा) دو علیحدہ لفظ ہیں چونکہ ان کے تلفظ اور معنوں میں اختلاف ہے اس لئے اِن کے املا میں بھی فرق ضروری ہے مثلاً ساتھ، ہاتھ وغیرہ کی بجائے ساتہہ، ہاتہہ وغیرہ کو ہائے مخلوط کے طریقہ پر لکھنا غلط ہے۔ اسی طرح تمہارا، ہر وغیرہ کو تمھارا، ھر وغیرہ ہائے دو چشمی سے لکھنا غیر صحیح ہے۔ پس ان ہر دو کی کتابت، میں امتیاز ضروری ہے۔

ف۱۵ :- گائے کے بچے کو اہل زبان بچھڑا، بچھڑی کہتے ہیں لیکن دکن میں پاڑی، پاڑا کہا جاتا ہے۔

ف۱۶ :- دو علیحدہ لفظ ایک جگہ ملا کر لکھنے سے ایک حرف حذف ہو جاتا ہے مثلاً نہ ہو کو نہو

ف۱۷ :- اکثر عبارت میں چونکہ کا استعمال بے محل ہوتا ہے۔ حرف شرط، چونکہ، کے ساتھ حرف جزا اس لئے لایا جاتا ہے۔ مثلاً چونکہ آپ نے بُلایا تھا اس لئے مَیں آیا۔

ف۱۸ :- بعض کی جمع کے الفاظ موجود ہوتے ہوئے جمع الجمع لائے جاتے ہیں مثلاً رقوم، وجوہ کو علی الترتیب

رقومات، وجوہات وغیرہ۔

ف ۱۹۔ بعض الفاظ کا تلفظ غلط بولا جاتا ہے۔ خطابت میں اس کا عیب چھپ جاتا ہے لیکن بات چیت میں قابلیت کا اظہار ہو جاتا ہے۔ مثلاً نقص (بالفتح) عصمت (بالکسر) کو علی الترتیب بالضم، بالفتح، بولنا غلط ہے۔

ف ۲۰۔ 'اور' 'و' یہ دونوں حرف عطف ہیں اور دونوں کے معنی ایک ہی ہیں لیکن ان کے استعمال کا طریقہ جدا ہے۔ جب کسی جملہ میں دو فارسی لفظ ہوں تو ان دونوں کے درمیان واؤ آئیگا اس کے برخلاف ایک لفظ فارسی اور دوسرا ہندی کا ہو تو ان کے مابین واؤ نہیں آتا بلکہ اور آتا ہے مثلاً دل وجان، ورنہ دل اور آنکھ وغیرہ لکھنا صحیح ہوگا۔

ف ۲۱۔ وہی، یہی، یونہی، جونہی وغیرہ کی بجائے وہ ہی، یہ ہی، یوں ہی، جوں ہی وغیرہ لکھنا غلط ہے۔

ف ۲۲۔ قریبِ مرگ، لبِ راہ، ہنوز، تقریباً وغیرہ کی بجائے قریب المرگ، لب سڑک، اہلِ ہنود قریباً وغیرہ لکھنا غیر صحیح ہے۔

ف ۲۳۔ جب کاتب اپنی عبارت یا مضمون میں ایک لفظ یا جملے کا دوسرے لفظ یا جملہ سے جدا کر کے معنی واضح کرنے کے لئے ٹھہراؤ (وقفہ) کرتا ہے تو مبتدا کو عبارت کا مطلب آسانی سے سمجھ میں آتا ہے۔ اس لئے رموز اوقاف کا استعمال ضروری ہے مثلاً زید، بکر اور احمد آج اسکول کیوں نہیں گئے ؟

اگر ایک ایک لفظ سپرد قلم کیا جائے تو ایک چھوٹی موٹی کتاب بن جائے لیکن مضمون کی طوالت کے خوف سے بہت سی باتیں نظر انداز کر دی گئیں۔

اب خاتمہ مضمون پر یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ حیدرآباد ریاست کے تمام دفاتر میں اُردو کا عمل دخل ہے لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ خصوصاً اکثر اضلاع کے کارکنانِ دفاتر غلط اُردو لکھا کرتے ہیں۔ پس جن لوگوں نے مدارس سرکاری میں تعلیم پائی ہے ضرور ہے کہ وہ صحیح اُردو لکھنے اور بولنے کی فکر کریں تاکہ ہمارے دامن سے یہ داغ دُھل جائے۔ اگر ہم وطن کی محبت اپنے دلوں میں رکھتے ہیں اور اس کی ترقی کے خواہاں ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ اُردو زبان سے محبت کریں، اس لئے ہمیں چاہئے کہ دکن میں جو غیر فصیح الفاظ بولے جاتے ہیں ان کو ترک کر دیں۔

ایک زمانہ تھا کہ ہندی بھاشا نے اپنی کشادہ پیشانی سے حاکم وقت کی زبانیں فارسی، عربی، ترکی کو اپنے ہاں مہمان رکھا اور ان کے اکثر الفاظ بجنسہ بلا ترجمہ لینے میں کوئی عیب نہ سمجھا۔ اس کا یہ خیال تھا کہ میرے خزانہ میں ادائے مطالب کے لئے بیسوں الفاظ اور خیالات موجود ہوں تاکہ دنیا میں کوئی زبان میرا مقابلہ نہ کر سکے اور بھاشا نے خیالات کے ساتھ اپنا نام بھی تبدیل کر کے اُردو نام رکھ لیا۔ اب اسی نام سے پکارا جاتا ہے چونکہ کچھ عرصہ سے ہندوستان میں انگریزی کا دور دورہ ہے اس لئے اُردو کی وسعت اخلاق نے انگریزی زبان کے الفاظ اور خیالات لینے کے لئے اپنا دامن پھیلائے رکھا ہے۔ اس میں ہزاروں الفاظ آکر شامل ہو گئے ہیں۔ لیکن بعض ترقی داں حضرات انگریزی الفاظ کی جگہ عربی کے مشکل الفاظ لا رہے ہیں

جس سے ہماری زبان عوام کیا بلکہ خاص لوگ بھی نہ سمجھ سکیں گے۔ پس اس میں عام فہم اور روزمرہ الفاظ لائے جائیں تاکہ اُردو زبان ہندوستانی زبان بننے کا دعویٰ کرے۔ یہ دعویٰ اُس صورت میں ہوسکتا ہے جبکہ ہماری زبان غیر تعلیم یافتہ بھی سمجھ سکے ورنہ ایک روز سنسکرت کی مانند صرف کتابوں کی زبان بن جائے گی لہٰذا ہر ایک ادیب کو چاہئے کہ عربی کے مشکل الفاظ لانے کی بجائے زمانہ جن الفاظ کو لانے کے لئے مجبور کرے وہی الفاظ لائے اس پر عمل کرنے سے اُمید ہے کہ ہمارا مشرقی باغ 'مغربی باغ کی مانند لہلہاتا ہرا بھرا نظر آئے گا۔ ورنہ یہ شعر صادق آئے گا

ہر ایک باغ میں ہے اک نئی ہوا چلتی
چمن میں پھول ہیں لیکن بہار ہے باہر

جی ین ریڈی (مومن آباد)

اے افلاس

نوائے دل [illegible] یاب کرنا ہے
ابھی تو تارِ رگِ جاں رباب کرنا ہے

ابھی تو اشکِ ندامت کو خوں بنانا ہے
ابھی تو خونِ جگر کو شراب کرنا ہے

ابھی تو لینی ہیں بیواؤں کی دعائیں مجھے
ابھی تو سخت کلیجوں کو آب کرنا ہے

خزاں رسیدہ گلستاں کے خشک پھولوں کو
ہجومِ اشک سے جنت مآب کرنا ہے

ابھی تو مجھ کو بُھلانا ہے آستانِ حرم
جہانِ کفر میں اک انقلاب کرنا ہے

ابھی تو عشق کی محشر نواز آہوں سے
غرورِ حسن کو خانہ خراب کرنا ہے

ابھی تو رفعتِ تخیل سے زمانے میں
ہر ایک ذرے کو شعر و شراب کرنا ہے

ستانا عہدِ جوانی میں مجھکو اے افلاس
مجھے بھی دہر میں کارِ ثواب کرنا ہے

(شیدائے غم) اختر رضوانی

میزبان

ایک جگہ دعوت تھی چار پانچ شاعروں کے ساتھ، مجھ ایک غیر شاعر کو بھی شرکت کا موقع ملا وہ دعوت کیا تھی ایک چھوٹا سا مشاعرہ تھا۔ سامعین کی تعداد، شعرا کے لئے بڑی ہمت شکن تھی، میزبان، ان کے ایک دوست، اور میرے سوا جو تھا وہاں کوئی نہ تھا جو مصرعہ اٹھاتا مگر میزبان کے شاعری کے ذوق نے شاعروں کی کچھ امید بندھا دی تھی۔ کھانے پینے کا شغل بڑی دیر تک ہوتا رہا۔ میزبان بولتے اور شاعر کھاتے رہے۔ آخر محفل مشاعرہ جمی۔ شاعروں نے اپنی اپنی بیاضوں کو، جنھیں وہ ابھی تک اپنی جیبوں اور رومالوں میں چھپائے بیٹھے تھے، بے نیام کیا۔ ایک شاعر، جو اپنے حافظہ کی مدد سے، بیاض کی جھنجٹ سے بے نیاز رہے۔ اور شاعروں کی طرف بڑی حقارت سے دیکھ کر مجھ پر داد طلب نظریں ڈال رہے تھے۔ میزبان کے ایک اشارہ نے مشاعرہ شروع ہونے کے کچھ آثار پیدا کر دیئے۔ صف شعرا میں کچھ ہل چل ہوئی۔ کچھ ہاتھ عینکوں کی طرف بڑھے اور کچھ بیاضوں کی طرف اور جن کے پاس بیاضیں نہ تھیں وہ اپنی جیبیں ٹٹولنے لگے۔ میزبان نے ایک پُریقین انداز میں مشاعرے کے شروع ہونے کا اعلان کیا۔ اور ایک شاعر کا نام لیکر کلام سنانے کی درخواست کی، دوسرے شاعروں نے اپنی گردنیں جھکالیں۔ جن شاعر صاحب کا نام لیا گیا تھا وہ صفِ شعرا سے کچھ آگے بڑھ کر بیٹھ گئے اور اپنی بیاض کھول، ورق گردانی کرنے لگے۔ ادھر شاعروں نے نظروں میں ایک دوسرے سے بات چیت شروع کی، کچھ کانا پھوسی ہونے لگی تو، آگے بڑھے ہوئے شاعر نے ان سب کی طرف گھور کر دیکھا اور پھر میزبان پر شفقانہ نظریں ڈال کر بولے۔ ادھر ایک سال سے کچھ کہا نہیں ہے، ایک پرانی ہی چیز عرض کرتا ہوں، سب نے کہا "ارشاد" شاعر نے پہلے اپنی آواز صاف کی، دو ایک سکنڈ گنگنایا اور پھر لَے، سے مطلع پڑھا۔ پہلا مصرعہ خوب زوروں سے اٹھا۔ "سبحان اللہ" اور خوب ہے" کی آوازیں گونجنے لگیں۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ سامعین میں شعرا بھی شریک ہیں، بلکہ ایک دو تو داد دینے میں سب سے آگے بڑھے ہوئے ہیں۔ انہوں نے دوسرا شعر پڑھا۔ کچھ تعریف نہیں ہوئی۔ تیسرا شعر بھی یونہی گیا۔ شاعر کے ہاتھوں میں کچھ تھرتھراہٹ پیدا ہوئی۔ نظروں میں کچھ ناامیدی کے ساتھ التجا کا رنگ جھلکنے لگا۔ دوسرے شاعروں کے چہرے دیک رہے تھے۔ اور ادھر میں اور میزبان، تعریف کرنے اور داد دینے کے لئے تیار ہو گئے۔ انہوں نے ابھی مصرعہ ختم بھی نہیں کیا تھا کہ تعریف کا ایک شور اٹھا۔ "شاباش ہے شاعر، اور" کیا خوب مصرعہ کہا ہے" اور" واللہ حق ادا کر دیا ہے شاعری کا" کی آوازیں آتی رہیں۔ کچھ لوگ جھوم رہے تھے اور کچھ ہنس رہے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دوسرے شاعر، اس شاعر کے خلاف محاذ بنائے بیٹھے ہیں۔ آخر مقطع آیا تو میں نے اور میزبان نے اسے خوب دہرایا اور تین بار، مکرر ارشاد، کی آواز لگائی۔ تب کہیں جاکر اس شاعر کے چہرے پر غم و غصہ اور نفرت و حقارت کی جگہ ذرا اطمینان کے آثار جھلکنے لگے۔ اب

دوسرے شاعر صاحب کی باری تھی۔ ان کا رنگ جدید تھا۔ بیاض ساتھ نہیں تھی۔ وہ آگے بڑھے۔ جیب میں سے کاغذ کا پرزہ نکالا اور اسے دو انگلیوں میں پکڑ کر کہنے لگے۔ "ایک نظم عرض کی ہے پار سال میں کشمیر گیا تھا، اس کی رنگین بہاروں سے یہ رنگ اڑا لایا ہوں" ایک دوسرے شاعر نے اس پر اس طرح مصرعہ لگایا "وہ جگہ ہی ویسی تھی ورنہ ایسی نظمیں زندگی میں بار بار تھوڑی ہی ہوتی ہیں" نظم شروع ہوئی۔ ختم ہوئی تو سب شعرا نے تعریف کی مگر اس انداز میں کہ گویا داد دینے کی بجائے صرف اس کے حوصلے بڑھائے جا رہے ہیں۔

تیسرے اور چوتھے شاعر بھی اسی طرح آئے اور چلے گئے۔ اب آخری شاعر کی باری تھی کھنکتی ہوئی پاٹ دار آواز میں انھوں نے شعرخوانی شروع کی محفل میں کچھ گرمی آ چلی تھی۔ پہلے شعر پر میزبان نے "اے سبحان اللہ" کا نعرہ لگایا تو دوسرے شعر پر شاعر ساری محفل پر چھا گیا۔ دوسرے شاعر حسرت سے ایک دوسرے کی صورت تک رہے تھے، مگر اب دوسری باری کی کچھ امید نہ تھی۔ مشاعرہ کا رنگ اب جم رہا تھا کہ غزل ختم ہو گئی مقطع پر سب نے خوب شور مچایا اس لئے کہ یہ مشاعرہ کا آخری شعر تھا پھر نہ معلوم کب موقع ملے۔ اب سارے شعرا کی نگاہیں میزبان پر جمی تھیں۔ اس امید میں کہ شائد ایک اور دور چلے۔ میزبان نے ذرا مسکرا کر کہا۔ "میں بہت مشکور ہوں کہ آپ حضرات نے تکلیف فرما کر قدم رنجہ فرمایا، اور اپنی شاعری سے لطف اٹھانے کا موقع دیا" اور پھر مسکرا کر اپنے دوست کی طرف دیکھا۔ دوست نے کہا "آپ ہی کچھ سنائیے" اور مجمع کو مخاطب کر کے کہنے لگے "آپ بھی بڑے اچھے شاعر ہیں۔ ویسے سناتے ذرا تکلف کرتے ہیں اور مشاعروں میں کبھی نہیں جاتے، اس لئے ان کی شاعری کا حال کسی کو معلوم نہیں۔"

"ہمیں تو اس کی خبر ہی نہیں، آپ کو ضرور سنانا ہوگا" سب ایک ساتھ بولے تو میزبان نے کہا "آپ لوگ اصرار ہی کرتے ہیں تو مجھے کوئی عذر نہیں، مگر میں کیا اور میری شاعری کیا۔"

اس کے بعد نہ پوچھئے کہ کیا ہوا۔ دو گھنٹہ تک میزبان اپنی شاعری سے مہمانوں کو نوازتا رہا اور جب مہمان باہر چلے ہیں تو بڑی دیر تک میزبان کی شخصیت موضوعِ بحث بنی رہی۔

اشفاق حسین

گولکنڈے کے ہیرے ۔ (۱۲) افسانے ۸ تصاویر ۲۴۶ صفحات قیمت مجلد ۱۲؍

گولکنڈے کے ہیرے تمام دنیا میں مشہور ہیں ان کی قدر و قیمت چمک دمک ہر زمانہ میں باقی رہی اور ہمیشہ باقی رہے گی۔ ان کی طرح گولکنڈہ کے اکثر کردار بھی ہیروں سے کم نہ تھے۔ ان دونوں کے دلچسپ قصے اس کتاب میں درج ہیں۔ اس مجموعے کے ہر فسانے کے پڑھنے میں اتنی ہی خوشی ہوتی ہے جتنی کہ ہیرے مل جانے پر ہوگی۔ گولکنڈہ کی کوئی سیر و تفریح ان کتابوں کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ جو گولکنڈہ دیکھ چکے ہیں وہ جب یہ افسانے پڑھتے ہیں تو محسوس کرنے لگتے ہیں کہ ہم نے کچھ نہیں دیکھا اور جنھوں نے کبھی گولکنڈے کی سیر نہیں کی ان کے دل میں ان کو پڑھنے کے بعد گولکنڈہ کی سیر کی امنگیں موجزن ہو جاتی ہیں۔

ابدی مثلث۔ اسکولوں میں پڑھایا جاتا ہے کہ تین نقطے جو ایک سیدھ میں نہ رکھے ہوں' انھیں لکیریں کھینچ کر ملایا جائے تو جو شکل بنے گی اُسے مثلث کہتے ہیں۔ انسانی فطرت بھی ایک مثلث بنایا کرتی ہے۔ اس کے لئے نقطوں کا ایک سیدھ میں ہونا شرط نہیں' کہ وہ رکھے ہی بے ٹھکانے ہوتے ہیں۔ یہ اٹل تکونیا کبھی دو عورتوں اور ایک مرد سے بنتا ہے اور کبھی دو مرد اور ایک عورت سے ترتیب پاتا ہے۔ ہم جس مثلث کو پیش کر رہے ہیں وہ اس آخری قسم کا تھا۔

سینما سے نکل کر جب دونوں موٹر میں بیٹھ لئے تو نواب نعمت علی خان نے اپنے رفیق اور دمساز جمالی سے پوچھا۔

"کہو' کیا رائے ہے ـــ فلم کیسا تھا؟"

"کہانی میں ندرت پیدا ہونا تو اس لئے مشکل تھا کہ وہ موضوع ہی حضرت انسان کے برابر پرانا ہے' مگر اس کا تو پلاٹ بھی سپاٹ تھا۔ البتہ کامنی نے اپنے کردار میں جان ڈال دی ہے ـــ شبہ ہوتا ہے کہ فسانہ ہی کامنی کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا ہے۔"

"کامنی نے واقعی غضب کا کام کیا ہے!"

"اُس نے کمال یہ کیا ہے کہ جذبات کے اظہار کو فلسفے کی صورت دیدی ہے!"

موٹر جب جمالی کے دروازے پر رکی اور وہ اترنے لگا تو نواب نے کہا۔

"یار کل بمبئی چلینگے۔"

یہ سن کر جمالی حیران تو اس لئے نہ ہو سکتا تھا کہ نوابوں رئیسوں کے ارادے اسی طرح قایم ہوتے ہیں' اور یہ دونوں تو اسکول کے زمانے کے دوست تھے' لیکن اتنی تھوڑی مہلت میں اُسے خود تیار ہو سکنا دشوار معلوم ہوا۔ اُس نے جواب میں کہا۔

"بھئی ہم نہ جا سکینگے۔ والد صاحب کل ہی بگڑ چکے ہیں کہ جس نے کاروبار کو بالکل بھلا دیا ہے۔"

"بہت اچھا آپ نہ چلئے!"

"تمھیں تو بس بگڑنا آتا ہے۔ نہ سوچنا نہ سمجھنا۔ بات یہ ہے۔"

"میں نے کہا تو تم نے چلو پھر بات وات کی ضرورت کیا؟"

"لاحول ولا قوۃ! اچھا خیر' کس گاڑی سے چلنا ہے؟"

"سب بھلے آدمی ڈاک سے سفر کرتے ہیں!"

"گر تم کب سے بھلے آدمی ہو گئے! ہوں' صبح گیارہ بجے! بہت خوب!"

دوسری صبح کو جب یہ دونوں اسٹیشن پہنچ کر فرسٹ کلاس کے ڈبے میں بیٹھ لئے تو جمالی نے پوچھا۔

"اب اگر مضائقہ نہ ہو تو مجھے میرے سفر کا مقصد بھی بتا دو!"

"میرا ساتھ اگر کوئی بڑا مقصد نہیں تو ایک اعلیٰ افسانے کے لئے بیش قیمت تجربہ!"

"ساتھ تو کہتے ہیں ہر وقت بیوی بھی نہیں دے سکتی' رہ گیا افسانے کے لئے مسالا تو اس غرض سے سفر لازمی نہیں!"

"لیکن اس سفر کے تجربے کو تم نے افسانے میں ڈھال لیا تو سمجھو گے کہ سفر واقعی ضروری ہے' خاص کر میری معیت میں!"

یہ بات بس اتنے ہی پر ختم ہو گئی۔ بمبئی پہنچ کر دونوں مجسٹک ہوٹل میں اٹک گئے۔ ضروریات سے فارغ ہو کر بیٹھے تو نواب نے ٹیلیفون ڈائرکٹری کی ورق گردانی شروع کر دی۔ اور جمالی اخبار میں منہمک ہو گیا۔ ورق لوٹتے پلٹتے نواب نے خود "اوہو ہو!" کر کے جمالی سے کہا۔

"جمالی' ایک خط تو لکھو' ابدی مثلث' کی تعریف میں' خوب داد دی جائے!"

"فلم کی یا مس کامنی کی؟"

"مقصود تو کامنی کی اداکاری کو سراہنا ہے!"

جمالی نے ایک مختصر تحسینی خط لکھ دیا۔ نواب نے پڑھکر کہا۔

"نہیں، یہ نہیں۔ اسے واحد غائب میں لکھو!"

"تو مجھے غائب سمجھو، خود حاضر ہو جاؤ!"

"مذاق نہ کرو!"

"تو میں اس واحد غائب کا مطلب خاک نہیں سمجھا!"

"سنو جمالی، مجھے نواب بنانے میں تمہیں کوئی اعتراض ہے؟"

"میں کوئی احمق ہوں، تم تو قوم کے نواب ہو، بننے بنانے کی بات کیا ہے؟"

"یہ کہ تم میرے سکرٹری بنجاؤ!"

"بہت خوب، بنگیا، پھر؟"

"یہ کہ تم اپنی طرف سے لکھو کہ ہمارے نواب کو آپ کا فلم بہت پسند آیا وغیرہ"

"مگر ہاتھ گھما کر ناک پکڑنے کی ضرورت؟"

"یہ کہ سکریٹری بطرزِ مناسب لکھ سکتا ہے کہ آپ کی اداکاری کے اعتراف میں نواب صاحب کوئی تحفہ پیش کرنا چاہتے ہیں ــــ"

"نتیجہ؟"

"یہ کہ بمبئی کا چند دن کا قیام لطف سے گزرے گا!"

"انکار ہو گیا تو کیا توہین نہ ہوگی؟"

"اُسے توہین ہوتی ہے جب بات تیسرے کے کان پڑے! وہ کیا اخبار میں چھپواتی پھر گی؟"

"اور اپنا احساس وضمیر کوئی چیز نہیں؟"

"تمہیں کس نے فسانہ نگار مان لیا؟ ضمیر ہمیشہ رسم ورواج کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے!"

"آخر تو قومی نواب ہیں۔ ادہر اُدھر ایک بات سن لی اور لگے ہر جگہ بگھارنے! نواب صاحب، ضمیر نام اُس بطون کا ہے جو رسم ورواج کیا معنی ہر غلط بات کے خلاف بولتا ہے۔ وہ سانچے میں ڈھل نہیں جاتا بلکہ مردہ ہو جاتا ہے!"

"آپ سے کوئی جیت تھوڑی سکتا ہے، اسی بات پر خط لکھ ڈالو!"

جمالی نے نہایت بنا چنا کر خط لکھا اور نواب مطمئن ہی نہیں خوش تھے۔ اپنے ہاتھ سے خط کو ڈاک میں ڈالا۔ اُسی روز شام کو دستی جواب آیا۔ نواب صاحب کی صناعت پسندی کی خوب داد دی گئی کہ جن باریکیوں اور نزاکتوں پر ان کی نظر پڑی ہے تحسین وتعریف کے سیکڑوں ہزاروں خطوں میں ایک بھی ایسا نہیں آیا۔ دوسرے دن حسب ایضاً کو چائے پر مدعو بھی کیا گیا تھا۔

نواب نے اُسی آدمی کے ہاتھ شکریے کے ساتھ دعوت کی منظوری لکھ بھیجی۔

"یار یہ تو بڑی غلطی ہوئی!" نواب نے افسوس کے لہجے میں کہا۔

"کونسی؟"

"کہ تمہیں سکرٹری بنا دیا!"

"ابھی تک تو میں نے کوئی چیک وصول کیا نہیں ہے، اور خرابی کیا ہو گئی؟"

"یہ کہ تم ساتھ نہ ہو گے!"

"پہلی ملاقات میں تم اس کو پسند بھی نہ کرتے! نہ معلوم کیا افتاد پڑے!"

"لطف آدھا رہ جائے گا!"

"مردِ خدا تو نیم نان ہی پر قناعت کر لیتا ہے!"

"آؤ چلو بازار کی سیر کر آئیں!"

دونوں ہوٹل سے نکلے، ٹہلتے ہوئے قلعے کی دوکانوں میں گئے۔ ایک جوہری کی دوکان میں گھس گئے۔ نواب نے گلے بند و دست بند کا موتی کا

پلیٹ پسند کیا۔ جمالی نے اسے خوش ذوقی کے خلاف بتایا۔ اور متفقہ رائے سے طلائی "وینیٹی کیس" اس کی چوتھائی قیمت میں خرید اگیا۔

دوسرے دن شام ہونے تک نواب کو بے کلی سی رہی۔ جمالی خموشی سے تماشا دیکھتا رہا۔ نواب نے ذکر چھیڑا بھی تو اُس نے بہلا دیا۔ تیسرا پہر ہوا تو نواب مِس کامنی کے مکان "پریم نواس" پر وارد ہو گئے۔ وہ منتظر ہی تھی۔ بڑے تپاک سے پزیرائی ہوئی۔

کامنی واقعی زندگی میں اُس سے زیادہ من موہنی معلوم ہوئی جتنی کہ پردہ سیمیں پر نظر آئی تھی۔ گھر پر اس کا بیساختہ پن اور کھلا انداز ایک جیتا جادو ثابت ہوا۔ تحفے کی بار بار تعریف کی گئی، بار بار شکریہ ادا ہوا۔ نواب کی آرٹ کی نظر کی بڑی داد دی گئی۔

جب ایسی دلنواز صحبت ہو تو چائے شراب کا درجہ رکھتی ہے۔ نواب کو ابتدائی مرحلے اس آسانی اور حسن و خوبی سے طے ہو جانے کی امید نہ تھی۔ جب رخصت ہونے لگے تو نواب نے مِس کامنی کو دعوت دی۔ اُس نے اپنے کام کی زیادتی اور ذمہ داری کا عذر کیا۔ لیکن ڈائرکیٹر سے رخصت لیکر صبح فون کرنے کا وعدہ کیا۔ نواب نے ہوٹل پہنچ کر جمالی کو حال سنایا۔ اُس نے بے توجہی سے سن لیا۔

دوسری صبح فون نہ آیا تو نواب نے خود فون کیا۔ جواب ملا۔

"او ہو، نواب صاحب، عجیب اتفاق ہے۔ حسنِ اتفاق! میں آپ کو فون کرنے کے لئے ریسیور اٹھا ہی رہی تھی کہ آپ نے گھنٹی دیدی!" یہ کہکر ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا جس کا نشہ نواب کے رگوں میں بجلی رو کی طرح دوڑ گیا۔ پھر بولی "مجھے چھٹی مل گئی ہے۔ پانچ بجے آپ کی منتظر رہوں گی"۔

پانچ بجے جمالی کو زبردستی ساتھ لئے "پریم نواس" پہنچ گئے۔ جمالی کا تعارف کرایا۔

"یہ میرے بچپن کے دوست، ایک کامیاب تاجر، اور اعلیٰ رتبے کے افسانہ نگار بھی ہیں!"

"اوہو! ہماری جنس میں سے ہیں!" اُسی بجتی ہوئی ہنسی کے ساتھ بولی۔

"میں آپ کی جنس بن جانے کے لئے ڈاکٹروں کی مدد ضرور حاصل کرتا مگر اندیشہ ہوتا ہے کہ اس ڈیل ڈول کو کون قبول کرے گا!"

کامنی نے پھر شرابی ہنسی ہنسی۔ نواب نے بھی سنگت دی۔ مگر جمالی سنجیدہ صورت بنائے بے خبر رہا۔ وہ اُس سے بار بار مخاطب ہوئی مگر وہ دو حرفی جواب دیکر چپ ہو جاتا رہا۔ اس پر وہ دل میں جھلائی بھی۔ پھر نواب سے کہنے لگی۔

آج ایک اہم سین لیا جانیوالا تھا، اور چھٹی ملنا مشکل۔ مگر میں نے کام چھوڑ دینے کی دھمکی دی تو ڈائرکیٹر سیدھا ہوا۔ پھر تینوں باہر نکلے دیر تک موٹر میں سیر ہوتی رہی اور پھر تاج کے "ڈنر ڈانس" میں شریک ہوئے۔ صحبت نہایت خوش آئند تھی۔ زیادہ تر جمالی سے شعر و ادب پر گفتگو ہوتی رہی۔ جمالی جتنا ئیے دئے رہا وہ اتنی ہی اس سے بات کرنے پر مصر نظر آئی۔ اگرچہ دل میں بہت کڑھتی ہی رہی۔

دوسری صبح کامنی نے فون سے کہا۔

"کہیئے نواب صاحب، مزاج بخیر؟"

"آپ جیسے نوازین اس کے مزاج بخیر ہوں!"

"دھنکس، سنئے، ہلو، میں نے اپنے ڈائرکیٹر سے آرٹ کے مربی ہونے کی حیثیت سے آپ کی بڑی تعریف کی ہے۔ وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ بھی آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔"

"میں ایسا کہاں"۔

"سنئے، ہلو، آپ سے ان کی ملاقات ہو جانے کے بعد مجھے چھٹی ملنے میں سہولت رہے گی۔ ہلو، میں خود ساتھ آتی مگر ایک نہایت

ضروری کام ہے اور پھر اُن کو کئی روز تک فرصت نہ ہوگی، ہلو!"

"جی، ہلو، میں اُن سے مل کر نہایت خوش ہوں گا۔ ہلو، آج شام کو۔"

"اُن سے ملاقات کے بعد مجھے فون کیجئے گا۔"

"بہت خوب، ہلو، آج شام کو ـــــ ہلو ہلو، تسلیم۔"

دوپہر کے بعد ٹیلیفون پر نواب سے دریافت کیا گیا کہ مس کامنی نے آپ کی آرٹ پسندی کی بڑی تعریف کی ہے کمپنی کے ڈائرکٹر اور مینجنگ ایجنٹ آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ کیا اس وقت آپ کو فرصت ہے؟

"میں اُن کا منتظر رہوں گا، بڑے شوق سے تشریف لائیں۔ نواب نے جواب دیا۔

دونوں آئے رسمی تعارف ہوا۔ مختلف اور سطحی قسم کی باتیں ہوتی ہیں۔ نواب کی آرٹ پسندی پر اظہار مسرت و اطمینان کیا گیا۔ اور جب اُٹھنے لگے تو نواب کو "نگار خانہ" دیکھنے کی دعوت دی اور نواب نے قبول کر لی۔ اُن کے جانے کے بعد نواب نے کامنی کو اطلاع کی اور بتایا کہ کل نگار خانہ دیکھیں گے۔ کامنی نے تعلقات قائم ہو جانے پر مسرت ظاہر کی۔ نواب نے اُس کے پاس آنے اور سیر کو چلنے کی آرزو ظاہر کی تو بولی۔

"روز روز! کیا خوب! نہیں، آج نہیں، کل تو ملاقات ہو گی ہی۔" کامنی نے بڑے چوچلے کی آواز میں کہا اور ہنس دی۔

نواب کی مایوسی کا احساس اُس کی ہنسی کے نشے میں ڈوب گیا۔ نواب کو محسوس ہوا کہ کمپنی والوں کو دوست بنائے رکھنا کامنی سے ملاقات جاری رکھنے کے لئے ایک شرط ہے۔

دوسرے دن دوپہر بعد کامنی اور ڈائرکٹر آئے اور ان دونوں کو ساتھ لے گئے۔ بڑی شان کا استقبال ہوا۔ سارا اسٹاف موجود تھا۔ کام بند کر دیا گیا تھا۔ ایک ایک چیز دکھائی سمجھائی گئی۔ چائے کا اہتمام اعلیٰ پیمانے پر تھا۔ جب سب چائے پینے بیٹھے تو مس کامنی نے کمپنی کی طرف سے میزبانی کے فرائض ادا کئے۔ کمپنی کی مشہور رقاصہ نے اپنے فن کا کمال دکھایا۔ دوسری اداکاروں نے گانا سنایا جو اسی خاص موقع کے لئے "منشی جی" اور "اُستاد جی" نے مرتب کیا تھا۔ پھر نواب دفتر میں لیجائے گئے۔ جمالی اور کامنی گفتگو کرتے رہے۔

مینجنگ ایجنٹ نے نواب سے کمپنی کے کاروبار کا ذکر چھیڑا اور بتایا کہ اب تک کمپنی کتنا منافع کرتی رہی ہے۔ اور یہ بھی کہ کتنا منافع نہیں کر سکی اور کیوں نہیں کر سکی ہے۔ پھر سرمایہ بڑھانے کی اسکیم بتائی کہ نئی اسکیمیں چلائی جائیں گی۔ آخر میں درخواست کی کہ نواب بھی ایک لاکھ کے حصّے لیں اور کمپنی کے ڈائرکٹر بنجائیں۔

نواب نے بلا تامل دستخط کر دئے۔ شاید پہلا موقع تھا کہ اُس نے جمالی سے مشورہ کئے بغیر کوئی کام کیا ہو۔ اور پہلا موقع تھا کہ اُس نے جمالی سے اس بات کو مخفی رکھنا چاہا؟

پھر کامنی اُن کے ساتھ ہوٹل تک گئی۔ نواب نے دوسرے دن کی قرار داد چاہی تو بولی۔

"آپ کو معلوم نہیں ایک فلم ایکٹریس کی زندگی کتنی دشوار ہے۔ ڈائرکٹر روز روز کی ناغہ کبھی جائز نہ رکھیگا۔ خدا حافظ!"

لیکن اس کے بعد رفتہ رفتہ دن عید اور رات شب برات گزرنے لگی۔ کامنی کام پر ہوتی تو نواب سائے کی طرح ساتھ ہوتے۔ کمپنی کو نواب سے یہ اُمید بھی ہو گئی تھی کہ وہ اپنے تعلقہ دار دوستوں سے کمپنی کے لئے سرمایہ فراہم کرا دیگا کہ کمپنی کی نئی اسکیموں کو خاطر خواہ چلایا جا سکے۔ اب کامنی حکم کی باندی تھی۔

جمالی کو احساس ہوا کہ معاملہ خلاف توقع بہت جلد طول پکڑ گیا۔

اور یہ خود اس کی غفلت کا نتیجہ ہے۔ اور نواب نعمت ایسا دوست نہیں جسے آنکھوں دیکھے خراب وتباہ ہونے دیا جائے۔ اُس میں خوبیاں بھی ہیں اور زندگی کے تجربات ان خوبیوں میں ابھی اضافہ کرنیوالے ہیں۔ جمالی کو کامنی کی طبع وسرشت کا اندازہ پہلی ہی ملاقات میں ہوگیا تھا۔ اُسے علم تھا کہ کامنی خود اس پر ملتفت ہے۔ اُس نے سوچا کہ اگر موقعہ دیکھ کر کامنی کے التفات کو بڑھا چڑھا کر نواب کو یقین کرا دیا جائے تو فطری رشک سے، نواب کامنی سے بیزار ہو جائے گا۔ لیکن جب تک وہ خود قدم نہ بڑھائیگا، اب کامنی اپنی جگہ سے آگے نہ بڑھے گی۔ وہ کوئی گری پڑی تو ہے نہیں! لیکن نواب کو اُس کی طرف سے صدمہ۔ صدمہ نہیں تعلق بھی ختم ہوسکتا ہے! اگر بچپن کی دوستی کی قربانی دوست کے لئے بھی بڑی قربانی ہے۔ لیکن اُسے اگر دوستی کا دعوےٰ ہے تو قربانی دینا ہی چاہئے۔ دوستی بھی قیمت میں دیکر دوست کو بچا لینا ہی دوستی ہے!

جمالی نے شروع دن سے اور شرارت کے خیال سے یہ اہتمام رکھا تھا کہ جب کامنی اس کی طرف دیکھتی وہ نظریں چرا لیتا۔ اس سے کامنی چڑھ جاتی تھی۔ ایک دن جب یہ دونوں تنہا تھے، کامنی نے اس کی طرف دیکھا تو اُس نے حسب معمول نگاہ پھیر لی۔ کامنی نے جھنجلا کر کہا

"یہ آپ کی کیا ادا ہے؟"

"میری اور ادا؟ کونسی؟"

"کہ جب میں دیکھوں آنکھیں چرا لینا!"

"یہ تو ناکسی کا مداوا ہے یا بے بسی کا انتقام!"

"یعنے؟"

"یہ کہ میں اس طرح حسن کو ناقابل التفات ٹھیرا کر اپنا دل ٹھنڈا کر لیتا ہوں!"

"آپ اپنا دل جلاویں ہی کیوں؟"

"اس لئے کہ میں نہ نواب نہ نواب زادہ!"

"کیا خوب! آپ راجہ نواب بننے کی تمنا لئے ہوئے ہیں۔ یہ بھیڑوں کا گلہ جو صرف اس لئے بنا ہے کہ جہاں جائے اُون اتار لی جائے! میں تو آپ کو بہت بلند سمجھ رہی تھی!"

"مگر یہ نتیجہ آپ نے غلط نکالا کہ مجھے تمنا ہے! حقیقت و واقعہ کا احساس تمنا نہیں کہا جاسکتا۔ بہرکیف، غنیمت ہے۔ آپ مجھے، بھیڑ، نہیں سمجھتیں، شکریہ!"

"آپ تو رمز شناس ہیں، سمجھئے تو کہ جہاں حصول زر مقصود ہو وہاں کبھی دلی تعلق ہوسکتا ہے؟ شکر ہے کہ آپ راجہ نواب نہیں اگر چہ میری نظروں میں آپ راجوں کے راجہ ہیں!"

"شکریہ۔ اب آپ نے بنانا شروع کر دیا!"

"ایک ذہین انشا پرداز کو عامیانہ باتیں زیب نہیں دیتیں آزمایئے! نہیں تو وقت بڑی کسوٹی ہے!"

"کیا ایک ایسا آدمی جو نہ نواب ہو نہ نواب زادہ تمہارے دل کے کسی گوشے میں جگہ پا سکتا ہے؟"

"جمالی، میرے دل کی پوری مملکت پر تمہارا سکہ چلتا ہے!"

کامنی کی آنکھیں بھر آئیں۔ اُس نے اپنا سر جمالی کے شانے پر لگا دیا۔

نواب نے آڑ میں کھڑے ہوکر ان کی باتیں سن لیں۔ اندر داخل ہوئے تو حواس برجا نہ تھے، ہونٹوں پر خشکی تھی اور دل میں دونوں کی بیوفائی پر غصہ کا طوفان۔ زباں سے ایک لفظ نہ نکلا۔ وہاں سے رخصت ہوئے تو راستے میں بھی بات نہ کی۔ مگر ہوٹل کے کمرے میں پہنچے تو پھوٹ پڑی۔

"یہی شرافت اور اخلاق ہے جس کے درس تم دنیا کو دیتے رہتے ہو، جمالی!"

"دماغ کو تکلیف دینا تو تم نے سیکھا نہیں۔ تم درخت کی

ڈالی ہلاؤ اور ایک پختہ رسیلا آم میری گود میں آپڑے تو کیا میں اُسے پھینکدوں گا؟"

"مگر مجھے اس سے الفت تھی!"

"تم نے اس کی زبان سے سن لیا، تھی تو اب نہ رہنا چاہئے! تم دھوکے میں تھے!"

"اور تم دوستی و رفاقت کی توہین کرنے پر اسی لئے آمادہ ہوگئے کہ اُسے مجھ سے محبت نہیں ہوسکتی؟"

"بلکہ تمھاری حماقت ثابت کرنے کے لئے!"

"دغا باز بننا بھی قبول کیا!"

"دنیا کے معیار اعتبارات پر قائم ہوتے ہیں۔ اس فلم کو یاد کرو جو کاتسنی نے سینما کے پردے پر دکھایا تھا اور اس حقیقت کو دیکھو جو وہ زندگی کی بساط پر دکھارہی ہے۔ وہ تمھاری دوست نگی محض دولت وتنعم کی خاطر! وہ مجھ پر ملتفت ہے صرف جذبات کی بنیاد پر! یہ حقیقت ہے باقی سب لغو!"

"تم نے نہایت کمینے پن کا ثبوت دیا ہے، جمالی!"

"مکر وریا کی دنیا میں حقیقت سے دور بہت سے حسین لفظ استعمال ہوتے ہیں! لیکن فطرت کی نظر میں ان کے کوئی معنی نہیں۔ اس کو حقائق سے دوچار ہونیوالا سمجھ سکتا ہے!"

"تم انسانیت کے لئے ننگ ہو!"

"تمہیں حق حاصل ہے، اس لئے میں برا بھی نہیں مانتا، اور جواب دے ہی چکا ہوں۔ بہر حال میں تمھارا شکر گزار ہوں!"

"میں آج ہی لکھنو واپس جا رہا ہوں!"

"جاؤ، مجھے تو افسانے کی تکمیل کرنا ہے۔ یاد نہیں، تم نے کہا تھا اس سفر میں ایک اعلیٰ افسانے کا مسالا حاصل ہوگا۔ شکریہ!"

یہ کہہ کر جمالی نکل کے چلا گیا اور نواب نعمت علی خان اس حقیقت غور پر کرنے میں "کہ محبت و دوستی سی شئے کا وجود ہے بھی یا نہیں" اپنا دل خون کیا کئے۔

ل۔ احمد

چلے گئے

صہبائے چشم مست پلا کر چلے گئے　　ساغر سے بے نیاز بنا کر چلے گئے

پھولوں میں بوئے زلف معنبر بکھیر دی　　کلیوں میں اپنا رنگ بسا کر چلے گئے

ہر سمت مسکرا کے نظر ڈالتے ہوئے　　منظر میں چار چاند لگا کر چلے گئے

اللہ رے تصورِ کا ل لہ بارہا　　دھوکہ سا دل کو تھا کہ وہ آکر چلے گئے

جراُت بھی دست شوق کی تھرا کے رہ گئی　　دامن کچھ اس ادا سے چھڑا کر چلے گئے

اٹھی جو چشم شوق تو کچھ آگیا حجاب　　نظریں جھکائے آنکھ بچا کر چلے گئے

جلوے فروغ حسن کے آنکھوں میں بس گئے　　ذروں کو آفتاب بنا کر چلے گئے

وہ حسن شعلہ بار وہ رنگ خرام ناز　　اک آگ سی فضا میں لگا کر چلے گئے

کیا تھیں ہمیشہ ہائے وہ انکی تسلیاں
جاتے ہوئے گلے سے لگا کر چلے گئے

رشید احمد رشید (عثمانیہ)

مشاہدے

کئی سال بعد علیگڈہ جانے کا اتفاق ہوا۔ سرسید کے لگائے ہوئے پودے ہرے بھرے تناور درخت ہو گئے ہیں، ان کے پھل پھول دیکھ کر دل خوش ہوتا ہے۔ ایک شخص کی ہمت اور عقلمندی پر آفریں ہے کہ اس نے کیا کیا دقتیں اٹھائیں، کیسی کیسی مالی مصیبتوں کا سامنا کیا مگر ہمت نہ ہارنا تھی نہ ہاری۔ سرسید کے متعلق ایک قصہ معلوم ہوا، آپ نے نہ سنا ہوگا آپ یقیناً دلچسپی سے سنیں گے اور کبھی سُنا بھی تھا تو اس کی یاد تازہ ہو جائے گی۔ بہر صورت آپ دل ہی دل میں سرسید کی حاضر دماغی اور افادیت پسندی پر صاد کریں گے۔

قصہ یہ ہے کہ جب سرسید مسلمانوں کی قومی درس گاہ کے لئے روپیہ جمع کر رہے تھے تو ایک طوائف نے دس ہزار کا نقد چندہ بھجوایا۔ تمام ٹرسٹی انکار پر تلے تھے اور رقم واپس بھجوائی جا رہی تھی کہ سرسید کو اس کا علم ہوا۔ انہوں نے فوراً منع کیا۔ تمام ٹرسٹی حیران ہو گئے۔ سُنا ہے کہ ایک نے صاف صاف کہدیا کہ

"حرام کی کمائیوں سے روپیہ لے کر آپ جس کالج کو سینچیں گے اس کے علم و اخلاق کا کیا معیار ہوگا! کیا آپ کی حالت ابھی سے ایسی گئی گذری ہو گئی ہے کہ.......... آپ رنڈی بھڑووں کا پیسہ لینے بیٹھے ہیں!"

سرسید نے جواب دیا

"بھئی۔ گھبراتے کیوں ہو؟ دیکھو تو کہ اس روپیہ کا بھی کوئی موزوں مصرف نکل ہی آئے گا"

غرض سرسید نے روپیہ رکھ لیا، شکریہ کی رسید بھجوا دی اور اس رقم سے مختلف حصوں میں بیت الخلاء بنوا ڈالے، دینے والی نے نیک نیتی سے روپیہ دیا تھا، لینے والے نے نیک نیتی سے روپیہ لیا۔ اور ایک مفید غرض پر صرف کر کے دکھا دیا کہ نیک کام کرنا مفید کام کرنا ہے اور مفید کام کرنا ــــ نیکی کرنا ہے۔ جہاں سرسید نے رشوت لینے والے عہدیداروں، استحصال اور غصب، لوٹ اور فریب سے کمانے والے ہر پیشے اور طبقے کے "معززوں" سے پیسہ لیا تھا وہاں انہوں نے "عصمت فروش" سے بھی روپیہ قبول کر لیا۔ جب ضمیر فروشوں سے روپیہ لینے میں کوئی ہرج نہیں تو عصمت فروشوں سے روپیہ لینے میں کیا قباحت ہے؟ یہ بھی سرسید کی مصلحت شناسی تھی کہ انہوں نے تنگ نظر ٹرسٹیوں کی خاطر اتنی رعایت کی۔ بہرحال ان کی حکمت عملی قابل داد ہے کہ انہوں نے جھوٹی شیخی، بے موقع گھمنڈ اور برتری والی نخوت سے متاثر ہو کر دس ہزار کا گراں قدر نقد چندہ کھونے نہ دیا۔

جب میں اپنے شہر میں اور دوسرے شہروں اور قصبوں میں لوگوں کو عام راستوں پر غلاظت کرتے اور گندگی پھیلاتے دیکھتا ہوں تو مجھے خیال آتا ہے کہ ضرورت انہیں بدتمیزیوں پر مجبور کرتی ہے۔ علیگڈہ کے یونیورسٹی والے خوش قسمت ہیں کہ وہ بدتمیزی کرنے پر مجبور نہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اخلاق کا انحصار بڑی حد تک ہماری دولت پر ہے۔ اخلاق اور شرافت، تمیز اور تہذیب کی یہ معاشی تاویل کیا غلط ہے کہ دولت اور سہولت ہمیں صفائی اور پاکیزگی سکھاتے ہیں؟ ہماری سہولتوں کے ماحول میں انسان صفائی کا عادی اور نفاست کا شوقین ہو سکتا ہے۔ غلاظت اور گندگی بیشتر انسانوں کے جمالیاتی احساسات کو غارت کر دیتی ہیں۔

کسی کا کہا ہوا یہ جملہ مجھے بار بار یاد آ رہا ہے کہ

"وہی روپیہ اچھا ہے جس کا مصرف ٹھیک ہو اور وہی آدمی بھلا ہے جس کا خاتمہ بالخیر ہو!"

علیگڈہ ہی میں بعض مشتبہ قابلیت اور مخلوط اخلاق کے لوگوں کو دیکھ کر اس خیال کو تقویت ہوئی کہ بعض لوگ جو قومی اداروں

چپہ دام بھی دینا گوارا نہیں کرتے اپنے مطلب اور فائدے کے لئے قومی اداروں اور تعلیمی درس گاہوں کو چوسنے اور اس سے مستفید ہونے سب سے پہلے تیار ہو جاتے ہیں۔ لاہور میں بھی میں نے یہ مشاہدہ کیا۔ انجمن حمایت اسلام کی پچاس سالہ جوبلی منائی جارہی تھی۔ یہ وہی مشہور انجمن ہے جس کے سالانہ جلسوں میں اقبال نے اپنی بہترین نظمیں سنائی تھیں، یہ وہی انجمن ہے جس کا شمار ہندوستان کی بہترین رفاہی انجمنوں میں ہونا لازمی ہے یہ وہی انجمن ہے جس نے عمل کے ذریعہ اپنے وجود کی ضرورت و افادیت کو کئی بار ثابت کیا ہے۔ اعلیٰحضرت کے تیس ہزار کے عطیہ کا اعلان کیا گیا، حکومت پنجاب نے بھی اسی قدر رقم دی، اہل خیر نے مختلف رقمیں عطا کیں غریبوں سے "پیسہ فنڈ" میں پیسہ پیسہ جمع کیا گیا مگر ایسی عمدہ انجمن کے لئے اور ایسے زرین موقع پر بھی بعض لوگوں نے باوجود استطاعت کے کچھ نہ دیا۔ انجمن نبھانے والوں میں بعض بڑی بڑی ہستیاں تھیں۔

وہاں سے ایک کے صاحبزادے بی۔ اے جیسا معمولی امتحان وہ بھی معمولی درجے میں پاس کرکے ہندوستان کی ایک مشہور درسگاہ میں قسمت آزمائی کے لئے آئے تھے، ان کے والد بھی ساتھ تھے۔ انہوں نے ایسی جوڑ توڑ کی اور خوشامد اور منت سماجت کر کے ایسا زور باندھا کہ آخر اپنے کم اہل بیٹے کو دو ڈھائی سو کی خدمت پر چپکا ہی دیا۔ ان سے زیادہ قابل، ان سے زیادہ مخلص، ان سے زیادہ شریف منہ دیکھتے رہ گئے۔ بعض لوگ قومی درس گاہوں پر جان و مال سے قربانیاں کرتے ہیں اور بعض لوگ جونک بن کر قوم پر پلتے ہیں۔ بعض لوگ اپنے عیش اور آرام کو قوم پر میٹتے ہیں اور بعض لوگ عیش اور آرام کی خاطر قومی دولت سمیٹتے ہیں۔

جعفر حسن

غزل

خوش خوش دلِ بے تاب ہے معلوم نہیں کیوں　　غم اور بھی نایاب ہے معلوم نہیں کیوں
گل زارِ محبت میں مرا نخلِ تمنا　　سرسبز ہے شاداب ہے معلوم نہیں کیوں
عالم کا وہ پارینہ صحیفہ ہے کہ جس میں　　بے ربطیِ ابواب ہے معلوم نہیں کیوں
کیا وجہ بتاؤں ـ دلِ مایوسِ محبت　　بے چین ہے بے خواب ہے معلوم نہیں کیوں
اب بارگہِ عشق میں گستاخ نہیں دل　　پابندیِ آداب ہے معلوم نہیں کیوں
پھر بزم میں ہیں مجھ پہ ہی وہ مست نگاہیں　　پھر دورِ مئے ناب ہے معلوم نہیں کیوں
آما جگہِ حسرت و ارماں تھا کبھی دل　　اب رنج بھی کم یاب ہے معلوم نہیں کیوں
ایسا تو نہ تھا پہلے دُرِ اشک مگر اب　　خوش رنگ ہے خوش آب ہے معلوم نہیں کیوں
دل آپ ہی خوش ہے تو کبھی آپ ہی غمگیں　　بیگانۂ اسباب ہے معلوم نہیں کیوں
شاید کوئی دشمن ہے مرے دل کے سکوں کا　　دن رات جو بے تاب ہے معلوم نہیں کیوں
دیکھے تو کوئی دیدۂ نم پر صفِ مژگاں　　میلہ سا لبِ آب ہے معلوم نہیں کیوں
یوں پرسشِ احوالِ بشیر اور مسلسل　　بے حس دلِ احباب ہے معلوم نہیں کیوں

میر بشیر الدین بشیر

جذبۂ بے اختیار

تم دوائے دل تھے دردِ لا دوا کیوں ہو گئے؟
آشنا ہو کر وفا نا آشنا کیوں ہو گئے؟

گھلتے گھلتے مہربانی بے رخی کیوں ہو گئی؟
ہوتے ہوتے دشمنِ مہر و وفا کیوں ہو گئے؟

اللہ اللہ یہ تمہارے عہد و پیماں کا مآل
زمزمے کمبخت پیغامِ قضا کیوں ہو گئے؟

تم مجھے پہروں کیا کرتے تھے تلقینِ وفا۔
آج خود غارت گرِ جنسِ وفا کیوں ہو گئے؟

فکرِ مستقبل، غمِ احباب، جورِ روزگار
اس پریشانی میں تم مجھ سے جدا کیوں ہو گئے؟

کاش خودداری اجازت دے کہ اتنا پوچھ لوں
تم وفا کے مدعی تھے بے وفا کیوں ہو گئے؟

تم کو غیروں سے وفا منظور تھی کرتے مگر
میرے اطمینانِ ہستی سے خفا کیوں ہو گئے؟

اشک بھر آئے ہیں کیوں احسان ان کو دیکھ کر
یہ زباں کے فرض آنکھوں سے ادا کیوں ہو گئے؟

احسان دانش

ریاست باؤنی کا آصفی خانوادہ

ہز ہائینس اعظم الامرا فخر الدولہ معین الملک صاحب جاہ محصین سردار نواب باصل الحسن خاں ظفر جنگ نواب بہادر والی ریاست باؤنی۔ حضرت آصف جاہ مغفرت مآب کی اولاد سے ہیں جو اس وقت فرماں روا والی ریاست باؤنی ہیں جن کو ۱۱ توپ کی سلامی مقرر ہے۔ آپ کے حالات خاندانی اس ریاست ابد قرار سے وابستہ ہیں اس کو آپ تاریخ کی روشنی میں تفصیل سے ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) نواب قمر الدین خاں نظام الملک آصفجاہ مغفرت مآب

حضرت آصف جاہ مغفرت مآب کو چھ صاحبزادے اور چھ صاحبزادیاں تھیں جن کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) حافظ میر محمد پناہ غازی الدین خاں۔ نظام الملک امیر الامرا فیروز جنگ ولادت سنہ ۱۱۲۰ھ وفات سنہ ۱۱۶۵ھ مدفن دہلی

(۲) میر احمد علی خاں نظام الدولہ ناصر جنگ شہید ولادت سنہ ۱۱۲۴ھ وفات سنہ ۱۱۶۴ھ مدفن اورنگ آباد

(۳) سید محمد خاں آصف الدولہ میر الممالک صلابت جنگ ظفر جنگ سپہ سالار ولادت سنہ ۱۱۲۴ھ وفات سنہ ۱۱۷۷ھ مدفن بیدر شریف۔

(۴) میر نظام علی خاں نظام الدولہ نظام الملک اسد جنگ فتح جنگ ولادت سنہ ۱۱۴۶ھ وفات سنہ ۱۲۱۸ھ مدفن مکہ مسجد حیدر آباد۔

(۵) میر محمد شریف خاں شجاع الملک بسالت جنگ شجاع الدولہ ولادت سنہ ۱۱۴۹ھ وفات سنہ ۱۱۹۵ھ مدفن قلعہ ادھونی۔

(۶) میر مغل علی خاں ہمایوں جاہ ناصر الملک معتضد الدولہ ہمایوں جنگ چین قلیچ خاں صوبہ دار بیجاپور ولادت سنہ ۱۱۵ھ وفات سنہ ۱۲۱۰ھ مزار درگاہ سید حسن برہنہ شاہ رحمۃ اللہ علیہ حیدر آباد۔

حضرت آصف جاہ اول مغفرت مآب کو چھ صاحبزادیاں تھیں جن میں سے ایک صاحبزادی موسوم خیر النساء بیگم صاحبہ نواب متوسل خاں بہادر سے منسوب تھیں یہ نواب ہدایت محی الدین خاں مظفر جنگ کی والدہ محترمہ ہیں۔

(۲) نواب غازی الدین خاں فرزند اول آصف جاہ مغفرت مآب آپ کا اسم گرامی حافظ میر محمد پناہ خطاب غازی الدین خاں نظام الملک امیر الامرا فیروز جنگ دیوان دہلی سنہ جلوس بہادر شاہی مطابق ۱۱۳۰ سنہ ۱۱۱۶ھ (دربار آصف) میں پیدا ہوئے آپ کی والدہ ماجدہ حضرت سید النساء بیگم عرب بی بیگم صاحبہ نواب عضد الدولہ عیوض خاں بہادر کی صاحبزادی تھیں اور زیب النساء بیگم دختر وزیر الممالک آپ کی محل محترمہ تھیں۔ حضرت فردوس آرامگاہ محمد شاہ بادشاہ جب سنہ ۱۱۵۳ھ میں سریر آرائے سلطنت دہلی ہوئے تو آپ کو اپنا دیوان خاص مقرر فرمایا۔ اور سنہ ۱۱۶۵ھ میں خطاب نظام الملک اور کل صوبہ داری دکن سے سرفرازی بخشی۔ نواب غازی الدین خاں بہادر اپنے برادر ناصر جنگ شہید کے بعد دہلی میں اپنے فرزند نواب میر شہاب الدین خاں کو نائب دیوان مقرر کر کے ملہار راؤ کے ہمراہ اپنی کثیر فوج کے ساتھ اکتوبر ۱۷۵۲ء مطابق محرم سنہ ۱۱۶۵ھ اورنگ آباد پہنچے۔ مورخین کا بیان ہے کہ آپ کو زہر دیا گیا سو ہضمی سے

جان پر آبنی بہر حال جان چلی گئی۔ اس وقت نواب صلابت جنگ بہادر آپ کے برادر صوبہ دار دکن تھے۔ اس واقعہ کی تفصیل سراج الدین طالب مرحوم نے اپنی تصنیف "نظام علی خاں" میں نہایت تحقیق سے بیان فرمائی ہے۔ آپ نے ۵۴ سال کی عمر میں بمقام اورنگ آباد ۷۔ ذیحجہ ۱۱۶۵ھ میں انتقال فرمایا۔ میر حشمت خاں و تیر انداز خاں بعد تجہیز و تکفین میت دہلی لے گئے اور وہاں آپ کو حضرت مغفرت مآب کے والد کے مقبرہ میں دفن کیا گیا۔

نواب غازی الدین خاں مرحوم کو ایک صاحبزادہ مسمی نواب میر شہاب الدین خاں اور تین صاحبزادیاں تھیں۔

(۱) پہلی صاحبزادی ہدایت النساء بیگم صاحبہ محل خواجہ قلندر خاں بہادر آپ کی بطن سے ایک فرزند اور دو لڑکیاں تھیں۔

(۲) دوسری صاحبزادی امیر النساء بیگم صاحبہ محل خواجہ سکندر خاں عزیز الدولہ ان کو ایک فرزند اور ایک دختر ہوئی۔

(۳) تیسری صاحبزادی سعادت النساء بیگم صاحبہ نبیرہ وزیر الممالک خواجہ محمود خاں بہادر سے منسوب ہوئیں جن کے بطن سے ایک لڑکی اور ایک فرزند ہوا۔

ان ہر سہ صاحبزادیوں کی اولاد کی تفصیل ملاحظہ ہو شجرۂ آصفیہ مصنفہ بدر الدین خاں تمیز امیر پائیگاہ۔

(۴) نواب میر شہاب الدین خاں فرزند حافظ میر محمد پناہ خلف حضرت مغفرت مآب۔

میر شہاب الدین خاں بہادر نواب حافظ میر محمد پناہ غازی الدین خاں بہادر (خلف اکبر حضرت آصفجاہ مغفرت مآب) کے صاحبزادے ہیں آپ کی والدہ ماجدہ کا نام زیب النساء بیگم صاحبہ تھیں جو وزیر الممالک کی دختر تھیں۔

آپ کا عقد نواب معین الملک میر منو رستم ہند طغائی بہادر کی صاحبزادی عمدۃ النساء بیگم صاحبہ سے ہوا تھا۔ اس وقت آپ کی عمر ۱۶ سال کی تھی بسعی و سفارش صفدر جنگ وزیر آپ کو دربار دہلی سے غازی الدین خاں عماد الملک کا خطاب عطا کیا گیا۔ اور ۱۱۶۶ھ میں وزیر الممالک عماد الدولہ نصرت جنگ مزید خطابات سرفراز کیے گئے۔ جب صفدر جنگ کو احمد شاہ بادشاہ دہلی نے معزول فرمایا تو انتظام الدولہ خانخاناں اور نواب غازی الدین خاں موصوف کا دہلی پر قبضہ اور انتظام تھا۔

صفدر جنگ نے جب بغاوت کی تو آپ نے اپنی فوج اور جان نثاروں کو لے کر اس بغاوت کو فرو کیا (امیر الامرا) یعنی مدار المہام سلطنت دہلی بھی مقرر ہو چکے تھے۔ عہد عالمگیر ثانی میں آپ نے سات سال تک وزارت ہند کی خدمت انجام دی۔ آپ کا انتقال ۱۱۹۹ھ میں ہوا۔ آپ کے حسب ذیل صاحبزادے اور صاحبزادیاں تھیں۔

صاحبزادگان

۱۔ حافظ میر خیرات علی حمید الدولہ متہور جنگ۔
۲۔ غلام محی الدین خاں محی الدولہ
۳۔ معلاً صاحب معلاً جاہ
۴۔ میر قطب الدین خاں قطب الملک
۵۔ میر محمد نصیر الدولہ شیر جنگ (بانی ریاست باؤنی)
۶۔ میر جیلانی خاں عرف میاں بخشو شرف الدولہ
۷۔ غلام فخر الدین خان (داماد ہمایون جاہ)

۸ ۔ میر آصف خاں منور الدولہ

۹ ۔ محمد بخش خاں انتظام الدولہ

۱۰ ۔ غلام نظام الدین (مقیم کالپی)

۱۱ ۔ خواجہ بخش خاں

۱۲ ۔ میر نصر اللہ خاں ناصر الدولہ

صاحبزادیاں

۱ ۔ بینڈو بیگم محل خواجہ وزیر خاں نواسہ وزیر الممالک

۲ ۔ دردانہ بیگم محل خواجہ امیر خاں نواسہ وزیر الممالک

۳ ۔ حاجی بیگم محل خواجہ قطب الدین خاں نواسہ وزیر الممالک

۴ ۔ فضل النساء بیگم محل امیر محمد علی خاں نواسہ وزیر الممالک

۵ ۔ عظمت النساء بیگم محل محمد صلاح الدین فرزند وزیر الممالک

۶ ۔ فرخندہ بیگم محل میر سعد اللہ خاں

۷ ۔ فرحت بیگم محل میر نصر اللہ خاں

(۴) نواب میر محمد نصیر الدولہ شیر جنگ بہادر

آپ کا نام "میر محمد" المخاطب نصیر الدولہ شیر جنگ

آپ نواب میر شہاب الدین خاں بہادر نبیرہ حضرت آصفجاہ اول مغفرت مآب کے فرزند نجیم ہیں آپ کی والدہ ماجدہ کا نام گنہ بیگم صاحبہ ہے آپ کو ایک صاحبزادی پادشاہ بیگم صاحبہ جو احمد بخش خاں بہادر فرزند ناصر الدولہ خلف وزیر الممالک سے منسوب تھیں۔

تاریخ بندیلکھنڈ

بندیلکھنڈ ہندو راج دھانی تھا۔ عہد شاہ جہاں بادشاہ میں راجہ چمپت رائے اور اس کے فرزند چھتر سال نے ایک جدید خاندان مشترک ملک میں قایم کیا محمد خاں بنگش افغان رئیس فرخ آباد نے چھتر سال کے ملک پر حملہ کیا پیشوا باجی راؤ کی امداد سے حملے کی مدافعت کی گئی۔ یہ علاقہ علی بہادر پوتا باجی راؤ بیٹا شیو بہادر اور فرزندان چھتر سال میں تقسیم ہو گیا تھا۔ شیو بہادر بن علی بہادر سنہ ۱۸۲۳ء میں جب فوت ہوا تو اس کے بھائی ذو الفقار علی کے نام یہ علاقہ سپرد ہوا۔ من بعد علی بہادر کا سنہ ۱۸۵۶ء میں خاتمہ ہو گیا۔ بندیلکھنڈ ایک وسیع علاقہ ہے جہاں صرف یہی ایک اسلامی ریاست واقع ہے۔

ریاست باؤنی

نواب میر شہاب الدین خاں بہادر نبیرہ حضرت آصفجاہ مغفرت مآب نے پیشوا سے باون مواضع کا ایک علاقہ حاصل کیا تھا جس وقت بندیلکھنڈ میں سرکار عظمت مدار برطانیہ کا قبضہ ہوا تو نواب نصیر الدولہ شیر جنگ بہادر کا قبضہ ریاست باؤنی پر برقرار رہا۔

سنہ ۱۸۰۶ء میں اس ریاست نے سرکار عظمت مدار سے اپنا توسل پیدا کیا اور ذریعہ کپتان بیلی۔ آنریبل گورنر جنرل بہادر سے بعض معاہدات کیے جس کی تفصیل عہدنامجات جلد سوم متعلق بندیلکھنڈ میں ملاحظہ ہو۔

جب نواب نصیر الدولہ شیر جنگ بہادر کا انتقال ہوا تو سنہ ۱۸۱۵ء میں ان کے صاحبزادے نواب غلام قادر خاں امیر الملک بہادر اور ان کے بعد سنہ ۱۸۳۵ء میں آپ کے صاحبزادے نواب محمد حسین خان بہادر جانشین ہوئے نواب صاحب موصوف نے سنہ ۱۸۵۶ء میں اپنے فرزند نواب مہدی حسین خاں المخاطب امام الدولہ بہادر کو اپنا قایم مقام مقرر فرمایا۔

نواب محمد حسین خاں بہادر والی ریاست باونی کا انتقال اگسٹ سنہ ۱۸۵۹ء میں ہوا۔ نواب مہدی حسین خاں امام الدولہ بہادر کو سنہ ۱۸۶۲ء میں سند تعین وراثت عطا ہوئی۔

نقل سند ملاحظہ ہو۔

سند جو نواب مہدی حسین خاں امام الدولہ باونی والہ کو عطا ہوئی المرقوم ۱۱ر مارچ ۱۸۶۲ء۔

جناب ملکہ معظمہ کی یہ خواہش ہے کہ حکومت اکثر رئیسان و راجگان ہندوستان کی جو اب اپنے اپنے علاقہ میں حکمران ہیں واسطے دوام کے رہے اور شان و شوکت ان کے خاندان کی جاری رہے بہ تعمیل اس خواہش شاہنشاہی کے یہ سند تم کو دیجاتی ہے۔ جس کے رو سے اطمینان دیا جاتا ہے کہ درصورت نہ ہونے وارث اصلی کے گورنمنٹ انگریزی اس شخص کو منظور کرکے جانشین تمھارے علاقہ کا کرے گی جو از روے شرع محمدی کے جائز ہوگا۔ بشرطیکہ نصف آمدنی علاقہ اس سال کی بطور نذرانہ داخل ہوگی جب کہ مسند نشینی کسی وارث اصلی کی منائی جائے گی اطمینان رکھو کہ کوئی امر مخل اس شرط کا نہ ہوگا جو تم سے کی جاتی ہے جب تک تمھارا خاندان نمک حلال تخت و تاج شاہی رہے گا اور جب تک وہ شرائط عہد ناموجات و عطاناموجات واقرار ناموجات کی جو گورنمنٹ انگریزی سے ہوئے ہیں تعمیل بایمانداری کرتے رہیں گے۔

(از عہد ناموجات جلد سوم)

نواب مہدی حسن خان امام الدولہ بہادر نے ۱۸۸۳ء میں ریاست سے کنارہ کشی اختیار فرمائی اور حسب صوابدید سرکار عظمت مدار آپ کے صاحبزادے نواب محمد حسین خاں بہادر جانشین ہوئے۔ عرصہ دراز تک نہایت نیک نامی کے ساتھ ریاست کا انتظام فرماتے رہے آپ کی وفات پر آپ کے صاحبزادے ہز ہائینس اعظم الامرا فخرالدولہ معین الملک صاحب جاہ معین سردار نواب ریاض الحسن خاں ظفر جنگ بہادر۔ سریر آراے سلطنت باونی ہوئے۔ حضور ممدوح کے تفصیلی حالات آیندہ شایع کیے جائیں گے۔ اس ریاست کا رقبہ ایک سو بائیس مربع میل آبادی انیس ہزار سات سو اسّی۔ اور آمدنی ایک لاکھ روپے سے زائد ہے اور اس ریاست کے رئیس کو ۱۱ ضرب توپ کی سلامی کا بھی اعزاز حاصل ہے۔

حضرت آصفجاہ اول مغفرت مآب نور اللہ مرقدہٗ نے نہ صرف دکن ہی میں اپنی سلطنت کی بنا ڈالی بلکہ ہندوستان میں بمقام بندیلکھنڈ ایک اسلامی سلطنت چھوڑی جہاں بحمد اللہ اب تک آپ کی اولاد فرمانروا کا سلسلہ باقی ہے کیونکہ اس وقت تک حیدرآباد دکن میں عامۃ الناس بہت کم اس ریاست سے واقف ہیں اب مختصر حالات پر اکتفا کیا جاتا ہے کسی فرصت سے ریاست باونی کے تفصیلی حالات پیش کیے جائیں گے۔

شجرہ

۱۔ نواب محمد قمرالدین خاں نظام الملک آصفجاہ مغفرت مآب
۲۔ حافظ میر محمد پناہ غازی الدین خاں فیروز جنگ امیرالامرا نظام الملک
۳۔ میر شہاب الدین خاں غازی الدین خاں وزیر الممالک عماد الملک عماد الدولہ نصرت جنگ
۴۔ میر محمدی نصیرالدولہ شیر جنگ۔ (۵) غلام قادر خان امیرالممالک
۶۔ محمد حسین خاں بہادر (۷) مہدی حسین خان امام الدولہ
۸۔ محمد حسین خان بہادر ثانی (۹) فرمانروا رئیس باونی نواب ریاض الحسن خان ظفر جنگ بالقابہم۔

حکیم شفا مجددی

ایک بحر میں تین غزلیں

(۱)

محبت کا آغاز، سو سو بہانے — اچٹتی نگاہیں، ادھورے فسانے
میں کچھ کہہ رہا ہوں، میں کچھ سن رہا ہوں — یہ کیا گفتگو ہو رہی ہے، نہ جانے
ملائی گئی مے میں آنکھوں کی مستی — مٹائے گئے ہستیوں کے خزانے
پلٹ آئی شاید مری عمرِ رفتہ — وہی مست راتیں، وہی دن سہانے
بہاروں سے پت جھڑ گلے مل رہی ہے — چھپائے کہیں شاخِ گل آشیانے
مری روح کا قہقہہ بن گئے ہیں — لبوں پر سسکتے ہوئے سے ترانے
صراحی کوئی چھین لے اُن سے میکش — وہ اٹھے ہیں محفل میں ساغر اٹھانے

(۲)

محبت کے دن ہم نے یوں بھی گزارے — سمجھتے رہے نامکمل اشارے
نہیں یوں نہ معصوم کلیوں سے کہہ دو — تمہیں چومنے کو اترتے ہیں تارے
گھٹاؤں سے کھیلے ستاروں کو چومے — زمیں پر ہی برسائے بجلی شرارے

قدم لڑکھڑاتے تھے میکش کے لیکن — سنبھلتا رہا، لغزشوں کے سہارے

(۳)

یہ انداز تو، اک جہاں بن رہا ہے — کوئی مجھ سے کہہ دے کہاں بن رہا ہے
یہ کیا ہو گیا میرے سجدے کو یارب — یہیں اک نیا آستاں بن رہا ہے
جو گم کردہ منزل کا نقشِ قدم تھا — وہ اب رہبرِ کارواں بن رہا ہے
خزاں فرشِ گل کر رہی ہے چمن میں — چمن، دامنِ باغباں بن رہا ہے
محبت کے گیتوں پہ سر دھننے والے — اسی لئے میں ذوقِ فغاں بن رہا ہے

غریبوں نے اتنا نوازا کہ میکش
یقیں بھی یقینِ گماں بن رہا ہے

میکش

گُل بُوٹے

ایک بزرگ خاتون کئی برسانوں سے ایک ایسے مکان میں رہتی ہیں جو ایک دن برسے تو تین دن ٹپکتا ہے، بعداز خرابی بسیار اب گھر بدلنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی ہے۔ ہر ہفتے دو چار مکان دیکھ ڈالتی ہیں مگر کوئی جی کو نہیں لگتا "خدا کی قدرت" دیکھیے کہ ہمارا ابھی ایک گھر اسی اثنا میں خالی ہوا۔ ایک دن صبح سویرے کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھنے لگے وہ آئیں، اور گھر کے چپہ چپہ کو خیاباں خیاباں ارم کرنے لگیں" ہر کمرے میں دس پندرہ منٹ ٹھہرتیں، سانس کو ٹھیک کرتیں، در و دیوار کو، دیکھتیں، اپنے آنے والی ضرورتوں کا اندازہ لگائیں، یہاں تک کہ کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے لیٹنے سونے، اللہ اللہ کرنے وغیرہ وغیرہ کے لیے کمروں کی نام رکھائی بھی ہوگئی، ہم نے یہ سمجھا کہ مدظلہا کو گھر پسند آگیا ہے اور ہم دل ہی دل میں اس کے کرایہ پراٹھنے کی خوشی منا ہی رہے تھے کہ یوں گویا ہوئیں۔

"گھر بڑا سہانا ہے، صحن خاصا ہے، دالان اور کمرے قرینے کے ہیں کیا اچھا ہوتا جو کچھ اور گنجائش بھی ہوتی"! ہم نے پوچھا" اور کس قسم کی گنجائش چاہیئے، ؟

فرمایا ——میری چھوٹی بیٹی کے میاں مجھ سے بہت مانوس ہیں، یوں تو دوسرا گھر کر لیا ہے مگر ان کا روز کا آنا اور بچوں کے ساتھ میرے پاس کا کھانا پینا کبھی نہیں ٹلتا! میری بیٹی کی نشانی بیچارے وہی تو رہ گئے ہیں!! اللہ رکھے نواسہ نواسی بھی موجود ہیں۔ مگر داماد آخر داماد ہی ہوتا ہے! ان کے اٹھنے بیٹھنے کے لیے دو تین کمرے اور ہوتے تو اچھا تھا!!!

ہم نے دریافت کیا" یہ کمرے آپ کس قسم کے چاہتی ہیں" ؟

جواب ملا " اگر آپ تین معمولی کمرے ٹین کی چھت ڈال کر بنوا دیں گے تو میں اس گھر سے کبھی نہ جاوں گی، کرایہ ساٹھ کے عوض سو روپے لیجئے!

ہم نے عرض کیا " اگر آپ سو روپے کرایہ دیں اور تین سال کی گیارنٹی لکھ دیں تو ہم ایک مہینے کے اندر کمرے بنوا دیتے ہیں" بولنے لگیں "میری بات پتھر کی لکیر ہوتی ہے" قول مرداں کی مثل مشہور ہوگئی ہے لیکن اس کی حقیقت نقش بر آب، سے زیادہ نہیں ہوتی"! سو روپے کے کرایہ کے خیال سے ہم نے اس قول کی تردید نہیں کی مگر ان مناتے ہوئے عرض کیا۔

"آپ سچ فرماتی ہیں جب ہی تو دنیا میں یہ طوفان اٹھ رہے ہیں" !!

ہم کچھ اور کہنے کو تھے کہ ہماری بولتی بند ہوگئی جب مدظلہا بات کاٹ کر یہ فرمانے لگیں۔

"گھر کی چھتیں کچھ ٹھیک نہیں ہیں، میرے فیملی ڈاکٹر نے مجھ کو سخت تاکید کی ہے کہ ایسے گھر میں نہ رہوں جس کی چھتوں میں لوہے کی ناٹمیں ہوں! کیا یہ ہوسکتا ہے کہ آپ ان کی جگہ لکڑی کی ناٹمیں لگوا دیں" ؟

اس فرمائش سے ہم چپ کنم ہوگئے اور انھیں "قیامت کے فتنہ کی طرح سر سے پاؤں تک تکنے لگے۔ جب یہ دیکھا کہ وہ ماشاء اللہ جواب کی منتظر ہیں تو کہنا ہی پڑا۔

"ایک دو دن سوچ کر عرض کیا جائے گا"۔

ہم اس ادھیڑبن میں ہی تھے کہ دوسرے دن مذطلہا نے لکھ بھیجا ۔ فیملی ڈاکٹر کی رائے نہیں ہے کہ میں ایسے مکان میں جاؤں جس میں سے بیم نکال کر لکڑی لگائی گئی ہو، اس وجہ سے کے ایسا کرنے سے چھتیں کمزور ہو جاتی ہیں لہذا ابھی چھتوں میں لکڑی لگانے کا کام شروع نہ کیا جائے"!!

ایک شاعروں کے "قدر دان" بزرگ کسی جگہ رونق بزم تھے، طوائف صفی لکھنوی کی غزل گا رہی تھی جس کا مطلع ہے۔

"یہ درد عشق نے پہلے ہی کہہ رکھا تھا اس دل سے ٭ کہ موت آئے گی آسانی سے دم نکلے گا مشکل سے"

آپ جھوم جھوم کر "داد کلام" دے رہے تھے، جب اس نے مقطع گایا۔

پلٹ کر عمر رفتہ کو صفی آواز دیتا ہوں ٭ نکل آیا ہوں اپنی رو میں اتنی دور منزل سے

آپ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا، اپنے ایک دوست سے جو آپ کے بازو بیٹھے تھے فرمایا۔

" بھئی عجب مہمل شعر ہے! کچھ مطلب ہی نہیں نکلتا"!!

دوست نے کہا "بھائی صاحب شاعر نے بڑی نازک بات کہی ہے کہ کس طرح تغافل شعار انسان دنیا کی بھول بھلیوں میں پھنس کر زندگی کی منزل سے دور نکل جاتا ہے اور آخر عمر میں پچھتاتا ہے جب کہ اس کے بس میں کچھ نہیں ہوتا" شاعری کی یہ موٹی موٹی باتیں" آپ کے نازک دماغ میں بھلا کیسے آسکتی تھیں! مگر آپ نے اس انداز سے سراقدس کو جنبش دی گویا سب کچھ سمجھ گئے ہیں!!

دوسرے روز صبح میں بیدار ہوتے ہی آپ کی محترم بیگم کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ آپ اُلٹے پاوں چل رہے ہیں! سبب پوچھا تو فرمایا۔

"رات کو دعوت میں ایک شعر سنا تھا معلوم ہوا کہ انسان کی گزری ہوئی عمر اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہے! چنانچہ شاعر آخر عمر میں اپنی "عمر رفتہ" کو پلٹ پلٹ کر پکارتا ہے۔ میں نے کل کی رات ہی سے یہ عمل شروع کر دیا ہے!! اب تک تو وہ "کمبخت نظر نہیں آئی۔ پلٹ پلٹ کر بار بار دیکھنے کی زحمت سے بچنے کے لیے میں نے الٹے پاؤں چلنا شروع کر دیا ہے تاکہ "وہ" نظر آتے ہی پکڑ لوں! کیوں ہے کیسا آسان طریقہ "اعادہ شباب" بلکہ اعادہ طفلی" کا میں نے سوچا ہے"!!

باغبان

تنقید و تبصرہ

بہاراں

تقطیع ۔ ۲۰×۸ ۔ صفحے ۔ نفیس لکھائی چھپائی۔
مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ ۔ قیمت (۳ روپئے)

یہ خان بہادر مرزا جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی' کے کلام کا مجموعہ ہے ۔ جو کئی حیثیتوں سے موجودہ اردو شاعری میں اہمیت رکھتا ہے۔

غزل پر جو تنزل آتشؔ اور ناسخؔ کے بعد سے طاری ہونے لگا تھا' اس کو توڑنے میں غالب کی شاعری کو جتنا دخل ہے' اتنا ہی دخل اس کو' محاورہ بندی کی بے مزہ تک بندیوں کے اثر کو گھٹانے اور شعر میں خیال کی اہمیت کو بڑھانے میں ہے غالبؔ کی شاعری سے لوگوں کے ذہن جس قدر مانوس ہوتے گئے' اردو غزل میں نئی نئی راہیں کھلنے لگیں۔

اس وقت یہ اثرات فضا میں پھیلے ہوئے ہیں' اور شعوری یا غیر شعوری طور پر' اردو شاعر ان سے متاثر ہو رہے ہیں ۔ چنانچہ اس زمانے کے بعض شعرا کے کلام میں غالب کی شاعری کے خاص خاص پہلو نمایاں نظر آتے ہیں۔

اصغر گونڈوی' مرحوم نے غالب کی جدت طرازانہ اور ایک حد تک فلسفیانہ راز فکر کو نمایاں کرنے کی کوشش کی' اور فانیؔ کی شاعری میں غالب کے کلام کا قنوطی پہلو بہت زیادہ گہرا ہو گیا ہے ۔ جگرؔ اور اثرؔ' پر یہ اثرات راست نہیں پڑے ۔ تاہم غالب کے بعد سے اردو غزل کے ارتقا پر نظر والے' تغزل کی اس وسعت کے رشتے کو جس کا ان شعرا کے پاس ثبوت ملتا ہے' غالب کے بواسطہ اثر کے سوا کسی اور ماخذ سے نہیں جوڑ سکتے۔ زیر نظر مجموعے میں بھی' ترکیبوں' زمینوں اور مضامین میں جگہ جگہ یہ اثرات کارفرما نظر آتے ہیں۔

اثرؔ کے کلام میں' فضائی رجحانات' کا غیر معمولی اعتدال' اس سبب سے پیدا ہو گیا ہے کہ انہوں نے' میرؔ کی سادہ بیانی کو اپنا سطح نظر قرار دیا ہے ۔ نام اور سرنامے کے اشعار کے علاوہ ذیل کے شعر سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے

دل کش نہ ہو کیوں کلام اثرؔ کا   سیکھا ہے یہ اس نے میرؔ سے فن

"بہاراں" میں بہت سے اشعار اور غزلیں ایسی موجود ہیں جو یہ ظاہر کرتی ہیں کہ شاعر بار بار اپنے ماحول سے نکل کر' اسی قدیم شعری فضا میں اپنے آپ کو پہنچانا چاہتا ہے' جو اس کا نصب العین ہے ۔ اور یہاں سے وہ الہام حاصل کرنا چاہتا ہے ۔ اس کوشش میں ہماری زیادہ بسیط اور پیچیدہ معاشرت میں رہنے والا شاعر' جس قدر کامیاب ہو سکتا ہے' اتنی کامیابی اثرؔ کو بھی حاصل ہوئی۔

اثرؔ' میرؔ کی طرح' ایک غنائی شاعر ہیں ۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری کا مطالعہ کرتے وقت یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہئے کہ شاعری اگر پیشے کے طور پر بھی اختیار کی جا سکتی ہے' تو اثرؔ کی شاعری ذوق کی شاعری ہے ۔ پیشے میں زندگی کے دوسرے مسائل سے ان کا واسطہ ہے۔

اثرؔ کی شاعری میں لکھنؤ کی شستہ اور ثقہ طرز فکر کے ساتھ ساتھ میرؔ کی سادہ خیالی اور سادہ بیانی کے پیوند نے بڑا لطف پیدا کر دیا ہے اور اس میں' کہیں کہیں لفظی رعایتوں کی پابندی سے' لکھنؤ کے گذشتہ دور شاعری کے ساتھ اس کا رشتہ مستحکم ہو گیا ہے ۔ اثرؔ کی طبیعت کی روانی کا پتہ ان کی طویل غزلوں سے چلتا ہے جو اس مجموعے میں بہت خاصی تعداد میں موجود ہیں ۔ بعض غزلیں مسلسل بھی ہیں ۔ اور اکثر ایسی غزلوں میں جو مسلسل نہیں ہیں' بے ربط خیالات کی تہ میں طبیعت کے وقتی تاثر کی یکسانیت کا رشتہ موجود ہے'

غزل کے تمام اساتذہ کی طرح' اثرؔ نے بھی' اپنے عاشقانہ اور غنائی انداز کو ماحول کے تاثرات کا پردہ بنایا ہے ۔ غزل کے وسیع اور منتشر مضامین کے درمیان' ان کا ایک ذاتی احساس' خاص طور پر ہر جگہ نمایاں نظر آتا ہے' اور یہ "بہار" سے اثر پذیری ہے ۔ نہ جانے شاعر نے کتنے وسیع تصورات میں بہار کا رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے۔

"س"

ارمغان حجاز :- از علامہ اقبال۔ لکھائی چھپائی بانگ درا کی سی ہے۔ صرف اسقدر فرق ہے کہ اس کا خط بانگ درا کے خط سے جلی ہے اور یہ (۲۸۰) صفحات پر مشتمل ہے اور بانگ درا کی بہ نسبت اسکی نظموں کے عنوانوں میں زیادہ ہم آہنگی اور پختگی خیال ہے ارمغان حجاز میں کوئی دیباچہ نہیں ہے۔ اسکو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے پہلا حصہ فارسی کلام کا ہے اس میں حضور حق، حضور رسالتؐ، حضور ملت، حضور عالمؑ انسانی بہ یاران طریق کے عنوان کے تحت نظمیں لکھی گئی ہیں، ان نظموں کا ماحصل یہ ہے کہ اقبالؒ نے وہی اپنے دلپذیر پیرایہ میں عقائد اسلامی کے راز کا انکشاف کیا ہے خودی کو پہچاننے، افراد کو قرآنی تعلیم اور نبی کریم صلعم کے اسوہ حسنہ سے محکم کرکے ملت کو "انا الحق" کہنے کا دعویدار بنانے کی اقبال نے تلقین کی ہے۔ بہ حضور حق و بہ بارگاہ نبی کریم صلعم وہ عامی مسلمان کی زبان حال سے شکوہ آمیز التجا بڑی لطافت و دل پذیر پیرایہ میں کرتے ہیں۔ وہ عامی مسلمان کی اس لئے عذر خواہی کرتے ہیں کہ وہ اس دنیا کے کیوں اور کس لئے کے سمجھے حل کرنے میں مبتلا ہے۔ نیکی اور بدی کے اور عقل و دل کے درمیان ان کا دل فطرتاً متحیر و مضطرب رہتا ہے۔ ہندوستانی مسلمان کے لئے وہ زیادہ رحم و کرم کے طالب ہیں کیونکہ یہ نہایت بلندی سے گرا ہوا اور دردمند دل رکھنے والا مسلمان ہے۔ ہندی مسلمان سے عدم تنظیم آپس کے نفاق۔ عدم موجودگی قائد ملت کی انہیں شکایت ہے وہ اس کی جیب میں درم دیکھتے ہیں نہ ہاتھ میں تلوار۔ نہ قرآنی تعلیم سے اسکو آشنا پاتے ہیں ان کو تعجب ہو رہا ہے کہ وہ مسلمان ہو کر کس طرح بے "اللہ ھو" کے جی رہا ہے۔ علامہ اقبال اس اسیر غلامی کی اللہ و رسول سے مدد کے طالب ہیں۔ وہ دعا کرتے ہیں کہ ان کا سوز مسلمانوں کے دل میں تکبیر کی آگ بھڑکا دے اور ان کا یقین ایمان مسلمانوں کے دلوں میں پیدا ہو جائے۔

ارمغان حجاز کا دوسرا حصہ اردو نظموں کا ہے۔ اس کی پہلی نظم ابلیس کی مجلس شوری سے شروع ہوتی ہے۔ اس میں موجودہ سیاسی نظام پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ یورپی جمہوریت کو اقبالؒ ملوکیت کی ایک دوسری شکل سمجھتے ہیں اور ملوکیت کی تعریف وہ یوں کرتے ہیں۔

مجلس ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو ہے وہ سلطان غیر کی کھیتی پہ ہو جسکی نظر

وہ روسی اشتراکیت کے فلسفے کا جواب اٹلی کے فاسٹی نظام میں دیکھتے ہیں ان کی دوربین آنکھیں اشتراکیت کو خطرہ فردا نہیں سمجھتیں بلکہ وہ اپنے اسلامی دور جدید کے اپنے قدیم خواب کی تعبیر کے منتظر ہیں اور کہتے ہیں۔

جانتا ہے جس پہ روشن باطن ایام ہے مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے

اسلام کے قوانین شرعیہ میں ان کو وہ تمام خصوصیات نظر آ رہی ہیں جن کے پھیلنے کے لئے عصر حاضر تقاضا کر رہا ہے۔ یہ پیشگوئیاں ہیں جن کو اقبال جیسے دیدہ ور شاعر نے مدتوں پہلے بیان کیا تھا اور آج ہم اپنی آنکھوں سے یورپ کا نقشہ بدلتا ہوا دیکھ رہے ہیں اس ارمغان میں انہوں نے پھر اپنی قدیم پیشین گوئیوں کی یاد تازہ کی ہے۔ ان سے استفادہ کرنا یقیناً ہر سمجھدار انسان کا فرض ہے کیونکہ

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اس اردو کلام کے حصے میں اور نظمیں مثلاً بڈھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو، تصویر اور مصور، عالم برزخ وغیرہ مکالمے کے طرز کی نظمیں پڑھنے کے قابل ہیں بعض اردو نظموں کے عنوانین گنجلک پیدا ہو گیا ہے یہ عنوان کہ "ملا زادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض" اس کے پڑھنے والے کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ گویا ایک بیاض پر نظم لکھی گئی ہے مگر پڑھنے سے معلوم ہوا کہ ناشر کا مقصد وہ چیدہ چیدہ اردو فارسی ابیات ہیں جو ملازادہ کے بیاض سے ماخوذ ہیں۔ اسی طرح ایک اور نظم سر اکبر حیدری صدر اعظم حیدر آباد دکن کے متعلق ہے جس کے تحت دو سطروں میں حسب ذیل عبارت ہے "یوم اقبال کے موقع پر

توشہ خانہ حضور نظام کی طرف سے جو صاحب صدر اعظم کے ماتحت ہے ایکہزار روپئے کا چک بطور تواضع وصول ہونے پر" یہ جملہ ناقصہ واضح ہوجاتا اگر کبھی گئی اس کے ساتھ لکھدیا جاتا۔ اسی طرح کتاب کے آخر صفحہ پر صرف عبدالمجید پروین رقم لکھا ہوا ہے اگر اس کے ساتھ کاتب کا لفظ لکھدیا جاتا تو اس نام کے لکھے جانے کی خصوصیت ظاہر ہو جاتی۔ بہر حال قطع نظر طباعت کی بعض غلطیوں کے ارمغان حجاز شور رومی سوز خسرو اور اخلاص سنائی رکھنے والے دل درد آشنا شاعر کے اردو فارسی کلام کا بہترین گلدستہ ہے۔

(ڈاکٹر محمد عبدالمعید خان)

شاعر کی دنیا۔ چالیس شعرا کی بزم ہے۔ جس کو محمد عظیم الدین صاحب محبت نے آراستہ کی ہے۔ مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس قیمت ۱؍

پیش لفظ جناب ماہر القادری نے پیش کیا ہے۔ جو بجائے خود شاعرانہ نثر کا ایک دلچسپ ٹکڑا ہے اس میں تسک نہیں "بدعت" تو ہوئی ہے صاحب موصوف سے۔ مگر بقول خود ان کے چوک ہوچکی ہے اور اب خمیازہ بھی غالباً انھیں کو بھگتنا پڑے گا۔ پیش لفظ کے بعد محبت صاحب کا عرض حال ہے۔ پھر اُن کی تصویر ہے۔ اس طرح صفحہ (۱۱) سے شعراء کی صف کا آغاز اجلال کے کلام سے ہوا ہے۔ نمونۂ کلام سے پہلے مختصر طور پر حالات زندگی بھی درج ہیں اجلال صاحب کا یہ شعر تصوف کے رنگ میں خوب ہے ؎

کب تک سنیں یہ دیر و حرم کی حکایتیں　　اُٹھّو نقاب ختم ہو یہ داستاں کہیں

پھر اختر و اشک والم ہیں اور امجد کی دنیا ہی سب سے الگ ہے یہ بالکل انوکھے رنگ میں جلوہ گر ہیں۔ کہیں "گزار دے" پر تضمین کی مرصع بندش ہے۔ ان کے رباعیات تصوف کی جان ہیں۔ جن سے دنیا سے بیزاری، قناعت و سکون قلب کا رنگ جھلکتا ہے۔ پھر تو باقی کے فاؤسٹ کا آزاد ترجمہ ہے۔ تابش، تدبیر، جعفر کے بعد استاد جلیل ہیں۔ جن کے کلام میں امیر مینائی کے تیور ہیں۔ خصوصاً یہ دو شعر کتنے پاکیزہ ہیں ؎

کیا کہوں مرمر کے جینے کا مزہ　　اے خضر یہ زندگانی اور ہے

یوں تو سب کچھ ہے زبان شمع پر　　کہتی ہے جو بے زبانی اور ہے

حامد کے نالے یہاں سے بلند ہوتے ہیں۔ یہ صاحب دہائی دیتے ہوئے نکلے ہیں۔ حرماں و حزیں کے کلام میں ان کے تخلص کا عکس نمایاں ہے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ تمناؤں میں بھی اُلجھے ہوئے ہیں۔ حسرت تو اسم بامسمیٰ معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی دونوں غزلوں میں یاس والم کا رنگ نمایاں ہے۔ آخر میں ایک ہی شعر جو دیا ہے وہ بہت اچھا ہے ؎

مختاری اس کو کہتے ہیں مجبوری نام اسی کا ہے

جو تم نے چاہا ہو کے رہا جو ہم نے چاہا ہو نہ سکا

خیالات میں اکبر آبادی کے انداز ہیں۔

رشید ترابی کے شکوہ کا جواب "شاعر کی دنیا" کا بلیغ ترین سرمایہ ہے اقبال کا جواب ہے اور اقبال کے ہی رنگ میں۔ ڈاکٹر زور کی نظم "چاندنی" میں چکبست کی شاعری کا پرتو ہے۔ خصوصاً یہ شعر کتنا مرصع ہے ؎

نشتر سے میرے دل میں چبھوئے ہوئے سے ہیں

نغمے مرے رباب میں سوئے ہوئے سے ہیں

زیبا، ساز، سعید، صدق، صفا، صفی، عارف، عرش، عزیز، علی اور غیور کے بعد فانی ہیں جن کے لئے خود مؤلف نے لکھا ہے۔ "دور حاضرہ کے امام المتغزلین ہیں"۔ ان کے کلام کا قنوطی پہلو اپنے گہرائیوں میں میر کی شان لئے ہوئے ہے۔ ان کے یہاں ایک فلسفہ ہے۔ ان کی شاعری غم والم یاس و حرماں کا مرقع ہے۔ دونوں غزلیں اس مجموعہ میں ان کی اچھی ہیں۔ خصوصاً دوسری غزل کا یہ شعر ؎

زندگی کی دوسری کروٹ تھی موت　　زندگی کروٹ بدل کر رہ گئی

شاعر کے لئے آلام حیات اور آرزؤں کی پامالی بہت ضروری ہے۔ اس کے بغیر صحیح جذبات بیدار ہی نہیں ہوتے پھر قتیل ہیں جن میں فانی کی

بوباس پائی جاتی ہے ۔ یہ شعر ان کا اقبال کے تخیل کی غمازی کرتا ہے ؎

وہاں دل شاکئی تاب تکلم　　خموشی بھی جہاں اک داستاں ہے

آخر تو فن شاعری کے ماہر ہی ٹھیرے ۔ ان کی زبان کا شباب اور

بانکپن بے حد سحور کن ہے مثلاً ؎

اک بار تجھے عقل نے چاہا تھا بھلانا　　سو بار جنوں نے تری تصویر دکھادی

یہ ویرانہ، یہ سناٹا، یہ وحشت خیز خاموشی　　عزیزوں نے میری میت کو کیا سمجھا کہاں رکھ دی

تری محفل ناز سے اٹھنے والے　　نگاہوں میں تجھ کو لئے جارہے ہیں

ان کے بعد جامعہ عثمانیہ کے وہ مایۂ ناز شاعر ہیں جن کا نام ہی تخلص

میں مل جل گیا ہے ۔ ان کے سوت کا گیت اور انتظار دونوں کا کیا پوچھنا

پھر تو میکش کی "ہنسی" ہے جو غالباً ان کا ایک ایسا ہی شہ کار

ہے جیسے اقبال کا شکوہ اور جواب شکوہ نظر کے نمونۂ کلام پر یہ شاعری کی

دنیا ختم ہو جاتی ہے ۔

شاعری جزویست از پیغمبری کی دلیل کو اگر تسلیم کر لیا جائے تو

اب حد نظر تک ہمیں اس میدان میں پیغمبر ہی پیغمبر نظر آتے ہیں ۔ ذوق

شاعری کے ہر دلعزیز ہو جانے سے مستقبل روشن نظر آتا ہے ۔ ادب میں

قوت پھیلنے سے آتی ہے ۔ لیکن بعض نوخیز شعرا کے کلام کو دیکھ کر ہمت

پست ہوئی جاتی ہے ۔ کلام مبتدی سہی مگر عامیانہ نہو ۔ خیالات میں روانی

کیساتھ مہذب وشستہ مذاق، وقار و متانت کی بہت سخت ضرورت ہے

جذبات کے حقوق پامال ہونے کے لئے نہیں ہیں ۔ محسوسات کسی ٹھیس کے بھی

متحمل نہیں ہوتے ۔ شاعر کا کلام اسی دل کی دنیا کا عکس ہوتا ہے ۔ اُس کو

جہاں تک ممکن ہوسکے پاکیزہ تر اور لطیف ہونا چاہیئے ۔

بہرکیف یہ مجموعہ بھی رطب ویابس کے زنجیرے کی ایک کڑی

ہے ۔ تاہم فاضل مؤلف کے خدمات قابل قدر ہیں ۔　　(ج)

کربلا کے بعد ۔ مصنفہ سید عزیز حسن بقائی صاحب ۔ مقام اشاعت

رسالہ پیشوا ۔ جامع مسجد ۔ اردو بازار ۔ دہلی سنہ ۱۹۳۹ء قیمت (عمر)

تمہید سے معلوم ہوتا ہے کہ پیش نظر کتاب انہیں مصنف کی ایک

تصنیف "سیدہ فاطمہؓ کا لال عرف مظلوم کربلا" کا دوسرا حصہ ہے ۔ مصنف

نے سبب تالیف یہ ظاہر کیا ہے کہ ان کا مقصد اہل بیت اطہار رضی اللہ عنہم

کی تاریخ اور ان کی مظلومیت کی داستان بیان کرنا ہے ۔ اسی وجہ سے گو انہوں نے

تمام اموی اور عباسی خلفاء کی مختصر تاریخ بیان کی ہے مگر اپنے مقصد کو کبھی

ہاتھ سے نہیں دیا، بلکہ ہر خلیفہ کے عہد میں بنو علیؓ پر جو گذرا اُسے کافی تفصیل سے

بیان کیا ہے، اور جہاں تک ہو سکا ہے ہر واقعہ کے اسباب و علل پر بھی بحث کی

ہے ۔ مگر بعض مقامات پر الزام لگاتے وقت ثبوت پیش نہیں کیا گیا ۔ صرف ممکن

ہے لکھ دینا جیسا کہ صفحہ ۸۸ اور صفحہ ۹۲ پر کیا گیا ہے، کافی نہیں، یا تو الزام ہی

نہ لگائیے اور اگر لگائیے تو ثبوت ضرور پیش کیجئے ۔ مصعب بن زبیر کو اس وجہ

سے قتل نہیں کیا گیا تہا کہ وہ حضرت سکینہ کے شوہر تھے، بلکہ وہ ایک جنگ

میں جس کے اسباب خالصتہً سیاسی تھے، عبد الملک کی فوج کے مقابلے

میں لڑتے ہوئے شہید ہوئے تھے، اس واقعہ کو اس رنگ میں پیش کرنا جس سے

عبد الملک اہل بیت اطہار کا دشمن ثابت ہو، درست نہیں کہا جاسکتا ۔ بنو عباس

کے زمانے میں بنو علیؓ اور خاندان خلافت ہی کے درمیان جو واقعات پیش آئے

ان میں بھی سیاسی رُخ پر غور و فکر نہیں کیا گیا، اور ہر واقعہ اس رنگ میں

پیش کیا گیا ہے گویا کہ یہ خلفاء اہل بیت کے دشمن تھے ۔ یہ ضرور ہے کہ خلفاء

عباسیہ نے بنو علیؓ پر زیادہ سخت نگرانی رکھی تھی، مگر اس کے اسباب بھی تھے ۔

خود مصنف صاحب نے اکثر جگہ ذکر کیا ہے کہ متعدد موقعوں پر باوجود اس

کڑی نگرانی کے، کسی ظاہری سبب کے بغیر بنو علیؓ کے مختلف افراد کی

طرف سے کشت وخون کے واقعات پیش آئے تھے ۔ مثلاً ص ۲۱۴ سے

۲۱۶ ملاحظہ ہو ۔ کیا ہر حکومت کا فرض نہیں کہ اس قسم کے فسادات سے بچنے

کے لئے احتیاط برتے؟ آخر میں اس کتاب کے ماخذوں کی ایک فہرست

دی گئی ہے ۔ جن میں یزید نامہ، سنین الاسلام، تاریخ الامت، سکینہ بنت حسین

جیسی کتابوں کو ماخذ کہنا ظلم ہی ہوگا ۔

بہرحال کتاب بحیثیت مجموعی دلچسپ ہے، اور ہمیں امید ہے کہ آئندہ ایڈیشن زیادہ مفید ہوگا ۔

(پروفیسر جمیل الرحمٰن)

ہندوستان کی صنعت اور تجارت :- از منت اللہ صاحب رحمانی ایم - ایل - اے - چھوٹی تقطیع - لکھائی چھپائی عمدہ حجم ۲۱۲ صفحات قیمت درج نہیں - پتہ - مکتبۂ سیفیہ - مونگیر (بہار)

اس کتاب کی تالیف کی وجہ جناب مؤلف نے دیباچہ میں یہ بیان کی ہے - " غالباً ہندوستان کے تجارتی اور صنعتی حالات اب تک اردو زبان میں اس طرح یکجا نہیں کئے گئے جن کا علم ہر ایک ہندوستانی کے لئے بہت ہی ضروری ہے " اسی خیال کے تحت قابل مؤلف نے ہندوستان کی اقسام کی تجارتوں اور صنعتوں کی درآمد برآمد کے اعداد و شمار کئی سال کی محنت اور جستجو کے بعد جمع کئے ہیں اور نہایت عمدہ پیرایہ میں ان کو بڑی وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کتاب کیا ہے زمانہ قدیم سے لیکر آج تک کی تجارت اور صنعت و حرفت کی مختصر تاریخ ہے۔ اس کتاب کی ابتدا مغل بادشاہوں کے زمانے کی تجارت اور صنعت و حرفت سے ہوتی ہے اس دور کے قبل کی تجارت وغیرہ کا مختصر خاکہ بھی دیا گیا ہے - مغلیہ دور کے مختلف یوروپین اور انگریز سیاحوں کے بیانات کا بھی درج ہے - آخر میں ایسٹ انڈیا کمپنی اور اوس کے بعد کے زمانے میں ہندوستان کی تجارت اور صنعت و حرفت کی جو تباہی اور بربادی ہوئی اُس پر صراحت سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ بہ حیثیت مجموعی یہ کتاب کارآمد اور دلچسپ ہے - "س"

ماہنامہ تصویر :- رام پور بابتہ ۱۵ - اکٹوبر سنہ ۱۹۳۹ء مرتبہ برق زیدی حجم ۵۷ صفحات قیمت سالانہ عہ

" تصویر " کا یہ پہلا نمبر ہے ہمیں امید ہے کہ جناب برق اپنی برقی قوت سے بہت جلد اس " تصویر " میں علم و ادب کی روح پھونک دینگے ' زیر نظر نمبر میں بعض مضامین نظم و نثر کہنہ مشق لکھنے والوں کے قلم کے منت کش ہیں - پہلا مضمون " ہندوستانی نوجوانوں سے " پروفیسر رام سروپ کوشل ایم - اے - نے لکھا ہے ' نوجوانوں کے لئے یہ مقالہ سبق آموز اور بصیرت افروز ہے - نجم الحسن بی - اے - نے " موجودہ تعلیم کے اثر " پر جو کچھ لکھا ہے وہ اس قابل ہے کہ ہر طالب علم اس کو غور سے پڑھے اور سمجھے - بشر ایم - اے کا مختصر ڈراما " نوجوانوں " غریب مزدوروں کی کس مپرسی اور ظالم سرمایہ داروں کی عیش پرستی کی اچھی تمثیل ہے - حصہ نظم میں صفدر ' دل ' بلقیس جمال ' شرف زیدی ' ولایت ' نگہت ' بہزاد ' وفا وغیرہ کی اخلاقی نظمیں اور رنگین غزلیں نتیجہ خیز اور کیف آور ہیں - "س"

معین ہفتہ وار :- (عرس نمبر) مرتبہ خواجہ ضیا ' حجم ۴۲ صفحات قیمت ۲/

حضرت خواجہ اجمیری رح کے عرس کے موقع پر معین ہفتہ وار نے اپنا یہ " عرس نمبر " نکالا ہے ' اس میں تقریباً جملہ مضامین حضرت خواجہ رح کے حالات زندگی ' ان کے مقالات ' ان کا تصوف ' ان کی تصانیف اور شاعری ' اون کے روحانی کمالات وغیرہ پر مشتمل ہیں ' ان متبرک مضامین کے ساتھ ساتھ " جنسی امراض " اور مقویات کے اشتہار حد درجہ بدنما ہیں - ایک جگہ سفوف اور گولیوں کا اشتہار ایک گھنٹہ قبل کھانے کی ہدایت کے ساتھ نہایت شرمناک ہے - "س"

ماہنامہ البیان :- امرتسر بابتہ ماہ نومبر سنہ ۱۹۳۹ء مرتبہ محمد حسین صاحب - حجم ۷۲ صفحات قیمت سالانہ تین روپے

امت مسلمہ امرتسر کا یہ ماہواری پرچہ ہے - اس کے شروع میں حالات حاضرہ پر ایک مختصر دلچسپ نوٹ ہے - اس میں آل انڈیا ریڈیو کی زبان پر اچھا تبصرہ کیا گیا ہے - " قرآن اور فصاحت و بلاغت " کے عنوان سے ایک طویل مقالہ فیروزالدین صاحب نے لکھا ہے - اس میں آیات قرآنی کی روشنی میں کفار عرب کے ہفوات ' صفات قرآن کا مقصد ' قرآن کی زبان وغیرہ پر وضاحت کے ساتھ لکھا گیا ہے اور اسی سلسلہ میں بعض یوروپین فلسفیوں ' پروفیسروں وغیرہ کے تاثرات بھی درج کئے گئے ہیں - رسالہ کے آخر میں " تفسیر بیان للناس " کو بہ

اقساط شائع کیا جا رہا ہے۔ "س"

تعلیمی گزٹ:۔ نئی دہلی مرتبہ پروفیسر ایم۔ اے۔ قریشی صاحب دہلوی

زیر نظر نمبر میں جناب اخلاق دہلوی پرنسپل اورنٹیل کالج نئی دہلی کا مرتبہ رسالہ "اردو مضمون نگاری" سب رس کے سائز کی ۴۶ صفحوں پر شائع ہوا ہے۔ یہ رسالہ ٹیکسٹ بک کمیٹی صوبہ دہلی کا منظور شدہ ہے اس کی قیمت دس آنے ہے' ادبی سوسائٹی نئی دہلی سے ملسکتا ہے۔

جناب اخلاق نے اس رسالہ میں مضمون نگاری کے اصول' لکھنے کے اوقات اور مقامات' مضامین کے خاکے' مضمون نگاروں کی قسمیں ہاتھ کی لکیروں کی روشنی میں' مختلف مضامین کے نمونے' فن تقریر' شاعری' تعلیم' مصوری' وغیرہ پر وضاحت کے ساتھ لکھا ہے۔ رسالہ کے آخر میں دنیا کا صرف اقالیم کی حد تک مختصر جغرافیہ بھی بیان کیا ہے' کچھ حالات دہلی کے بھی لکھے ہیں فوقانی جماعتوں کے مضمون نگاری سے دلچسپی رکھنے والے طلبہ اس رسالہ سے کچھ نہ کچھ استفادہ کر سکتے ہیں۔ "س"

ناموران اسلام:۔ مصنف محمد حسین خانصاحب (جامعی) اڈیٹر پیام تعلیم دہلی چھوٹی سائز حجم (۲۸۸) صفحے کتابت' کاغذ وغیرہ دیدہ زیب' مجلد قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے' اس میں ناموران اسلام کے حالات شائع کئے گئے ہیں' ان میں مفسر[۴] محدث[۴] فقیہ[۲] علما[۴] مصلحین[۴] صوفیا[۴] خلفا[۴] سلاطین[۳] وزرا[۲] سپہ سالار[۴] جہاز ران[۱] مورخین[۵] فلسفی[۳] طبیب[۲] سائنس دان[۱] سیاح[۲] شعراء[۵] ادیب[۴] مدبرین[۲]۔ شامل ہیں جملہ تعداد (۶۰) ہے۔

یہ کتاب بچوں کے لئے مرتب ہوئی ہے۔ اس لئے نہایت سلیس اور سادہ زبان کا استعمال ہوا ہے' لیکن یہ صرف بچوں کے لئے ہی نہیں بلکہ بڑوں کے لئے بھی مفید' اور پر از معلومات ہے' ضروری اور صحیح حالات کا دلچسپ طریقہ سے تذکرہ ہوا ہے۔

لیکن تبصرہ سو سال کی تاریخ اسلام سے صرف (۶۰) فرزندان اسلام کا انتخاب کیا گیا ہے' اس سے واضح ہے کہ سینکڑوں ناموران اسلام جن کے کارنامے زندگی جاوید رکھتے ہیں' متروک ہو گئے ہیں۔ مثلاً اگر صرف جنوبی ہند پر نظر کی جائے تو فیروز شاہ بہمنی' ٹیپو سلطان' ابو القاسم فرشتہ' سالار جنگ وغیرہ ایسی ہستیاں تھیں جن کو اس تفصیل میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

دوسرا قابل تذکرہ امر یہ ہے کہ مصنف نے کوئی سلسلہ قایم نہیں رکھا ہے' نہ تو نام کے لحاظ سے ردیف وار بیان ہے اور نہ انتقال کے سنہ کا لحاظ رکھا گیا ہے اور پھر فن کا لحاظ بھی نہیں ہے' اگر کسی خاص سلسلہ کے تحت بیان ہوتا تو زیادہ مناسب تھا۔

اس کے قطع نظر کتاب مفید' دلچسپ' اور کار آمد ہے' اس کا مطالعہ وسیع معلومات کا ذریعہ ہوگا۔

دلچسپ مقامات:۔ مؤلف اصغر حسین صاحب فرزند ڈاکٹر ارسطو یار جنگ بہادر۔ پانچ حصے ہیں ہر حصے کی قیمت (ایک روپیہ) ملنے کا پتہ:۔ خورشید بلڈنگ مکرم جاہی روڈ حیدرآباد دکن۔

(۱) حصہ اول شہر حیدرآباد اور گولکنڈہ حجم (۱۰۲) صفحے مجلد
(۲) " دوم صوبہ اورنگ آباد " (۱۲۷) " "
(۳) " سوم صوبہ گلبرگہ " (۱۱۵) " غیر "
(۴) " چہارم صوبہ میدک " (۳۸) " مجلد
(۵) " پنجم صوبہ ورنگل " (۳۲) " "

ان میں جیسا کہ نام سے واضح ہے سلطنت آصفیہ کے دلچسپ اور مشہور مقامات کا تذکرہ ہے۔ قدیم اور جدید کوئی عمارت متروک نہیں ہوئی ہے۔ ان پر جو کتبے نصب ہیں ان کی بھی صراحت کی گئی ہے' اگر عربی کتبہ ہو تو اس کا ترجمہ بھی شامل ہے یہ کتابیں باتصویر ہیں چھوٹی سائز ہے۔ قیمت بہت زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ نہ صرف سیاحوں بلکہ دیگر شائقین تاریخ وغیرہ کے لئے بھی دلچسپ ہیں ہر کتاب کے ساتھ ایک نقشہ بھی شریک ہے۔ ریلوے اور بس کے سیاحوں کے لئے اس کا مطالعہ زیادہ مفید اور کار آمد ہوگا۔ ن۔ سہ۔

ارسطو جاہ۔ تقطیع ۷×۵ صفحات ۴۹ مطبوعہ ادارہ ادبیات اردو قیمت ۶ر

یہ چھوٹی سی کتاب بھی ادارہ ادبیات اردو ہی نے شایع کی ہے۔ اس کے مرتب پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی تاریخ دکن کے مشہور عالم ہیں۔ اس سے پہلے آپ کی معرکتہ الآرا کتاب "تاریخ گولکنڈہ" قدر و منزلت کے ہاتھوں لی جا چکی ہے۔ یہ کتاب خانوادۂ آصفی کے مشہور وزیر اعظم الامراء غلام سید خان ارسطو جاہ کے حالات اور کارناموں پر مشتمل ہے۔ ارسطو جاہ کا زمانہ دکن میں اردو ادب اور شاعری کے نقطۂ نظر سے بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ شمالی ہند سے زبان اور شاعری کی نئی تحریک یہاں پھیل رہی تھی، اور اس کو منظم کرنے میں ارسطو جاہ کی شعری سرپرستیوں نے بڑا کام انجام دیا۔ مرتب نے ان تمام واقعات کو نہایت سلیقہ اور وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب تاریخ دکن میں خاص اہمیت رکھے گی۔

مکتوبات شاد عظیم آبادی۔ ۷×۵ صفحات (۲۴۰) مطبوعہ ادارۂ ادبیات اردو قیمت (عہ)

شاد عظیم آبادی کے خطوط کا یہ مجموعہ ادارۂ ادبیات اردو نے شائع کیا ہے۔ اور اس کی ترتیب معتمد ادارہ پروفیسر ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی مرہونِ منت ہے۔

شاد عظیم آبادی، پٹنہ کے مشہور شاعر اور ادیب ہیں۔ ان کا زمانہ، اردو ادب میں اس لحاظ سے معرکتہ الآرا تھا کہ اس وقت حالی اور سرسید کی تحریکیں شروع ہو چکی تھیں ان تحریکوں اور ان کے عمل اور ردِّ عمل کا اندازہ تاریخ سے اس قدر واضح نہیں ہو سکتا، جتنا کہ ادب اور خاص طور پر ایسے خطوط سے ہو سکتا ہے اسی وجہ سے "مکتوبات شاد عظیم آبادی" غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔ ممکن ہے کہ بعض حضرات اس کو ضروری سمجھیں کہ خطوط کی شخصیتوں پر حاشیہ بھی چڑھایا جائے لیکن خطوط میں اتنے زیادہ لوگوں کا ذکر ہے کہ محض ان کی معلومات حاصل کرنے کے لئے عرصہ دراز لگ جاتا اس کے باوجود حیدرآباد میں رہتے ہوئے اس کا یقین نہ تھا کہ اس میں مرتب کو کامیابی ہوگی۔ جو لوگ پٹنہ کی تاریخ سے واقف ہیں وہ اگر اس کمی کو پورا کردیں تو اس عہد کی اچھی ادبی تاریخ ہو جائے گی۔

شاد بہ حیثیت شاعر بھی کچھ کم اہمیت کے مالک نہیں تھے۔ وہ داغ کی ٹکر کے شاعر تھے، لیکن ان کا انداز جدا تھا۔ مرتب نے ان امور کی صراحت اپنے مقدمہ میں عمدگی سے کر دی ہے۔

ڈاکٹر زور صاحب نے، یہ خطوط شائع کر کے، اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والوں اور متعلمین کے لئے بیش بہا خدمت انجام دی ہے اور ادارۂ ادبیات اردو کا یہ کارنامہ ہر لحاظ سے ستائش کا مستحق ہے۔ "س"

گیت مالا۔ پنجاب کے مشہور رسالہ ادبی دنیا کے مدیرین صلاح الدین احمد اور میراجی نے مرتب کر کے کتب خانہ ادبی دنیا لاہور سے شائع کیا ہے۔ یہ متوسط تقطیع کے ۸۴ صفحات کا مجموعہ نظم ہے جس کی نظموں کو تین حصوں (۱) پریت کے گیت (۲) رات کے گیت اور (۳) جگ بیتی میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ابتدا میں ۲ صفحوں کا ایک دیباچہ نثر گیت کی ریت کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔ جس میں گیتوں کی خصوصیتیں اور فائدے بیان کئے گئے ہیں اس نثر کا اسلوب بھی دلآویز ہے کیونکہ اس میں گیتوں ہی کی زبان استعمال کی گئی ہیں۔ اس قسم کی کوششیں قابل مبارکباد ہیں۔ یقین کہ یہ گیت مالا بہت مقبول ہوگی۔ یہ تمام گیت مختلف اصحاب کے لکھے ہوئے ہیں لیکن زیادہ تر اندرجیت شرما، حفیظ ہوشیارپوری و بقول حسین احمد پوری کے نتائج طبع ہیں۔ پہلا گیت اندرجیت شرما۔ پریتم کی تلاش ہے۔ اس کا پہلا اور آخری بند ہے۔

پریتم کو ڈھونڈنے میں تو سکھی آج گئی۔ پریتم کو ڈھونڈنے

پھولوں کے رنگ میں

جل کے ترنگ میں

کرنوں کی جنگ میں

پریتم کو ڈھونڈنے میں تو سکھی آج گئی۔ پریتم کو ڈھونڈنے۔
چنپے کے جھاڑ میں
بوندوں کی آڑ میں
بن میں پہاڑ میں
پریتم کو ڈھونڈنے میں تو سکھی آج گئی۔ پریتم کو ڈھونڈنے

ایک اور نظم روگ کا راگ کے چند شعر بھی پیش کئے جاتے ہیں یہ راج کماری بکاولی کی لکھی ہوئی ہے۔

نہیں جی سے میں کیسے بھلاؤں سکی مرے جی کو آکے لبھا ہی گئے
مرے من میں وہ پریم بسا ہی گئے مجھے پریت کا روگ لگا ہی گئے
کئے میں نے ہزار ہزار جتن کہ بچا رہے پریت کی آگ سے من
مرے من میں ابھار کے اپنی لگن وہ لگاؤ کی آگ لگا ہی گئے
رہے رات کی رات سدھار گئے مجھے سپنا سمجھ کے بسار گئے
میں تھی ہار گلے کا اتار گئے میں دیا تھی جیسے وہ بجھا ہی گئے
سکھی کوئلیں ساونی گائیں گی پھر نئی کلیاں بھی چھاؤنی چھائیں گی پھر
مری چین کی راتیں نہ آئیں گی پھر جنھیں نین کے نیر مٹا ہی گئے
مرے جی میں تھی بات چھپائے رکھوں سکھی چاہ کو من میں دبائے رکھوں
انہیں دیکھ کے آنسو جو آہی گئے مری چاہ کا بھید وہ پا ہی گئے

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا عظمت اللہ خان مرحوم کی نظم ہے۔ افسوس ہے کہ عظمت بہت جلد دنیا سے منہ موڑ گئے اور ان کی بے وقت موت سے اردو شاعری کو بہت بڑا نقصان پہنچا یا۔ یہ بھی افسوس کا مقام ہے کہ ان کے کلام کا مجموعہ اب تک شائع نہیں ہوا ورنہ اس قسم کی شاعری کے بڑے ولولہ انگیز نمونے منظر عام پر آجاتے۔

معین سخن :۔ نواب معین الدولہ بہادر معین کا مجموعہ کلام بڑی تقطیع کے ۲۴۸ صفحات میں شائع ہوا ہے۔ اور اسکو مولوی میر یاور علی صاحب خنجر نے اپنی نگرانی میں نہایت نفاست اور خوبی سے چھپوایا ہے۔ اس کے آغاز میں میرا لکھا ہوا ایک مقدمہ ہے اور آخر میں چالیس سے زیادہ ہمعصر شعرا کی کہی ہوئی تاریخیں اور تقریظی نظمیں بھی شامل ہیں جن میں صفیؔ اورنگ آبادی اور ماہرؔ القادری کی نظمیں نہایت پُر تکلف اور پاکیزہ ہیں۔

نواب معین الدولہ بہادر کو بچپن ہی سے شعر و سخن سے شغف رہا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری نواب مرزا داغؔ دہلوی کے رنگ میں شروع کی اور چونکہ یہ اسلوب ان کی طبیعت کے مناسب بھی تھا۔ اس لئے برابر ترقی کرتا گیا اور اب تو انہوں نے اپنے تغزل میں ایک پختگی پیدا کرلی ہے۔ ان کے اس مجموعہ میں متعدد ایسے شعر نظر سے گذرتے ہیں جو صحیح معنوں میں غزل گوئی کا کمال ہیں اور سہل ممتنع اشعار کی بہترین مثال سمجھے جاسکتے ہیں۔ مثلاً

ہر ادا آپ کی ہر ایک چلن دیکھ لیا
سادگی دیکھ لی بے ساختہ پن دیکھ لیا

کبھی نصیب تھے ہم کو بھی گل کے نظارے
کبھی چمن میں ہمارا بھی آشیانہ تھا

آگیا دل اپنا جس پر آگیا
ہوگئی جس سے محبت ہوگئی

تو ہی جب بے رخی سے ملتا ہے
کون ہم سے خوشی سے ملتا ہے

تمہاری نظر کا نہیں اعتبار
ابھی یہ ادھر سے ادھر ہوگئی

نواب معین الدولہ بہادر کوئی پیشہ ور شاعر نہیں ہیں انہوں نے تکلفات باردہ اور غیر ضروری مبالغہ آرائی سے کام لیکر اپنی استادی کا رعب ڈالنے کی کوشش نہیں کی ہے وہ جو کچھ لکھتے ہیں صحیح اور پاکیزہ زبان میں لکھتے ہیں۔ ان کے اسلوب میں تعقید یا گنجلک نہیں پایا جاتا۔ "ق"

منزل

دن تو جوں توں روتے دھوتے کاٹ ہی لیتا ہوں میں — ٹھوکریں کھا کھا کے دادِ زندگی دیتا ہوں میں
یوں ہی کچھ کھویا ہوا بھٹکا ہوا رہتا ہوں میں — اپنی دھن میں آپ ہی اُلجھا ہوا رہتا ہوں میں

جیسے دیوانہ سرِ مغرب ہو صحرا میں کہیں
چل رہا ہو خواب کی مسحور دنیا میں کہیں

کیا کروں اپنے دلِ بیتاب کی آواز کو — کیا کروں تخئیل کی بھٹکی ہوئی پرواز کو
رات کی خاموشیوں، تاریکیوں کو کیا کروں — فکر کی تنہا فلک پیمائیوں کو کیا کروں

لے ہی جاتی ہیں مجھے تیرے حریمِ ناز میں — تیرے دل میں اور دل کی بزمِ سوز و ساز میں

تجھ کو چھا جانا تھا ہستی پر مری چھا ہی گیا
دل کے مٹ جانے پہ آخر کار چین آ ہی گیا

ماہ و انجم سے ابھی میں نے نظر پھیری نہیں — جستجو کو دعوتِ فکر و عمل دی ہی نہیں
اک فریبِ حسنِ فطرت تک رسائی ہے مری — مشتمل رنگین دھوکوں پر خدائی ہے مری
سن رہا ہوں میں فسانہ ہستئ موہوم کا — اس جہانِ رنگ و بو کا عالمِ مغموم کا

آندھیوں میں بانسری جیسے بجاتا ہو کوئی!!
یا اُفق کے پار جیسے گنگناتا ہو کوئی!!

میرا ہر تارِ نفس، اک نغمۂ روح خموش — میری ہر اک آہ پیغامِ وفا۔ الفت بدوش
ہر قدم ہے ایک نامعلوم منزل کی تلاش — ہر نظر ہے اک شکستہ شیشۂ دل کی تلاش
نیم بے ہوشی میں نغماتِ جنوں گاتا ہوں میں — زندگی کی وادیوں میں دوڑتا جاتا ہوں میں

میرے رستے میں نہیں حائل صدائے کائنات!!
ہم نشیں۔ منزل ہے میری ماورائے کائنات!!

صمد رضوی ساز

محرم نامہ

سانحہ کربلا کے متعلق مضمونوں مرثیوں سلاموں نوحوں اور تصویروں کا عظیم الشان مجموعہ۔ آج تک ایسا محرم نامہ شایع نہیں ہوا اس کے محققانہ اور ادیبانہ مضامین میں واقعات کربلا اور فلسفۂ شہادت پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے اور تقریباً پچاس شعرا کے مرثیوں، نوحوں اور سلاموں کو تاریخ وار شایع کیا گیا ہے مرثیہ گو شعرا اور مجالس کی نایاب تصویریں شامل ہیں مجلسوں میں تقسیم کرنے کے لیے اس سے بہتر تحفہ یا تبرک اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ (تعداد صفحات ۱۱۲ تعداد تصاویر ۹ قیمت مجلد (عہ)

ہماری تعلیمی زبان

بظاہر یہ عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ اردو یا ہندوستانی زبان اپنے مولد سے میلوں دور دکن میں جہاں ایک سے زیادہ زبانیں بولی جاتی ہیں آج سے چار پانچ سو سال پہلے کس طرح اس آسانی کے ساتھ رائج ہو سکی اور نشو و نما پا سکی کہ تھوڑے عرصہ کے اندر اندر یہاں کے رہنے والوں کی رگ و پے میں جذب ہو گئی۔ اس سے بھی زیادہ تعجب انگیز یہ امر معلوم ہوتا ہے کہ اس کے قریب ہی زمانے میں زبان کے نہ صرف بولنے اور سمجھنے والے دکن کے طول و عرض میں موجود تھے بلکہ اعلیٰ درجہ کے شاعر بھی پیدا ہو گئے تھے۔

زبانوں کے رائج ہونے اور نشو و نما پانے کا در حقیقت یہ ایک آسان اور عام فہم اصول ہے۔ سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ یہ زبان ہندوستان کی دو عظیم الشان مگر مختلف اللسان جماعتوں کے مابین تبادلۂ خیال کے آلۂ کار کی ناگزیر مجبوری سے وجود پذیر ہوئی تھی، اس سے ظاہر ہے کہ یہ عوام کی زبان تھی اور اس کے سب سے پہلے معمار عوام ہی ہیں۔

دکن میں جب مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا اور یہاں ان کی حکومتیں بھی قائم ہو گئیں تو حکومت کے عہدہ داروں اور رعایا میں تبادلۂ خیال کی بڑی دقت تھی۔ مسلمانوں کی مادری زبان فارسی تھی اور ان کے تمام کاروبار مملکت اسی زبان کے ذریعہ انجام پاتے تھے۔ سالہا سال سے ہندوستان کے ملکی اور مالی دفاتر میں اس زبان کے رائج ہونے کے سبب اس میں دفتر کی تمام اصطلاحات موجود تھیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ دکن کے وسیع خطے میں فارسی کو اس طرح رائج کرنا کہ وہ عوام کی ثانوی زبان بن جائے مشکل اور طوالت طلب کام تھا۔ ان دقتوں نے مسلمانوں کو اپنی مادری زبان چھوڑ کر عامتہ الناس کی اس زبان کو اختیار کرنے پر آمادہ کر دیا جس کے رواج پانے کے یقیناً زیادہ امکانات تھے اور جس کو مسلمان مصنفین اپنی زبان کے مقابلے میں ہندی یا ہندوی یعنی ہندوؤں کی زبان کہتے تھے۔ اور چونکہ اس کا ادب اور شاعری ابتدائی زمانے میں یہیں پیدا ہوئی اس لئے اس کو دکھنی بھی کہتے تھے۔

اس میں شبہ نہیں کہ مسلمان فاتح شمال کی طرح کچھ عرصے کی کوشش کے بعد دکن کی علمی زبان فارسی بنا سکتے تھے۔ چنانچہ ابتدائی سنین میں انھوں نے سرکاری دفاتر میں فارسی استعمال کر کے اس کی کوشش بھی کی کیونکہ جس سرزمین میں ایک سے زیادہ زبانیں رائج ہوں وہاں نو وارد فاتحین کے لئے یہ تصفیہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ سرکاری دفاتر کے لئے کون سی زبان اختیار کی جائے۔ عموماً ہر جگہ یہی ہوتا آیا ہے کہ فاتح اپنی زبان ہی کو اختیار کرتے ہیں۔ لیکن جب نو واردوں کے تعلقات ملک سے قائم ہو جاتے ہیں اور وہ اس کے قدیم باشندوں کے ساتھ گھل مل جاتے ہیں تو عموماً دونوں زبانوں کے خلط ملط سے نئی زبانیں تعمیر پاتی رہی ہیں۔ چنانچہ سیکسن قوم کی فتح انگلستان کے بعد اینگلوسیکسن زبان کا پیدا ہونا اور آریوں کی فتح ہندوستان کے بعد پراکرتوں کا نشو و نما پانا اسی حقیقت کا نتیجہ ہے۔ حکومت نے تو اپنی حد تک فارسی کو اختیار کر لیا تھا لیکن نو وارد مسلمان دکن کے ساتھ رہنے بسنے اور لین دین کی ناگزیر ضرورتوں کے باعث رفتہ رفتہ فارسی کو ترک کرتے گئے اور اس دیسی زبان کی طرف راغب ہوتے گئے جسے وہ ہندوؤں کی زبان سمجھتے تھے۔ تھوڑے عرصے کے اندر اندر یہ زبان عوام کی

بول چال سے بڑھ کر تصنیف و تالیف اور شعر و شاعری میں بھی استعمال ہونے لگی۔ جب اس زبان نے ترقی کے آثار ظاہر کئے تو فاتحین بھی رواداری سے کام لے کر اس کی سرپرستی کرنے پر آمادہ ہو گئے چنانچہ بعض حضرات کی تحقیق کے مطابق عادل شاہی اور قطب شاہی خاندانوں کے چند بادشاہوں نے اس زبان کو سرکاری دفاتر میں رائج کر دیا تھا۔ جب ضرورت کسی امر کا تصفیہ کر دیتی ہے تو پھر اس کو اٹل سمجھنا چاہیے۔ دکن میں اس زبان کے جلد ہی ادبی و ملکی بن جانے کا بھی یہی سبب ہے۔ شمال سے ان کے تعلقات منقطع ہو جانے کے سبب وہ فارسی کی بجائے ہندوستانی زبان کو ترقی دینے اور اس میں تصنیف و تالیف کرنے لگے۔ مصنف کے لئے پڑھنے والوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر فارسی بولنے والے فارسی ہی میں تصنیف و تالیف کرتے تو ان کے مخاطب صرف وہی لوگ ہوتے جو ان کے ہمراہ آئے تھے یہ عیسیٰ لکھے موسیٰ پڑھے کے مصداق ہوتا۔ مصنف کی لازمی طور پر یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی تصنیف زیادہ سے زیادہ پڑھی جائے اور وسیع سے وسیع حلقوں میں گشت لگائے۔ فارسی بولنے والوں کا ہندوستانی میں تصنیف و تالیف کرنا خود اس بات کا ثبوت ہے کہ انھیں پڑھنے والوں کا وسیع تر حلقہ اسی زبان میں میسر آسکتا تھا۔ اس کے علاوہ ابتدائی اردو کارنامے جو زیادہ تر مذہبی موضوعات پر مشتمل ہیں اس بات کا مزید ثبوت ہیں کہ وہ اپنے ہم مذہبوں کے لئے نہیں بلکہ زیادہ تر ان نو مسلموں اور غیر مسلموں کے لئے لکھے گئے تھے جن کے لئے وہ اپنے مذہب کی حقانیت اس کے اصول قوانین اور احکام پیش کرنا اپنا مذہبی فرض سمجھتے تھے۔

تصنیف و تالیف کے بعد دوسرا درجہ تعلیم و تدریس کا ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی چین میں عبرانی بائبل شایع کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ جو کتابیں عام طور پر پبلک میں لکھی جائیں گی وہی مدارس میں پڑھائی بھی جانی چاہئیں۔ لیکن ہندوستانی کی تعلیم گزشتہ صدی کے وسط تک زیادہ تر دینیات کے حلقہ کی کتابوں تک محدود تھی۔ انگریزوں کی سلطنت کے قیام تک بھی ہندوستانی تعلیم کا یہی حال تھا۔ حیدرآباد میں جس وقت سے تعلیم کی تنظیم شروع ہوئی اور عام تعلیم کے لئے مدارس قائم ہونے لگے ان کی ترقی میں ہندوستانی زبان نے جو حصہ لیا وہ دوسری تمام زبانوں سے بڑھ کر ہے۔ اس زبان کا تعلق حیدرآباد کی تعلیم سے بھی ایسا ہی قدیم ہے جیسا کہ زبان کے ادبی اور شعری کارنامے اولین ہیں۔

حکومت کی طرف سے تنظیم تعلیم کی ساعی کے آغاز ہونے سے پہلے جو مدارس ہمارے حد علم میں آسکے ہیں ان میں قدیم ترین مدرسہ جامع مسجد کا ہے جو مسجد کے ساتھ محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں تعمیر ہوا تھا۔ بعد میں جب مولانا حافظ شجاع الدین نے اس مسجد کی خانقاہ میں سکونت اختیار کی تو ان کی کوشش سے یہ مدرسہ از سر نو زندہ ہوا۔ اس مدرسہ میں زیادہ تر دینیات کی تعلیم ہوتی تھی اور ملک کے طول و عرض سے طالبان علم حصول علم کے شوق میں آتے تھے۔ تعلیم کے ساتھ طلبہ کے رہنے کا بھی انتظام تھا اور کھانا وغیرہ بھی اوقاف مسجد سے ملتا تھا۔ اس مدرسے میں جو کتابیں پڑھائی جاتی تھیں اس میں شک نہیں کہ فارسی اور عربی کی قدیم درسی کتابیں تھیں لیکن ان کی تعلیم اور تفہیم کا ذریعہ زیادہ تر یہی زبان تھی۔ چنانچہ اس کا بڑا ثبوت مولانا کی مشہور کتاب "کشف الخلاصہ ہندی" سے ملتا ہے۔

جو مسائل فقہ پر نظم میں لکھی گئی ہے اور مدرسے کے طلبا کے لئے مقصود تھی۔ لیکن یہ ایسی مقبول ہوئی کہ حیدرآباد کے تمام مدارس میں زمانۂ حال تک بھی پڑھائی جاتی تھی۔

دوسرا مدرسہ اس کے کچھ عرصہ بعد کا ہے جو پائیگاہ کے امیر کبیر اور سلطنت کے علم دوست وزیر نواب فخرالدین شمس الامرا ثانی نے سنہ ۱۲۵۰ھ میں اپنی ڈیوڑھی میں قائم کیا تھا۔ یہ مدرسۂ فخریہ کے نام سے موسوم تھا اور اس میں درس دینے کے لئے ہندوستان کے طول و عرض سے علما بلائے گئے تھے۔ سارے ہندوستان میں اپنی نوعیت کا یہ واحد مدرسہ تھا جہاں مروجہ دینی علوم کے ساتھ ساتھ حکمی علوم کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ خود نواب فخرالدین خاں کو حکمی علوم سے غیر معمولی شغف تھا۔ چنانچہ اسی دلچسپی کی پیش رفت میں انھوں نے ایک ادارہ قائم کیا تھا جس میں حکمی علوم کی کتابوں کے ترجمے انگریزی سے اردو میں کیے جاتے تھے۔ ضرورتاً اصطلاحیں بھی بنائی جاتی تھیں۔ ان کتابوں میں ستہ شمسیہ بہت مشہور ہے۔ ہیئت کی تعلیم میں اجرام فلکی کے مشاہدات کی غرض سے جہاں نما کی رسدگاہ بھی تعمیر کرائی گئی تھی جو آج تک باقی ہے۔

یہ کتابیں دراصل مدرسہ فخریہ کے طلبا کے لئے لکھی گئی تھیں لیکن مولانا امام خاں تاریخ خورشید جاہی کے مصنف کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک کے طول و عرض کے طلبا میں یہ ایسی مقبول ہوئیں کہ ہاتھوں ہاتھ لی گئیں۔

حضرت غفران منزل نواب ناصرالدولہ کی سرپرآرائی کے آخر زمانے سے تنظیم تعلیم کی سعی شروع ہوئی اور عجیب بات ہے کہ سب سے پہلے جو مدرسہ قائم کیا گیا وہ ڈاکٹری کی تعلیم کا تھا۔ اس مدرسے کے متعلق ایک اہم بات یہ ہے کہ اس میں مغربی طب کی تعلیم اردو زبان میں دی جاتی تھی۔ یہ اردو میں طب کی تعلیم دینے کی اولین کوشش تھی۔ اپنے نتائج کے لحاظ سے یہ مدرسہ کس قدر کامیاب رہا اس کے متعلق صرف یہ معلوم کرنا کافی ہوگا کہ نواب لقمان الدولہ مرحوم اور ہمارے زمانے کے ہر دلعزیز اور قابل قدر ڈاکٹر عبدالحین ارسطو یار جنگ بہادر اس مدرسے کے تعلیم یافتہ ہیں۔ اس تربیت کا اثر یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے نسخے آج تک اردو میں لکھے جاتے ہیں۔

ہمارے قریبی زمانے کے مدارس میں سب سے زیادہ قابل ذکر مدرسہ دارالعلوم ہے جس کی بنیاد سنہ ۱۲۷۳ھ میں نواب مختارالملک سر سالار جنگ کے ہاتھوں پڑی تھی۔ اس مدرسے کا نظام و نصاب پہلے پہل قدیم درس نظامیہ پر مبنی تھا۔ بعد کو اس میں کچھ تبدیلیاں کی گئیں۔ لیکن اس میں تفہیم و تدریس کا ذریعہ اردو زبان تھی۔ اس سلسلے میں یہ امر بھی دلچسپی سے پڑھا جائے گا کہ سالار جنگ مرحوم کا نقطۂ نظر زبان کے معاملہ میں انگریز مدبروں سے ملتا جلتا تھا وہ فارسی کے سخت طرف دار تھے اور اس زبان کے علاوہ کسی اور زبان کو دفاتر میں رائج کرنے کے خیال سے جز بز ہوتے تھے لیکن واقعات کی رفتار کچھ اور ہی چیز ہے۔ کسی ایک شخص یا گروہ کی کوشش سے یہ رک نہیں سکتی چنانچہ سلطنت آصفیہ کے دفاتر میں بھی یہ زبان رائج ہو گئی۔ مدرسہ دارالعلوم میں اگر قصداً اردو رائج کرنے کی کوشش کی جاتی تو سر سالار جنگ شاید اس کو پسند نہ کرتے لیکن یہ چیز بغیر جانے اور بغیر کوشش کے صرف اس لئے رائج ہو گئی کہ معلمین اور متعلمین دونوں کی زبان یہی تھی۔ دارالعلوم کی توسیع کے بعد قدیم مدرسہ فخریہ بھی اسی سے متعلق ہو گیا تھا اور دارالعلوم ہی کے نصاب کی یہاں تکمیل کرائی جاتی تھی۔

۱۸۸۵ء میں حیدرآباد کے ایک ہمدرد عالم مولوی انیس الدین نے مدرسہ نظامیہ کی بنیاد ڈالی۔ دار العلوم میں دینیات کے علاوہ بہت سے دنیاوی علوم بھی داخل ہوگئے تھے۔ اس لئے ایک مدرسے کی ضرورت محسوس کی گئی جو محض دینیات کی تعلیم کے لئے مختص رہے۔ اس مدرسے میں بھی عربی زبان اور دینیات کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں لیکن درس کا ذریعہ اردو زبان ہی تھی۔

غرض یہ ایک سرسری خاکہ ہے اس حقیقت کا کہ

جس وقت سے حیدرآباد میں عام تعلیم کا چرچا شروع ہوا اور سرکاری طور پر یا خانگی جو مدارس قائم ہوئے وہ معلمین اور متعلمین کی سہولت اور ضرورت کے مدنظر درس کی تفہیم اردو زبان کے ذریعہ ہی کرتے تھے۔ بہ الفاظ دیگر حیدرآباد کی عام تعلیم کی شروعات ہی سے یہ زبان بطور ذریعۂ تفہیم کے حیدرآباد کے اکثر چھوٹے بڑے مدارس میں رائج رہی ہے۔ لیکن ملکی ضروریات نے جب سے سرکاری دفاتر میں بھی اس زبان کا رواج ناگزیر کر دیا اس کا حلقۂ اثر اور بھی وسیع اور مستحکم ہوگیا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ ملکی مالی بہ حساب کتاب ریاستی کاروبار اور رسل و رسائل کی اصطلاحات کا ایک بڑا ذخیرہ اس زبان میں پیدا ہوتا گیا جس سے اس کو بڑی تقویت حاصل ہوئی۔

عدالتوں میں اس کے رواج نے اس زبان کو علمی اور جامعی بنانے میں بھی ایک قدم آگے بڑھایا کیونکہ عدالتوں کے کاروبار کے دو رخ ہیں جن میں سے ایک میں قانون سازی بالکل علمی اور جامعی طرز کا کام ہے۔ اس کے شروع ہو جانے سے ملک کا قانونی علم، شعور اور احساس رفتہ رفتہ اس قدر ترقی کر گیا کہ قانون کی اکثر و بیشتر اصطلاحات اس زبان میں فراہم ہوگئیں۔ مختلف زبانوں کے بولنے والے ایسے قدیم وکلا ہمارے یہاں کوئی کمی نہیں ہے جو انگریزی کا ایک لفظ بھی نہیں جانتے لیکن قانونی علم میں وہ درک رکھتے ہیں جو شاید انگریزی داں بھی کم رکھتے ہوں گے۔ ایسے وکلا نے ملک کی بڑی بڑی ذمہ دارانہ خدمات بھی انجام دی ہیں۔ حیدرآباد کے لئے جس وقت اعلیٰ تعلیم کے راستے پنجاب کی جامعہ کی طرف سے بند کر دیے گئے تو ملک میں جامعہ کے قیام کا احساس فطرتاً شدت کے ساتھ پیدا ہوگیا۔

اعلیٰحضرت سلطان العلوم میر عثمان علیخاں بہادر خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کے سریر آرا ہوتے ہی آپ نے سب سے پہلے ملک کی شدید ضرورت کو محسوس فرما لیا اور جو شغف آپ کو علم سے ہے اس کی پیش رفت میں اپنی تخت نشینی کی یادگار کے طور پر جامعہ عثمانیہ کے قیام کا حکم محکم صادر فرمایا لیکن ملک کے خاص حالات ضروریات اور قدیم روایات کے احترام میں جامعہ کا ذریعۂ تعلیم اردو ہی قرار دیا۔

یہ اہل ملک کے لئے ایک مانوس چیز تھی اس لئے کہ یہ ملک کے قلوب اور دماغوں کے ساتھ ہم آہنگ ہوگئی اور ایک قلیل مدت کے اندر اندر ملک کی علمی جدوجہد کا پورا نقشہ بدل گیا۔ ایک صاحب بصیرت بزرگ کے الفاظ میں گویا علم نامانوس زبانوں میں مقید تھا وہ اس سرزمین میں آزاد کر دیا گیا۔

وہ حضرات جن کو حیدرآباد کے حالات کا بغور مطالعہ کرنے کا موقع نہیں ملا جامعہ کے قیام اور اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد یہاں مستند پایہ کی علمی اور اچھی تصانیف کی کثرت کو ایک معجزہ سمجھتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تاریخی اور تدریجی ارتقا کا نتیجہ ہے۔ واقعات کی رفتار اور سیلاب کے بہاؤ کے رخ کو حضرت سلطان العلوم سے بڑھ کر کسی نے نہیں پہچانا تاآنکہ ملک کو اپنی تخت نشینی کی یادگار میں وہ تحفہ عطا کیا جس کو آپ کی بصیرت افروز نظر نے ملک و قوم کی حقیقی ضرورت سمجھا اور اس تصفیہ ہی میں ملک کی موجودہ علمی چہل پہل اور ترقیوں کا راز پوشیدہ ہے

عبد القادر سروری

فنستان

موجودہ جنگِ یورپ میں بحرِ بالٹک کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ چند مہینوں پہلے لٹویا، اسٹونیا اور لیتھونیا کی قسمتوں کا فیصلہ ابھی نہیں ہوا اور اب فنستان روسی حملوں کا نشانہ بنا ہوا ہے۔ فنستان جیسے چھوٹے ملک پر روسی حملے رنگ لائے بغیر نہیں رہے۔ متمدن دنیا اس وحشیانہ اقدام پر بہت لعنت ملامت کر رہی ہے اور اس قدر غیظ و غضب کا اظہار ہو رہا ہے کہ شاید آسٹریا، بوہیمیا اور پولستان کی تسخیر میں بھی نہیں ہوا۔ چنانچہ امریکہ بھی روس پر سخت برافروختہ ہے۔ برطانیہ و فرانس اس چھوٹی سی مملکت کی حمایت پر آمادہ ہو گئے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ روس مجلسِ اقوام سے الگ کر دیا گیا اور فنستان کو اس وقت تمام متمدن دنیا کی ہمدردی حاصل ہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ صرف ہمدردی کسی مصیبت کا علاج نہیں ہوتی۔ اگر فنستان کے ساتھ محض ہمدردی کی جاتی اور اس ملک کے باشندوں میں اتنی قابلیت نہ ہوتی کہ باہر کے سیلاب کا مقابلہ کر سکیں تو فنستان کب کا ختم ہو جاتا۔ فنستانی بہادر ہیں اور اپنی آزادی کی حفاظت کے لئے تیار رہیں۔ انھوں نے اپنے ملک کی حفاظت کرنے کا تہیہ کر لیا ہے خواہ اس میں کتنا ہی نقصان کیوں نہ اٹھانا پڑے۔ ان بلند حوصلوں کے ساتھ قدرت نے بھی اس کے لئے ایسا جغرافیہ بنایا ہے کہ اس سے خاطر خواہ مدافعت ہوتی ہے اور وہ دشمن کا اچھی طرح مقابلہ کر سکتے ہیں۔ گو دونوں فریق برف کا مقابلہ کرنے کے عادی ہیں لیکن فنستان کی برف ایسی ہے جو خود اہلِ ملک کی محافظ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے لاکھوں سپاہیوں کو ناکامی کی صورت دیکھنی پڑ رہی ہے۔ غرض ملک کے جغرافیہ اور اہلِ ملک کی دلیری کی بدولت فنستان روس جیسی بڑی طاقت کے سامنے کھڑا ہو گیا اور اس وحشی سیلاب کا برابر مقابلہ کر رہا ہے۔ اگر اس موقع پر فنستانیوں کی کچھ نسلی تحقیق کی جائے تو دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کون سی قوم ہے اور فنستان میں آ کر کس طرح آباد ہوئی؟

یہ خیال کیا جاتا ہے کہ فنستان بالٹک ملک نہیں ہے۔ بلکہ اسکانڈی نیوی سلسلے میں شامل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سویڈن کے ساتھ اس کا قریبی تعلق ہے اور مغربی یورپ کے ساتھ اس کا سیاسی، تاریخی اور تمدنی رشتہ ہے لیکن حقیقت میں اس کی اصل ٹیوٹانی ہے نہ سلاوی بلکہ اس کی تاریخی اور تمدنی کڑیاں وسط ایشیا کے کوہستانی سلسلوں یعنے التائی سے ملتی ہیں۔ چنانچہ ایک بڑی مثنوی میں جو کالی والا (Kaleuala) کے نام سے مشہور ہے اور جس کے بعض حصے تین ہزار سال پہلے کے ہیں، فنستانیوں کا وہ زمانہ ملتا ہے جب کہ وہ ابھی یورپ سے متاثر نہیں ہوئے تھے۔

فنستانیوں کی ابتدائی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ سائبیریا کی ایک وحشی قوم تھی جو ہرن پالا کرتی تھی۔ یہ لوگ دریائے ینے سی (Yenesei) کے منبع سے لے کر خلیج چٹن گا (Chatanga) تک جو بحر شمالی کا حصہ ہے، پھیلے ہوئے تھے۔ ان پر بعد میں تاتاریوں کا دباؤ پڑنے لگا جس کی وجہ سے وہ مغرب کی طرف ہٹتے گئے اور کوہستان یورال کی دونوں جانب بس گئے۔ اسی جگہ انھوں نے دھاتوں کا استعمال سیکھا۔ اکثر شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ پانچ سو یا چھ سو قبل مسیح تک یہ لوگ یورال ہی میں آباد رہے۔ لیکن بعد میں ترکی کرغیز (Turki Kirghiz) کے قبیلے فینیوں کو یورال سے ڈھکیلنے لگے اور یہاں سے یہ لوگ مختلف سمتوں میں منتشر ہو گئے۔ ایک گروہ والگا (Volga) کی طرف چلا گیا اور پھر دریائے ڈینیوب کو عبور کر کے ہنگری پہنچا۔

فنستان اور اس کی ہمسایہ مملکتیں

دوسرے گروہ نے شمال کی سمت اختیار کی اور بحر اسبیق کے کنارے
بس گئے یہاں سے بعض لوگ اور آگے بڑھنے لگے اور دریائے
والگا کے کنارے کنارے جھیل لڈوگا (Ladoga) تک پہنچ گئے
اور پھر یہاں سے بالٹک کے ملکوں میں پھیل گئے۔ اگرچہ ان علاقوں میں
وہ ایک مدت تک بس گئے تھے لیکن بعد میں جرمنوں اور اہل لتھونیا
نے انھیں یہاں سے بھی مار بھگایا۔ بہنیم وحشی پہلے پہل لیوونیا،
کورٹ لینڈ اور اسٹونیا کے باشندوں کے ساتھ گھل مل گئے
تھے چنانچہ وہ انہی کی زبانیں بولتے تھے اور انہی کے تمدن
میں رنگ گئے تھے۔ یہاں تک کہ اکثر انہی لوگوں کی مذہبی رسوم
اور ملکی قوانین کی تقلید کرنے لگے۔ وہ باشندے جو آج
فینی قومیت کی شکل میں ہمارے سامنے ہیں، انہی لوگوں
کی نسل سے ہیں اور یہ سب غیر آریائی ہیں جنھوں نے اپنی
علیحدہ قومیت اور آزادی کو اب تک برقرار رکھا۔ ڈاکٹر
اے ایچ۔ کین لکھتے ہیں "اس کے باوجود کہ مغرب میں
سویڈن کی طرف سے اور مشرق میں روس کیطرف سے فنستان پر دباؤ
پڑتا رہا، فنستانیوں نے یورپ میں اپنی جداگانہ قومیت کو برابر
قایم رکھا اور اپنی میٹھی زبان کی اتنی خدمت کی کہ وہ ادبی اور شعری
زبان بن گئی۔"

فنستان اور لیاپستان کے باشندے ایک ہی نسل کی
دو شاخیں ہیں۔ اس سے پہلے کہ فنستانی فنستان کے جنوبی حصوں
میں آکر بسے لیاپستان کے باشندے شمالی حصوں میں آباد ہو گئے
تھے۔ چنانچہ آج بھی ان میں منگولوں کی بہت سی نشانیاں
پائی جاتی ہیں مثلاً یہ کہ ان کے چہرے منگولوں کی طرح چپٹے اور
رخسار کی ہڈیاں ابھری ہوئی ہوتی ہیں۔ اگرچہ نسلی اعتبار سے
لیاپ اور فینی ایک ہی ہیں لیکن زمانے کے اثر نے ان دونوں کو
شکل و صورت کے لحاظ سے بالکل جدا کر دیا ہے۔ اور نہ صرف
جسمانی لحاظ سے بلکہ دماغی صلاحیتوں کے اعتبار سے بھی ان
لوگوں کو لیاپ کے ساتھ بظاہر کوئی رشتہ نہیں معلوم ہوتا۔ فنستانیوں
نے بارہویں صدی تک تو اپنے اجداد کی طرح سادہ زندگی بسر
کی لیکن جب ان کے پرانے مذہبی عقیدے بدل گئے اور
سویڈن کے شاہ ایرک ہشتم کے اثر سے عیسائیت ان کا قومی مذہب
ہو گیا تو ان کی زندگی بالکل بدل گئی۔ اس کے بعد سے فنستان پر
سویڈن کا تمدنی اثر بھی بہت بڑھ گیا حتیٰ کہ اوائل انیسویں صدی
کی ان جنگوں میں جو روس کے خلاف ہوئیں فنستان نے سویڈن کا
ساتھ دیا اور روس کا مقابلہ کیا۔ مگر روسی طاقت کے سامنے
فنستانی زیادہ عرصے تک نہ ٹھیر سکے چنانچہ ۱۸۰۹ء میں پورا
فنستان روس میں شامل کر لیا گیا۔ اگرچہ زار الگزنڈر اول نے
وعدہ کیا کہ فنستانی دستور بحال رکھا جائے گا اور چند دنوں تک
اس کے مطابق عمل بھی ہوتا رہا لیکن بعد کے زاروں نے
فنستان کی آزادی کو ختم کرنے کی کوشش کی اور اسے بالکل
روس کا غلام بنالینا چاہا۔ اس کا ردعمل ناگزیر تھا۔ چنانچہ
۱۹۱۷ء میں روس میں انقلاب ہوا تو فنستان نے اپنی آزادی
کے لئے ہلچل شروع کر دی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ لینن نے فنستان
کی آزادی تسلیم کر لی لیکن اس کے بعد سے روس اور فنستان
کے تعلقات میں برابر کشیدگی رہی اور ۱۹۱۸ء میں تو سرخ
انقلابیوں نے فنستانی اشتمالیوں کو اپنے ساتھ ملا کر فنستان
میں خانہ جنگی شروع کر دی جو چار مہینے تک جاری رہی جنرل
مانرہیم نے فنستانی فوجوں کی رہنمائی کی اور جرمن فوجوں
کی مدد سے روسیوں کو اپنے راستے سے ہٹا دیا۔ اس کے بعد
روس اور فنستان کے درمیان امن قائم ہو گیا۔ فنستان اپنی

جمہوری حکومت کے سایہ میں ترقی کرتا رہا، اس کی تجارت بڑھتی گئی اور دنیا میں اس نے ایک خاص حیثیت حاصل کرلی۔ خصوصاً ممالک متحدہ میں تو فنلانیوں نے بڑا اثر پیدا کیا اور یہی وجہ ہے کہ اس ملک کو اب ممالک متحدہ کی ہمدردی حاصل ہے۔

فنلان میں زبان کا مسئلہ بھی بہت الجھا رہا۔ ملک میں اونچے طبقے کی زبان سویڈنی تھی اور اوسط طبقے کی فنلانی۔ مگر اب دونوں بولیاں ایک ہی درجہ پر آگئی ہیں اور اس طرح اب زبان کا مسئلہ ایک حد تک حل ہوگیا ہے۔ فنلان کے ایک آزادی پسند شخص نے کہا تھا کہ "اب ہم سویڈنی نہیں رہے اور روسی تو کبھی نہیں ہوسکتے" یہی تخیل فنلانیوں کے لئے مشعلِ ہدایت بنا رہا اور فینی قومیت اسی کے سہارے زور پکڑتی گئی۔ فنلانیوں نے اپنی محنت و جفاکشی اور بلند حوصلوں کی بدولت اپنے کو آزادی کا اہل ثابت کردیا ہے اگر روس اس آزادی کو جو ان کا حق ہے، چھیننا چاہتا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ روس کی زیادتی ہے اور قدرت اس وحشیانہ اقدام کا کسی نہ کسی طرح ضرور جواب دے گی۔

چند عجیب پودے

حفیظ صدیقی

دنیا میں ہزاروں قسم کے پودے اگتے ہیں اور ہر پودے کے لئے خاص زمین اور خاص آب و ہوا کی ضرورت ہے۔ بعض پودے تو خوبصورتی کی وجہ سے مشہور ہیں اور بعض اس سبب سے کہ بہت اونچے اور بڑے ہوتے ہیں۔ بعض اس لئے کہ ان کی لکڑی بہت قیمتی ہوتی اور عمارت کے کام آتی ہے۔ اور بعض اس وجہ سے کہ اس کے پھل خوش ذائقہ اور پھول نہایت خوشبودار ہوتے ہیں۔ مگر بعض پودے ایسے بھی ہیں جو محض اس لئے قابلِ لحاظ ہیں کہ وہ بہت عجیب و غریب ہوتے ہیں۔

بحر جنوبی کے جزیروں میں ایک درخت ہوتا ہے جسے وہاں کے لوگ نان پاؤ کا درخت کہتے ہیں اس درخت میں بڑے بڑے پھل ہوتے ہیں جو تقریباً ناریل کے برابر ہوتے ہیں۔ جب انھیں آگ پر رکھا جاتا ہے تو ان کا رنگ اور ذائقہ بالکل نان پاؤ کے جیسا ہوجاتا ہے۔ یہاں کے رہنے والے کیسے خوش نصیب ہیں کہ انہیں درختوں میں سے پکی پکائی روٹی مل جاتی ہے۔ اس جگہ ایک اور درخت ہوتا ہے جس کو یہاں کے لوگ گوبھی کا درخت کہتے ہیں۔ اس کی اونچائی تیس گز سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اوپر جانے کے بعد پتے نکلتے ہیں پتے ایسے ہوتے ہیں جیسے ہماری پانی کی گوبھی۔ مزہ بھی اسی طرح کا اور شکل بھی ایسی ہی

اسٹریلیا میں ایک درخت ہوتا ہے جس کو گھاس کا درخت کہتے ہیں اس کی شاخوں کے سروں پر گھاس کے گچھے کے گچھے نکل آتے ہیں۔ جانور اس کو بڑی خواہش سے کھاتے ہیں۔

گرم ملکوں میں بعض درختوں سے دودھ نکلتا ہے اور یہ ایسا ہی مزہ دار اور مقوی ہوتا ہے جیسا کہ گائے یا بھینس کا دودھ سورج نکلتے ہی ان درختوں کی شاخوں سے دودھ ٹپکنا شروع ہوجاتا ہے۔ وہاں کے رہنے والے صبح ہوتے ہی برتن لے کر دودھ بھرنے چلے جاتے ہیں۔

ملک گنی میں ایک درخت ہوتا ہے جسے مکھن کا درخت کہتے ہیں اس درخت کے بیجوں سے ایک قسم کا تیل نکلتا ہے جس کا مزہ تازہ مکھن کا سا ہوتا ہے۔ خوبی یہ ہے کہ لوگ اسے سال بھر تک رکھتے ہیں لیکن اس کے ذائقہ اور بو میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوتی۔

ملک چین میں ایک درخت ہوتا ہے جسے وہاں چربی کا درخت کہا جاتا ہے اس میں سے جو چربی نکلتی ہے یہاں کے لوگ اس کی موم بتیاں بنا کر جلاتے ہیں ان موم بتیوں کی روشنی نہایت

صاف ہوتی ہے مطلق دھواں نہیں نکلتا۔ یہ چربی ریل کے پہیوں میں بھی ڈالی جاتی ہے۔

اسٹریلیا میں عجیب عجیب درخت ہوتے ہیں۔ ایک درخت ایسا ہوتا ہے جسے لوہے کا درخت کہتے ہیں اس کی لکڑی اتنی وزنی ہوتی ہے کہ پانی میں ڈالتے ہی فوراً ڈوب جاتی ہے۔ اور بسولے سے کاٹیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی لوہے کی سلاخ پر بسولہ چلایا جا رہا ہے۔

ایک درخت اور بھی ہوتا ہے جس کو بچھو کا درخت کہتے ہیں اگر اس کے پتوں کو چھو لیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بچھو نے ڈنک مار دیا لیکن اسی درخت کے نیچے ایک اور بوٹی پیدا ہوتی ہے اگر اس کو مل دیا جائے تو جھنکار فوراً کم ہو جاتی ہے۔

جنوبی افریقہ میں ایک قسم کا درخت ہوتا ہے جس کو نکھانی کا درخت کہتے ہیں اس کی لکڑی میں کیڑا نہیں لگتا۔ جب آرہ کش اس پر آرہ چلاتا ہے تو چھینکتے چھینکتے اس کو ناک میں دم آ جاتا ہے۔

جزائر فجی میں ایک عجیب درخت ہوتا ہے اس کو کھجلی کا درخت کہتے ہیں اگر اس کے پتوں کو ہاتھ لگا یا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی گرم اور دہکتے ہوئے لوہے پر ہاتھ رکھ دیا گیا ہے اس سے خارش بھی ہوتی ہے جو مہینوں نہیں جاتی۔

بعض جنگلوں میں چھوٹے چھوٹے پودے ہوتے ہیں جن سے تقریباً سارا میدان بھرا ہوا ہوتا ہے اگر اس میدان میں سے کوئی آدمی یا جانور جاتا ہے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کس طرف گیا ہے کیونکہ جہاں جہاں سے وہ گزرتا اور پودوں کو چھوتا جاتا ہے پودے مرجھائے جاتے ہیں۔

محمد احسن

انگریز اور انگریزی

(بسلسلہ گزشتہ)

نئے نئے خیالات کے اظہار کے لئے ان سیدھے سادے انگریزوں کو نئے الفاظ وضع کرنے پڑے۔ زمانہ گزرتا گیا انگریز بڑی تعداد میں پھیلتے رہے۔ اس دوران میں ان کو مختلف قسم کے لوگوں سے ملنے اور ان کے ساتھ رہنے کا موقع ملا جو بالکل نئے خیالات کے حامل تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزی زبان میں کثرت سے نئے الفاظ بھرتی ہو گئے جس سے قدیم انگریزی زبان کے الفاظ بہت کم رہ گئے لیکن ان کی اہمیت میں کسی قسم کی کمی نہ ہوئی۔

چھٹی صدی عیسوی میں عیسائی مذہب کی تبلیغ کے بعد اہم واقعہ گیارہویں صدی عیسوی میں نارمنوں کی فتح ہے نارمن فرانس کے شمال سے آئے تھے اور وہ مخلوط فرانسیسی زبان بولتے تھے جس میں مختلف شمالی زبانیں شامل تھیں کیونکہ نارمن خود بھی انگریزوں کی طرح "بحری خانہ بدوش" تھے جو صدیوں قبل علاقہ نارمنڈی کو فتح کر کے قابض ہو گئے تھے۔

نارمنوں نے بہت جلد انگریزوں پر فتح حاصل کی اور ان کے علاقے پر قابض ہو گئے تھے۔ دو تین صدی تک وہ قابض رہتے تو ممکن تھا کہ وہ انگریزی زبان پر بھی قابض ہو جاتے اور اپنی زبان رائج کرتے اور اگر ایسا ہوتا تو ہم اس زمانے میں ایک قسم کی "نارمنی فرانسیسی" زبان میں گفتگو کرتے۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ نارمن ہزاروں کی تعداد میں آ کر بس گئے لیکن انھوں نے اپنے آپ کو لاکھوں انگریزوں کے درمیان پایا۔ پہلے پہل یہ دونوں قومیں بڑی حد تک جدا رہیں نارمن بلند مرتبہ سمجھے جاتے جنھوں نے اپنے زور بازو سے انگریزوں کو مطیع کیا تھا اور انگریز پست درجے کے سمجھے جاتے جو اپنے فاتحین کے لئے سخت کام کرتے تھے۔

یہ حالت تقریباً دو صدی تک رہی چنانچہ انگریز پرانی سادہ زندگی بسر کرتے رہے اور قدیم انگریزی ہی کو بول چال کا ذریعہ بنائے رہے اور باوجودیکہ نارمنوں نے اپنی تہذیب اور زبان کو رواج دینے کی بہت کوشش کی لیکن انگریزوں نے اس تہذیب کو ہرگز قبول نہ کیا لیکن پھر بھی زبان نارمنوں سے محفوظ نہ رہ سکی۔ حاکم زبان کا اثر محکوم باشندوں کی زبان پر پڑنا ضروری تھا چنانچہ نارمنوں کی زبان کے بہت سے الفاظ قدیم انگریزی میں بھرتی ہو گئے جو بول چال میں عام طور پر استعمال ہونے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں کی تعداد میں نئے الفاظ انگریزی میں داخل ہو گئے بہادری اور جنگ کے بیان کرنے میں مثلاً (Tournament، captain خطابات اور عہدے مثلاً Vicar، prince، Dhke وغیرہ، حکومت اور قانون میں مثلاً Peeliament Jirdge وغیرہ شکار اور دوسرے شغلوں میں مثلاً catch، chase mnion ہا وغیرہ طباخی میں مختلف گوشت کی وضاحت اور تخصیص کے لئے (veal، pork، Multon، Beef وغیرہ الفاظ انگریزی زبان میں نہ صرف داخل ہو گئے بلکہ عام طور پر بے تکلفانہ استعمال کئے جانے لگے اور وہ انگریزی زبان کے ساتھ ایسے شیر و شکر ہو گئے کہ ان کی پہچان مشکل ہو گئی۔

فتح نارمن کے بعد کئی صدی تک ایسا زمانہ رہا جس میں تمام یورپ ایک قسم کی نیند میں تھا۔ علم کا شوق کم ہو گیا تھا۔ سائنس اور دیگر فنون میں کسی قسم کی ترقی نہ ہوئی تھی۔ چنانچہ یہ "عہد تاریک (Dark age)" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے لیکن اس کے بعد فطرتاً بیداری کے آثار نمایاں ہوتے رہے لوگ عام طور پر اطراف و اکناف کے حادثوں اور واقعات پر غور کرنے لگے۔ سوچنے سمجھنے لگے۔ اور کولمبس جیسے سیاح سیاحت عالم کے لئے نکلے۔

یہ تحصیل علم کا زمانہ "عہد بیداری" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے یہ دور چودھویں صدی عیسوی سے شروع ہوا اور اب یہ اپنی انتہائی منازل طے کر رہا ہے۔ انگلستان میں اس دور کے عمدہ نتائج ملکہ الزبتھ کے عہد حکومت میں رونما ہوئے۔ ہر قسم کی کتابیں خصوصاً یونانی زبان میں تحریر کی ہوئی کتابیں جستجو اور محنت سے جمع کی جانے لگیں۔ اور لوگ ان کو شوق سے پڑھنے لگے۔ مردہ زبانوں نے نیا جنم لیا اور یونانی اور لاطینی الفاظ پھر ایک دفعہ کثرت کے ساتھ انگریزی میں استعمال کئے جانے لگے۔

یہ دوسرا اہم واقعہ ہے کہ لاطینی اور یونانی الفاظ کو لوگوں نے قبول کیا۔ ہر لفظ ایک خاص خیال اور مطلب کا حامل تھا۔ اس لئے الفاظ کی بھرمار ہونے لگی۔ اور یہ الفاظ تعلیم یافتہ طبقہ تک محدود تھے۔ علماء، وکیل اور پادری ان الفاظ کو بہت بے تکلفی سے استعمال کرتے تھے۔ اس کا اس قدر گہرا اثر ہونے لگا کہ لوگوں کو ڈر ہوا کہ کہیں انگریزی لاطینی اور یونانی میں ضم نہ ہو جائے۔ عیسائی مذہب کی ابتداء۔ نارمنوں کی فتح۔ عہد بیداری کا اثر یہ تینوں واقعات انگریزی زبان کی تاریخ میں تو بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ خصوصاً عہد بیداری کے بعد سے بہت سی زبانوں کے الفاظ انگریزی بول چال میں استعمال ہونے لگے تھے اور آج کل یہی زبان عالمگیر زبان ہونے کا دعویٰ کر رہی ہے نیز شدت کے ساتھ اس بات پر زور دیا جا رہا ہے کہ ہند میں قومی زبان اسی انگریزی کو قرار دیا جائے۔

یہ امر بہت مشکل ہے کہ ہم غیر زبان کے ان الفاظ کی صحیح صحیح تعداد بتلا سکیں جو انگریزی میں شریک کر لئے گئے ہیں۔ یا یا الفاظ دیگر انگریزی میں گھل مل گئے ہیں کہ ہم بلا تکلف انگریزی بول چال میں (بلالحاظ اس کے کہ وہ غیر زبان کے ہیں) استعمال کرتے ہیں یہ امر یقینی ہے کہ غیر زبانوں کے تقریباً ۳ لاکھ الفاظ انگریزی میں مستعمل ہیں۔ شیکسپیر نے

جس کے مضامین کی تعداد سب مضمون نگاروں کے مضامین کی تعداد سے جدا جدا زائد ہے تقریباً بارہ ہزار غیر زبانوں کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ ایک تعلیم یافتہ شخص کم سے کم چھ ہزار غیر زبان کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ معمولی زندگی میں دو ہزار الفاظ کا استعمال ضروری اور کافی ہے۔

ان الفاظ کے انبار میں جو انگریزی کی بڑی بڑی لغتوں میں ملتے ہیں صرف چند ہزار الفاظ قدیم انگریزی کے ہیں جو بجا طور پر "انگریزی الفاظ" کہلانے کے مستحق ہیں لیکن پھر بھی ہم اس مخلوط زبان کو انگریزی کہتے ہیں اور آئندہ نسلیں بھی اس زبان کو انگریزی ہی کہیں گی۔

شریف النساء بیگم

اردو کی نئی کتابیں

۱۔ اندھا دیوتا (تین افسانوں کا ترجمہ) مرتبہ سید احسان علی شار قیمت (عہ)

۲۔ بربط ناہید (مکتوبات) از جہاں بانو بیگم ایم اے (عثمانیہ) ۱۶۴ صفحات قیمت (عہ)

۳۔ عروس سخن (میر انیس کے چند مرثیے) مرتبہ بیگم رضا ۱۵۰ صفحات قیمت عہ

۴۔ بلبل بیمار (مجموعہ مضامین) از علامہ راشد الخیری مرحوم قیمت ۱۰ر

۵۔ سچے افسانے (تاریخی افسانے) از گوپال متل بی اے ۳۰۰ صفحات قیمت عہ

۶۔ کالیداس اور ودیا (ڈراما) از پنڈت جگدیش چندر جوش قیمت ۸ر

۷۔ امیر العروض (عروض اور قافیہ کے اصول) از بزمی انصاری بی اے ۲۰۰ صفحات قیمت عہ ۱۲ر

۸۔ لب المجربات تیسرا ایڈیشن (مجرب نسخے) از حکیم ولبر حسن خاں ۲۴۲ صفحات قیمت عاں۔

۹۔ ایشیا کے بڑے لوگ چار حصے (چند مشاہیر کے حالات) از محمد مرزا قیمت عاں۔

۱۰۔ دوشیزۂ صحرا (افسانہ) از صادق الخیری قیمت عہ

۱۱۔ ساز فطرت (افسانے) از حسن عزیز جاوید قیمت عہ ۴ر

۱۲۔ فرشتوں کا امتحان (مزاحیہ) از حاجی لق لق قیمت ۸ر

۱۳۔ لمحات رنگین (افسانے) از زبیدہ سلطانہ قیمت عاں۔

۱۴۔ نیلوفر (افسانے) از حسن عزیز جاوید قیمت عہ ۴ر

۱۵۔ مشیر عالم ڈائرکٹری (مشاہیر دکن کے حالات) مرتبہ سید عباس حسین صمصام قیمت عہ۔

۱۶۔ یورپ کی خونی سیاست (یورپ کے انقلاب کی تفصیل) از سید تصور حسین ۱۳۶ صفحات قیمت ۸ر

۱۷۔ جوش عمل (سیاسی نظموں کا مجموعہ) از محمد مصطفیٰ خاں احمق ۱۵۰ صفحات قیمت ۱۲ر

۱۸۔ رباعیات حیدر از حیدر دہلوی ۱۲۵ صفحات قیمت عہ

۱۹۔ عصر نو (نظموں کا مجموعہ) از محمد صادق ضیا ۸۴ صفحات قیمت ۴ر

۲۰۔ مہابلی بھیم (سوانح) از سیلا رام وفا ۴۶ صفحات قیمت ۲ر

۲۱۔ قائد اعظم (سوانح محمد علی جناح) از ایم اے سلام ۸۴ صفحات قیمت ۶ر

۲۲۔ ترکوں کا باپ (سوانح مصطفیٰ کمال) از ایم اے سلام ۵۴ صفحات قیمت ۶ر

۲۳۔ اسرار شریانیہ (نبض کی تحقیق) از حکیم محمد عبد الوہاب انصاری ۸۰ صفحات قیمت ۸ر

۲۴۔ نگارشات (ادبی مضامین وغیرہ) از آغا محمد باقر ۲۶۲ صفحات قیمت عہ

۲۵۔ بندے ماترم از محمد داور حسین ۵۰ صفحات قیمت ۲ر

۲۶۔ حیدرآباد اور آئینی اصلاحات از سید احمد عارف ۵۶ صفحات قیمت ۲ر

۲۷۔ اندرون حیدرآباد از خالد ادیب خانم ۴۲ صفحات قیمت ۲ر

مرزا سیف علی خاں

حالاتِ حاضرہ

برطانیہ کے مقاصدِ جنگ۔ فروری کے پہلے ہفتے میں وزیر جنگ آئیون ہا سٹیلی صاحب نے نیوکاسل میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہمارا ایک جنگی مقصد ہے اور وہ جنگ کا جیتنا ہے ہم صلح چاہتے ہیں مگر ایسی صلح جو پائدار ہو۔ اس کے بعد انھوں نے کہا "معاہدہ ورسائی میں خامیاں چاہے کتنی ہی ہوں لیکن اس کا محرک صرف یہی خیال تھا کہ دوسری قومیتوں کو جرمن حکمرانی سے آزاد کردیا جائے۔ جرمن معاہدہ ورسائے کو امن کے منافی سمجھتے ہیں لیکن اگر جرمنی جنگ میں کامیاب ہوجائے تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ برطانیہ کے ساتھ کم ازکم معاہدہ ورسائے کی طرح کا کوئی معاہدہ کرے گا۔ اس کے برخلاف برطانیہ اپنی سلطنت' بیڑے اور تجارت سے محروم ہوکر ایک چھوٹا سا گنجان جزیرہ بن جائے گا اور اس کی بحالی ناممکن اور بقا مشتبہ ہوجائے گی۔ اپنی حدتک ہم جرمنی یا جرمنوں سے کچھ نہیں چاہتے۔ ہم ان کی تباہی کی خواہش نہیں رکھتے۔ ہم کو ان کی خوشحالی سے شکایت نہیں۔ ہم ان کو ایسے غلام کسان نہیں بنانا چاہتے جو انھوں نے لاکھوں آدمیوں کو بنایا اور نہ ہم ان کی زمین کو صحرا بنانا چاہتے ہیں جس طرح انھوں نے ایک ربع یورپ کو بنادیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ وہ پُرامن اور خوشحال یورپ کے پُرامن اور خوشحال رکن رہیں لیکن موجودہ یا کسی دوسرے دور میں ان کو اس کا اختیار کبھی نہ ملنا چاہیے کہ دنیا کو مصیبت اور بلا میں مبتلا کریں۔"

ایران اور امریکہ۔ ایران اور امریکہ کے درمیان اب خوشگوار تعلقات قائم ہوگئے ہیں صرف تین سال پہلے ان دو ملکوں کے درمیان کشیدگی پیدا ہوگئی تھی۔ اس کشیدگی کی بنا یہ تھی کہ ایرانی وزیر کو موٹر تیز چلانے کی وجہ سے میری لینڈ میں ایک پولیس کے جوان نے روک دیا تھا۔ شاید معمولی بات چیت سے معاملہ آگے کو بڑھا اور نتیجہ یہ ہوا کہ ایرانی وزیر کو گرفتار کرلیا گیا۔ بعد میں جب یہ معلوم ہوا کہ ایرانی وزیر کو سفارتی استثناء حاصل ہے تو اس کو چھوڑ دیا گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی امریکہ کے سکرٹری آف اسٹیٹ کارڈل ہل صاحب نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ سفارتی استثناء کے یہ معنی نہ ہونے چاہئیں کہ مستثنیٰ آدمی اس کو خلاف ورزی قانون کا پروانہ سمجھنے لگے۔ بلکہ ایسے لوگوں کو چاہیے کہ خود ذمہ داری کا احساس پیدا کریں۔ اس طرزِ عمل سے حکومتِ ایران ناخوش ہوگئی اور اس لئے اپنے وزیر کو امریکہ سے واپس بلالیا۔

جنوبی افریقہ۔ جس وقت سے جنرل اسمٹس نے اپنی نئی کابینہ بنائی ہے' افریقہ کی شرکتِ جنگ کے متعلق برابر اختلاف کیا جارہا ہے اور ہرٹزاگ اور ملن کی جماعت نے اسمبلی میں اور اسمبلی سے باہر خوب شور مچایا لیکن نئی حکومت نے اختلاف کو عرصہ تک دبائے رکھا اور مخالفوں کو عدم اعتماد کی تحریک کے پیش کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ جنرل اسمٹس اتنی مخالفتوں کے باوجود اپنے مسلک پر برابر قائم ہیں۔

سردی اور جنگ۔ اس سال فرانس میں اتنی زیادہ سردی پڑی ہے کہ شاید پچھلے کئی سال سے ایسی سخت سردی نہیں ہوئی۔ چنانچہ اب ۲۰ درجہ حرارت ہے۔ اس کی وجہ سے اتحادیوں اور جرمنی کے درمیان برف کی ایک سدِ سکندری حائل ہوگئی ہے اور ہر ایک فریق اپنے سپاہیوں اور جانوروں کو سردی سے محفوظ رکھنے کی فکر میں ہے جس کی وجہ سے ان کو لڑائی کا خیال بھی نہیں رہا۔ لیکن بحری جنگ برابر جاری ہے اور شاید پچھلے پانچ مہینوں سے زیادہ سخت ہو رہی ہے۔ اطالیہ امریکہ اور جاپان کو چھوڑ کر جو طاقتور غیر جانبدار ممالک ہیں' دوسرے تمام ملکوں کے جہاز خطرے میں

ہیں کیونکہ جرمن یوبوٹ ان پر بغیر اطلاع کے حملہ کر دیتی ہیں۔

۲۸۷ جہاز۔ جنگ کی ابتدا سے اس وقت تک ۲۸۷ جہاز غرق ہو چکے ہیں۔ ان میں سے ۱۶۲ برطانوی جہاز ہیں جس کے یہ معنی ہیں کہ جنگ شروع ہونے کے بعد سے اب تک جرمنی نے روزآنہ ایک برطانوی جہاز ڈبو دیا۔ غیر جانبدار ملکوں کے ۱۶۵ جہاز ڈوبے جن میں سب سے زیادہ نقصان ناروے اور سویڈن کا ہوا۔

ان نقصانات کے جواب میں اتحادیوں نے ۳۲ جرمن جہازوں کو ڈبو دیا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جرمنی کے نقصانات متحدین کے نقصانات کے مقابلے میں بہت حقیر ہیں لیکن بات یہ ہے کہ جرمنی کے پاس جہازوں کی تعداد بہت کم ہے اور اسی تعداد کا لحاظ کرتے ہوئے جرمنی کا بہت بڑا نقصان ہے۔

جہاز اور آبدوز۔ فروری کے مہینے میں بہت سے جہاز غرق ہوئے جن میں سے بعض غیر جانبدار ملکوں کے جہاز تھے اور بعض برطانوی۔ ان میں سے چند حسب ذیل ہیں۔

۱۳ فروری کو سویڈن کا ایک دخانی جہاز "اورہنیا" (۲۸۵۸ ٹن) دشمن کے تارپیڈو کا شکار ہوا۔ اس جہاز کے ۱۰ آدمیوں کو ایک برطانوی جہاز نے بچا لیا۔ اسی دن سویڈن کا ایک اور دخانی جہاز "ڈالارو" (۳۹۲۰ ٹن) بحر اوقیانوس میں ڈوب گیا لیکن یہ نہ معلوم ہو سکا کہ ڈالارو سرنگ سے ٹکرایا یا تارپیڈو کی وجہ سے ڈوبا۔ ۱۴ فروری کو ناروے کا ایک حربی جہاز "اسنٹاڈ" (۴ ہزار ٹن) جو امریکہ جا رہا تھا ایک دھماکہ سے ڈوب گیا۔ دھماکہ یا تو سرنگ سے ہوا یا تارپیڈو سے۔ ناروے کا ایک دخانی جہاز "نیداہوم" (۲۳۴۲ ٹن) بھی جو امریکہ جا رہا تھا اسی دن ڈوب گیا۔ جہازیوں کو ناروے کے ایک دوسرے جہاز نے بچا لیا۔ ۱۵ فروری کو ڈنمارک کے ایک دخانی جہاز "کرسٹین ایئرسک" کو جرمن آبدوز نے ڈبو دیا۔ اس کے ۳۰ ملاحوں کو ایک برطانوی طیارے نے بچا لیا۔ ڈنمارک کا ایک اور جہاز "مارٹن گولڈشمڈٹ" بھی ڈوب گیا۔ ۱۶ فروری کو اطالیہ کا ایک تجارتی جہاز "جیواولیس" (۵۶۹۴ ٹن) ایک سرنگ سے ٹکرا کر غرق ہو گیا۔ ان کے علاوہ ہالینڈ کا ایک جہاز "برگرڈاجک" بھی تارپیڈو سے ڈوب گیا۔

۱۴ فروری کو برطانیہ کے تین بڑے جہاز "کرسٹافیلڈ" "برٹش ٹرایمف" اور "سلطان اسٹار" ڈوب گئے۔ برٹش ٹرایمف ۸۵۰۱ ٹن کا جہاز تھا جو بحر شمالی میں ایک دھماکے کے بعد الٹ گیا اور سلطان اسٹار ۱۲۰۰۰ ٹن کا تھا جو تارپیڈو کا شکار ہوا۔ لیکن ان برطانوی جہازوں کو غرق کرنے والی دو جرمن آبدوزوں کو بھی تباہ کر دیا گیا۔

فنستان کی جدوجہد۔ میانرہیم لائن پر روسیوں نے پوری توجہ لگا دی ہے اور روسی فوجیں اس جگہ خوب دباؤ ڈال رہی ہیں۔ لیکن فنستانی بھی روسیوں کے مقابلے میں اپنی پوری قوت کے ساتھ ڈٹ گئے ہیں۔ فنستانیوں کے لیے یہ بات بھی ہمت افزا ہے کہ برطانیہ نے اس چھوٹی سی مملکت کی عملی طور پر مدد کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔

فروری کے تیسرے ہفتے میں صدر فنستان ایم۔ کالیو نے ہلسنکی میں ایک بیان دیا جس میں وہ کہتے ہیں "فنستان اپنی آزادی کے لئے لڑ رہا ہے اور ہماری جدوجہد یقیناً ہماری کامیابی کی ضامن ہے۔ اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ اس امداد کو جو جلد اور موقع پر پہنچائی جائے۔ بہت بڑی امداد سمجھنا چاہیے اور ہمیں امید ہے کہ دوسرے ہمدرد ملکوں کے سپاہی بہت جلد ہمارے دوش بدوش لڑنے کے لئے آ جائیں گے۔ ہم کو مدد کی سخت ضرورت ہے اور اس سے کہیں زیادہ مدد کی ضرورت ہے جو اب تک ہم کو ملی۔

اطالیہ کی تیاری۔ فروری کے دوسرے ہفتہ میں مسولینی نے مسلسل پانچ دن تک مدافعتی اعلی کونسل کے اجلاس منعقد کئے۔

روم کی بعض اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ کس کونسل نے اطالیہ کو جنگ کے لئے باطل تیار کردینے کا تصفیہ کیا ہے۔ اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اطالیہ کو جرمنی اور روس کے متحدہ حملے کا خوف ہے یا کسی ایک سے حملہ کا ڈر ہے؟ اور اگر بلقان پر جہاں اطالیہ کا زیادہ مفاد ہے حملہ ہو جائے تو اطالیہ کیا کرے گا؟

اب یہ امر قرین قیاس نہیں ہے کہ ہٹلر اور مسولینی اپنے پچھلے اختلافات سے درگزر کرکے بلقان میں البانیہ کی طرح کوئی نیا گل کھلائیں گے۔ البتہ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اطالیہ اپنے مفاد کے تحفظ کی خاطر یقیناً کوئی کارروائی کرے گا اور اس قسم کے اقدام کو اتحادی مستحسن نظروں سے دیکھیں گے۔

ہندوستان

گاندھی جی کا بیان۔ گورنر جنرل اور گاندھی جی کے درمیان حالیہ گفتگو کے بعد جب گاندھی جی دلی سے ناکام لوٹے تو انھوں نے ہریجن میں ایک مضمون لکھا۔ اس میں انھوں نے کہا کہ اس ناکامی کو ناکامی نہیں سمجھنا چاہیے۔ پھر وائسرائے بہادر کے خلوص کی تعریف کرتے ہوئے گاندھی جی نے کہا کہ ان کو برطانوی حکومت کے مسلک کی پابندی کرنی پڑتی ہے اور یہ کہ وہ ایک طرح سے معذور سمجھے جانے چاہئیں۔ اس کے بعد گاندھی جی نے کانگریس کی بعض کمزوریوں کا بھی اعتراف کیا اور کہا کہ پہلے ان کمزوریوں کو دور کر لینا چاہیے۔ اسی ضمن میں گاندھی جی نے مسلمان اور دوسری ملتوں کے ساتھ تعلقات پر بحث کی کہ "کانگریس کو چاہیے کہ انھیں راضی کرے" ان کا روئے سخن خاص طور پر مسلمانوں کی طرف ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں "ہم قائد اعظم جناح کی غیر ملکی اور سراسر غیر قومی روش کو اپنے ذہن سے خارج کر سکتے ہیں لیکن ہم مسلمانوں کو اپنے غور و خوض سے خارج نہیں کر سکتے۔" مسلمانوں کو کانگریس کے حلقے میں لانے کے لئے گاندھی جی یہ تدبیر بتاتے ہیں کہ "کانگریس کمیٹیوں، مقامی جماعتوں اور اسی قسم کی مجالس کے بعض انتخابات میں زیادہ مسلمانوں کو منتخب ہونے کا موقع دیا جائے۔"

وزیر ہند کی توقعات۔ فروری کے دوسرے ہفتے میں لارڈ زٹلینڈ نے ایک اخباری نمایندے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ گاندھی و وائسرائے گفت و شنید کی ناکامی سے انھیں مایوسی اور حیرانی ہوئی۔ اس کے بعد وزیر ہند نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ تجدید کا دروازہ بند نہیں ہوا۔ انھوں نے کہا کہ گاندھی جی کے اس بیان سے جو انھوں نے ابھی چند روز پہلے دیا ہے۔ ظاہر ہوتا ہے کہ کانگریسی رہنما اپنے ابتدائی مطالبات سے بالکل نہیں ہٹے۔ اس کے بعد لارڈ زٹلینڈ نے یہ توقع ظاہر کی کہ کانگریسی رہنما ان مشکلات کا زیادہ لحاظ کریں گے جو ان کے مطالبات کی تکمیل کی نسبت برطانوی حکومت کی راہ میں حائل ہیں۔

یارک شائر پوسٹ اور کانگریس۔ ۰ر فبروری کو لندن کے مشہور اخبار یارک شائر پوسٹ نے ایک افتتاحی مقالہ میں چند سوال کئے ہیں۔ وہ پوچھتا ہے کہ ہندوستانی اور برطانوی سیاست دانوں پر اعتماد اشتراک کو کونسی چیز روکتی ہے؟ ہندوستان کی جانب سے بولنے اور ان کی نسبت فیصلہ کرنے کا اختیار کس کو حاصل ہے؟ اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ جب تک خود ہندوستانی اس سوال کا متفقہ جواب نہ دیں کانگریسی مطالبات پر برطانیہ سر نہیں جھکا سکتا۔ پھر وہ لکھتا ہے کہ ہندوستان میں برطانیہ کو اپنے باعزت مفادات پورے کرنے ہیں اسے مسلمانوں اور دیگر ملتوں کے مستقبل کا تحفظ اور والیان ریاست کی نسبت اپنی پابندیوں کا احترام کرنا ہے۔ اگرچہ برطانوی عوام ہندوستانی باشندوں کو کامل قومیت کی شاہراہ پر گامزن دیکھنے کے مشتاق ہیں لیکن برطانیہ اپنی اس ذمہ داری سے دست بردار نہیں ہو سکتا کہ ہندوستان کے خارجی اور داخلی تحفظ کو برقرار

رکھے اور اس کا یقین دلائے کہ اس ملک کی تمام قومیتوں سے انصاف کیا جائے گا۔ برطانوی باشندوں کو ہندوستانی جذبات سے گہری ہمدردی ہے لیکن برطانیہ ہندوستانی ترقی میں بہت کم مدد دے سکتا ہے تاوقتیکہ خود ہندوستانی جماعتیں تعاون کرنا نہ سیکھیں۔

کانگریس کا نیا صدر۔ اس سال کانگریس کی صدارت کے لئے ایم۔ این رائے اور ابوالکلام آزاد بطور امیدوار کھڑے ہوئے تھے ۱۶ر فبروری کے اعلان کی بموجب ایم۔ این رائے کو ۱۸۳ رائیں ملیں اور آخر الذکر کو (۱۸۶۴) اس طرح مولانا آزاد (۱۶۸۱) آراء کی کثرت سے کانگریس کے صدر منتخب ہو گئے۔

مسلم لیگ کا سالانہ جلسہ۔ کل ہند مسلم لیگ کا سالانہ جلسہ لاہور میں ۲۲، ۲۳، ۲۴ مارچ کو منعقد ہو رہا ہے۔ ملت اسلامیہ کے اجتماعی مسائل اور موجودہ بین قومی نازک صورت حال کی وجہ سے اس جلسے کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس میں ہندوستانی مسلمانوں کے علاوہ غالباً بیشتر اسلامی مملکتوں کے نمایندے بھی شریک ہوں گے۔ مسٹر جناح جلسے کی صدارت کر رہے ہیں۔

سندھ۔ سندھ کے صدر اعظم خان بہادر اللہ بخش نے ۱۵ر فبروری کو استعفاء دے دیا ہے۔

اردو علم و ادب تنقید و تعلیم سیاست و ظرافت فنیات و معلومات کا

مجموعہ "شاہکار" لاہور ماہنامہ

ملک کے فاضل نقاد علامہ تاجور و خواجہ محمود جعفری ایم اے

کی اڈیٹری میں مشرق و مغرب کے بلند ادبیات کا خزینہ بن کر شائع ہو رہا ہے۔ سات رنگ کا بیحد حسین سرورق۔ آرٹ کی سہ رنگی و یک رنگی دلکش تصاویر ۲۰×۲۶ م ۲۷ جہازی صفحات جن میں عام تین رسالوں کے مضامین سماتے ہیں۔

مشاہیر شعراء کی روح پرور نظمیں، وجد آفرین تازہ افسانے۔ اردو ادب اور اصناف ادب پر تاریخی و تنقیدی بلند تبصرے۔ ہندوستان اور آزاد ممالک کے تعلیمی نظریات زندگی اور دنیا کے متعلق تازہ حالات، ظریفانہ و سیاسی مضامین کے علاوہ انگریزی، عربی، فارسی، ہندی زبانوں کے تازہ رسالوں سے بلند مضامین نظم و نثر کے دلکش حصوں کا انتخاب دے کر شاہکار کے پڑھنے والوں کو ترقی یافتہ زبانوں کے علمی ادبی رسالوں کے مطالعے سے بے نیاز کر دیا جاتا ہے۔ سالانہ چندہ چھ روپے۔ نمونے کا پرچہ پانچ آنے کے ٹکٹ بھیجنے پر۔

نادار صاحب ذوق خریداروں سے رعایتی چندہ بذریعہ پیشگی منی آرڈر صرف چار روپے۔ آٹھ آنے۔

پتہ:- دفتر رسالہ شاہکار بیڈن روڈ لاہور

بچوں سے

سب رس کے تیسرے سال کا تیسرا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ سب رس نے اس قلیل مدت میں جو ترقی اور اردو کی خدمت کی ہے اس سے آپ سب واقف ہیں۔ ادارۂ ادبیات اردو نے اس مدت میں اردو کی ترقی کے لئے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ ادارہ نے مختلف شعبے قائم کر کے اپنے کام کو اور وسیع کیا ہے۔ ہر ایک شعبہ اپنی جگہ پر برابر کام انجام دے رہا ہے۔ بچوں اور طلبہ کے لئے بھی دو شعبے قائم ہیں ایک شعبۂ اطفال ہے جو بچوں کے لئے چھوٹی چھوٹی کتابیں شایع کر رہا ہے جس میں وہی لوگ ہیں جو اس کام سے واقف اور جنھیں اس کام سے دلچسپی ہے۔ ایک اور شعبے کا قیام حال ہی میں عمل میں آیا جس سے آپ بخوبی واقف ہیں اس سے مراد شعبۂ طلبہ ہے۔ اس شعبہ میں زیادہ تر طلبۂ وسطانیہ اور فوقانیہ کے طلبہ ہیں۔ اس کے جلسے مہینہ میں ایک دو بار ضرور ہوتے ہیں۔ طلبہ میں ابھی سے تقریر کرنے کا شوق پیدا کرایا جا رہا ہے۔ ادارۂ ادبیات اردو کا ہمیشہ سے یہ مقصد رہا کہ بچوں، بچیوں اور طلبہ کی طرف پہلے توجہ کرنی چاہیے اور انھیں ایک ایسے راستے کی طرف متوجہ کرنا چاہیے جو اُن کے لئے مفید ہو۔ یہی نوجوان طلبہ ہی اردو کی خدمت اچھی طرح انجام دے سکتے ہیں اور بڑے ہو کر اپنے ملک اور زبان کی خدمت کے قابل بن سکتے ہیں آپ سب کو چاہیئے کہ ادارہ کا ہاتھ بٹائیں اور خود بھی اس میں حصہ لے کر اردو کی ترقی کے لئے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں۔ ایسا کرنے میں آپ کا بھی فائدہ ہے اور ادارہ کا بھی۔ اور سب سے بڑھ کر اپنی پیاری زبان اردو کا۔

اس عرصہ میں شعبۂ طلبہ کے کئی جلسے ہوئے۔ ایک جلسے میں پروفیسر سید محمد صاحب ام اے نے "ہمارے طلبہ اور ہماری زبان" پر ایک مفید اور دلچسپ تقریر کی، اور طلبہ کو توجہ دلائی کہ وہ اردو کی ترقی کے لئے کوشش کریں، اور بات چیت آسان اور سلیس زبان میں کریں تاکہ ہر ایک ہماری زبان سمجھ سکے۔ ایک اور جلسہ ۲۰ فروری سنہ ۴۶ء کو ہوا جس میں طلبہ نے مختلف عنوانات پر اپنے لکھے ہوئے مضمون سنائے۔

اکثر بچوں نے فروری کے پرچے کی تعریف کی ہے کیونکہ اس میں بڑے ہی مفید اور دلچسپ مضمون چھپے تھے۔ آپ توقع رکھئے کہ اب اسی طرح ہمیشہ چھپا کریں گے۔ ضرورت اس کی ہے کہ آپ اپنے دوستوں اور ساتھیوں کو اس کے پڑھنے کا شوق دلائیں۔ ہر لایق، اور ترقی کرنے والا لڑکا یا لڑکی سب رس ضرور خریدتا ہے اور بڑے شوق سے اس کے پرچے جمع کر کے سال بھر کا فائل مکمل کرتا ہے۔ چنانچہ سب رس کے دفتر میں اکثر پرانے رسالوں کی خریدی کے خط آتے ہیں مگر افسوس ہے کہ ہمارے یہاں بعض پرچے ختم ہو گئے ہیں۔ اگر آپ میں سے کسی کے یہاں ۱۹۳۵ء کے ماہ جنوری و فروری کے پرچے اچھی حالت میں ہوں اور آپ ان کو فروخت کرنا چاہتے ہیں تو دفتر سب رس کو ایک کارڈ ڈال دیجئے۔ دفتر سے اصل قیمت روانہ کر کے پرچے حاصل کر لئے جائیں گے۔

معمّہ کے حل تو وصول ہوئے مگر معلوم ہوتا ہے کہ اکثروں نے بعض الفاظ کے معنی نہیں سمجھے وہ اپنے استاد صاحب سے دریافت کر لیں اور پھر معمّہ کا صحیح حل روانہ کریں۔

پھر ایک ماہ بعد ملاقات ہو گی۔ خدا حافظ

معین الدین احمد انصاری

علم

"بیاموز جز علم گر عاقلی   کہ بے علم بودن بود غافلی"

علم کی غایت اصلی عرفان الہٰی حاصل کرنا اور نیکی اور بدی میں تمیز کرنا ہے۔ علم ہی سے انسان کو خدا تعالیٰ کی شناخت حاصل ہو سکتی ہے۔ جب ایک عالم شخص موجودات عالم یعنی بلند آسمان، متجلی سیارے، وسیع زمین، عمیق سمندر، گونا گوں نباتات، عجیب و غریب حیوانات اور رنگا رنگ جمادات پر نظر کرتا ہے۔ اور پھر ان کے نظام و حرکات تغیر و تبدل حیات و ممات، ماہیت و حقیقت پر غور کرتا ہے تو وہ خالق عالم کی ہستی مطلق، اس کی قدرت و حکمت اور عظمت و جبروت پر دل سے یقین کرتا اور بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

یوں تو موجوداتِ عالم کو ہر شخص دیکھ سکتا ہے۔ لیکن جاہل و عالم کے مشاہدے میں زمین و آسمان کا فرق ہے اس کی نظر سطحی ہوگی اور یہ جہاں سے جہاں آفریں کا پتہ لگاتا اور سبب سے مسبب کی حقیقت دریافت کرتا ہے۔ سعدی علیہ الرحمہ نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

"کہ بے علم نتواں خدا را شناخت"

علم کا دراصل خلاصہ یہ ہے کہ انسان خدا تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی صفات اعلیٰ سے آشنا ہو۔ اور اچھی بری باتوں کی تمیز پیدا کرے اور ہر ایک امر کی کماحقہٗ حقیقت سے واقف ہو جائے۔

علم کا حاصل کرنا فرائض انسانی میں داخل ہے۔ چنانچہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے "طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ وَّ مُسْلِمَۃٍ"۔ علم ایک ایسا بحر ناپیدا کنار ہے کہ بڑے سے بڑا شناور اس سمندر کو عبور نہیں کر سکتا۔

علم ہی سے انسان اشرف المخلوقات کہلانے کا مستحق ہے اسی سے انسان کی خوبیاں اور کمال چمک جاتا ہے اور اسی کی مدد سے وہ ہر کام کو عمدگی اور خوش اسلوبی سے انجام دے سکتا ہے۔ دنیا نے جو کچھ ترقی کی ہے اور ایجادات و اختراعات ہوئی ہیں۔ سب علم ہی کے بدولت ہیں چنانچہ سائنس جو علم و عقل کا مجموعہ ہے۔ ایسی عجیب و غریب اور نادر الوجود اشیاء جس کو دیکھ کر معمولی علم و عقل کا آدمی دنگ رہ جاتا ہے۔ ایجاد کرتی ہے جیسے "بجلی کی روشنی" "ہوائی جہاز" "ٹیلیفون" وغیرہ جن کی وجہ سے بنی نوع انسان کو ہر طرح کا آرام و آسائش حاصل ہے۔

علم سے دولت مل سکتی ہے لیکن دولت سے علم نہیں حاصل ہو سکتا۔ علم ہی سے ناموری و شہرت ہوتی ہے۔ عالم لوگوں ہی کی یاد صفحۂ دنیا پر باقی ہے جتنے بڑے بڑے مصنف گزرے ہیں وہ سب اگر عالم نہ ہوتے تو کوئی ان کو جانتا تک نہیں ان کی تصنیفات ہی ان کے شہرہ کا باعث ہوئیں نہ صرف ان کی شہرت کا بلکہ ان کی بھی جن کے حالات انھوں نے بیان کئے ہیں۔ بقول فردوسی

منش کردہ ام رستم پہلواں   وگرنہ یلے بود در سیستاں

علم ایک ایسی لازوال دولت ہے جس کے ضایع ہونے کا کوئی خوف و اندیشہ نہیں۔ حصولِ علم سے ایسا سرور حاصل ہوتا ہے کہ دنیا کی کوئی مسرت اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔

علم سے محروم رہنا بڑی بدنصیبی کی بات ہے۔ جاہل آدمی مثل ایک اندھے کے ہے۔ گو اس کی آنکھیں موجود ہیں۔ لیکن وہ دوسروں کی آنکھوں کا محتاج' وہ دنیا میں ہے گر دنیا کے حالات سے بے خبر' مخلوقات دنیا کو دیکھتا ہے لیکن ان کی حقیقت سے نابلد۔ غرض کسی چیز سے کما حقہٗ فائدہ نہیں حاصل کرسکتا حتیٰ کہ اپنے فطری جوہر کو بھی کام میں نہیں لاسکتا۔ مگر جاہل سے بھی زیادہ بدنصیب وہ صاحب علم ہیں جو علم جیسی دولت کو ملازمت کے بھینٹ چڑھاتے ہیں۔ یعنی صرف ملازمت کے لئے علم حاصل کرتے ہیں۔

علم کا مقصد' معرفت' تزکیۂ نفس و درستی اخلاق ہونا چاہیے کہ آخرت اچھی ہو یا بہبود خلایق و رفاہ عام' نہ کہ ملازمت و غلامی۔

بدیں اے فرومایہ دنیا مخر
جوے خر بہ انجیل عیسیٰ مخر"

معصومہ بیگم

سماج میں عورت کا درجہ

اسلام نے عورت کو ایسے حقوق دیئے ہیں جو اس سے پہلے اس کو کبھی حاصل نہ تھے۔ وہ تمام جائز اختیارات اور کاموں میں مرد کے بالکل برابر رکھی گئی۔

وراثت کے مسئلے اور جائداد کے شخصی حصہ میں مسلمان عورت کا درجہ دوسرے مذہب کی عورتوں سے بہت بہتر ہے۔

مرد کو اپنے والدین اور عزیز جو جائداد چھوڑیں اس میں سے ایک حصہ لینا چاہیے۔ قرآن کہتا ہے کہ عورت کو اس کے والدین اور عزیز کی جائداد کا ایک مخصوص حصہ ملنا چاہیے۔ اس طرح جو وہ سو برس پہلے اسلام نے عورت کو حق جائداد دیا۔ لیکن انگلستان میں ۱۸۸۲ء تک عورت کو ایسا حق حاصل نہ تھا اور فرانس میں اس کو اس وقت تک یہ حق حاصل نہیں ہے۔ ایک مسلمان عورت اپنی جائداد صرف کرنے اور منتقل کرنے کا پورا حق رکھتی ہے۔ وہ اپنے طور پر تجارت کرسکتی ہے اور اپنی خواہش سے کسی معاہدہ میں بھی شریک ہوسکتی ہے اس کے شوہر کو اس میں دخل دینے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ شادی کے بعد بھی وہ اپنی انفرادیت قائم رکھ سکتی ہے اور اس کو شوہر کا نام اختیار نہیں کرنا پڑتا۔ جیسے مسز فلاں فلاں۔ اس طرح عورت مرد کی آزاد حصہ دار اور حقیقی ساتھی ہے۔

شوہر کے انتخاب میں آزادی۔

شادی کے متعلق مسلمان عورت کو اپنے شوہر کے انتخاب کی پوری آزادی دی گئی ہے۔ بغیر اس کی مرضی کے کوئی معاہدہ قانوناً تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ عورت کو اپنی مرضی ظاہر کرنی پڑتی ہے اور اس کے سرپرست اس کو منظور کرتے ہیں۔ کوئی سرپرست بغیر لڑکی کی مرضی

حاصل کئے اس کی شادی نہیں کرسکتا۔ اگر سرپرست لڑکی کی کمسنی میں شادی کردے تو وہ بڑی ہو کر اپنی مرضی سے شادی کو نامنظور کرسکتی ہے۔ اس کے علاوہ عورت کے مہر کا تصفیہ ہوئے بغیر شادی کا کوئی معاہدہ طے نہیں پاسکتا اور عورت جتنا چاہے اپنا مہر بندھا سکتی ہے۔ شوہر کے انتقال کے بعد جائداد پر تمام وارثوں اور قرض داروں کے مقابلہ میں عورت کے حق کو ترجیح دی گئی ہے۔ عورت کو خاص حالات میں طلاق لینے کا حق بھی حاصل ہے اور جہاں تک روحانی اور ذہنی ترقی کا تعلق ہے اس کی قابلیت مرد سے کم نہیں سمجھی گئی ہے۔ قرآن شریف کا ایک پورا سورہ اس کے نام سے موسوم ہے۔ سب سے پہلی سطر کا ماحصل یہ ہے "لوگو اس سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اس سے عورت کو پیدا کیا اور اس نے دنیا میں سب عورتوں، مردوں کو پھیلایا۔ خدا سے ڈرو جس کے نام سے تم مدد مانگتے ہو اور اس عورت کا احترام کرو جس سے تم پیدا ہوئے یقیناً خدا تم کو دیکھ رہا ہے۔"

کیا اس سے ان غیر مسلم مصنفوں کا بڑا الزام جھوٹا نہیں ثابت ہوتا کہ اسلام نے عورت کو عزت نہیں دی؟ قرآن شریف یہ بھی نہیں کہتا جیسا کہ انجیل میں ہے کہ عورت مرد کے لئے بنائی گئی ہے۔ اس کے برخلاف وہ صاف طور پر یہ بتلاتا ہے کہ ایک کی دوسرے برابر کی ذمہ داری ہے اگر مردوں کے عورتوں کے کچھ حقوق ہیں تو ویسے ہی حقوق عورتوں کے مردوں پر بھی ہیں۔

بیوی پن کا تصور۔ پیغمبر اسلام نے عورت کی عزت کو مذہبی تعلیم کا ایک جز قرار دیا ہے۔ آپ نے "جنت کو ماں کے قدموں کے نیچے" کہا ہے اور یہ ارشاد فرمایا ہے کہ "عورت اپنے شوہر کے گھر کی ملکہ ہے" اسلام میں بیوی پن کے معنی محبت اور خلوص ہیں نہ کہ تابعداری اور غلامی۔ مسلمان عورت کو بدکرداریوں سے محفوظ رکھنے والی ہستی سمجھتے ہیں نہ کہ "بدی کا راستہ" خیال کرتے ہیں وہ شیطان کے حملوں کو روکنے کے لئے ایک مضبوط قلعہ ہے نہ کہ "شیطان کے داخل ہونے کا دروازہ"۔ وہ نیکی کا ایک منور گھر ہے جو مرد کو اخلاقی تباہی سے بچاتا ہے جب کہ وہ خواہشات کی اٹھتی ہوئی موجوں میں غوطے لگا رہا ہو نہ کہ "شیطان کا آلہ" ہے جس کو وہ ہماری روح پر قبضہ پانے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ ایک نیک عورت کی سچی محبت ہی وہ چیز ہے جو انسان کو حیوان سے فرشتہ بناتی ہے۔ اسلامی ممالک میں رہنے والی عورتوں کا درجہ ان بہنوں سے جو دوسرے ممالک میں رہتی ہیں بہت اونچا ہے اور اگر کہیں مسلمان عورت تعلیم اور روشن خیالی میں پیچھے ہے اور سماج میں اور گھر میں اپنی جگہ پر نہیں ہے تو وہ وہاں کی تہذیب کی کمی کی وجہ سے ہے نہ کہ اسلام کے کسی قانون یا اصول کی خرابی کی وجہ سے اگر اسلام کو اس کے پیروؤں کی موجودہ زندگی سے جانچا جائے تو یہ ظلم ہوگا۔

(ترجمہ)

اکرام
پرنسپل زنانہ ہائی اسکول

حیدرآباد کے معدنی وسائل

کسی ملک کی معدنی دولت اس کا سب سے اہم قومی سرمایہ ہوتا ہے۔ اس اہمیت کے لئے حیدرآباد کی ریاست مدتوں سے شہرۂ آفاق ہے۔ سونا، ہیرا، لوہا اور تانبا چند اہم چیزیں ہیں جن سے پچھلی صدیوں میں کام لیا گیا ہے۔

ملک کے اہم معدنی چیزوں اور ان کے معاشی امکانات کا یہاں کچھ ذکر کیا جاتا ہے۔

سونا:۔ اس زمانے میں سونے کی کانوں کی کھدائی کا کام ۱۸۹۱ء سے شروع ہوا اور ۱۹۲۰ء تک جاری رہا۔ حال ہی میں سررشتۂ متعلقہ کی طرف سے جو پیمائش ہوئی ہے اس نے ریاست کے کچھ ہی علاقوں میں اس کی تجدید کے بہت ہی ہمت افزا امکانات کا انکشاف کیا ہے اور سونے کی موجودہ چڑھی ہوئی قیمت سونے کے کانوں کی کھدوائی کی صنعت کو ایک نئی قوت بخشے گی۔ حال ہی میں آٹھ لاکھ روپے کی رقم پیمائش کے ابتدائی اخراجات کے لئے منظور ہوئی ہے۔

کوئلہ:۔ اس وقت کوئلہ سنگارینی، تندور، کوتھا گودام اور ساستی کے کانوں سے نکالا جا رہا ہے اور گوداوری کی وادی میں اس کے پائے جانے کے بڑے امکانات ہیں۔ کوئلہ اب صرف بھاپ کے بنانے میں صرف کیا جاتا ہے، لیکن گیس، کولتار اور ساتھ کے ضمنی مرکبات کی تیاری میں اس کے استعمال کے امکانات کو معلوم کرنے کے لئے مزید تحقیقات کی ضرورت ہے۔

ہیرا:۔ مشہور ہیرے کی کانیں دریائے کرشنا کی شمالی وادی میں واقع ہیں۔ دنیا کے چند سب سے زیادہ مشہور و معروف اور بیش بہا ہیرے انہی کانوں سے نکالے گئے تھے اور یہاں اسی قسم کے اور ہیرے پائے جانے کے امکانات باقی ہیں۔ کرشنا کی وادی میں ایسے پتھر اور کنکر پائے جاتے ہیں جن سے الماس نکالا جا سکتا ہے۔ ضرورت ہے کہ ان کا بغور معاینہ کیا جائے اور جدید آلات اور مشینوں کو کام میں لا کر ان سے الماس نکالا جائے۔ وزنی ہیرے زیورات کے کام آ سکتے ہیں اور چھوٹے اور ادنیٰ قسم کے ہیرے صنعتی کاموں میں لائے جا سکتے ہیں۔ کرشنا کی جنوبی وادی میں یوروپین کمپنی کی جدید کامیاب مہم نے اس کے امکان کی تصدیق کردی ہے۔

لوہا:۔ لوہے کی کچی دھات ریاست کے مختلف مقامات پر کثرت کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ اس کے اقسام میں کافی فرق پایا جاتا ہے اور یہ قریب قریب ریاست کے تمام ارضی طبقات میں پائی جاتی ہے۔ ایک وقت تھا جب کہ دمشق اور اصفہان کی مشہور عالم تلواروں کے پھل حیدرآباد میں تیار کی ہوئی فولاد سے بنائے جاتے تھے۔ گو خارجی مقابلہ نے اس صنعت کو پس پشت ڈال دیا ہے پھر بھی اس صنعت میں جان ڈالی جا سکتی ہے اور یہ ممکن ہے کہ یہاں فولاد کی تیاری وسیع تجارتی پیمانے پر حکومت کی حمایت اور سرپرستی میں کی جائے۔

تانبا:۔ تانبے کی دھات کی علامتیں مختلف مقامات پر پائی گئی ہیں۔ اور تفصیلی معاینہ کی ضرورت ہے۔ رائچور کے

وو آبے میں تانبے کے نکالنے کے قدیم سامان موجود ہیں۔ اور حال ہی میں ضلع نلگنڈہ کے بعض مقامات پر تانبا نکالا گیا ہے

مانگنیس:۔ اضلاع بیدر اور نظام آباد میں متفرق مقامات پر پایا گیا ہے اور اس کے معاشی امکانات کا اندازہ لگانے کے لئے تحقیق کی ضرورت ہے۔

ابرق:۔ قابل بازار تقطیع پر ابرق ورنگل میں پائی گئی ہے۔ اور بہت سے مقامات پر چھوٹی تقطیع پر ملتی ہے جو خشک چکنی اشیاء کے بنانے میں استعمال ہوتی ہے۔

یاقوت:۔ پالونچا اور غریب پیٹھ (ضلع ورنگل) کے قریب جمع کیا ہوا یاقوت ۱۹۲۹ء تک بڑی مقدار میں باہر بھیجا گیا۔ انہی مقامات پر آئندہ استفادہ کے لئے حوصلہ افزا نتائج حاصل ہوئے ہیں۔ انہیں مقامات سے زیادہ یاقوت کے پائے جانے کی خبریں وصول ہوئی ہیں۔

سرمہ:۔ سرمہ ضلع ورنگل میں یاقوت کے ساتھ پایا جاتا ہے اور کانوں سے نکال کر باہر بھجوایا جا رہا ہے۔ سنا گیا ہے کہ کم مقدار میں ضلع کریم نگر میں بھی ملا ہے۔ چونکہ مانگنیس اور سرمہ دونوں ریاست کے اندر ہی موجود ہیں اس لئے بیاٹریوں وغیرہ کی صنعت کا فروغ توجہ کا مستحق ہے۔

گالینا (GALENA) ضلع نلگنڈہ میں موجود ہے اور اس سے استفادہ کے لئے تحقیق کی ضرورت ہے۔ اس مقام کے نمونے میں چاندی کی بڑی مقدار ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ یہ ورنگل میں اور حیدرآباد کے قریب بھی پایا جاتا ہے۔

چکنی مٹی:۔ بہت ہی عمدہ قسم کی چکنی مٹی جو سفال گری کے کام آتی ہے موٹی تہوں میں چنترالا، ضلع نلگنڈہ میں اور کام تھنا کے قریب بیدر میں پائی جاتی ہے۔ یہ مٹی باہر کے عمدہ کاوین سے بھی اعلیٰ قسم کی تصور کی جاتی ہے۔

قیمتی پتھروں کے ساتھ ساتھ پوٹاس جو سفال گری میں کام آتا ہے اضلاع تلنگانہ اور کرناٹک میں مختلف مقامات پر پایا جاتا ہے۔ ایک قسم کی مٹی (FIRE CLAY) کثرت کے ساتھ کوئلوں کے پرتوں سے ملی ہوئی ملتی ہے۔ یہ خام دھات کی صفائی کے لئے بھٹی کی ترتیب میں استعمال ہو سکتی ہے۔

ایک قسم کا نرم پتھر جو سلیٹ سے مشابہ ہوتا ہے گلبرگہ میں گوگی کے قریب پایا جاتا ہے۔ یہ پنسل پالش وغیرہ کے بنانے میں کام آتا ہے۔

شیشہ سازی میں جو اشیاء کام میں لائی جاتی ہیں انہیں بہت سی چیزیں بکثرت ریاست کے متفرق مقامات پر ملتی ہیں۔ سنگ مردہ اور ریت جو شیشہ سازی کے لئے بہت ضروری ہیں بڑے وسیع پیمانے پر پائے جاتے ہیں۔ سوڈے کی سفوف جن پھولوں سے بنتی ہے وہ عام طور پر ملک کے اکثر حصوں میں پائے گئے ہیں۔ اس طرح اکثر مقامات پر شیشہ سازی کی صنعت کے امکانات مستحکم ہیں۔

نمک:۔ حیدرآباد میں نمک سازی کی امتناع کا کوئی قانون نہیں ہے اور اس حیثیت میں حیدرآباد یکتا ہے۔ نمک سازی کی اس دیسی صنعت کا قدیم الایام سے ریاست میں وجود ہے۔ خوردنی اور چمڑے کو رنگت دینے والے نمک کے غیر محلول اجزاء کو پانی کے ذریعے سے کھاری مٹی سے علیحدہ کر لیا جاتا ہے اور اس طرح نمک کی تیاری عمل میں آتی ہے۔ یا سورج کے عمل تبخیر سے کھاری پانی کے کنوؤں سے نمک نکالا جاتا ہے۔ مختلف اقسام کے نمک کی

تیاری کے لئے سائنس کے جو جدید اور ترقی یافتہ طریقے رائج ہو رہے ہیں ان پر حکومت غور کر رہی ہے اور امید کیجا سکتی ہے کہ مستقبل قریب ہی میں ریاست میں ان کو رائج کر دیا جائے گا۔

ایک قسم کی مٹی (جس میں لوہا ملا ہوا ہوتا ہے) جو رنگدار رنگ کی ہوتی ہے۔ ریاست کے مختلف مقامات پر ملتی ہے۔ یہ رنگوں کے بنانے میں کام آسکتی ہے۔

(د) قیمتی پتھر

عقیق، سبز حجر الصلب (PLASMA)

لال پتھر اور سلیکا کی دوسری اقسام اضلاع مرہٹواڑی میں عام طور پر ملتی ہیں اور سنگ تراشی کے ہنرمند اِنھوں سے نظر فریب نگینوں اور جواہرات میں تراشی جاسکتی ہیں۔

پیریٹس (PYRITES) سونے کی چٹانوں میں گلبرگہ میں چونے کے پتھروں میں اور گرہ دار سنگ مثانہ کی شکل میں کوئلے کی پرتوں میں پایا جاتا ہے۔ کیمیائی صنعت کے لئے یہ ایک قیمتی خام شئے ہے اور خاص طور پر (SULPHURICACID) کے بنانے میں بہت کام آتا ہے۔

سوپ اسٹون (SOAP STONE)

ریاست میں بعض مقامات پر ملتے ہیں اور یہیں پر اس کے برتن وغیرہ بنا لئے جاتے ہیں۔

ریاست میں عمارتوں کے لئے اعلیٰ قسم کے پتھروں کی کمی نہیں ہے۔ یہ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ انگم پلی، رایچور اور حیدرآباد کے گرانیٹ، ابردین کے مشہور گرانیٹ سے بھی عمدہ قسم کے ہوتے ہیں۔ تعمیر کی مختلف اشیاء لامحدود مقدار میں ریاست میں ملتی ہیں۔ یہ بڑی عمارتوں اور ان کی آرائش و زیبائش کے لئے بہت موزوں ہوتی ہیں۔

شاہ آباد کے سیلو کے پتھر فرش اور چھت کے لئے استعمال ہوتے ہیں اور بڑے پیمانہ پر بکتے ہیں۔ چونے کے پتھر اور ساتھ کے شیلس (SHALES) سے سمنٹ کی ایک سر سبز صنعت وابستہ ہے جو ملک کی ایک بڑی صنعت ہے اور شاہ آباد کا سمنٹ کا کارخانہ ریاست کا واحد کارخانہ ہے۔ مختلف رنگ کے مرمر بلندوکے قریب ملتے ہیں اور ان میں سے بعض تو نہایت ہی عمدہ قسم کے ہوتے ہیں۔

حسن علی
(نظام کالج)

نیک کام کا انجام

حفیظ کو بچپن سے یہ تعلیم دی گئی تھی کہ نیکی کا پھل ضرور ملتا ہے۔ جب اس کی طالب علمی کا زمانہ ختم ہوا تو اس کے باپ نے جو ایک بڑا سوداگر تھا۔ چاہا کہ یہ بھی میری طرح سوداگری کرے۔ چنانچہ اس نے اس کو ایک بڑا جہاز جس پر لاکھوں روپے کا سامان تھا دیا تاکہ وہ دوسرے ممالک میں جاکر تجارت کرے۔

حفیظ نے بحری سفر شروع کیا۔ ایک دن اس کا جہاز ایک اور جہاز سے جا ملا۔ جس میں سے شور وغل اور رونے چلانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اس نے اس جہاز کے ملاحوں سے اس کی وجہ دریافت کی تو ملاحوں نے جواب دیا "اس میں بہت سے قیدی ہیں جن کو ہم نے کئی ایک ملکوں سے گرفتار کیا ہے اور اب ان کو غلام بناکر بیچیں گے"۔

رحم دل حفیظ نے کہا "کیا آپ کا سردار ان غلاموں کو میرے ہاتھ فروخت کردے گا۔ انھوں نے سردار سے دریافت کیا جو بڑی خوشی سے رضامند ہوگیا۔ حفیظ نے اپنا بہت سا سامان اُن لوگوں کو دیا اور غلاموں کو خرید کر آزاد کردیا سب اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ لیکن اس میں ایک خوبصورت لڑکی اور ایک بوڑھی عورت بھی تھی۔ جب ان سے جانے کے لئے کہا گیا تو اس بوڑھی عورت نے کہا۔" اے نیک دل نوجوان ہم بہت دور سے آرہے ہیں یہ لڑکی بادشاہ کی اکلوتی لڑکی ہے اور میں اس کی دایہ ہوں۔ میں نے بچپن سے اس کی پرورش کی ہے۔ ایک دن ہم محل سے دور ایک دریا کے کنارے سیر کو گئے تھے۔ ان بدمعاشوں نے ہمیں دیکھ لیا۔ اور اس کے زیور وغیرہ کو دیکھ کر اسے گرفتار کرلیا۔ میں اس کی مدد کو گئی تو انھوں نے مجھے بھی پکڑ لیا۔ اور ایک جہاز پر ہم دونوں کو لے آئے پھر چند دن بعد وہ جہاز وہاں سے روانہ ہوگیا۔ اب جب کہ تم نے ہمیں اس مصیبت سے نکالا ہے تو ہم کو اپنے ہی ساتھ رکھو۔ غرض حفیظ نے اس لڑکی سے شادی کرلی اور اس کی دایہ کو ساتھ لے کر اپنے گھر واپس آیا۔

جب گھر پہونچا تو اس کے باپ نے جہاز اور مال کی بابت دریافت کیا۔ اس نے جو کچھ گزرا تھا سب سنا دیا جس کو سن کر اس کا باپ بہت ناراض ہوا اور اسے گھر سے نکال دیا۔ وہ غریب اپنی بیوی اور دایہ کو لے کر اسی گاؤں میں ایک چھوٹے سے مکان میں رہنے لگا اور ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتا رہا کہ اس کا باپ اس کی خطا معاف کردے۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد باپ کو اس پر رحم آیا اور اس کو بی بی اور دایہ سمیت اپنے گھر میں بلا لیا۔

تھوڑے عرصہ بعد اس کے باپ نے ایک اور جہاز جو پہلے جہاز سے زیادہ قیمتی تھا تیار کرالیا اور اپنے لڑکے کو دوبارہ سفر پر روانہ کیا۔ حفیظ کو چونکہ اپنی بیوی اور دایہ سے بہت محبت تھی اس نے ان کو بھی ساتھ لے لیا اور جہاز کے ایک طرف بیوی کی اور دوسری طرف دایہ کی تصویر بنادی۔ کچھ دنوں تک سفر کرنے کے بعد یہ جہاز ایک شہر میں پہونچا شام تک اس شہر کے بادشاہ کی جانب سے ایک شخص دریافت کے لئے آیا کہ وہ کون ہیں اور کس لئے یہاں آئے ہیں لیکن

جب اس شخص نے جہاز پر اپنی شہزادی اور اس کی دایہ کی تصویر دیکھی تو بہت حیران ہوا اور الٹے پاؤں جاکر بادشاہ کو اس کی خبر دی دوسرے دن بادشاہ اپنے وزیر کے ساتھ جہاز پر آیا اور تصویر دیکھ کر واپس چلا گیا۔ واپس جانے کے بعد اس نے جہاز کے کپتان کو بلوایا اور اس سے دریافت کیا کہ جہاز پر تصویریں کس کی ہیں۔ کپتان نے سوچا کہ کسی اور کو کیا ضرورت پڑی ہے جو دریافت کرے یہ بادشاہ ضرور میری بیوی کا باپ ہے۔ چنانچہ اس نے سارا قصہ سنایا۔ بادشاہ بہت خوش ہوا اور کہا یہ لڑکی میری اکلوتی لڑکی ہے تم چونکہ اس کے شوہر ہو لہذا میرے تخت و تاج کے وارث ہو۔ اب جاؤ اپنے ماں باپ اور سب خاندان کو لے آؤ۔ تمھارا باپ میرا بھائی اور تمھاری ماں میری بہن ہوگی۔

غرض حفیظ اپنے ماں باپ کے ساتھ وہاں آگیا اس کے یہاں آنے کے چند سال بعد بادشاہ کا انتقال ہوگیا۔ اور اس کی جگہ حفیظ بادشاہ بنا اور ایک مدت دراز تک نہایت اطمینان کے ساتھ حکومت کرتا رہا۔

م ص د آصفیہ ہائی اسکول،

الطاف کا کھیل

جاؤں گی صبح مدرسہ امی
سب سبق میں تمھیں سناؤں گی
ہو کھڑے باادب کروں گی سلام
اپنی سب ساتھیوں کو میں لے کر
شام تک ان کے ساتھ کھیلوں گی
کر کے مغرب کی میں نماز ادا
" اے زمیں آسمان کے مالک
میرے ماں باپ اور چچا ابا
خالہ اور خالو میری پھوپی جاں
خوش رہیں یا الہٰی نانی ماں

چھٹی ہوتے ہی آؤں گی امی
صاف لکھ کر تمھیں بتاؤں گی
آپ ہی سے میں لوں گی پھر انعام
عصر کی ہاں نماز میں پڑھ کر
بعد گھر کو میں اپنے آؤں گی
ہاتھ اٹھا کر کروں گی پھر یہ دعا
ساری دنیا جہان کے مالک "
خوش رہیں یہ سدا خداوندا
خوش رہیں ماموں زاد ماموں میاں
چچی جاں اور میری آپا جاں

دلِ معصوم کی خداوندا
تیری درگہ میں ہو قبول دعا

محمد حسین شریف درد
متعلم جماعت ششم (سٹی کالج)

ورزش

جسمانی صحت کو برقرار رکھنے کے لئے ورزش ایسی ہی ضروری ہے جیسے چراغ کے لئے تیل، کبھی تم نے چراغ کو بغیر تیل کے جلتا ہوا نہیں دیکھا ہوگا اسی طرح اگر انسان اپنی پوری تندرستی میں رہنا چاہے تو اس کو لازم ہے کہ ورزش کی عادت ڈالے خصوصاً طالب علموں کو ورزش کی سخت ضرورت ہے۔ کیونکہ ان کا بہت سا وقت ذہنی اور دماغی کام میں صرف ہوتا ہے اور انھیں جسمانی حرکت کا موقع نہیں ملتا۔ اس لئے انھیں یہ لازم ہوا کہ ورزش کریں۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ مزدور لوگ کسان اور دیہاتی کوئی خاص قسم کی ورزش نہیں کرتے لیکن دن بھر وہ محنت و مشقت اور اپنے دست و پا سے کام کرتے رہتے ہیں۔ ان کے لئے وہی ایک اچھی خاصی ورزش ہوجاتی ہے اور یہی لوگ مال داروں سے زیادہ چست و چالاک اور طاقتور ہوتے ہیں۔

موجودہ دور میں جب کہ نئی تہذیب ہر ملک کے نوجوانوں کو کمزور کر رہی ہے اور کر چکی ہے تو ضرورت اس امر کی ہے کہ ملک کے نوجوانوں کی جسمانی حالت ایسی نہ ہو جو بہ زبانِ حال اترے ہوئے چہروں ہڈیوں کے ڈھانچوں، سوکھے سڑے جسموں سے اپنی کمزوری، بزدلی، ناکامی، شکست، دماغی کمزوری کا اعتراف کر رہی ہو۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جسمانی حالت ہی ملک و قوم کی عزت اور برتری کی دلیل ہے اگر تمہاری جسمانی حالت کمزور ہے تو دنیا میں کمزور سے کمزور دشمن بھی تمہارے سامنے اکڑے گا اس لئے سب سے بڑی چیز کی اس وقت جو ضرورت داعی ہے وہ ورزش جسمانی ہے جو ہمارے قویٰ کو اور جسمانی حالت کو درست کر سکتی ہے۔

اکثر اوقات طالب علم بیمار ہوجایا کرتے ہیں اور وہ بیماری میں لکھ پڑھ نہیں سکتے۔ ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں تو وہ آرام کرنے کی ہدایت کرتا ہے اور پڑھنے لکھنے سے بھی منع کرتا ہے آخر اس کی وجہ کیا ہے! اس کی وجہ یہی ہے کہ اکثر طالب علم اپنا وقت کھیل کود اور ورزش جسمانی میں صرف کرنے کی بجائے یہ بہتر سمجھتے ہیں کہ اتنے وقت میں کچھ پڑھ لیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دماغی قوت کمزور ہوجاتی ہے، اور پہلے پہل سر کا درد شروع ہوجاتا ہے پھر بخار اور اسی طرح کی اور کئی بیماریاں لاحق ہوجاتی ہیں اس لئے ایک دو گھنٹے عموماً طالب علموں کو کتاب کی دنیا سے علیحدہ ہونا چاہیے اور یہ وقت ورزش میں اور کھیلوں میں صرف کرنا چاہیے جو لڑکے ورزش کے عادی ہوتے ہیں وہ نہ صرف صحت مند اور تندرست رہتے ہیں بلکہ ان کی دماغی حالت بھی اچھی رہتی ہے ورزش کرنے والے لڑکے عموماً سستی اور کاہلی سے دور رہتے ہیں ان کے چہرے ہمیشہ خوشی کو ظاہر کرتے ہیں ان کی امنگیں، ہمتیں، استقلال اور حوصلے بڑھتے ہیں جو ان کے ہشاش بشاش چہروں سے عیاں ہیں۔

دماغی محنت کرنے والے بغیر ورزش کے اپنی دماغی محنت سے کامیاب نہیں ہو سکتے اور جو لڑکے محنت سے

پڑھنے لکھنے کے بعد کھیلتے نہیں وہ کبھی تندرست نہیں رہ سکتے اگر وہ کھیلوں کو پسند نہ کرتے ہوں تو بہتر یہی ہے کہ وہ صبح و شام بطور تفریح کچھ دور پیدل نکل جائیں کیونکہ یہ بھی بہت اچھی ورزش ہے کھیلوں میں عمدہ کھیل فٹ بال ٹینس، کرکٹ اور والی بال وغیرہ ہیں جو لڑکے ان تمام چیزوں میں بھی حصہ نہیں لیتے وہ مسلسل محنت کی وجہ سے سِل، دِق کی بیماری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ بڑھئی اس آرے کو جس سے کہ وہ لکڑی کاٹتا ہے۔ ہر دو تین گھنٹے کے بعد تیز کر لیا کرتا ہے کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرے تو بہت جلد اس کا وہ آلہ جس سے لکڑی کاٹ رہا تھا خراب ہو جائے گا اور اس سے لکڑی کاٹی نہیں جائے گی۔ یہی حال دماغ کا بھی ہے تمہیں معلوم ہے کہ اسکولوں میں بھی تین یا چار گھنٹے بعد وقفہ رہتا ہے تاکہ لڑکے دماغ کو کامل سکون اور آرام دیں۔ اگر وہ طلبا اپنے دماغ کو سکون نہ دیں گے تو ان کا دماغ ناکارہ ہو جائے گا اس لیئے دماغ کو ہمیشہ کام میں مت لگائے رہنے دو بلکہ اس کو تیز کرنے کے لیئے ورزش کرو تاکہ بیمار نہ ہو سکو۔

عبدالمجید خاں یوسف زئی

تلنکرات کا دن

آؤ آؤ پتنگ اڑائیں　　کھیلیں کودیں خوشی منائیں

بھائی میاں بھی پتنگ لائے　　لال اور پیلے اودے کالے

دیکھو کیسا پتنگ ہے میرا　　کیسا ہے یہ چاند اور تارا

دیکھو ہو کر بلند کتنا　　میرا پیارا پتنگ ہے اڑتا

شمیم بھاگو جلدی بھاگو　　میرے پتنگ کو لوٹ کے لاؤ

کیسی اچھی بچی ہو تم　　میرے پتنگ کو لائی ہو تم

یہ لو کٹا وہ آہا گرا وہ

یہی صدا ہے پکڑو پکڑو

میر محمود علی اکبر شبیر

گیہوں

گیہوں سب اناجوں میں مفید و مقوی ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں بہت بویا جاتا ہے۔ اور اتنا پیدا ہوتا ہے کہ اور ملکوں کے بیوپاری یہاں سے مول لے جاتے ہیں۔ ریل گاڑیاں بھر بھر کر بھیجتے ہیں۔ اس سے زمینداروں کو بہت فائدہ ہوتا ہے۔

گیہوں کا پودا گھاس کی قسم کا ہوتا ہے۔ کوئی گز سوا گز اونچا ہوتا ہے۔ لمبے لمبے پتے، ہلکا رنگ جب ہوا چلتی ہے تو ہرے بھرے کھیت لہراتے ہوئے دیکھ کر دل خوش ہو جاتا ہے۔ جب بالیں یعنی جس میں گیہوں ہوتے ہیں پک کر زرد ہو جاتی ہیں تو ان کے اندر سے سخت دانے بیج میں سے چیرے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کے اوپر چھلکا ہوتا ہے اور سرے پر تس یعنی گیہوں کے آخر میں جو سخت حصہ ہوتا ہے۔ بعض قسم کے دانوں پر تس نہیں ہوتا۔ گیہوں ہر قسم کی زمین میں اگ سکتا ہے۔ بونے سے پہلے زمین میں کئی بار ہل چلاتے ہیں تاکہ نرم ہو جائے۔ برسات سے پہلے بیج بو دیتے ہیں۔ اگر بیج اچھا ہوتا ہے تو پیداوار بھی اچھی ہوتی ہے۔ چھ مہینے میں پودے پک جاتے ہیں۔ گرمی کے موسم میں کھیت کاٹ لیتے ہیں۔ گیہوں نکال کر الگ رکھ لیتے ہیں اور بھوسا الگ کر دیتے ہیں۔ گیہوں کا پودا بڑے کام آتا ہے ہرے ہرے پودوں کو گائے بھینس خوشی سے کھاتی ہیں گیہوں کے پودے کے مختلف حصوں سے ٹوکریاں، ٹوپیاں وغیرہ بنتی ہیں۔ بھوسا گائے اور بیل کھاتے ہیں۔ گیہوں پیس کر آٹا، میدا اور روا بھی بناتے ہیں۔ آٹے کی روٹیاں، پوریاں، کچوریاں، پراٹھے، میدے کا حلوا، سویاں اور بہت سی مٹھائیاں بنتی ہیں۔

صالحہ سید علی جعفری
(محبوبیہ گرل اسکول)

زندگی کو اچھا بناؤ

ہمیں اپنی زندگی کو اچھا بنانا چاہیے۔ بچپن ہی سے ہر انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی زندگی کا ایک لمحہ بھی فضول نہ گنوائے۔ شروع ہی سے وقت کی پابندی، نیک صحبت، اچھے گن، عمدہ اخلاق اور نیکی و بھلائی کی راہیں اختیار کرے۔ کیونکہ یہی چیزیں ہیں جو زندگی کا صحیح مصرف سکھاتی ہیں اور انہیں چیزوں سے زندگی بنتی اور سنورتی ہے۔ تم اپنی کورس کی کتابوں کے علاوہ اور دوسری کتابوں میں خواہ اردو ہو یا انگریزی تم پڑھتے ہوں گے کہ اس میں بھی ایک نیک زندگی بسر کرنے کے صحیح اور سچے اصول بتائے گئے ہیں۔ یہ یاد رکھو ہر قوم ہر مذہب میں نیکی و بھلائی پسند کی جاتی ہے۔ قدیم کتابوں اور خود موجودہ اچھی کتابوں میں تم دیکھو گے جس میں تمہیں ایک اچھی اور عزت کی زندگی بسر کرنے کی ہدایت ہے۔ انہیں بے بہا اور گراں مایہ ہدایات اور نصائح سے تم اپنی زندگی کو علمی اور ادبی بنا سکو گے۔

قدیم مذاہب کے مہاتماؤں اور پیغمبروں کی مشہور کتابوں اور سوانح عمریوں میں پڑھو تو تمھیں معلوم ہوگا کہ خود ان میں شروع ہی سے ایک نیک زندگی بسر کرنے کے کیسے اچھے اچھے گن موجود تھے۔ ان میں وہ سب باتیں موجود تھیں جو ایک عمدہ زندگی بسر کرنے کے لیئے ضروری ہیں۔ اس وقت بھی تم اپنے ملک کے رہنماؤں، مشہور لیڈروں اور نیک لوگوں کی جو ہر اعتبار سے سب میں ممتاز سمجھے جائیں۔ تقلید کرو۔ ان سے کچھ سیکھنے کی کوشش کرو۔ یہ کافی ہے کہ تم اپنے میں موثر مادے، نیک احساسات اور اچھے خیالات پیدا کرو جو تمھیں زندگی میں کامیاب بنا سکیں۔ صرف عمدہ کھانے اچھا پہننے یا خوش حال رہنے سے زندگی کامیاب و عزت مند نہیں سمجھی جاتی۔ بلکہ اس کے علاوہ تم پر اور بھی حقوق ہیں وہ یہ کہ علم، اخلاق، عقائد وغیرہ کے اعتبار سے تم سب میں عمدہ ثابت ہو سکو۔ انسان کو اپنی معیاری حالتوں سے بڑھ کر اپنے عملی اور علمی معیار کو بڑھانے کی ممکن الحصول جد و جہد و کوشش کرنی چاہیے۔ موجودہ دنیا صرف عمل کی ہے۔ دنیا میں صرف فارغ البال زندگی کچھ زیادہ عزت کی نگاہوں سے نہیں دیکھی جاتی جتنی ایک نیک اور موثر عملی زندگی کی قدر کی جاتی ہے۔ انسان کے ظاہری حالات سے بڑھ کر اس کو اپنے باطنی کردار پر نظر رکھنی چاہیے نیک عمل، اچھے اخلاق، عادات اور نیکی و بھلائی عمدہ کردار وغیرہ کو مذہب کی پابندی تصور کریں۔ ہر انسان کے بچپن کا زمانہ سیکھنے کا ہے۔ تم شروع ہی سے اپنی زندگی کا ایک خاص نصب العین قرار دو اور پھر اس کے تحت راہیں اختیار کرو۔ اچھے اور ہوشیار ادیبوں کے ساتھ ملنا، عمدہ کتابیں مطالعہ کرنا اشد ضروری ہے۔ ہر وقت اپنے آپ کو مصروف رکھنا اور دنیا کے روشن پہلو کی طرف دیکھنے کی کوشش کرنا ہم کو خوش اور زندہ دل بنا دے گا۔

دنیا میں بہت سے برے کام ہیں۔ ان سے بچنا چاہیے ؎

ہنسو اور دنیا بھی تم سے ہنسے گی
جو روؤ تو تم ہی کو رونا پڑے گا

لیکن تم ہنس کر ہی نہ گزار دو۔ زندگی ایک سنجیدہ کام کے لیئے ہے۔ اکثر دو قسم کے لوگ اس دنیا میں نظر آتے ہیں وہ جو کبھی نہیں ہنستے اور وہ جو ہمیشہ ہنستے ہیں۔ ہمیں تیسری قسم کے لوگوں ہی سے ہونا چاہیئے۔ جو جانتے ہیں کب ہنسنا چاہیے اور کب سنجیدہ ہونا چاہیے۔ ہم اپنی زندگی کو بہتر نہیں بنا سکتے جب تک ہمارے سامنے کوئی مدعا نہ ہو۔ تم جانتے ہو کیا سیکھنا چاہیے، کیا کام کرنا چاہیے، کس بات کو نہ کرنا چاہیے ہر وقت سیکھنے ترقی کرنے اور تجربہ حاصل کرنے کا موقع تلاش کرنا چاہیے۔ کسی موقع کو ہاتھ سے نہیں دینا چاہیے۔ تمھیں معلوم ہے کہ بابر اور شیر شاہ سوری نے موقع تاڑ کر تمام ہندوستان فتح کرلیا۔ اکبر نے بھی کبھی موقع ضایع نہ کیا۔ اورنگ زیب اور ٹیپو سلطان نے بھی حق کے لیئے لڑائیوں میں بہادری اور سختی کا ثبوت دیا۔ تمھارے وقت اور موقعوں کو بنانے کے لیئے جو کچھ کیا گیا اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی زندگی کو اچھا بناؤ جیسا کہ ایک مصنف کہتا ہے۔ زندگی بنانا سیکھو۔ کوئی خوشی کا دن نہ گنواؤ۔ وقت تمھارے لیئے گزرے ہوئے موقعوں کو واپس نہیں لائے گا۔

محمود علی

گائے اور شیر

ایک گائے جنگل میں چر رہی تھی۔ ایک شیر نے اسے دیکھ لیا اور کھانے کا ارادہ کیا۔ گائے نے کہا اے جنگل کے راجہ مجھے اپنے پیارے بچے سے مل لینے دے تب میری جان لینا۔ وہ میری راہ دیکھتا کھڑا ہوگا شیر نے کہا میں تجھے ہرگز نہیں چھوڑوں گا تو دھوکا دے کر بھاگ جانا چاہتی ہے۔" میں سچ کہتی ہوں۔ ضرور واپس آؤں گی۔" شیر بولا " تو بچے کو تکلیف دینے کیوں جاتی ہے۔" وہ یہ سن کر روئے گا۔" گائے نے کہا لیکن وہ میرا راہ دیکھتا کھڑا ہوگا۔ میں نہ جاؤں گی تو وہ انتظار ہی میں مر جائے گا۔ مجھے ایک بار اس سے مل جانے دو۔ شیر کو رحم آگیا اس نے کہا اچھا جا لیکن بچے کو دودھ پلا کر جلدی آنا گائے گھر آئی بچے کو دودھ پلا کر رونے لگی۔ بچے نے پوچھا اماں آج تم کیوں روتی ہو۔ گائے نے کہا بیٹا آج میں ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہی ہوں۔ اب تم کو میرا دودھ کبھی نہ ملے گا تم ہری گھاس کھا کر اپنی زندگی بسر کرنا۔ بچے نے کہا تم اب جنگل میں نہ جاؤ شیر اب تمہارا کیا کر سکتا ہے۔ بیٹا میں اس سے وعدہ کر چکی ہوں مجھے ضرور جانا چاہیے۔ تم خدا پر بھروسہ کرو اور زندگی بسر کرو۔

گائے جنگل میں گئی۔ شیر اسے آتا دیکھ بڑا خوش ہوا۔ گائے سے پوچھا کیا تو اپنے بچے کو دودھ پلا آئی گائے نے کہا اے جنگل کے راجہ میں اسے خدا کے بھروسے پر چھوڑ آئی ہوں۔ شیر نے کہا تو اب گھر جا میں نے اب تجھے رہا کر دیا کیونکہ تو بات کی سچی نکلی۔ میں تیرے اس سچے کام کے بدلے میں تیری جان بخشتا ہوں۔ آج سے جہاں تیرا جی چاہے چرا کر۔ کوئی جانور تجھے کچھ نہ کہے گا۔ گائے خوشی خوشی گھر آئی۔

بچو! جو بات منہ سے نکالو اسے ضرور پوری کرو اس کا نتیجہ اچھا ہی ہوگا۔

نارائن لعل (تھرڈ فارم اے)
(سٹی کالج)

اردو دانی کی پہلی کتاب

اس کو مولوی سجاد مرزا صاحب ایم اے نائب صدر مجلس اردو امتحانات کی نگرانی میں مولوی ظہیر الدین صاحب نے مرتب کیا ہے۔ اس میں ایک سو اکانوے تصویریں ہیں۔ متوسط تقطیع کے ۶۰ صفحوں میں یہ کتاب جدید ترین اصول کے مطابق تیار کر کے چھاپی گئی ہے اور تصویروں اور ضخامت کے باوجود ادارہ نے محض اردو کی خدمت کی خاطر اس کی قیمت بہت کم یعنی صرف دو آنے چھ پائی رکھی ہے۔ جو لوگ اردو کی توسیع و اشاعت اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں وہ یقیناً اس کتاب کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے اور اپنے بچوں عزیزوں اور ملازمین کو اردو سکھانے کے لئے اس سے بہتر کتاب انہیں مل نہ سکے گی۔

گداگری

یوں تو دنیا میں گداگروں اور فقیروں کی کمی نہیں۔ مگر ہندوستان میں ان کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ جس کا نتیجہ ملک میں عالمگیر افلاس و تنگدستی کا دور دورہ ہے۔

اصل معنوں میں مستحق فقیر تو چند ہی ہوں گے۔ لیکن ہٹے کٹے (غیر مستحق) سست، کاہل، جاہل اور کام چور، بلکہ اصل معنی میں چور بہت نکل آئیں گے۔ جن میں اکثر و بیشتر کسی نہ کسی نشہ پانی کے ضرور عادی ہیں۔ اور اسی طلب کے مارے بہ ننگ خلقت، در بدر بھیک مانگتے، ٹکڑے توڑتے پھرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ورنہ فقیری کوئی پیشہ نہیں۔

سست و کاہل، اپاہج و کام چور، بے عزت و ننگ خاندان ہی اس در بدر بھیک کو قبول کر سکتے ہیں۔ ورنہ کسی مذہب نے بھی فقیری کی تعلیم نہیں دی۔ بلکہ محنت و مزدوری، ملازمت، تجارت، زراعت، صنعت و حرفت ان تمام سے دولت حاصل کرنے کی تعلیم دی ہے۔

ہندوستانیوں کے متعلق عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کی (۸۲) کروڑ آبادی میں سے صرف معدودے چند ہی جائز پیشوں میں لگے ہوئے ہیں۔ اور آبادی کا نوے فیصدی حصہ تو بس مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے" کے مصداق دوسروں کے کندھوں پر اپنا ناجائز دباؤ ڈال کر خود کو سست و کاہل۔ بیکار اور نکما سمجھا ہوا ہے اور محنت مزدوری کو باعثِ شرم سمجھتا ہے۔ اس کے لئے زیادہ سے زیادہ آجا کے اک نگوڑی ملازمت ہی رہ جاتی ہے۔

عزیز بچو! یاد رکھو ہرگز اس قسم کی پست ذہنیت اور تنگ نظری اختیار نہ کرنی چاہیے اور نہ خود کو مجبور و محتاج خیال کر کے آمدنی کے ناجائز ذرائع اختیار کرنے چاہئیں۔

سنو، دنیا کے تمام مذاہب نے اس خصوص میں کس قسم کی تعلیم دی ہے۔

محنت کرو، خود کو محنت کا عادی بناؤ، علم و ہنر سیکھو۔ تجارت کرو خوب دولت کماؤ اور عیش کی زندگی بسر کرو۔ مگر یاد رکھو غلام نہ بنو۔ کیونکہ غلامی کی زندگی بسر کرنے سے تو موت زیادہ بہتر ہے۔

زندگی باعثِ ذلت ہو تو مرنا بہتر ‫ ‫ موت منظور غلامی ہمیں منظور نہیں
غیر کیوں چھین لیں عہدہ نہ جہانداری کا ‫ ‫ تم کو جب پاس نہ ہو جذبۂ خودداری کا

ایک مدت سے ہیں سوئے ہوئے ابنائے وطن
نام لیتے نہیں کمبخت یہ بیداری کا!!

احقر صدیقی
(جالنہ)

Reg. No. M 3950.

ادارۂ ادبیات اردو

کی

چند علمی ، ادبی اور دلچسپ کتابیں

۱۔ شعرائے عثمانیہ | جامعہ عثمانیہ کے چھبیس شاعروں کے کلام کا پاکیزہ انتخاب۔ مختلف نظموں اور غزلوں کا گلدستہ رنگ و بو۔ ہر شاعر کے کلام پر ایک مختصر مگر جامع تنقید۔ مرتبہ سید معین الدین صاحب قریشی ایم۔ اے و عبدالقیوم خان صاحب باقی ایم۔ اے طباعت و کتابت نفیس رائل سائز صفحات (۲۳۱) قیمت مجلد با تصویر دو روپیہ ۱۲ آنے

۲۔ مغربی تصانیف کے اردو تراجم | مغربی زبانوں کی تصنیفات و تالیفات کو اردو زبان میں منتقل کرنے کی تمام انفرادی اور اجتماعی کوششوں کا تذکرہ۔ صاحبان نظر کی نظروں میں اس کتاب کی افادیت دوسری تحقیقی کتابوں سے کم نہیں۔ مرتبہ میر حسن صاحب ایم۔ اے طباعت و کتابت نفیس کراؤن سائز صفحات (۱۰۲) قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنے۔

۳۔ محبت کی چھاوں | مرزا ظفرالحسن صاحب بی۔ اے کے ۱۴ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ۔ ہر فسانے میں تخیل کی جولانی اور مشاہدے کے تاثرات کارفرما ہیں۔ نوجوانوں کے نصب العینی معاشرہ کی سچی تصویر اور مصروف زندگیوں کے لمحات فرصت کیلئے ایک شایستہ ذہنی تفریح صفحات (۱۳۲) قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنے۔

۴۔ سوتیلی ماں | اس کتاب میں اصلاح معاشرت کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ سوتیلی ماں اور سوتیلے بچوں کے تعلقات کو خوشگوار بنانے کے مفید طریقے بیان کئے گئے ہیں مصنفہ رابعہ بیگم صاحبہ طباعت و کتابت نفیس صفحات (۴۸) قیمت مجلد صرف چار آنے۔

۵۔ روح غالب | اردو اور فارسی کے مشہور شاعر و ادیب مرزا اسداللہ خان غالب کی حیات اور کارناموں کی ایک مجمل سرگزشت اور ان کے اردو خطوط کے دلچسپ ادبی حصوں کا انتخاب مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور۔ صفحات (۲۴۰) با تصویر قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

۶۔ تاریخ گولکنڈہ | وہ کتاب جو کئی سال کی تحقیق اور محنت و معلومات کا نتیجہ ہے۔ حیدرآباد کے مشہور مورخ اور جامعہ عثمانیہ کے استاد تاریخ مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی نے اس کتاب میں سلاطین قطب شاہیہ کی نہایت مستند تاریخ قلمبند کردی ہے۔ تصویریں بھی مواد کی طرح قدیم تاریخی ماخذوں سے حاصل کی گئی ہیں۔ صفحات (۳۳۰) قیمت مجلد تین روپیہ آٹھ آنے۔

۷۔ گریہ و تبسم | صاحبزادہ میکش کے کلام کا دلچسپ مجموعہ۔ شاعری کا ذوق رکھنے والوں کے لئے یہ مجموعہ رنگ و بو کا ایک خوش منظر گلدستہ ہے۔ صفحات (۱۹۲) قیمت مجلد دو روپے

۸۔ سر سالار جنگ اعظم | حیدرآباد کے محسن اعظم کے حالات زندگی اور کارنامے دلچسپ اور سادہ پیرائے میں قلمبند کئے گئے ہیں۔ مرتبہ مولوی فیض محمد صاحب بی۔ اے۔ ڈپ ایڈ صفحات (۴۸) قیمت مجلد صرف چھ آنے۔

مشاہیر اردو کا تاریخی گروپ

فرش پر بیٹھے ہوئے:- (۱) سر عبدالقادر (۲) حافظ ساجد علی وکیل اورنگ آباد (۳) نصف عمر۔

کرسیوں پر سامنے:- (۱) غلام محمد منشی (۲) سر اکبر حیدری (۳) وقار الملک (۴) حکیم محمد اجمل خاں (۵) حالی (۶) عزیز مرزا (۷) محسن الملک۔
(۸) مرزا محمود علی خاں (۹) منشی محبوب عالم۔

کرسیوں پر دوسری صف:- (۱) علی الدین حسن (۲) شبلی (۳) پیر نصیر اللہ (۴) نذیر احمد (۵) نواب ابو الحسن خاں۔

کرسیوں پر تیسری صف:- (۱) ظفر علی خاں بتاریس (۲) سر محمد اقبال (۳) نور المنیب اللہ حیدرآبادی (شملے میں)

پیچھے کھڑے ہوئے:- غلام محمد منشی سے حکیم اجمل خاں تک (۱) ابو الحسن (۲) خواجہ غلام ثقلین (شملے میں) (۳) حبیب الرحمن خاں شروانی (۴) مسعود علی محوی۔

پیچھے کھڑے ہوئے:- منشی محبوب عالم کے پیچھے (۱) قاسم دین (شملے میں) (۲) مصطفیٰ علی وکیل جالنہ۔

وسط میں استادہ:- ظفر علی خاں کے پیچھے ستون سے لگے ہوئے غلام جیلانی نور المنیب اللہ کے پیچھے شرف الحق۔

نوٹ:- اس اہم تاریخی گروپ کے اصحاب کے پہچاننے میں سر عبدالقادر اور مولوی نور المنیب اللہ صاحب وکیل نے سب رس کی جو مدد کی ہے اس کے لیے ادارہ شکر گزار ہے۔
یہ تصویر اگرچہ پہلے سب رس بابت جولائی ۱۹۳۰ء میں شائع ہو چکی تھی لیکن مولوی نور المنیب اللہ صاحب کی مدد اور مشورہ ہی کی وجہ سے دوبارہ بڑی بنا کر چھاپی جا رہی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ اصحاب کے نام معلوم ہو سکیں اور جو نام غلط لکھ دیے گئے تھے ان کی تصحیح ہو سکے۔

فہرست مضامین

غزلیات

چند مشاہیر اردو کی تصویریں اور مختصر حالات۔

خوابِ شیریں

تو، خواب کے مانند گزر جاتا ہے — تو، آنکھوں میں نیند کی طرح آتا ہے
تو، پاس آتا ہے جب، میں سو جاتا ہوں — تجھ کو پا کر میں آپ کھو جاتا ہوں

رباعی

بے خود میں رہوں، تو وہ قریں آتا ہے — اس پردے میں، وہ پردہ نشیں آتا ہے
جب وہ آتا ہے، میں نہیں رہتا ہوں — میں جب رہتا ہوں، وہ نہیں آتا ہے
اے نیند عجیب طرح ڈالی تو نے — میری آنکھوں میں رہ نکالی تو نے

رباعی

کونین کی فکروں سے فراموشی ہے — خاموشی میں کیفیت سرگوشی ہے
آنکھیں لذت میں ڈوب کر بند ہوئیں — یہ نیند ہے، یا تری ہم آغوشی ہے

ان بند پپوٹوں نے چھپایا ہے کسے — ان نور کی پتلیوں نے پایا ہے کسے
مستی میں بھی ہوشیار ہوں، واہ رے میں — بند آنکھوں سے دیکھتا ہوں، اللہ رے میں
ہے صاحبِ عرش کا مکاں آنکھوں میں — ہے نورِ زمین و آسماں آنکھوں میں

رباعی

اصلیت اگر نہیں، تو دھوکا ہی سہی — اللہ! بہت نہیں، تو تھوڑا ہی سہی
تسکین کی آخر کوئی صورت بھی تو ہو — رؤیت ممکن نہیں، تو رؤیا ہی سہی

سیّد احمد حسین امجد

کایا پلٹ

(میکش صاحب ورڈز ورتھ کی نظموں کا آزاد منظوم ترجمہ کر رہے ہیں کایا پلٹ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ "شاہد")

اس کاغذی گلزار میں بو ڈھونڈنے والے ! | بے جان لکیروں میں لہو ڈھونڈنے والے !
ابرو میں شکن ہے، ترے ماتھے پہ پسینہ | ساحل سے مگر دور ہے "کاغذ کا سفینہ"
غیروں کے بنائے ہوئے نغموں کو چبانا | ایسا ہی ہے جیسے کسی "گونگے کا ترانا"
انوارِ بصیرت پہ نہ چھا جائے "سیاہی" | آنکھوں کے لئے مانگ لے آزاد نگاہی

اٹھ اور نگاہوں سے کتابوں کو ہٹا دے
فطرت کے حسیں رخ سے نقابوں کو ہٹا دے

وہ دیکھ حسیں شام کی رنگین جوانی | کھیتوں کو سناتی ہے بہاروں کی کہانی
وہ دامنِ کہسار میں جھرنے کا ترنم | تتلی کے وہ چھو لینے سے کلیوں کا تبسم
جگنو میں جھلکتا ہے، مہ نو کا اشارا | لیتے ہوئے مخمور فضاؤں کا سہارا

....

گرد فن کتابوں میں غم لا تناہی | وہ دیکھ کہ لی طائرِ رنگیں نے جماہی
پیپل کی لچکتی ہوئی ٹہنی کو جھکا کر | آکاش پہ تاروں کو بلاتا ہے وہ، گا کر
سوگند مری روح کی، یہ مست ترانے | دنیا میں لٹاتے ہیں، مسرت کے خزانے
دیکھ، ان میں حیات آفریں نکہتوں کی روانی | سن، ان میں خرد بخشی فطرت کی کہانی

ان نغموں میں گم ہو کے تمنائے اثر سیکھ | تسخیرِ جہاں کے لئے اندازِ نظر سیکھ
خوابیدہ دماغوں کو جگاتے ہیں یہ نغمے | فطرت کی طرف دل کو بلاتے ہیں یہ نغمے

....

بکھرے ہوئے پھولوں کی بھی اک ہلکی سی جنبش | ہے بربطِ تحقیق کا اک نغمۂ دانش
انساں کی حقیقت کا کھلا راز ہے گویا | اک دور سے آئی ہوئی آواز ہے گویا

....

یہ عقل، فریب آشنا، تخیل کی دشمن | انساں کے لئے "محنتِ فردا" کی ہے الجھن
یہ عقل سیہ داغ ہے فطرت کی جبیں پر | پھینکی ہوئی اک آگ ہے فردوسِ بریں پر
اس عقل کے ہاتھوں سے بگڑ جاتی ہے ہستی | زنجیرِ تعین میں جکڑ جاتی ہے ہستی
اس عقل و خرد کو رہِ فطرت میں گنوا دے | آزاد نگاہوں سے کتابوں کو ہٹا دے

اٹھ اور یہیں اپنے لئے مانگ لے "وہ دل"
ہر شئے میں نظر آئے جسے "علم کا حاصل"

میکش

اداریہ

"سب رس" کی زندگی کا تیسرا سال "اُردو نمبر" سے شروع ہو رہا ہے۔ گزشتہ دو سال میں اس کی ترقی حسن صحت بخش طریقے سے ہوئی ہے، اس کا اظہار یہاں بے ضرورت ہوگا اس لیے کہ "سب رس" ارباب ملک سے ہمیشہ قریب تر رہا ہے اور ملک کے دماغوں سے نکلے ہوئے علمی و ادبی سرمائے کو ملک کے دماغوں تک پہنچانے میں اُس کی پُر خلوص کوشش قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی رہی۔

یورپ کی موجودہ صورت حال صحافت کے لیے صبر آزما بن گئی ہے۔ اشیا کی غیر معمولی گرانی نے ظاہری معیار کو پست کر دیا ہے اور ارباب صحافت کے لیے اپنی ساکھ کو قائم رکھنے کے لیے دو ہی راستے کُھلے ہوئے ہیں۔ چندہ میں اضافہ یا موجودہ چندہ کا بدل۔ لیکن ہم نہیں چاہتے کہ خدمت ادب کی راہ میں کسی عذر کو خواہ وہ حقیقت سے قریب ہی کیوں نہ ہو "سنگ گراں" باور کرائیں۔ اسی احساس کے پیشِ نظر ہم نے اپنے اعلانات کے مطابق "اُردو نمبر" کو شاندار بنانے کی کوشش کی ہے اور سب رس کا روایاتی معیار باقی رکھا ہے بلکہ ہمیں یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ اس کو بلند تر کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

سرورق

"اُردو نمبر" کے لیے سرورق کا انتخاب یقیناً ایک نازک کام تھا۔ اس لیے کہ ادبیات کے جدید دور نے "ظاہر و باطن" کی حدیں ملادی ہیں جس طرح ادب اور زندگی کو علحدہ نہیں کیا جا سکتا اسی طرح اچھی کتاب نام ہے، اپنے موضوع، انداز بیان اور دیدہ زیبی کا۔ ایک بدنما پھول، اپنی خوش بُو کے باوجود گیسوؤں کی زینت نہیں بن سکتا۔ ہم نے جب موزوں سرورق کے متعلق غور کیا تو ہمارے تصور میں جامعۂ عثمانیہ کے کلیۂ فنون کی وہ حسین و شاندار عمارت آئی جو اپنی طرز تعمیر میں تہذیب و تمدن کا ایک سرمایہ رکھتی ہے۔ جامعۂ عثمانیہ نے ترقی اُردو میں جو حصہ لیا ہے وہ عہد آفریں ہے۔ کلیۂ فنون کی عمارت ہند و مسلم تہذیبوں کے امتزاج کا خوش گوار نمونہ ہے اور اس عمارت کا افتتاح اُردو کے سب سے بڑے محسن اعلیٰ حضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ نے فرمایا ہے۔ یہی وہ غیر معمولی خصوصیات ہیں جن کے باعث اُردو نمبر کے سرورق پر جامعۂ عثمانیہ کے کلیۂ فنون کی تصویر ہی موزوں ترین سمجھی گئی۔

یہ تصویر جو "اُردو نمبر" کے سرورق پر دکن کی "خدمت اُردو" کے نمایاں ثبوت میں شایع کی جا رہی ہے، اصل میں چاندی کے اس کیسکٹ کا عکس ہے جو پندرہ ہزار روپے کے صرفے سے تیار ہوا اور بارگاہِ سلطان العلوم میں افتتاح کلیۂ فنون کے موقع پر گزرانا گیا۔ کلیۂ فنون کی عمارت چونے اور پتھر سے بنائی گئی ہے اور اس کا یہ نمونہ چاندی سے تیار کیا گیا ہے۔ لیکن ان دونوں میں عثمانیین کے دلوں کا سکون پرور اضطراب، روح کا تقدس اور علم و عمل کی پاکیزگی دکھائی دیتی ہے۔ فن کاروں کا یہ سب سے بڑا کمال ہے کہ انھوں نے حُسن کو حقیقت سے ہم آہنگ کر دیا۔

تصویریں

"اُردو نمبر" کی مناسبت سے اس کی تمام تر تصویریں یا تو اُردو ادب کے شاعروں، ادیبوں اور محسنوں کی ہیں یا اُردو سے تعلق رکھتی ہیں جیسا کہ

ہم نے پہلے بھی کہا ہے، جنگ کی وجہ سے کاغذ، بلاک سازی اور طباعت میں جو گرانی پیدا ہو گئی ہے اُس کے پیشِ نظر ایک ہی نمبر میں تقریباً پچاس تصویروں کا شائع کرنا معمولی بات نہیں ہے۔ اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنھوں نے کبھی اس کوچہ میں قدم رکھا ہے۔ اس واقعے کا اظہار ہم محض یہ بتانے کے لیے کر رہے ہیں کہ ہمیں "سب رس" کتنا عزیز ہے اور ہم اس کو مقبول و مفید بنانے کے لیے کیا کر رہے ہیں۔

مشاہیر اُردو کے غیر مطبوعہ خطوط۔

ادبیات میں مکتوبات کی خاص اہمیت ہے۔ اس لیے کہ مکتوبات زندگی کا آئینہ ہوتے ہیں جن میں کاتب بے تکلفی کے ساتھ اپنی زندگی کے عکس پیش کرتا ہے۔ چونکہ مکتوب چھپوانے کے خیال سے نہیں لکھا جاتا اس لیے اس میں سادگی اور بے ساختہ پن ہوتا ہے۔ اسی لیے مشاہیر کے خطوط کا ذخیرہ ہر زبان میں محفوظ کیا جاتا رہا ہے۔ اُردو میں بھی مکتوبات کے بعض مجموعے شائع کیے گئے ہیں۔ آپ کو اس نمبر میں مشاہیر اُردو کے سولہ غیر مطبوعہ خطوط ملیں گے جو پہلی دفعہ شائع ہو کر منظرِ عام پر آ رہے ہیں۔ شبلی، داغ، ..... طیبہ بیگم، گرامی، شاد عظیم آبادی، راشد الخیری اور ممتاز علی وغیرہ کے نام اور کام سے ہر اُردو داں واقف ہے۔ یہ مکاتیب اُردو ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہیں۔ یہاں یہ کہہ دینا بے محل نہ ہوگا کہ ادارۂ ادبیات اُردو اکثر مشاہیر اُردو کی غیر مطبوعہ تحریریں جمع کر رہا ہے اور اسی ذخیرے سے چند اُردو خطوط اُردو نمبر کے لیے حاصل کیے گئے ہیں۔

اُردو پروفیسروں کے حالات

اُردو ادب کی تاریخ، ان خاموش خدمت گزاروں کے تذکرے کے بغیر نامکمل رہے گی جن کی رہنمائی نوجوانوں میں اپنی زبان کی خدمت کرنے کا ذوق پیدا کرتی ہے، زبان کے ان خدمت گزاروں پر بہت کم لوگوں کی نظر گئی ہے۔ ادیبوں، انشا پردازوں اور شاعروں کو سراہنے والے ان کو کسی طرح نہیں بھلا سکتے، جن کی دماغی محنت اور ایثار سے نوخیز ادیبوں، انشا پردازوں اور شاعروں کی صحت بخش تربیت ہوتی ہے۔ اس نمبر میں ہم نے ہندوستان کی مختلف جامعات کے اساتذۂ اُردو کے حالات اور خدمات سے اہلِ زبان کو روشناس کرایا ہے۔

افسوس ہے کہ بعض حضرات نے اپنے حالات روانہ نہیں کیے ورنہ یہ تذکرہ مکمل ہو جاتا۔ اب اس کی تکمیل کا یہی طریقہ رہ گیا ہے کہ اس کو ایک جداگانہ کتاب کی صورت میں شائع کیا جائے "ادارۂ ادبیات اُردو" ایسی ایک کتاب شائع کر رہا ہے جس میں گزشتہ اساتذہ کے حالات و خدمات کا تذکرہ بھی شریک رہے گا۔

حصۂ نظم و نثر

اُردو نمبر کا حصۂ نظم پُر تنوع اور بلند پایہ ہے۔ اس کے لیے اکثر و بیشتر مشہور شاعروں کی غیر مطبوعہ غزلیں اور نظمیں خاص طور پر حاصل کی گئی ہیں۔ جلیل، امجد، علی منظور، ماہر، ساغر، حفیظ جالندھری، صفی اورنگ آبادی، احسان دانش، خنجر، مخدوم، وجد، وغیرہ کی غزلوں اور نظموں میں جو قدیم اور جدید طرزِ شاعری کے نمونے ہیں، آپ اُردو شاعری کے مختلف رجحانات دیکھیں گے۔

حصۂ نثر میں ہندوستان کے بہترین انشا پردازوں کے معلومات آفریں مضامین اور مقالے شامل ہیں، جو "سب رس" کے لیے خاص طور پر حاصل کیے گئے ہیں۔

ڈاکٹر زور - احسن یار جنگ - سید عارف الدین - عزیز یار جنگ - بہادر یار جنگ - سر عبدالقادر - محمد اکرام - سیف علیخان - ہاشمی
اقبال علی - پروفیسر سروری - ظہیر الدین احمد - پروفیسر سید محمد - ناصر الدین احمد - پروفیسر فضل حق - ڈاکٹر امیر علیخان
عارف علی - کمال علی - پروفیسر حمید صدیقی - سراج الدین احمد - عبدالحفیظ - حمید الدین شاہد

مرزا فرحت اللہ بیگ، ایم اسلم، ماہر القادری، علامہ ڈاکٹر نجم الدین احمد جعفری، پروفیسر عبد القادر سروری کے علاوہ متعدد ایسے اصحاب کی قلم کاری کے نتائج آپ کو اس نمبر میں ملیں گے جنھوں نے اپنی زندگی خاص خاص موضوعوں کے لیے وقف کر رکھی ہے۔

سب رسی معلومات

اس نمبر سے عوام کے ضمیمہ کے علاوہ ایک اور ضمیمۂ معلومات کا اضافہ کیا جا رہا ہے۔ جس میں عام فہم طریقے سے تازہ معلومات فراہم کی جائیں گی۔ زندگی کی بڑھتی ہوئی مصروفیتوں نے ایک طرف وقت کو تنگ بنا دیا ہے اور دوسری طرف رفتار زمانہ سے واقف رہنا ناگزیر ہے۔ اس لیے کم وقت میں بہت کچھ حاصل کرنے کے مواقع فراہم کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ ضمیمہ ان طلبہ کے لیے خاص طور پر مفید ہوگا جو امتحانات مقابلہ کے لیے تیاری کرتے ہیں۔ کیونکہ اس میں سائنس اور دیگر جدید علوم کے علاوہ مقابلہ کے امتحانوں کی ضروریات اور اطلاعیں شایع ہوتی رہیں گی۔ اس ضمیمہ کی ترتیب کا کام مولوی عبد الحفیظ صاحب صدیقی بی۔ ایس سی کے سپرد کیا گیا ہے ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ضمیمہ ان اصحاب کے لیے جو اپنی مصروفیتوں کے باعث مطالعہ کے لیے بہت کم وقت دے سکتے ہوں، کارآمد ہوگا۔

ادارۂ ادبیات اردو

[illegible] ہوئی سرگرمیوں [illegible] باعث اس وسیع کام کو جس کی انجام دہی مرکزی ادارے کے لئے وقت طلب ثابت ہو رہی تھی، شعبہ واری تقسیم کے ذریعے سے پھیلا دیا گیا ہے۔ اس طرح اب تک شعبۂ زبان، شعبۂ تالیف و تراجم، شعبۂ تاریخ دکن، شعبۂ شعرا و مصنفین دکن، شعبۂ تنقید، شعبۂ سائنس، شعبۂ امتحانات، شعبۂ نسواں، شعبۂ اطفال اور شعبۂ طلبہ قائم ہو چکے ہیں۔ اور ادارہ کے کام میں تنظیم کے ساتھ وسعت ہوتی جا رہی ہے۔ ملک کے علم دوست اور اہل ذوق خواتین اصحاب کی معاونت سے ان شعبوں نے ایک انفرادی حیثیت حاصل کر لی ہے اور ہر شعبہ اپنے مفوضہ کام کو دلچسپی [illegible] انجام دے رہا ہے۔ شعبے نہ صرف مختلف مسائل پر غور و خوض کر رہے ہیں بلکہ ان کی جانب سے خاص موضوع پر کتابیں تصنیف و تالیف کروائی جا رہی ہیں۔ ہم چاہتے تھے کہ یہاں ادارے کی شعبہ جاتی مصروفیتوں کو تفصیل کے ساتھ پیش کریں لیکن ادارہ سے ہم سفارش کر رہے ہیں کہ وہ ایک کتابچہ شایع کرے جس میں ادارے کی مکمل روداد ہو۔ خدا کا شکر ہے کہ ادارہ نے حیدرآباد میں اپنے خلوص عمل اور ذوق کار سے کافی مقبولیت حاصل کر لی ہے اور اس کی علمی کوششوں کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جا رہا ہے۔ اس لئے ایسے کتابچے کی اشاعت ارباب ملک کو یہ واقف کرانے کے لئے ضروری ہے کہ ادارے نے اب تک کیا کیا؟ اور اب وہ کیا کر رہا ہے؟

ایک وسیع کتب خانے کے قیام کی اسکیم جس میں [illegible] تمام قدیم و جدید اردو کتابیں ہوں زیر غور ہے تاہم فی الحال ادارہ کے دفتر ہی میں ایک کتب خانہ قائم کیا گیا ہے۔ اس کتب خانہ میں کئی مخطوطات کا بھی ایک قابل لحاظ ذخیرہ ہے۔ ملک کے وہ اہل ذوق اصحاب جو زبان کی خدمت کو ایک مقدس فرض سمجھتے ہیں، اس کتب خانے کے لئے قلمی و مطبوعہ کتابیں فراہم کرنے میں مدد دیں تو یقین ہے کہ اردو سے دلچسپی رکھنے والوں اور اردو ادب پر تحقیقی کام کرنے والوں کی ایک مشکل حل ہو جا سکتی ہے۔

"مرکزی ادارے" نے صرف بلدے کے اصحاب ذوق کا تعاون حاصل کیا تھا۔ اور یہ ناممکن تھا کہ اضلاع حیدرآباد کے خدمت گزاران اردو اپنی اعانت سے ادارے کو محروم رکھیں۔ اردو زبان حیدرآباد کی قومی اور سرکاری زبان ہے اس لئے اس کے ہر دیہات میں بولی اور سمجھی جاتی ہے لیکن بلدہ سے زیادہ اہلِ دیہات میں اشاعتِ اردو کا کام اس لئے ہونا چاہیئے کہ ..... وہ شہر سے دور ایسے گوشوں میں اپنی زندگی گزار رہے ہیں جو شہری سہولتوں سے محروم ہے۔ ادارہ کی شاخیں اب تک اورنگ آباد، محبوب نگر، جالنہ اور عثمان آباد میں قائم ہو چکی ہیں۔ اور توقع ہے کہ حیدرآباد کے ہر گوشے میں اس کی شاخ قائم ہو جائے گی۔ ہم اضلاعی شاخوں سے بلند آہنگ توقعات وابستہ کرنے میں غلطی نہیں کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ وہ اضلاع میں رہ کر اضلاع کی ضروریات سے بہت زیادہ واقف ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان کی پُرخلوص کوشش سے حیدرآباد کے ہر گوشے میں اردو ادب عام ہو جائے۔ یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ جاہلیت کے خلاف ایک مستحکم محاذ قائم کیا جائے۔

یہ کوئی دقت طلب کام نہیں ہے اگر ارادہ میں پختگی، مزاج میں استقلال اور دل میں خلوص ہو۔ ادارہ نے شعبۂ امتحانات قائم کر کے ایک راہِ عمل کھول دی ہے۔ اس لئے اضلاعی شاخوں کو چاہیئے کہ وہ زیادہ سے زیادہ طالب علموں کو ادارے کے امتحانات کی تیاری کے لئے آمادہ کریں اور ترغیب و مدد سے انہیں اس قابل بنائیں کہ وہ امتحانوں میں کامیابی حاصل کر سکیں۔

شاخ محبوب نگر :۔ صدر مولوی سید نقی صاحب بلگرامی بیرسٹر ایٹ لا ناظم عدالت ضلع۔ نائب صدر۔ مولوی احمد عبداللہ صاحب مسدیکا بی اے ال ال بی۔ معتمد۔ مولوی حسن علی مرزا صاحب وکیل۔ شریک معتمد مولوی عمر علی صاحب فاروقی وکیل۔

اراکین :۔ پنڈت نارائن راؤ صاحب وکیل۔ ہنمنت راؤ صاحب وکیل۔ مولوی عبدالرزاق خاں صاحب صولت بی اے ال ال بی وکیل۔ نندگیری وینکٹ راؤ صاحب بی اے ال ال بی وکیل۔ ڈاکٹر افتخار الدین صاحب سیول سرجن۔ سید ساجد علی صاحب مہتمم تعلیمات۔ مولوی سالم مسدوسی صاحب۔ مولوی عبدالعزیز صاحب گتہ دار۔ مولوی عبدالرحمٰن صاحب آواز گتہ دار۔

شاخ جالنہ :۔ صدر۔ مولوی فضل علی صاحب وکیل ہائیکورٹ معتمد۔ مولوی افضل عابدی صاحب وفا۔ مہتمم مولوی سید عمر صاحب مولوی فاضل۔ کتب خانہ دار مسٹر غازی۔

نشرگاہ حیدرآباد

موجودہ زمانے میں نشریات نے جو غیر معمولی اہمیت حاصل کر لی ہے وہ محتاجِ تشریح نہیں۔ ریڈیو تفریحی اور تعمیری دونوں حیثیتوں سے تمدنِ حاضرہ میں اپنا ممتاز مقام رکھتا ہے۔ برق کی ترسیلی قوت نے صوتی لحاظ سے ایک عالمی ارتباط پیدا کر دیا ہے۔ اور اس کی وجہ سے دنیا کے مختلف گوشے ایک دوسرے سے اتنے قریب ہو گئے ہیں جتنے کہ اس سے پہلے کبھی نہیں تھے۔ ریڈیو نے ملک و قوم کی خدمت کے نئے راستے کھول دئے ہیں۔ جس طرح قلم سے تعلیم و تہذیب کی اشاعت میں مدد لی جا سکتی ہے، اسی طرح ریڈیو کے ذریعے سے بھی زیادہ وسعت کے ساتھ تعمیری کام لیا جا سکتا ہے۔ ریڈیو سے جو خدمات ہو سکتی ہیں، ان میں خدمتِ زبان بھی ہے۔ دنیا بھر کی نشرگاہوں سے ادبی پروگرام کی نشر عوام میں "ادبی ذوق" پیدا کر رہی ہے۔ چونکہ ریڈیو کا راست تعلق عوام سے بھی ہے اس لئے ذریعۂ نشر وہی زبان ہو سکتی ہے جو عوام کی مشترکہ زبان ہو۔ بدقسمتی سے ہندوستان میں زبان کے مسئلہ کو سیاسی رنگ دیا گیا ہے اور یہ بحث ختم ہوتی نظر نہیں آتی کہ ہندوستان کی مشترکہ زبان اردو ہے یا ہندی؟

افسوس ہے کہ ادنیٰ تعصبات کی پھیلی ہوئی تاریکی میں ایک کرن بھی ایسی نہیں جو انتہا پسندوں کو ایک مقام پر لا سکے۔ لیکن جب "آل انڈیا ریڈیو" نے اپنے سننے والوں سے دریافت کیا کہ وہ کس زبان میں پروگرام سننا پسند کرتے ہیں تو زیادہ خط اردو (ہندوستانی) کی تائید میں وصول ہوئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو ہندوستان بھر میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ جس طرح ہندوستان کے فنون لطیفہ اپنے میں ہندوستانی تمدن کی روح رکھتے ہیں اسی طرح اردو بھی ہندوستان کے مشترکہ تمدن کی نشانی ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ حیدرآباد میں زبان کا مسئلہ ابھی تک خارزار سیاست میں نہیں الجھا ہے اور "سیاسی دیوانگی" کا داؤں ہمیشہ بیٹ ہی پڑا ہے۔ اردو حیدرآباد کی قومی اور ملکی زبان ہے۔ اس لئے اردو کی خدمت نہ صرف ملک و قوم بلکہ اپنی حقیقی تہذیب کی خدمت ہے۔

نشرگاہ حیدرآباد کا کل ہند بنیادوں پر حال ہی میں افتتاح ہوا ہے۔ لیکن وہ اردو کی جو خدمت کر رہی ہے قابل مبارکباد ہے۔ ہمارے ملک میں ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک اردو بولی یا سمجھی جاتی ہے، ہماری دفتری زبان اردو ہے، ہمارا ذریعۂ تعلیم اردو ہے اس لئے یہ ناممکن تھا کہ ہمارا ذریعۂ نشر بھی اردو نہ ہو۔ جہاں تک ہم سمجھ سکے ہیں نشرگاہ کی سرکاری اور غیر سرکاری تقریروں میں جو زبان استعمال کی جاتی ہے وہ اردو کے موجودہ رجحانات کا صحیح عکس ہے۔ اس کو ہندی نوازی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور نہ فارسی و عربی آمیز اردو سمجھا جا سکتا ہے۔ ہم ملک کے تمام حقیقت شناس باشندوں کی جانب سے یقین دلاتے ہیں کہ یہی زبان ہماری زبان ہے۔ ہم نشرگاہ حیدرآباد سے استدعا کریں گے کہ وہ بے جا اعتراضوں کو درمیان میں لائے بغیر زبان کے معاملہ میں موجودہ حکمت عملی ہی پر کاربند رہے تاکہ پروگرام کو زیادہ سے زیادہ لوگ سنیں اور سمجھیں۔

چونکہ نشرگاہ حیدرآباد کی تقریریں عوام میں ایک علمی و ادبی بیداری پیدا کرنے میں معاون ثابت ہو رہی ہیں اس لئے ادارۂ ادبیات اردو نے ان کو مقررین صاحبان کی اجازت سے اپنے ماہنامہ سب رس میں یا کتابوں کی صورت میں شایع کرنے کا انتظام کیا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے کی پہلی کتاب "سائنس کے کرشمے" شایع ہو چکی ہے۔ جس کو ادارہ کے مخلص رفیق میر حسن صاحب نے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب میں سائنس کے کرشموں پر ملک کی قابل ہستیوں کی عام فہم تقریریں جمع کی گئی ہیں۔

سب رس کی مجلس ادارت نے تصفیہ کیا ہے کہ جولائی سنہ ۱۹۴۰ء میں "سب رس" کا ایک "فضائی ادب نمبر" شایع کیا جائے جس میں ان نشری تقریروں کا انتخاب پیش کیا جائے جو اب تک نشرگاہ حیدرآباد سے نشر ہو چکی ہیں۔ ہم آئندہ شمارے میں اس نمبر کے متعلق تفصیل کے ساتھ عرض کرنے کے قابل ہو سکیں گے، فی الحال صرف یہی کہنا کافی ہوگا کہ ایسا تنوع، شاید ہی آپ نے کسی رسالہ میں دیکھا ہوگا جیسا کہ سب رس کے فضائی ادب نمبر میں ہوگا۔

جامعہ عثمانیہ جامعہ گزشتہ چند دنوں تک غیر معمولی علمی چہل پہل کا مرکز بنا رہا۔ کلیۂ فنون کی جدید عمارت کا افتتاح اعلیٰ حضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ نے بہ نفس نفیس فرمایا۔ جس عمارت کی بنیاد حضور شاہانہ نے اپنے دست مبارک سے رکھی ہو اور جس کا افتتاح خود حضور شاہانہ فرمائیں، وہ یقیناً علم و عمل کی پرورش کا گہوارہ بن سکتی ہے۔ اس موقع پر ارباب جامعہ اور طلبائے انجمن اتحاد کی جانب سے بارگاہ شاہانہ میں عقیدت مندانہ سپاس نامے پیش کرنے کی عزت حاصل کی گئی ان سپاس ناموں کا

جو جوابِ شاہانہ ارشاد فرمایا گیا، وہ عثمانین کی زندگیوں کے لئے نہایت ہی بصیرت افروز ہے۔ حضور اقدس و اعلیٰ کے ارشاداتِ عالیہ جامعہ عثمانیہ کے بلند تر مستقبل کی ضمانت ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ برادرانِ جامعہ نے اپنی زندگیوں کے لئے "اپنی زندگیوں کے مرکز" سے وہ سب کچھ حاصل کر لیا ہے جو انھیں از راہِ عطوفت خسروی عنایت فرمایا گیا۔ اس سرزمین پر جہاں "علم نامانوس زبانوں کی قید سے آزاد کیا گیا" اعلیٰ حضرت سلطان العلوم کی تشریف آوری ایک فالِ نیک ہے جس نے عثمانین کے جذبۂ عمل کو تیز تر کر دیا ہے۔

کلیۂ فنون کی جدید عمارت میں افتتاح کے بعد ہی دو شاندار علمی اجتماعات ہوئے۔ ایک تو ماہرینِ فلسفہ کی کانفرنس، اور دوسرا، ماہرینِ ریاضی کی کانفرنس۔ ان دونوں کانفرنسوں میں ہندوستان کی مختلف جامعات کے مندوبین جمع ہوئے تھے جنھوں نے جامعہ عثمانیہ کی سرپرستی میں اپنے فنون کے متعلق غور و خوض کیا۔ ان دونوں کانفرنسوں کے لئے اعلیٰ حضرت سلطان العلوم نے اپنے لطف و کرم سے پیاماتِ کامیابی عطا فرمائے۔ کلیۂ فنون کی جدید عمارت نے اپنی زندگی کی پہلی ہی منزل میں دو ایسے شاندار اجتماعات دیکھے جو شاید ہی کسی جامعہ کو آٹھ دن کی قلیل مدت میں نصیب ہوئے ہوں گے۔

طلبائے جامعہ کی جانب سے حسبِ معمول اس سال بھی "یومِ جامعہ" منایا گیا۔ لیکن اس کی ایک اہم خصوصیت ایسی ہے جو دوسری ایسی تقریبوں سے اسے ممتاز کر دیتی ہے اور وہ مشاعرہ میں والاشان حضرت معظم جاہ بہادر شجیع کی تشریف آوری ہے۔ شہزادۂ والاشان نے جامعہ کے مشاعرہ کی صدارت قبول فرما کر خانوادۂ شاہی کی ان پیہم عنایات کا ایک اور نمایاں ثبوت دیا جو جامعۂ عثمانیہ پر ہمیشہ مبذول رہی ہیں۔ فرزندانِ جامعہ کے شعری رجحانات "زندگی اور ادب" کو قریب تر کر رہے ہیں۔ "ادارۂ ادبیاتِ اردو" کی کتاب "شعرائے عثمانیہ" میں اس کی جابجا جھلک دکھائی دیتی ہے۔ جو حسنِ اتفاق سے انہی دنوں میں شائع ہوئی۔ ان شعری صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں شاہزادۂ والاشان کی دلچسپی جن کا پاکیزہ ذوقِ تغزل اردو شاعری پر دکن کے روایاتی الطافِ شاہانہ کا زندہ ثبوت ہے، بلاشبہ معاون ثابت ہوگی۔

"انجمنِ طیلسانیینِ عثمانیہ" ملک کی واحد انجمن ہے جس میں تمام اعلیٰ تعلیم یافتہ اراکین ہیں۔ ہم یہاں اس بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتے کہ انجمنِ طلبائے قدیم اور انجمنِ طیلسانین کو ایک مرکز پر لا لینے سے کیا کوئی ایسے نقصان کا امکان ہے جو ان دونوں انجمنوں کے مفادات کو متصادم کر دے گا۔ ہم ہمیشہ سے جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل اصحاب کو ایک ہی مرکز پر دیکھنے کے متمنی ہیں۔ بہر حال جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دونوں انجمنیں اپنے اپنے حلقۂ اثر میں سرگرمِ عمل ہیں تو ہمیں اس کا زیادہ احساس بھی نہیں ہوتا۔ عثمانی طیلسانوں کی کانفرنس، اس سال اورنگ آباد میں منعقد ہوئی، جس کی صدارت ادارۂ ادبیاتِ اردو کے ایک مؤسس مولوی عبد المجید صاحب صدیقی نے کی۔ اور جس کا افتتاح حضرت بسالت جاہ بہادر نے فرمایا۔ نواب بسالت جاہ بہادر کو ملک کی تعلیمی ترقی سے جو گہری دلچسپی ہے اس کا ثبوت ان کی مصروفیتوں سے نمایاں ہوتا رہتا ہے۔

انجمن کی معاشی کمیٹی نے گزشتہ سال کی طرح، اس سال بھی باغِ عام میں ایک عظیم الشان صنعتی نمائش منعقد کی ہے۔ اس قسم کی نمائشیں نہ صرف ملکی صناعوں کی حوصلہ افزائی کا باعث ہوتی ہیں بلکہ اربابِ ملک کے دلوں میں بھی ایک احساسِ ترقی پیدا کرتی ہیں۔

دکن کی صنعتوں کا زوال ہماری سرد مہریوں کا نتیجہ ہے۔ اور آج جبکہ نظام زندگی کی بنیاد معاشی مسائل پر قائم ہے ہمیں محسوس کرنا چاہیے کہ پیدائش دولت کے بغیر ہماری اجتماعی حالت ترقی نہ کر سکےگی۔ معاشی کمیٹی قابل مبارکباد ہے کہ اس نے ملک کی صنعتوں کو ارباب حکومت کے سامنے پیش کر کے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ملکی صناع کا داغ دل، دراصل ملک کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔

فلموں کی زبان

ہندوستان کے طول و عرض میں فلموں کی زبان کے متعلق چہ می گوئیاں زمانے سے جاری ہیں۔ اور فلموں کو دیکھنے والوں نے افسوس کے ساتھ یہ محسوس کیا ہے کہ اکثر فلموں کی زبان کا پلہ اس غیر مانوس زبان کی طرف جھکا ہوا ہے جس کو کم از کم اہل حیدرآباد سمجھنے سے قاصر ہیں فلم میں بھی وہی زبان استعمال ہونی چاہیے جو ہماری مشترکہ زبان ہے۔ اس لئے کہ وہ کسی خاص طبقے کے لئے نہیں تیار کیا جاتا ہے۔ غرض یہ ایک طولانی بحث ہے جس کو ہمیشہ اٹھایا جاتا رہا ہے۔ لیکن اردو سے محبت رکھنے والوں کا کیا یہ مقدس فرض نہیں ہے کہ وہ ایسے فلموں کی حوصلہ افزائی کریں جو اردو کی اشاعت میں مدد دے رہے ہیں؟ یہ ایک سوال ہے جس کے انکاری جواب کا ہمیں گمان تک نہیں۔ ہم ہندوستانی فلمی کمپنیوں کی نیتوں پر حملہ کئے بغیر اپنی زبان اور اس کے ذریعے سے اپنے تمدن کی حفاظت کے دل سے آرزومند ہیں۔ یہی وہ احساس تھا جس کے تحت مسٹر سہراب مودی کا جب وہ اردو نواز دکن میں آئے تو خندہ پیشانی کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا۔ وہ سہراب مودی کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک خدمتگزار اردو کی حیثیت سے ہمارے تحسین و ستائش کے مستحق ہیں۔ ذاتیات کی الجھنوں میں الجھ کر خدمات کو فراموش کر دینا کوئی ایسی قابل تعریف بات نہیں جس کو ہنگامہ آرائی کے لئے بہانہ بنایا جائے۔ ”کون کہتا ہے“؟ کا سوال ”کس نے کیا کیا“ کے درمیان کیوں لایا جائے۔ جو لوگ اردو کے سہارے جیتے ہیں وہ تعصبات ظاہری میں پڑ کر اصل حقیقت کو نظر انداز نہ ہونے دیں گے۔ ہمیں اس کا دلی افسوس ہے کہ غلط فہمی یا کسی اور بنا پر اس بارے میں عوام کی رائے کو غلط راستہ پر ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ بہرحال یہ ایک وقتی چیز تھی، لیکن کام قدر حاصل کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مسٹر سہراب مودی کی حیثیت صاف ہے اور اردو کے متعلق انھوں نے جو خیالات اپنی نشری تقریر میں ظاہر کئے ہیں، ان کی وجہ سے ان کی عزت اردو دنیا میں اور بھی بڑھ گئی ہے۔

امدادی سرمایہ جنگ

گزشتہ مہینے امدادی سرمایہ جنگ کے لئے ٹاؤن ہال باغ عامہ میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا گیا۔ جس کی صدارت ”ادارۂ ادبیات اردو“ کے سرپرست اعلیٰ ہز ہائنس پرنس آف برار نے فرمائی۔ یورپ کی نازک صورت حال، ایک عالمی تشویش کا باعث بن گئی ہے اس لئے ساری دنیا کے امن و امان کو آمری قوتوں سے محفوظ رکھنے کے لئے مخالفین مصروف ہیں۔ امن و امان کے تحفظ کا جذبہ یقیناً ایک مقدس جذبہ ہے اس لئے ان کی امداد ضروری ہے جو ہماری سلامتی کے لئے اپنی سلامتی کو خاطر میں لائے بغیر لڑ رہے ہیں اس جلسہ میں ہز ہائنس پرنس آف برار کے علاوہ شہزادہ والا شان نواب معظم جاہ بہادر، سر یمین السلطنت، ہز ایکسلنسی سر اکبر حیدری، نواز جنگ بہادر اور نواب سالار جنگ بہادر نے بھی تقریریں فرمائیں۔ یہ جلسہ حیدرآباد کی تاریخ میں پہلا جلسہ ہے جس کے اسٹیج سے ایک ہی وقت میں ملک کی بلند پایہ شخصیتوں نے اہل شہر کو مخاطب کیا۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

اس سال آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی صدارت کے لئے نواب کمال یار جنگ بہادر کو منتخب کیا گیا ہے۔ ایجوکیشنل کانفرنس ہندوستان کی علمی بیداری میں قابلِ لحاظ حصہ لیتی رہی ہے۔ اور نواب کمال یار جنگ بہادر ملک کے ان گنے چنے امراء میں سے ہیں جو ملک و قوم کا حقیقی درد رکھتے ہیں۔ خصوصاً دکن کے قحط زدہ غریبوں کے لئے انھوں نے حال ہی میں جو پُر خلوص کوششیں کی ہیں، کبھی بھلائی نہیں جا سکتیں۔ اس لئے ایجوکیشنل کانفرنس کے حالیہ اجلاس کی صدارت کے لئے ان کا انتخاب اربابِ کانفرنس کی بیدار مغزی کا ثبوت ہے۔ ہم نواب کمال یار جنگ بہادر کو پُر خلوص مبارک باد دیتے ہوئے ان سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ آئندہ بھی ملک و قوم کی تعمیری خدمت میں پیچھے نہیں رہیں گے۔ کانفرنس میں جو تحریکیں منظور ہوئیں ان میں سب سے زیادہ اہم، شمالی ہند کی جامعات اور خاص طور پر جامعہ علی گڑھ میں اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے اور جہاں ابھی تک اردو کی تعلیم اختیاری مضامین کے طور پر نہیں دی جا رہی ہے، وہاں اس کا انتظام کرنے سے متعلق ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ انجمن ترقیٔ اردو اپنے تمام وسائل سے کام لے کر اس تحریک کو عملی جامہ پہنائے بغیر چین نہیں لے گی۔

انجمن ترقیٔ اردو کی مقامی شاخ

دہلی میں "انجمن ترقیٔ اردو" کی منتقلی کے بعد حیدرآباد میں اس کی ایک شاخ قائم کی گئی ہے۔ "انجمن ترقیٔ اردو" نے اردو کی ترقی و اشاعت میں ہمیشہ سرگرم حصہ لیا ہے۔ اور ایسے وقت میں جب کہ اردو ہندی کشمکش بڑھتی جا رہی ہے، اردو کی حفاظت کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اس انجمن کو حکومتِ حیدرآباد کی جانب سے ایک بیش قرار رقم سالانہ امداد کے طور پر دی جاتی ہے۔ حیدرآباد میں اس کی شاخ کے معتمد ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی پروفیسر ریاضی جامعہ عثمانیہ ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو فنِ ریاضی میں ہندوستان گیر شہرت حاصل ہے۔ اس انجمن سے ہماری خوش گوار توقعات بیجا نہیں۔

بے بنیاد افواہ

حال ہی میں ایک شگوفہ چھوڑا گیا اور وہ یہ کہ مقامی انجمن ترقیٔ اردو اور ادارۂ ادبیات اردو میں اختلاف ہے، ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ بے بنیاد افواہ کیوں پھیلائی گئی اور اس کے ذمہ دار کون ہیں؟ اردو اکاڈمی جامعہ ملیہ دہلی، دار المصنفین اعظم گڑھ، ہندوستانی اکاڈیمی الہ آباد، اردو مرکز لاہور، کی طرح ادارۂ ادبیات اردو بھی، انجمن ترقیٔ اردو یا کسی اور ایسی انجمن کے ساتھ تعاون عمل کرنے ہمیشہ تیار رہا، جس کا مقصد اردو کی خدمت گزاری ہے۔ انجمن ترقیٔ اردو ہندوستان بھر میں اردو کے سیاسی اور ثقافتی اقتدار کو برقرار رکھنے کی جو ان تھک کوشش کر رہی ہے، وہ غالباً دوسری کسی انجمن سے ممکن نہیں۔ انجمن کے اغراض کی تکمیل کے لئے جس قدر زیادہ شاخیں قائم کی جائیں اچھا ہے، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ دوسرے ادارے جن کے نام ہم نے اوپر مثالاً دئے ہیں، وہ اپنی برسوں کی کارگزاری اور اس کے لازمی وجوبات (Obligations) کے ساتھ اپنا وجود ختم کر دیں۔

انعامی مضامین کا اعلان

سب رس سنہ ۱۹۳۹ء کے بہترین مضامین کے لئے حسب ذیل اصحاب نے انعامات عطا فرمائے ہیں۔ انعامات دینے کا تصفیہ ایک مجلس کے سپرد کیا گیا ہے جس کا نتیجہ فروری سنہ ۴۰ء کے سب رس میں شایع ہوگا۔

(۱) اصلاحی مضمون یا افسانہ:۔ محترمہ صغریٰ بیگم ہمایوں مرزا۔

(۲) ضمیمہ سب رس (بچوں کے لئے) کا بہترین مضمون یا افسانہ یا نظم۔ نواب مرزا سیف علی خاں صاحب جاگیردار۔

(۳) سب رس کا بہترین علمی و ادبی مضمون:۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ میکش

پہلی صف ۱۔ اشک۔ ۲۔ ذکی ۳۔ قریشی ۴۔ زور ۵۔ اکبر ۶۔ رشدی
دوسری صف ۷۔ مخدوم ۸۔ وحد ۹۔ رگھونندن راج سکسینہ ۱۰۔ باق
تیسری صف ۱۱۔ مہندر راج سکسینہ ۱۲۔ شکیب ۱۳۔ میکش

اُردو ادب کا مُطالعہ

زبان خواہ مادری ہو یا غیر مادری، ادب خواہ ملکی ہو یا غیر ملکی ان سب کے مطالعہ کے اصول اور تحصیل کے طریقے تقریباً متحد ہیں۔ متمدن اقوام مادری زبان کو بغیر کسی خاص کاوش کے حاصل کر لینے کو فطری طریقہ سمجھتی ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جس کو ہم فطری طریقہ سمجھتے ہیں اس میں ہماری اکتسابی قوت کا جزو کہاں تک شریک ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی زبان، خواہ وہ آغوشِ مادر میں سیکھی جائے یا استاد کے سایۂ شفقت میں، بغیر تکرار اور اعادہ کے حاصل نہیں ہوتی۔ بچہ ولادت کے وقت کوئی زبان بولتا ہوا نہیں پیدا ہوتا ہے بلکہ جس ماحول میں وہ آنکھیں کھولتا ہے اور جن لوگوں سے دوچار ہوتا ہے ان کی آواز اور زبان وہ سیکڑوں بلکہ ہزاروں بار لگاتار سنتا رہتا ہے۔ جتنی آوازیں اس کے کان تک پہونچتی ہیں وہ اس کے دماغی اعصاب پر مرتسم ہو جاتی ہیں۔ جب بچہ اس قابل ہوتا ہے کہ اپنی زبان ہلا سکے تو سب سے پہلے وہ مفرد الفاظ کو استعمال کرتا ہے پھر رفتہ رفتہ الفاظ کو جملوں کے ذریعہ ادا کرتا ہے اس طریق تحصیل کے تحت میں اگر بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو اعادہ و تکرار کا نفسیاتی پہلو سامنے آئے گا۔ جن جملوں کو بچہ بار بار سنتا ہے ان کا کچھ عرصہ بعد بلا تامل اور بلا اختیار اپنی زبان سے اعادہ کرتا ہے۔

اس طور سے اور انہیں اصول کے بنا پر جب ہم کسی غیر زبان کا مطالعہ کرتے ہیں تو مفرد الفاظ اور مکمل جملوں کو بار بار دہراتے اور انہیں کو لکھ کر مشق و مزاولت پیدا کرتے ہیں۔ مادری اور غیر مادری زبان کے استعمال میں جو فرق ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ مادری زبان کے سننے اور بولنے کے موقعے ہم لوگوں کو بہ نسبت غیر مادری زبان کے زیادہ ملتے ہیں۔ اکثر ایسا دیکھا گیا ہے کہ جو نوجوان کسی غیر ملک میں جا کر کسی خاندان میں قیام پذیر ہوتے ہیں تو وہ جلد تر وہاں کی زبان اور اس کے روزمرہ اور محاورں پر قدرت حاصل کر لیتے ہیں۔ اس تمہید کی غرض یہ ہے کہ ہم اس بیّن اصول کو پوری طرح ذہن نشین کر لیں کہ زبان اور ادب خواہ وہ کسی ملک کا ہو اکتسابی ہے نہ کہ وہبی۔ انفرادی استعداد، ذہانت اور طباعی کا اثر ادب کی تحصیل و تخلیق میں اکثر پایا جاتا ہے مگر ان فطری صلاحیتوں کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کوئی شخص محض ذکاوت اور طباعی کے بھروسے پر رہ کر بغیر محنت اور کسب کے زبان پر قدرت حاصل کر لے۔ خلاصہ یہ ہے کہ بغیر کد و کاوش اور بغیر محنت و جانفشانی کے کوئی علم یا ادب حاصل نہیں ہو سکتا۔

عرصۂ دراز تک اردو زبان کی تحصیل اور صحت کا دار و مدار اہلِ زبان ہونے پر غلط فہمی سے مانا جاتا تھا۔ جو لوگ دہلی یا لکھنؤ کے رہنے والے ہوتے انہیں کو یہ طغرائے کمال حاصل تھا کہ وہ صحیح زبان لکھنے اور بولنے کے اہل سمجھے جاتے۔ اس کمزور نظریہ کی سبب سے اردو زبان کی ترقی کو بہت بڑا نقصان پہونچا۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی معمولی ذہانت اور عقل و فہم کا انسان اگر کافی توجہ اور تندہی سے کسی ادب کا عموماً اور اردو کا خصوصاً بالاستیعاب مطالعہ کرے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ کچھ عرصہ میں اس پر قابلِ رشک قدرت نہ حاصل کر لے۔ ہمارے ادیبوں میں اکثر و بیشتر جن کو لکھنؤ یا دہلی کے شہری ہونے کا فخر نہیں حاصل تھا، باوجود اس امر کے وہ آسمانِ ادب کے درخشاں ستارے مانے جاتے ہیں اور ان کا نام رہتی دنیا تک قایم رہے گا۔ شبلی، حالی، نذیر احمد، عبد الماجد دریابادی

سید سلیمان ندوی، عبدالسلام، مہدی حسن، وہ اہلِ قلم ہیں جن کو براہِ راست دہلی یا لکھنو سے کوئی واسطہ نہ تھا پھر بھی ان کے علمی کارنامے ایسے وقیع اور ٹھوس ہیں جن کی اہمیت سے کوئی ادیب انکار نہیں کر سکتا۔

اب زمانہ آگیا ہے کہ ہم کو ایسے پیش پا افتادہ اور فرسودہ نظریوں سے انحراف کرنا ہوگا۔ دہلی اور لکھنو کی مرکزیت کے خیالات نے اردو کی لسانی ترقی کو بہت نقصان پہونچایا ہے۔ جو الفاظ یا محاورے قدیم دہلی یا لکھنو کے شعراء کے کلام میں نہیں ملتے تھے، ان کو ثقہ حضرات مستند نہیں مانتے تھے۔ بدقسمتی سے ان کو اس امر کا دھندلا سا بھی خیال نہیں ہے کہ زبان انسانی جذبات اور خیالات کے ساتھ ترقی کرتی ہے۔ جیسے جیسے ہماری ضروریاتِ زندگی بڑھتی جاتی ہیں اور نئی چیزوں کا انکشاف ہوتا جاتا ہے انہیں کے ساتھ ساتھ نئے نئے الفاظ اور ترکیبیں بھی معرضِ وجود میں لائی جاتی ہیں۔ یہ ایک ایسا اصول ہے جس کو ہمارے وہ شعراء اور ادبا جن کو قدامت پرستی پر اصرار ہے پیش نظر نہیں رکھتے۔ وہ اس امر کو فراموش کر جاتے ہیں کہ وہ الفاظ اور محاورے جو متقدمین شعراء کے زیرِ استعمال تھے ان میں سے اکثر و بیشتر اب متروک سمجھے جاتے ہیں اسی طرح سے جن محاوروں کو وہ ان دنوں اپنے استعمال میں لاتے ہیں ایک عرصے کے بعد وہ بھی پسِ پشت ڈال دئے جائیں گے۔ کسی زبان کا لغت دیکھو تو معلوم ہوگا کہ ہر دسویں سال اس کے الفاظ میں معتد بہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ یوروپین زبانوں میں ہمسایہ زبانوں کے الفاظ کثرت سے ایک دوسرے کی زبان میں داخل کر لئے جاتے ہیں۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے بعد انگریزی زبان کی جو لغات شائع ہوئی ہیں ان میں غیر زبانوں کے بہت سے نئے الفاظ درج ہیں جو اس امر کا ثبوت دیتے ہیں کہ جب قومیں ایک دوسرے سے ملتی ہیں تو ان کے الفاظ سے بھی کافی متاثر ہو کر بہت سے خارجی الفاظ کو اپنا بنا لیتی ہیں۔

ان اصولوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہم چند تجاویز طلبہ کی ہدایت کے لئے پیش کرتے ہیں تاکہ اس پر عمل پیرا ہو کر اردو ادب سے نہ صرف آشنا ہوں بلکہ اس پر کافی دست گاہ حاصل کر سکیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے ملکی ادب کو اسی اہمیت اور شغف کے ساتھ حاصل کریں جس طرح ہم انگریزی ادب کی تحصیل میں اب تک مصروف رہے ہیں۔ ہم کو چاہیے کہ ہم منتخب اور اعلیٰ پیمانے کے شاعروں، ادیبوں اور نثاروں کی کتابوں کو توجہ کے ساتھ مطالعہ کریں اور الفاظ اور محاورات کی تحقیق کریں اور یہ کام ہم اسی وقت انجام دے سکتے ہیں جب کہ ہم مستند لغات کو پیشِ نظر رکھیں گے۔ بار بار کے مطالعہ سے جملوں کی ساخت اور الفاظ کے استعمال ہمارے جزو دماغ ہو جائیں گے اور ہم لکھتے اور بولتے وقت بلا اختیار انہیں جملوں اور لفظوں کا اعادہ کریں گے۔ کسی بلند، غامض اور حکیمانہ خیالات کے اظہار کے لئے یہ ناگزیر ہے کہ ہم زبان کے مختلف الفاظ اور ان کے استعمال سے پوری طور پر واقف ہوں۔ ہمارے طلبہ اردو لغت کو بھولے سے بھی ہاتھ نہیں لگاتے ہیں اس لئے الفاظ کے مختلف معنی اور جو اوزان ہیں ان سے ناواقف رہتے ہیں۔ جہاں کہیں ان کو ایک تولہ وزن کے الفاظ استعمال کرنا چاہیے وہاں غلط فہمی اور نادانی کی وجہ سے ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جن کا وزن ایک سیر سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔

ادب کے باقاعدہ مطالعے کے لئے ضروری ہے کہ ہم چند ضمنی اور ضروری علوم سے بھی ایک گونہ واقفیت رکھیں مثلاً کوئی شخص اردو یا فارسی علم و ادب پر پوری قدرت حاصل نہیں کر سکتا اور نہ اس کے ادبی نکات کو سمجھ سکتا ہے اگر وہ مذہبی تلمیحات، اعتقادات اور روایات سے ناواقف ہے۔ ہمارے شعرا متقدمین ہوں یا متوسطین مذہبی جذبات اور روایات سے اس درجہ متاثر تھے کہ ان کا کلام جگہ جگہ پر مذہبی تلمیحات سے پُر ہے۔ محسن کاکوروی کے نعتیہ قصائد یا مومن، غالب اور ذوق کے قصائد اور غزلوں کو بغیر مذہبی معلومات سے واقفیت حاصل کئے ہوئے کوئی پوری طرح نہیں سمجھ سکتا۔ ید بیضا، کوہ طور، جنت عدن، جنت الماوا، تحت الثرا، رستخیز، شجر طوبیٰ، لن ترانی، گلزار ابراہیم، آتش نمرود وغیرہ وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جن کو مذہبی روایات سے بیگانہ شخص کبھی نہیں سمجھ سکتا۔ اسی طرح موٹے موٹے تاریخی واقعات سے بھی واقفیت ضروری ہے۔ شاعر یا مصنف جس زمانے میں پیدا ہوتا ہے وہ اس دور کے مذہبی، معاشری، سیاسی اور اخلاقی ماحول سے کافی طور پر متاثر ہوتا ہے لہذا اس زمانے کے اخلاقی، تاریخی واقعات سے بغیر واقف ہوئے کوئی طالب علم شاعر کے ادبی رجحانات اور اس زمانے کی تحریکوں سے واقف نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح شاعر کے مفصل سوانح حیات اور اس کے معاصرین کے خیالات اور حالات کا ایک حد تک جاننا بھی بہت ضروری ہے اس لئے کہ شاعر کبھی تو آپ بیتی اور کبھی جگ بیتی واقعات قلمبند کرتا ہے جس وقت شاعر اپنے زمانے کی بلندی یا پستی اخلاق کا ذکر کرتا ہے تو اس پر غور کرنا چاہیے کہ وہ کس تاریخی دور سے ہو کر گزرا ہے اس زمانے کے افراد یا جماعت کے اخلاق بلند یا پست تھے۔ میر حسن اپنی مثنوی کو شاہزادہ بدر منیر کی زبان سے ایک فرضی قصے کو نظم کرتے ہیں مگر حقیقت میں وہ لکھنؤ کے معاشری اور سیاسی حالات کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ مثنوی بدر منیر کے مطالعے سے لکھنؤ کی سوسائٹی کی پوری تصویر کھنچ جاتی ہے۔ اس لئے تاریخی واقعات سے ایک گونہ واقفیت بھی ادب کے مطالعے کے لئے ضروری ہے۔

اگر یہ کلیتہً صحیح ہے کہ ادب حیات انسانی کے مختلف شعبوں کی ترجمانی کرتا ہے تو ہم اس نتیجہ پر بلا تامل پہنچ سکتے ہیں کہ بغیر حیات انسانی کی گہرائیوں کو سمجھے ہوئے ہم کسی ادب پر حاوی نہیں ہو سکتے اور نہ اس کے رموز و نکات کو سمجھ سکتے ہیں۔ جو شخص انسانی جذبات کی پیچیدگیوں اور بوقلمونیوں سے ناواقف ہوگا یا ذہنی شعور کے مختلف پہلوؤں کو نہ جانتا ہوگا وہ رنج و غم، حسرت و یاس، وصل و فراق، کامیابی اور ناکامیابی، نقصان اور فائدہ، بغض و کینہ، ہمدردی اور سنگ دلی، رقابت اور دوستی کی نفسی کارفرمائیوں سے بے بہرہ رہے گا اور جب کہ شاعر اپنے واردات قلب کو الفاظ کا جامہ پہنا کر صفحۂ قرطاس پر مزین کرے گا تو وہ شخص جو نفسیات انسانی کی مبادیات سے بھی ناآشنا ہو کما حقہ شاعر کے حقیقی مافی الضمیر کو نہیں سمجھ سکتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے جو شخص عادت کے فلسفہ کو نہ جانتا ہو اور اس کی زبردست طاقت سے ناواقف ہو وہ غالب کے اس مشہور شعر کے اصلی مفہوم کو نہیں سمجھ سکتا ؎

صد بار دام عشق سے آزاد ہم ہوئے
پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

یا نواب شیش محل کا یہ شعر ؎

کہتا ہے کون یار کی محفل اُداس ہے
کوئی نہیں اُداس مرا دل اُداس ہے

اِس شعر کا لطف وہی اٹھا سکتا ہے جس کو یہ معلوم ہو کہ ہماری دنیا ہمارے جذبات اور خیالات کا عکس ہوا کرتی ہے جس کی طبیعت مضمحل یا شپر مردہ نہ ہوئی ہو وہ اس شعر سے بھلا کیا لطف اندوز ہو سکتا ہے۔

میری آخری تجویز یہ ہے کہ ادب اردو کا مطالعہ بے لاگ سچائی اور ذہنی ایمان داری کے ساتھ کرنا چاہیے۔ عام طور سے یہ دیکھا گیا ہے کہ ہمارے ادیب اور ناقد جب کسی سے خوش ظن ہوتے ہیں تو اس کے کلام کے ہر پہلو کی تعریف کرتے ہیں خواہ بلند پایہ کلام نہ ہو اسی طرح سے اگر وہ کسی سے بدظن یا ناخوش ہوتے ہیں تو اس کا کلام خواہ کتنا ہی پُر معنی اور پُر مغز کیوں نہ ہو پڑھنا بھی گوارا نہیں کرتے یہ روّیہ اصولِ تنقید کے منافی ہے۔ کلام کو پرکھتے وقت اس کے حسن و قبح پر یکساں نظر ڈالنی چاہیے۔ قطع نظر اس کے کہ ہم شاعر سے خوش ظن ہیں یا بدظن۔ ذاتی مناقشات اور اختلاف رائے کو پس پشت ڈال کر اور اپنے رذیل جذبات پر قدرت حاصل کر کے ہم کو ادب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ تنقید کا بے لاگ اصول یہ ہے کہ جس کلام میں جتنے محاسن ہیں ان کو سراہیں اور ان کی ادبی خوبیوں اور باریکیوں کو منظرِ عام پر لاویں اور جتنے معائب ہوں ان کو بلا کم و کاست اور بغیر کسی تحقیر و تذلیل کے مہذب طریقے سے جتا دیں۔ اردو ادب کو سب سے زیادہ نقصان ہمارے ذاتی مناقشات اور غیر ضروری اختلافات پر ضرورت سے زیادہ زور دینے سے پہونچا ہے۔ جب تک ہم ایک دوسرے کے کلام کی منصفانہ قدر نہ کریں گے اور ذہنی ایمان داری کو اپنا اصولِ زندگی نہ بنائیں گے ہماری زبان اور ادب کو ترقی نہیں ہو سکتی اور نہ بغیر باہمی ہمت افزائی اور قدر دانی کے ہونہار اہلِ قلم اپنی محنت اور جاں کاہی کے ثمرہ سے ہم کو فیض یاب کر سکتے ہیں۔

م حفیظ سیّد

میر حسن ایم اے

عکس خط شاد عظیم آبادی

محترمہ صغریٰ بیگم ہمایوں مرزا

صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش

دکنی بولی

(یہ مضمون کلاسکی نشرگاہ حیدرآباد سے نشر کیا گیا تھا)

دکنی بولی آج اردو زبان کی ایک شاخ ہو کر رہ گئی ہے۔ لیکن اپنے آغازی دور میں اور اس کے بعد بھی کئی سو سال تک اس کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ یہی وہ زبان ہے جو گولکنڈہ، بیجاپور اور دکن کی دوسری سلطنتوں میں ایک عرصے تک تعلیم یافتوں کی معیاری تحریری اور بول چال کی زبان کی حیثیت سے راج کرتی رہی ہے۔

دکنی زبان کی اہمیت اور اس کے نشوونما کے خاص حالات پر غور کرنے کے لیے اردو زبان کی تاریخ میں سیکڑوں سال پیچھے کی طرف جانا پڑتا ہے۔ اردو زبان جیسا کہ سب جانتے ہیں، فارسی بولنے والے مسلمانوں اور کھڑی بولی بولنے والے ہندوؤں کے پنجاب میں میل جول کا نتیجہ ہے۔ یہی وہ صوبہ ہے جہاں سلطان محمود غزنوی کی حکومت بڑے عرصے تک قائم رہی اس کے بعد محمد غوری کا دور شروع ہوا۔ اس دور میں بھی اردو کے خدوخال موہوم ہی رہے اور اس میں انفرادیت یا شخصیت کا کوئی رنگ پیدا نہ ہو سکا۔

خلجیوں کے دور میں اردو جس نے پنجاب میں جنم لیا تھا، علاء الدین خلجی کے ساتھ دکن پہنچی۔ یہاں اس کی پرورش شمال سے بالکل مختلف اور دکنی طبائع کے میلانات کے مطابق جداگانہ قسم کے ماحول اور اثرات کے تحت ہوئی۔ دکن کی یہ اردو دکنی کہلانے لگی۔

دکنی زبان نے بیجاپور اور گولکنڈہ کی سلطنتوں کے عروج کے زمانے میں بڑی ترقی کی۔ اس میں سو ڈیڑھ سو سال تک ادبی کتابیں لکھی جاتی رہیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ شمال میں اردو صرف بول چال کی زبان تھی، علم و ادب شعر و شاعری یہاں تک کہ خط و کتابت کی زبان بھی ایرانی تھی۔ شمال میں اردو سے بے توجہی اور ایرانی کے فروغ کی کئی وجوہات ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہاں صدیوں تک ایرانی علماء اور شعراء کی آمد کا تانتا بندھا رہا۔ اور سرکاری زبان بھی ایرانی ہی تھی جسے ہندوؤں کے لئے بھی ملازمت کے لئے ضروری قرار دے کر راجہ ٹوڈرمل نے ترقی کی رفتار اور تیز کر دی۔

برخلاف اس کے دکن کے حالات شمال سے مختلف رہے۔ ہندوستان کے اس حصے پر زیادہ تر یورشیں شمال ہی کی طرف سے ہو سکتی تھیں۔ لیکن اس زمانے میں بندھیاچل کو عبور کر کے دکن پہنچنا بڑی زحمت کا باعث ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دکن کی سلطنتوں میں سالہا سال تک امن رہا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں میل جول کے زیادہ سے زیادہ مواقع پیدا ہوئے اور ایک مخلوط دکنی تمدن کی بنیادیں قائم ہوئیں۔

اردو زبان اور ادب کے دکن میں فروغ پانے کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ بیجاپور اور گولکنڈہ کی سلطنتوں کی عدالتی اور سرکاری زبان دکنی تھی۔ اس کے علاوہ بیجاپور اور گولکنڈہ کے بیشتر بادشاہ نہ صرف خود عالم اور اہلِ قلم تھے بلکہ علم و ادب کی سرپرستی بھی بڑی فیاضی سے کرتے تھے۔

ان ساز گار حالات اور شاہی سرپرستیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ بڑے بڑے عالموں نے دکنی زبان کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ ابتدا ایرانی ادب کے زیر اثر شعر و شاعری سے ہوئی اور تقریباً تمام مروجہ اصنافِ شعر مثلاً قصیدہ، مثنوی، رباعی، مراثی اور غزل میں درباری شعراء نے خوب زور دکھلایا۔

اس عہد کے مشہور شاعروں میں غواصی، ابن نشاطی، ملا قطبی، جنیدی، سعدی، نوری، شاہی، مرزا، طالب، مومن وغیرہ قابل ذکر ہیں جن میں سے بعض کے کلام کے نمونے "اردو شہ پارے" میں شایع ہو چکے ہیں۔

مرثیہ گوئی کو اس عہد میں بہت فروغ ہوا۔ کیونکہ شعرا مرثیہ گوئی کو دین اور دنیا دونوں کی بہتری کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ مرثیے سنا کر ایک طرف درباروں میں انعام پاتے تھے اور دوسری طرف انھیں ثواب اور نجات کی بھی امید تھی۔

بیجاپور کے عادل شاہی دربار کے شاعروں میں نصرتی، ہاشم، مرزا، امین، شاہ ملک اور مومن قابل ذکر ہیں۔ دکنی اردو کی نثری تصانیف میں سب سے زیادہ اہمیت ملا وجہی کی "سب رس" کو حاصل ہے۔ جو ۱۰۴۵ھ میں یعنی آج سے تقریباً تین سو سال پہلے لکھی گئی۔ یہ اردو زبان کی سب سے پہلی نثری تصنیف سمجھی جاتی ہے اور انجمن ترقی اردو ہند کی طرف سے چھپ کر شایع ہو چکی ہے۔

ملا وجہی سلطان عبداللہ قطب شاہ والی گولکنڈہ کا درباری شاعر تھا۔ سب رس اسی بادشاہ کے حکم سے شایع ہوئی۔ قدیم دکنی اردو نثر کے بعض نمونے اس سے پہلے کے بھی ملفوظات اور مذہبی رسائل کی شکل میں ملتے ہیں۔ لیکن "سب رس" ایک مکمل اور جامع تصنیف ہے۔ اس سے پہلے کی کسی کتاب میں ایسی خوبیاں پائی نہیں جاتیں، جو گولکنڈہ کے اس مصنف کی تحریر میں نظر آتی ہیں۔ سب رس کا موضوع حسن و دل کا قصہ ہے جو تمثیلی پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے اس کی عبارت میں ادبی شان پائی جاتی ہے۔ نثر مقفیٰ ہے اس کے باوجود زبان سادہ سلیس اور شگفتہ ہے۔ وجہی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے اپنی کتاب میں بعض مقامات پر دکنی زبانوں مثلاً تلنگی اور مرہٹی کے الفاظ اور محاورے بھی استعمال کیے ہیں۔

دکنی ادب کے [illegible] مشہور شاعروں اور نثر لکھنے والوں کا ذکر ہوا تقریباً ان سب کی شہرت بیسویں صدی کے اوائل تک مقامی رہی دکن کا پہلا شاعر جس کا کلام نہ صرف سارے دکن میں مقبول ہوا بلکہ جس نے بندھیاچل کو عبور کر کے شمالی ہندوستان کو بھی مسخر کر لیا ولی تھا۔ ولی اورنگ آبادی کا کلام جب شمال پہنچا تو اہل کمال نے اس کی دل سے قدر کی یہ ولی ہی کا اثر تھا کہ شمال میں حاتم، آبرو، آرزو اور دوسرے اساتذہ نے پہلی دفعہ اردو میں شعر کہنا شروع کیا جس کا ثبوت خود ان کے کلام سے ملتا ہے۔ ولی کے اثرات سے دکنی الفاظ اور محاورے شمالی ہند کے متقدمین کے کلام میں کثرت سے داخل ہوئے اور اپنی دل آویزی اور انوکھے پن کی وجہ سے ادب میں ایسے رچ گئے کہ متوسطین کے کلام میں بھی اس کی چاشنی پائی جاتی ہے۔

شمال میں اردو نویسی کو مزید تقویت یوں بھی ہوئی جب شہنشاہ اورنگ زیب کے ساتھ گولکنڈہ کے شاہی کتب خانہ کی نادر دکنی کتابیں دلی پہنچیں۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے ادبی ذوق رکھنے والوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ اور اردو شعر و نثر کا دور شمال میں بھی شروع ہوگیا۔

سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد ہندوستان نے کچھ ایسی کروٹ بدلی کہ شمال اور جنوب کے درمیان کی رکاوٹیں روز بروز دور ہوتی گئیں۔ آمد و رفت اور رسل و رسائل کی آسانیوں نے دور افتادہ مقامات کو بھی گویا ایک دوسرے سے قریب کردیا۔ جس کی وجہ سے ہندوستان کے سارے حصوں کی انفرادیت اور مقامی خصوصیات پر کل ہند اثرات حاوی ہونے لگے۔ بہت جلد وہ زمانہ آگیا جب کہ دکنی ادبی زبان کے لئے ناموزوں ہوگئی اور ناموزوں سمجھی جانے لگی۔ اس کے برخلاف شمالی ہند اور خاص طور پر دلی اور لکھنؤ کی زبان نے معیاری زبان ہونے کا امتیاز حاصل کرلیا۔ اس انقلاب کی وجہ صاف ہے جو یہ ہے کہ جس حصہ ملک کے اہل قلم تصنیف و تالیف میں پیش پیش رہتے ہیں وہیں کی زبان معیاری اور قابل تقلید بن جاتی ہے۔

دکن میں جس وقت تک علم و ادب کا زور رہا دکنی معیاری زبان بنی رہی کو اس کا دائرہ مختلف وجوہات کی بنا پر بہت بڑی حد تک محدود ہی رہا۔ اور جب شمال میں ایک سے ایک بڑے اور باعظمت شاعر اور نثر نگار پیدا ہونے لگے جنھوں نے اپنی تحریروں سے اردو کو غیر فانی بنا دیا تو انہیں کی زبان لازمی طور پر ادبی زبان کے رتبہ پر پہونچ گئی۔

معیاری اردو نے شمالی ہند میں جنم لیا لیکن آج وہ تمام جغرافی پابندیوں سے آزاد ہوکر سارے ہندوستان کے تعلیم یافتوں اور انشا پردازوں اور شاعروں کی زبان ہے۔ دکنی اپنی خاص دل کشیوں کے باوجود ایک مقامی بولی ہوکر رہ گئی ہے اس کے بولنے والوں میں دکن کے دیہات کے رہنے والے اور شہروں اور اضلاع کے ان پڑھ باشندے ہیں۔ تعلیم یافتوں کے اثر سے شہر کے عوام کی زبان تو آدھا تیتر آدھا بٹیر کی مصداق ہے لیکن بعض اضلاع والوں کی زبان باہر کے اثرات سے اس وقت تک اس قدر محفوظ ہے کہ ان سے باتیں کرنے میں "سب رس" پڑھنے کا لطف آجاتا ہے۔

بازاری دکنی بڑی پر لطف بولی ہے جو دکن اور خاص طور پر ... حیدرآباد کے ہری علاقوں میں بے تکلف رائج ہے۔

میر حسن

اردو شہ پارے (بالتصویر)۔ اردو کے آغاز سے ولی اورنگ آبادی تک کے اردو ادب (نثر و نظم) کے متعلق جدید ترین تحقیقات اور ادبی کارناموں کے اعلیٰ پایہ اور دلچسپ تفصیلی نمونے جو یورپ اور ہندوستان کے متعدد کتب خانوں کے کم یاب قلمی نسخوں سے منتخب کئے گئے ہیں۔ قدیم الفاظ کی فرہنگیں اور محققین و طلبہ کے لئے مفید تبصرے شامل ہیں۔ قدیم شعرا اور قدر دانان سخن کی بیش بہا قلمی تصاویر کے عکس بھی شریک ہیں۔

مجلد بڑی تقطیع ۴۰۰ صفحات قیمت (عہ ۱۲)

فاتحۂ سالانہ

آج مصروف نظر آئے نہ کیوں ریحانہ — کیسے دم ساز کا ہے فاتحۂ سالانہ
عورتیں آئی ہیں کثرت سے ملنے والی — اس بڑے گھر میں جگہ رہ گئی ہے کم خالی
یہ جو پھیلا ہوا سامان ہے بریانی کا — فرض کرتی ہے ادا اُس کی نگہبانی کا
اک یہی فرض نہیں، اس کے فرائض ہیں کئی — آگئی کوئی عزیزہ تو یہ ملنے کو گئی
عورتیں خاص عزیزوں میں کم ایسی ہوں گی — جو کسی خاص سبب ہی سے نہ آئی ہوں گی
کام بھی کرتی ہے باتیں بھی کئے جاتی ہے — داد سنجیدہ خیالی کی لئے جاتی ہے

۲

حیرت انگیز ہے اس کا "عمل آرا" عالم — زعفراں حل کبھی کرتی ہے کھرل میں مبہم
گوشت بنواتی ہے بیٹی کی مدد سے گاہے — جو ہو خود دار وہ اوروں سے مدد کیوں چاہے
دیگ کے نیچے کبھی آگ یہ بھڑکاتی ہے — چہرہ تپتا ہے تو دم بھر کو سرک جاتی ہے
کبھی یخنی کے مصالح کی یہ لیتی ہے خبر — غرض، آتی ہے نظر گاہ اِدھر گاہ اُدھر
جب کسی کام میں دیتی ہے بہو اس کا ساتھ — کام کرتی ہوئی کر لیتی ہے کچھ کام کی بات
یاں بہو، منتظرِ حکم ہے باہر بیٹا — دل کسی کام میں اس کا نہیں ہوتا بیٹا

۳

عمر چالیس کے لگ بھگ ہے مگر اس پر بھی — نظر آتی ہے یہ فی الحال جواں ہمت ہی
چلن اس عمر [illegible] بی بی کا شریفانہ ہے — سبق آموزِ جہاں عصمتِ ریحانہ ہے
زخمِ دل ہے اسے ہجرِ دوامِ شوہر — آہ کس طرح بھلا دیتی یہ نامِ شوہر
کون یاد آئے گا پھر گر نہ اُسے یاد کیا — جس نے اکیس برس ہر جہتی ساتھ دیا
بست و یک سالہ رفاقت کا اثر کیا کہنا — اس کو آسان ہے اب اُس کی ہی دھن میں رہنا
پختہ کارانہ تصور یہ ہیں اس کے سب ڈھنگ — ایک تصویر میں برسوں سے بھری جاتی ہے رنگ

یہ مناتی ہے جس انداز سے یومِ شوہر
اس کے ہر سال ہوا کرتے ہیں چرچے گھر گھر

علی منظور

سر سید احمد خاں

نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی

مرزا فرحت اللہ بیگ

مرزا اسد اللہ خاں غالب

حیدرآباد تا دلّی

ایک انگریزی مثل ہے کہ "بعض واقعات قصہ کہانیوں سے بڑھ جاتے ہیں" حیدرآباد سے چلتے وقت مجھے شان گمان بھی نہ تھا کہ ایسا کوئی واقعہ خود مجھے پیش آنے والا ہے۔

چھتیس ۳۶ گھنٹے کے لگاتار سفر سے وحشت تو ضرور تھی مگر یہ کیا خبر تھی کہ راستے میں یہ وحشت دہشت کا رنگ اختیار کر لے گی۔ ۲۷ نومبر کو گھر سے چلا اسٹیشن پر یار دوست چھوڑنے آئے۔ گھنٹی بجی گارڈ نے سیٹی دی۔ انجن نے چیخ ماری۔ پہیوں نے گردش کی۔ گاڑی چلی اور ہم حیدرآبادی سے دلّی والے بننے شروع ہو گئے۔ بعض دوستوں نے دور ہی سے سلام علیک کھینچ ماری۔

بعض ریل کے ساتھ ساتھ چلتے اور ہاتھ ملاتے رہے۔ مگر کہاں تک ذرا سی دیر میں "ایک میں تھا ایک خدا کی ذات تھی" معلوم نہیں مسافروں کو مجھ سے کیا دشمنی تھی کہ ایک بھلا آدمی بھی میرے درجے میں نہیں آیا۔ اور حیدرآباد سے لگا کر دہلی تک میں رہا اور چار قدم لمبا اور تین قدم چوڑا درجہ بعض مسافر ایسے بھی ہوتے ہیں جو خالی درجہ پا کر خوش ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان کو اگر وہ واقعہ پیش آئے جو مجھے پیش آیا ہے تو یقین مانیے کہ وہ خالی درجے میں بیٹھنے سے اتنا ہی ڈریں جتنا یو، پی کے زمیندار آج کل نئے قانونِ اراضی سے ڈر رہے ہیں۔

ہاں صاحب تو، خیر، گاڑی چلی ہم کھڑکی میں سے جھانکتے اور دیکھتے رہے کہ فلاں صاحب کا گھر سامنے سے گزر گیا، فلاں صاحب کا بنگلہ نکل گیا۔ خیرت آباد کا اسٹیشن آیا، حسین ساگر جنکشن آیا اور گھس گھس گھس گھس کر کے ریل سکندرآباد پہونچ ہی گئی۔ کہنے کو تو یہ گاڑی گرانڈ ٹرنک اکسپرس کی دُم ہے، مگر شاید ہی کوئی اسٹیشن ہوگا جہاں یہ سستا نہ لیتی ہو۔ شوال کی پانچویں تھی تھوڑی سی دیر میں چاندنی غائب ہو گئی۔ اس لئے ناچار کچھوے کی طرح گردن کھڑکی سے اندر کر لی جھلملیاں چڑھا دیں۔ بستر پر سے کوئلے کے ریزوں کو جھٹکا اور چادر اوڑھ سونے کی تیاری کی۔ مگر جو شخص رات کے گیارہ بارہ بجے سوتا ہو اس کو بھلا نو بجے نیند کیوں آنے لگی تھوڑی دیر لوٹتے پوٹتے خیال آیا کہ اوہو ابھی تک نماز تو پڑھی ہی نہیں لاؤ وہ بھی پڑھ لیں۔ غسل خانے میں جا کر وضو کیا اور نماز کو کھڑے ہو گئے مگر ریل کے جھٹکوں کی وجہ سے بیٹھ جانا پڑا۔ خیر نماز تو ہو گئی مگر کیسی ہوئی یہ اللہ بہتر جانتا ہے۔ کتاب اٹھائی کہ شاید پڑھنے ہی میں کچھ وقت کٹ جائے مگر سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ اس میں لکھا کیا ہے۔ اس وقت خیال آیا کہ یار اگر اس وقت افیون ساتھ ہوتی تو مزا آ جاتا۔ میں اوپر کے درجے میں سفر کرنے والوں کو صلاح دیتا ہوں کہ وہ سفر میں اپنے ساتھ افیون کی دو چار گولیاں رکھ لیا کریں تاکہ اگر سفر دور کا ہو اور درجہ خالی ملے تو یہ گولیاں "داشتہ آید بکار" بن سکیں۔

جعفر زٹلی فرماتے ہیں "گندم اگر بہم نہ رسد بھس غنیمت است" سوچے کہ لاؤ افیون نہ سہی سگریٹ ہی سے اس کمی کو پورا کریں۔ ڈبہ پاس تھا کھولا اور سگریٹ پر سگریٹ دھنکنے شروع کئے۔ لیکن اس کے دھوئیں نے دماغ میں وہ خشکی پیدا کی کہ رہی سہی نیند اور بھی اڑ گئی۔ دس بجے قاضی پیٹھ پہونچے۔ وہاں ہماری گاڑی گرانڈ ٹرنک اکسپرس میں جڑنے والی تھی اور اس گاڑی کے آنے میں دیر تھی اس لئے پلیٹ فارم پر ٹہلنا شروع کیا مگر یہ چہل قدمی

چالیس قدم کے اندر ہی رہی۔ کیونکہ جانتے تھے کہ ذرا ادھر ادھر ہوئے اور مال دوستوں کا ہوگیا۔ خدا خدا کر کے مدراس کی گاڑی آئی اور ہم مشرق کی بجائے شمال کی طرف چلنے شروع ہوئے۔ یہاں جس حصۂ ملک میں سے ریل گزرتی ہے اس میں انسانوں سے زیادہ جانور آباد ہیں اور چونکہ وہ مسافروں کو آثار نے چڑھانے بہت کام آتے ہیں اس لئے یہ اسٹیشن اکثر سنسان کف دشت میدان بنے رہتے ہیں ہاں اگر کبھی کوئی شیر یا چیتا ادھر آنکلتا ہے تو ذرا چہل پہل ہو جاتی ہے۔ بہرحال ریل چلتی رہی اور ہم بنچ پر لوٹ مارتے رہے۔ اسٹیشن آتا تو کھڑکی کھول کر ذرا جھانک لیتے اور اگر کوئی اللہ کا بندہ نظر آجاتا تو اسی سے پوچھ بھی لیتے کہ "بھئی یہ کونسا اسٹیشن ہے" مگر وہ ذاتِ شریف کچھ ایسے لہجے میں جواب دیتے کہ اس کا سمجھنا ہماری عقل سے باہر ہوتا۔ خدا خدا کر کے رات کے چار بجے بلہار شاہ اسٹیشن آیا اور اس وقت ذرا طبیعت بحال ہوئی کہ چلو اب صبح قریب ہے اور کچھ نہیں تو کم سے کم آدمیوں کی شکلیں تو دکھائی دیں گی۔ کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد پو پھٹی، شفق کے کنارے سرخ ہوئے اور پھٹ سے صبح ہوگئی۔ اس روز صبح ہونے کی جس قدر خوشی مجھے ہوئی ہے وہ بیان نہیں ہوسکتی رات کی ساری کلفت دور ہوگئی۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ شاعر شبِ فراق اور عالمِ تنہائی کا رونا اس قدر روتے ہیں مگر جب دیکھو تب تازہ مونچھوں پر تاؤ دیتے نظر آتے ہیں۔ ریل میں اس رات کے گزارنے کے بعد یہ مسئلہ بآسانی حل ہوگیا اور پتہ چلا کہ واقعی شبِ فراق ان بیچاروں پر سخت گزرتی ہے مگر صبح کی آمد پھر ان کو جیسے کا ویسا کر دیتی ہے۔

کوئی آٹھ ساڑھے آٹھ بجے واردھے کا اسٹیشن آیا۔ آج کل اس اسٹیشن نے ریل کی آمدنی بہت بڑھا دی ہے۔ ذرا کہیں کچھ گڑبڑ ہوئی اور چل مرے یار واردھے کو۔ یہاں ہم نے وہ گنگنا بادامی رنگ کا پانی پیا جس کو عرفِ عام میں چائے کہا جاتا ہے کوئی بیس برس کی بات ہے کہ ہمارے محلہ میں ایک شخص کافی بیچنے آتا اور بڑے سخت لہجے میں آواز لگایا کرتا تھا کہ "کافی ایٹ گرم" چنانچہ اس کا نام ہی "کافی ایٹ" پڑ گیا تھا۔ خوب بکری ہوتی تھی مگر خدا معلوم کیا بات ہوئی کہ اس نے یہ چلتا ہوا دھندا چھوڑ ہمارے ہاں نوکری کرلی۔ ایک دن سب نے اس سے فرمایش کی کہ کافی بناو۔ اس نے پانی دیگچی میں چڑھا، خدا معلوم کیا کیا الابلا ڈال کافی بنا ہمارے سامنے لا رکھی۔ آپ یقین مانیے کہ اس کافی کے تھے تو دس بارہ اجزا مگر اس میں بُن نام کو نہ تھے۔ اسی نمونے کی وہ چائے ہوتی ہے جو اسٹیشنوں پر ملتی ہے اور زہر مار کی جاتی ہے۔

میں پالیٹکس سے ہمیشہ دور رہتا ہوں مگر خبر نہیں کہ یہ واردھے کی چائے کا زور تھا یا وہاں کی آب و ہوا کا اثر کہ ایک دفعہ ہی میرے خیالات پولیٹیکل ہوگئے اور ان خیالات کا وہ زور بندھا کہ بڑی مشکل سے یہ نمد ساڑھے نو بجے ناگپور کے سنتروں کی ترشی سے اترا۔ میں ہر اس مسافر کو جو ناگپور پر سے گزرتا ہے آگاہ کئے دیتا ہوں کہ اسٹیشن پر سنتروں کی جو ٹوکریاں بکنے آتی ہیں ان کو ذرا دیکھ بھال کر لیا کریں ورنہ بھئی وہ جانیں اور ان کا کام جانے۔ انگریزی کی ایک مثال ہے کہ "ہر وہ چیز جو چمکتی ہے سونا نہیں ہوتی" اسی طرح سمجھ لیکہ "ہر وہ چیز جو ان ٹوکریوں میں ہوتی ہے سنترہ نہیں ہوتی" ہم لیے بھی

ایک ٹوکری خریدی۔ پہلے بارہ آنے مانگے گئے آخر جب ریل چلنے لگی تو دو آنے پر تصفیہ ہوا۔ چلتی گاڑی سے ہم نے دوانی باہر پھینکی اور اس نے سنتروں کی ٹوکری اندر لڑھکا دی ٹوکری میں سے جو سنترے نکلے ہیں وہ بس دیکھنے کے قابل تھے۔ کھانے کے کام کے تو تھے نہیں۔ ہاں خاصہ بھلا چنگا آچار تھا۔ اوپر کی تہ ذرا اچھی تھی، سوچے کہ چلو دو آنے میں چھ سنترے ہی کیا بڑے رہے۔ ایک کو چھیلا پھانک کو صاف کیا، بیج نکال کر پھینکے پھانک منہ میں رکھی اس کے بعد کچھ نہ پوچھو کہ کیا ہوا۔ بس یہ سمجھ لو کہ کھٹاس افعل التفضیل کے صیغہ کے ساتھ منہ میں داخل ہو گئی۔ گھبراہٹ میں بغیر سوچے سمجھے کلی کی نتیجہ یہ ہوا کہ دانت بیکار ہو گئے ذوق مرحوم فرماتے ہیں ؎

دشنام ہو کے ترش وہ مجھ کو ہزار دے
یاں وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے

اگر جاڑے میں استاد مرحوم ناگپور کے سنترے کھاتے تو ہرگز یہ شعر نہ لکھتے۔ ذرا میں بھی تو دیکھوں کہ وہ کونسے عاشق ہیں جو جاڑے میں ناگپور کے سنترے کھائیں اور اس ترشی سے ان کا نشۂ عشق ہرن نہ ہو جائے۔

ناگپور سے آگے جو اسٹیشن پڑتے ہیں ان کو معناً اہل نو اسٹیشن کہا جا سکتا ہے کہ وہاں گاڑی ٹھیرتی ہے ورنہ بغیر دوربین کے ان کو دیکھنا کچھ آسان کام نہیں ہے۔ ہاں سنترے ہر جگہ ملتے ہیں اور خدا کے فضل سے کھائے بھی جاتے ہیں بھلا ناگپور کے سنتروں کا مزہ چکھنے کے بعد میری کیا ہمت ہو سکتی تھی کہ ان کے خریدنے کا خیال بھی دل میں لا سکتا۔ اس لئے دور ہی سے ان کا نظارہ کرتا اور کھانے والوں کے کام و دہن کی تعریف کرتا رہا۔ وقت کسی طرح کاٹے نہ کٹتا تھا اس لئے ناول نکالا

ایک آدھ صفحہ پڑھا تھا کہ پان کا خیال آیا یہ کچھ عجیب بات ہے کہ جب تک پان منہ میں نہ ہو میں نہ کچھ لکھ سکتا ہوں اور نہ پڑھ سکتا ہوں۔ دانتوں کی حالت مجھے معلوم تھی لیکن مرتا کیا نہ کرتا ڈبیا میں سے پان نکالا، ڈرتے ڈرتے منہ میں رکھا، پان منہ میں رکھنا تھا کہ دانت "کر کر" کرنے لگے آخر پوپلوں کی طرح منہ چلایا۔ تھوڑی دیر میں ترشی کا اثر ذرا دور ہوا اور پڑھنے میں دل لگنے لگا کوئی بارہ ساڑھے بارہ بجے ہوں گے کہ پیٹ نے فریاد بلند کی کہ "بیار بدہ ہر چہ داری بدہ" کھانے کی گاڑی ریل میں لگی ہوئی تھی دوسرے ہی اسٹیشن پر کھانا منگوایا۔ یہ تو خدا ہی کو خبر ہے کہ اس میں کیسی کیا کیا چیزیں۔ مگر بھوک کا وہ زور تھا کہ "زر خوردن" کی گردان کرتے کرتے ساری رکابیاں صاف کر دیں۔ اس کے بعد اطمینان ہوا۔ پان کھایا، سگریٹ سلگایا اور ناول پڑھنا شروع کیا۔ پانچ بجے اٹارسی پہونچے۔ یہاں خوب ڈٹ کر چائے پی۔ ہوشنگ آباد پہونچتے پہونچتے شام ہوگئی۔ سات بجے بھوپال آیا یہاں میرے ایک عزیز اپنی عنایت سے بہت مرغن کھانا لائے کھانا اپنی رکابیوں میں الٹ ان کی پلیٹیں ان کے حوالے کیں۔ بھوپال سے نکلنے کے بعد خیال آیا کہ کھانا کھا کر اب لوٹ مارو۔ چوبیس پچیس گھنٹے کے جاگے ہوئے ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بیمار پڑ جاؤ۔ کھانا کھایا عشاء کی نماز پڑھی۔ کھڑکیاں چڑھائیں۔ دروازوں کے کھٹکے لگائے روشنی گل کی کمبل تانا اور اپنے آپ کو نیند میں ڈالا۔ نیند تو راہ دیکھ ہی رہی تھی جھٹ آنکھ لگ گئی۔

خدا معلوم وہ کونسی جگہ تھی کیا وقت تھا کہ ایک دروازہ کی کھڑکی پٹ سے گری اور اس آواز کے ساتھ ہی میری

آنکھ کھل گئی کیا دیکھتا ہوں کہ کھڑکی میں سے کالے دستانے پہنا ہوا ایک ہاتھ نکلا۔ ساتھ ہی آہستہ آہستہ دروازہ کھلا اور ایک صاحب سیاہ اوورکوٹ ڈانٹے نقاب منہ پر ڈالے ایک پستول ہاتھ میں لئے اندر تشریف لائے اندر آکر انھوں نے بجلی تو نہیں کھولی ہاں ان کے دوسرے ہاتھ میں جو چھوٹی سی بیاٹری تھی اس کو روشن کیا۔ مگر روشنی کا رُخ نیچے کی طرف رکھا اور نہایت متانت سے کہا کہ "اٹھئیے" میں اُٹھ بیٹھا کہنے لگے" لاؤ تمھارے پاس کیا ہے" میں نے کہا" تین روپے چھ آنے نو پائی اور دلّی کا ٹکٹ" کہنے لگے۔ "مذاق کرتے ہو" میں نے کہا" جناب والا ایسی حالت میں کیا کوئی بھلا آدمی مذاق کرسکتا ہے" مگر نہ معلوم یہ کیا بات تھی کہ باوجود ایسا نازک موقعہ ہونے کے ان حضرت کا اثر مجھ پر کچھ زیادہ نہیں ہوا۔ یہ ضرور ہے کہ پستول ایک خطرناک چیز ہے مگر جب یہ یقین ہوجائے کہ یہ کسی پلپلے آدمی کے ہاتھ میں ہے تو پھر اس کا ڈر ورکچھ نہیں رہتا۔ میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ انھوں نے پھر ذرا اونچی آواز میں کہا "نکالتے ہو یا نہیں" میں نے کہا" بہت اچھا نکالتا ہوں" یہ کہہ کر میں ذرا جھکا بنچ کے نیچے میرا کالا پمپ شوز پڑا تھا وہ میں نے اٹھایا اور ایک دفعہ ہی زور سے کہا کہ "ہیں' یہ دروازہ میں کون ہے" میری اس آواز پر انھوں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ میں نے پمپ شوز کے پچھلے حصے کو مٹھی میں دبا اور اس کی نوک سامنے کرکے کہا" رکھ دو پستول نہیں تو گولی مار دوں گا" اب جو وہ میری طرف مڑ کر دیکھتے ہیں تو ایک زبردست پستول ان کے سینے کی طرف ہے۔ بیاٹری کی روشنی نیچے پڑ رہی تھی اس لئے وہ میرے پستول کی ماہیت کو نہ سمجھ سکے آہستہ سے اپنا پستول میرے سامنے والے بنچ پر ڈال دیا بیاٹری نیچے پھینک دی اور دونوں ہاتھ اونچے کرکے کھڑے ہوگئے میں نے بنچ پر سے ان کا پستول اٹھایا اُٹھ کر بجلی کا بٹن دبایا۔ اس وقت ان کو معلوم ہوا کہ ان کے پستول سے زیادہ میرا جوتا بکار آمد ثابت ہوا۔ میں نے بہت ڈانٹ کر کہا "سامنے بنچ پر بیٹھ جاؤ" وہ حضرت یا تو اس زوروں سے آئے تھے یا تھرتھر کانپنے لگے اور بنچ پر بیٹھ گئے۔ میں نے اٹھ کر چاہا کہ خطرے کی زنجیر کھینچوں کہ انھوں نے رونا شروع کیا اور کہا کہ" خدا کے لئے زنجیر نہ کھینچئے میں گاڑی سے کود کر جان دیدوں گی" میں! جان دیدوں گی" ایں چہ معنی دارد' میں نے کہا کہ" تم ہو کون" انھوں نے کہا عورت" میں نے کہا" نام" کہا" راسخہ" میں نے کہا" سبحان اللہ" آپ کو دیکھئے آپ کے کرتوتوں کو دیکھئے۔ اللہ کی بندی تجھے گھر میں بہو بیٹی بن کر بیٹھنا تھا یا اس طرح ڈاکے ڈالتے پھرنا" کہنے لگی" مصیبت سب کچھ کراتی ہے اور رفتہ رفتہ سب کچھ سکھاتی ہے" میں نے کہا" نقاب اتارو" کہنے لگی "نہیں" میں نے کہا" نہیں؟ تو اچھا میں زنجیر کھینچتا ہوں" آخر ناچار ہوکر بچاری نے نقاب اٹھائی خاصی اچھی شکل کی جوان عورت تھی مگر آنکھوں کے نیچے کی کالی کالی لکیریں بتارہی تھیں کہ مصیبت زدہ ہے۔ بڑی دیر تک ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ میرے تیور دیکھ کر سمجھ گئی کہ میرا ارادہ اس کو پولیس کے حوالے کرنے کا نہیں ہے کیونکہ وہ ایک دفعہ ہی کھڑی ہوگئی اور کہا کہ "خدا حافظ" میں نے پستول کا رُخ اس کی طرف کرکے کہا کہ" بیٹھ جاؤ"

اس نے ایک قہقہہ مارا اور کہا کہ "پہلے پستول کو تو دیکھ لیجئے کہ یہہ چلتا بھی ہے یا نہیں آپ نے جوتے کے پستول سے لکڑی کا پستول چھین کر کوئی بڑا کمال نہیں کیا ہے ۔"

اب جو میں نے غور سے پستول کو دیکھا تو واقعی لکڑی کا ٹکڑا تھا۔ گو شکل صورت میں عین مین پستول تھا میں نے کہا "کچھ ہرج نہیں پستول کام دے یا نہ دے۔ میرے ہاتھ پاؤں تو کام دیتے ہیں اب بیٹھتی ہے یا میں اٹھاؤں" یہہ سن کر وہ بیٹھ گئی اور کہنے لگی "آخر اس سے آپ کا مطلب" میں نے کہا کہ "میں تمھاری داستان سننا چاہتا ہوں"۔ پوچھا "یہ کیوں" میں نے کہا "مضمون لکھنے کو" کہنے لگی "تو اچھا آپ مضمون نگار ہیں اور آپ کا اسم شریف" میں نے کہا "فرحت اللہ بیگ" کہنے لگی "اوہو آپ ہی مرزا صاحب ہیں، آداب عرض کرتی ہوں آپ کے مضمون پڑھتی تھی۔ آپ کو دیکھنے کا شوق تھا چلو وہ بھی اللہ نے پورا کر دیا۔ اجی مرزا صاحب! میں کیا بتاؤں کہ میں کون ہوں ایک مصیبت زدہ عورت ہوں۔ ایف اے تک تعلیم پائی ہے۔ چھوٹی عمر میں شادی ہوئی، دو ہی برس کے بعد وہ مر گئے۔ سسرال والوں نے ان کے مرنے کا سبب مجھ کو ٹھیرایا، الزام یہ تھا کہ میں سسرال والوں پر بھاری ہوئی کہ ایک ہی سال میں ایک چھوڑ چار کو کھا گئی، میکے میں آ کر رہی وہاں سوتیلے بھائیوں نے ٹکنے نہ دیا۔ آخر ایک بھلے آدمی سے نکاح کر لیا وہ اللہ کے فضل سے ڈاکو نکلے دن کو گھر میں رہتے اور رات کو خدا معلوم کہاں کہاں جا کر ڈاکہ ڈالتے۔ مجھے بچپن ہی سے ڈاکوؤں اور سراغرسانوں کے قصے پڑھنے کا شوق تھا۔ میں ان کے سر ہو گئی کہ مجھے بھی ساتھ لے چلا کرو۔ پہلے تو وہ "نہیں نہیں" کرتے رہے لیکن بعد میں راضی ہو گئے اور اس طرح تھوڑے ہی دنوں میں مجھے گھوڑے کی سواری بھی آ گئی اور چلتی ریل میں چڑھنے اترنے کی مشق بھی ہو گئی۔ ابھی ڈیڑھ سال کی بات ہے کہ نبارک پور کے گاؤں والوں نے ان کو گھیر لیا اور گولی مار کر شہید کر دیا۔"

میں نے کہا "شہید کر دیا کی بھی بہت ہوئی یہ کیوں نہیں کہتیں کہ جہنم واصل کر دیا" کہنے لگی "مرزا صاحب دیکھئے خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کیجئے میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں مگر ان کے متعلق اگر آپ نے کوئی برا لفظ زبان سے نکالا تو اچھا نہ ہوگا" میں نے کہا "تو بیگم صاحبہ آپ چاہتی ہیں کہ میں ایک ڈاکو کی تعریف کروں" کہنے لگی "ساری دنیا ڈاکو ہے کوئی اپنی عقل سے دنیا کو لوٹتا ہے۔ کوئی اپنے ہاتھ پاؤں کے زور سے۔ ایک کی آپ تعریف کرتے ہیں اور دوسرے کی مذمت ورنہ، ہیں دونوں ڈاکو" میں نے کہا "اللہ رے تیری منطق، اچھا اس جھگڑے کو تو چھوڑو اور اپنا قصہ ختم کرو" کہنے لگی "اس کے بعد اب قصے میں رہ ہی کیا گیا ہے۔ ان کے مرنے کے بعد سال بھر تک تو اپنی جمع پونجی پر گزارہ کرتی رہی جب وہ ختم ہو گئی تو میں نے اکا دکا مسافروں کو لوٹنا شروع کیا۔ چنانچہ خوش قسمتی سے آج آپ سے نیاز حاصل ہو گیا اچھا اب اجازت ہے" میں نے کہا "راسخہ! بڑے افسوس کی بات ہے کہ تم شریف اور تعلیم یافتہ ہو کر اپنی ڈاکہ زنی پر فخر کرتی ہو" کہنے لگی "اجی مرزا صاحب، مثل مشہور ہے کہ بھوکے شریف اور پیٹ بھرے رذیل سے ڈرنا چاہیے۔ مگر میں کہتی ہوں کہ یہ دونوں ایسے خطرناک نہیں ہوتے جتنے بگڑے ہوئے تعلیم یافتہ شریف یقین

مانیے کہ اگر ان لوگوں میں ذرا سی ہمت کا اضافہ ہو جائے تو یہ دنیا کو ہلا دیں۔

وہ تو کہو کہ خدا نے گنجے کو ناخن ہی نہیں دیئے ورنہ کبھی کبھی اکر خدا معلوم اپنا کیا حال کر لیتا۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہ پیشہ چھوڑ دو۔ میں آج ہی چھوڑے دیتی ہوں مگر میرے کھانے پینے کا تو بندوبست کردو" میں نے کہا" پھر کسی سے نکاح کر لو" کہنے لگی "کس سے آپ سے" میں نے کہا۔ "مجھ سے نکاح کرنا کچھ آسان کام نہیں ہے۔ میری بیوی پکی مغلانی ہے میں نے تو جوتے سے پستول کا کام لیا تھا مگر وہ چپل سے استرے کا کام لے گی" یہ سن کر اس نے ایک قہقہہ مارا اور کہا "مرزا صاحب' آپ کی باتوں میں آج مزا آگیا۔ ہاں' لائیے سیدھے ہاتھ سے اب کچھ دلوائیے۔ خدا کی قسم میرے پاس کھانے کو ایک پیسہ نہیں ہے کل سے بھوکی ہوں" میں نے بٹوہ کھول اس کے سامنے کر دیا بٹوے میں کئی نوٹ تھے مگر اس اللہ کی بندی نے صرف دو روپے نکال لئے اور کہا "شکریہ" چلو چلتے چلتے آپ پر بھی ہاتھ صاف کر ہی دیا۔ اچھا فی امان اللہ" یہ کہہ دروازہ کھول ریل سے اس طرح نیچے اتر گئی کہ کوئی گارڈ بھی کیا اترے گا۔ چلتے چلتے اپنی بیاٹری اور پستول بھی اٹھا کر لے گئی۔ میں سوچتا تھا کہ یا رالہ' جب شریف زادیاں اس طرح ڈاکہ ڈالنے پر اتر آئی ہیں تو یہ دنیا کیا رنگ پکڑنے والی ہے۔

گھبرا کر بنچ سے اٹھا' کیا دیکھتا ہوں کہ دروازے کا کھٹکا اندر سے لگا ہوا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یا الٰہی یہ کیا معاملہ ہے بڑی دیر تک غور کرنے کے بعد سمجھ میں آیا کہ ہو نہ ہو یہ سب کچھ تیرے چوبیس [۲۴] گھنٹے تک جاگنے' ثقیل غذا کھانے' اور سخت بنچ پر پڑے رہنے کا نتیجہ ہے۔ ورنہ شریف زادیاں تو شریف زادیاں ہی ہوتی ہیں ان کو بھلا ایسے کاموں سے کیا واسطہ۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ میرے بٹوے میں سے دو روپے کیوں کم ہو گئے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ

دردناک مشاہدہ

(۱۹ نومبر کو انارکلی چوک نیلا گنبد لاہور کا ایک چشم دید واقعہ۔ احسان دانش کے پانچویں مجموعۂ کلام "نفیرِ فطرت" کا ایک ورق)

کل صبح ایک شخص پریشان و مضمحل
پامالِ روزگار، مسرت سے دور تر

بیٹھا تھا اک دوراہے پر غم میں گھرا ہوا
سانسوں میں جا رہی تھی کھنچی خاکِ رہ گزر

ٹوٹی سی ٹوکری میں سنگھاڑے لئے ہوئے
چلا رہا تھا "پیسے کے لے جاؤ سیر بھر"

گاہک مگر نہ کوئی بھی آتا تھا اس کے پاس
حسرت سے اٹھ رہی تھیں نگاہیں ادھر ادھر

۲

اتنے میں ایک شخص رجسٹر لئے ہوئے
باشان و باشکوہ و باندازِ کرّ و فر

اس کی طرف بڑھا تو یہ سمجھا وہ نامراد
"میری نوائے گرم گئی تا دل و جگر"

لیکن یہ جب سنا "ابے محصول کر ادا"
"بیٹھا ہے صبح صبح دوراہے کو گھیر کر"

منہ رہ گیا کھلا کا کھلا، سانس رک گئی
اٹھی نہ جھجک کے سوگ میں ڈوبی ہوئی نظر

اس ششدری کے بعد لرزتی زبان سے
کہنے لگا "ہو آپ کا رتبہ بلند تر"

"آیا ہوں جب سے ایک بھی گاہک نہیں نصیب"
"میں کیا کروں نہیں مری تقدیر ساز گر"

"محصول سے کہاں مجھے انکار کی مجال"
"مہلت ہو اس قدر کہ جب آپ آئیں لوٹ کر"

اس التجا پہ طیش محرّر کو آگیا
ٹھوکر لگائی ایسی بچارے کے تان کر

نالی میں گر گئی وہ سنگھاڑوں کی ٹوکری
چپ تھا غریب ضعف سے تھامے ہوئے کمر

۳

یہ ہے یہاں غریب کا معیارِ زندگی
یہ غم زدوں کے حال پہ ہے لطف کی نظر

یہ قدرِ آدمی کی یہاں آدمی کو ہے
شرما ئیں جس کو دیکھ کے جنگل کے جانور

یہ خستہ کامیوں کی مدارات، الاماں!
یہ نامرادیوں پہ عنایات، الحذر!!

یہ فاقہ مستیوں پہ سخاوت کی بارشیں!
ناداریوں پہ یہ ہیں کرم ہائے اہلِ زر!!

یہ مُلک میں ہے عزتِ باشندگانِ ملک
محصول دے سکیں تو کریں زندگی بسر

یہ زندگی پہ جور و ستم ہائے زندگی!
یہ دورِ خود نما "کہ بشر کا خدا بشر"!!

مذہب غلام، روح غلام، آبرو غلام
آزادیٔ ضمیر، نہ آزادیٔ نظر

احسان دانش

رُوحِ غالب اردو اور فارسی کے مشہور شاعر و ادیب مرزا اسد اللہ خاں غالب کی حیات اور کارناموں کی ایک مجمل سرگذشت اور ان کے اردو خطوط کے دلچسپ ادبی حصوں کا انتخاب جس کو جناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور نے نہایت محنت اور جانفشانی سے مرتب کیا ہے اس کتاب کا پیش لفظ نواب مہدی یار جنگ بہادر ام اے کیمبرج، صدر المہام تعلیمات و معین امیر جامعہ عثمانیہ نے تحریر فرمایا ہے۔
اس کتاب میں سب سے پہلی دفعہ غالب کے خاندان و اعزہ اور ان کے سسرالی اعزہ و اقارب کے دو تفصیلی شجرے بھی شائع کئے گئے ہیں۔ غالب کے حالاتِ زندگی جس خوبی اور اجمال کے ساتھ اس میں درج ہیں آج تک کسی سوانح غالب میں نہیں شائع ہوئے۔
صفحات (۲۴۰) تعداد تصاویر (۳) کتابت و طباعت نفیس کاغذ اعلیٰ قسم قیمت عہ

موجودہ اردو شاعری

آج کل کی اردو شاعری' گرد و پیش کے اثرات کے لئے
جس قدر کشادہ آغوش بن گئی ہے' ایسی کسی زمانے میں بھی
نہیں تھی۔ وہ تمام قومی اور ملکی سیاست' عالمی معاشی اور
سیاسی افراتفری' نظری اور علمی علوم کی توسیع اور حسن کاری
کے اگلے تخیلات کی تبدیلیاں' جن سے ہماری قومی زندگی
متاثر ہو رہی ہے' ان کا تھوڑا بہت عکس' ہماری موجودہ
شاعری میں بھی اتر رہا ہے۔

موجودہ شاعری کے پس منظر میں' دو واقعات'
بےحد نمایاں اور خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں پہلا اور
سب سے اہم واقعہ' مغربی قوموں سے ہمارا تصادم ہے۔
جس کا انجام بالآخر' ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط کی
صورت میں ہوا۔ لیکن یہ انجام ہماری شاعری کے لئے چند
اہم تحریکوں کا نقطۂ آغاز ثابت ہوا۔ انگریزی تسلط کے بعد ہماری
شائستہ زندگی کا رخ' ایران سے انگلستان کی طرف پھر گیا۔ ہمارے
خیالات' اعتقادات' رہنے بسنے کے طور طریق غرض ہر چیز
میں تبدیلی ہو رہی تھی۔ اس کا اثر ہمارے ادبی تخیلات پر
بھی پڑنا ناگزیر تھا۔ چنانچہ بدلی ہوئی فضا سے اپنے آپ کو
ہم آہنگ کرنے کے لئے ہم کو جو جدوجہد کرنی پڑی' اس کا
تھوڑا بہت اثر ہماری شاعری پر بھی پڑا۔ اس زمانے میں'
نئی روشنی کو ہماری زندگیوں میں داخل کرنے کا باعث'
اس عصر کے اولین مصلح' سرسید احمد خاں بنے' اور
اس تحریک کو شاعری میں' داخل کرنے کا باعث آزاد
اور ان سے بڑھ کر حالی تھے۔

حالی کی تحریک کا مقصد' اردو شاعری کو اس کے
مخصوص ذہنی تخیلات سے ہٹانا تھا۔ اس میں ان کو اس
حد تک کامیابی ہوئی کہ' فنِ شعر کے نظریے میں ایک ہلچل
برپا ہو گئی اور ہماری شاعری' نیچرل شاعری' قومی شاعری'
جیسی تحریکوں اور سادہ طرزِ بیان سے روشناس
ہوئی۔ لیکن شعر کی صنفیں اور شکل و صورت ابھی تک معرضِ
بحث میں نہیں آئی تھی۔ حالی' مروجہ شاعری کے مضامین
کے ساتھ' ردیف اور قافیہ کی" اوگھٹ گھاٹیوں' سے
بھی بیزار تھے۔ لیکن ان کی عملی ذہنیت اصنافِ شعر کو
چھیڑنے کا مشورہ نہیں دیتی تھی۔ تاہم یہ تخم بھی بویا
جا چکا تھا' اور طوفان راہیں تلاش کر رہا تھا۔ ایسے
میں' دوسرا اہم واقعہ پیش آیا۔ یہ یورپ کی جنگِ عظیم تھی
اس اہم عالمی حادثہ کا اثر' ہماری شاعری پر شاید
براہِ راست نہیں پڑا' اس جنگ کے بعد سے عالمی
سیاست میں جو گتھم گتھا ہو گئی تھی' اس کے سبب ہم
ان اثرات سے' بےتعلق بھی نہیں رہ سکتے تھے۔

اس جنگ کا اثر دنیا پر کس قدر دور رس ثابت
ہوا' اس کا پورا پورا اندازہ ابھی تک بھی نہ ہو سکا۔ اس کی
وجہ سے جہاں بہت سا جانی اور مالی نقصان ہوا' اور
دولت مند قومیں مفلس ہو گئیں' وہیں' مشرقی قوموں کے
دلوں میں آزادی کی ایک لہر دوڑ گئی اور ترکی انقلاب نے
راستہ اور بھی ہموار کر دیا۔ اور یورپ' اور خاص کر
انگریزوں کی برتری کا طلسم ہمارے ذہنوں سے ٹوٹنے
لگا۔ یہی زمانہ ہماری شاعری میں' قومی جوش اور حب وطن
کے ترانوں کا زمانہ ہے۔ اس سلسلے میں اقبال نے رہنمائی
کی' اور چکبست' سرور اور نوجوان شعراء کی ایک بڑی
تعداد ان کے نقشِ قدم پر چلنے لگی۔ اقبال کا مشہور ترانہ
اس احساس کو جگانے [illegible]

اردو کے نظم گو شاعر

نظم کے پیش خاکے نظم ہماری زبان میں ایک مربوط اور مسلسل صنفِ سخن کا نام ہے۔ یہ ظاہری اور معنوی حیثیتوں سے غزل سے بالکل مختلف ایک مستقل صنفِ سخن ہے، جس کو جدید ادب میں روز افزوں اہمیت حاصل ہوتی جا رہی ہے۔ اردو میں اس کا خاکہ عہدِ قدیم ہی سے پڑ چکا تھا۔ قدیم دکنی ادب کے نمونے تمام تر مثنویوں کی شکل میں ملتے ہیں، خاور نامہ یوسف زلیخا، چندر بدن مہیار، قصۂ بہرام و حسن بانو اس دور کی مشہور مثنویاں ہیں، ان مثنویوں سے متعلق تفصیلی معلومات پیش کرنا اردو مثنویوں کی تاریخ لکھنے والے کا کام ہے۔ لیکن ہمارے لئے اتنا جاننا ضروری ہے کہ ہم آج جس صنفِ سخن کو نظم کہتے ہیں، اس کا ایک دھندلا سا خاکہ ان مثنویوں کی شکل میں قدیم دکنی ادب میں تیار ہو چکا تھا۔

نظیر اکبر آبادی نظیر اکبر آبادی پہلے شاعر ہیں جنھوں نے نظم کو جدید طرز اور نئے رنگ سے پیش کیا۔ نظیر نے اپنی نظموں کے موضوعوں کے لئے ہندوستانی ماحول اور ہندوستانی معاشرت کا انتخاب کیا۔ الفاظ کا جتنا ذخیرہ نظیر کی نظموں میں ملتا ہے اتنا میر انیس کے علاوہ غالباً کسی اور شاعر کے کلام میں نہیں ملتا۔ نظیر کے اکثر و بیشتر الفاظ آج کل متروکات میں شمار کئے جاتے ہیں، ان کے اسلوب ان کی زبان اور ان کی نظموں کے موضوعوں پر بہت سارے اعتراضات کئے جاتے رہے ہیں۔ یہ نقاد کا کام ہے کہ ان کی تائید یا تردید کرتا رہے، لیکن ایک مورخ کی نظر میں نظیر اکبر آبادی پہلے شاعر ہیں جنھوں نے منظر کشی اور واقعہ نگاری کی طرف توجہ کی اور اس طرح اپنے لئے اور دوسروں کے لئے ایک مستقل شاہراہِ سخن تیار کر لی۔

میر انیس میر انیس نے منظر کشی اور جذبات نگاری کو درجۂ کمال تک پہنچا دیا۔ لیکن خود میر انیس نے نظم کی ایک خاص صنف کو اپنی شاعری کا محور بنا لیا تھا۔ اس لئے ان کی شاعری تاریخی حیثیت سے اردو مرثیے اور اردو کی ڈرامائی شاعری سے متعلق ہو جاتی ہے۔ بہر حال میر انیس کی منظر نگاری اور جذبات نگاری کو جدید نظم کے پیش خاکے کا اہم جزو سمجھنا چاہیے۔

عہدِ حالی انیس کے بعد نظم کے "پیش خاکے" مختلف حیثیتوں سے مختلف شاعروں کے ہاں تیار ہوتے رہے۔ مولوی محمد حسین آزاد نے کرنل ہالرائڈ کے مشورے سے جس وقت انجمن پنجاب کے جدید مشاعروں کی بناء ڈالی ہو گی تو ان کا وجدانِ شعری غیر شعوری طور پر ان پیش خاکوں سے متاثر رہا ہو گا۔ نظیر اکبر آبادی کی نظمیں میر حسن کی مثنوی کے دلچسپ مرقعے میر انیس کے مرثیوں کے مناظر اور ان کی جذبات نگاری یہ سب ان کے پیشِ نظر رہے ہوں گے۔ اور ان کے ذہن میں ان اجزا کی مدد سے جدید نظم کی عمارت کی تعمیر ہو رہی ہو گی۔ مختصر یہ کہ آزاد کی تحریک نے جدید شاعری کے سب سے بڑے علمبردار اور اس عہد کے سب سے بڑے قومی شاعر حالی کے شعور کو بیدار کر دیا اور ہماری زبان میں ان دونوں بزرگوں کی کوششوں سے اس صنفِ سخن کی مستقل بنیاد پڑی جس کو ہم آج نظم سے تعبیر کرتے ہیں، حالی چونکہ سرسید کی اصلاحی تحریکوں سے بے حد متاثر تھے، یہ اصلاحی تحریکات ان کی شاعری کا ایک اہم جزو بن گئی۔ حالی کی نظمیں چونکہ ان کے دل سے نکلی تھیں وہ براہِ راست دل کے تاروں کو چھیڑتی ہیں۔

خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی

اکبر حسین اکبر الہ آبادی

شبیر حسن جوش ملیح آبادی

ابوالاثر حفیظ جالندھری

شیخ ابراہیم ذوق

خواجہ حیدر علی آتش

خواجہ میر درد

قوم پر حالیؔ کے پیام کا کیا اثر ہوا یہ ایک علٰحدہ بحث ہے۔ لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری نے مسلمانوں کے اجتماعی شعور کو بیدار کر دیا۔ حالیؔ کی شاعری مسلمانوں کے تنزل کا ایک دردناک مرثیہ ہے۔

شبلیؔ ۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء | حالیؔ کی نظمیں اصلاحی مقاصد کے لئے اس قدر موثر اور مقبول ثابت ہونے لگیں کہ شبلیؔ جیسے سنجیدہ عالم اور مورخ کو بھی اس کی طرف توجہ کرنی پڑی، شبلیؔ چونکہ فطرت سے شاعرانہ دل و دماغ لے کر آئے تھے ان کو اپنی شاعری کے لئے کسی ذہنی کاوش سے دوچار ہونا نہ پڑا۔ شبلیؔ نے تاریخ اسلام کے بعض دلچسپ اور سبق آموز واقعات نہایت کامیابی کے ساتھ نظم کئے ہیں۔ ان کی مثنوی صبح امید تاریخی اور ادبی اعتبار سے خاص اہمیت رکھتی ہے۔

اسمٰعیل میرٹھی ۱۸۴۴ء تا ۱۹۱۷ء | اسمٰعیل میرٹھی دبستانِ حالیؔ کے ایک ممتاز پیرو ہیں، انھوں نے بہت ہی اخلاقی اور اصلاحی نظمیں کہی ہیں، یوں کہنے کو اسمٰعیل بچوں کے شاعر تھے لیکن اسلوب کی شگفتگی اور سلاست کے اعتبار سے ان کی نظمیں ہر مذاق اور ہر طبیعت پر یکساں اثر رکھتی ہیں۔

اکبر الٰہ آبادی ۱۸۴۶ء تا ۱۹۲۱ء | اکبر ہماری زبان کے سب سے بڑے طنز نگار satirist تھے۔ انھوں نے جس لطیف طنز کی زبان میں بنا ڈالی اس کے آپ موجد اور آپ ہی منتہی تھے، ان کی شاعری ہماری بڑھتی ہوئی مغربیت کے خلاف ایک احتجاج تھی۔ اکبر اپنے دور کے واحد نمائندہ شاعر ہیں جن کے کلام میں ہم کو اس عہد کے سارے ذہنی رجحانات نظر آتے ہیں اس میں ہم کو اس عہد کی مغرب پرستی اور اس کے ردِ عمل دونوں ملتے ہیں، مغربیت کے خلاف اکبر کے بھی جذبات زیادہ قوت کے ساتھ اقبال کی نظموں میں جلوہ گر ہوئے اس اعتبار سے مشرق کے شاعرِ اعظم علامہ اقبال مرحوم کی شاعری اکبر کی شاعری کی ہی صدائے بازگشت ہے۔

چکبستؔ لکھنوی ۱۸۸۲ء تا ۱۹۲۶ء | اس عہد کے ایک اور ممتاز نظم گو شاعر چکبستؔ لکھنوی ہیں۔

چکبستؔ کی نظمیں منظر نگاری اور وطن پرستی کے جذبات کے اعتبار سے اردو ادب میں ایک ممتاز اور رفیع مقام رکھتی ہیں، چکبستؔ کی منظر کشی اور جذبات نگاری کے اسلوب پر میر انیسؔ کا نمایاں اثر ہے۔

شوقؔ ۱۸۵۳ء تا ۱۹۲۵ء اور نظمؔ طباطبائی ۱۸۵۲ء تا ۱۹۳۳ء | شوقؔ اور نظمؔ بھی اس عہد کے نظم نگار شاعروں میں قابلِ ذکر ہیں، شوقؔ کی جذباتی نظمیں بے حد دلچسپ ہیں، نظمؔ طباطبائی کی شاعری قدیم اور جدید تحریکات کا سنگم ہے گرے کی مشہور نظم گورِ غریباں ان کا غیر فانی کارنامہ ہے نظمؔ طباطبائی اور عبد الحلیم شررؔ مرحوم نے اردو میں قافیہ معرا (بلینک ورس) کو رواج دینے کی کوشش کی تھی لیکن یہ مساعی غیر مشکور ثابت ہوں۔

عظمت اللہ خاں ۱۸۸۷ء تا ۱۹۲۷ء | تقریباً اسی دور کے ایک اور ممتاز شاعر عظمت اللہ خاں گذرے ہیں۔ انھوں نے بڑی شاعرانہ طبیعت اور حسن کارانہ مذاق پایا تھا وہ ایک خاص طرز کے موجد اور تنہا مالک تھے، ان کی نظموں پر ہندی شاعری کا بڑا اثر تھا۔ ان کے الفاظ مترنم اور اسلوب بے حد من موہن ہوتا تھا۔

سلیم | مولوی وحید الدین سلیمؔ عظمت اللہ خاں اور جوشؔ ملیح آبادی

سے بے حد متاثر تھے۔ سلیم نے شاعری اپنی عمر کے آخری حصے میں شروع کی ان کی نظموں میں جوش اور روانی بہت زیادہ نظر آتی ہے۔

عہد اقبال | اقبال (۱۸۷۵ء تا ۱۹۳۸ء) اقبال کی عظیم الشان شخصیت ان کی زندگی ہی میں بجائے خود ایک ادارہ بن گئی تھی۔ اور ان کی شاعری کا اثر شعوری یا غیر شعوری طور پر سارے ادب پر پڑ رہا تھا، اقبال بلاخوف تردید اردو کے بلکہ ساری ایشیائی زبانوں کے سب سے بڑے شاعر سمجھے جا سکتے ہیں۔ ان کی حیات اور ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر جتنا کچھ لکھا جا چکا ہے وہ اردو کے کسی اور شاعر کے متعلق نہیں لکھا گیا۔ اقبال کی شاعری نے اردو کے ہر چھوٹے اور بڑے شاعر کو متاثر کیا ہے اور ہر شاعر نے کسی نہ کسی طرح ان کی فکر سے اکتساب کیا ہے اور ان کی شاعری کی تقلید کی ہے۔

جوش ملیح آبادی ۱۸۹۴ء | جوش غالباً موجودہ عہد کے سب سے زیادہ مشہور و مقبول نظم گو شاعر ہیں، جوش و سرمستی ان کے کلام کی اہم خصوصیات ہیں۔ جوش ملیح آبادی اپنے مسلک اور عقائد کے اعتبار سے اقبال سے بالکل مختلف ہیں لیکن ان کی طرز فکر اور ان کے اسلوب پر اقبال کا اثر ضرور ہے۔ جس سے شاید وہ خود باخبر نہیں ہیں۔ جوش نے نہایت آزاد اور بیباک شاعرانہ طبیعت پائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کہیں کہیں ان کی نظموں میں ایک بے اعتدالی اور بے آہنگی سی پائی جاتی ہے لیکن اس سے ان کی شاعرانہ عظمت پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔ جوش شاعر انقلاب بھی ہیں اور شاعر شبابیات بھی۔ انقلاب کے لئے ان کے پاس اقبال کی طرح کوئی مستقل فلسفہ یا پیام نہیں ملتا، جوش جس انقلاب کا خواب دیکھتے ہیں۔ اس انقلاب کی تعمیر محض خون آشامیوں اور ہنگام آرائیوں میں ہوتی نظر آتی ہے، اقبال جس انقلاب کے متمنی ہیں وہ ایک وجدانی انقلاب ہے جس کا وہ ایک مکمل نصاب اپنے فلسفے میں پیش کرتے ہیں، اقبال شاعر بھی تھے اور مفکر بھی لیکن جوش شاعر اور صرف شاعر ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی انقلابی شاعری سے زیادہ اہم ان کی جذباتی اور شبابیاتی شاعری ہے، اسی کو ان کی حیات ادبی کا غیر فانی سرمایہ سمجھنا چاہیے۔

علی اختر | حیدرآباد دکن کے علی اختر عہد حاضر کے نظم گو شاعروں میں سب سے زیادہ سنجیدہ اور سب سے بلند شاعرانہ حیثیت کے مالک ہیں۔ ان کی نظمیں فکر عمیق کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ ان کا ہر شعر ایک مستقبل دعوت فکر ہوتا ہے ان کی نظمیں "میلارمے" (فرانسیسی شاعر) کی نظموں کی طرح عوام کے لئے چیستاں بن کر نہیں رہ جاتیں، ان کا کلام غیر شعوری طور پر ایک دلکش نغمہ بن کر دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔ اقبال کا صحیح اثر علی اختر سے زیادہ کسی شاعر نے قبول نہیں کیا۔ ان کی شاعری کا سب سے بڑا حسن ان کی فکر اور ان کے اسلوب کی ہمواری اور ہم آہنگی ہے، فارسی ترکیبوں کے استعمال کا سلیقۂ جمیل علی اختر سے زیادہ عہد حاضر کے کسی شاعر کو نصیب نہیں ہو سکا۔

سیماب اکبرآبادی | سیماب اکبرآبادی اس عہد کے ایک اور ممتاز صاحب طرز نظم گو شاعر ہیں، انھوں نے آگرہ اسکول کی بنیاد ڈالی ہے۔ سیماب کے دبستاں کے شاعروں میں ساغر نظامی، منتظر، اعجاز اور شاہد خاص طور سے

حافظ نذیر احمد

شبلی نعمانی

عبدالحلیم شرر

راشد الخیری

ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب بی اے۔ ڈی لٹ

قابلِ ذکر ہیں۔

ماہر القادری ماہر القادری بھی اس دور کے ایک ممتاز اور خوش فکر نظم گو شاعر ہیں، اصلاحی اور شبابی دونوں قسم کی نظمیں ماہر کے کلام میں موجود ہیں، یہ نظمیں حسنِ خیال اور حسنِ بیان کا نہایت دلکش اور اچھوتا نمونہ ہیں۔

احسان بن دانش احسان بن دانش عہد حاضر کے سب سے بڑے انقلابی شاعر ہیں، ان کی انقلابی شاعری کوئی رسمی شاعری نہیں بلکہ ان کی اپنی بپتا ہے۔

ان کے علاوہ اختر شیرانی، روش صدیقی، حفیظ جالندھری، عدم، مجاز، ابوالفخر سلام، مخدوم عثمانیہ، میکش عثمانیہ، ساز عثمانیہ، علی منظور، زیبا، وجد، جان نثار اختر، اِلطاف مشہدی، آثر صہبائی اور فطرت واسطی ہماری زبان کے مشہور نظم گو شاعر ہیں ان کا کلام اس عہد کا بیش بہا ادبی سرمایہ ہے۔ اردو شعر و ادب کے مستقبل کی تعمیر ان ہی ہاتھوں سے ہونے والی ہے

محمد مہاجر

یاد

جب چاند ستارے ہنستے ہیں رنگین نظارے ہنستے ہیں
خاموش اندھیری راتوں میں معصوم نظارے ہنستے ہیں
کیوں یاد تمھاری آتی ہے

(۲)

جب سخت اندھیرا ہوتا ہے جب سارا عالم سوتا ہے
اور پریم کی ویران نگری میں دل چپ کے چپکے روتا ہے
کیوں یاد تمھاری آتی ہے

(۳)

جب نینن گنگا بہتی ہے اور پریم کہانی کہتی ہے
جب بگلے اڑتے رہتے ہیں اور ندیا بہتی رہتی ہے
کیوں یاد تمھاری آتی ہے

(۴)

جب پریم تپسّا ہوتی ہے اور "شاما" کا کر رونی ہے
تاروں کی سندر چھاؤں میں جب پریم کی دنیا سوتی ہے
کیوں یاد تمھاری آتی ہے

(۵)

جب بادل شور مچاتا ہے الفت کے ترانے گاتا ہے
جب ساون بھادوں ملتے ہیں شہنائی سیگھ بجاتا ہے
کیوں یاد تمھاری آتی ہے

(۶)

اک نور کا گھیرا ہوتا ہے رنگین سویرا ہوتا ہے
جب دیپک بجھنے لگتا ہے معدوم اندھیرا ہوتا ہے
کیوں یاد تمھاری آتی ہے

(۷)

جب چرخ پہ تارے ہوتے ہیں خاموش اشارے ہوتے ہیں
جب کلیاں ہنستی رہتی ہیں معصوم نظارے ہوتے ہیں
کیوں یاد تمھاری آتی ہے

انس کلیانوی
(ناگر گنشہ)

میرا سنگِ مزار

سنہ ۱۹۲۱ء میں ایک مضمون میں نے لکھا تھا جس کا عنوان "ہماری آخیر خواب گاہ" تھا۔ جو رسالہ النساء میں چھپا۔ اُس میں یہ بتایا تھا کہ ہم اپنے رہنے کے لئے تو عالی شان عمارتیں بناتے ہیں۔ اور ہمارے بعد ہمارے مزار پر جانور لوٹا کرتے ہیں ہندوؤں اور مسلمانوں کے قبرستان نہایت بری حالت میں رہتے ہیں ہم کو چاہیے اپنی زندگی میں اپنی آخیر خواب گاہ بنالیں وہاں چمن و باغ ہو جس کی جو حیثیت ہو اسی طرح کا انتظام پہلے سے کرنا چاہیے۔ اٹلی کا قبرستان نمائش گاہ بنا ہوا ہے۔ اور پانڈیچری کا بھی قبرستان قابلِ دید ہے ہم کو بھی چاہیے کہ ہم بھی اپنی آخیر خواب گاہ خوبصورت بنائیں وغیرہ وغیرہ۔

مضمون تو لکھا تھا مگر میں نے خود اس پر عمل نہیں کیا۔ البتہ جہاں ہمارا مزار بنایا جائے گا وہ زمین سوچ لی تھی مگر مقبرہ وغیرہ نہیں بنایا تھا۔ اب سید ہمایوں مرزا صاحب مرحوم کے انتقال کے بعد ان کے لئے نہایت خوبصورت مقبرہ بنایا ہے اور مقبرے کے اندر تاریخیں جو ان کے انتقال پر لوگوں نے لکھی ہیں وہ آئینے کے چوکھٹوں میں لگوا کر آویزاں کر دی ہیں، سرہانے مزار کے سنگِ مزار پر حضرت اقدس و اعلیٰ دام اقبالہ کی فرمودہ تاریخ "در جنت ہمایوں ہم فرشتہ" کندہ کروا دی ہے اس کے نیچے خان بہادر احمد علی خاں صاحب کی لکھی ہوئی سنہ ۱۳۴۴ف ہجری تاریخ کندہ کی ہے۔

مرحوم کے مزار کے بازو میں میں نے اپنا مزار بھی کھدوا کر تیار رکھا ہے میں نے اپنا سنگِ مزار بھی کندہ کرنے اسی شخص کو دیدیا جس نے تمام مقبرے میں سنگِ مرمر کا فرش کیا ہے۔ میرے سنگِ مزار کی عبارت یہ ہے۔

یا رحیم
نصر من اللہ وفتح قریب

"مزار صغرا ہمایوں مرزا بنتِ حاجی کپتان ڈاکٹر صفدر علی مرزا صاحب مرحوم سنہ پیدائش سنہ وفات"

ہر کس وسیلہ دارد و ما بے وسیلہ ایم
ما را وسیلہ نیست بجز ذاتِ پاک تو

اس کے نیچے جگہ چھوڑ دی ہے مرے بعد جو کوئی تاریخ لکھے وہ اسی جگہ کندہ کی جائے گی۔

جب میں نے سنگِ مزار لکھنے دیا تو دوکان دار صاحب نے ہمدردی سے کہا ابھی جلدی کیا ہے خدا نہ کرے آپ کیوں اپنا سنگِ مزار کندہ کرواتی ہیں" میں نے کہا آپ کو اس سے کیا آپ کندہ کر دیجئے انھوں نے چار روز میں کندہ کر کے دینے کا وعدہ کیا اور آج پانچ ماہ ہوتے ہیں نہ دیا۔

دوکان دار صاحب جن کا نام صفدر علی صاحب ہے مجھے کہہ رہے ہیں آپ کا سنگِ مزار لوگ دیکھا کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ہم بھی اپنی زندگی میں سنگِ مزار بنالیں۔" آپ کے سنگِ مزار کی وجہ میرے بہت سے پتھر فروخت ہو رہے ہیں اس لئے میں ابھی آپ کا سنگِ مزار نہیں دوں گا۔" یہ سن کر مجھے ہنسی آئی کہ لو میرا سنگِ مزار اشتہار کا کام کر رہا ہے دوسروں کو فائدہ پہنچا رہا ہے۔ میرا خیال آج سے نہیں ایک زمانے سے بھی ہے۔ میں نے مکہ معظمہ سے

وہ کفنی سنہ ۱۹۰۶ء میں منگائے تھے۔ مری پھوپی صاحبہ مرحومہ اور خالہ صاحبہ مرحومہ جب کہ معظمہ جا رہی تھیں ان کے ذریعہ منگائے تھے جو زمزم کے پانی سے دھوئے گئے تھے ایک تو مرحوم کے کام آیا ایک میرے انتظار میں رکھا ہے۔

مسز صغرا ہمایوں مرزا

حسرت

مہتاب کے جلووں سے منور ہیں فضائیں — بے خود کئے دیتی ہیں سکوں ریز ہوائیں
جھرمٹ میں ستاروں کے قمر جھوم رہا ہے — فطرت کی جبیں خوابِ سحر چوم رہا ہے

چھایا ہوا ہر ذرۂ عالم پہ سکوں ہے
بگڑا ہوا لیکن مرا انداز جنوں ہے

تڑپاتا ہے یہ درد میں ڈوبا ہوا منظر — بے حال ہوا جاتا ہے حال دلِ مضطر
سہما ہوا دل رونگھٹے تھرائے ہوئے ہیں — احساس پہ طوفانِ الم چھائے ہوئے ہیں
ہنستا ہوا نظروں میں مری آتا ہے کوئی — جذبات کے شانوں کو ہلا جاتا ہے کوئی
اشکوں میں تڑپتے ہوئے بیتاب شرارے — ہر سانس نکلتا ہوا آہوں کے سہارے
کروٹ ہی بدلتا رہا میں نیند نہ آئی — دشمن کو بھی اللہ نہ دے دردِ جدائی
اک جانِ حزیں اور یہ سختی ارے توبہ — لٹتی ہوئی ارمانوں کی بستی ارے توبہ
بجھتی ہوئی یہ شمعِ جوانی کوئی دیکھے — دل چیر کے حسرت کی کہانی کوئی دیکھے
سوگند تمھیں سوزِ محبت کے اثر کی — سوگند تمھیں بڑھتے ہوئے دردِ جگر کی
آہوں کی قسم اشک کے طوفاں کی قسم ہے — قسموں پہ مچلتے ہوئے پیماں کی قسم ہے

آؤ بھی کہ اب صبر کا یارا نہیں مجھ کو
تم بن کوئی جینے کا سہارا نہیں مجھ کو

رشید احمد رشید (عثمانیہ)

خواتینِ دکن کی ادبی خدمات

ہر قوم کے تمدن میں "زبان" کا خاص درجہ ہوتا ہے۔ زبان کی ترقی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس میں ادبی ذخیرہ کثرت سے فراہم نہ ہو، ادبیات کی ترقی کے ساتھ ساتھ زبان کی وسعت اور زبان کی ترقی ہوتی ہے، وہ قوم اور وہ ملک سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور مہذب کہلاتا ہے جس میں ادبیات کا کافی ذخیرہ ہو، یہ تصور کرنا چاہیے کہ "ادب" ایک کسوٹی ہے جس پر زبان کو پرکھا جاتا ہے۔

"لٹریچر" یا ادبیات میں کئی چیزیں شامل ہیں مثلاً "شاعری" "مضمون نگاری" افسانے، ناول، ڈرامے اور خطوط وغیرہ، ان ہی عنوانوں کے تحت ہم یہاں کچھ صراحت کریں گے۔

شاعری

ادب کی ایک اہم شاخ شعر گوئی ہے، نظم انسان کو بالطبع مرغوب ہے، بہ نسبت نثر کے نظم زیادہ موثر ہوتی ہے۔

نظم کا احاطہ نہایت وسیع ہے، اگر نظم میں مذہب اور اخلاق کو بیان کیا جا سکتا ہے تو پھر اسی نظم کے قالب میں تاریخ اور سوانح بھی بیان کی جا سکتی ہے، نظم کے جامے میں فلسفہ اور تصوف کے نکات پیش کئے جا سکتے ہیں تو پند و نصیحت بھی بیان کی جا سکتی ہے، نظم میں رزم و بزم کی تصویر کھینچی جا سکتی ہے، مناظر قدرت کی نیرنگی اور خوش نمائی، فطرتی اشیاء کی ترجمانی نظم کی صورت میں بہتر سے بہتر طریقے سے ہوتی ہے، قوم اور ملک کو بیدار کرنے، جوش و ہمت دلانے، شاہراہِ ترقی پر قدم بڑھانے کے لئے نظم ہی موزوں خیال کی جاتی ہے، میدانِ جنگ میں بہادری و دلاوری کے جوہر دکھانے کی ترغیب نظم ہی سے وابستہ ہوتی ہے، اگر نظم کے ذریعہ ہنسایا جاتا ہے تو اسی میں مرثیہ اور نوحہ کہہ کر رلایا جاتا ہے، اگر کسی کی مدح اور ستائش کر کے آسمان پر چڑھایا جا سکتا ہے، تو کسی کی ہجو کہہ کر اس کو تحت ثریٰ پر پہونچایا جا سکتا ہے، غرض کہ شاعری یا نظم نگاری سے بیسیوں کام لئے جا سکتے ہیں۔

اردو شعر گوئی میں خواتینِ دکن نے جو حصہ لیا ہے اس کی تفصیلی وضاحت اس مختصر مضمون میں دشوار ہے، البتہ اجمالاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ عصرِ حاضر میں ایک سو سے زیادہ خواتین شعر گوئی کی حیثیت سے پیش ہو سکتی ہیں، جن میں سے کئی خواتین شعر گوئی کے لحاظ سے بلند مرتبہ رکھتی ہیں، ان کا کلام پسندیدہ اور شائستگی کا اعلیٰ نمونہ ہوتا ہے، ان کی شاعری اکثر ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔

ہماری شاعر خواتین کا کلام قدیم طرز کی شاعری تک محدود نہیں ہے، بلکہ جدید خیالات اور جدید طرز کی شاعری میں بھی وہ خاصہ حصہ لیا کرتی ہیں، اگر ان کے کلام میں قدیم طرز کی عشق و عاشقی، گل و بلبل، شاہد و ساقی، کی داستانیں اپنی رنگین و شیریں بیانی، جدت آفرینی اور زبان کی لطافت کے لحاظ سے قابلِ ستائش ہوتی ہے، تو جدید طرز کی شاعری جو ملک اور قوم کو بیدار کرتی، مناظرِ قدرت اور نیچر کی

ترجمانی کرتی ہے، خیالات کی بلند پروازی اور جدت، زبان کی صفائی اور سادگی، اسلوبِ بیان کی ندرت اور نزاکت کے لحاظ سے قابل داد ہوتی ہے۔

عصرِ حاضر میں جن خواتینِ دکن نے شاعر کی حیثیت سے نام و نمود پیدا کیا ہے اور جن کے کلام نے کافی شہرت حاصل کر لی ہے، ان میں سے بعض کا مختصر تعارف اس موقع پر بے محل نہیں ہو سکتا اس خصوص میں سب سے پہلے ملکۂ دکن حضرت دلہن بادشاہ بیگم کا اسم گرامی پیش ہوگا جو اعجاز تخلص کے ساتھ شعر کہتی ہیں، آپ دکن کی پہلی ملکہ ہیں جو اردو میں طبع آزمائی فرماتی ہیں۔

اس کے بعد بشر النسا، بیگم بشیر، رابعہ بیگم رابعہ منظور فاطمہ بیگم سردار، رحمت بیگم اسیر نوشابہ خاتون نوشابہ، لطیف النسا، بیگم لطیف وغیرہ کا نام لینا چاہیئے جو اپنے ہمعصروں میں ممتاز حیثیت رکھتی ہیں،

بشیر کو نظم نگاری اور غزل گوئی کا بہت اچھا ملکہ ہے، ان کے کلام کا مجموعہ عنقریب شایع ہونے والا ہے، رابعہ بیگم کو فطرتی اشیا کی ترجمانی کا خاصا سلیقہ ہے، ان کی نظمیں قابلِ قدر ہوتی ہیں، اسیر اور سردار کو غزل گوئی وغیرہ میں اچھی مہارت ہے، ان کے کلام میں زبان کی لطافت اور رنگینی کے جوہر پائے جاتے ہیں، نوشابہ خاتون جامعہ عثمانیہ کی پہلی بی اے خاتون ہیں۔ ان کے کلام کا مجموعہ "موجِ تخیل" کے نام سے شایع ہو چکا ہے، نوشابہ خاتون کا کلام سوز و گداز کے لحاظ سے قابلِ ستایش ہوتا ہے، لطیف النساء بیگم نے بچوں کے لئے نظم لکھنے کی اچھی مشق کر لی ہے۔

ان کے علاوہ بیسیوں خواتین ہیں جن کی شاعری قابلِ داد اور لایق ستایش ہوتی ہے، ان کے نام بھی طوالت کا موجب ہوں گے۔

مضمون نگاری

ادب کا ایک شعبہ مضمون نگاری ہے، جو ساری ادبی کوششوں کا نچوڑ ہوتا ہے، نثر کے ذریعہ سنجیدہ اور متین مسائل سمجھائے جا سکتے ہیں، تحقیقات اور انکشافات کو واضح طور پر ذہن نشین کرایا جا سکتا ہے۔

مضمون نگاری کے بیسیوں اقسام اور بیسیوں موضوع میں، ادب کی جو گراں بہا اور بیش قیمت خدمت مضمون نگاری کے ذریعہ ہو سکتی ہے وہ ایک حقیقت نفس الامر ہے۔

خواتین دکن نے نثر نگاری کے ذریعہ اردو ادب کی جو خدمت انجام دی اور دے رہی ہیں اس کی صراحت طویل صفحات کی خواہاں ہے، اس موقع پر ہم صرف نثر نگار خواتین کے نام بھی پیش نہیں کر سکتے چہ جائے کہ ان کے کارناموں کی تفصیل کی جائے، البتہ بعض ممتاز نثر نگار خواتین کا نام لیا جا سکتا ہے جن کی ادبی خدمتیں فروگذاشت نہیں کی جا سکتیں۔

اس خصوص میں سب پہلے طیبہ بیگم مرحومہ کا نام لینا چاہیئے اگرچہ وہ آج زندہ نہیں ہیں مگر انھوں نے جو داغ بیل ڈالی تھی، جو بنیاد قائم کی تھی، وہ آج مستحکم ہو چکی ہے اور بار آور ہو کر پھول پھل رہی ہے، خوشی کی بات ہے کہ اب ادارۂ ادبیاتِ اردو کے شعبۂ نسواں کی جانب سے ان کے اعلیٰ اور بلند پایہ

مضامین کتابی صورت میں شایع ہونے والے ہیں۔

اس تفصیل میں صغرا بیگم ہمایوں مرزا کا نام لینا ضروری ہے جن کی اب تک چودہ پندرہ کتابیں مختلف عنوان کے تحت شایع ہو چکی ہیں، اور مضامین جو مختلف رسالوں میں شایع ہوا کرتے ہیں ان کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے، ان کی ادبی دلچسپی اور انہماک ہر آئینہ مستحق تقلید ہے۔

اس کے بعد جہاں بانو بیگم نقوی لطیف النسا بیگم اور سکینہ بیگم کے ناموں کی صراحت بھی ضروری ہے، جہاں بانو بیگم کے ادبی دلچسپ اور پر از معلومات مضامین دکن اور ہندوستان کے رسالوں میں تعریف کے ساتھ شایع ہوتے ہیں، رسالہ شہاب کے حصۂ نسوان کی ایڈیٹر کی حیثیت سے آپ جو ادبی خدمت انجام دے رہی ہیں وہ مستحق ستایش ہے، اسی طرح سکینہ بیگم مدیرۂ "سب رس" اور ادارۂ ادبیات اردو کے شعبۂ نسوان کے داعی کی حیثیت سے جو ادبی کام کر رہی ہیں وہ ہر طرح تعریف و توصیف کے قابل ہے۔

حیدرآباد اور ہندوستان کے زنانہ اور مردانہ رسالوں اور اخبارات میں بیسیوں خواتین دکن کے مضامین جو مختلف موضوع پر ہوتے ہیں تعریف و ستایش کے ساتھ شایع ہوتے ہیں، ان مضامین کی زبان صاف، اسلوب بیان پسندیدہ اور طرز نگارش دلچسپ ہوتا ہے، دختران جامعہ عثمانیہ اور غیر عثمانی خواتین جو نام و نمود مضمون نگاری کی حیثیت سے پیدا کر رہی ہیں وہ ایک درخشاں مستقبل کا پیش خیمہ ہے۔

ناول اور افسانے نظم سے جس طرح انسانی دل پر اثر ہوتا ہے اسی طرح دلچسپ قصے کے پیرایے میں کسی تاریخی، اخلاقی یا معاشرتی پہلو کو بیان کرنا خاص طور پر موثر ہوتا ہے، خشک فلسفیانہ مضامین سے بڑھ کر افسانے زود اثر ہوتے ہیں، انسانی فطرت اس امر کی مقتضی ہے کہ ان کے دماغ کے لئے عمدہ عمدہ غذا میسر ہو، اور ان کی دلبستگی کے لئے ایسی کہانیوں کی ضرورت ہے جن میں زیادہ تر ان کے ابنائے جنس کے واقعات اور حالات اس طرح بیان کئے گئے ہوں جو یا تو سچ معلوم ہوتے ہوں یا ایسے ہونے کی قابلیت رکھتے ہوں۔

ناول ایک فوٹو یا آئینہ ہے جس سے زمانۂ گزشتہ کے حالات اور موجودہ زمانے کے واقعات اصلی رنگ و روغن میں نظر آتے ہیں، واقعات کے انتخاب اور ان کی مناسب ترتیب سے پلاٹ بنتا ہے، اس میں حرکت، روانی اور جوش ہونا چاہیے۔

پلاٹ [illegible] ڈھانچہ ہے جن اشخاص کا اس میں ذکر ہوتا ہے ان کی پوری تفصیل اس طرح ہونی چاہیے کہ وہ انسان کی طرح چلتے پھرتے، کام کرتے، بولتے زندہ معلوم ہوں، قصے کے اشخاص کا تعلق جس زمانے اور جس مقام سے ہوتا ہے اس زمانے اور مقام کی تمام خصوصیات سے ناول نگار کو واقف ہونا چاہیے تاکہ اس وقت کے رسم و رواج تمدن اور تہذیب کا پورا پورا حال اس ناول سے معلوم ہو سکے، غرض جو قصہ ناول یا افسانے میں بیان کیا جائے وہ ہر طرح اصلی معلوم ہو، اس کا کوئی پہلو عقل کے خلاف نہ ہو۔

ان تمام امور کو پیش نظر رکھ کر جب ہم دکن کی

خواتین کے کارناموں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ناکامی نہیں ہوتی، اور ہم بہ مسرت کہہ سکتے ہیں کہ خواتینِ دکن نے اس قسم کی ادبی خدمت بھی انجام دی ہے۔

"انوری بیگم" اور "حشمت آرا" کے نام سے دو ناول ایسے پیش کئے جا سکتے ہیں جو اصلاحِ معاشرت کے لئے لکھی گئی ہیں، ان میں حیدرآباد کے تمدن، تہذیب کی سچی اور اصلی تصویر [illegible] ہے حقوقِ نسواں، تعلیمِ نسواں، پرانے توہمات و تعصبات، رسم و رواج، روزمرہ کے کام کاج، بیکار اور فرصت کے مشاغل وغیرہ امور بہت دلچسپ طریقے سے بیان کئے گئے ہیں۔

ان دونوں ناولوں کی مصنفہ مرحومہ طیبہ بیگم ہیں جن کا تذکرہ اس کے پہلے ہو چکا ہے، صغرا بیگم ہمایوں مرزا کے ناول سرگذشتِ ہاجرہ اور موہنی کا تذکرہ بھی یہاں [illegible] ہے جو [illegible] کے لحاظ سے دلچسپ اور مفید ہیں۔

مختصر افسانے موجودہ زمانہ میں مختصر افسانوں نے بڑی اہمیت حاصل کر لی ہے، اس قسم کا بڑا ذخیرہ ہر زبان کے ادبیات میں فراہم ہو گیا ہے۔ طول طویل ناول کے بجائے مختصر افسانے جو چند اوراق میں ختم ہو جاتے ہیں زیادہ پسند کئے جاتے ہیں۔

ناول اور افسانے کے لئے جو امور ضروری ہیں وہی مختصر افسانوں کے لئے درکار ہیں۔ مختصر افسانے بیسیوں عنوان اور موضوع پر لکھے جا رہے ہیں، اردو زبان میں اب اس قسم کا ادبی ذخیرہ کافی [illegible] اہم ہو گیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی اس امر کی صراحت ناگزیر ہے کہ بہترین افسانوں کی تعداد (جو ہر حیثیت سے قابلِ ستائش اور لائقِ داد ہوں) کم ہے اور چند ہی افسانہ نگار کامیاب افسانہ نگار کی حیثیت سے پیش کئے جا سکتے ہیں۔

مختصر افسانہ نگار کی حیثیت سے ہندوستان کی کئی خواتین متعارف کی جا سکتی ہیں جن میں مسز حجاب امتیاز علی کا نام اس عنوان میں سرِ فہرست ہونا چاہئے، جو دنیائے اردو میں اپنے حزنیہ افسانہ نگاری کے باعث امتیاز رکھتی ہیں، مسز حجاب کی پیدائش اور ابتدائی پرورش حیدرآباد میں ہوئی اور پھر مدراس کی سرزمین میں انھوں نے افسانہ نگاری میں امتیاز حاصل کیا ہے۔

موجودہ زمانے میں کئی خواتین مختصر افسانے قلمبند کرتی ہیں، ان کے ترجمے اور طبع زاد دونوں افسانے ہوتے ہیں، یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ خواتینِ دکن کے افسانے ہر طور قابلِ ستائش ہیں اور ان میں کوئی خامی نہیں ہوتی، اس قسم کا دعویٰ کرنا ابھی قبل از وقت ہے، البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کامیاب افسانے لکھنے کی ضرور کوشش کی جا رہی ہے، اور توقع ہے کہ آئندہ بہترین نتائج رونما ہو سکیں۔

دختران جامعہ عثمانیہ اور غیر عثمانی خواتین کے بیسیوں نام اس عنوان میں بیان کئے جا سکتے ہیں، خصوصاً جہاں بانو بیگم کا نام فراموش نہیں کیا جا سکتا، جن کے افسانوں کا مجموعہ "رفتارِ خیال" کے نام سے شائع ہو کر منظرِ عام پر آ چکا ہے۔

ڈرامے ادبیات کی ایک اہم شاخ ڈرامہ نگاری ہے، اس خصوص میں اردو زبان میں ایسا ذخیرہ بہت کم ہے جس پر فخر کیا جا سکے، اچھے ڈراموں کی شدید ضرورت ہے، خوشی کی بات ہے کہ اب پنجاب، دہلی اور حیدرآباد میں اس کی جانب توجہ کی گئی ہے۔

پنجاب اور دہلی کے قطع نظر حیدرآباد میں اس کی طرف خاص توجہ ہو چکی ہے، اب تک کئی ڈرامے لکھے گئے ہیں اور اسٹیج پر کامیاب طور پر ان کو بتایا گیا ہے، ان ڈراموں میں مولوی فضل الرحمٰن صاحب بی اے ڈپٹی کنٹرولر لاسلکی کے دو ڈرامے خصوصیت سے قابل تذکرہ ہیں جو اپنی خوبیوں کے باعث عام مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔

بعض حیدرآبادی خواتین نے بھی اس کی جانب توجہ کی ہے، اور دو چار مختصر ڈرامے لکھے ہیں، مگر یہ ڈرامے ایسے نہیں کہ ان کا تذکرہ کیا جائے، البتہ مس جیسی نندی کا نام ضرور لیا جا سکتا ہے، انھوں نے اپنے والد ڈاکٹر جارج نندی کے ایک انگریزی ڈرامہ کو اردو کا لباس پہنایا ہے، اور بمبئی ٹاکیز نے کسی قدر ترمیم کے بعد "عزت" کے نام سے اس کو فلم میں پیش کیا ہے، مس جیسی نے اس کے علاوہ بھی چند ڈرامے تصنیف کئے ہیں مگر ہنوز ان کو شایع نہیں کیا ہے۔

خطوط

ادب کا ایک جز خطوط بھی ہے، ہر زبان کے ادبیات میں اس کا بھی ذخیرہ ہوتا ہے اگرچہ آج تک عورتوں کے خطوط کا کوئی مجموعہ اردو زبان میں شایع نہیں ہوا ہے مگر بعض رسالوں میں ایسے خطوط شایع ہوئے ہیں جو ہمارے ادب کا بہترین نمونہ کہلا سکتے ہیں۔

جہاں بانو بیگم نقوی کا تعارف اس عنوان میں ضروری ہے، ان کے خطوط جو رسالہ شہاب میں اکثر شایع ہوئے ہیں ہمارے ادبیات میں گراں قدر اضافہ کا موجب ہوتے ہیں۔

آخر پر "ادارۂ ادبیات اردو" کے شعبۂ نسوان کا تذکرہ بھی نہایت ضروری ہے، جس کی صدر رابعہ بیگم، اور معتمد سکینہ بیگم، اور ارکان جہاں بانو بیگم، سارہ بیگم اور لطیف النساء بیگم ہیں، توقع ہے کہ آگے چل کر یہ ادبی ادارہ اپنے پُر جوش اور مستعد کارکنوں کی دلچسپی کے باعث خواتین دکن میں نئے خیالات نئی امنگیں پیدا کرنے میں اپنی آپ نظیر ہوگا

ہمارے اس مضمون سے اس امر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خواتینِ دکن بھی اردو ادب کی خدمت گزاری میں کسی اور ملک سے پیچھے نہیں ہیں، ان کے خدمات قابل قدر اور لایق تحسین ہیں، اور امید ہے کہ آنے والی نسل کے لئے اپنا اچھا نمونہ اور شان دار نقش چھوڑ جائیں۔

نصیر الدین ہاشمی

نذر دکن (بالتصویر) دکن کے متعلق خواتین دکن کے رشحاتِ قلم کو محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ نے خاص ذوق اور سلیقہ سے مرتب کیا ہے۔ یہ مجموعہ ایک ایسا بیش بہا تحفہ ہے جس کے مطالعہ سے عورتیں اور مرد دونوں مستفید ہو سکتے اور سرزمین دکن کے متعلق ضروری معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ اس میں صنفِ نازک کے مذاق کی نفیس تصویریں بھی ہیں صفحات ۹۴۔ قیمت مجلد عہ

من کی بتیا محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ ام اے نے اس کتاب میں متوسط طبقہ کی خواتین کی معاشرتی (و اخلاقی کمزوریوں کو بے نقاب کرکے زندگی کی تلخیوں سے کامیاب مقابلہ کرنے کے طریقے پیش کئے ہیں۔ یہ کتاب بہت ہی دلچسپ پیرایہ میں لکھی گئی ہے۔ خواتین اور خصوصاً موجودہ تعلیم یافتہ خواتین کے لئے اس کا مطالعہ بیحد ضروری ہے۔ اس کو ہر گھر میں ہر وقت موجود رہنا چاہیے۔
صفحات ۔ قیمت مجلد ۸ر

دکن کے چند کایستھ شعراء

جب انقلاباتِ روزگار نے شمال میں اردو کے لئے کوئی آسرا نہ رکھا، تو پھر یہ بیچاری اسی آغوش میں چلی آئی جہاں اس سے بہت زمانہ قبل اس کی خوب آؤبھگت ہوئی تھی۔ سرزمینِ دکن ہمیشہ سے اردو کے لئے سازگار رہی اور یہیں اس نے اپنے عہد کے خوبصورت ترین گل بوٹے نکالے چنانچہ یہ صحت بخش آب و ہوا اس کی خلط کے عین موافق تھی پھر اس کو سرسبز کرنے لگی۔

اس میں شک نہیں کہ اب یہاں سے قطب شاہوں کا وہ شفیق سایہ اٹھ چکا تھا، جس نے ایک عرصۂ دراز تک اس کو نظرِ بد سے بچائے رکھا۔ اس کی داشت و پرداخت جان سے زیادہ کی، اور صحیح معنوں میں پروان چڑھایا لیکن ان کی بجائے اسے یہاں ایک ایسے خانوادۂ علم دوست کی بارگاہ ملی جو اردو نوازی میں قطب شاہوں سے کم نہ تھا۔ انہوں نے اس نازوں کی پلی کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اپنی سرپرستی میں جگہ دی۔ اور اپنے مضبوط ہاتھوں میں اس کی حفاظت کا بیڑا اٹھایا۔ یہی وجہ ہوئی کہ تقریباً ایک صدی تک حیدرآباد کی مجلسیں عاشقانِ اردو کا جمگھٹ بنی رہیں۔ اور اس عرصے میں وہ محفلیں گرم ہوئیں جن کی یاد اودھ اور لال قلعہ کی صحبتوں سے پہلو زنی کرتی ہے۔

مولانا شبلی نعمانی۔ رتن ناتھ سرشار۔ نذیر احمد دہلوی۔ عبدالحلیم شرر۔ نواب محسن الملک۔ امیر مینائی۔ مرزا داغ اس شمع کی ضیا پاشیوں پر دور دور سے شیدا ہو کر آئے۔ دکن کی مہمان نواز زمین نے ان احباب کی یہاں بڑی قدر کی۔ دربارِ آصفی نے ان کی توقیر بڑھائی۔ اور زبردست اعزاز عطا کئے۔

اسی زمانہ میں خود اس مردم خیز ملک نے اپنے یہاں ایسے ایسے جید عالم اور بڑے بزرگ پیدا کئے جن کے فیضِ اثر سے دکن فن و ادب کا مرجع بن گیا۔ شیر محمد خاں ایمان۔ مہاراجہ چندو لال شاداں۔ حافظ میر شمس الدین فیض۔ راجہ محبوب نواز ونت باقی۔ ڈاکٹر احمد حسین مائل۔ میر احمد علیخاں عصر۔ حفیظ الدین پیام۔ تراب علی زور۔ بہاری لال رمز۔ مہاراجہ کشن پرشاد شاد۔ بچو لال تمکین، اس دور کی چند ممتاز شخصیتیں ہیں۔

یہ زمانہ سچ پوچھئے تو دکن کے ادبی مذاق کا اصل محرک ہے۔ اس لئے کہ اس عہد میں یہ بزرگ ہستیاں مذہب اور قوم کی ظاہری کسوٹی پر نہیں جانچی گئیں۔ بلکہ ملک نے انہیں اپنے ذاتی جوہر کی بنا پر پرکھا۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے دوش بدوش ہندوؤں نے بھی اس زبان کے سنوارنے میں برابر کا حصہ لیا اور کبھی تنگ نظری یا مذہبی کدورت کو اپنے سینوں میں جگہ نہ دی۔

ان لوگوں میں طبقۂ کایستھ بہت نمایاں تھا۔ اور یہ اس کے لئے کوئی نئی بات بھی نہ تھی۔ اس لئے کہ اگر حقیقت کا اظہار بے جا تعلی نہیں ہے۔ تو نہایت وثوق کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ تمدن کے ہر دور میں اور ہر زمانہ میں جب امن آشتی نے ملکوں میں فن و ادب کو تازہ کیا یہ قوم اپنی فطری قابلیت سے پیش پیش رہی۔ اور اپنی طبیعت کے جواہرِ خفتہ کو چمکایا۔

راجگان و سلاطینِ سلف کی طرح شاہانِ آصفیہ نے بھی اس فرقہ کی قابلیتوں کو پہچانا۔ اور ان کی خاص سرپرستی فرمائی۔ انہیں کسبِ معیشت سے جو ایک فن کار کے لئے دنیا میں سب سے زیادہ مانعِ ترقی ہوتا ہے تقریباً آزاد کر دیا اور موقع بموقع ان کی قدر و منزلت میں کوتاہی نہ کی۔ اس کا راست یہ اثر ہوا کہ اس قلیل عرصے میں اس گروہ میں بعض

ایسے ادیب بلیغ اور شاعر نکتہ رس پیدا ہوئے جو دکنی ادب میں ایک خاص پایہ رکھتے ہیں اور جنہیں اپنے زمانہ کے استادوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

چنانچہ اردو گو شعرائے قدیم راجہ محبوب نواز ونت باقیؔ رائے جوالا پرشاد فاضلؔ۔ راجہ سری پرشاد اخترؔ۔ رائے انبا پرشاد ہنرؔ۔ رائے ٹھاکر پرشاد نظمؔ۔ رائے شنکر پرشاد افضلؔ اور شعرائے جدید میں رائے گرسرن لال آزادؔ۔ راجہ سنگھ راج بہادر عالیؔ۔ رائے محبوب راج محبوبؔ۔ رائے سنگرو پرشاد رہبرؔ۔ رائے رگھوبیر پرشاد شوقؔ۔ فارسی گو شعراء میں بچو لال تمکینؔ۔ راجہ باقیؔ۔ راجہ لکھن لال ساقیؔ۔ رائے جوالا پرشاد فاضلؔ۔ انبا پرشاد حکمؔ وغیرہ وغیرہ قابل تذکرہ ہیں۔

ان اصحاب بزرگ کے علاوہ اور بھی ایسے بلند حیثیت شاعر گزرے ہیں جنہیں ایک تو میں اپنی کوتاہ واقفیت دوسرے عدیم الفرصتی کی وجہ سے یہاں چھوڑ رہا ہوں۔ اگر مصروفیتوں نے دم لینے دیا' تو خیال ہے کہ ایک علحدہ تذکرہ کی صورت میں اس یاد رفتہ گاں کو تازہ کیا جائے انشاء اللہ

(۱) **باقیؔ**۔ راجہ محبوب نواز ونت گردھاری پرشاد باقیؔ

راجہ باقیؔ جو اپنے زمانے کے نہایت بلند پایہ شاعر اور انشا پرداز گزرے ہیں، حضرت شمس الدین فیضؔ کے حلقۂ تلامذہ میں سے تھے۔ باقیؔ کا خاندان دکن کے ان قدیم خاندانوں میں سے ہے جو حضرت آصفجاہ نظام الملک کے ساتھ دہلی سے اورنگ آباد آیا۔ ایک عرصہ تک اورنگ آباد میں مقیم رہنے کے بعد جب رائے راجا رام ابن رائے دولت رائے کو دربار آصفی سے چھتیس ۳۶ کارخانوں کی تنقیح و نگرانی کا کام عطا ہوا' تو سنہ ۱۱۹۸ھ میں انہوں نے محلہ چندر کا پور عرف حسینی علم میں ایک مکان خریدا اور مستقل ڈیوڑھی کی بنیاد ڈالی۔ چنانچہ وہ خود اپنی کتاب "کلام متفرقات" میں اس کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں۔

"۔۔۔۔۔ از دہلی وارد دکن گردیدند چندے در شہر اورنگ آباد بود و باش ورزیدہ پس ازاں اقامت پذیر بلدہ حیدرآباد شدند رائے راجا رام بن رائے دولت رائے جد اعلیٰ راقم آثم بخدمت استیفائے تحاویل خانسامانی کہ کار تنقیح سی و شش کارخانجات سرکار آصفی میباشد در عہد نظام الملک عز امتیاز میداشتند و در سنہ یک ہزار و یکصد و نود و ہشت ہجری در محلہ حسینی علم عرف چندر کا پور یک قطعہ حویلی بجہت برائے اقامت خود خرید نمودہ مقیم شدند"

اسی ڈیوڑھی میں وہ بتاریخ یکم رجب سنہ ۱۲۴۴ھ پیدا ہوئے اس خاندان کے اکثر اراکین صاحب مناصب و خطابات ہوئے ہیں۔ چنانچہ پیشگاہ نواب سکندر جاہ بہادر۔ نواب ناصر الدولہ بہادر۔ نواب افضل الدولہ بہادر سے اس خاندان کی مسلسل عزت افزائی ہوتی رہی خود راجہ باقی تادم مرگ خدمات جلیلہ اور مناصب اعلیٰ پر سرفراز رہے۔ باقیؔ نے حضرت محمد علی صاحب عاشقؔ سے فارسی پڑھی اردو فن شعر میں انہیں حضرت شمس الدین فیضؔ سے تلمذ حاصل تھا جن خدمات پر باقیؔ فائز رہے اور اپنے فرائض جس خوش اسلوبی سے بجالاتے رہے انہیں سامنے رکھ کر یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ کس قدر مصروف انسان تھے۔ چنانچہ ان کی کثیر التعداد تصانیف اور کلام کو دیکھ کر سخت حیرت ہوتی ہے اور تعجب ہوتا ہے کہ ایسے ہی حالات میں کیا ہم سے اس کا عشر عشیر بھی ہو سکتا ہے؟

ان کی تصانیف تیس ۳۰ سے زیادہ ہیں اور یہ فارسی اردو۔ ہندی۔ تین زبانوں میں پھیلی ہوئی ہیں جب ان کتابوں کے عنوان اور مضامین پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ باقیؔ کو علاوہ فن شاعری کے کس قدر علوم و فنون میں دخل تھا۔

فن شاعری۔ عروض و قافیہ۔ انشا۔ حساب۔ حکمت۔ لغت خواص الاشیاء۔ فلکیات۔ سفرنامے۔ مذہبیات۔ بھجن۔ پوتی پران۔ یہ چند عنوان ہیں جن پر باقی نے خامہ فرسائی کی ہے

اس کے علاوہ انہوں نے رباعیات خواجہ میر درد کو اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ اردو میں خواجہ صاحب کی رباعیوں کا ترجمہ کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس لئے کہ ان رباعیات کو جو تصوف اور فلسفہ کے گراں بہا جواہر سے مالا مال ہیں۔ ایک ایسی زبان میں منتقل کرنا تھا جو فارسی کے مقابل میں ابھی بچہ ہی تھی۔ پھر بھی اس ترجمہ کو دیکھ کر یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ باقی اس باب میں کس قدر کامیاب رہے ہیں۔ مثلاً مشتے نمونہ از خروارے۔

درد

بر جرم گر اعتراف خواہی کردن ٭ دل را اے درد صاف خواہی کردن

یارب تو کریم و من گنہگار توام ٭ دانم آخر معاف خواہی کردن

باقی

مجرم ہوں اعتراف کرتا ہوں صاف ٭ کیا منہ ہے جو چاہوں میں اپنا انصاف

یارب تو کریم ہے گنہگار ہوں میں ٭ تقصیر معاف ہوگی تقصیر معاف

درد

اے جلوہ بدید یار خواہد گردید ٭ رازش ہمہ آشکار خواہد گردید

ما آئینہ ایم خود پرست است نگار ٭ ناچار دوچار خواہد گردید

باقی

اک دن دیدار یار ہو جائے گا ٭ راز اس کا خود آشکار ہو جائیگا

میں آئینہ ہوں نگار حسن پرست ٭ ناچار کبھی دوچار ہو جائیگا

درد

ہر لحظہ دریں خانہ کہ من می آیم ٭ گم کردہ رہ شناختن می آیم

چوں شعلہ کجا رسیدم منظور است ٭ پیوستہ برون خویشتن می آیم

باقی

معلوم نہیں گھر سے کہاں جاتا ہوں ٭ بھولا ہوا راستہ ہے گھبراتا ہوں

شعلہ کی طرح کہیں پہنچا ہوگا ٭ یوں آپ سے باہر جو نکل جاتا ہوں

باقی کا کلام نہایت سلیس و سادہ ہے گو بعض وقت مناسبات و رعایات لفظی پر جو اس عہد کے مذاق کا ایک نمایاں پہلو تھا، زیادہ زور دیتے ہیں۔ شعر میں ایک کے لئے چار چار مناسبتیں رکھنا، دور دور کی بندشیں، ایہام و صنعت لفظی کی بھرمار اس زمانہ کی خصوصیت تھی۔ باقی بھی اس رو سے بچ نہ سکے۔

چشم بلبل ہے بجائے دو مہر مرقد کا غلاف ٭ جس میں سب جانیں کہ عاشق تھا کسی گلرو کا

لفظ بسمل ہے بجائے بسم اللہ تھا تیرا سبق ٭ تو نے مکتب ہی میں پہلے خوں کیا استاد کا

اس کی مژگاں کا تصور نہ کر اے دل نہار ٭ کیوں تو بوتا ہے یہ اپنے لئے ناداں کانٹے

کسی کہے ہے لب شیریں کی ہمسری کی سزا ٭ جو نیشکر کے جدا بند بند کرتے ہیں

بعض وقت اسی گورکھ دھندے میں بھی وہ ایسے در ہائے مضمون نکال لاتے ہیں کہ ان کی قادر الکلامی پر یقین ہو جاتا ہے

نیم جاں خنجر قاتل سے میں تڑپا بھی ٭ بولی شمشیر نہ گھبرا ترے سر پر میں ہوں

لیکن ان کے سرمایہ سخن پر اجمالاً نظر ڈال لیجئے تو معلوم ہوگا کہ وہ اس دھارے میں ہمعصر شعرا کی طرح بہہ نہیں جاتے بلکہ سلاست و شستگی کا دامن برابر تھامے رہتے ہیں۔

ملاحظہ ہو کس قدر صاف زبان ہے۔

کہہ رہا ہے دل شیدائے شراب ٭ ہائے خم ہائے سبو ہائے شراب

میرے زخموں سے جو بھاہا اترا ٭ بن گیا پنبۂ مینائے شراب

دریا سے موج موج سے دریا نہیں الگ ٭ ہم سے جدا نہیں ہے خدا اور خدا سے ہم

عارض یار نہیں عکس فگن پانی میں ٭ گل شاداب کا پھولا ہے چمن پانی میں

یہ شعر ملاحظہ ہو۔

آپ نے لطف سے آنسو جو نہ پونچھے ہوتے ٭ دیکھتے پھر یہ مرا دیدۂ تر کیا کرتا

پھر ہے میرے قتل کو ترچھی نظر ٭ دیکھئے اے بندہ پرور دیکھئے

سلامت زبان دیکھئے۔

دل میں تو لگی ہے آگ اس کو ٭ کیوں پانی سے گھر بھار ہے ہو

سنتا ہے تمہاری کون باقیؔ + دیوانے ہو غل مچا رہے ہو

ماہ نو جھکتا ہے مجرے کے لئے + مہرباں نیچے سا اوپر دیکھئے

باقیؔ نے ماہ صفر ۱۳۱۴ھ بعارضہ وجع مفاصل بلدہ میں انتقال کیا۔

(۲) رائے جوالا پرشاد فاضلؔ

رائے جوالا پرشاد فاضلؔ سررشتہ داران سکھان راجہ موہن لال جاگیردار و خزانچی کے صاحبزادے ہیں۔ محلہ حسینی علم دیوڑھی راجہ موہن لال میں سنہ ۱۲۶۲ھ کے قریب پیدا ہوئے فارسی اور عربی کی تعلیم مولوی محمد علی عاشقؔ سے حاصل کی باوجود تحقیق کے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ شعر میں انہیں کس سے تلمذ تھا

رائے جوالا پرشاد فاضلؔ کا خاندان دکن کے نہایت قدیم اور ممتاز گھرانوں میں سے شمار ہوتا ہے ان کے والد رائے موہن لال خزانچی بڑے باسطوت رئیس ہوئے ہیں۔ ان کے نانا راجہ سری پرشاد نواب ناصر الدولہ کے اتالیق اور معتمد تھے۔ منیجی اس کے علاوہ سررشتہ سکھان بھی انہیں کے تفویض تھا۔

فاضلؔ بچپن سے ہی نہایت طباع و ذہین تھے۔ فارسی بہت کہتے تھے۔ اور لب و لہجہ میں عجمیوں سے ٹکر لیتے تھے سنا ہے کہ عربی میں بھی شعر کہتے تھے اور انہوں نے عربی میں حضرت غفران مکان کی مدح میں ایک قصیدہ بھی لکھا تھا لیکن ان کا کوئی شعر اس زبان میں میری نظروں سے اس لئے نہیں گزرا کہ ان کا تمام سرمایہ سخن استداد زمانہ اور دیمک کے نذر ہو چکا ہے۔ اور جو کچھ دو تین فارسی غزلیات۔ چند قصائد اور دو ایک اردو شعر اس بربادی سے بچ بچا کر مجھ تک پہنچ سکے ہیں وہ میرے یہاں محفوظ ہیں۔

فاضلؔ کی عربی و فارسی کی قابلیت کا اس سے پتہ چلیگا کہ حیدرآباد کی کایستھ برادری میں وہ ضرب المثل ہو چکی ہے اور اب تک والدین اپنے لڑکوں کو ان کی مثال دیتے ہیں۔

یہ چند شعر ملاحظہ میں پیش کرتا ہوں لیکن ناظرین یہ جان لیں کہ یہ شعر منتخب نہیں ہیں بلکہ ان کے خرمن سخن کے وہ چند ریزے ہیں جو زمانہ کی تباہی سے بچ رہے۔ علاوہ ازیں جہاں تک میں نے سنا ہے فاضلؔ فارسی زیادہ کہنے کے عادی رہیں۔

مدام جلتا ہوں کوئی خبر نہیں لیتا + کسی غریب کی شمع سر مزار ہوں میں
مٹا دئے سے مرے جوہر مری کدورت نے + چھپا ہوں گرد میں اپنی وہ شہسوار ہوں میں

جگہ کوئی در جاناں سے بہتر میں نہ سمجھا تھا + وہاں سے اُٹھ نہ دیگا یہ مقدر میں نہ سمجھا تھا
دن جوانی کے گئے بجھ گیا اب دل فاضلؔ + پھر کر شمع کو ہم بھی تھے ہنسانے والے

فاضلؔ نے سنہ ۱۳۳۴ف میں بعارضہ بخار بمقام جاگیر گھٹ اولی انتقال کیا

(۳) راجہ ایسری پرشاد۔ احقرؔ

راجہ ایسری پرشاد احقرؔ راجہ باقیؔ کے برادرزادے اور راجہ نرسنگھ راج بہادر عالیؔ کے عم زاد بھائی ہیں۔ احقرؔ بہت کم سن ہی تھے کہ ان کے والد رائے خوب چند کا انتقال ہو گیا۔ اس لئے ان کی تعلیم و تربیت ان کے شفیق چچا راجہ باقیؔ کی زیر سرپرستی ہوئی۔

شعر و سخن کا مذاق اس خاندان میں ایک عرصہ سے موجود تھا۔ ان کے جد رائے مہن لال ایک زبردست انشا پرداز تھے۔ جنہوں نے فن انشا پر مبسوط کتاب لکھی ہے راجہ مکھن لال ساقیؔ ایک بڑے مورخ اور شاعر گزرے ہیں انہوں نے شائد سب سے پہلے رباعیات عمر خیام کا اردو میں ترجمہ کیا۔ مزید براں تاریخ مکھن لال کے بھی یہی مصنف ہیں۔

احقر شاعری میں کھنو لال تائب لکھنوی سے تلمذ رکھتے تھے۔ لیکن راجہ باقی کی فیض صحبت کا ان کے کلام پر اثر پڑا۔

راجہ گردھاری پرشاد محبوب نواز ونت نے انہیں دفتر فوج باقاعدہ کی تنظیم پر مامور کیا تھا۔ نیز ان کے انتقال کے بعد ایک عرصہ تک احقر اسٹیٹ کا کاروبار دیکھتے رہے بدقسمتی سے جوانی میں ہی احقر کو ایک پیچیدہ مرض لاحق ہو گیا چنانچہ اسی مرض موت کی تشخیص کے لئے مدراس گئے تھے کہ سنہ ۱۳۱۸ھ میں انہوں نے وہیں داعی اجل کو لبیک کہا۔

نمونتاً چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جوشش دیدۂ گریاں کو نہیں جانتے کیا + نوح کے صدہ طوفان کو نہیں جانتے کیا
کوئی کہتا ہے فلک اسکو کوئی ابر سیاہ + دود آہ دل سوزاں کو نہیں جانتے کیا
ابرو و عارض دلدار کا مفتوں نہیں کون + ماہ نو مہر درخشاں کو نہیں جانتے کیا
میں بھی اک بندۂ احقر ہوں نمک خوار انکا + میر محبوب علی خاں کو نہیں جانتے کیا

افسوس کہ باوجود تلاش کے ان کا کلام بھی دستیاب نہ ہو سکا۔

(۴) ہنر رائے انبا پرشاد ہنر

انبا پرشاد ہنر بمقام بلدہ حیدرآباد سنہ ۱۲۷۵ف میں پیدا ہوئے۔ اس زمانہ کے حسب قاعدہ ان کی ابتدائی تعلیم خانگی مکتب میں ہوئی۔ لیکن نوعمر انبا پرشاد نے بہت جلد ہی اپنے ہم سبقوں میں امتیاز پیدا کر لیا۔ عربی و فارسی میں کافی دستگاہ حاصل کی۔ اور خطاطی میں جو قدما کے یہاں ایک مستقل فن شمار ہوتا تھا اچھی مہارت پیدا کر لی۔ چنانچہ ہنر کا دیوان جو خود انہوں نے اپنے قلم سے نہایت خوبصورت نستعلیق میں لکھا تھا حال حال تک محفوظ تھا۔ مگر افسوس کہ وہ کسی حادثہ کی وجہ سے برباد ہو گیا۔ اس لئے ان کے دو چار شعر حاصل کرنے کے لئے بھی بڑی دقت اٹھانی پڑی۔

کیوں نہ ہوا ہیبت پہ حال روئے انور آئینہ + صاف کہدیتا ہے جو کہنا ہو منہ پر آئینہ
تھی ہی رخ کی صفائی جب کہ آنکھ + کور ہو جاتا ہے پیدا کرکے جوہر آئینہ
دید رہتی ہے تمہارے روئے روشن کی نصیب + بن گیا ہے اپنے طالع کا سکندر آئینہ

ہنر پائیگاہ آسماں جاہی میں سررشتہ دار افواج تھے نیز انہیں صرف خاص مبارک سے منصب بھی ملتا تھا سنا ہے شاعری میں انہیں نواب خیرات علیخاں سخی سے تلمذ تھا۔

ہنر نے ۶۲ سال کی عمر پائی اور سنہ ۱۳۳۶ف میں بعارضہ درج مفاصل انتقال کیا۔

نظم۔ رائے ٹھاکر پرشاد نظم سنہ ۱۲۷۴ف میں بمقام بلدہ حیدرآباد پیدا ہوئے۔ ان کے آبا و اجداد بسلسلۂ ملازمت شمالی ہند سے مدراس آئے اور یہیں خاندان والاجاہ کی سلسلہ ملازمت میں منسلک ہو گئے۔ چنانچہ ان کے جد رائے سندلال مہتمم شادی خانہ نواب والاجاہ اور رئیس شہر تھے۔

جب اس خاندان کا ستارا ڈوب گیا۔ تو ان کے صاحبزادے رائے منبی دھر حیدرآباد آئے۔ جہاں انہیں بارگاہ آصفیہ سے منصب عطا ہوا۔ نظم پیشکاری سرکار عالی میں خدمت مددگاری پر مامور تھے اور یہاں ارباب اقتدار کی نظروں میں انہوں نے بحیثیت ایک متدین و منتظم عہدہ دار کے بہت جلد اپنا مقام پیدا کر لیا۔ چنانچہ بزمانۂ مدارالمہامی مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر یمین السلطنت جب صیغہ اصلاح مصارف قائم ہوا تو اس اہم صیغہ پر بطور خاص نظم کا انتخاب عمل میں آیا۔

نظم ایک نہایت ہی خوش اخلاق اور ہمدرد انسان تھے چنانچہ وہ ان معدودے چند افراد میں تھے جنہوں نے اپنی جوانی میں اصلاح قوم کا بیڑا اٹھایا اور مرتے دم تک اس پر اڑے رہے۔ ایک عرصہ تک وہ بزم تہذیب کے معتمد کی حیثیت سے علمی و ادبی خدمات انجام دیتے رہے۔ پھر آل انڈیا [illegible]

کے رکن کی حیثیت سے انہوں نے حیدرآباد کے کالیستھوں کی بہت کچھ خدمت کی۔

نہ صرف نظم میں ان کا مذاق بلند تھا بلکہ نثر پر بھی انہیں خاص قدرت حاصل تھی۔ اس عہد کا مشہور ادبی پرچہ "دبدبۂ آصفی" جو حضرت صوفی شاد کی زیر نگرانی اور ایک عرصہ تک پنڈت رتن ناتھ سرشار کے زیر ادارت نکلا کرتا تھا، انہیں کے زیر اہتمام شائع ہوتا تھا۔ اور وہ خود اس رسالہ کے لئے برابر مضامین لکھا کرتے۔ نظم کا کلام شمالی ہند کے اکثر رسالوں مثلاً مذاقِ سخن۔ بہار اودھ وغیرہ میں شائع ہوتا رہا۔ شاعری میں انہیں حضرت کھنو لال تائب سے تلمذ حاصل تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حافظ شمس الدین فیض سے بھی غائبانہ عقیدت تھی اس لئے کہ ان کے یادگاری مشاعروں میں بڑی پابندی سے شریک ہوتے اور ان کی مدح میں اکثر کچھ نہ کچھ لکھا کرتے تھے

لامکاں ہے اگر مکانِ فیض — عرش اعظم ہے آستانِ فیض
وہی دیکھا جو کہہ گئے حضرت — لبِ اعجاز تھی زبانِ فیض
اب بھی ہیں فیض یاب اہل دکن — ایسی بافیض تھی زبانِ فیض
کیوں نہ ان کی غزل ہو سلکِ گہر — کہ تھا گنجِ گہر دہانِ فیض
اٹھ گیا لطفِ شاعری اے نظم — رہ گئی لب پہ داستانِ فیض

نمونۂ کلام یہ ہے

دل لگا کر سب سے کہتے پھر رہے ہو ہم لُٹ گئے + نظم یہ بھی ہیں بھلا کوئی طریقے پیار کے
درد و غم رنج و الم نالہ و فریاد و فغاں + رات دن ان سے رہا کرتی ہے صحبت میری
خیر اتنا تو کیا جذبۂ الفت نے اثر + کہ مقرر تو ہیں وہ سب سے مرے تڑپانے کے

آزاد و رائے گردھن لی آزاد۔

آزاد کے آباواجداد غدر کے بعد بلدہ حیدرآباد آئے اور دیگر خاندانوں کی طرح یہیں کے ہو رہے ان کے والد رائے راج لی اوج بڑے اچھے شاعر اور صاحب مذاق گزرے ہیں۔ انہوں نے آزاد کی تربیت کا خاص خیال رکھا اردو فارسی کی تعلیم قابل اساتذہ سے دلوائی۔ آزاد کے جد کا تخلص توکل تھا۔ اور ان کے چچا مہابلی انور ایک بڑے بلند مرتبہ شاعر گزرے ہیں۔ اس لئے شعر سخن کا مذاق انہیں ورثہ میں ملا۔ یہ سنہ ۱۳۱۱ھ میں بمقام بلدہ دیوڑھی راجہ راجان شیوراج دھرم ونت پیدا ہوئے اور اب بھی یہیں مقیم ہیں۔

آزاد بڑے خوش اخلاق۔ بذلہ سنج اور مرنجاں مرنج آدمی ہیں۔ رباعی خوب کہتے ہیں۔ چنانچہ عمر خیام کی رباعیوں کا ایک سلیس ترجمہ الخیام عنوان سے شائع کیا ہے۔ فارسی اور اردو دونوں میں شعر کہتے ہیں۔ اور مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد کے مشاعروں میں برابر پابندی سے شریک رہتے ہیں۔ ان کی ایک مثنوی الشمس بھی جو زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہے قابل دید ہے۔ عمر خیام کی ایک رباعی کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

آغاز رواں گشتن ایں زریں طاس — انجام روانی مہ و خور کیا ہے
وانجام خرابی جنس نیک اساس — بربادی کائنات کا گر کیا ہے
دانستہ نمی شود بمعیار عقول — آتی نہیں کچھ عقل میں اپنے یہ بات
سنجیدہ نمی شود بمقیاس قیاس — جمتا نہیں ساز پر جو یہ سر کیا ہے

نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

حشر میں حشر بپا ہوگا نیا اک آزاد + بے نقاب آج وہ محشر میں چلے آتے ہیں
واعظا الجھ نہ مجھ سے کدھر کو خیال ہے + رندوں کی بات تجھکو سمجھنی محال ہے
فریب نظریہ مکان و زماں ہے + طلسمات ہے کارخانہ ہمارا

مثنوی الشمس جو ابھی ابھی چھپی ہے اپنی سلاست بیان کی وجہ سے قابل دید ہے۔ اس میں آزاد نے ایک سائنٹفک یا نیم سائنٹفک مضمون کو نظم میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔

عالیؔ راجہ نرسنگھ راج بہادر عالیؔ

راجہ نرسنگھ راج بہادر عالیؔ راجہ گردھاری پرشاد محبوب نواز ونت باقیؔ کے فرزند اکبر ہیں۔ وہ بمقام بلدہ سنہ ۱۳۰۴ھ میں پیدا ہوئے اور اپنے برگزیدہ والد کی طرح سلسلۂ خدامانِ بارگاہِ آصفی میں منسلک ہیں۔ راجہ باقیؔ کو ہمیشہ اپنی اولاد کا غم رہا۔ چنانچہ وہ اپنی زندگی بھر صدموں سے متاثر رہے۔ حسن اتفاق کہ بنارس کے ایک خدارسیدہ بزرگ سوامی بھاسکر آنند سرسوتی نے عالیؔ کے لئے دعا کی اور باقیؔ یہ ہدایت فرمائی کہ اس لڑکے کی رسم بسم اللہ اور شادی بنارس میں ہی ان کے پاس کی جائے۔ چنانچہ یہ دونوں رسمیں وہیں ادا ہوئیں۔

جب والد کا سایہ سر سے اٹھا تو عالی نہایت کم سن تھے اور ان نوعمر کاندھوں پر بڑی ذمہ داریاں تھیں چھوٹے بھائی محبوب راج کا ابھی بچپن تھا۔ اسٹیٹ نااہل کارکنوں کے ہاتھ میں چلا گیا تھا۔ اس لئے اس افراتفری میں عالیؔ نے جو کچھ بھی تعلیم حاصل کی اور اپنے برادر صغیر کی تربیت کا جس قدر بھی خیال رکھا وہ انھیں کی ہمت اور حوصلہ کا کام تھا۔

بحیثیت شاعر عالیؔ صاحب مذاق خوش فکر ہیں۔ شاعری انہیں ورثہ میں ملی ہے۔ زبان سادہ اور سلیس ہے جو بات کہتے ہیں سیدھی اور صاف۔ کلام میں لگاوٹ بناوٹ کو دخل نہیں دیتے۔

رندہ ہوش ہیں مگر کیسی ؛ کر رہے ہیں شعور کی باتیں
بت خدا بن گئے معاذ اللہ ؛ نہیں اچھی غرور کی باتیں

میں نہا دھو کے ہوا پاک ہر اک عصیاں سے
اشکِ خجلت جو مرے دیدۂ تر سے نکلا

کون کہتا ہے کہ تو خوگر بیداد نہیں
مجھ میں پہلی سی مگر طاقتِ فریاد نہیں

رفتہ رفتہ باعثِ تسکیں ہوئیں بیتابیاں
دردِ دل اتنا بڑھا بڑھ کر مداوا ہو گیا

رباعی ملاحظہ ہو۔

پوشیدہ ہے گر جلوہ عیاں تیرا ہے
کثرت ہو کہ وحدت ہو نشاں تیرا ہے

کس کے دل میں نہیں ہے تیرا مسکن
کس کے لب پر نہیں بیاں تیرا ہے۔

کلام میں تصوف کا نقش زیادہ واضح ہے اور اس کو مہاراجہ سرکشن پرشاد شادؔ جیسے صوفی کی فیض صحبت اور استاد جلیلؔ کے ذاتی اثر نے اور بھی گہرا کر دیا ہے۔ اصناف سخن میں زیادہ تر غزل اور رباعی ہیں لیکن سب میں ان کا مخصوص رنگ برابر قائم ہے۔

محبوبؔ ۔ رائے محبوب راج محبوبؔ

رائے محبوب راج محبوبؔ راجہ محبوب نواز ونت باقیؔ کے چھوٹے فرزند اور راجہ نرسنگھ راج عالی کے برادر خورد ہیں۔ وہ ایک نہایت جامہ زیب اور وجیہہ انسان تھے طبیعت نہایت شگفتہ پائی تھی۔ چنانچہ حلقۂ احباب میں اپنی بذلہ سنجی اور خوش طبعی کی وجہ سے وہ بہت ہر دل عزیز تھے۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر شادؔ انہیں انتہا سے زیادہ دوست رکھتے اور ایک منٹ کے لئے جدا نہ ہونے دیتے تھے۔

محبوبؔ سنہ ۱۳۱۲ھ میں بمقام بلدہ حیدرآباد پیدا ہوئے۔ پدرِ بزرگوار راجہ باقیؔ نے اپنے مالک مجازی کے حسبِ ارشاد

ومنشار ان کا نام محبوب راج رکھا۔ وہ بچپن سے نہایت طباع وذہین تھے۔ اس لئے انہوں نے بہت جلد مکتبی تعلیم سے فراغت پالی۔ اس کے بعد ان کو مدرسہ عالیہ میں داخل کیا گیا۔ جہاں انہیں گوناگوں حالات کی وجہ سے میٹرک کے بعد ہی تعلیم ختم کردینی پڑی۔

محبوب کے کلام کی خصوصیت ان کی زبان ہے وہ نہایت سلیس وشستہ لکھتے ہیں۔ بحریں چھوٹی چھوٹی اور بندشیں چست ہوتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کوئی اچھا داستان گو عشق ومحبت کی کہانی نہایت موثر اور چبھتی ہوئی زبان میں سنا رہا ہے۔

آفت ہیں بلائیں فتنہ گر کی ؛ کچھ خیر نہیں دل وجگر کی
تھا عشق کا مرحلہ نہ آساں ؛ سر دے کے یہ مہم ہم نے سر کی
اللہ رے درازیٔ شبِ ہجر ؛ ملتی ہی نہیں خبر سحر کی

سنبھالو میکشو اب شیشہ و جام ؛ گھٹا چھائی ہے ساون کی جھڑی ہے
گلے مل لو کہ سوزِ غم کے ہاتھوں ؛ چراغِ زندگی بس دو گھڑی ہے
قدم کیوں کر اٹھیں کوچے سے تیرے ؛ یہاں تو حسن کی مٹی گڑی ہے

مضامین اور ندرتِ بیان دیکھئے۔

جاں بلب شوقِ شہادت میں تھے ہم ؛ تیغ قاتل کی مسیحا ہو گئی
خواب میں آتے ہو پھر ہو لگاؤ شوق میں ؛ کیا پردہ ہے کہ چھپتے ہو نکل کر سامنے

ستم کا دیکھ کر انداز ہوتی ہے خوشی ہم کو
کہ ہم بھی چاہنے والوں میں شامل ہوتے جاتے ہیں

انہیں استاد فصاحت جنگ بہادر جلیل سے تلمذ حاصل تھا۔ افسوس کہ نوجوان شاعر کی عمر نے وفا نہ کی اور وہ سنہ ۱۳۵۲ھ میں بعارضہ نمونیہ عین ہنگام شباب میں اس دنیائے فانی سے رخصت ہوگئے۔

رہبر حکیم رائے ست گرو پرشاد رہبر

حکیم ست گرو پرشاد رہبر رائے بنکٹ پرشاد صاحب مرحوم منصبدار وسررشتہ دار افواج نظم جمعیت سرکار عالی کے فرزند ہیں آپ بتاریخ ۶ر صفر ۱۳۱۷ف بروز جمعہ بلدہ حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ رہبر بچپن ہی سے شاعری کی جانب مائل تھے طبیعت رسا اور فطرت رنگین پائی تھی اور چونکہ نہایت تیز ہوش طباع واقع ہوئے تھے۔ اس لئے ان کا جوہر بہت نوعمری ہی میں چمک گیا۔

حسن اتفاق کہ ان کی تعلیم علامہ عبدالرزاق نیشاپوری جیسے جید عالم کے یہاں ہوئی جو فارسی اور عربی میں اپنے عصر کی ممتاز شخصیتوں میں شمار ہوتے تھے۔ اردو ان کی مادری زبان تھی۔ اور شعر وسخن ان کے خاندان کا خاص مذاق تھا۔ اس لئے نوعمری سے ہی اس ماحول نے شاعرانہ مزاج کے لئے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔

اسنہ اور ادب سے ایک گونہ فراغت ملی تو انہیں مفید الانام ہائی اسکول میں داخل کرادیا گیا۔ جہاں انہوں نے انٹرنس تک اپنی تعلیم ختم کی اور چونکہ حکمت سے بھی طبعی لگاؤ تھا۔ اس لئے مدرسہ طبیہ سرکار عالی میں شریک ہو کر اس فن کی تکمیل کرلی۔ فن شاعری میں انہوں نے استاد عصر حضرت سید علی احمد زیرک سے تلمذ حاصل کیا۔

رہبر کایستھوں کے ایک قدیم اور معزز گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے آباؤ اجداد والاجاہانِ مدراس کے عہد میں خدماتِ جلیلہ پر فائز اور صاحب خطابات ومناصب

ہوئے ہیں۔ حیدرآباد آنے کے بعد بھی یہاں ان لوگوں کو سرفرازیوں اور اعزاز خاص سے نوازا گیا۔ یہی گزشتہ خاندانی تمکنت کی بُو باس جو رہبر کے دماغ میں اب تک بسی ہوئی ہے انھیں اہل دولت و امارت کی بے جا خوشامد اور چاپلوسی سے دور رکھتی ہے اور یہی احساس خودداری ہے جو انھیں کسی کے آگے بے محل جھکنے سے روکتا ہے۔

طبیعت نہایت غیور اور تنہائی پسند ہے۔ علاوہ منصبدار ہونے کے انھیں میز خانۂ مبارک میں منسلک خدمت ہونے کا بھی شرف حاصل ہے غزل زیادہ کہتے ہیں گو دیگر اصناف کی بھی ان کے سرمایۂ سخن میں کمی نہیں۔

اس امر کی ضرورت ہے کہ اس نوجوان شاعر نکتہ رس کے کلام کا تفصیلی تجزیہ کیا جائے۔ دیکھئے اگر موقع ملے تو اس فرض کو بجا لاؤنگا۔ رہبر کی زبان اس قدر صاف اور سلیس ہے کہ بے اختیار منہہ سے واہ نکل جاتی ہے۔

کب خوف ہجر یار نہ تھا وصل یار میں ٭ کس دن خزاں کی یاد نہ آئی بہار میں
پرہیز میکشی ہے ہو فصل بہار میں ٭ یہ احتمال رحمت پروردگار میں
کانٹوں میں ہے خلش نہ گلوں میں ہے رنگ و بو ٭ کیسی ہوا چلی چمن روزگار میں
دم گھٹ نہ جائے ضعف جنوں کچھ تو رحم کر ٭ ثابت ابھی ہے اپنا گریباں بہار میں

حرم تیرا گھر بتکدہ تیرا مسکن ٭ ہے تفریق شیخ و برہمن ہیں کیسی

زحمت اٹھاؤ کیوں نظر قہر ڈال کے ٭ رکھدوں میں آپ اپنا کلیجہ نکال کے
اے شوق فروشی عشاق مژدہ باد ٭ بیٹھے ہیں وہ تنے ہوئے خنجر نکال کے

مضمون آفرینی ملاحظہ ہو

توڑ دیتے ہے ذوق آزادی میرا قفس ٭ روح کو اس قید سے آزاد کر لیتا ہوں میں
کھینچ کے آجاتے ہیں وہ جذب تصور کے نثار ٭ ایک نیا نئے خیال آباد کر لیتا ہوں میں

یاس اور امید کا کھلونا ہے یہ دل ٭ شاد کر لیتا ہوں میں ناشاد کر لیتا ہوں میں

رُباعی میں اُن کا اپنا رنگ مخصوص ہے۔

دنیا میں بُری رہ نہ برادر چلنا ٭ ہشیار خبردار سنبھل کر چلنا
رہنا ہے اگر بزم طرب میں رہبر ٭ شیشہ کی طرح سر کو جھکا کر چلنا

شوق۔ رائے گمبھیر پرشاد شوق

رگھوبیر پرشاد شوق۔ بی۔ اے عثمانیہ بتاریخ ۱۱ ربیع الاول ۱۳۲۱ھ میں بلدہ حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ اپنے برادر بزرگوار رائے ست گرو پرشاد رہبر کی طرح فارسی اور عربی کی تعلیم اپنے خاندانی استاد علامہ عبدالرزاق نیشاپوری سے حاصل کی۔

۱۳۴۸ف میں انہوں نے جامعہ عثمانیہ سے بی۔ اے کا امتحان فلسفہ کے کامیاب کیا۔ اور دفتر پولیس بلدہ میں ملازم ہوگئے۔ انھیں عروض اور فن شعر کی تعلیم اپنے بڑے بھائی حکیم ست گرو پرشاد رہبر سے ملی۔ اور شعر و سخن کا مذاق بھی انہی کی فیض صحبت سے چمکا۔

کرشمے بھی تیرے سوز الفت کیا نرالے ہیں
کسی جا شمع بننا اور کہیں پروانہ ہو جانا

ظاہر ہیں نہاں میں عیاں ہر نہاں میں آپ
مسکن گزیں بتائیے ہیں کس مکاں میں آپ
آنکھیں ہوں گر تو گھر میں ہے لیلائے خاب قیس
کیا ڈھونڈتے ہیں نجد کی ریگ رواں میں آپ

یوں جو ہر ایک سے الجھتی ہے ۔ کس کے دامن کا خار ہے دنیا

بدقسمتی سے عرصہ ۷ سال ہوا کہ بعارضہ خلل دماغ علیل ہیں۔ ورنہ نہ جانے دکن کے اس نوجوان شاعر سے فن شعر کی کس قدر خدمت ہوسکتی۔ **مہندر راج سکسینہ**

اُردُو ادَب اور قومی شاعری

غدر کے بعد اردو شاعروں میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہوا جس نے سوچا کہ اب "حسن و عشق" کی منزلیں حد سے گذر چکی ہیں۔ مغربی سیلاب اور زمانے کا انقلاب اب اس کا مقتضی نہیں کہ وہی پرانا راگ الاپا جائے لہذا شاعری کو قوم اور وطن کی بیداری کا ایک ذریعہ بنانا چاہیئے چنانچہ حذف اور اضافے کئے گئے اور اس شاعری کو جدید شاعری سے تعبیر کیا جانے لگا۔ اس جدید شاعری کا آغاز قومی شاعری سے ہوا۔ یقینی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کی ابتدا کس زمانے سے ہوی مگر یہ کہنا بیجا نہیں کہ اس کا سنگ بنیاد حالی کے ہاتھوں رکھا گیا۔ حالی پہلے پہلے تو اسی ڈگر پر چلے جس پر شیفتہ، مجروح وغیرہ چل چکے تھے لیکن انہیں تو ایک جدید اسکول کا بانی ہونا تھا۔ اس وقت اردو شاعری نے ایک نئی کروٹ لی اور یہیں سے اس کا RENAISSANCE یعنی دَورِ نہضت شروع ہوا۔ اسلامی سلطنت کی دیا خاموش ہو چکی تھی۔ مسلمانوں کی زندگی اور سیاسیات میں ایک انقلاب کی ضرورت تھی۔ حالی نے مدس لکھی اور اپنے قوم کی زندگی میں حیات کی گرمی اور حرکت پیدا کی۔ شمع سے شمع جلتی ہے۔ حالی کی 'برکھارُت' اور 'حُبِ وطن' نے اکبر، اور چکبست، اقبال اور جوش جیسے شاعر پیدا کئے۔

اکبر نے اپنے بے شمار مزاحیہ قطعوں اور نظموں سے مغربی تہذیب کی برائیوں اور خرابیوں سے آگاہ کیا۔ چکبست نے ہندوستان کی بہار رفتہ اور عظمتِ قدیم کا ذکر کر کے عوام کے دلوں میں حس اور قوت پیکار پیدا کی۔

یہ وہ وقت تھا جب کہ ہندوستان پستی و گمراہی کی ضلالت میں گھرا ہوا تھا۔ اور ایک ایسے بڑے قومی شاعر کی ضرورت محسوس کر رہا تھا جو صحیح جادۂ اعتدال کی طرف رہنمائی کرے۔ چنانچہ قدرت نے اس کے لئے اقبال کا انتخاب کیا جس نے ہم کو نئی تہذیب کے اثراتِ بد سے آگاہ کر کے ایک شاندار مستقبل کے لئے آمادہ کیا۔ ہمارے دلوں میں ہماری ذمہ داریوں کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اسلاف کے کارنامے سنا کر ہمارے سرد اور منجمد خون میں روانی پیدا کی۔

اقبال کی قومی شاعری کو تین عنوانات کے تحت رکھا جاسکتا ہے۔

۱۔ وطنی ۲۔ اسلامی ۳۔ بین قومی

اقبال ور وطنیت:۔ اقبال نے جب آنکھ کھولی اس وقت ہندوستان مغربی طرزِ تمدن اور مغربی افکار و آرا سے آشنا ہوتا جا رہا تھا۔ بہتیرے ناعاقبت اندیش اس رو میں بہہ گئے اور مغرب کی اندھی تقلید میں اپنا مشرقی ناموس کھو دیا۔ یہ ماحول تھا جو اقبال کی شاعری پر اثر انداز ہوا اور اقبال کو وطنیت کی رَو میں بہالے گیا۔ بانگِ درا کا صفحہ صفحہ اسی ماحول کا پرتو ہے "بانگِ درا" کھولتے ہی پہلی نظم جس پر نظر پڑتی ہے ہمالیہ ہے۔ ہندوستان کا بچہ بچہ اسے جانتا اور فخر کرتا ہے۔ یہ نظم قطع نظر بلندی تخیل اور جدتِ تشبیہات کے ایک اچھوتا پیغام دلوں تک پہنچاتی ہے اور اس کے لفظ لفظ سے 'حُبِ وطن' کی بو آتی ہے پھر جوں جوں ہم آگے بڑھتے ہیں اس کی مہک بڑھتی جاتی ہے۔ چند صفحوں کے بعد "صدائے درد" کے عنوان سے ایک چھوٹی نظم ہے۔ شاعر شدت دردِ دل سے چیخ اٹھتا ہے اور اپنے ملک کی بدنصیبی پر آنسو بہاتا ہے۔

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے

ہاں ڈبو دے اے محیطِ آبِ گنگا تو مجھے
سرزمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے

لذتِ قربِ حقیقی پر مٹا جاتا ہوں
اختلاطِ موجۂ و ساحل سے گھبراتا ہوں

پھر ایک اور نظم تصویر درد ہے جس میں شاعر نے دل کھول کر اپنے وطن کا مرثیہ پڑھا ہے۔

رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا
لکھا کلکِ ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

چند ہی ورق اُلٹنے کے بعد ترانہ ہندی آتا ہے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اُس کی یہ گلستاں ہمارا

اس نظم کو وہ مقبولیت حاصل ہے جو شاید ہی کسی دوسری نظم کو ہوئی ہو اور قومی گیت کی حیثیت سے چھوٹے بڑے خاص و عام سب کی زبان پر جاری ہے۔ اس کا ایک ایک شعر حُبِّ وطن میں رنگا ہوا ہے۔ اس کے ختم ہوتے ہی نیا شوالہ ہے۔

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو بُرا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

اس کے ہر شعر میں حب وطن کی آگ بھری ہوئی ہے۔ اس میں ایک ایسے نئے شوالے کی تعمیر کی طرف اشارہ ہے جہاں پرستارانِ وطن کا سر جھک جائے۔

سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں

اور پھر یہیں سے عالمگیر محبت اور اتحاد کی بنیاد قائم ہو۔ نئے شوالے کے ساتھ ہی اقبال کی وطنی شاعری ختم ہو گئی۔ بعد میں یہ ہندی نغمہ روز بروز دھیما پڑتا گیا اور آخر میں عجمی خم اور حجازی بادہ ہی رہ گئی۔

اقبال اور اسلامیات:۔ قوموں میں ایک نہ ایک ایسا وقت آتا ہے جب اس کے افراد اپنے آپ کو منصب انسانیت سے گرا کر ضلالت و گمراہی میں ڈال دیتے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں پر بھی ایک ایسا دور آیا کہ ان کی انسانیت اپنے مرکزِ اصلی سے ہٹ کر اوہام و خرافات کی اندھیری اور پیچ بہ پیچ وادیوں میں اِدھر اُدھر بھٹکنے لگی۔ اقبال نے اسے محسوس کیا اور اپنی شاعری کا رخ جس کا آغاز وطنیت سے ہوا تھا اسلام کی طرف پھیر دیا۔ مسلمانوں میں ایک نئی روح ڈال دی اور ایک ایسا صُور پھونکا کہ اکثر اٹھ بیٹھے اور جو نہ اٹھے وہ کم از کم چونک تو ضرور پڑے جس کا احساس اُسے خود بھی ہوا اور وہ پکار اٹھا۔

عجم از نغمہ ام آتش بجان است ؛ صدائے من درائے کاروان است

اقبال کے کلام کا بڑا ذخیرہ اسلامیات کے متعلق ہے۔ اقبال نے اسلامی شاعر کی حیثیت سے مذہب و ملت کی بڑی خدمات انجام دیں۔ اس صنف کی ابتدائی نظمیں بحد پُر جوش اور ولولہ انگیز ہیں۔ 'شکوہ' اور 'جواب شکوہ' اسی رنگ کی مخصوص نظمیں ہیں۔

یورپی اقوام نے قومیت کی ساری بنیاد وطن پر رکھی جس کا

نتیجہ یہ ہوا کہ خود غرضی اور جنگ و جدال نے انسانوں سے سکھ اور شانتی کو چھین لیا۔ اقبال نے بتایا کہ افراد قوم اور انسانی سیرت کی صحیح تجدید صرف اسی وقت ہو سکتی ہے جب انسان جغرافی حدود سے پرے نکل جائے یعنی انہوں نے بتا دیا کہ ملتِ اسلامیہ کی بنیاد وطن پر رکھنا درست نہیں۔

آن چناں قطع اخوت کردہ اند ؛ بر وطن تعمیر ملت کردہ اند

مردمے اندر جہاں افسانہ شد ؛ آدمی از آدمی بیگانہ شد

روح از تن رفت و ہفت اندام ماند ؛ آدمیت گم شد و اقوام شد

کوئی قوم جب تنزل اور انحطاط کی طرف مائل ہوتی ہے تو اس کے علمی قوی شل ہو جاتے ہیں اور وہ ساتھ ہی ساتھ اپنی تمام خصوصیتوں اور روایتوں کو ذلیل سمجھنے لگتی ہے۔ اقبال نے اسلام کی بلند و برتری کی ایسی تشریح کی کہ غیر تو غیر خود اپنے بھی حیران رہ گئے کہ واقعی ہمارا اسلام اتنا ارفع و اعلیٰ ہے اور ہمارا یہ رتبہ ہے۔

ترا جوہر ہے نوری پاک ہے تو ؛ فروغ دیدۂ افلاک ہے تو

ترے صیدِ زبوں افرشتہ و حور ؛ کہ شاہین شہ لولاک ہے تو

بعض وقت اقبال کے اندر ایک ایسے سخت قسم کا فرقہ وارانہ رجحان (Communalistic Tendency) پیدا ہو جاتا ہے جو بڑھتے بڑھتے "جہاد فی سبیل اللہ" تک پہنچ جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں بانگ درا کی نظمیں "بلال" "ایک حاجی مدینے کے راستے میں" اور ضرب کلیم کی "جہاد" "اسلام"۔ "مسلمانوں کا زوال" اور "ہندی اسلام" پیش کی جا سکتی ہیں۔

نظم "اذان" کے دو شعر ملاحظہ ہوں کتنے اثر آفریں ہیں۔ یہ نظم اقبال نے قرطبہ (اسپین) میں لکھی تھی۔

سنی نہ مصر و فلسطیں میں وہ اذاں میں نے
دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشۂ سیماب

ہوائے قرطبہ شاید یہ ہے اثر تیرا
مری نوا میں ہے سوز و سرور عہدِ شباب

اقبال اور بین قومی تاثرات:۔ اقبال نے ان مسائل پر بھی روشنی ڈالی ہے جن کا تعلق نہ تو ان کے وطن سے ہے اور نہ ان کے مذہب اسلام سے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے جو نظمیں کہی ہیں وہ زیادہ تر "ضرب کلیم" میں پائی جاتی ہیں مثلاً "نپولین کے مزار پر" اور "مسولینی" وغیرہ ہیں۔

بین قومی سیاسیات پر اقبال نے جن افکار کا اظہار کیا ہے ان میں شاعرانہ تخیل کے ساتھ انسانیت کا شرف بھی بدرجۂ اتم موجود ہے "بالشویک روس" "ابی سینا" "مسولینی" "سیاساتِ فرنگ" "جمعیت اقوام" اور مشرق قابل ذکر ہیں۔ مسولینی پر اقبال کی نظم بال جبریل میں بھی ہے اور ضرب کلیم میں بھی۔ موخر الذکر نظم "مسولینی" میں انھوں نے مسولینی کی تعریف تو نہیں کی لیکن معترضین یورپ پر ایک زبردست اعتراض ضرور کیا ہے۔

کیا زمانے سے نرالا ہے مسولینی کا جرم
بے محل بگڑا ہے معصومانِ یورپ کا مزاج

میرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم
تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے زجاج

پردۂ تہذیب میں غارتگری، آدم کشی
کل روا رکھی تھی تم نے میں روا رکھتا ہوں آج

اقبال نے دول یورپ کی پکار اور چیخ کی حقیقت خوب سمجھی تھی وہ نفسیات یورپ کے ماہر تھے۔ خونریزی اور بدامنی کو روکنے کی خاطر جمعیت اقوام قائم کی گئی اور دنیا نے یہ یقین کر

طور پر سمجھ لیا کہ اب امن ہی امن رہے گا۔ لیکن اقبال سیاستِ
افرنگ کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھے انہوں نے
اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دوزے چند
بہرِ تقسیمِ قبور انجمنے ساختہ اند

زمانہ جانتا ہے کہ اقبال کی پیشین گوئی حرف
بہ حرف کتنی درست ثابت ہوئی۔ واقعات نے بتا دیا کہ
اربابِ سیاست کی عیاریوں کے سامنے اس کی کچھ نہیں
چل سکتی ۔ آج ہماری یہ "امن کی دیوی" کس کس مپرسی
کی حالت میں دم توڑ رہی ہے۔

بے چاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے
ڈر ہے خبرِ بد نہ مرے منہ سے نکل جائے

اقبال کی شاعری کا چراغ گل ہوتے ہوتے یہ قومی
شاعری عوام میں بھی آ چکی تھی۔ لہذا اس میں نئی شاخوں اور
نئی راہوں کا اضافہ ہوا۔ مفلس اور بے روزگاروں کی
زندگی پر تنقید اور تبصرے ہونے لگے۔ نظموں کے ذریعہ
مزدور، کسان اور سرمایہ داروں کی کشاکش کا معمہ سلجھانے
اور بیان کرنے کی کوشش کی جانے لگی۔ طبقۂ کسان اپنی
جہالت، بے مائگی کے سبب سوسائٹی میں خواہ کتنا ہی ذلیل
کیوں نہ ہو پھر بھی اس حقیقت سے گریز نہیں کہ اسی کی ذات پر
ہماری ساری طمانیت اور شادمانیِ حیات کا دار و مدار ہے
اقبال نے اس مقدس طبقہ کی طرف ہندوستان کی توجہ
منعطف کرائی تھی۔

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

جوش، سیماب، احسان دانش نے بھی اپنے قدم
بڑھائے ۔ محل سے نکل کر جھونپڑوں میں چراغ جلائے۔
مفلسوں کی زندگی پر روشنی ڈالی ۔ کسان کی بدحالی پر دنیا کو
ہمدردی کے لئے مائل کرنا شروع کیا ۔ اس سلسلہ میں
جوش کا قدم سب سے آگے ہے ۔ جوش کی ایک نظم
کسان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

جھٹ پٹے کا نرم رو دریا، شفق کا اضطراب
کھیتیاں، میدان، خاموشی، غروبِ آفتاب

یہ سماں اور اک قوی انسان یعنی کاشتکار
ارتقا کا پیشوا، تہذیب کا پروردگار
خون ہے جس کی جوانی کا بہارِ روزگار
جس کے اشکوں پر فراغت کے تبسم کا مدار

دوڑتی ہے رات کو جس کی نظر افلاک پر
دن کو جس کی انگلیاں رہتی ہیں نبضِ خاک پر

دھوپ کے جھلسے ہوئے، رخ پر مشقت کے نشاں
کھیت سے پھیرے ہوئے منہ گھر کی جانب ہے رواں
ٹوکرا سر پر، بغل میں پھاوڑا، تیوری پہ بل
سامنے بیلوں کی جوڑی، دوش پر مضبوط ہل

قطع ہوتی ہی نہیں تاریکیِ حرماں سے راہ
فاقہ کش بچوں کے دھندلے آنسوؤں پہ ہے نگاہ
پھر رہا ہے خونچکاں آنکھوں کے نیچے بار بار

گھر کی ناامید دیوی کا شباب سوگوار
سیم وزر، نان ونمک، آب وغذا کچھ بھی نہیں
گھر میں ایک خاموش ماتم کے سوا کچھ بھی نہیں
ایک دل اور یہ ہجوم سوگواری ہائے ہائے
یہ ستم اے سنگدل سرمایہ داری ہائے ہائے

اسی عنواں پر سیماب اکبرآبادی کے بھی چند اشعار دیکھئے۔ مزدور کی حالت کا نقشہ کس فطری انداز میں کھینچا گیا ہے

گرد چہرے پر پسینہ میں جبیں ڈوبی ہوئی۔
آنسوؤں میں کہنیوں تک آستیں ڈوبی ہوئی
پیٹھ پر ناقابلِ برداشت اک بار گراں۔
ضعف سے لرزی ہوئی سارے بدن کی جھریاں
ہڈیوں میں تیز چلنے سے چٹخنے کی صدا
درد میں ڈوبی ہوئی مجروح ٹخنے کی صدا

جا رہا ہے جانور کی طرح گھبراتا ہوا۔
ہانپتا، گرتا، لرزتا ٹھوکریں کھاتا ہوا
مضمحل واماندگی سے اور فاقوں سے نڈھال
چار پیسے کی توقع سارے کنبے کا خیال
ایک لمحہ بھی نہیں فکر معیشت سے نجات
صبح ہو یا شام، ہے تاریک اس کی کائنات
دیکھ اے قارونِ اعظم دیکھ اے سرمایہ دار
نامرادی کا مرقع بے کسی کا شاہکار
گو ہے تیرے ہی طرح انسان پر مٹھو ہے۔
دیکھ اے دولت کے اندھے سانپ یہ مزدور ہے

صرف کسان اور مزدور ہی نہیں بلکہ غریبوں کے وہ طبقے بھی جو باوجود بے انتہا کارآمد ہونے کے اب تک بے توجہی کے شکار تھے اور کس مپرسی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کو ہمارے وطن پرست شعراء نے نہایت دل کش پیرائے میں ملک کے سامنے پیش کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں بعض شعراء، مثلاً احسان دانش کو اتنا انہماک ہو گیا ہے کہ انہوں نے ایسے ہی طبقے کو اپنا موضوع شاعری بنا لیا ہے۔ انکی ایک نظم "خانہ بدوش" کے کچھ اشعار دیکھئے۔

میداں کے صاف سینے پہ آبادیوں سے دور
ٹھہرا ہوا ہے خانہ بدوشوں کا کارواں
ان کا کسی کو شہر میں رہنا نہیں پسند، دشمن ہے گر زمیں تو مخالف ہے آسماں
تاریخ ہند کے یہ پریشان سے ورق، یہ بیادسی ضعیف تمدن کی داستاں
برباد ہیں ذلیل ہیں رسوا ہیں خوار ہیں، القصہ جنگلوں میں بھی ملتی نہیں اماں
جن کے مکاں پہ فتح کے پرچم تھے موج ریز
وہ پھر رہے ہیں سر پہ اٹھائے ہوئے مکاں

الطاف مشہدی کی ایک انقلابی نظم "قربانی" کے بھی چند اشعار ملاحظہ ہوں

جونہی مدد کو پکارے گا میرا پیارا وطن۔
سرور و کیف میں ڈوبی ہوئی ملاقاتیں
فسوں نواز جوانی کی رازداں راتیں
گلے کو چومنے والی حسیں تریں باہیں
دیارِ دوست کی مخمور و دلنشیں راہیں
کسی کی ہوشربا و جنوں فروش نگاہ
ہماری پاک محبت کا اولین گناہ
وطن کے نام پہ سب کچھ نثار کرتا ہوا
دیارِ ہند کو وقفِ بہار کرتا ہوا
خوشی سے جھومتا، گاتا، گرجتا، آؤں گا
مثالِ ابر زمانے پہ گھر کے چھاؤں گا
جونہی مدد کو پکارے گا میرا پیارا وطن۔

علی احمد (عثمانیہ)

مشاہدے

کئی سال بعد راقم کو شمالی ہندوستان میں سفر کرنے کا موقع ملا۔ اُس چند روزہ سفر کی بعض باتیں یاد رہ گئیں اور اس امید میں میں ان کو قلم بند کر رہا ہوں کہ وہ شاید بعض لوگوں کی تفریحی مطالعہ کی مستحق ہوں' یا ان لوگوں کے لئے کام کی باتیں ثابت ہوں جنہیں ادبیات اور تمدن سے دلچسپی ہے۔

سب سے زیادہ جس چیز سے مجھے ناگوار حیرت ہوئی وہ شمالی ہند کی مغرب زدگی اور انگریزیت پسندی ہے چنانچہ خاص دوآبے میں جو نہ صرف ہندستانی تہذیب و تمدن کا گہوارہ بلکہ اردو کا وطن ہے اور کئی ہندستانی زبانوں اور تمدنی تحریکوں کا سرچشمہ ہے معمولی معمولی لوگ بلا وجہ انگریزی لفظوں کا استعمال کرکے اپنی مغرب زدگی کا ثبوت دیتے ہیں۔ خیال تھا کہ ادھر دس بارہ برس سے ہندستانی زبانوں کا عروج ہو رہا ہے کئی صوبوں میں کانگریسی حکومت قائم ہو گئی ہے ممکن ہے کہ حالات کچھ بہتر ہو گئے ہوں' لوگوں کی معاشی اور مالی حالت کے ساتھ (خیال ہوا کہ) شائد زبان بھی سنبھل گئی ہو۔ مگر یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوا کہ تمدنی اور زبانی نقطۂ نظر سے ہم میں احساسِ کمتری کے متعدد آثار پائے جاتے ہیں، اور ہم اس ضبط کی وجہ سے اپنی ذاتی تذلیل کر رہے ہیں۔ آپ مانیں یا نہ مانیں میں تو اپنی آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی باتیں لکھ رہا ہوں اور میرا مقصد اظہار حقیقت اور دعوتِ اصلاح ہے نہ کہ دل آزاری یا وعظ پسندی

تاج محل کے ایک موروثی خادم کو میں نے کسی دوسرے شخص کو کہتے ہوئے سنا کہ :-

" وہ اس ٹری کے پرے ہے"!

ٹری ؟ ؟ ؟ عجب ! ! یہ کیا ؟ ؟ . . . . درخت ! !

جس ملک کے چھوٹے بڑے سب اسی خبط میں مبتلا ہوں کہ بے وجہ انگریزی لفظوں کا استعمال کرکے اپنی ادھوری تعلیم کا رعب گانٹھیں تو پھر اُن کم سمجھ اَن پڑھوں کا کیا قصور اگر انہوں نے بھی اپنی قابلیت جتانے کے لئے دو چار انگریزی لفظ سیکھ رکھے ہوں۔ ؟

ایک "خان بہادر" کے ہاں مہمان تھا۔ ان کے ایک ملاقاتی سوٹ پوش' گلوری چباتے ہوئے۔ موٹر سے اترے' رسمی طور پر میرا بھی تعارف کرایا گیا۔ ان میں باتیں ہونے لگیں۔ میں ایک خاموش سننے والے کی حیثیت سے مجبوراً بیٹھا رہا۔ گھر کی بیماری اور عدم فرصت کا ذکر ہوا ایک نے کہا :-

" میری وائف کو اِن دنوں بہت کام تھا اور وہ آپ کے ہاں ملنے نہ آسکیں"۔

جواب ملا :-

میری وائف کو بھی ملنے کا بہت اشتیاق ہے۔

نہ جانے . . . . میں سمجھتا تھا کہ یہ صرف دکن کے مغرب زدہ خبطیوں کا شیوہ ہے کہ بیوی کو بیوی کہتے انہیں شرم آتی ہے . . . . . وائف کہتے شرم نہیں آتی مگر اب معلوم ہوا کہ وندھیاچل کے پرے بھی مغربیت کا اندھا جنون روزمرہ کی گفتگو کو غارت کر رہا ہے۔

لاہور میں غضب کی سردی تھی مگر پنجابیوں کے

حسنِ سلوک اور ان کی مہمان نوازیوں نے دل میں اتنی گرمی اور جان میں اتنی تازگی پیدا کی کہ بیرونی سردی زیادہ اثر نہ کر سکی۔ مختلف طبقوں کے لوگوں سے ملنے کا موقع ملا وہاں والوں کے حسن سیرت کو دیکھ کر اپنوں کے متعلق جو مغالطہ تھا وہ دور ہو گیا۔ پنجاب کے وزیر اعظم سر سکندر حیات خاں اور وزیر داخلہ خضر حیات دولتانہ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ کھدر پوش راجہ صاحب محمود آباد کے درشن نصیب ہوئے۔ پنجابیوں کی پگڑیاں بڑی بانکی ہوتی ہیں۔ ان لوگوں کی جسمانی صحت اور سڈول بدن پر یہ طرے اور بھی زیادہ بانکے معلوم ہوتے ہیں حسن صحت، حسن صورت اور حسن سیرت کے اعتبار سے پنجابیوں میں متعدد خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ اردو نوازی، اچھی طباعت، خوشنویسی، اعلیٰ کتابت اور عمدہ جلد سازی میں لاہور سے بڑھنا تو بڑی بات ہے کوئی اس سے ہمسری بھی نہیں کر سکتا۔ غالبؔ کے دیوان کے جیسے عمدہ مصوّر اور خوشنما اڈیشن پنجاب نے شائع کئے ہیں، وہ نہ صرف اردو بلکہ سارے ہندستان کے لئے قابل فخر ہے۔

حیدرآبادی "تانگا" اور جھٹکا متوسط طبقے کی عام سواریاں ہیں جو آگرہ اور اودھ کے تانگوں اور اکوں سے زیادہ تکلیف دہ اور بدنما ہیں۔ قاضی پیٹھ سے ورنگل تک خاصہ ۸۔۱۰ میل کا فاصلہ ہے۔ مجبوراً اسی جھٹکے میں بیٹھا جا رہا تھا۔ مجھے جلدی تھی، جھٹکا خراب تھا، راستہ بدتر تھا۔ ٹٹو کمزور تھا اگر انعام کی توقع اور پیسہ کی لالچ کسی طرح چابک کو تھمنے نہیں دے رہی تھی اور جھٹکا مقابلتہً تیز رفتاری سے جا رہا تھا۔ چابک کی آواز، پتھریلی سڑک پر پہیوں کی گڑگڑاہٹ اور جھٹکے بان کی صدائیں خاصہ لطف دے رہی تھیں شہر کے قریب ایک دیسی صاحب بہادر سوٹ بوٹ پہنے چلے جا رہے تھے۔ جھٹکے والے نے ملائم لہجے میں کہا

" چلئے صاحب! ہٹئے جناب!"

تھوڑی دیر بعد ایک سفید پوش صاحب' کاندھے پر رومال ڈالے راستہ سے گزر رہے تھے۔ جھٹکے والے نے صاف آواز میں کہا۔

" چلو صاحب! ہٹو میاں!"

چوراہے کے قریب ایک شخص ننگے پیر، معمولی لباس پہنے، دکھائی دیا۔ جھٹکا گزرنے سے پہلے ہی وہ جا سکتا تھا مگر جھٹکے والے نے زور سے کہا۔

" سرکو جی! دیکھتے نہیں ہو؟"

ذرا آگے بڑھتے ہی ایک غریب کمل پوش نظر آیا وہ بھی راستے سے گزرنا چاہتا تھا۔ اسے دیکھ کر جھٹکے والا آپے سے باہر ہو گیا اور اس نے للکار کر کہا۔

"ہٹ بے! اندھے!!"

وہ بیچارہ سہم کر خاموش ہو گیا اور اس طرح آنکھ بچا کر نکل گیا گویا اس نے کوئی جرم کیا تھا اور سزا سے بچ گیا! ان کی مرعوبیت ان کی سب سے بڑی کمزوری ہے اسی ایک مثال سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہماری معاشرت کس طرح مختلف طبقوں میں منقسم ہے اور ان مختلف طبقوں کے افراد کے ساتھ جھٹکے والے بھی کس طرح سلوک کیا کرتے ہیں۔

ہمیشہ بریجاں

ہندوستان کی زبان

نوا را تلخ ترمی زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی!

ہندوستان جو گئے ایام میں جنت نشان کہلاتا تھا اب اس کو اگر غلامستان کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا۔ غلامستان محض اس لئے نہیں کہ اس ملک پر ایک مدت سے بدیسی لوگ حکمران ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ ہندوستانی کہلانے والوں کی ذہنیت کچھ اس قدر پست ہوگئی ہے کہ یہاں سوائے ذلت اور ادبار کے اب اور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ ایک جھگڑا ختم نہیں ہونے پاتا کہ محبانِ وطن اور قوم پرست بزرگ دوسرا کھڑا کر دیتے ہیں۔

اس ملک کی سب سے بڑی بدقسمتی تو یہ ہے کہ یہاں چپہ چپہ پر مختلف مذہب و ملت کے لوگ آباد ہیں۔ کوئی آج سے نہیں بلکہ روزِ ازل سے غلامی، فرقہ بندی، اور قومی بغض و عناد نے اس ملک والوں کو یار و اغیار کی نگاہوں میں رسوا کر دیا ہے۔ اور رہی سہی کسر اس زبان کے سوال نے پوری کر دی ہے۔ خدا بخشے! شاعرِ مشرق نے کیا خوب کہا ہے کہ ؎

اُجاڑا ہے تمیزِ ملت و آئیں نے قوموں کو

مرے اہلِ وطن کے دل میں کچھ فکرِ وطن بھی ہے

بہت ممکن تھا کہ ہندوستان کے رہنے والوں میں نہ کہیں اخوت نظر آتی نہ ہمدردی پائی جاتی نہ لوگوں میں میل ملاپ ہوتا ایک کی ٹاکر دوسرے سے علیحدہ ہی رہتی۔ لیکن قدرت کو چونکہ کچھ بھلے دن بھی دکھانے تھے اس لئے اس نے ہندوستان والوں کو آپس میں شیر و شکر کرنے کے لئے ایک ایسی زبان پیدا کر دی جس کی طفیل یہاں کچھ یک رنگی سی نظر آنے لگی۔ اس کے ساتھ کچھ روزمرہ کی ضروریات بھی اس امر کی مقتضی تھیں کہ کوئی ایسا طریق اختیار کیا جائے جو سب کے لئے آسان اور قابلِ قبول ہو۔ تو جناب! یہ مشکل اردو زبان نے حل کر دی۔ اردو زبان کی نشو و نما ہندو اور مسلمان دونوں کے ہاتھ سے ہوئی، اور دونوں نے مل کر اسے عروج پر پہنچایا اور آج بلادِ مشرق میں اردو کو وہی حیثیت حاصل ہے جو مغربی ممالک میں فرانسیسی زبان کو۔ اردو زبان کی افادیت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ہر دور میں ہندو اور مسلمان ادبا اور شعرا اس کی ترقی کے لئے کوشاں رہے ہیں اور آج بھی جب کہ زبان کا جھگڑا ہندو قوم کے رہنماؤں کی تنگ نظری کی بدولت ایک ناگوار کشیدگی کی صورت اختیار کر رہا ہے اردو زبان کے ہندو ادبا اور شعرا اس کی خدمت سے غافل نہیں۔

خیال تو کیجئے کہ ایک ایسے ملک میں جہاں مختلف الخیال لوگ آباد ہوں، جہاں فرقے فرقے کا مذہب علیحدہ ہو، رسم و رواج بھی الگ الگ ہوں، جن کی تہذیب اور تمدن میں زمین اور آسمان کا فرق ہو، جو اپنے قومی اور سیاسی مفاد کے لئے علیحدہ علیحدہ اکھاڑے بنا رہے ہوں، لیکن جہاں تک زبان کا تعلق ہے ملک کی اکثریت ایک زبان بولنے یا سمجھنے والی ہو تو اس سے زیادہ اس زبان کی ہمہ گیری کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ اس گئے گزرے زمانے میں لے دے کر ایک زبان ہی تو ایسی چیز ہمارے پاس ہے جس سے ہمارا آپس میں کچھ میل جول نظر آ رہا ہے۔ ورنہ خود غرضی اور قوم پرستی کا جو خوفناک حربہ یارانِ وطن استعمال

کر رہے ہیں اس نے تو کبھی کے اس نازک رشتے کو بھی مٹا دیا ہوتا۔ اور لطف یہ ہے کہ اردو زبان کو مٹانے والے وہی محترم ہستیاں ہیں جو ہندوستان کی آزادی کی علم بردار بنی پھرتی ہیں۔ اور ہندو مسلم اتحاد کی خواہاں ہیں، علامہ اقبال علیہ الرحمہ کیا خوب فرما گئے ہیں ؎

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

مجھے اس وقت یہ بتلانا مقصود نہیں کہ اردو زبان بنی کیسے۔ مجھے تو کچھ اس کے متعلق عرض کرنا ہے کہ اردو زبان پر اعتراض کرنے والے کون بزرگ ہیں اور اس کی تہہ میں کونسا جذبہ کارفرما ہے۔

اردو زبان پر اعتراض کرنے والے صرف ہمارے ہندو دوست ہیں۔ ان میں سے کچھ تو مذہب کی آڑ لے کر اردو پر برس رہے ہیں اور کچھ وہ لوگ ہیں جو ہندوستان میں رام راجیہ قائم کرنے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ ان دونوں قسم کے لوگوں کی تنگ نظری اور فرقہ پرستی اب اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ انہی کے اکثر بھائی بندان کی اس قسم کی تفرقہ انگیز چالوں سے متنفر نظر آنے لگے ہیں۔ ہندوؤں کے سوا ہندوستان کی کسی دوسری قوم نے اردو کے خلاف آواز نہیں اٹھائی۔ بنگالی زبان کا اردو کے بعد ہندوستان میں دوسرا درجہ ہے۔ بنگالی میں علم و ادب کا بھی ایک گراں قدر ذخیرہ موجود ہے بنگال والوں نے بڑے نامور ادیب، شاعر اور باکمال آدمی پیدا کئے ہیں لیکن اردو کے خلاف آج تک اس قوم نے کبھی کسی قسم کی ناپاک کوشش نہیں کی بلکہ اکثر بزرگ اس کوشش میں ہیں کہ بنگال میں بھی اردو زبان کا رواج عام ہو جائے۔ جس طرح اردو کئی ایک زبانوں کے ملاپ سے بنی ہے اسی طرح بنگالی زبان میں فارسی اور عربی کے بہت الفاظ ملتے ہیں جنھیں بنگالیوں نے اپنا لیا ہے۔ جیسے روز کی بجائے "روج"۔ کباب کی بجائے "کاباب"۔ جانور کی بجائے "جنور"۔ یا کاریگر کا "کاری گور" یا مزدور کا "موجور" یا ہفتہ کی بجائے "ہوپتا"۔ اسی طرح عربی کے الفاظ دیکھ لیجئے کس طرح بنگالی بن گئے ہیں۔ ناقص کا "ناکس"۔ غسل کا "گسل" توقع کا "توکو" ضبط کا "جبت" مضبوط "مجبوت" حضور کا "ہجور" وغیرہ وغیرہ۔

اسی طرح مرہٹی، گجراتی یا تلنگی بولنے والوں کی طرف سے بھی کبھی اس قسم کا مطالبہ یا خواہش نہیں کی گئی۔ یہ سودا صرف ہمارے ہندو دوستوں کے سر میں سمایا ہے گو اس فرقے کے اکثر سمجھ دار بزرگ اس تحریک کے خلاف بھی ہیں اور آواز محض گاندھی صاحب کے تقدس کی خاطر اس کے خلاف بلند نہیں کرتے۔

اردو کے خلاف کٹر خیال کے ہندو تو ایک مدت سے اونگی بونگی بول رہے تھے لیکن جب سے کانگرس برسر اقتدار آئی ہے اس روز سے ہندی کو ملک کی قومی زبان بنانے کا مرض بہت ترقی کر گیا ہے۔ یہ سب کانگرس کے اقتدار کی برکات ہیں جو آج اس ملک میں واردھا اور وویا مندر ایسی ناپاک اسکیمیں تیار ہو رہی ہیں۔ ان اسکیموں کا صرف ایک مطلب ہے یعنی مسلمانوں کی تہذیب اور تمدن کو ملیا میٹ کیا جائے۔ ہم تو یہ دعائیں مانگ رہے تھے کہ

ناخن خدا نہ دے تجھے اے پنجۂ جنوں !

لیکن قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اس نے پنجۂ جنوں کو آخر ناخن عطا کر ہی دیئے۔ اور اسی وحشت نے کہیں سرسوتی کی پوجا کہیں بندے ماترم کا گیت کہیں کچھ اور کہیں کچھ فتنے برپا کر دیئے۔ کانگرس نے حکومت سنبھالتے ہی جو پر پرزے نکالے تھے انہیں دیکھ دیکھ کر زبان پر بار بار یہ آتا تھا کہ ع

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

تو جناب! یہ ان لوگوں کے لئے ایک سبق ہے جنھیں ملک کی بہتری کانگرس کے اقتدار میں نظر آ رہی ہے۔ اور پھر لطف تو یہ ہے کہ اردو ہندی کا سوال پیدا کرنے والے وہی محترم لوگ ہیں جو کانگرس کے کرتا دھرتا کہلاتے ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو ہندوستان کی آزادی کے خواب دیکھ رہے ہیں وہی اردو ایسی عالمگیر زبان کے خلاف محض اس لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں کہ ایک تو بقول جناب گاندھی یہ مسلمانوں کی زبان ہے اور قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے۔ دوسرے پنڈت مالویہ صاحب کو یہ خوف دامنگیر ہو رہا ہے کہ اردو زبان پڑھنے لکھنے سے ہندو دھرم کا ناش ہو جائیگا۔ چنانچہ انھوں نے مذہب کی آڑ لے کر اپنی قوم میں اردو کی مخالفت کا بیج بو دیا۔ افسوس ؎

اور ہے تیرا شعار آئینِ ملت اور ہے
زشت روئی سے تری آئینہ ہے رسوا ترا

”ہندی“ کو راشٹر بھاشا کا درجہ دینے والے ذرا گریبان میں منہ ڈال کر تو دیکھیں کہ ”ہندی“ کی ملک میں حیثیت کیا ہے۔ اردو کے مشہور رسالہ ساقی (دہلی) میں ”سوجھ بوجھ کے ڈھائی اکھر“ کے عنوان سے جناب سید ابوالقاسم صاحب سرور کے نام سے گذشتہ دو تین مہینوں سے ایک بہت دلچسپ اور پُر از معلومات مضمون شایع ہو رہا ہے۔ ساقی بابت نومبر میں سرور صاحب نے ہندوستان کی تمام زبانوں کے جو اعداد شمار (جو غالباً کسی مغربی محقق کے ممنونِ منت ہیں) دیئے ہیں اس سے ”ہندی“ کی زبوں حالی صاف ظاہر ہو رہی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

نام زبان	بولنے والوں کی تعداد
۱۔ اردو	آٹھ کروڑ پچاس لاکھ (یہ اندازہ بالکل غلط ہے)
۲۔ بنگالی	تین کروڑ نوے لاکھ
۳۔ مرہٹی	ایک کروڑ ستر لاکھ
۴۔ تلنگی	ایک کروڑ ستر لاکھ
۵۔ پنجابی	ایک کروڑ ساٹھ لاکھ
۶۔ تامل	ایک کروڑ تیس لاکھ
۷۔ گجراتی	پچانوے لاکھ
۸۔ اوڑیا	ستتر لاکھ
۹۔ کنڑی	پچاس لاکھ
۱۰۔ ملیالم	پچاس لاکھ
۱۱۔ سندھی	چالیس لاکھ
۱۲۔ ہندی	تیس لاکھ

(پنجابی، تامل:) یہ غلط ہے پنجاب میں کم و بیش پونے دو کروڑ آدمی اردو بولتے اور سمجھتے ہیں۔

لیکن برا ہو اس مذہبی تعصب کا جس کے ہوتے ہوئے کوئی دلیل کارگر نہیں ہوتی ؎

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

کانگرس کی اپنی چھان بین سے بھی اردو کی مقبولیت آشکارا ہوتی ہے۔ کانگرسی نقطۂ نظر سے ہندوستان میں اردو بولنے والے اٹھارہ کروڑ کے لگ بھگ ہیں۔ حالانکہ یہ اسی طرح غلط ہے جس طرح کانگرسی اور مہا سبھائی پروپگنڈا کی وجہ سے ہندوستان میں اسلامی آبادی صرف آٹھ کروڑ بتلائی جا رہی ہے۔ کوئی آج سے نہیں بلکہ نصف صدی سے یہ دروغ بیانی جاری ہے۔ حالانکہ اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی گیارہ کروڑ کے لگ بھگ ہے۔

ہندوستان کی کل آبادی کم و بیش اٹھتیس (۳۸) کروڑ ہے اور آج اس ملک میں ۳۴ اور ۳۵ کروڑ آدمی اردو بولنے اور سمجھنے والے موجود ہیں۔

اور سنیئے! اس ملک میں ۱۰۲۹ اخبارات اور رسائل شایع ہوتے ہیں۔ ان میں سے ۴۱ ہندی کے ہیں اور ۱۰۱۳ اردو زبان میں نکلتے ہیں۔ یہ تو رہی ہندوستان کی حالت اب ذرا بیرون ہند بھی اردو کی مقبولیت کا اندازہ کیجئے۔

افغانستان، ایران } ۰۰ لاکھ آدمی اردو بولتے اور سمجھتے ہیں۔

گلگت، بلخ اور ختن } پچاس لاکھ اردو بولنے اور سمجھنے والے موجود ہیں۔

عرب اور عدن	پچانوے لاکھ
یورپ اور امریکہ	بیس لاکھ
جاپان اور سنگاپور	پانچ لاکھ
دیگر اسلامی علاقے	پندرہ لاکھ

اب ان اعداد و شمار کو سامنے رکھ کر ذرا "ہندی" کے علم برداروں سے کوئی اتنا تو پوچھے کہ کیوں بھیا! ہندی کا ڈھونگ رچانے کے کیا معنی! خیر! یہ تو رہیں دور کی باتیں۔ ابھی تھوڑے روز ہوئے آل انڈیا بمبئی ریڈیو اسٹیشن کی طرف سے ریڈیو سننے والوں سے یہ پوچھا گیا تھا کہ وہ کس زبان میں پروگرام پسند کریں گے۔ اس کا نتیجہ جو سرکاری طور پر شایع کیا گیا ہے ملاحظہ فرمائیے۔

بمبئی ۔ اردو یعنی ہندوستانی ۲۰۵۶ ۔ انگریزی ۲۰۳۲ ۔ گجراتی ۱۰۴۲ ۔ مرہٹی ۱۵۳۹ ۔ ہندی ×

اس کے بعد دوسرا سوال یہ تھا کہ اگر صرف ایک ہی زبان میں ریڈیو پروگرام تیار کیا جائے تو آپ کس زبان میں ریڈیو سننا پسند کریں گے۔ اس کا جواب سنئے!

اردو (ہندوستانی) ۳۶۵۰ ۔ انگریزی ۱۰۴۷ ۔ گجراتی ۹۲۰ ۔ مرہٹی ۸۳۵ ۔ ہندی ×

پھر کلکتہ، دہلی اور مدراس کے ریڈیو سننے والوں سے بھی یہی پوچھا گیا ان صوبوں سے زبان کے متعلق جو جواب ملا

اس سے اردو کی مقبولیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

کلکتہ:۔ اردو ۳۵۵۹۔ انگریزی ۱۷۵۴۔ بنگال ۳۹۹۔ ہندی ×

دہلی:۔ اردو ۳۸۴۸۔ انگریزی ۱۷۳۶۔ ہندی ×

مدراس:۔ اردو ۳۵۲۵۔ انگریزی ۱۷۸۱۔ تامل ۳۹۴۔ تلنگی ۲۱۹۔ ہندی ×

ان اعداد شمار سے یہ روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ اردو زبان کو ملیا میٹ کرنے کا جنون صرف ہندوؤں میں پایا جاتا ہے۔ دوسری اقوام ہندوؤں کی ہم نوا نہیں اردو زبان کے خلاف صوبۂ متحدہ میں جس کاوش سے کوشش ہورہی ہے اس کی مثال دوسری جگہ شاید نہ ملے۔ کانگریس والوں سے کچھ شکوہ ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ یہ خالص ہندو قوم کی نمائندہ ہے۔ لیکن افسوس تو مسلمانوں پر ہے جو یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی ٹس سے مس نہیں ہوتے ؎

عاقبت منزل ما وادیٔ خاموشان است

حالیا غلغلہ در گنبد افلاک انداز

ابھی پچھلے دنوں ریڈیو اسٹیشن دہلی والوں نے جو اردو کی گت بنائی ہے اور جس جس طرح اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کی وہ کسی سے کچھ چھپی ہوئی نہیں سنتے تو یہ تھے براڈ کاسٹنگ کا محکمہ بھی سرکاری محکمہ ہے۔ لیکن دہلی ریڈیو اسٹیشن کے ڈائرکٹر نے تو قولاً اور فعلاً یہ ثابت کر دکھایا کہ یہ خالص کانگرسی محکمہ ہے۔ آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن سے جو خبریں نشر ہوتی ہیں۔ اس میں ہندی کے اور ایسے ایسے من گھڑت الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں جنھیں سُن کر یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ ہندوستان کے قدیم باشندے سے بات چیت کر رہے ہیں۔ خیال تو فرمائیے کہ

"ایکا" (اتفاق) "ہتھیار بند بھانہ"۔ "دُہرا دُھرے"۔ "پہناوُ"۔ "پچھمی فرنٹ"۔ "سندیسہ"۔ "راج دھانی"۔ پورب پچھم۔ اتر۔ دکن۔ "اڑان" (پرواز) "سناہی والا مال"۔ "مورتع پھانٹا"۔ "ڈبکنی کشتی"۔ "صلح کے بیان کی سواگت"۔ "ڈپلومیٹک حلقوں کی بات چیت"۔ "مانگیں" (مطالبہ) "لیکھت"۔ "لکھت پڑھت"۔ "میرٹھ میں شانتی ہوگئی"۔ "پرکھت کا وقت ہے"۔ "لڑائی بند کرنے کی مانگ"۔ "بہتری ثابت کرنے والے" وغیرہ وغیرہ الفاظ اگر رام راجیہ کے دور میں ہندو جاتی کی حکومت استعمال کرتی تو کچھ مضائقہ نہ تھا۔ لیکن ابھی تو وہ دلی دور والا معاملہ ہے۔ ہندو دوستوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ مسلمان اور اردو کے بہی خواہ اس قسم کی "غیر مہذب زبان" کبھی قبول نہیں کرسکتے۔ اگر اسی کا نام "ہندوستانی" ہے تو پھر یہ ہندوؤں کو ہی مبارک ہو۔ لطف تو یہ ہے کہ گاندھی صاحب کو "اردو" نام بھی ناپسند ہے اور ہونا بھی چاہیے کیونکہ اگر صلح اور اہنسا کے دیوتا کو ہمسایہ قوم سے بغض نہ ہو تو اور کس کو ہو۔ آپ نے زبان کا نام "ہندوستانی" تجویز فرمایا ہے۔ لیکن جناب گاندھی کو کوئی اتنا تو بتلا دے کہ "ہندوستانی" تو انگریزوں کا دیا ہوا نام ہے۔ آپ تو انگریز کی ہر چیز سے متنفر ہیں یہ نام کیوں پسند آگیا آپ کو۔

اردو زبان کے خلاف جو یہ نفرت انگیز اور اختلاف پرور تحریک جاری ہے اس کی تہہ میں صرف سیاسی جذبہ کار فرما ہے۔ انگریزوں نے کسی مصلحت کو مدنظر رکھتے ہوئے کانگرس کو ذرا ڈھیل دے دی تھی جس سے اس کی رسی اور بھی دراز ہوگئی۔ اور گھر بیٹھے یہ لوگ رام راجیہ کے خواب دیکھنے لگے۔ اور جناب آج ہندوستان میں رام راج قائم ہونے دیجئے پھر دیکھئے کہ اسلامی تہذیب اور تمدن پر کس کس طرح کلہاڑا چلایا جاتا ہے۔

اردو ایسی عالمگیر اور شگفتہ زبان جس میں ہر پڑھے لکھے آدمی کو اپنا مطلب ادا کرنے کے لئے لفظی نزاکت، لطافت، رنگینی اور دلکشی حاصل ہو سکے، اس کے خلاف پروپگنڈا کرنا اپنی ذہنیت کی پستی کا پروپگنڈا کرنا ہے۔ یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ فارسی ایک بے حد دلاویز اور دلکش زبان ہے لیکن اردو کی شگفتگی اور دلکشی اسے بھی مات کر گئی ہے۔ ہندوؤں کا یہ کہنا کہ اردو محض مسلمانوں کی زبان ہے ایسا ہی لغو اور بے معنی ہے جیسے بنارس کے ایک پنڈت نے ایک بار یہ کہہ دیا تھا۔

"مہاراجہ بکرماجیت اور بابر بادشاہ میں کئی معرکے ہوئے لیکن جیت ہمیشہ مہاراجہ بکرماجیت کی ہی ہی"

پنڈت مدن موہن مالویہ کی کوششوں سے تو صرف ہندو ریاستوں سے اردو زبان اور اردو رسم الخط کو دیس نکالا ملا تھا۔ لیکن ہندو مسلم اتحاد کے حامی جناب گاندھی کے تقدس نے یہ آگ اب ہر جگہ لگا دی ہے اور آپ اپنے دامن کی ہوا سے اسے تیز سے تیز تر کئے جا رہے ہیں۔ رہی سہی کسر بھی وہ گاندھی صاحب نے ناگپور میں یہ کہہ کر پوری کر دی کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے اور قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے۔

میرے خیال میں وہ سب لوگ جو اردو ہندی کی آویزش کے ذمہ دار ہیں مصلح قوم اور محب وطن کہلانے کے مستحق نہیں۔ زبان سے ملک وملت کی شان نظر آتی ہے۔ آپس میں اخوت اور اتحاد کا رشتہ استوار ہوتا ہے۔ اس لئے جو قوم یا جو فرد یا جو شخص اس مقدس رشتہ کی جڑ کاٹنے والا ہو ہرگز قابل اعتبار نہیں۔ کسی ملک کی آزادی کے لئے اس کی زبان کا ایک ہونا بھی ضروری ہے۔ اور زبان کا اختلاف غلامی کی دلیل۔

اردو زبان پر یاران وطن کو سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ اس میں عربی فارسی الفاظ بکثرت پائے جاتے ہیں۔ لیکن ان "عقل کے پتلوں" نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ عام بول چال کی زبان اور ہوتی ہے اور ادبی زبان اور عام بول چال میں کوئی احمق ہی ہوگا جو خواہ مخواہ عربی اور فارسی کے غیر ضروری الفاظ استعمال کرے۔ لیکن جہاں ادبی شگفتگی مدنظر ہو وہاں ان الفاظ کا استعمال کرنا بھی ضروری ہوگا۔ پھر ہر لکھنے والے کی اپنی اپنی طرز ہوتی ہے۔ کوئی سادہ الفاظ استعمال کر کے زبان میں چاشنی اور لطافت پیدا کرتا ہے کوئی عربی فارسی اور ہندی کے الفاظ سے اپنی تحریر کو مزین کرتا ہے۔

لیکن ہندی کو تو یہ بات بھی حاصل نہیں۔ اور حاصل ہو بھی کیسے سکتی ہے کیونکہ بقول جناب گاندھی ہندی وہ زبان ہے جو کتابوں میں ملتی ہے۔ پھر اس پر یہ دعویٰ کہ ہندی ہی ہندوستان کی راشٹر بھاشا کہلا سکتی ہے جس قدر مضحکہ خیز ہے سب پر عیاں ہے۔

ہندوستان کی زبان کو ہم "ہندوستانی" تب کہہ سکتے تھے جب کہ تمام ملک میں ایک ہی قوم و ملت کے لوگ آباد ہوتے۔ پھر آج تک یہ بھی تو معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ "ہندوستانی" کیا ہوگی کیسی ہوگی۔ ڈاکٹر تارا چند۔ بابو راجندر پرشاد اور علامہ کیفی نے ہندوستانی کے موضوع پر آل انڈیا ریڈیو دہلی سے جو تقریریں نشر کی تھیں۔ اس میں بھی اسی بات پر زور دیا گیا تھا کہ جدید ہندوستانی" اردو اور ہندی کے بیچ کا راستہ" لے گی۔ لیکن ان تینوں بزرگوں نے اس بیچ کا راستہ لینے والی زبان کی مثال تو ایک بھی نہ دی۔ جس سے اس جدید ہندوستانی کا کچھ اندازہ ہو سکتا۔ ہاں! ہندو قوم جو زبان چاہتی ہے اس کی مثال میں مسٹر سپورانند کی وہ تقریر پیش کی جاسکتی ہے جو انھوں نے صوبۂ متحدہ کی کونسل میں کی تھی اور جسے مسلمان تو رہے درکنار اسّی فیصدی ہندو بھی نہ سمجھ سکے تھے۔

یارانِ وطن کی اردو زبان کے خلاف سرگرمیاں تو اب شاید حشر تک بھی ختم نہ ہوں لیکن سوال یہ ہے کہ اردو زبان کے بہی خواہ کب تک خاموش رہیں گے۔ اردو کی حمایت اور ترویج کے لئے انجمنوں کا قیام ہے تو ایک نیک فال، لیکن کچھ کام بھی تو ہونا چاہیے۔ اردو زبان کے حامیوں کا یہ اخلاقی فرض ہے کہ اردو کے خلاف ہر تحریک کو کچلنے کے لئے سینہ سپر رہیں۔ خواہ یہ تحریک جناب گاندھی کی طرف سے ہو یا کسی کانگرسی جماعت کی طرف سے۔ افراد کا جمود قوم کی تباہی کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ اور آج اردو زبان کے ہواخواہوں کا یہی جمود اردو زبان کے حق میں زہر قاتل ثابت ہو رہا ہے۔ یہ مصلحتوں کا وقت نہیں بلکہ اب اردو زبان کی لاج اور آبرو کا سوال ہے۔ اور اس لاج اور آبرو کو برقرار رکھنے کے لئے کچھ عمل کی ضرورت ہے۔ باتوں کا وقت ہو چکا۔ آپ نے اردو کی ترویج کے لئے انجمنیں تو قائم کرلیں۔ لیکن یہ تو فرمائیے کہ آپ کی انجمنوں نے عملی کام بھی کچھ کیا۔ ع

حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی!

ایم اسلم

مدراس میں اردو (مجلد) اس کتاب میں مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی منشی فاضل نے مدراس میں اردو کے نشو و نما اور اس کے ارتقا کی تاریخ پیش کی ہے۔ کتاب کو نو ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے ہر دور کے شاعروں اور نثر نگاروں کے سوانح حیات اور نمونۂ کلام کو پیش کیا ہے۔ تاریخ ادب اردو سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کے لئے اس کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔

صفحات (۲۰۰) قیمت مجلد (عہ ۱ر)

کیفِ جاوید

حجاب آلودہ جلوے تھے شباب انگیز روماں تھا
مری نظروں کی دولت تھی کہ حسن کار نیرداں تھا

چمن کا ذرہ ذرہ لے رہا تھا ایک انگڑائی
ترے جلوے کی رعنائی میں گم سارا گلستاں تھا

نگاہِ درد پرور کی خلش کیا خاک کم ہوتی
تری رنگینیاں تھیں اور مرا معصوم ایماں تھا

میں ہر قیمت پہ لے سکتا ہوں وہ جاں آفریں لمحے
کہ جب پہلے پہل مل کر کوئی مجھ سے پشیماں تھا

چمن کا پتہ پتہ بن گیا تصویر ناکامی
ترے جانے سے پژمردہ گلستاں کا گلستاں تھا

روپہلی چاندنی میں وہ مرے پہلو میں بیٹھی تھیں
مرے اُس چاند سے لیکن فلک کا چاند لرزاں تھا

وہ اپنے حسن سے بڑھ کر مری چاہت پہ نازاں تھیں
مری نظریں اور اتنی کامراں میں خود بھی حیراں تھا

صنوبر کے حسیں سائے لب جو گود میں کوئی
مگر اب یاد کرتا ہوں تو اک خوابِ پریشاں تھا

کوئی خوابیدہ تھا قیصری مری آغوشِ رنگیں میں
فلک بھر چاندنی تھی یا گلستاں کا گلستاں تھا

قیصری (رامپوری)

"ورڈزورتھ اور اس کی شاعری" ادارہ ادبیاتِ اردو کی اولین کتاب ہے جو آج سے پانچ سال پہلے شایع ہوئی۔ یہ کتاب مولانا سلیمان ندوی کی رائے میں جدید قسم کی بہترین سوانح عمری ہے۔ اصغر گونڈوی مرحوم اس کو ۱۹۳۲ء کی بہترین اردو کتاب سمجھتے تھے۔ مولوی عبدالحق صاحب فرماتے ہیں کہ اردو کے ہر شاعر کو یہ کتاب پڑھنی چاہیے اور حضرت نیاز فتح پوری کا ارشاد ہے کہ مشرق اور مغرب کی ادبیات کا تقابلی مطالعہ کرنے والوں کے لئے یہ ایک خاص چیز ہے۔

اس دوران میں اردو شعر پر ورڈسورتھ کے اثرات ایک حد تک نمایاں ہو گئے۔ موضوع، اسلوب اور زبان کی سادگی کا جو رنگ مغربی شاعری اور خاص طور پر ورڈزورتھ سے متاثر ہو کر مولانا حالی نے اپنا شروع کیا تھا اس کے اثرات میں اضافہ ہو جا رہا ہے۔

عنقریب ورڈسورتھ اور اُس کی شاعری کا دوسرا ایڈیشن بعض اضافوں کے ساتھ شایع ہونے والا ہے۔ اس میں سکیٹس صاحب کی بعض نظمیں بھی شامل ہوں گی۔ ان نظموں کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اردو شعر کی ساری خوبیوں کو برقرار رکھ کر ورڈسورتھ کی ترجمانی کی گئی ہے

ادب اور ذوق

(ایک مغربی صاحبِ ذوق کی مفید تصنیف کا پہلا باب ترجمے کی صورت میں پیش ہے۔ اس کے پڑھنے سے ادب والوں اور "بے ادبوں" دونوں کے دل پر شاید کچھ اثر ہو)

سب سے پہلے ضرورت اس امر کی ہے کہ راستے سے ایک غلط فہمی دور کر دی جائے۔ اگر عموماً نہیں تو اکثر حضرات ادبی ذوق کو ایک نفیس تحصیل اور اکتساب سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ اسے حاصل کرنے سے وہ اپنے آپ کو مکمل کر لیں گے اور ایک صحیح سوسائٹی کے رکن بننے کے اہل ہو جائیں گے۔ وہ دراصل ادب سے ناواقفیت رکھتے ہیں اور اپنی ناواقفیت سے اس طرح شرمندہ بھی ہیں جس طرح وہ کسی اعلیٰ اور مہذب تقریب میں آدابِ مجلس سے اپنی لاعلمی کی بناء پر محجوب رہتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اس طرح ناقابل اور مشوش پاتے ہیں جس طرح کسی سواری نہ جاننے والے شخص کو یکایک گھوڑے پر سوار ہونے کے لئے کہا جائے۔ ان کا خیال ہے کہ انسان کے لئے دنیا میں بعض چیزوں کو جاننا یا ان کے متعلق معلومات رکھنا ضروری ہے اور ان میں سے ایک ادب ہے۔ انھوں نے شائستگی کے ساتھ لباس پہننا سیکھ لیا ہے، وہ ہر موقع پر شائستگی اور تہذیب کا اظہار بھی کر سکتے ہیں۔ وہ زندگی کے روزآنہ اور ضروری مسائل سے کماحقہ واقف ہیں۔ محنت اور کوشش سے وہ اپنے اوقاتِ فرصت میں کچھ تحصیل و اکتساب بھی کر لیتے ہیں۔ اس لئے یہ امر بھی اُن کے لئے حق بجانب معلوم ہوتا ہے کہ وہ ادب سے واقفیت کو ہر باعزت اور خوددار انسان کا ذاتی سرمایہ اور لازمہ قرار دیں۔ مصوری ضروری نہیں۔ موسیقی ضروری نہیں۔ لیکن ادب سے تعلق رکھنا ہر شخص کے لئے ضروری ہے۔ اس طرح معلوم ہوا کہ ادب ایک دلفریب ترغیب اور دل بہلائی ہے۔ گویا ادبی ذوق کے دو مقاصد ہوئے۔ ایک صحیح تہذیب کا صداقت نامہ بننا، دوسرے ایک خانگی مشغلہ ثابت ہونا۔ ریاضیات کے ایک نوجوان پروفیسر نے، جو ریاضیات اور کھیل کا ماہر، شطرنج میں خطرناک، وایولین بجانے میں مشاق تھا، ایک دفعہ کتاب سے متعلق میری گفتگو سن کے کہا "جی ہاں، مجھے بھی ادب کی تحصیل کرنی چاہیے۔" گویا وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ "میں اسے حاصل کرنا بھول گیا تھا۔ میں نے دوسری چیزوں پر تو چھاپہ مارا ہے، اب ادب کی طرف بھی کچھ توجہ کروں گا۔"

یہ رجحان یا وہ خیال جو اس کے مماثل ہو، سراسر غلط ہے۔ اس شخص کے لئے جو واقعی ادب کو سمجھ سکتا ہے، اور یہ جان سکتا ہے کہ ادب کا مقصد اور عمل کیا ہے، اس قسم کے رجحانات محض مضحکہ خیز ہیں۔ علاوہ ازیں ادبی ذوق کی تکمیل میں ان سے نقصان بھی پہنچتا ہے۔ جو لوگ ادبی ذوق کو صرف ایک تحصیل و اکتساب سمجھتے، اور ادب کو ایک تفریح اور ترغیب قرار دیتے ہیں، وہ نہ اکتساب میں کامیاب ہوں گے اور نہ اس نیم اکتسابیت سے کوئی تفریح کا کام لے سکیں گے۔ یہ ایک اور بات ہے کہ یہ ترغیب دوسری ترغیبات سے زیادہ کمل ہے اور یہ تحصیل و اکتساب مہذب انسانیت کی عام دیوانگی کو موثر بنانے میں دوسرے قسم کی تحصیلات سے بہت زیادہ قوی اور دلکش ہے۔ ادب، ایک اضافہ، یا ایک ضروری لاحقہ نہیں بلکہ حیاتِ کامل کی اصل اور روح ہے۔ میں اس موقع پر فصیح و بلیغ اور جذبات انگیز جملے قطعاً استعمال نہیں کرنا چاہتا اور نہ کسی خطبے اور مبالغے سے کام لینا چاہتا ہوں۔ تاہم، میں حق بجانب ہوں گا، اگر میں کہوں کہ جس انسان کا ادب کی آزادی کا سامنا نہ ہو، وہ درحقیقت اپنے خوابِ غفلت سے جاگا ہی نہیں ہے۔ وہ ابھی پیدا ہی نہیں

ہوا ہے۔ وہ پوری طور پر دیکھ نہیں سکتا، سن نہیں سکتا، محسوس نہیں کرسکتا۔ وہ صرف کھانا کھا سکتا ہے۔ ان لوگوں کو جو ادب کے صحیح عمل اور منشا سے واقف ہیں، اور انھوں نے اس سے استفادہ بھی کیا ہے، اس سے زیادہ اور کوئی امر تکلیف نہیں دے سکتا کہ وہ ہزاروں افراد کو اس ترغیب میں مبتلا دیکھیں کہ وہ زندہ ہیں، حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ وہ زندگی سے صرف اتنا قریب ہیں جتنا موسم سرما میں ایک ریچھ ہوتا ہے۔

اب میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ادب کیا چیز ہے؟ نہیں، کاش میں ایسا کرسکتا مگر میں نہیں کرسکتا، نہ کوئی اور کرسکتا ہے۔ اس راز پر صرف ہلکی سی روشنی ڈالی جا سکتی ہے، یا کچھ اشارے کئے جا سکتے ہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں میں بھی صرف اس کی طرف اشارہ کروں گا۔ اس کے لئے میں آپ کو آپ کی زندگی کے کسی واقعے کی طرف واپس لے جاؤں گا یا مستقبل کی طرف بڑھا دوں گا۔

آپ کو وہ شام یاد ہے جب کہ آپ اپنے ایک بے تکلف اور جانی دوست کے ساتھ تفریح کر رہے تھے۔ آپ کا وہ دوست آپ کا رازدار تھا، آپ اُس سے کوئی بات چھپا نہ سکتے تھے۔ اس شام کو آپ اس سے ایک ایسی بات چھپانا چاہتے تھے جو آپکے دل و دماغ پر پورا قبضہ کئے ہوئے تھی۔ لیکن خدا جانے کونسی قوت تھی جو آپ کو اس کی طرف کھینچے جا رہی تھی۔ آپ پر ایک والہانہ جوش سوار تھا۔ چونکہ آپ کا دوست ہمدرد بھی تھا اور فرزانہ بھی، وہ ایک باعزت خواہش اور ذوق جستجو کے ساتھ آپ کی خوشامد بھی کررہا تھا اس لئے آپ اس واقعے کی طرف آہستہ آہستہ بڑھتے گئے۔ جیسے جیسے زیادہ اعتماد اور راز داری کا جذبہ پیدا ہوتا گیا، آپ اصل واقعہ کے قریب ہوتے گئے، حتیٰ کہ آپ نے ایک تہلکہ آمیز سرگوشی کے ساتھ کہہ ہی دیا "میرے دوست، وہ لڑکی حسن کا معجزہ ہے"! اس لمحے اور ساعت میں آپ ادب کی سلطنت میں موجود تھے۔

مجھے اس کی تشریح کرنے دیجئے۔ یہ سچ ہے کہ لفظ "معجزہ" کے عام مفہوم کے اعتبار سے وہ لڑکی حسن کا معجزہ تو نہ تھی۔ آپ کے وفادار دوست نے کبھی اسے اتنا حسین نہیں سمجھا اور نہ ان چالیس ہزار نظارہ بازوں نے سمجھا تھا جو اسے دیکھا کرتے تھے۔ وہ صرف ایک لڑکی تھی۔ اس کے لئے شہر ٹرائے جلایا نہیں گیا تھا۔ ایک لڑکی کو معجزہ نہیں کہا جاسکتا۔ اگر آپ ایک لڑکی کو معجزہ کہیں گے تو دنیا کی ہر معمولی چیز کو بھی اسی نام سے یاد کیا جا سکے گا لیکن ٹھیک ہے، آپ ایسا کرسکتے ہیں۔ آپ کو ایسا کرنا چاہیے۔ کائنات کے بے انتہا معجزات میں سے آپ کو صرف ایک کا احساس ہوا تھا۔ اس وقت آپ اپنی ایجاد اور انکشاف سے معمور تھے اس انکشاف کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے آپ میں ایک قدرتی ولولہ موجود تھا۔ آپ کو کسی چیز کے زبردست حسن کا قوی احساس ہوگیا تھا اور آپ اس جذبے کو اپنا بنانے پر مجبور تھے۔ آپ کسی چیز کے متعلق جذبات اور خواہشات سے بھرے ہوئے تھے۔ آپ سارے بنی نوع انسان سے ہٹ کر اس ایک ہستی کی طرف کھنچ آئے تھے۔ اب آپ اپنے جذبے اور اظہار کا وہ اثر ملاحظہ فرمائیں جو آپ کے دوست پر ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ لڑکی ایک معجزہ نہیں ہے۔ کوئی اور شخص اسے مجبور کرسکتا تھا کہ اس "معجزے" پر ایمان لائے۔ لیکن آپ نے اپنے نظارے کی طاقت اور ایمان داری سے اور اپنے دوست کو اپنے نظارے میں شریک کرنے کے جوش اور ولولے سے، بہت دیر تک اس غریب

یہ محسوس کرنے اور سمجھنے پر مجبور کیا کہ لڑکی میں کوئی غیر معمولی بات ہے اور وہ اب تک اس کے اعجازِ حسن کی طرف سے آنکھیں بند کئے ہوئے تھا۔

اس منزل پر آپ ادب پیدا کر رہے تھے۔ آپ زندہ تھے۔ دنیا کے تھوڑے سے حسن اور اعجوبیت کی طرف آپ کی آنکھوں پر پٹی نہیں تھی، آپ کے کان بہرے نہ تھے۔ آپ کے اندر ایک ایسی قوت تھی جو آپ کو اپنے جذبے کے اظہار پر مجبور کر رہی تھی۔ یہ آپ کے لئے کافی نہ تھا کہ آپ اسے دیکھیں یا سنیں۔ آپ کے لئے ضروری تھا کہ دوسرے بھی اسے دیکھیں اور سنیں۔ دوسروں کو جگانا لازم تھا' اور آپ نے جگایا۔ یہ ممکن ہے ــ گو مجھے یقین کامل نہیں ہے ــ کہ دوسرے ہی روز یا دوسرے مہینے آپ کا وفادار دوست کسی اور لڑکی کو دیکھے اور فوراً محسوس کرے کہ وہ بھی معجزۂ حسن ہے۔ یہ ادب کا اثر ہے!

ادب کے بنانے والے دراصل وہ لوگ ہیں جنھوں نے کائنات کے اعجاز نیرنگ و حیرت کو دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ اور ان میں سب سے بڑے معمار وہ ہیں جن کا مطمحِ نظر بہت زیادہ وسیع اور جن کا احساس بہت زیادہ شدید ہے۔ آپ کی تیز نگاہی کا ایک ٹکڑا ممکن ہے اتفاقی ہو اور عارضی بھی' لیکن ان کی زندگی ایک طویل تر نگ' ایک مسلسل حسرت ہے جو ہمیشہ اس امر سے انکار کرتی رہی کہ دنیا ایک اداس جگہ ہے۔ اگر آپ بھی یہ سمجھنے اور معلوم کرنے کے قابل ہوں کہ دنیا ایک اداس جگہ نہیں ہے تو کیا آپ کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہ ہوگی؟ اگر آپ کو بھنواروں اور غاروں سے نکال کر پہاڑوں کی چوٹیوں پر کھڑا کر دیا جائے تاکہ آپ زندگی کے صحیح لذت اور کیف سے لطف اندوز ہوں' اور آپ کی اس خوبصورت شیروانی کے نیچے ایک سچا دھڑکنے والا دل پیدا ہو تو کیا آپ اسے کوئی بات نہ سمجھیں گے؟ ادب کے معمار آپ کو ان چیزوں کا حریف اور مدِ مقابل بنا دیتے ہیں!

ادبی مطالعے کا مقصد یہ نہیں کہ اوقاتِ فرصت بہلائے جائیں۔ اس کا مقصد اپنے آپ کو جگانا' زندہ کرنا' ہمدردی' مسرت اور فہم و ادراک' اخذ و جذب کی صلاحیتوں کو زیادہ قوی بنانا ہے۔ اس کا منشا صرف ایک گھنٹے کو متاثر کرنا نہیں بلکہ چوبیس گھنٹوں کو متاثر کرنا ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ دنیا کے ساتھ ہمارے تعلقات کا رخ اور نوعیت ہی بدل دے۔ ادب کا سمجھنا اور اسے پسند کرنا دنیا کو سمجھنے اور پسند کرنے کے مرادف ہے۔ اس کی سوا اس میں کوئی اور معنی نہیں ہیں۔ اس میں زندگی کے لے جوڑ اور علحدہ ٹکڑوں کو جوڑنا نہیں بلکہ پوری زندگی کو ایک مربوط اور جامع نقشے میں دیکھنا ہے ادب کی روح ربط اور اتحاد ہے۔ ادب قندیل اور ستاروں کو ملاتا ہے اور تصور اور عکس کے جادو سے یہ ثابت کرتا ہے کہ ایک بڑی چیز کا حسن درحقیقت ایک چھوٹی چیز میں ہے۔ وہ اس امر پر اکتفا نہیں کرتا کہ حسن کا انکشاف کیا جائے یا ساری چیزوں کو ایک ہی مرکزِ خیال پر لایا جائے' بلکہ وہ علت و معلول' سبب اور نتیجہ کے قانون کا پتہ چلا کر ایک قسم کی اخلاقی فہم و ادراک پیدا کرتا اور اسے ہم پر مسلط کرتا ہے۔ اس کی تشفی اور تسکین دو قسم کی ہوتی ہے۔ وہ ایک غیر مشکوک دلکشی کو بے نقاب کرتا ہے' دوسرے وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ ہماری قسمت بھی کائنات کے ساتھ ہے۔ یہ ایک انکشاف کرنے والے شخص کی زبردست پکار ہے جو ہمدردیاں بانٹتی اور ایک ہی اشارے میں ہمدردیاں حاصل بھی کرنا چاہتی ہے۔

کسی شاعر کے دیوانوں کے قدیم نسخے ٹٹولنے' کسی ڈرامہ نگار کے مضمون کے ماخذ معلوم کرنے' یا علم عروض کی تاریخ لکھنے' یا ان

امور کے انکار و اقرار کے دلائل ڈھونڈنے میں کہ نظام الملک طوسی یا حسن بن صباح عالی فکر اور بدمعاش انسان تھے، اس امر کا امکان ہے کہ لوگ اصل ادب اور اس کی روح کو بھول جائیں اور یہ نہ معلوم کر سکیں کہ اس کا مقصد کیا ہے، اور یہ کس کے لئے ہے! مجھے پھر یہ یاد دلانا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ادب درحقیقت صحیح زندگی کا ذریعہ ہے، اور ادبی ذوق کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس ذریعے کو اپنی اعلیٰ تر زندگی کے لئے کتنی خوبی سے استعمال کر سکتے ہیں؛ جو لوگ زندہ نہیں رہنا چاہتے، جن کو محسوس کرنے سے زیادہ دل بہلائی کی خواہش ہے، وہ براہ کرم ادب کو خیرباد کہہ دیں۔ یہی ان کی عقلمندی ہوگی۔ بقول ایک عمدہ شاعر کے پاکیزہ مصرعے کے "بیٹھے ہوئے سند ہولے کھایا کریں"؛ ایک معمولی جھاڑی کا نظارہ "جو جلال ایزدی سے معمور ہو" شاید ان کو حواس باختہ بنا دے گا!

محمد عبدالقیوم خان باقی

دعا

آپ بھی بے حجاب ہو مجھ کو بھی بے حجاب کر
جامِ مئے حیات کو چشمۂ آفتاب کر

ڈوب رہی ہے نبضِ دل سانس کہیں الٹ نہ جائے
سینۂ آب و خاک کو عرصۂ انقلاب کر

میری دعائے نیم شب اور یہ سوز و تاب و تب
میرے چمن میں جلوہ سلسلۂ سحاب کر

عشق ہے محوِ آب و رنگ عقل ہے محوِ خار و سنگ
حسنِ ازل کا واسطہ حسن کو بے نقاب کر

منزلِ بے خودی میں یہ مرحلۂ خبر کہاں!
حسن جوابِ حسن ہے عشق کو لاجواب کر

تشنہ ہے روحِ زندگی گل ہے چراغِ بندگی
مجھ کو پیامِ تازہ دے مجھ کو عطا کتاب کر

درد ہے رازِ کائنات یہ جو نہیں تو کچھ نہیں
عشرتِ رنگ پر نہ جا درد کا انتخاب کر

میری حیات کا جمال تیرے شباب کا خیال
ہستیٔ ناتمام کو نقشِ گرِ شباب کر

کاوشِ خستہ دل ہوں میں صبا رنگ و بو ہے تو
غنچۂ ناشگفتہ کو پھول بنا گلاب کر!

کاوش

گُل بُوٹے

کسی کے ہر اپریل اور مئی کے گرم تقاضوں سے تنگ آکر پور سے ایک عشرے کے بعد پچھلی گرمیوں میں بنگلور کے لئے ہم نے رختِ سفر باندھا ! اس تقریب میں ہماری بیچاری پانچ سال کی نئی فورڈ " پر بھی آفت آئی وہ بھی ہمارے ساتھ چلنے پر مجبور ہوئی ۔ اپریل کے آخری ہفتہ میں ہمارا " کاروان " کچھ موٹر میں اور کچھ ریل میں صبح سویرے بنگلور چل پڑا ، شہر سے کوئی چونسٹھ میل موٹر میں چلنے کے بعد ہم محبوب نگر پہنچے یہاں ہم سب نے اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں ناشتہ کیا اور چلے اسٹیشن ماسٹر سے ملنے ۔ کرنول کے قریب جو ندیاں آڑے آتی ہیں ان کو پار کرنے کے لئے ہم نے چار روز پہلے ہی ریلوے ٹرک اپنی موٹر کے لئے محفوظ کرا لیا تھا ، اسٹیشن ماسٹر سے مل کر ہم نے اپنی موٹر کو ٹرک میں بٹھا دیا ، سب کے ٹکٹ کرنول تک کے خرید لئے اور پلیٹ فارم پر ٹرین کے انتظار میں ٹہلنے لگے

ساڑھے نو بجکر کچھ منٹ پر ٹرین آئی ، ہم سب اپنے اپنے ڈبوں میں سوار ہو گئے ، اور دھویں کی گاڑی ہمیں اڑاتی ہوئی کرنول چلی ، ہمارے ڈبے میں ہمارے سوا دو اور مسافر تھے ، ایک صاحب اوپر کی برتھ پر لیٹے ہوئے کوئی موٹی سی کتاب بہت غور سے پڑھ رہے تھے اور کچھ گنگنا بھی رہے تھے ، دوسرے صاحب نیچے کی سیٹ پر ٹائمز آف انڈیا دیکھ رہے تھے ، ہم اپنی تنہائی کو بری طرح محسوس کر رہے تھے ، اتنے میں اوپر والے صاحب وہم سے نیچے کود ے اور " السلام علیکم " کہہ کر ہمارے بازو بیٹھ گئے ۔ اب جو ہماری نظر انکی کتاب پر پڑی تو اس پر سنہری حرفوں میں " دیوانِ حافظ " لکھا دیکھا ، اس دیوان کو ان کے ہاتھ میں دیکھ کر ان کی وقعت ہماری نظروں میں بہت بڑھ گئی ، ہم نے موصوف سے سوال کیا ۔

" کیا حافظ سے آپ کو خاص لگاؤ معلوم ہوتا ہے ؟"

فرمایا " جی ہاں ! میں ان کے دیوان کا ترجمہ منظوم انگریزی میں کر رہا ہوں " !!

انگریزی میں دیوان حافظ کا " منظوم " ترجمہ سنکر ہماری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور موصوف کی لیاقت کی دھاک ہم پر خوب بیٹھ گئی ، ہم یہ چاہتے ہی تھے کہ اس منظوم ترجمے کے سننے کی سعادت ہمیں نصیب ہو کہ اتنے میں موصوف نے ہم سے پوچھا ۔

" کیا کوئی غزل کا فی البدیہہ منظوم ترجمہ سناؤں ؟"

ہم نے عرض کیا " چشم ما روشن دلِ ما شاد ! نیکی اور پوچھ پوچھ !! ضرور ارشاد ہو " !!!

فرمایا " حافظ کی غزل کا انگریزی میں منظوم ترجمہ کرنا بچوں کا کھیل نہیں ! بہت مشکل کام ہے !! اس کے لئے بڑی قابلیت کی ضرورت ہے " !

ہم نے کہا " اسمیں کیا شک ! پہلے تو ترجمہ کرنا ہی کچھ آسان کام نہیں ہے اور پھر حافظ کا انگریزی میں اور پھر منظوم ترجمہ !! واقعی یہ کار سے وار داین .....

از تو آید و مردان چنیں کنند " !!!

مسکرا کر جواب دیا " کوئی پچیس برس کی مشق کے بعد یہ کام مجھ کو اب آسان معلوم ہوتا ہے ، پہلے میں نے اردو غزلوں کا ترجمہ منظوم انگریزی میں کرنا شروع کیا ،

اس پر کافی عبور حاصل کرنے کے بعد اب فارسی کا شروع کیا ہے، یہ ترجمہ اگر کسی انگریزی داں ایرانی کو سناؤں تو واللہ پھڑک اٹھے، دیکھئے حافظ مرحوم کی روح کو ایک الحمد اور تین قل ہو اللہ پڑھکر بخشتا ہوں اور پھر "شاخ نبات" کی قسم ہو کر کتاب کھولتا ہوں اور جو غزل نکلے اوس کا ترجمہ فی البدیہ سناتا ہوں۔"

چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا اور بسم اللہ کہکر کتاب کھولی، غزل نکلی۔

یوسف گم گشتہ باز آید بکنعاں غم مخور
کلبۂ احزاں شود روزے گلستاں غم مخور

اس شعر کا آپ نے انگریزی میں جو منظوم ترجمہ کیا ہے وہ سچ مچ ایک "شاہکار" ہے، ملاحظہ ہو!

The last Yousuf will come back to Kan-an swallow-not sorrow.

The cottage of sorrow will become a flower garden one day swallow not Sorrow

اس "فی البدیہ" ترجمہ کو سن کر ہم نے اپنے رفقا بو مجنے کی جو کوشش کی تو ہمارے جسم میں کچھ عجیب "ارتعاش" پیدا ہوا ہم نے اپنے پیٹ کو اچھی طرح پکڑ لیا کہ کہیں جوشِ مسرت میں نہ پڑے معلوم نہیں "کنار آب رکن آباد" گلگشت کرنے والے حضرت حافظ کی روح پر کیا گزری اگر وہ انگریزی داں ہوتی! ہم نے پلٹ کر ٹائمز آف انڈیا پڑھنے والے ہمسفر کی طرف جو دیکھا تو ان کا چہرہ کو اخبار کے ورقوں سے ملا ہوا اور ان کے بھاری بھرکم جسم کو کچھ عجیب وضع سے ہلتا ہوا پایا۔ اس اثنا میں موصوف نے دوسرے شعر کا ترجمہ بھی کر ڈالا، ارشاد ہوا۔

"این دل غم دیدہ حالش بہ شود دل بد مکن
وین سر شوریدہ باز آید بسامان غم مخور"

The condition of this sor-row seen heart will be-come better, dont make the heart bad. This noisy head will come back with luggage, swallow not sorrow

اس ترجمہ میں "گیج" کی ہم دل ہی دل میں داد دے رہے تھے کہ تیسرا شعر ارشاد ہوا۔

در بیاباں گر بہ شوق کعبہ خواہی زد قدم
سرزنش ہا گر کند خار مغیلاں غم مخور"

If you wish to strike foot in jangle in fondness for Kaba. If Babool thorns take you to task swallow not sorrow

ارشاد ہوا "اس منظوم ترجمہ کو قافیہ سے بے نیاز رکھا گیا ہے Swallow not Sorrow اس کی ردیف ہے، قافیہ لگانے کی کوشش کی گئی تھی مگر یہ دیکھکر کہ شعر وزن سے گر جاتا ہے صرف ردیف ہی پر قناعت کی گئی۔"

غرضکہ موصوف نے پوری غزل کا ترجمہ چند منٹوں میں اسی طرح "بڑی روانی" سے کر ڈالا اور ہماری رائے پوچھی! ہم ششدر رہ گئے اور "لسان الغیب" ہماری زبان سے بے ساختہ بول اٹھے "جزاک اللہ فی الدارین خیرا" سچ تو یہ ہے

کہ آپ نے انگریزی اور فارسی شاعری دونوں پر بڑا احسان کیا ہے۔ اس ترجمہ کا نسخہ انشاءاللہ کسی دن لندن کے عجائب خانہ میں پہنچ جائیگا"!

تو آپ کی رائے ہے کہ اس ترجمہ کی کاپیاں چھپوائی جائیں؟"

ہم نے کہا "بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے، اس ترجمہ کی تو کم سے کم دس ہزار کاپیاں چھپوا لینی چاہییے"۔

اس وقت "ٹائمز آف انڈیا" والے ہمارے ساتھی نے اپنا چہرہ اخبار کے ورقوں سے جو باہر نکالا تو ہم نے دیکھا کہ ان کی آنکھیں کچھ سرخ ہوگئی ہیں اور ان میں پانی کھیل رہا ہے! غالباً وہ اپنی بے بضاعتی پر آنسو بہا رہے تھے کہ ان میں ایسا منظوم ترجمہ کرلے کی لیاقت نہیں تھی! یہ معلوم کرکے ہمیں بڑی مسرت ہوئی کہ "فاضل مترجم صاحب بھی گرمیاں گزارنے بنگلور جارہے ہیں، بنگلور میں آپ نے اور ترجمہ سنانے کا وعدہ کرتے ہوے اپنا بنگلور کا پتہ ہمیں دیا اور ہم سے وعدہ لیا کہ کسی دن ان کا ترجمہ سننے ضرور آئیں، چنانچہ بنگلور میں کئی مرتبہ ہم نے ان کا ترجمہ بڑے مزے لیکر سنا۔ انشاءاللہ کبھی نظر سب رس کے ملاحظہ میں اس ترجمے کے چند نمونے پیش کرینگے۔ سب رس زندہ صحبت باقی

آج ہم ان وقتوں کا ذکر کرتے ہیں جبکہ ایک بزرگوار اپنے "آخری" امتحان میں رونق افروز تھے، اردو کا پرچہ بڑی پھرتی سے لکھ رہے تھے کیونکہ "پدری زبان جو ٹھہری"!! ایک گھنٹہ پہلے ہی آپ نے پرچے گارڈ کے حوالے کردئے اور امتحان کے ہال سے نکل کر ادھر ادھر گلگشت کرنے لگے آخر بڑے انتظار کے بعد ایک ساتھی باہر آئے، دونوں میں پرچہ کے متعلق گفتگو شروع ہوئی، آپ نے کہا۔

"آج کا پرچہ بھی کچھ تھا! مجھ کو تو سو میں سو نمبروں کی امید ہے"!! ساتھی نے اپنا پرچہ دیکھکر کہا "مجھ کو پچاس نمبروں سے زیادہ کی امید نہیں ہے کیونکہ بعض اشعار میری سمجھ میں نہیں آئے، کہئے آپ نے اس شعر کا مطلب کیا لکھا؟ ؂

غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں"

ارشاد ہوا "تم بھی عجب احمق ہو! ارے اتنے آسان شعر کا مطلب تمھاری سمجھ میں نہ آیا!! سنو! شاعر کہتا ہے، لوگ مضامین کی ایسی فاش غلطیاں کرتے ہیں کہ گویا ندی نالوں کو رسیوں سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں"!!!

ایک صاحب نے اپنی سنہ ۱۹۲۰ء کی بڑی سیڈان "ڈاج" "موٹر کار برائے فروخت ہوتی ہے" کا ایک چھوٹا سا بورڈ سامنے کے آئینہ پر لٹکایا ہے اور موٹر کو صحن میں ایک درخت کے نیچے بڑی حفاظت کے ساتھ رکھ چھوڑا ہے۔

ہمارے ایک دوست کو "سکنڈ ہینڈ" کار کی ضرورت تھی، ایک واقف کار کی حیثیت سے ہم ان کی ہمرکابی کی عزت حاصل کرنے پر مجبور کئے گئے اور چلے موٹر دیکھنے کوئی تین بجے ہوں گے کہ ہم دونوں در دولت پر پہنچے۔ وہاں ایک "مرد معقول" سے آمنا سامنا ہوا۔ ٹھگنا سا قد، گندمی دھوپ چھاؤں رنگ، چمڑا ہڈیوں پر منڈھا ہوا، گال سے زیادہ کن پٹیاں پچکی ہوئیں، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، بڑے بڑے کان، چونچ دار ناک، چگی ڈاڑھی، موٹا ہفت پیوند پاجامہ، باریک ململ کا نسبتاً اجلا ڈھیلا ڈھالا کرتہ، اس پر پرانا چمڑے کا چوبازاری بلٹ، سر پر ایک لچھے دار پرانی جو کسی زمانے میں غالباً سالو کے رنگ کی ہوگی بہت ڈھیلی شاگرد پیشہ کی پگڑی۔ ان حضرت سے معلوم ہوا کہ "سرکار خاصہ پر ہیں"!

ہم نے موٹر دیکھنے کی اجازت چاہی، جواب ملا "ٹھہرو ! سرکار آتیں" !!

اتنے میں آواز آئی "کیا ہے مدار صاب کون ہے" ؟

"مدار صاب گویا ہوئے "سرکار دو جنے موٹر دیکھتے بولیں" !

ارشاد ہوا "اچھا دیکھو بولو" !

ہماری پریشانی کی کوئی حد نہ تھی جب ہم نے یہ محسوس کیا کہ "مدار صاب" کے سرکار بغیر دکھائی دئے وہیں کہیں سے بول رہے ہیں حسب الحکم ہم موٹر کے پاس لائے گئے، موٹر کیا تھی نہایت فرسودہ گرم روزگار چشیدہ، گویا اپنے وقت کی "مدار صاب" تھی اندر جو نظر پڑی تو دیکھتے کیا ہیں، ایک گل موچھ، ڈاڑھی چٹ "دوگوشتہ" سرکار برآمد ہیں۔ لٹھے کا تکمہ دار کرتہ پہنے ہوئے ہیں، سر بال صفا ہے اور ہاتھوں میں لو اسیر دنوا سیر کے کئی چھلے ہیں۔

اب یہ عقدہ کھلا کہ سرکار ہی "سروش غیب" تھے۔ "مدار صاب" نے بالکل سچ کہا تھا کہ "سرکار خاصہ پر ہیں" ! موٹر میں ایک تپائی تھی، کچھ تپائی پر اور کچھ گدے پر رکابیاں، کٹورے بکھرے پڑے تھے۔ باریک چانول ابلے ہوئے مشقاب بھر، خمیری روٹیوں کا "ونٹر" تلا ہوا چرب مسالہ دار تقریباً سیر بھر گوشت، دو چار لال بھبو کے سالن، بالائی، شکر۔ یہ تھا وہ "لیٹ لنچ" جو سرکار اڑا رہے تھے اور خوب پسینہ پسینہ ہو رہے تھے۔ قریب میں پاندان تھا، ناس کی ڈبیہ تھی، ہاتھ کا نیلیا رومال تھا اور کچھ ہٹ کر ایک پست قد، جسیم "آتش بہ سرپیچوان" سرکار کی جنبش لب پر بولنے تیار رکھا تھا۔

جوں ہی سرکار نے ہمیں دیکھا ارشاد ہوا "سلام والیکم" اور اس طرح کہ "والیکم" کا "کم" باہر نہ نکل سکا، اس وجہ سے کہ سرکار کے "لقمہ" نے اس کو بیچوں بیچ دھر لیا۔

ہم نے وعلیکم السلام عرض کرتے ہوئے موٹر کو چلا کر دیکھنے کی اجازت چاہی، کسی قدر گرجتے ہوئے فرمایا "کیا میری موٹر چلتی نین سمجھ رین ؟ وزرا ٹھہرو ! ڈریور مبئی کو گیا ہے، آنے دیو چلا کر بتاتوں" !!

اس "ذرا ٹھہرو" کی تکلیف ہمارے لئے ناقابل برداشت تھی، اس لئے ہم نے لب چباتے ہوئے عرض کیا "اجازت ہو تو ہم خود چلا کر دیکھ لیتے ہیں"

بپھرتے ہوئے فرمایا "نیئں جی او پیچ ہاتھ پو اچھی چلتی ہے" یہ سنکر ہم لاجواب ہوگئے اور اس ملاقات کو جلد ختم کرنے کی نیت سے بلبلاتے ہوئے قیمت دریافت کی۔

ارشاد ہوا "بیچوں گا تو سیٹھ، پن کیا قیمت کو بیچوں گا سوا بی نین بول سکتا"

ہم نے پھر حاضر ہونے کی اجازت چاہتے ہوئے آداب عرض کیا اور لوٹنے لگے۔ "مدار صاب" چند قدم ہمارے ساتھ آئے اور احتیاطاً ادھر ادھر دیکھکر آہستہ سے کہا۔

"بڑی بیگم صاب کی کنڈی کرکو آئیں۔ ابی گرم ہین، پھر کو آؤ" !

"باغبان"

سلطان محمود غزنوی کی بزم ادب

۱۷۰ صفحات قیمت دعہ، غزنین کی فارسی شاعروں اور وہاں کی ادبی وعلمی چہل پہل کا مبسوط تذکرہ۔

سلطان محمود کی ادبی سرپرستیاں اور اس کے دربار کے شعراکے حالات اور کلام پر تبصرہ فارسی زبان پر ان شعرا کی کاوشوں کا اثر وغیرہ

جون آف آرک کی زندگی کے چار دور

جون آف آرک

(فرانس کی اس مشہور دوشیزہ کے حالاتِ زندگی پر ادارہ کی طرف سے ایک دلچسپ کتاب لکھی جا رہی ہے
جس کے تعارف کے طور پر یہ مضمون درج ہے۔)

مشرق اپنی مردہ پرستی کی وجہ سے بدنام ہے اور یہ واقعہ بھی ہے کہ بہت کم خوش نصیب صاحبِ کمال ایسے گذرے ہیں جن کی قدر ان کی زندگی میں کی گئی۔ لیکن یہ کمزوری صرف ایشیائی ممالک تک محدود نہیں۔ یورپ میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں گو ان کی تعداد نسبتاً کم ہے۔ ذیل میں فرانس کی ایک باعصمت دوشیزہ کی کہانی لکھی جاتی ہے جو بہ قول "راسکوپ تھیپیر" اپنی زندگی میں ایک بدکار سفلی روح اور انسانیت کے لئے باعثِ ننگ سمجھی جاتی تھی لیکن مرنے کے بعد صاحبِ کشف و کمال اور مقدس ہستی سمجھی گئی اور اس کی پوجا کی جانے لگی۔

آج سے تقریباً پانسو سال پہلے متعدد لڑائیوں کے بعد فرانس پر انگلستان کی سیادت قائم ہو گئی۔ تخت کا جائز وارث فرار ہو کر بائیٹیرنہ چلا گیا اور اس کی ماں نے سفارش کر کے تخت و تاج انگریزوں کے ہاتھ بیچ ڈالا۔

فرانس کی ابتری اور بربادی انتہا کو پہنچ چکی تھی لیکن ایک گڈریے کی لڑکی نے جس کا نام جون تھا چند ہی سال میں فرانس کو پھر آزادی دلا دی۔

فاتح اعظم نپولین کے وطن کی خاک سے یوں تو بہت سی بڑی ہستیاں اٹھیں اور فرانسیسی بلانویس افسانہ نگاروں نے بہتیرے مکمل اور نصب العینی تخیلی کردار پیدا کئے۔ لیکن کوئی تاریخی یا افسانوی شخصیت جون کی بلندی پر نہیں پہنچ سکی۔

جون آف آرک کے واقعات شروع سے آخر تک کچھ اس نوعیت کے ہیں کہ آج مادیت کے چرچے کی وجہ سے بہت کم لوگ ان پر یقین کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جون آف آرک ایک روز اپنے گاؤں میں گلہ بانی کر رہی تھی کہ ایک غیبی آواز اس کے کان تک پہنچی جو یہ تھی "جا، فرانس کو آزاد کرا اور روئن میں شہزادہ ڈافن کو تاج پہنا"

اس آسمانی حکم کے سنتے ہی یہ لڑکی اپنے باپ کے پاس پہنچی اور اس کو سارا واقعہ سنایا۔ باپ نے مسکرا کر کہا "پاگل ہو گئی ہے"۔ وہ خاموش ہو گئی۔ لیکن خدائی آواز روزانہ سوتے جاگتے اس کے کانوں میں پڑتی رہی یہاں تک کہ لوگ مذاق اڑاتے اور اسے پاگل بناتے ہی رہے لیکن وہ ایک درباری رئیس کے توسط سے ڈافن تک پہنچ گئی۔ ڈافن کو جون آف آرک کے دعوؤں کی اطلاع پہلے ہی مل چکی تھی۔ اس نے پہلا امتحان اس طرح لیا کہ اپنی جگہ ایک اور شخص کو دے کر خود درباریوں میں جا بیٹھا۔ لیکن شہزادہ اور اہلِ دربار کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ جون جس نے کبھی شہزادے کو نہیں دیکھا تھا سیدھا اسی کے پاس پہنچ گئی اور اس کا نام لے کر اسے مخاطب کیا۔ اور بھی آزمائشیں ہوئیں جس کے بعد فوج کی کمان جون کے حوالے کی گئی۔

جون نے چاند سلطانہ کی طرح مردانہ اور سپاہیانہ لباس پہن لیا۔ ہتھیار لگائے اور شہزادے کے دئے ہوئے سفید گھوڑے پر سوار ہو کر نکلی۔ دشمنوں سے جہاں جہاں مقابلہ ہوا اس نے انہیں شکست دی۔ ایک لڑائی میں تیر سے زخمی

ہو کر دیوار پر سے نیچے گری لیکن اس حالت میں بھی فوج کو برابر بڑھا دیتی اور سپاہیوں کے دل بڑھاتی رہی۔ دوست دشمن سب حیران تھے۔ خود جون کے ساتھی اسے ساحرہ سمجھ کر ڈرنے لگے تھے۔ مقابلے جاری رہے اور کامیابیاں ہوتی رہیں یہاں تک کہ انگریزوں کے پیر اکھڑ گئے۔

خدائی احکام کی تعمیل کے یہ اہم مدارج طے ہو چکے۔ اب صرف تخت نشینی باقی تھی۔ جون نے شہزادے سے کہا کہ وہ "روئن" چل کر تاج وتخت سنبھالے لیکن شہزادہ ڈرا ہوا تھا۔ بہ قول شخصے اس کا باپ پاگل اور ماں دغاباز تھی۔ جون کے بارے میں دنیا بھر کے شبہات اس کے دل میں تھے۔

بالآخر شہزادہ راضی ہو گیا اور اس کو ساتھ لے کر جون آف آرک "روئن" پہونچی ــــ تاج ڈافن کے سر پر رکھا اور یہ کہہ کر کہ آسمانی احکام کے مطابق اس کے فرائض پورے ہو چکے ہیں، اپنے گاؤں کو واپس جانے کی اجازت چاہی۔ کاش اس کی اجازت جون کو مل جاتی مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہوا۔ ڈافن نے جون کے عزیزوں کو جاگیر اور منصب سے سرفراز اور جون کو اپنے ساتھ ہی رکھا۔

جون کے بارے میں لوگوں کے شبہات بڑھتے گئے انھوں نے علی الاعلان کہنا شروع کیا کہ جون ساحرہ ہے اور اس نے سفلی ارواح کی مدد سے فوق الانسان مہمیں سر کی ہیں۔ صداقت کے آفتاب پر کذب اور افترا کے کالے کالے بادل چھانے لگے یہاں تک کہ تاریکی پھیل گئی۔ علما اور رہادیان مذہب نے بھی عوام کی ہاں میں ہاں ملائی یہاں تک کہ فرانس نے ــــ جون کے وطن نے ... اس سرزمین نے جس کے لئے جون نے اپنی جان کو خطرات میں ڈال دیا تھا اور جس کی محبت کا خون جون کی رگ رگ میں دوڑ رہا تھا ــــ اپنے اس محسن کو سولہ ہزار پاؤنڈ قیمت لے کر انگریزوں کے ہاتھ بیچ ڈالا۔

جون کی زندگی کے ڈرامے کا تیسرا ایکٹ شیکسپیئر کی حزنیوں سے بھی کہیں زیادہ دردناک ہے کہا جاتا ہے کہ عدالت اندھی ہوتی ہے اس قول کا اطلاق سب سے زیادہ اس عدالت پر ہوتا ہے جس میں جون پر مقدمہ چلایا گیا۔ بڑے بڑے ماہرین قانون اور انسان دشمنوں نے قسم قسم کے سوالات کر کے اور جرح کے ذریعہ جون کو پھانسنا چاہا لیکن حقیقت ہمالیہ پہاڑ کی طرح اپنی جگہ جمی رہی۔ توہم پرست اور کمزور اعتقاد کے لوگوں نے اس کو سحر سامری سمجھا۔ آخر کار خود عدالت کے منشی کا بیان ہے کہ جون کے بیانات میں مجرمانہ تحریف کی گئی۔ دنیا کی اس عظیم الشان ہستی کے لئے موت کی سزا تجویز ہوئی۔

بڑے آدمیوں کی موت بھی بڑی ہی ہوتی ہے جون کو سولی نہیں دی گئی۔ اسے زہر نہیں کھلایا گیا۔ اس کا سر نہیں کاٹا۔ اس لئے کہ جو گناہ فرانس کو آزاد کر کے اس نے کئے تھے ان کی سزا دینے کے لئے یہ سارے عام طریقے غیر مناسب سمجھے گئے۔

شہر روئین کے ایک پبلک مقام پر جون کے لئے چتا تیار ہوئی۔ اور آن کی آن میں فرانس کی یہ موہنی مورت بھڑکتے ہوئے شعلوں میں چھپ گئی۔ ہزاروں آدمی کھڑے دیکھ رہے تھے اور دیکھتے رہے یہاں تک کہ گھٹتے گھٹتے

شعلے بیٹھ گئے اور آگ راکھ بن کر چاروں طرف اڑنے لگی۔ لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا اور خوشی خوشی گھر لوٹے کہ ایک بدکار کاہنہ کا خاتمہ ہوگیا۔

لیکن یہ لوگ غلطی پر تھے۔ ان شعلوں نے جون کا خاتمہ نہیں کیا بلکہ اس کی عظمت اور تقدس میں ہمیشہ کے لئے چار چاند لگا دیئے۔ حقیقت کے چہرے سے کذب وافترا اور توہمات کے پردے جلد جلد اٹھنے لگے اور جون کی عظمت کی کرنیں سارے فرانس میں پھیلنے لگیں۔ جون آف آرک سینٹ جون کہلانے لگی۔ فرانسیسی اس کے نام پر جان دیتے ہیں۔ جون آف آرک فرانس کے غیر فانی ادیبوں، مصوروں اور مورت سازوں کا موضوع بن گئی۔ آج بھی پیرس کی شاہراہ پر جون آف آرک کا مجسمہ فرانسیسیوں کو یاد دلاتا ہے کہ آزادی پانی اور ہوا کی طرح تمام قوموں کا فطری حق ہے۔

میر حسن

اردو

اے جمالِ پیکرِ ہندوستاں — تیرا عالم میں رہے اونچا نشاں
اے کہ پالا ہے بزرگوں نے تجھے — آفتیں سہہ کر اٹھا کر سختیاں
مر گئے پر تجھ کو زندہ کر گئے! — داستاں تیری ہے کتنی خونچکاں
پھر یہ کیسے ہم سے دیکھا جائیگا — کوندتی ہوں تیرے سر پر بجلیاں
لوحِ ہستی سے مٹانے کی تری — دشمنوں میں ہوتی ہیں سرگوشیاں
کوئی یہ پیغام پہنچا دے انہیں — کوششیں بے سود، محنت رائیگاں
تجھ کو حاصل ہوگئی اقبال سے — سربلندی، اور عمرِ جاوداں!
تو نہ ڈر مطلق کہ حق ہے تیرے ساتھ — ہیں ترے فرزند بھی لاکھوں جواں
جن کا دل سیماب، جن میں جوش ہے — بازوؤں میں زور جیسے پہلواں
اختروں کی طرح تابندہ تمام! — جن سے روشن ہیں زمین و آسماں
آنچ آئے تجھ پہ یہ ممکن نہیں — تیرے دم کے ساتھ ہے ہم سب کی جاں

شور عابدی (گلبرگہ)

اردو کی نئی کتابیں

ادارۂ ادبیات اردو کے شعبہ تنقید و تبصرہ کے پہلے جلسہ کی قرارداد مورخہ ۶ر بہمن ۱۳۴۸ف کے مطابق کہ ہندستان کی جدید اردو مطبوعات کی فن وار فہرست ہر مہینہ رسالہ "سب رس" میں درج ہوا کرے" ماہ جنوری ۱۳۴۹ف سے اس فہرست کی اشاعت پابندی سے ہو رہی ہے "سب رس" کی صرف دو تین اشاعتوں میں جگہ کی تنگی کی وجہ سے یہ فہرست درج نہ ہوسکی۔

اس فہرست کی اشاعت کا مقصد یہ ہے کہ ناظرین سب رس کو مختلف مضامین کی مطبوعات میں سے اپنے ذوق کی کتابیں انتخاب کرنے کا پہلا موقع ملے، اس کے علاوہ مصنفین، مولفین اور ناشرین کو بھی اس فہرست کی اشاعت سے استفادہ کا موقع ملتا ہے، وہ اس طرح کہ ان کی تصنیف، تالیف اور مطبوعات کی نشر و اشاعت ہندوستان کے طول و عرض میں جہاں جہاں "سب رس" کی رسائی ہوتی ہے بلا کسی معاوضہ کے ہوا کرتی ہے۔

زیر نظر فہرست میں کوشش کی گئی ہے کہ آخر ستمبر ۱۳۴۹ف تک کی جملہ اردو کتابوں کی تعداد فن وار درج ہو، چونکہ آخر سہ ماہی ۱۳۴۹ف کی مطبوعات کی فہرست اس وجہ سے لکھی نہ جاسکی کہ اس نمبر کی کتابت ماہ نومبر ہی میں شروع کر دی گئی۔ اس لئے آخر سہ ماہی ۱۳۴۸ف کی مطبوعات بھی اس فہرست میں شریک کر لی گئی ہیں تاکہ پورے ایک سال کے اعداد و شمار سے ناظرین کو واقفیت ہو، اس فہرست کی ترتیب میں ہندوستان بھر کے اردو رسالوں، مختلف کتب خانوں اور چھاپے خانوں کی فہرستوں اور مقامی کتب فروشوں سے مواد حاصل کیا گیا ہے۔

آخر سہ ماہی ۱۳۴۸ف سے آخر نو ماہی ۱۳۴۹ف تک سوانح، افسانہ، ڈراما، شاعری، فلسفہ، تاریخ، ادب، طب، سیاست، قانون، مذہب، اخلاقیات، ریاضیات، نفسیات، نسوانی ادب و خانہ داری وغیرہ وغیرہ پر جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان کی تعداد فن وار ذیل میں درج کی جاتی ہے

سوانح ۷۳، افسانہ ۱۰۲، ڈراما ۱۵، شاعری ۱۲۶، فلسفہ ۳، تاریخ ۸۶، ادب ۱۹۰، طب ۸۴، سیاست ۲۵، قانون ۲۴، مذہب ۱۵۷، اخلاقیات ۴، ریاضیات ۶۹، سفرنامہ ۳، نفسیات ۱۴، نسوانی ادب و خانہ داری ۲۵، لغات ۴، صنعت و حرفت ۴، معاشیات ۲، تعلیم ۲، متفرق ۹۳،

اس طرح ایک سال میں جملہ ۱۰۶۷ اردو کی کتابیں شائع ہوئیں، ادب، مذہب اور شاعری پر سب سے زیادہ کتابیں طبع ہوئیں ان کے بعد افسانہ تاریخ اور سوانح کا نمبر رہا، ریاضیات پر بھی کافی کتابیں نکلیں، ان میں سے جو اہم کتابیں شایع ہوئی ہیں ان کی تفصیل فن وار ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

سوانح

(۱) حیات عثمانی (سلطان العلوم اعلیٰ حضرت آصف جاہ ہفتم کے حالات) از شیخ یعقوب علی صاحب عرفانی ۴۰۸ صفحات قیمت مہ

(۲) ہٹلر اعظم (ہر ہٹلر کی سوانح عمری) از پروفیسر چندر شیکھر شاستری ۴۰۰ صفحات قیمت مجلد ے

(۳) اشرف السوانح (اشرف علی صاحب تھانوی کی سوانح عمری) ۲۹۸ صفحات

(۴) تذکرہ وقار (نواب وقار الملک مرحوم کی سوانح) ۳۸۸ صفحات قیمت عا/

(۵) محمد علی جناح (جناح کے حالات) از عبدالعزیز صاحب (۲۵۶) صفحات ۔

(۶) سخنوران دکن (عہد عثمانی کے شعرا کا تذکرہ) از سید تمکین صاحب عابدی ۴۸۴ صفحات قیمت سے

(۷) اتاترک ۔ باتصویر (مصطفیٰ کمال مرحوم کی سوانحعمری) از محمد مرزا صاحب آزاد ۳۰۰ صفحات قیمت عا/

(۸) روح غالب ۔ باتصویر (غالب کی سوانحعمری) از ڈاکٹر سید محی الدین صاحب زور ۲۴۰ صفحات قیمت عا/

(۹) مشاہیر ہند (چند مشہور لوگوں کے حالات) از سید بادشاہ حسین صاحب ۱۳۱ صفحات قیمت عصہ

(۱۰) حیات و کلیات اسمٰعیل باتصویر (محمد اسمٰعیل صاحب کی سوانح عمری مع مجموعہ کلام) دوسرا ایڈیشن مرتبہ محمد اسلم صاحب سیفی ۷۸۰ صفحات قیمت للعہ

(۱۱) سرسید (سوانحعمری) مرتبہ انصار الحق صاحب ۴۰ صفحات قیمت ۵/

(۱۲) عہد حاضر کے بڑے لوگ حصہ اول و دوم باتصویر (مشہور سیاسی رہنماؤں کے حالات) ۲۵۶ صفحات قیمت عصہ

(۱۳) سیرت سید احمد شہید (سید احمد صاحب بریلوی کی سوانح عمری) از سید ابوالحسن علی صاحب ۴۶۴ صفحات قیمت عا/

(۱۴) آب حیات کے لطیفے (آزاد مرحوم کے حالات) از آغا محمد اشرف صاحب ۱۴۴ صفحات قیمت ۱۲/

(۱۵) رحمۃ للعالمین جلد اول (آنحضرت کے حالات) از قاضی محمد سلیمان صاحب ۔ ۴۶۴ صفحات قیمت عا/

(۱۶) مشاہیر پولیس (پنجاب پولیس کے چند افسروں کے کارنامے) از مرزا فرید الدین بیگ صاحب ۲۹۱ صفحات

(۱۷) رئیس قادیان حصہ اول (مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کے حالات) ۲۱۴ صفحات

(۱۸) شہید مکسوینی (ائرش محب وطن کی سوانحعمری) ۱۴۲ صفحات

(۱۹) سیرت اقبال از محمد طاہر صاحب فاروقی ۳۹۴ صفحات قیمت ہے

(۲۰) حیات اقبال (مرتبہ تاج کمپنی لاہور) ۲۱۵ صفحات قیمت عہ

(۲۱) میری جد و جہد (ہٹلر کی خود نوشت سوانح عمری کا ترجمہ) ۲۶۵ صفحات قیمت عا/

(۲۲) حضرت امام حسینؓ کی مختصر سوانح عمری) از ظفر حسن صاحب ۲۳۲ صفحات

(۲۳) کمال اتاترک (محمد توفیق کی ترکی کتاب کا ترجمہ) ۲۸۸ صفحات قیمت عا/

(۲۴) واقعات اظفری (مترجمہ محمد حسین صاحب محوی لکچرار اردو مدراس یونیورسٹی ۔ قیمت عا/

(۲۵) رسول پاک (از عبدالواحد صاحب سندھی) ۱۶۵ صفحات قیمت ۸/

(۲۶) میری کہانی میری زبانی (سید ہمایوں مرزا صاحب مرحوم بیرسٹر کی خود نوشت سوانح) مرتبہ محترمہ صغرا ہمایوں مرزا صاحبہ ۳۲۸ صفحات قیمت سے

(۲۷) شاہ نعمت اللہ ولی از ایم ۔ اے حنیف ۸۰ صفحات - ۱۴/

(۲۸) خود نوشت سرگذشت (مسولینی کے حالات) ۲۸۶ صفحات قیمت ۱۲

(۲۹) تذکرہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف (از مولوی فضل اللہ صاحب) ۲۴۰ صفحات ۔ قیمت عا/

(۳۰) محمد علی جناح (از احسان اللہ صاحب کرمانی) ۲۸۰ صفحات قیمت ۱۰/

(۴۱) لینن (مترجمہ ڈاکٹر محمد اشرف صاحب قیمت مجلد عـہ

(۴۲) غالب با تصویر (غالب کی خودنوشت سوانح عمری) مرتبہ چودہری غلام رسول صاحب مہر ۴۰۰ صفحات قیمت ۱۲

(۴۳) شعرائے پنجاب (پنجاب کے موجودہ شعرا کے حالات معہ نمونہ کلام) مرتبہ ملک محمد باقر صاحب رضوانی ۳۰۶ صفحات قیمت ۱۲

(۴۴) ہلال و صلیب (سلطان صلاح الدین کی سوانح) از ایم اسلم صاحب ۲۵۰ صفحات قیمت عا

(۴۵) گلبدن بیگم (شہزادی گلبدن کی سوانح عمری) از سید ابن حسن صاحب شارق ۱۰۰ صفحات قیمت ۱۲

(۴۶) مشاہیر عالم (سولہ مشاہیر کے حالات) از کے ایے حمید بیرسٹر ۲۳۶ صفحات قیمت ۱۲

(۴۷) وداع راشد (حیات راشد کا آخری باب) رزاق الخیری ۹۰ صفحات قیمت ۸

افسانے

۱۔ محبت کا فسانہ (از لطیف الدین احمد صاحب اکبر آبادی۔ ۲۴۴ صفحات قیمت عا

۲۔ ربیعہ (از خالدہ ادیب خانم مترجمہ عبدالرحیم صاحب شبلی ۲۴۴ صفحات قیمت عـہ۔

۳۔ پس پردہ (سات مختصر افسانے) از چندر بہوشن سنگھ صاحب۔ ۱۲۸ صفحات قیمت عـہ.

۴۔ گئودان (ناول) از منشی پریم چند صاحب ۶۵۰ صفحات قیمت عا۔ مکتبہ جامعہ دہلی۔

۵۔ میری کہانی! سنئے گا؟ از سید علی صاحب شاکر ۱۲۵ صفحات قیمت عـہ

۶۔ انسپکٹر کی لڑکی (ناول) از ایم جیکب صاحب ۱۶۰ صفحات

۷۔ ماتا ہری۔ از خلیل احمد صاحب ۲۰۰ صفحات قیمت عـہ

۸۔ لالہ رخ با تصویر۔ جدید ایڈیشن مترجمہ لطیف الدین احمد صاحب۔ قیمت مجلد عا

۹۔ ساز ہستی (افسانہ) از عبدالاحد صاحب فحردن ۱۹۰ صفحات

۱۰۔ خدائی راج اور دوسرے افسانے۔ از علامہ راشد الخیری صاحب مرحوم قیمت عـہ

۱۱۔ افسانہ بابل از سردار محمد اقبال صاحب سیف ۱۶۰ صفحات قیمت ۱۲

۱۲۔ شب غم از میاں ایم۔ اسلم صاحب قیمت عـہ

۱۳۔ پریت افسانے حصہ دوم از گربخش سنگھ صاحب ۲۵۵ صفحات۔

۱۴۔ ہاشمی دوشیزہ حصہ اول و دوم (عہد عباسی کا تاریخی ناول) از محمد صادق حسین صاحب ۴۸۰ صفحات

۱۵۔ خودکشی کی انجمن (اسٹونس کے ناول سوئی سائڈ کلب کا ترجمہ) از عبدالمجید خاں سالک ۲۰۴ صفحات

۱۶۔ زندگی کے کھیل (مختصر افسانے) از لطیف الدین احمد صاحب ۱۶۰ صفحات قیمت عـہ

۱۷۔ تسخیر استنبول (تاریخی ناول) از محمد مائل صاحب ۲۵۶ صفحات۔

۱۸۔ جنت اور جہنم (ناول) از کرشن چندر صاحب قیمت عا

۱۹۔ باسی پھول۔ (افسانے) از سید علی عباس صاحب حسینی ۳۰۰ صفحات۔ قیمت عـہ

۲۰۔ طلسم خیال۔ (افسانے) از کرشن چند صاحب ۲۵۰

صفحات قیمت عہ
۲۱ - قطرات شبنم (افسانے اور ادبی مضامین) از لالہ گوردھن داس صاحب ۱۴۰ صفحات قیمت عہ
۲۲ - خون ملت (تاریخی ناول) از محمد مائل صاحب ۲۷۶ صفحات قیمت عہ
۲۳ - بیسویں صدی کی سیاہکاریاں (عبرت خیز افسانے) از ایس۔ ایس منور صاحب ۱۰۲ صفحات قیمت عصہ
۲۴ - سعی ناکام اور دیگر افسانے از امتہ الرفیق صاحبہ ۱۲۰ صفحات
۲۵ - منزل - از علی سردار صاحب جعفری قیمت ۱۲ر
۲۶ - انوکھے افسانے (جاسوسی افسانے) از شیخ بدرالاسلام صاحب فضلی ۲۰۰ صفحات
۲۷ - کاشانہ نادر (ناول) از عطاء الرحمن صاحب عطا ۲۴۸ صفحات قیمت عہ
۲۸ - اندھی دنیا - (کہانیاں) از اختر انصاری صاحب ۱۵۸ صفحات قیمت عصہ
۲۹ - لندن کی ایک رات (افسانہ) از سید سجاد ظہیر صاحب ۱۵۲ صفحات قیمت عصہ
۳۰ - خواب فراموش (انگریزی ناول کا ترجمہ) ۲۵۰ صفحات قیمت عصہ
۳۱ - ماہ درخشاں (ناول) از بیگم مرزا احمد علی صاحب ۵۵۰ صفحات قیمت مجلد عا
۳۲ - قاتل (مختصر افسانے) از میاں محمد اسلم صاحب ۲۵۶ صفحات
۳۳ - طلسم حیات (کہانیاں) از منظور حسین صاحب ماہر القادری ۲۰۰ صفحات قیمت مجلد عاہ

۳۴ - جواہرات (اخلاقی افسانے) از چودھری افضل حق صاحب ۲۲۴ صفحات
۳۵ - پری اور دیگر افسانے) از راحت آرا بیگم صاحبہ ۱۲۸ صفحات
۳۶ - آئی۔ سی۔ ایس۔ (اخلاقی افسانے) از سید عباس علی صاحب حسینی قیمت عہ
۳۷ - دغا کا پتلا ("دی ریڑن آف آرسین لوپن" کا ترجمہ) از تیرتھ رام صاحب فیروزپوری ۲۷۲ صفحات قیمت عا
۳۸ - خاموش حسن (ٹیگور کے افسانوں کا ترجمہ) ۲۳۲ صفحات قیمت عہ
۳۹ - فریبی ڈاکو (جاسوسی ناول) از راجہ رام صاحب ۱۲۸ صفحات قیمت ۱۲ر
۴۰ - لعل مقدس (دی اکیوزڈ پرنسس کا ترجمہ) از تیرتھ رام صاحب فیروزپوری ۴۳۲ صفحات قیمت عاہ
۴۱ - من کی دنیا (جدید طرز کے افسانے) از رشید صاحب قریشی ۱۶۰ صفحات قیمت مجلد عصہ
۴۲ - بحری طوفان (ناول) از نعیم اللہ صاحب کوثر ۲۰۰ صفحات
۴۳ - مسلمان مجاہد (ناول) از خواجہ نذیر احمد صاحب ۸۰ صفحات
۴۴ معیار محبت اور دیگر افسانے (از سیاح سنائی صاحب جزنلسٹ ۱۷۲ صفحات قیمت عصہ
۴۵ - سحر فرانس (موپساں کے افسانوں کا ترجمہ) از طاہر قریشی صاحب ۲۲۵ صفحات قیمت عہ
۴۶ - انمول کہانیاں (بارہ انقلابی افسانے) از شوکت تھانوی صاحب ۱۳۱ صفحات قیمت ۱۲ر
۴۷ - کیلے کا چھلکا اور دیگر مضامین (مزاحیہ افسانے و مضامین) از سید انجہازی صاحب ۱۷۶ صفحات قیمت عصہ
۴۸ - ایک کہانی - چہار دیبوں کی زبانی) از امتیاز - ل - احمد علی عباس وغیرہ

۲۰ صفحات قیمت ۶ر

۴۹ - چوپال (دیہاتی افسانے) از احمد ندیم صاحب قاسمی ۳۰۴ صفحات قیمت عہ

۵۰ - محبت کی چھاؤں (۷ افسانے) از مرزا ظفر الحسن بی۔اے ۱۳۲ صفحات قیمت عہ

۵۱ - ڈاچی (افسانے) از اپندر ناتھ اشک ۲۰۸ صفحات قیمت عمہ

۵۲ - صدائے جرس (افسانے) از والدہ سراج الدین ظفر ۳۰۰ صفحات قیمت عہ

۵۳ - افسانہ پدمنی (ادرانی پدمنی کے فسانہ کی مورخانہ تحقیق) از احتشام الدین ایم۔اے ۱۵۰ صفحات قیمت عمہ

ڈرامے

۱ - ریڈیو ڈرامے (۸ ڈراموں کا مجموعہ) از فضل حق صاحب قریشی ۱۹۲ صفحات قیمت عمہ

۲ - انار کلی (تیسرا ایڈیشن) از سید امتیاز علی صاحب تاج بی۔اے ۱۹۸ صفحات قیمت عہ

۳ - تسلیم (المیہ ڈراما) از سید مظہر علی صاحب گیلانی ۸۰ صفحات قیمت ۶ر

۴ - پہلا شرابی کار (ٹالسٹائی کے ڈرامہ کا ترجمہ) از محمد یونس صاحب سلیم ۴۰ صفحات قیمت ۴ر

۵ - بے انصافی کا انصاف (عدالتوں کی بے انصافیاں) از پنڈت دیو دت صاحب شرما ۳۱۰ صفحات قیمت عمہ

شاعری

۱ - باغی (باغیانہ نظمیں) از جانباز قریشی صاحب ۱۲۵ صفحات قیمت عمہ

۲ - گلستان شرف (اردو و فارسی کلام کا مجموعہ) از سید ابو الفتح شرف الدین الحسینی صاحب شرف ۱۲۰ صفحات قیمت عمہ

۳ - نور مشرق (نظمیں) از جوہر لال صاحب ضیا فتح آبادی۔ ۱۳۶ صفحات قیمت عمہ

۴ - نیرنگ فطرت (نظموں اور غزلوں کا مجموعہ) از پنڈت اندر جیت صاحب شرما ۲۱۷ صفحات قیمت عہ

۵ - افکار سلیم (وحید الدین صاحب سلیم کی نظمیں) مرتبہ محمد اسمٰعیل صاحب پانی پتی ۲۱۸ صفحات قیمت عہ

۶ - دیوان بیدار (میر محمدی صاحب بیدار کا مجموعہ کلام) مرتبہ محمد حسین صاحب محوی صدیقی لکچرار اردو مدراس یونیورسٹی قیمت عہ

۷ - جنون و حکمت (رباعیات کا مجموعہ) از جناب جوش ملیح آبادی قیمت سے

۸ - آہنگ (نظمیں) از اسرار الحق صاحب مجاز ۱۰۴ صفحات قیمت عمہ

۹ - الخیام (عمر خیام کی رباعیوں کا اردو ترجمہ) از رائے گورسرن لال صاحب آزاد قیمت ۱۲ر

۱۰ - میخانہ الہام (مجموعہ کلام) از جناب شاد عظیم آبادی قیمت ہے

۱۱ - ارمغان حجاز (علامہ اقبال کا آخری کلام) قیمت ہے

۱۲ - نغمہ حرم (نظمیں) از اختر صاحب شیرانی قیمت عہ

۱۳ - آہ کے سو شعر از ڈاکٹر سید محمد صفدر صاحب آہ قیمت ۸ر

۱۴ - ترجمان الغیب (حافظ کی چھ سو غزلوں کا منظوم ترجمہ) از محمد احتشام الدین ایم اے ۳۲۲ صفحات قیمت عہ

۱۵ - آہنگ رزم (رزمیہ نظمیں) از جناب فقار انبالوی ۴۸ صفحات قیمت ۸ر

۱۶ - تصویر کشمیر (نظمیں) از جناب حفیظ جالندھری۔ قیمت ۸ر

۱۷ - نغمہ ازل (نعتیہ کلام) از محمد یونس صاحب جلیل ۹۶ صفحات قیمت عمہ

۱۸ ۔ نغمۂ نور (غزلیں اور نظمیں) از جناب بہزاد لکھنوی ۲۰۰ صفحات
قیمت عمہ
۱۹ ۔ بادۂ فطرت (مجموعۂ کلام) از میر زیدی صاحب ۲۸۸
صفحات قیمت ۱۲/
۲۰ ۔ حدیثِ حسن (نظمیں) از شمیم احمد صاحب فطرت قیمت عمہ
۲۱ ۔ اربعہ عناصر (رباعیات) از حکیم محمود علی خاں صاحب ماہر
۲۰۸ صفحات قیمت عمہ
۲۲ ۔ حرف و حکایات (نظمیں) از جناب جوش ملیح آبادی
۲۴۸ صفحات قیمت عاں
۲۳ ۔ قندیلِ نور (مرثیوں کا مجموعہ) از جناب نور لدھیانوی
۱۸۴ صفحات
۲۴ ۔ دیوانِ ثاقب (از مرزا ذاکر حسین صاحب ثاقب لکھنوی
۵۵۰ صفحات قیمت عاں
۲۵ ۔ تصویرِ احساس (مجموعہ کلام) از الطاف مشہدی صاحب
قیمت عاں
۲۶ ۔ ارمغانِ جذب حصہ دوم (رباعیات) از راگھوندر راؤ صاحب
جذب ۱۲۰ صفحات قیمت ۱۲/
۲۷ ۔ کلیاتِ بحری (قدیم دکھنی شاعر) مرتبہ ڈاکٹر محمد حفیظ سید صاحب
۳۱۲ صفحات قیمت سے
۲۸ ۔ ریاضِ حیدر (مرثیوں کا مجموعہ) از حیدر عباس صاحب
رضوی ۲۰۰ صفحات
۲۹ ۔ نغمۂ نانک (مجموعۂ کلام) از نانک چند صاحب نانک
لکھنوی ۲۵۲ صفحات
۳۰ ۔ تمثیلی مشاعرہ (مشہور قدیم شعرا کا کلام ڈرامائی طرز میں)
از پنڈت کیفی صاحب ۱۰۰ صفحات قیمت عمر
۳۱ ۔ سرودِ جاوید (مثنوی سحر البیان پر تبصرہ) از شمس الحسن صاحب
شمس ۲۰۴ صفحات
۳۲ ۔ جوہرِ تخلیق (شاہنامہ کی ایک جنگ کا منظوم ترجمہ) از سید
محمد علی صاحب چشم ۹۸ صفحات قیمت ۸/
۳۳ ۔ شہنشاہ نامۂ اسلام (آنحضرتؐ اور خلفا کے غزوات)
۲۱۵ صفحات
۳۴ ۔ تنقیدی مضامین (شعرا کے کلام پر تنقید) از ایم۔ ایم۔ اے
ہاشمی صاحب و فیاض حسین صاحب زیدی۔
۳۵ ۔ سریلی بانسری (مجموعہ کلام) از سید انور حسین صاحب آرزو
۲۰۰ صفحات قیمت عاں
۳۶ ۔ چراغاں (مجموعہ کلام) از جناب احسان دانش ۲۳۲
صفحات قیمت عہ
۳۷ ۔ آتش خاموش (مجموعہ کلام " " ۲۰۰ صفحات قیمت عمہ
۳۸ ۔ نفیرِ فطرت " " " ۲۰۰ صفحات قیمت عمہ
۳۹ ۔ جادۂ نو (قطعات) " " قیمت ۸/
۴۰ ۔ نوائے کارگر (مجموعہ کلام) " " ۳۶۸ صفحات قیمت عاں
۴۱ ۔ تفصیلِ غالب (دیوانِ غالب کی شرح) از جناب احسان
دانش قیمت عمہ
۴۲ ۔ خضرِ عروض (علمِ عروض کی الجھنوں کا حل) از جناب احسان
دانش قیمت ۸/
۴۳ ۔ فرحتِ دل (منتخب اشعار) از خان بہادر عبداللہ خاں
۲۷۱ صفحات قیمت عہ
۴۴ ۔ معارفِ جمیل (مجموعہ کلام) از حکیم آزاد انصاری ۲۵۶
صفحات قیمت عہ
۴۵ ۔ گل نغمہ (نظموں کا مجموعہ) از ڈاکٹر عظیم الدین احمد عظیم
قیمت عاں
۴۶ ۔ جذباتِ بسمل با تصویر (مجموعہ کلام) از منشی سکھ دیو پرشاد

بستل قیمت ۱۲ر

۴۷۔ پیام روح باتصویر (مجموعہ کلام) از حامد اللہ افسر قیمت ۱ر
۴۸۔ شعرائے عثمانیہ (مرقع سخن کی چوتھی جلد) مرتبہ سید معین الدین قریشی و عبدالقیوم خاں باقی ۲۳۱ صفحات قیمت ۱ر
۴۹۔ عرفانیات فانی (کلیات) از شوکت علی خاں فانی قیمت ۸ر
۵۰۔ خونابۂ دل (مجموعہ کلام) از شعیب احمد ندرت میرٹھی قیمت عہ
۵۱۔ خمخانہ (مجموعہ کلام) از گوبرسرن لال آزاد ۲۱۲ صفحات قیمت ۸ر
۵۲۔ متاع اقبال (اقبال کی شاعری پر تبصرہ) از ابوظفر عبدالواحد قیمت عہ
۵۳۔ تقلقہ (غزلوں اور نظموں کا مجموعہ) از حاجی لق لق قیمت عہ
۵۴۔ برق و باراں (انقلابی نظمیں) از شمیم کرمانی قیمت عہ
۵۵۔ کائنات دل (نظمیں) از منور لکھنوی ۳۵۰ صفحات
۵۶۔ اقبال اور اس کا پیغام (شاعری پر تبصرہ) از ڈاکٹر تصدق حسین خالد قیمت ۸ر
۵۷۔ یادِ چکبست (چکبست اور ان کی شاعری پر مضامین) از پنڈت انند نرائن ملا ۱۷۱ صفحات

فلسفہ

(۱) فہم انسانی (ہیوم کی مشہور کتاب کا ترجمہ) ۴۹۱ صفحات
۲۔ خواب کی دنیا (خواب کی ماہیت اور اس کا فلسفہ) از عبدالمالک صاحب ۱۹۰ صفحات قیمت ۱۲ر
۳۔ فلسفۂ حسن از مست رام صاحب ۱۹۶ صفحات
۴۔ حیات کیا ہے (حیات کی ابتدا، اور اس کے ارتقا پر تبصرہ) قیمت ۱۲ر

تاریخ

۱۔ دہلی کی دو سو برس کی تاریخ، از سید حسن صاحب برنی ۱۵۴ صفحات
۲۔ تاریخ مدینہ منورہ از غلام دستگیر صاحب نامی ۱۸۴ صفحات
۳۔ نور المبین (فرقہ اسماعیلیہ کے ائمہ کے تاریخی حالات) از علی محمد خان صاحب ۔۔ صفحات قیمت ۱ر
۴۔ دنیا کی کہانی (تاریخی تقاریر کا مجموعہ) از پروفیسر محمد مجیب صاحب ۲۲۷ صفحات قیمت عہ
۵۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل (تین سو برس کی تاریخ) از سید طفیل احمد صاحب علیگ ۶۰۸ صفحات قیمت ۱ر
۶۔ تاریخ گولکنڈہ باتصویر (مشہور تاریخی قلعہ گولکنڈہ کے حالات) از پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی ۲۱۴ صفحات قیمت ۸ر
۷۔ شجرۂ آصفیہ (شجرۂ خاندان آصفی) از حکیم سید شمس اللہ صاحب قادری ۹۵ صفحات معہ متعدد شجرے قیمت ۸ر
۸۔ مسلمانوں کا ایثار اور آزادی کی جنگ (اسلامی سیاسیات کی تاریخ) از عبدالوحید خاں صاحب ۴۵۲ صفحات
۹۔ تاریخ نظم و نثر از آغا محمد باقر صاحب ۳۱۶ صفحات
۱۰۔ مرقع ملتان از سید محمد اولاد علی صاحب گیلانی ۲۱۶ صفحات
۱۱۔ مدراس میں اردو۔ از نصیر الدین صاحب ہاشمی ۲۰۰ صفحات قیمت مجلد ۱۲ر
۱۲۔ تاریخ ائمہ (انبیاء کرام و ائمہ طاہرین کے حالات) از سید علی حیدر صاحب ۵۰۴ صفحات قیمت ۱ر
۱۳۔ تاریخ اسلامی ہند از جناب نیاز فتحپوری ۲۴۲ صفحات قیمت ۱ر
۱۴۔ تاریخ ملت (ایام جاہلیت سے خلافت راشدہ تک کی تاریخ) از مسلم صاحب دہلوی ۲۲۸ صفحات

۱۵۔ برطانوی ہند کی تاریخ اور اس کے مورخین۔ از ڈاکٹر سرشفاعت احمد خانصاحب ۱۰۳ صفحات

۱۶۔ انقلاب حبش (حبش پر اطالیہ کے مظالم) از محمد اشرف خانصاحب۔ عطا قیمت ۱۲ر

ادب

۱۔ پیام اقبال (علامہ اقبال کے پیام پر مضامین) ۳۰۰ صفحات قیمت عا

۲۔ صحرا نورد کے خطوط از مرزا ادیب صاحب ۵۰۰ صفحات قیمت عہ

۳۔ مضامین فراق از خواجہ سید ناصر نذیر صاحب فراق ۶۰ صفحات قیمت عمر

۴۔ مضامین رشید (مزاحیہ) از رشید احمد صاحب صدیقی ۲۲۳ صفحات قیمت عا

۵۔ مضامین فلک پیما از خان بہادر میاں عبدالعزیز صاحب ۳۸۰ صفحات قیمت عار

۶۔ فلکش (مزاحیہ مضامین) از سید ابوطاہر داؤد صاحب ۲۵۶ صفحات قیمت عہ

۷۔ مطائبات (فکاہی مضامین) از چراغ حسن صاحب حسرت ۱۱۶ صفحات عمر

۸۔ جوہر اقبال (مجموعہ مضامین) از ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب وغیرہ قیمت عہ

۹۔ بکھری ہوئی پتیاں (مجموعہ مضامین) از علامہ راشد الخیری صاحب مرحوم قیمت عمر

۱۰۔ مقالات شبلی جلد ششم از مولانا شبلی نعمانی مرحوم ۲۰۲ صفحات

۱۱۔ مکاتیب مہدی (مہدی حسن صاحب کے خطوط) مرتبہ مہدی بیگم صاحبہ ۳۰۲ صفحات قیمت سے

۱۲۔ قطرات شبنم (مجموعہ مضامین) از گوردھن داس صاحب بی۔ اے ۱۴۴ صفحات

۱۳۔ تاریخ و تنقید (مضامین کا مجموعہ) از پروفیسر عابد حسن صاحب ۲۲۴ صفحات قیمت عہ

۱۴۔ شمع راہ (خطبات) از پروفیسر محمد سجاد مرزا بیگ صاحب ۱۱۵ صفحات قیمت ۱۰ر

۱۵۔ نوجوان اور مفلسی (اصلاحی مضامین) از سید صابر حسین صاحب قیمت ۱۰ر

۱۶۔ ہندوستانی (ریڈیو تقاریر) از ڈاکٹر تارا چند صاحب وغیرہ قیمت ۱۲ر

۱۷۔ راز و نیاز۔ از سلطان احمد صاحب۔ جودی قیمت عمر

۱۸۔ موتی (اقوال کا مجموعہ) از سید یوسف صاحب بخاری ۱۴۰ صفحات قیمت ۱۲ر

۱۹۔ محاورات اردو۔ از حافظ عبدالکریم صاحب مفتوں ۱۴۴ صفحات قیمت ۸ر

۲۰۔ اصلاح ادب (اردو زبان کی غلطیاں) از غلام حیدر صاحب

۲۱۔ نقوش سلیمانی (مضامین و تقاریر کا مجموعہ) از مولانا سلیمان صاحب ندوی ۴۷۶ صفحات قیمت عار

۲۲۔ مقالات ہاشمی۔ از نصیر الدین صاحب ہاشمی ۴۶۴ صفحات قیمت عللہ ر

۲۳۔ مجنوں کے خطوط از عطاء الرحمن صاحب عطا علیگ ۳۰۰ صفحات قیمت عا

۲۴۔ سنہرا حلقہ (ایک خاتون کے خطوط) از ناظر صاحب کاکوری ۸۰ صفحات

طب

۱۔ کلیات ادویہ از حکیم کبیرالدین صاحب ۵۹۰ صفحات قیمت مجلد صہ

۲۔ تحفۂ نایاب (مجرب نسخے) از محمد عبدالرحیم صاحب جمیل ۱۴۴ صفحات قیمت

۳۔ شاہراہ تندرستی (صحت و امراض کا ترجمہ) از لالہ رنگ بہاری لال صاحب ۱۲۰ صفحات

۴۔ بچوں کی بیماریاں از ڈاکٹر سید ممتاز حسین صاحب ۲۰۰ صفحات قیمت عصہ

۵۔ طبیب نسواں مع رہنمائے دایاں از حاجی اصغر علی صاحب ۱۹۲ صفحات

۶۔ اسرار جیلانی از حکیم غلام جیلانی صاحب ۱۰۰ صفحات

۷۔ پاکٹ ڈاکٹر (دوسرا ایڈیشن) از محمد عبدالرحمن صاحب ۲۱۰ صفحات

۸۔ کفیل صحت از محمد خلیل شاہ صاحب ۱۷۹ صفحات

۹۔ نیا علم شفا بخشی (نواں ایڈیشن) از لوئیس کوھینی ۵۴۲ صفحات

۱۰۔ گنجینۂ طبیب حصہ چہارم از حاجی اصغر علی صاحب ۹۶۲ صفحات

۱۱۔ گلزار رحمت از حکیم وزیر چند صاحب ۱۸ صفحات

۱۲۔ مشیر الصحت عرف دیہاتی چٹکلے (چند مجرب نسخے) از میر مصطفےٰ علی صاحب ودم متعلقہ از ملگندہ

۱۳۔ گربہ شاستر (ضبط تولید اور زچہ و بچہ کی حفاظت) ۲۰۵ صفحات

۱۴۔ مرقع جمیل از محمد عبدالرحیم صاحب جمیل ۲۲۸ صفحات

۱۵۔ تہذیبی نسخے۔ (تہذیب نسواں کے نسخوں کا مجموعہ) ۲۲۴ صفحات

۱۶۔ ہومیو علاج (ہومیوپیتھی علاج کے متعلق) ۹۲۳ صفحات

۱۷۔ ضبط تولید و اصلاح نسل مرتبہ حکیم عبدالحمید صاحب دہلوی ۳۰۰ صفحات قیمت ۱۲؍

۱۸۔ خوراک صحت (مہاتما گاندھی کے تجربات) ۱۷۶ صفحات قیمت ۱۲؍

سیاسیات

۱۔ حکومت خود اختیاری اور ہندو مسلم مسئلہ کا حل از طفیل احمد صاحب ۵۲۴ صفحات

۲۔ ترکی جمہوریہ (ترکی کی سیاست) از ضمیر احمد صاحب ہاشمی ۳۶۴ صفحات

۳۔ کمیٹی دستوری اصلاحات کی رپورٹ (حیدرآباد کے دستوری اصلاحات) مرتبہ سید یوسف علی صاحب معتمد کمیٹی ۱۶۴ صفحات قیمت عہہ

۴۔ تحریک ترقی مملکت آصفیہ از خواجہ حمید احمد صاحب بی اے عثمانیہ ۱۳۳ صفحات قیمت ے

۵۔ سیاسیات کی پہلی کتاب از محمد عاقل صاحب ایم اے ۲۰ صفحات ۵؍

۶۔ مسلمانان ہند کی سیاست وطنی از محمد امین صاحب زبیری ۲۱۹ صفحات قیمت ۱۰؍

۷۔ شیطان کا انتقام (دور حاضر کے سیاسی حالات) از محمد جلال الدین صاحب اشک ۹۰ صفحات قیمت عصہ

۸۔ جمعیۃ الاقوام پر ایک نظر (جمعیۃ الاقوام کے مقاصد اور عمل کا جائزہ) ۸۰ صفحات

۹۔ متاع حق (اسلامی سیاست) از سید امیر احمد صاحب ۱۵۸ صفحات قیمت ۸؍

۱۰۔ جدید جغرافیہ پنجاب (پنجاب کی سیاست پر مزاحیہ تبصرہ) ازسند باد جہازی قیمت عہ

قانون

۱۔ قانون اسٹامپ حصہ اول از گردھاری صاحب ساگر ۲۴۴ صفحات

۲۔ آئین حکومت ہند (دوسرا ایڈیشن) از عبد المجید خاں صاحب سالک بی۔ اے۔ ۴۰۰ صفحات

۳۔ تحفہ نمبر ۳ (قانون وراثت) از رلیا رام صاحب ۱۹۲ صفحات۔

۴۔ میڈیکل جورس پروڈنس از محمد سلیمان صاحب قریشی ۱۱۰ صفحات

۵۔ معاشدار (عطیہ معاش کی وضاحت) از کاشی ناتھ راؤ صاحب وکیل نظام آباد قیمت عہ

دینیات

۱۔ مذاہب اور انسانیت (بارہ مختلف مذاہب کے اصول) از لالہ ہردیال صاحب ۲۸۸ صفحات قیمت عہ

۲۔ اظہار حقیقت از مجبور صاحب چشتی ۱۰۴ صفحات

۳۔ بچوں کے لئے رامائن از پروفیسر رام سروپ صاحب ۲۲۸ صفحات

۴۔ عرفان نانک (سکھوں کی دعا کا ترجمہ) از برج لعل سنگھ صاحب بیدی ۲۲۲ صفحات

۵۔ جیون چرتر (مذہبی ہدایات) از سوامی بھگوان سنگھ صاحب ۲۸۷ صفحات

۶۔ یدبیضا (اسلام اور مسلم سوسائٹی پر مضامین) از ڈاکٹر سید نجم الدین احمد صاحب جعفری ۱۴۰ صفحات

۷۔ تاثیرات قادیان از ملک فضل حسین صاحب ۲۴۴ صفحات

۸۔ گیتا امرت (ماخوذ از بھگوت گیتا) از چودھری روشن لال صاحب ۲۳۸ صفحات قیمت ۶ر

۹۔ فن تفسیر از مرزا عزیز صاحب قیصانی ۲۰۰ صفحات

۱۰۔ ہندوستانی اسلام (دو خاص مذاہب کی تاریخی حیثیت) از قاضی اظہار الدین صاحب ۵۰ صفحات قیمت ۶ر

۱۱۔ مدح صحابہ اور تبرا (اقتباسات اخبار مدینہ) ۹۶ صفحات قیمت ۴ر

۱۲۔ اسلامی نظام تعلیم از ریاست علی صاحب ندوی ۵۶ صفحات

۱۳۔ نغمۂ توحید از سری سچدانند سدگرو یوگی راج ۲۰۰ صفحات قیمت عہ

۱۴۔ پیام امین (کلام اللہ کی تدوین اور اس کی تعلیم) دوسرا ایڈیشن از محمد عبداللہ صاحب منہاس ۱۴۰ صفحات قیمت عہ

۱۵۔ اسلام میں غلامی کی حقیقت از سعید احمد ایم۔ اے ۲۶۲ صفحات قیمت عہ

۱۶۔ مقدس قانون۔ از ناصر الدین رشید ترابی قیمت ۱۰ر

۱۷۔ تنقیحات (اسلام اور مغربی تہذیب پر تبصرہ) از سید ابوالاعلیٰ مودودی ۱۴۰ صفحات قیمت ۱۲ر

اخلاقیات

۱۔ انسان (انسان اور انسانیت کے متعلق) از کاشی ناتھ رام صاحب چاؤلہ ۳۰۰ صفحات قیمت ۸ر

۲۔ مخزن اخلاق (پانچواں ایڈیشن) از رحمت اللہ صاحب سبحانی

۴۰۰ صفحات

ریاضیات

۱۔ فہمید حساب حصہ دوم از ایم اے نذیر صاحب ۱۰۶ صفحات

۲۔ کرشنا میکینکل گائیڈ از پنڈت کشن چند صاحب سردار ۳۰۳ صفحات

سفرنامہ

۱۔ سفرنامہ حکیم ناصر خسرو۔ مرتبہ حرمت اللہ صاحب کہانی ۱۵۰ صفحات

۲۔ سیر کشمیر۔ از کوی راج بلونت سنگھ صاحب ۲۳۶ صفحات قیمت عہ

۳۔ اندرون ہند خالدہ ادیب خانم کی انگریزی کتاب ان سائڈ انڈیا کا اردو ترجمہ از سید ہاشمی قیمت سے

نفسیات

۱۔ مظاہر ذہنیات از ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب ۱۸۴ صفحات قیمت عا

نسوانی ادب و خانہ داری

۱۔ نذر دکن۔ (سب رس کے دکن نمبر کا ضمیمہ نسواں) مرتبہ محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ ۱۰۴ صفحات قیمت عہ

۲۔ بڑھاپے کی برکتیں اور عورت از خواجہ عبدالحمید صاحب دہلوی ۹۶ صفحات قیمت عمہ

۳۔ علم خانہ داری از محترمہ ممتاز شاہنواز صاحبہ ۲۰۰ صفحات قیمت عمہ

۴۔ گلزار درخشاں (دستکاری کے متعلق) از آر۔ کے درخشاں صاحبہ قیمت عمہ

۵۔ ہندوستانی کشیدہ کاری۔ از مس امۃ اللہ قیمت عمہ

۶۔ مراۃ العروس (جدید ایڈیشن) از مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم ۲۳۲ صفحات قیمت ۱۲ر

۷۔ بنات النعش (جدید ایڈیشن) از مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم ۲۳۰ صفحات قیمت ۱۲ر

۸۔ توبۃ النصوح (جدید ایڈیشن) از مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم ۲۲۷ صفحات قیمت ۱۲ر

۹۔ مسلمان عورت کے حقوق از علامہ راشد الخیری صاحب مرحوم قیمت ۱۲ر

۱۰۔ ساجن موہنی (تسخیر شوہر کے طریقے) از علامہ راشد الخیری صاحب مرحوم قیمت ۴ر

۱۱۔ من کی بتیا (اصلاح معاشرت) از محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ۔ ایم۔ اے ۸۸ صفحات قیمت ۸ر

۱۲۔ محکومیت نسواں (حقوق نسواں) از معین الدین صاحب انصاری قیمت عمہ

۱۳۔ مکمل باورچی خانہ از فہمیدہ خاتون صاحبہ۔ فرحت ۲۰۰ صفحات قیمت ۱۲ر

۱۴۔ سوتیلی ماں۔ از رابعہ بیگم صاحبہ۔ شعبہ نسواں ادارہ ادبیات اردو۔ ۵۶ صفحات قیمت ۴ر

لغات

۱۔ فرہنگ عامرہ۔ (عربی۔ فارسی اور ترکی کی لغات کا فرہنگ) از محمد عبداللہ خاں صاحب قریشی ۵۸۲ صفحات قیمت عا

۲۔ مبادی اللغات (اردو لغت) از فیض محمد صاحب ۱۹ صفحات

صنعت و حرفت

۱۔ روپئے بنانے کی مشین (صابن سازی فوٹوگرافی وغیرہ)

ازیم۔آر انند ۱۱۲ صفحات

۲۔انڈین ماسٹر آف کرپا تصویر (لباس کی کتر بیونت) قیمت عہ

۳۔وصلی کی دستکاری از سید رضا احمد صاحب جعفری ۵۶ صفحات قیمت ۸ر

۴۔لکڑی کا باریک کام از سید رضا احمد صاحب جعفری ۵۸ صفحات قیمت ۸ر

۵۔صنعت وحرفت کے قیمتی راز از مہانند جی قیمت عہ

۶۔ہندوستان کی صنعت وتجارت از منت اللہ صاحب رحمانی ۱۲۴ صفحات

معاشیات

۱۔ہندوستان میں برطانوی حکومت کے بعض معاشی اور مالی پہلو۔ از ڈاکٹر زین الدین احمد صاحب ۱۵ صفحات قیمت ۸ر

۲۔اجتماعی زندگی کی ابتدا راز محمد عاقل صاحب ۱۱۲ صفحات

تعلیم

۱۔رہنمائے اساتذہ از للیارام صاحب ۲۵۶ صفحات

۲۔بنیادی قومی تعلیم کا نصاب از ذاکر حسین صاحب ۲۴۰ صفحات قیمت عہ

۳۔اردو مضمون نویسی از پروفیسر نانک پرشاد صاحب بی۔اے قیمت ۸ر

متفرق

۱۔کرشمۂ روحانی از محمد شریف صاحب ۹۶ صفحات

۲۔تلوار (متعلق شمشیر زنی) از کپتان اعجاز علی صاحب شہرت قیمت ۶ر

۳۔لذت شادی۔ از بی چندر صاحب بکل ۱۶۰ صفحات

۴۔کالا علم۔ (طلسمات پر ایک مصری کتاب کا ترجمہ) ۲۱۶ صفحات۔

۵۔ترکاری۔ از جی۔ ایم ملک صاحب ۴۸ صفحات

۶۔معلم پٹوار از آغا نثار احمد صاحب ۴۴ صفحات

۷۔چوپائے اور انسان از موہن لال صاحب ۱۶ صفحات

۸۔انسداد گداگری از سلطان احمد صاحب قیمت عہ

۹۔اسلامی سپہ گری از عبدالکریم صاحب قیمت عہ

۱۰۔سکھی کسان از عبدالحمید صاحب تحصیلدار آرمور نظام آباد ۱۹۳ صفحات عہ

۱۱۔برہمچریہ (مہاتما گاندھی کے تجربات) ۹۶ صفحات قیمت ۹ر

۱۲۔گرہست جیون (") ۵۰ صفحات قیمت ۱۲ر

۱۳۔یورپ کے تاثرات (چند اہل قلم کے تاثرات) مرتبہ بدر شکیب بی۔ اے ۱۹۰ صفحات قیمت عہ

۱۴۔مغربی تصانیف کے اردو متراجم از میر حسن ایم اے ۳۴ صفحات قیمت عہ

۱۵۔نئے مسائل (فکر و عمل کی نئی راہیں) از محمد مرغوب الدین بی۔اے قیمت ۸ر

مرزا سیف علی خاں

۸۰۴ صفحات

ریاضیات

۱۔ فہمید حساب حصہ دوم از ایم اے نذیر صاحب ۱۸۶ صفحات
۲۔ کرشنا میکنیکل گائیڈ از پنڈت کشن چند صاحب سردار ۳۲۰ صفحات

سفرنامہ

۱۔ سفرنامہ حکیم ناصر خسرو۔ مرتبہ صمد اللہ صاحب کیانی ۱۵۰ صفحات
۲۔ سیر کشمیر۔ از کوی راج بلونت سنگھ صاحب ۲۲۶ صفحات قیمت عہ
۳۔ اندرون ہند خالدہ ادیب خانم کی انگریزی کتاب ان سائڈ انڈیا کا اردو ترجمہ از سید ہاشمی قیمت سے

نفسیات

۱۔ مظاہر ذہنیات از ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب ۱۸۴ صفحات قیمت عا

نسوانی ادب و خانہ داری

۱۔ نذر دکن۔ (سب رس کے دکن نمبر کا ضمیمہ نسواں) مرتبہ محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ ۱۰۴ صفحات قیمت عہ
۲۔ بڑھاپے کی برکتیں اور عورت از خواجہ عبدالحمید صاحب دہلوی ۹۶ صفحات قیمت عصہ
۳۔ علم خانہ داری از محترمہ ممتاز شاہنواز صاحبہ ۷۰ صفحات قیمت عصہ
۴۔ گلزار درخشاں (دستکاری کے متعلق) از آر۔ کے درخشاں صاحبہ قیمت عصہ
۵۔ ہندوستانی کشیدہ کاری۔ از مس امۃ اللہ قیمت عصہ
۶۔ مراۃ العروس (جدید ایڈیشن) از مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم ۲۳۲ صفحات قیمت ۱۲/
۷۔ بنات النعش (جدید ایڈیشن) از مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم ۲۳۰ صفحات قیمت ۱۲/
۸۔ توبۃ النصوح (جدید ایڈیشن) از مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم ۲۲۰ صفحات قیمت ۱۲/
۹۔ مسلمان عورت کے حقوق از علامہ راشد الخیری صاحب مرحوم قیمت ۱۲/
۱۰۔ ساجن موہنی (تسخیر شوہر کے طریقے) از علامہ راشد الخیری صاحب مرحوم قیمت ۴/
۱۱۔ من کی بیتا (اصلاح معاشرت) از محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ۔ ایم۔ اے ۸۸ صفحات قیمت ۸/
۱۲۔ محکومیت نسواں (حقوق نسواں) از معین الدین صاحب انصاری قیمت عصہ
۱۳۔ مکمل باورچی خانہ از فہمیدہ خاتون صاحبہ۔ فرحت ۲۰۰ صفحات قیمت ۱۲/
۱۴۔ سوتیلی ماں۔ از رابعہ بیگم صاحبہ۔ شعبہ نسوان ادارہ ادبیات اردو۔ ۵۶ صفحات قیمت ۴/

لغات

۱۔ فرہنگ عامرہ۔ (عربی۔ فارسی اور ترکی کی لغات کا فرہنگ) از محمد عبداللہ خاں صاحب قریشی ۵۸۲ صفحات قیمت عا
۲۔ مبادی اللغات (اردو لغت) از فیض محمد صاحب ۱۹۱ صفحات

صنعت و حرفت

۱۔ روپیہ بنانے کی مشین (صابن سازی فوٹوگرافی وغیرہ)

ازیم۔آر انند ۱۱۲ صفحات
۲۔انڈین ماسٹر آف کرّبا تصویر (لباس کی کتربیونت قیمت عہ
۳۔وصلی کی دستکاری از سید رضا احمد صاحب جعفری ۵۶ صفحات قیمت ۸ر
۴۔لکڑی کا باریک کام از سید رضا احمد صاحب جعفری ۵۸ صفحات قیمت ۸ر
۵۔صنعت وحرفت کے قیمتی راز از مہاتما ندجی قیمت عہ
۶۔ہندوستان کی صنعت وتجارت از منت اللہ صاحب رحمانی ۱۲۴ صفحات

معاشیات

۱۔ہندوستان میں برطانوی حکومت کے بعض معاشی اور مالی پہلو۔ از ڈاکٹر زین الدین احمد صاحب ۱۵ صفحات قیمت ۸ر
۲۔اجتماعی زندگی کی ابتدا از محمد عاقل صاحب ۱۱۲ صفحات

تعلیم

۱۔رہنمائے اساتذہ از لیلارام صاحب ۲۵۶ صفحات
۲۔بنیادی قومی تعلیم کا نصاب از ذاکر حسین صاحب ۲۴۴ صفحات قیمت عہ
۳۔اردو مضمون نویسی از پروفیسر نانک پرشاد صاحب بی۔اے قیمت ۸ر

متفرق

۱۔کرشمۂ روحانی از محمد شریف صاحب ۹۶ صفحات
۲۔تلوار (متعلق شمشیر زنی) از کپتن اعجاز علی صاحب شہرت قیمت ۶ر
۳۔لذت شادی۔ از بی چند صاحب بکل ۱۶۰ صفحات
۴۔کالاعلم۔ (طلسمات پر ایک مصری کتاب کا ترجمہ) ۲۱۶ صفحات۔
۵۔ترکاری۔ از جی۔ ایم ملک صاحب ۴۰ صفحات
۶۔معلم پٹوار از آغا نثار احمد صاحب ۲۴۴ صفحات
۷۔چوپائے اور انسان از موہن لال صاحب ۱۶ صفحات
۸۔انسداد گداگری از سلطان احمد صاحب قیمت عہ
۹۔اسلامی سپہ گری از عبدالکریم صاحب قیمت عہ
۱۰۔سکھی کسان از عبدالحمید صاحب تحصیلدار آرمور نظام آباد ۱۳۹ صفحات عہ
۱۱۔برہمچریہ (مہاتما گاندھی کے تجربات) ۹۶ صفحات قیمت ۹ر
۱۲۔گرہست جیون (　"　) ۵۰ صفحات قیمت ۱۲ر
۱۳۔یورپ کے تاثرات (چند اہل قلم کے تاثرات) مرتبہ بدر شکیب بی۔اے ۹۰ صفحات قیمت عہ
۱۴۔مغربی تصانیف کے اردو تراجم از میر حسن ایم اے ۴۴ صفحات قیمت عہ
۱۵۔نئے مسائل (فکر وعمل کی نئی راہیں) از محمد خواجہ الدین بی۔اے قیمت ۸ر

مرزا سیف علی خاں

ضلع

(یہ مضمون حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن سے نشر کیا گیا تھا)

ضلع سے میری مراد ضلع عثمان آباد، ضلع بیڑ یا ہندوستان کے کسی خاص ضلع سے نہیں ہے بلکہ ضلع سے میرا مقصد اس صنعت سے ہے جسے گھٹیا درجہ کے شعراء اپنے شعروں میں اور بڑھیا درجہ کے خوش مذاق اصحاب ظرافت پیدا کرنے کے لئے عام طور پر اپنی گفتگو میں استعمال کرتے ہیں۔

اس صنعت کا دوسرا نام رعایتِ لفظی ہے اور عام طور پر اس میں ایسے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں جن کو دوسرے الفاظ کے ساتھ محض ایک لفظی تعلق ہوتا ہے مگر ان کے معنوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مثلاً کسی کا شعر ہے کہ

سن کے چرچا غیر نے جا کے چھچھوندر چھوڑ دی گھر جلا عاشق کا ان لوگوں کا کیا ٹوٹا ہوا

یہاں چھچھوندر چھوڑنے کے معنی شگوفہ چھوڑنے کے ہیں اور ٹوٹے کے معنی نقصان کے ہیں مگر چھچھوندر اور ٹوٹا آتش بازی کے نام بھی ہیں اس لئے، گھر جلا، چھچھوندر اور ٹوٹا ضلع کے الفاظ ہیں اور ان میں ایک دوسرے سے مناسبت ہے

اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ جس چیز کا نام لیا جائے، وہ ایک سالم لفظ سے ظاہر ہو جائے جیسے کہ یہ ایک مشہور لطیفہ ہے کہ

جج بھی کانا تھا اور ملزم بھی کانا تھا۔ ملزم نے جج کی طرف دیکھا اور ہاتھ جوڑ کر عرض کی کہ حضور! بدبختوں پر چشم عنایت چاہیے۔ جج نے کہا کہ ہم سب کو ایک آنکھ دیکھتے ہیں۔ ملزم نے کہا کہ یہ تو حضور کی عین منصفی ہے

اس کی دوسری قسم میں الفاظ اس قدر کھینچ تان کر بٹھائے جاتے ہیں کہ ان کی ہڈیاں پسلیاں ٹوٹ جاتی ہیں مثلاً امانت کا یہ مشہور شعر ہے کہ

ہم کو ہو زہر غیر کو مصری کی ڈلی ہو ایسی نہ بات آپ زباں سے نکالئے

یہاں دوسرے مصرع میں نہ بات کا لفظ، زبان سے نکالتے وقت نبات ہو جاتا ہے۔ جس کے معنی مصری کے ہیں اور زہر، مصری، نبات، یہ سب ضلع کے لفظ ہیں۔

آپ نے وہ شعر تو سن لیا جس میں زبردستی کھینچ تان کر ضلع باندھا گیا تھا اب ایک چھوٹی سی اسی نمونے کی گفتگو بھی سن لیجئے۔

ایک صاحب استرہ خریدنے گئے۔ دوکاندار نے قیمت زیادہ بتائی۔ خریدار نے کہا کہ میاں تم تو مونڈھتے ہو (یعنی دوکان دار کو حجام بنایا) دکاندار نے تڑسے جواب دیا کہ حضور ہم اس طرح سے مونڈھتے ہیں اور آپ اُس طرح سے مونڈھتے ہیں (یہاں "اُس طرح" سے تلفظ کرتے وقت اُسترے سے ہو جاتا ہے)

ابتداء میں شعراء نے اس دل لبھانے والی صنعت کو اس خوبی سے پیش کیا کہ ہر شخص اس پر لٹو ہو گیا

چند روز کے بعد بازار میں چل نکلی اور ایسی چلی کہ ہر شخص اس کا سودائی بن گیا۔ اس لئے بعض شعرا نے تو اس قدر گریز کی کہ اس کو حدود شاعری سے ہی خارج کر دیا اور بعض نے اس قدر وسعت دی کہ کشور شعر سخن کا رکن اعظم بنالیا۔
غالب کی مشہور و معروف غزل کا مصرع ہے کہ "ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانو" اکثر ضلع بازوں کا خیال ہے کہ یہاں ہیہات، پانو کی مناسبت سے ضلع کے طور پر بٹھایا گیا ہے۔
مگر ان کے بعض واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں ضلع جگت کا زیادہ شوق نہیں تھا۔ چنانچہ یہ ایک مشہور واقعہ ہے کہ ایک روز کوئی صاحب ان سے ملنے آئے۔ کلام کی بہت تعریف کی اور کہا کہ آپ کا یہ شعر مجھے دور و دراز سے کھینچ کر لایا ہے پھر یہ شعر پڑھا۔

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی میرے شیر شاباش رحمت خدا کی

چونکہ یہ شعر غالب کا نہیں تھا اور اسد کی رعایت سے شیر کو کہاں خاطر میں لاتے تھے اس لئے اسنا! مسکرائے اور کہا کہ جناب جس بزرگ کا یہ شعر ہے ان پر بقول ان کے رحمت خدا کی اور یہ میرا شعر ہے تو مجھ پر لعنت خدا کی۔
غالب سے پیشتر بھی اکثر شعرا نے ضلع بولنے والوں پر چوٹیں کیں ہیں۔ چنانچہ سودا فرماتے ہیں۔ کہ

پکڑی جو شورے نے کہیں کھیتی سے چڑیا سمجھا کہ نہیں باز کوئی مجھ سا کلاں گیر
استاد کی ان کے ہے انھوں کو یہ نصیحت لفظی نہ تناسب ہو تو کچھ مت کرو تحریر
آنا تو تلازم رکھو الفاظ کا ملحوظ ہے پنجہ و ناخن نہ لکھو دودھ کو تم شیر
جب تک کہ نہ منظوم ہو پا سنگ و ترازو باندھو نہ کبھی شعر میں تم لفظ شکم سیر

یہاں پنجہ، ناخن، شیر، پاسنگ، ترازو، اور شکم سیر یہ سب ضلع کے الفاظ جنہیں معترض کے پردے میں لکھ کر استاد نے خود اپنا ذوق سلیم بھی بتا دیا ہے۔
بہر حال اس سے دے کے باوجود اس وقت ہزاروں غزلیں، ہزاروں قصیدے اور ہزاروں مثنویاں اس صنعت میں بھری پڑی ہیں اور پھر ضلع بازوں نے تو وہ دریا بہائے ہیں کہ شعرا کے کارناموں پر بھی پانی پھیر دیا ہے۔
جس طرح اکثر لوگ بیت بازی اور دوسرے مشاغل میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں اسی طرح بعض اصحاب ضلع بازی میں اپنا وقت گزارتے رہتے ہیں جہاں دو آدمی مل کر بیٹھے اور ضلع شروع ہو گیا۔ مثلاً کسی صاحب نے حقہ پیتے پیتے سرکایا اور یار لوگوں نے حقہ پر ضلع شروع کر دیا۔ اب حقہ سے متعلق جتنی چیزیں ہیں دماغ سے اترنی شروع ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ حقہ سے مناسبت رکھنے والے الفاظ یہ ہیں۔
اپنا کوئی ہمدم سہے نہ دمساز دمسے میں دم نہیں اب خیر مانگو جان کی۔ این گل دیگر شگفت بندہ ہر دم تازہ

رہتا ہے۔ دل کی کلی کھلی رہتی ہے۔ گڑ تو گڑ ہی اور شکر شکر ہی ہے۔ اگر کوئی میرے منہ کو آئے تو منہ نائی میں دے دوں۔ ہمارا خدا ضامن ہے۔ وہ عالی دودمان ہے۔ چلمن سے لگے بیٹھے رہو۔ وہ منہ نیچا کئے ہوئے باہر نکل گئے جس کو پیا چاہے وہ سہاگن ہے۔ سانچ کو کیا آنچ ہے۔ سخن تازہ فرمائیے۔ جواب تلخ۔ سوختہ جاں۔ زنجیر یا خشک و تر ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر در آید۔ بے کلی سر پہ توا باندھ کر آؤ۔ دھواں لیگ۔ اللہ سے تو لگائے رہو۔ فقیر کا کمبل وغیرہ وغیرہ۔

بظاہر ان الفاظ میں نہ تو کوئی ظرافت معلوم ہوتی ہے اور نہ اس قدر دم کہ ظرافت کا عنصر اور تفنن طبع کا ذریعہ بن سکیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اگر برمحل اور برموقع کسی گفتگو کے سلسلہ میں ضلع کے الفاظ بٹھا دئے جائیں تو پھر اٹھائے نہیں اٹھتے بلکہ تلازمہ کی آڑ میں جو چاہو کہہ جاؤ بقول شخصے سات خون معاف ہیں۔

نمونے کے طور پر ہم آپ کو چند قصے سناتے ہیں، جن میں ضلع کا چٹخارہ دے کر ظرافت پیدا کی گئی ہے وہ آپ بھی سنئے اور لطف اٹھائیے۔

ایک صاحب کسی چرب زبان جوتے والے کی دکان پر پہنچے۔ دکاندار نے کہا کہ کیا حکم ہوتا ہے خریدار نے کہا کہ ایک جوڑے کی ضرورت ہے۔ دکاندار نے کہا کہ حضور تو نری کا چاہتے ہونگے۔ خریدار نے کہا کہ مجھے وصلی کا درکار ہے۔ ذرا خوش رنگ اور مضبوط تلے کا ہو۔ دکاندار نے کہا کہ آپ اس کی فکر نہ کیجئے۔ پھر چند جوتوں کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ دیکھئے وہ جوتے جو آپ کے سامنے پڑے ہیں، خوش رنگ بھی ہیں مضبوط بھی ہیں اور بڑی بات یہ ہے کہ آپ کو بہت سستے پڑیں گے۔ خریدار نے قیمت دریافت کی تو کچھ زیادہ بتائی۔ اس پر خریدار نے کہا کہ آج کل تو آپ لوگ بے حساب کھانے لگے ہیں۔ اول تو صرف چار آنے جوتا کھاتے تھے مگر اب تو یہ کیفیت کہ آپ ایک ایک روپیہ جوتا کھاتے ہیں اور پھر بھی آپ کا پیٹ نہیں بھرتا۔

دکاندار نے کہا حضور! ہم اپنے جوتے زبردستی کسی کے سر تھوڑی مارتے ہیں۔ یہ تو خوشی کا سودا ہے۔ اگر پسند ہو تو یہ حاضر ہیں ورنہ جہاں آپ کو سستے پڑیں وہاں جا کر آپ بخوشی لے سکتے ہیں۔

اسی قسم کی ایک اور گفتگو ملاحظہ فرمائیے۔

ایک حجام کا لڑکا کسی بڑے عہدہ پر پہنچ گیا۔ ایک روز خفا ہو کر اس نے منتظم دفتر پر جرمانہ ٹھوک دیا۔ منتظم صاحب جوش میں بھرے ہوئے ان کے گھر پہنچے اور کہا کہ سرکار نے تو الٹے استرے سے میرا سر مونڈھ دیا۔ افسر صاحب نے کہا کہ ذرا سوچ سمجھ کر بات کرو۔ منتظم صاحب نے کہا کہ اب اور کیا سوچوں، صاف صاف کہتا ہوں پوست کندہ کہتا ہوں اگر بال برابر بھی فرق ہو تو آپ میری ڈاڑھی مونچھیں حقے کے پانی سے مونڈھ دیجئے گا۔

اس طرح ایک عرب کا قصہ مشہور ہے کہ وہ بارش کے موسم میں کسی ظریف کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ رستے میں ظریف نے پوچھا کہ تمہارا کیا نام ہے۔ جواب دیا کہ مطر پوچھا کنیت، اس نے کہا کہ ابو الفیض پھر ظریف نے پوچھا کہ

تمہارے باپ کا کیا نام ہے اس نے جواب دیا کہ ابو الغیث پھر پوچھا کہ تمہاری ماں کا کیا نام ہے۔ اس نے جواب دیا کہ سحاب پوچھا کنیت۔ جواب دیا کہ ام آبحر ظریف یہ سن کر رک گیا اور کہا کہ ذرا ٹھیر جا۔ میں ابھی ایک کشتی لے آتا ہوں۔ ورنہ تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے ڈوبے گا۔ ظریف کے منہہ سے یہ فقرہ سن کر وہ ترنم سے پانی پانی ہوگیا

کسی ظریف کا قصہ مشہور ہے کہ وہ کسی درویش کے ہاں مہمان ٹھیرا۔ درویش کا مکان بہت پرانا تھا اور چھت میں سے چٹ چٹ کی آوازیں آتی تھیں۔ ظریف نے گھبرا کر پوچھا کہ خیر تو ہے، قبلہ یہ کیا ماجرا ہے؟ درویش نے کہا کہ ڈرو مت۔ میرے گھر کی کڑیاں ذکر و تسبیح کرتی رہتی ہیں ظریف نے کہا کہ مجھے ڈر ہے کہ اسی ذکر و اذکار میں کہیں ان کو حالتِ وجد نہ پیدا ہو جائے اور وہ رقص کر کے سجدے میں نہ آپڑیں تو پھر اس وقت اس گنہگار کا کیا حشر ہوگا۔

ایک صاحب نے اپنے بچے کا ختنہ کیا اور احباب کو دعوت دی مکان چھوٹا تھا اس لئے دعوت کا انتظام ایک خواجہ سرا کے مکان میں کیا۔ استاد ذوق بھی مدعو تھے کھانا کھا کر صحن میں آ بیٹھے۔ اتنے میں میزبان پان لئے ہوئے آئے۔ حکیم آغا جان عیش نے کہا کہ آج تو دست مبارک سے گلوری کھلانا واجب ہے۔ ذوق نے کہا کہ ضیافت تو سنت ہی تھی۔ حکیم صاحب نے فرمایا کہ ان کی ظرافت کے نکتے کو کہاں تک پائیے۔ ختنے کی ضیافت اور خواجہ سرا کے مکان میں کھانا کھلایا۔ ذوق نے کہا کہ ظرافت یہ ظرافت یہ کہ کھلایا بھی تو خصی پلاؤ

شاہ نصیر کا ایک مشہور واقعہ ہے کہ انہوں نے لکھنو کے کسی معرکے کے مشاعرے میں ایک غزل پڑھی جس کا مطلع یہ تھا

خال پشتِ لب شیریں ہے عسل کی مکھی روح فرہاد لپٹ بن کے جبل کی مکھی

کسی صاحب نے ایک شعر پر کہا کہ سبحان اللہ، استاد کیا مکھی بیٹھی ہے۔ کسی نے دوسرے شعر پر کہا کہ حضور یہ مکھی تو ٹھیک نہیں بیٹھی۔ غزل ختم ہونے کے بعد ایک صاحب نے کہا کہ قبلہ غزل تو خوب ہے مگر ردیف سے جی متلانے لگا۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ جنھیں چاشنئ سخن کا مذاق ہے وہ تو لطف ہی اٹھائیں گے ہاں جنھیں حسد کے صفرے کا زور ہے ان کا جی بھی متلائے گا اور ردیں بھی ہوں گی۔

مرزا عصمت اللہ بیگ

تاریخ گولکنڈہ حیدرآباد کے مشہور مورخ اور جامعہ عثمانیہ کے معلم تاریخ پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی ایم۔ اے ایل ایل بی نے سلاطین قطب شاہیہ کی نہایت مستند اور مربوط تاریخ قلمبند کی ہے۔ اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے جو اس اہتمام اور محنت سے لکھی گئی ہے۔ اس کے مولف نے تاریخ دکن کے متعلق خاص تحقیقات کی ہیں اور ان کی ایک اور کتاب "بہمنی تمدن" بھی عنقریب شائع ہو کر منظر عام پر آجائے گی۔

تاریخ گولکنڈہ باتصویر ہے اور اس کی تصویریں بھی اس کے مواد کی طرح قدیم تاریخی ماخذوں سے حاصل کی گئی ہیں۔

بڑی سائز ڈھائی سو سے زیادہ صفحات قیمت ہے

ہماری زبان

جنم اس نے ہندوستان میں لیا　　اسی ملکِ جنت نشاں میں لیا
اسی کی ہواؤں میں پھولی پھلی　　مگر تھی ازل سے بڑی منچلی

نگاہوں کی بے باک دل کی جواں
نزاکت کی پتلی لطافت کی کاں

امیروں کی آنکھوں کا تارا بنی　　غریبوں کے دل کا سہارا بنی
رہی امتیازات سے بے نیاز　　ہر اک دل ہر اک بزم میں سرفراز
ہوا اس کی شہرت کا پرچم بلند　　نگاہوں میں سب کی ہوئی ارجمند
عرب سے فصاحت کا آیا خراج　　اور اس میں لطافت تھا امتزاج

جو فارس سے آئی رباب اور چنگ
تو ہندی نے بھی نذر کی جلترنگ

تبسم پہ اس کے ستاروں کو ناز　　ترنم پہ اس کے ہزاروں کو ناز
یہ پاکیزگی۔ یہ توازن۔ یہ شان　　یہ اس کا سنورنا یہ اس کی اٹھان
ہر اک کی نگاہوں میں جچتی گئی　　دلوں میں لہو بن کے رچتی گئی
اٹھی تھی جو اس محترم خاک سے　　لگی چشمکیں کرنے افلاک سے
لئے رنگ قوس قزح سے کبھی　　کبھی بڑھ کے کہکشاں تک گئی
ستاروں سے ان کی چمک چھین لی　　قمر سے غمِ دل کی تسکین لی

فلک سے ملی وسعتِ بے کنار
ہوا حسن خورشید از خود نثار

ہر اک جلوہ پیشِ نظر ہے یہاں　　ہر اک دلفریبی کا گھر ہے یہاں
ہر اک حسن اس بزم میں باریاب　　ہر اک ذرہ اس بزم میں آفتاب

زمیں زاد ہے آسماں جاہ ہے
وطن کی ترقی کی شاہ راہ ہے

ہر اک اہلِ علم کو اس کا ہے اعتراف　　کہ اردو کا دامن ہے کانٹوں سے صاف
نہ الجھن نہ مشکل نہ بے مائیگی　　یہ وسعت۔ یہ ایجاز یہ سادگی
نہ مشرق نہ مغرب کی ہے کوئی قید　　کہ دونوں ہیں اس کی نگاہوں کے صید

زمانے کی ہر خوبصورت زباں — اسے پیش کرتی ہے کچھ ارمغاں
ہراک حلقہ میں سب کو آئی پسند — ہراک دور میں یہ رہی سربلند
ہراک ملک میں اس کا سکہ رواں — کہ دنیا سمجھتی ہے اردو زباں

میسر ہوا اس کو رنگ قبول
کہ ہیں اس میں ہر ایک گلشن کے پھول

ہمیں کیوں نہ اردو سے ہو اتنا پیار — سماعت نے پایا اسے خوشگوار
رتن ناتھ سرشار اس کے اسیر — پرستار اس کے انیسؔ و دبیرؔ
امیر اور حکمتؔ کی ترجماں — نسیم اور غالبؔ کی پیاری زباں

ہمارے تمدن کی بانی ہے یہ
حقیقت میں ہندوستانی ہے یہ

یہی آشتی کی ہے آئینہ دار — اسی پر ترقی کا ہے انحصار
اسے ہاتھ سے جانے دینگے نہ ہم — اسے کوئی غم کھانے دینگے نہ ہم

بزرگوں کا پیارا نشاں ہے یہی
ہماری مقدس زباں ہے یہی

عبدالعزیز فطرت
(راولپنڈی)

گریہ و تبسم۔ صاحبزادہ میکشؔ مدیر سب رس کی نظموں اور غزلوں کا بہترین مجموعہ ہے۔ جناب میکشؔ حیدرآباد کے نوجوان شعرا میں ایک امتیاز کے مالک ہیں اور ان کا کلام بہت مقبول ہے۔ عالیجناب ڈاکٹر زور صاحب کا دیباچہ عمومی اور جناب پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری کا مقدمہ بھی اس کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔

میکشؔ کے کلام کا مجموعہ ہے اور رنگ و بو کا ایک خوش منظر گلدستہ کتاب کی تقسیم کئی حصوں پر ہے مثلاً حرکت و حیات، سکون و اضطراب ماضی و حال، حال و قال، عقیدت و یقین، شباب و شعر وغیرہ بعض بعض نظموں پر بے اختیار کلام اقبالؔ کا دھوکا ہوجاتا ہے۔

"صدق" لکھنو بابت یکم جنوری سنہ ۱۹۳۹ء صفحات (۱۹۲) طباعت و کتابت نفیس، کاغذ اعلیٰ قسم کا جلد پر سنہری نام

(قیمت عہ)

پرانی اور نئی باتیں

(تمدن اور شعر و ادب پر ایک نگاہ)

سنسار کی ریت اور دنیا کا دستور ہے کہ پرانی باتوں کو لوگ بھول جاتے ہیں اور وہی بھولی باتیں جب دہرائی جاتی ہیں تو لوگ سمجھتے ہیں کہ بالکل نئی اور اچھوتی باتیں کہی جا رہی ہیں۔ دنیا کا حافظہ بہت کمزور ہے۔ تاریخ اپنے کو ہمیشہ دہراتی رہتی ہے۔ لیکن ہم اس کے دہرانے کو محسوس نہیں کرتے۔ دنیا کے انقلابات اور واقعات کا حال، سینما کے پردے سے ملتا جلتا ہے، دیکھی ہوئی تصویریں تھوڑے الٹ پھیر کے ساتھ نمودار ہوتی رہتی ہیں، اور فریب خوردہ نگاہیں سمجھتی ہیں کہ کوئی جدید فلم دکھایا جا رہا ہے۔ حوادث و انقلابات کے ان مناظر کو دیکھ کر ایک مشہور فلسفی بے اختیار پکار اٹھا کہ:۔

"دنیا میں کوئی چیز نئی نہیں۔!"

تمدن و تہذیب کو ٹوٹے ہوئے نقوش جب ابھرتے ہیں، تو لوگ سمجھنے لگتے ہیں کہ کسی جدید تہذیب کی داغ بیل پڑ رہی ہے۔ دنیا پرانے ملبہ سے نئی عمارتیں بنا کر اکڑنے لگتی ہے۔ آج دنیا تہذیب و علم کی جن "جدید شاہراہوں" پر ناز کر رہی ہے، وہ سب گزشتہ تہذیبوں کے روندے ہوئے راستے ہیں۔ آج ہم محکمۂ آبرسانی کے حسنِ انتظام پر فخر کرتے ہیں، مگر آج سے کئی ہزار سال قبل، یونان کے مشہور مورخ ہیروڈوٹس نے بابل کے شہر میں ابلتے ہوئے فوارے اور ڈھلکتے ہوئے آبشار دیکھے تھے۔ جن لوگوں نے بیدر (دکن) کے قلعہ کو دیکھا ہے وہ اس زمانے کے "واٹر ورکس" کے حسنِ انتظام کا ضرور اعتراف کرینگے۔

سینما کو دورِ جدید کی ایجاد بتایا جاتا ہے مگر ڈریپر کی مشہور کتاب (Conflict between Religion & Science) "معرکۂ مذہب و سائنس" کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر میں متحرک تصویروں کا رواج تھا، اور حسین و جمیل رقاصاؤں کے نغمہ و رقص کے ساتھ ساتھ، متحرک تصویریں ذوقِ نظارہ کو تسکین بخشتی تھیں محکمۂ اکتشافاتِ اثری کی کوششوں کی بدولت، قدیم نوادر منظرِ عام پر آ کر، تہذیب و تمدن کی کڑیوں کو ملا رہے ہیں۔ اور دنیا کو اپنے حافظہ کی کمزوری کا احساس ہوتا جا رہا ہے۔ اگر آپ کسی چیز کو بھول جاتے ہیں تو اس کے یہ معنی نہیں، کہ وہ چیز کبھی تھی ہی نہیں آپ کی بھول چوک سے "ہوئی بات"، "انہوئی" نہیں ہو سکتی۔ عدمِ علم شئے سے وجودِ شئے کی نفی نہیں ہوتی۔

فکر و خیال کی یکسانی

تمدن و تہذیب اور علم و ادب کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ تمدن و تہذیب کی طرح علم و ادب کے نقوش بھی مٹتے اور ابھرتے رہتے ہیں۔ قدیم افکار نئے سانچوں میں ڈھلتے جاتے ہیں اور وہی نغمے جو فضا میں گونج چکے ہیں، مختلف ڈھولوں اور سروں میں اس انداز میں گائے جاتے ہیں، جیسے یہ پہلے پہل سامعہ نواز ہوئے ہیں۔ فکر و خیال کی جو شراب روم و یونان کے میکدوں میں کھنچی تھی، وہی شراب بھارت ورش کی بھٹیوں پر جوش کھاتی ہوئی نظر آتی ہے، ایک دو آنچ کی البتہ کسر رہ گئی ہے، مگر اس سے

شراب کی اصلیت پر تو کوئی حرف نہیں آتا۔ روم کی رزمیہ شاعری' فردوسی کے شاہنامے سے ٹکراتی ہے' اور ہومر اور ورجل کے نغموں کی گونج ایران میں سنائی دیتی ہے۔ اگر دنیا کے قدیم لٹریچر کا تاریخ وار ی تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بہت پہلے کہی ہوئی باتیں' کس کس انداز میں دہرائی گئی ہیں' اور یہ "توارد" اپنے اندر کس قدر عمومیت رکھتا ہے۔ بات یہ ہے کہ دنیا کے تمام انسان قوم و نسل کے امتیاز و اختلاف کے باوجود' فکر و تصور کے مرکز پر آکر ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔ گرد و پیش اور ماحول سے متاثر ہوکر' محسوسات کے اظہار میں ضرور فرق ہوتا ہے' مگر فکر و خیال کی تان ایک ہی حقیقت پر آکر ٹوٹتی ہے۔ عرب کی لیلیٰ' ایران کی شیریں' ہندوستان کی شکنتلا اور مصر کی قلوپطرہ پر شاعروں اور ادیبوں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں اصطلاحات کے فرق کے سوا' بہت سی چیزیں ملتی جلتی ہیں۔

ایک ہی نغمہ مختلف دھنوں میں زبانوں سے نکلا ہے' اور ایک ہی شراب مختلف پیمانوں میں ڈھلی ہے۔

پرانے چراغ

ہماری موجودہ "اردو غزل" جو ہمارا سرمایۂ ناز و افتخار ہے۔ اس کی داغ بیل بھی بہت پہلے پڑ چکی ہے۔ اور نہ صرف فکر و خیال بلکہ الفاظ اور ترکیب کے اعتبار سے بھی ہمارے پیش رو غزل گو شعرا شعر و ادب کی وادیوں کو ہموار کر کے' فکر و خیال کے چراغ جلا گئے ہیں۔ ہم ان ہی چراغوں کی روشنی میں منزلیں گزر رہے ہیں' یہ دوسری بات ہے کہ ہم کو اس اجالے کا پورے طور پر احساس نہیں ہوتا' مگر اجالا تو اپنی جگہ پر بہرحال قائم و ثابت ہے۔ ان ہی پرانے چراغوں کے آس پاس ہم بھی کچھ شمعیں روشن کر رہے ہیں' اور آنے والی نسلیں اپنے کو ہم سے زیادہ روشنی میں پائینگی۔

"ولی دکنی کو لوگ بھولتے جا رہے ہیں' حالانکہ آج سے دو سو سال قبل اس نے کہا تھا"

معشوق کو ضرر نہیں عاشق کی آہ سے
بجھتا نہیں ہے باد صبا سے چراغِ گل

خیال و فکر کی قدرت کے علاوہ' الفاظ کے استعمال سے دھوکا ہوتا ہے کہ یہ شعر ہمارے ہی دور کے کسی شاعر کا کہا ہوا ہے میر محمد تقی میر کے اس شعر کا جواب

اس نے دیکھا جو اٹھ کے سوتے سے
اڑ گئے آئینہ کے توتے سے

مشکل ہی سے پیش کیا جا سکے گا۔ ہم کو آج اپنی نظموں پر بہت ناز ہے' مگر میر کے اس شعر کے لطف کو کوئی نظم پھیکا نہیں کر سکتی۔ اگر یہ صحیح ہے کہ روح القدس' شاعروں کی تائید کرتا ہے' تو میر کا یہ شعر اس تائید کا سب سے بڑا مظہر ہے۔

خواجہ میر درد کے اس شعر کو پڑھ کر

جوش جنوں کے ہاتھ سے فصل بہار میں
گل سے بھی ہو سکی نہ گریباں کی احتیاط

موجودہ زمانہ کی بیسیوں غزلوں کو اگر چاک کر دیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔
مصحفی نے اب سے بہت پہلے جو کہا تھا :-

چلے بھی جا جرس غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلۂ نو بہار ٹھیرے گا

بہت سے ہمارے شعروں کو اسی کی صدائے بازگشت سمجھنا چاہیے۔
داغ کا یہ شعر :-

لذت سیر وگر چشم تماشا دے گی
ایک بار اور بھی دنیا ابھی پلٹا دے گی

انقلابی شاعروں کے لئے آج بھی دلیلِ راہ بن سکتا ہے اور "انقلاب زندہ باد" کے فلک شگاف نعروں سے بہت زیادہ قوت اس شعر میں پائی جاتی ہے۔
امیر مینائی کے اس شعر پر :-

لچک ہے شاخوں میں جنبش ہوا سے پھولوں میں
بہار جھول رہی ہے خوشی کے جھولوں میں

آج بھی روح جھومنے لگتی ہے۔ اس دور کے بہترین مصور کا قلم باغ و بہار کو تو دکھا سکتا ہے۔ مگر بہار کو خوشی کے جھولوں میں کس طرح جھلائے گا۔!

میں نے غالب کے اشعار کو قصداً پیش نہیں کیا' اور وہ اس لئے کہ اس کے فکر و خیال کی روح تو ہماری شاعری کے پیکر میں دوڑ رہی ہے' اور کوئی شاعر محسوس یا غیر محسوس طور پر غالب کی شاعری کے تاثرات سے نہیں بچ سکتا۔

ماہر القادری

من کی دنیا حیدرآباد کے نوجوان افسانہ نگار رشید قریشی کے افسانوں کا نفیس مجموعہ ہے۔ عالیجناب ڈاکٹر زور صاحب کا دیباچہ عمومی اور جناب پروفیسر سروری صاحب کا مقدمہ بھی اس کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ افسانوی ادب سے دلچسپی رکھنے والے ضرور اس کا مطالعہ کریں۔ کتاب بہت دلچسپ اور انداز بیان نہایت شگفتہ ہے۔
ہر افسانہ رعنائی اور رنگینی بیان کا بہترین نمونہ ہے۔ اردو کے نئے ادب سے دلچسپی رکھنے والے اور ترقی پسند نظریوں کے پرستاران افسانوں کے مطالعہ سے ضرور محظوظ ہونگے۔ جو اصحاب اردو کے جدید ترین افسانوں کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں وہ اس نوجوان مصنف کے ان پرکیف افسانوں سے ضرور لطف اندوز ہونگے۔ صفحات (۱۶۰) قیمت مجلد (عہ)

اردو شاعری

ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ شاعری ہے کیا چیز۔ مختلف لوگوں نے مختلف طور پر شاعری کی تعریف کی ہے۔ یہاں پر ان تمام تعریفوں کے اعادہ کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ شاعری کی تعریف سادے لفظوں میں یہ ہو سکتی ہے، کہ نثر تو ذہنی اور جذباتی تصورات کے سیدھے سادے اظہار کا نام ہے اور شاعری ایسے اظہار کا ایک طریقہ ہے جو کلام موزوں بن جاوے۔ مگر پھر بھی شاعری کا اصلی نقشہ اس تصویر میں نہیں ملتا۔ یہ خوب سمجھ لیجئے کہ شاعری کا میدان عمل وہی ہے جو ایک نثار کا ہے رزم ہو یا بزم، جذبۂ قومیت ہو یا جوشِ مذہبی، ذہنی تخیلات ہوں یا بیان کائنات ہر چیز میں جس حد تک نثر کا دخل ہے اسی حد تک شاعری کا بھی ہے سوال یہ ہے کہ پھر اظہار کی مختلف انداز و بیان کیوں وجود میں آئے۔ اس لئے اور صرف اس لئے کہ جہاں صنفِ نثر موثر نہ ہو وہاں دوسری صنف یعنی شاعری سے کام لیا جائے۔ دیکھئے شیکسپیر۔ ہومر۔ ورجل اور گوئٹے کے ہم عصر صدہا نثار رہے تھے مگر ان کی قوم کے تمدن میں جس انقلاب کی ضرورت تھی وہ ان سے نہ ہو سکا۔ اس کام کو ان شعراء نے انجام دیا۔ انصاف اور رحم کے نقشے یا انسانی کیریکٹر اور تاثرات کے خاکے جس طرح شیکسپیر نے اپنے ڈراموں میں کھینچے ہیں یا قومی جذبے کے متعلق اسکاٹ نے جو نظمیں لکھی ہیں، یا قدرتی مناظر کا ورڈسورتھ نے جو نقشہ کھینچا ہے، ان کا بیان ایک نثار کتنی ہی خوش اسلوبی سے نثر میں کیوں نہ کرے ان شعراء کی طرح اثر پیدا نہیں کر سکتا۔ جس طرح موسیقی شعر کی خوبیوں پر سونے پر سہاگہ کا کام کرتی ہے، اسی طرح نثر شعر کے سانچے میں ڈھل کر خیالات کے اثرات کو دوبالا کر دیتی ہے۔

یہ نہ سمجھئے کہ نظم و نثر کا یہ فرق قافیہ اور ردیف کی وجہ سے ہوتا ہے خدا جانے کتنے اثرات کا مجموعہ ہے جن سے مل کر شاعری نثر سے بالکل جدا اور اس سے بہت بلند تر اور ایک اچھوتی چیز بن جاتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ شاعری ایک ایسی قوت ہے جس کا اظہار جذبات کے ہر شعبے پر اثر پذیر ہے خواہ وہ ارتقائے ذہنی ہو خواہ مصوری جذبات جمالیت خواہ جوشِ ملی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان شعبوں پر شاعری کا نثر کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ اثر ہے۔

مذکورۂ بالا معیار کی روشنی میں ہمیں دیکھنا چاہیے کہ آیا ہم شاعری کے اس مفہوم کو سمجھتے ہیں یا نہیں۔ آیا ہم اردو شاعری سے یہ کام لے رہے ہیں یا نہیں۔ اور آیا ہماری شاعری ہمارے انسانی اور قومی ارتقاء کی ترجمان ہے یا نہیں۔ گزشتہ صدی کے دورِ شاعری پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو ظاہر ہو جائے گا کہ ہم نے شاعری کے اعجاز سے کہاں تک کام لیا ہے۔ تعمیری جذبے سے بے نیاز، روح پرور نغموں سے خالی، مفروضی نقطۂ نظر سے ناکارہ، اور موضوعی حیثیت سے بھی مصنوعی اور دقیانوسی۔ یہ ہے پرانی داستان ہماری شاعری کی بدقسمتی سے ہمارے شعراء کا میلانِ طبع صرف تغزل کی طرف رہا۔ اور جو نظری مجسمہ حسن، اظہارِ جذبات کا مرکز بنا رہا۔

اس میں ایک طرف تو سوقیت غالب رہی اور دوسرے جانب جو مجسمہ اظہار تغزل کو تیار کیا گیا وہ ایک عجیب الخلقت ابوالہول سے کم نہیں یعنی نہ وہ مرد ہے نہ عورت نہ فی الحقیقت کوئی ایسی چیز ہے جو صحیح تصویر بن سکے۔ اس کے سر کے بال کمر تک لمبے، مانگ سیندور بھری ہوئی جس کو خط آرہ کشی سے تشبیہہ دی جاتی ہے۔ مو باف سرخ و زرد گھنگھورا پیشانی پر افشاں، رخسار پر خال گویا پھول کی پتی پر مگس یا ایمان کے خرمن میں کفر کا ایک دانہ، پاؤں میں پازیب و خلخال کا جنجال جن کی جھنکار محشر خیز، ہاتھوں میں مہندی گویا عاشق کے خون کا رنگ، لب و دندان پر مسی کی دھڑی اور پاؤں کی سرخی قدیم سنگار کے تصور کو بھی شرماتی ہیں۔ انگیا۔ چولی۔ محرم۔ نقاب۔ سیب ذقن۔ انار پستان یہ تو نسوانی علامات ہیں مگر ساتھ ہی معشوق سبزۂ خط سے ریش ایل بھی ہوتا ہے۔ ظلم و جور۔ اغیار کے ساتھ سر بازار آوارہ گردی، تیغ آزمائی تیر افگنی، قتل و غارت گری وغیرہ اس کی صنف قوی سے ہونے کا ثبوت ہے۔ حلیہ اس معشوق عجیب کا یہ ہے کہ صراحی کی طرح لمبی گردن، لکھنو کی ککڑیوں سے نازک کلائیاں، کمر بالکل معدوم یا بال کی طرح باریک، لب کوزۂ قند و نبات، دنداں سلکِ مروارید، ناک شمع کافوری، آنکھیں نرگس بیمار، پلکیں تیر و نشتر، بھویں شمشیر و خنجر، رخسار آفتاب، جبین ماہتاب، زلف بل کھائی ہوئی ناگن، گیسو مار سیاہ، موئے خط سبزہ زار۔ غرض کہ ایشیائی شاعری کے اس خیالی معشوق کو مثالی جامہ پہنا کر کسی بزم مشاعرہ میں پیش کر دیا جائے تو ہمارے عشق زدہ کمزور دل شعراء چیخ مار کر بیہوش ہو جائیں اور جری و بہادر لوگ زندہ دل ہنستے ہنستے لوٹ جائیں، اور معشوق صاحب کی وہ گت بنائیں کہ پھر وہ اپنے عاشق شعراء کے خواب و خیال میں بھی آنے کی جرأت نہ کر سکیں۔

تعجب ہوتا ہے کہ دنیا اس قدر ترقی کر چکی ہے کہ آج ہر چیز کے لئے عین الیقین کی ضرورت ہے مگر ہمارے شعراء اپنے حسن و عشق کے تخیل میں واقعیت اور حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتے۔ تمام تشبیہات و تلمیحات اور حسن و عشق کے فرضی لوازمات ایسے پیش کئے جاتے ہیں جن سے ہمارے ماحول اور محسوسات کو مطلقاً تعلق نہیں۔ اگر کہیں مناظر کی جھلک بھی نظر آتی ہے تو ایسی جن سے ہماری نگاہیں آج تک محروم ہیں اور نا آشنا۔ غیر ملکی مناظر کے لئے جن سے ہمیں مسرت حاصل نہیں ہو سکتی اپنے ملکی ماحولی مناظر کی طرف اب تک آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔

سمندِ ناز پر ایک اور تازیانہ ہوا ۔ اردو غزل میں اس کی ہمیشہ سے اجازت دی گئی ہے کہ ایک ہی غزل میں متفرق خیالات ہوں لیکن اب یہ مرض بڑھتا جا رہا ہے کہ ایک ہی غزل میں متضاد خیالات بھرے جاتے ہیں۔ پھر کیا تعجب ہے جو ہماری غزلیں غیر فطری سمجھی جاتی ہیں۔ ایک ہی سانس میں دو متضاد جذبے کیسے ہو سکتے ہیں۔ میرا مطلب تغزل کی اہمیت کو کم کرنا نہیں ہے اور اصلی تغزل انسان کے صحیح جذبات کا صحیح آئینہ ہوتا ہے اور جہاں اور اصناف سخن ایک ہنگامی حیثیت رکھتے ہیں اس کی استقامت اور استقلال

پر زلزلہ لانا دشوار ہے لیکن ہمارے شعراء افراط تفریط کے شکار ہوئے اور محض تغزل اور وہ بھی غیر فطری تغزل کو انہوں نے اپنا نصب العین بنا رکھا اور دوسرے اصنافِ سخن سے بالکل غافل رہے۔

ابتدا میں تو کچھ توجہ قصیدوں اور مثنویوں کی طرف رہی لیکن ان اصناف سے جو اصلی کام لینا چاہیے تھا وہ نہیں لیا گیا۔ اور نظموں کی طرف تو کسی نے خیال ہی نہیں کیا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ تو مناظر قدرت کی تصویر کشی سے مستفید ہوئے نہ جذباتِ ملی و ملکی قوم میں یہ پیدا کر سکے۔ میں جانتا ہوں کہ زبان کے ابتدائی دور میں اس کی صفائی و روانی پر توجہ غالب رہتی ہے۔ اسی طرح ہماری زبان میں بھی ہوا۔ گو تخیل کا معیار بلند نہ ہوا۔ لیکن اس دور کے بعد دنیائے شاعری کے افق پر ایک روشن ستارہ نجم الدولہ دبیر الملک غالب دہلوی کی صورت میں طلوع ہوا جس نے اپنی شاعری کی بنیاد فلسفۂ حیات اور رموز زندگی کی مستحکم زمین پر قائم کی۔ خیالات کی بلندی جذبات کی لطافت اور پاکیزگی کے ساتھ اس نے ان حقائق کی تصویر کھینچی جو انسانیت کا مرکز نگاہ بننے کے قابل تھے

دو اور شعراء انیس و دبیر اصلی معنوں میں شاعر کہلانے کے مستحق ہو سکتے تھے مگر افسوس کہ انہوں نے اپنی فکر طبع کو محدود رکھا۔ منظر کشی، واقعہ نگاری اور جذبات کی تصویریں اتارنے میں یہ دونوں شعراء نے داد سخن دی لیکن ان کے یہاں بھی فطرت سے وہ ہم آہنگی اور قرب عنقا ہے جو ورڈسورتھ (Wordsworth) شیلی (Shelley) یا بائرن (Byron) کے یہاں بدرجۂ اتم موجود ہے۔

غالب کی روش پر چلنے کی بہت کم لوگوں کو توفیق ہوئی لیکن وہ ایک ایسی شاہراہ پیدا کر گئے تھے جو معدوم نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اس ترقی یافتہ دور میں سنجیدہ طبقے نے اس شاہراہ پر گامزنی کی کوشش فرمائی اور اس لیے اب خاصی کامیابی حاصل کر لی ہے۔ اس طبقے کے شعراء نے جذبات، حسن وعشق اور فلسفۂ حیات کی حقیقت آگیں تصویر دکھلانے میں جو سعی فرمائی اس نے تغزل میں ایک انقلابی کیفیت پیدا کر دی ہے ان میں سے خاص طور پر فانی۔ جگر اور حسرت ہیں۔ بے معنی تغزل سے ہٹانے میں پہلی سعی جس شاعر نے کی وہ مولانا حالی ہیں۔ قومی ادبار کی تصویر ان کے سامنے تھی قومی درد ان میں کوٹ کوٹ کے بھرا ہوا تھا۔ وہ ابل پڑا اور اس نے ان سے مسدس ایسی نایاب چیز لکھائی۔ نیز اسی طرح کی اور نظمیں جن کو پڑھ کر قومی جذبہ پیدا ہوتا ہے، اور عمل کا احساس ہوتا ہے پھر چکبست نے ایسے دلچسپ پیرایے میں قومی ترانے گائے کہ اس نے قومیت ملکیت، اور وطنیت کا جوشِ جنوں پیدا کر دیا۔ فلسفۂ زندگی کو طنزیات کے تحت میں لا کر بیان کرنے میں اکبر الہ آبادی نے جو کمال دکھایا ہے، اس کی نظیر نہیں ملتی۔ لیکن ان کا مسلک "زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز" نہ تھا اس لئے قوم کی ذہنی ارتقاء میں ان کی شاعری ایک سنگِ گراں ثابت ہوئی۔

حالی کو زیادہ زمانہ نہ گزرا تھا کہ آسمانِ شاعری پر علامہ اقبال نمودار ہوئے اور انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ سے ایک ایسا پیغام ہم کو پہنچایا جس سے ہماری نظر حقیقتِ انسانی پر پڑی اور ہم سب

ایک خاص جذبے سے متاثر ہو گئے۔ اور اب شعراء کا رجحان تکمیل تغزل کی طرف ہوا اور اسی کے ساتھ ہی ساتھ مذہبی۔ اخلاقی۔ قومی سیاسی نظموں اور نیچرل شاعری کی طرف خاص طور سے توجہ بڑھی جس کا ثبوت ادبی جرائد متواتر پیش کر رہے ہیں۔ ان میں خاص طور پر قابل ذکر حضرت جوش ملیح آبادی۔ پنڈت انند نرائن ملاّ۔ ہادی مچھلی شہری۔ حفیظ جالندھری۔ احسان دانش۔ اختر شیرانی وغیرہ وغیرہ ہیں۔ ان حالات سے امید ہوتی ہے کہ اردو شاعری ایک ہمہ گیر اور مکمل شاعری کی حیثیت حاصل کرے گی۔

شاعروں اور شاعری کے بڑے بڑے کارنامے صفحات تاریخ پر موجود نہیں۔ دنیا کے بہت سے عظیم انقلاب شاعری کے رہین منت ہیں اور ہماری خوش قسمتی ہے کہ ابھی ہمارا ذہن شعریت سے خالی نہیں ہے اور ہم اس صنفِ سخن سے بہت کچھ کام لے سکتے ہیں۔ آج تو ان ممالک میں جہاں صنعتی اور حرفتی ارتقاء حادی ہو گئے ہیں، وہاں شعراء رفتہ رفتہ عنقا ہوتے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس وقت یورپ میں یہ صورت ہے کہ بلند پایہ ادیب۔ محقق۔ سیاست داں اور صحیفہ نگار تو وافر تعداد میں موجود ہیں مگر شکسپیر۔ ملٹن۔ ورجل۔ ہومر اور ڈانٹے نیا تمدن نہیں پیدا کر سکا۔ اس لئے ہمارے شعراء کو اس حقیقت سے آشنا ہو جانا چاہیئے۔ ضرورت ہے کہ اس وقت کو غنیمت سمجھیں اور حقیقی شاعری کا جذبہ ملک میں پیدا کریں۔ جوش جوانی اور عیش پرستی کا ذکر اس قوم کے لئے زیبا ہے جس کو عیش و راحت کی زندگی میسر ہو۔ لیکن جو قوم ایسی ہو کہ اس کے بیشتر افراد کو ایک وقت شکم سیری میسر نہیں اور مصائب اور آفات کے ہجوم سے محزون و مغموم ہیں اس کے شعراء کو یہ کیونکر زیب دے سکتا ہے کہ خیالی تعشق اور رندی اور بدمستی کے راگ الاپتے رہیں۔

ملک و ملت زبانِ حال سے فریادی ہیں کہ ہم کو زندگی کے اصلی مقصد کی تلاش ہے۔ اقتصادی، معاشی مذہبی، اخلاقی، اور تمدنی و معاشرتی آزادی کی ضرورت ہے لہٰذا ان امور کے حصول کے لئے تمام قومی طبقات کے ساتھ طبقۂ شعراء کو بھی میدانِ جد و جہد میں آکر اپنا فرض ادا کرنا چاہیئے۔

نجم الدین احمد جعفری
(الہ آباد)

عہد ابراہیم عادل شاہ ثانی کے متولیانِ ریاست اس کتاب کو مجلس علمیہ طیلسانین عثمانیہ نے شائع کیا ہے۔ یہ کتاب اصل میں ایک تحقیقی مقالہ ہے جس کو مولوی علی محسن صاحب نے اپنے ام اے کے امتحان کے لئے لکھا تھا۔ اپنے موضوع کے اعتبار سے اس کتاب کا مطالعہ اہل اردو کی معلومات میں اضافہ کا باعث ہوگا۔

تعداد صفحات ۲۰۴ قیمت عہ

اظہارِ مسرت

دکن کی شاہزادیوں کی خیر و عافیت کے ساتھ واپسی پر دکن کی مختلف انجمنوں کی طرف سے جو مبارک باد کا جلسہ بتاریخ ۱۴ امر دسمبر ۱۹۳۹ء منعقد ہوا تھا اس میں ادارۂ ادبیاتِ اردو کے شعبۂ نسوان کی طرف سے بھی اس کی صدر محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ نے پھول پہنائے اور اس شعبہ کی اراکین نے جو نظمیں پڑھیں وہ یہاں درج کی جاتی ہیں۔

بہارِ تازہ ز مغرب بہ ایں دیار آمد　　نبیرۂ شہہ عثمانِ کامگار آمد

مغنّمے کہ مخامت زروئے او پیداست　　بہ بر گرفتہ چساں دُرِّ شاہوار آمد

زما پیام رساند کسے بہ شاہ دکن

برار بہ تازہ بہ شہزادۂ برار آمد

۲

تعالیٰ اللہ! دعائیں اپنی یہ تاثیر لائی ہیں　　بخیر و عافیت شہزادیاں یورپ سے آئی ہیں

نہ تھی تشویش تک بھی جنگِ موجودہ تباہی کی　　ہمیں تو فکر رہتی تھی فقط ارکانِ شاہی کی

مساجد، خانقاہوں، شاہراہوں اور مکانوں سے　　نکلتی تھی دعائے واپسی لاکھوں زبانوں سے

مقامِ جنگ سے جب تار وحشت ناک آتے تھے　　ستارے آسمانِ سلطنت کے جھلملاتے تھے

کسی اخبار میں گر "واپسی" عنوان نظر آتا　　گماں فی الفور اپنا شاہزادوں کی طرف جاتا

کبھی جب نشرگہ سے تازہ کچھ اعلان ہوتا تھا　　دلوں میں جاں نثاروں کے بپا طوفان ہوتا تھا

دعائیں مانگنے کو اجتماعِ عام ہوتا تھا　　ہر اک فرطِ خضوع سے لرزہ براندام ہوتا تھا

نکلنے بھی نہ پاتی خاکِ سجدہ تک جبینوں سے　　کہ اٹھ کر پوچھتے تھے کیفیت اخبار بینوں سے

امید و بیم کی یہ کشمکش ہر دم ستاتی تھی　　نہ دن کو چین ملتا تھا، نہ شب کو نیند آتی تھی

سفینہ اپنی تقدیروں کا گردابِ بلا میں تھا　　قبیلۂ آصفِ سابع کا اک جو کھم فضا میں تھا

بفضلِ رحمتِ پروردگار آخر وہ دن آیا　　رعایائے دکن نے "مژدۂ آمد" بھی سن پایا

خدا کا شکر ہے جاتی رہیں بے تابیاں اپنی　　ہجومِ شوق سے لبریز ہے اب داستاں اپنی

ریاضِ آصفی میں شادمانی کے ثمر آئے　　بخیر و عافیت سرکار کے لختِ جگر آئے

کرم پویاں پویان و مغنّم در کنار آمد　　درِ شہوار باشہزادۂ ملکِ برار آمد

جلالِ ترکمانی از معظّم جاہ پیدا شد

فرنیلوفری ہنگر برنگِ تو ہویدا شد

بشیر النسا بیگم بشیر

اظہارِ جذبات

تھیں نظر سے جو نہاں   اپنی شاہزادیاں

منہ پہ تھیں ہر ایک کے   اڑ رہی ہوائیاں

دل تھے صرفِ رنج و غم   ہاتھ سوئے آسماں

تھی دعا ہر ایک کی   اے خدائے انس و جاں

— ۲ —

خیریت سے آئیں وہ   خیریت سے آئیں وہ

دل کی اُجڑی بستیاں   آکے پھر بسائیں وہ

اپنے دم سے ملک کو   گلستاں بنائیں وہ

کیف اور سرور کی   ندیاں بہائیں وہ

— ۳ —

بدلیاں دعاؤں کی   جب فلک پہ چھا گئیں

جوشش میں رحیم کی   رحمتیں بھی آ گئیں

کام حق کی بخششیں   اس طرح بنا گئیں

شکر ربّ العالمین   شکر ربّ العالمین

— ۴ —

پھر دکن کی سرزمیں   نازشِ ارم بنی

خیریت سے آئے وہ   لو تھی جن کی لگ رہی

لب پہ جن کا نام تھا   دل میں جن کی یاد تھی

جو دکن کے ناز ہیں   شان اپنی جنس کی

— ۵ —

برکتِ ورود نے   کر دیا ہے غم غلط

ہر دکن کے فرد سے   یادِ درد و ہم غلط

لوحِ دل سے ہو گئے   معنیٔ الم غلط

گردشِ جہان کی   فکرِ بیشِ و کم غلط

— ۶ —

پھر وہی چہل پہل   پھر وہی ہے چہچہے

پھر وہی ہنسی خوشی   پھر وہی ہیں قہقہے

جوشش یہ سرور کا   کم نہ ہو خدا کرے

دورِ انبساط یہ
یا خدا سدا رہے

لطیف النساء بیگم

ریلوں کی اردو

ہماری بدترین کمزوریوں میں ہماری غفلت، لاپروائی، پست ذہنیت اور احساس کمتری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم غیروں کے ہاتھوں اپنی تہذیب اور زبان کی بربادی گوارا کر رہے ہیں۔ اس بربادی کے اتنے ثبوت دیکھتے ہوئے یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ تباہی کی یہ نشانیاں دوآبے میں نظر آ رہی ہیں اور اس تباہ کاری کو وہی اہل زبان گوارا کر رہے ہیں جن کی زبان شستہ اور مستند سمجھی جاتی ہے۔ اگرچہ مجھے بھی علم ہے کہ ریلوں پر ہمارا زور نہیں، آئینی اعتبار سے ریلوے کے کاروبار میں ہمارا عمل دخل نہیں ہے مگر یہ بھی میں جانتا ہوں کہ ریلوے بورڈوں میں جتنے ہندوستانی افراد ہیں (چاہے وہ حکومت کے نمائندہ ہوں یا تجارتی اداروں کی طرف سے نمائندگی کر رہے ہوں) اگر وہ متحدہ طور پر ہندوستانی زبانوں کی تحقیر کی مخالفت کریں تو اس خرابی کا بہت جلد خاتمہ ہو جائے۔

مجھے خیال تھا کہ کانگریسی راج قایم ہونے کے بعد تحریری زبان سنبھل جائے گی، سرکاری محکمے زبان کی فصاحت اور پاکیزگی نہ سہی کم از کم صحت کا خیال ضرور کریں گے مگر نہیں وہی پرانا ڈھرا قایم تھا، پرانی بدتمیزیاں موجود تھیں، پرانی زبان کشی جاری تھی بعض گاڑیوں کے نئے نئے ڈبوں میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا تھا، ہر چیز کی طہارت و نفاست سے یہ چلتا تھا کہ ابھی ابھی یہ ڈبے بن کر نکلے ہیں، ہر چیز نئی تھی، جابجا ضروری اعلانوں کی تحریریں بھی نئی تھیں صرف —— زبان پرانی تھی! وہی زبان جو صاحب بہادر استعمال کرتے ہیں، چنانچہ ایک اعلان تھا کہ۔

"مسافروں کو ہوشیار کر دیا جاتا ہے کہ جب گاڑی چلتی رہے تب گاڑی کے دروازے کو نہ کھول رکھیں یا اپنے جسم کے کسی حصے کو کھڑکی یا دروازے کے باہر نہ رکھیں کیونکہ یہ دونوں عادتیں خطرناک ہیں"

خط کشیدہ لفظوں پر غور کیجیے۔ اس سے زیادہ مہمل عبارت اور کیا ہو سکے گی! وہ بھی اس ریلوے کی جو اردو اور ہندی کے گہواروں میں ڈولتی ہے، اردو کے سرچشموں سے سیراب ہو رہی ہے، دوآبے کی دولت سے مالا مال ہو رہی ہے اور بیچ بیچ دہلی کی زبانی ٹکسال لال قلعہ میں سے گزرتی ہے۔

شاید آپ کو معلوم نہ ہو یا معلوم بھی رہا ہو تو بھول گئے ہوں کہ دہلی سے غازی آباد کو جو ریل جاتی ہے وہ شاہان دہلی کی قیام گاہ، اکبر کے بنائے ہوئے قلعے اور بہادر شاہ ظفر کی تاج پوشی سے گزرتی ہوئی جاتی ہے اور اس ریل کی تعمیر کے وقت محض سہولت اور —— کفایت کی خاطر لال قلعے کی دیواروں کو توڑ تاڑ کر ہموار کیا گیا اور رہتی دنیا کے سامنے بے حسی بربریت اور غارت پسندی کا ثبوت دیا گیا! غرض، لال قلعہ ٹوٹا، اس میں سے ریل گزری، انگریزی مطلق العنانی کا بھی خاتمہ ہوا مگر ریلوں کی زبان نہ سنبھلنا تھی نہ سنبھلی! کیا کوئی ان سے پوچھنے والا نہیں کہ اس قسم کے مہمل جملے کا کہ

"اپنے جسم کے کسی حصے کو باہر نہ رکھیں!"

کیا مطلب ہے؟ اس قسم کے بے معنی اور لغو اعلانوں کا کیا فائدہ؟ کیا اردو کے شیدائی، ہندی کے پریمی، ہندستانی کے دلدادہ

باقی نہیں کہ ریلوے کی زبان کشی کے خلاف جہاد کریں اور ان کے دماغ کو ٹھکانے لگائیں؟ اگر خود حکومت کو صحیح زبان کا احساس نہیں تو ریلوے کے ممبر' ریلوے بورڈوں کے ارکان' مجلس مقننہ کے اردو نواز اصحاب کیا کر رہے ہیں؟

یہ ایک ہی اعلان نہیں جسے نظرانداز کیا جاتا۔ اس قسم کے ہزاروں اعلان انگریزی ٹپہ خانوں' تار گھروں' سرکاری دفتروں اور ریل کے ڈبوں میں نظر آتے ہیں تعجب ہے کہ اردو کی ستیاناسی اسی صوبے میں کی جائے جو اردو کا وطن ہو اور ــــ اہل زبان خاموش بیٹھے رہیں؟! الہ آباد میں "ہندوستانی اکیڈمی" اعظم گڑھ میں "دارالمصنفین" قرول باغ میں "اردو اکاڈمی" ہو؛

"ہندی پرچارنی سبھا" کا مسکن بنارس ہو اور انجمن ترقی اردو کا صدر مرکز دہلی میں ہو؛ پھر بھی اس صوبے میں زبان کی توہین آمیز اور حقارت انگیز عبارتیں گوارا کی جائیں!؟ ایک طرف تو سرکاری اور قومی یونیورسٹیوں اور کالجوں' مدرسوں اور پاٹھ شالاؤں' مکتبوں اور درس گاہوں میں صحیح زبان سکھائی جارہی ہے' اردو کے استادوں اور اردو کے پروفیسروں پر ملک و قوم کا ہزار ہا روپیہ صرف ہو رہا ہے اور دوسری طرف سرکار کے محکموں میں' سرکاری ریلوں میں اردو کی ناقدری ہی نہیں اردو کا ستیاناس اور غارت گری ہو رہی ہے اور ہم آپ خاموش بیٹھے فلسفہ بگھار رہے ہیں!!

جعفر حسن

نغمہ اردو

اظہار مطالب کی جو تو جان ہے اردو	ہر ایک ترا دل سے ثنا خوان ہے اردو
جس بزم میں کرتی نہیں تو نغمہ سرائی	کچھ شک نہیں وہ بزم بھی سنسان ہے اردو
رکتی ہو ترقی تری؟ ہوں لاکھ مخالف	دشمن بھی ترا تجھ سے پریشان ہے اردو
کب شستہ و صاف ایسی کوئی اور زبان ہے	کہنے میں سمجھنے میں بھی آسان ہے اردو
کیا تجھ پہ کوئی اور زباں کی ہو حکومت	تو مشترکہ قوم کی پہچان ہے اردو
بن جائے گی کچھ روز میں شیرازۂ اقوام	وسعت میں تری اس کا بھی امکان ہے اردو
سرمایہ نہ کیوں علم و ادب کا ہو۔ کہ تیرا	سلطان علوم آج نگہبان ہے اردو

اک روز تو ہو جائے زبان سارے جہاں کی
بس دل میں تمکین کے یہی ارمان ہے اردو

میر حسن علیخان تمکین

اُردو کے خاموش خدمت گذار

موجودہ زمانے میں "روشناسِ خلق" وہی ہستیاں ہیں جن کو سیاست یا کسی دوسری معرکتہ الآرا تحریک سے قریبی تعلق ہو
شعراء اور بعض سربرآوردہ مصنفین بھی رسالوں، تذکروں اور سوانح کے طفیل سے اپنی زندگی اور کام کو عوام تک پہنچا دیتے ہیں
اولیاء اللہ اور بزرگانِ دین کے تذکروں کو بھی شوق اور تعظیم سے پڑھا جاتا ہے۔ اور ان کی زندگی لوگوں کے لئے شمع ہدایت
ثابت ہوتی رہی ہے۔ لیکن زمانے کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ وہ ان قابلِ قدر ہستیوں کا بھول کر بھی خیال نہیں کرتا جن کو قوموں کی
تعمیر میں بہت بڑا دخل ہے۔ جن کی مخلصانہ کوشش ہماری نسلوں کے ذوقِ عمل و تحصیلِ علم کو اکساتی ہیں۔ اور ایسے افرادِ قوم کی
ذہنی نشوونما ان کے ذمہ ہوتی ہے جن سے قوموں کی قسمتیں وابستہ ہوتی ہیں دنیا کا کوئی شخص اُستاد کی گرانمایہ خدمت سے
انکار نہیں کرسکتا۔ یہی وہ سرچشمہ ہے جہاں سے ایسے سوتے اُبلتے ہیں جن سے انسانیت کی کھیتی ہری ہوتی ہے۔ یہی وہ انسان نما
خضر ہیں جو ہزاروں بھٹکے ہوؤں کو راہ راست پر لگاتے ہیں اور نئی نئی شاہراہیں کھولتے ہیں افسوس ہے کہ یہی لوگ زمانے کی
نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ محمد علی جناح اور گاندھی جی کے اُستاد کون تھے ؟ کہاں کے رہنے والے تھے
اور انھوں نے ان کی زندگی اور طبیعت و اخلاق کے بنانے میں کیا حصہ لیا تھا ؟ ہاں ایکٹرسوں اور ایکٹروں کی زندگیوں کے
ایک چھوڑ کئی ایڈیشن نکل سکتے ہیں ان کی حیات کے ہر دور سے لوگ واقف رہیں گے۔ کب فلاں نے فلاں سے ملاقات کی۔
فلاں کی زندگی میں تبدیلی کب پیدا ہوئی۔ غرض کہ ممکنہ معلومات سے ہر شخص واقف ہونا چاہتا ہے۔

میتھو آرنلڈ نے سچے ہیرو کے لقب کو صرف اُستاد کے لئے مختص قرار دیا ہے اس کے نزدیک اساتذہ صرف اکیلے ہی
ترقی کی راہ پر گامزن نہیں رہتے بلکہ ایک کاروان کی بھی رہنمائی کرتے ہیں اور تاوقتیکہ ان سب اہلِ کاروان کو منزلِ مقصود پر
پہنچا نہیں دیتے ان کی محنت ٹھکانے نہیں لگتی۔ اساتذۂ اُردو جس گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں وہ خود ہماری پستی
اور ناقدرشناسی کی دلیل ہے۔ ان اساتذہ کی صحیح عظمت کا اندازہ اس حقیقت سے ہوسکتا ہے کہ ان ہی کی کوششوں
اور تربیت سے ہر قسم کی علمی و ادبی صلاحیت کے جوہر کھلتے ہیں۔ اُستاد ہی کی صحیح تربیت کسی کو شاعر، کسی کو افسانہ نگار
اور کسی کو خادمِ قوم بننے کا موقع دیتی ہے۔ اس مضمون کے شائع کرنے سے یہ مقصد نہیں کہ صرف اساتذۂ اُردو ہی کے سر
ساری عظمتوں کا سہرا ہے بلکہ اس کا یہ مقصد ہے کہ ان خاموش خدمت گذاروں کی طرف بھی لوگوں کو متوجہ کیا جائے
یہ میری پہلی کوشش ہے اگر اس میں مجھے کامیابی ہوجائے اور اُردو کے موجودہ اُستادوں سے میں اُردو دنیا کو متعارف
کراسکا تو میں کوشش کروں گا کہ ایسے اصحاب کے حالات بھی جمع کروں جو اُردو کی تعلیم دیتے ہوئے اپنی زندگیاں ختم کرچکے ہیں

اُردو زبان کی مقبولیت اور وسعت روز افزوں ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام سے اس زبان کو بہت بڑی سرپرستی
حاصل ہوگئی ہے اس جامعہ میں ذریعۂ تعلیم اُردو ہے۔ اور وہ تمام مغربی علوم و فنون جو غیر زبانوں میں مقید تھے اب آزاد ہیں
اس لئے اُردو کے اُستاد بھی اِس دور میں پہلے سے زیادہ توجہ، روشناسی اور قدر و منزلت کے مستحق ہیں۔

اُردو کے اِن بہی خواہوں اور سرپرستوں کی گنتی انگلیوں پر کی جاسکتی ہے اور ان میں سے اکثر کسی نہ کسی ادارہ

درس و تدریس سے متعلق ہیں میں نے اسے اپنا سب سے مقدس اور پہلا فریضہ سمجھا کہ ان قابل احترام ہستیوں سے قارئینِ سب رس کو متعارف کراؤں۔ اس خیال کا ذکر میں نے محترمی و استادی ڈاکٹر زور صاحب سے کیا جنھوں نے اس کو بہت پسند کیا اور ممکنہ امداد کے بہم پہنچانے کا وعدہ کیا میں نے ہندستان کی مختلف جامعات کے اُردو کے اساتذہ صاحبان سے خط و کتابت شروع کر دی اور ان کے حالاتِ زندگی، کام اور دیگر معلومات کا ایک تفصیلی خاکہ مانگا۔ عالیجناب ڈاکٹر زور صاحب نے ہر خط پر میری استدعا پر توجہ کرنے کے لئے شخصی اثر اور تعلق سے کام لیتے ہوئے سفارش کی لیکن اکثر اساتذہ صاحبان نے روایتی "عدم توجہی" اور "لاجوابی" سے کام لیا۔ بعض نے نہایت ہی مختصر حالاتِ زندگی کے روانہ کرنے پر اکتفا کی۔ بعض نے تصویر بھیجنے سے معذوری ظاہر کی۔ اور اکثروں نے "میرے حالات زندگی کچھ قابل ذکر نہیں"۔ "ایک زمانے سے تصویر نہیں کھنچوائی اس لئے معذور ہوں" "میں ایک خاموش کارکن ہوں" لکھ کر مجھے مایوس کر دیا۔ دوبارہ اس سلسلے میں یاد دہانی کی گئی تو کچھ زیادہ توجہ سے کام لیا گیا۔ اور اس کے لئے میں سب سے پہلے ڈاکٹر زور کا اور پھر جملہ اساتذہ صاحبین کا تہِ دل سے مشکور ہوں۔ دوسروں کے نزدیک "خاموش کارگزاری" اور "عزلت گزینی" چاہے جس نظر سے بھی دیکھی جائے بحیثیت اُردو ادب کے ایک مخلص طالب علم اور سوانح نگار کے میں اس کو ایک ادبی "رجعت پسندی" سے تعبیر کروں گا۔ اس مضمون میں اگر یکجا ہو جائے تو آپ دیکھیں گے کہ ایسی ایسی گمنام ہستیاں آپ کے پیش نظر رہیں گی جن کی زندگی کا ایک ایک باب ہدایت اور رہنمائی کا دفتر لئے ہوئے ہے۔

ان ہی خواہانِ اُردو کی زندگیاں جن منزلوں سے گزریں، جو جو مراحل ان مستقل مزاج اصحاب کو برداشت کرنے پڑے، اور جس کس مپرسی اور عزلت گزینی کی حالت میں انھوں نے اپنی زبان اور ادب کی خدمت کی ان سب کو نظروں میں رکھتے ہوئے کون ہے جو خاموش خدمت گذاری اور مستقل مزاجی کا درس نہیں لے گا۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ مضمون جملہ اساتذہ صاحبانِ اُردو کی زندگیوں پر روشنی نہ ڈال سکے گا۔ بہرحال اسے ایک ابتدائی کوشش سمجھئے۔ موقع ملے تو ایک مستقل تذکرہ اس موضوع پر ترتیب دیا جاسکے گا۔ اس وقت جن اصحاب کے حالات مہیا ہو سکے ہیں ان کے نام حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ مولوی سید مسعود حسن صاحب رضوی ایم اے ایل ٹی۔ (لکھنو)
۲۔ سید ضامن علی صاحب ایم اے (الہ آباد)
۳۔ ڈاکٹر ایم حفیظ سید صاحب ایم اے۔ پی ایچ۔ ڈی۔ ڈی لٹ۔ ایل ٹی (الہ آباد)
۴۔ مولوی سید نجیب اشرف صاحب ندوی ایم۔ اے (اسمٰعیل کالج جوگیشوری۔ بمبئی)
۵۔ مولنٰا محمد طاہر صاحب فاروقی ایم۔ اے۔ مولوی فاضل۔ ادیب فاضل۔ دبیر کامل (آگرہ یونیورسٹی)
۶۔ پروفیسر حامد حسن صاحب قادری (آگرہ یونیورسٹی)
۷۔ مولوی عبدالقادر صاحب سروری ایم اے۔ ال ال بی (کلیہ فنون جامعہ عثمانیہ)
۸۔ مولوی سید محمد صاحب ایم اے (کلیہ بلدہ۔ جامعہ عثمانیہ)

(۱) مولوی سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب۔ ایم اے۔ ایل ٹی۔ (لکھنو یونیورسٹی)

آپ نے جس گھر میں آنکھیں کھولیں، اس میں تمول نہ تھا تو پریشان حالی بھی نہ تھی۔ قسمت نے آپ کو ایسے زمانے میں پیدا کیا

پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی

پروفیسر سید مسعود حسن رضوی

اسمٰعیل میرٹھی - اکبر الہ آبادی
نظم طبا طبائی - شوق قدوائی

پروفیسر ڈاکٹر حفیظ سید

جب کہ عزت و وقار کا کاروان آپ کے برگزیدہ اور اولوالعزم بزرگوں کے ساتھ کوچ کر چکا تھا۔ آپ گردِ کارواں سے کاروان کی عظمتوں کا اندازہ کرنے کے لئے پیدا ہوئے۔ میراث میں وہ خاندانی ثروت و دولت نہ ملی البتہ چند سرکاری کاغذ زمانے کی دست برد سے محفوظ تھے یہی اس خاندان کی گزشتہ ترقی اور عروج کی یادگار تھے۔ وہ لوگ بھی نہ رہے جنھوں نے اپنی آنکھوں سے اس خاندان کو ترقی کی منزلیں طے کرتے دیکھا۔ ان کاغذات میں آپ کے دادا کے دادا سید عزیز علی ولد سید عبدالمطلب کی ایک جاگیر کی تفصیل درج ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ سید عزیز علی کے دادا سید سیف اللہ ولد سید محمود "بندہائے چوکی خاص" میں سے تھے۔ اور دو صدی ذات کے منصب پر فائز تھے۔ سید عزیز علی کی ایک بڑی جاگیر نواح گورکھپور میں تھی۔

آپ کے والد سید مرتضیٰ حسن مرحوم' ایک عالم بزرگ اور حاذق طبیب تھے۔ اُن کا وطن' اودھ کے ضلع اُناؤ میں قصبۂ نیوتنی تھا۔ حصولِ علم کے لئے کشاں کشاں لکھنو گئے۔ جہاں سے بہرائچ پہنچے۔ مسعود حسن صاحب رضوی کا مقام پیدائش بہرائچ اور تاریخ ۱۵ محرم ۱۳۱۱ھ ہے آپ کے والد کا خیال تھا کہ آپ طب اور علوم اسلامی میں دستگاہ حاصل کریں۔ لیکن اُردو نے آپ کو اپنی خدمت کے لئے منتخب کر لیا تھا۔ آپ کی عمر ابھی دس ہی برس کی تھی کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ مایوسیوں اور مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا' سرپرست کی موت نے سارے حوصلے پست کر دئے۔ عزیز و اقارب ایسے ہمدرد نہ تھے کہ آپ کی آئندہ فلاح و بہبود کا خیال ان کے دل میں پیدا ہوتا' اور وہ آپ کے تعلیمی مصارف کے کفیل ہوتے' ایک بیوہ ماں کی اشک شوئیوں اور تسلیوں نے علم کے شوق کو آنسوؤں کی زد میں بہہ جانے سے روکا اور حصول علم کی آگ کو افسردگی کی راکھ میں بجھنے نہ دیا۔ اور برابر آپ کی ہمت بندھاتی رہیں۔ آپ کی تعلیمی زندگی اصل میں آپ کی والدۂ محترمہ کی بدولت پروان چڑھی۔

آپ کی ذاتی استعداد اور دماغی صلاحیت کو بھی آپ کی تعلیمی ترقی میں بہت بڑا دخل ہے۔ اسکول کے ہر امتحان میں اول آتے' اور سال بہ سال ترقی پاتے۔ آٹھویں درجے میں پہنچے تو دردِ سر کا عارضہ لاحق ہو گیا اور اب تک یہ دردِ سر پیچھا نہیں چھوڑتا۔ سال میں ایک آدہ دفعہ ضرور سر اٹھاتا ہے سر کے درد کے ساتھ تبخیر معدہ کی شکایت بھی پیدا ہو گئی۔ تو آپ کو سلسلۂ تعلیم جاری رکھنے میں سخت زحمت کا سامنا کرنا پڑا' بعض بہی خواہوں نے مشورہ بھی دیا کہ جان ہے تو تعلیم بھی ہے۔ مگر جو قدم تعلیم کی راہ میں آگے بڑھے وہ رکے اور نہ پیچھے ہٹے۔ آپ نے اس بیماری کی حالت میں بھی تعلیم جاری رکھی اور ۱۹۱۷ء میں کیننگ کالج لکھنو سے بی اے کا امتحان کامیاب کر لیا۔ بی اے کے بعد ام اے کا داخلہ لیا۔ ایک سال ادبیات انگریزی کی تحصیل میں صرف کیا۔ لیکن امتحان میں شریک نہ ہو سکے۔ اسی سال آپ پر ہیضے کے مہلک حملے ہوئے۔ زندگی تھی بچ گئے۔ اور اس دفعہ آپ کے شوقِ تعلیمی کو بیماری کے آگے سرد ہونا پڑا۔

اسی اثناء میں صوبۂ متحدہ کے سررشتۂ تعلیم میں ایک جگہ نکالی گئی۔ کام یہ تھا کہ صوبہ میں جتنی کتابیں بھی شائع ہوں ان کی فہرست تمام ضروری تفصیلوں کے ساتھ ہر سہ ماہی میں صوبے کے سرکاری اخبار (یو۔ پی۔ گورنمنٹ گزٹ) میں شائع کی جائے۔ اور عوام کے رجحان کا اندازہ کرنے کے لئے تبصرے لکھے جائیں۔ جس سے رپورٹ کے لئے مواد فراہم ہو سکے۔ اپریل ۱۹۱۸ء میں آپ کا تقرر اس خدمت پر ہو گیا' اور آپ لکھنو چھوڑ کر الہ آباد چلے گئے اس ملازمت کی بدولت آپ کی نظر سے ہر تازہ کتاب گزرتی' اور مطالعہ کا جو شوق آپ کی فطرت میں تھا اس کی پوری بھڑاس نکلتی۔ ڈیڑھ دو سال کے قلیل عرصے میں آپ کی

نظر سے تقریباً دس ہزار کتابیں گزریں۔ اسی ملازمت نے آپ کی معلومات کو وسیع اور تصنیف و تالیف کے جذبہ کو بیدار کر دیا۔ ۱۹۲۲ء میں ٹیچرس ٹریننگ کالج الہ آباد سے آپ نے ایل ٹی کی ڈگری حاصل کی، اسی سال لکھنؤ یونیورسٹی کے جونیر لکچرار کی حیثیت سے آپ کا تقرر بہ یافت ۲۲۵ تا ۲۵۰ ہوا۔

اگست ۱۹۲۶ء میں اُردو کے لکچرار کی حیثیت سے آپ کا رگزار ہوگئے۔ ۱۹۲۵ء میں فارسی ام اے کا امتحان اس امتیاز کے ساتھ کامیاب کیا کہ آپ کو یونیورسٹی نے ایک طلائی تمغہ عطا کیا۔ آپ کی فارسی قابلیت بھی مسلم ہے ۱۹۳۳ء میں آپ نے ایرانی زبان کی تحصیل و تکمیل کے ارادے سے ایران کا سفر بھی کیا۔

۱۹۳۰ء سے برابر ان دونوں اہم زبانوں کے پروفیسر ہیں اور دونوں شعبوں کی صدارت آپ ہی کے تفویض ہے۔ آپ کی موجودہ تنخواہ ساڑھے آٹھ سو ماہوار ہے۔ آپ کو قدیم اور نادر کتب کے جمع کرنے کا بے حد شوق ہے۔ ادبیات سے جو گہرا لگاؤ آپ کی طبیعت کو ہے وہ اُردو کی توسیع و اضافہ کا ضامن ہے۔ لکھنؤ کی گلیوں کی خاک چھان چھان کر اور بڑی عرق ریزی کے بعد آپ نے اپنے کتب خانے میں نادر کتابوں کا کافی ذخیرہ فراہم کر لیا۔ قدیم تذکرے اور مخطوط، کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ اور ایک قابل ذکر چیز یہ ہے کہ واجد علی شاہ کی تصانیف جتنی آپ کے ذخیرۂ کتب میں محفوظ ہیں دوسری جگہ نہیں ملتیں۔ ان کی تعداد چالیس بیالیس کے قریب ہے۔

شاعری آپ کے لئے اگرچہ "ذریعہ عزت" نہیں، پھر بھی جذبات کے اظہار کی خاطر اس کو بھی کام میں لاتے ہیں۔ آپ کے اشعار جذباتی اور بالکل فطری ہوتے ہیں۔ خاص کر بچوں کے لئے آپ جو نظمیں لکھتے ہیں وہ بہت مفید ہیں اور اردو ادب کی کمی کو پورا کرتے ہیں

خرابی صحت نے آپ کے علمی انہاک میں بہت کچھ رخنہ ڈالا۔ پھر بھی آپ کی قلمی کاوشیں کافی تعداد میں منظر عام پر آچکی ہیں۔

آپ کی ایک تصنیف "ہماری شاعری" کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ کتاب کئی یونیورسیٹوں کے نصاب میں بھی داخل ہے۔ دوسری اور ادبی کوششیں یہ ہیں جو اُردو کے لئے ایک قابل قدر اضافہ ہیں "امتحان وفا، فرہنگ امثال فیض میر، مجالس رنگین، دلبستان اُردو روح انیس، نظام اُردو، جواہر سخن جلد دوم۔ ان کے علاوہ کئی ایک تنقیدی مضامین مختلف جرائد میں شائع ہوچکے ہیں آپ کے زیر تصنیف "تاریخ مرثیہ" ہے۔ یہ کتاب اپنی اہمیت اور نوعیت کے اعتبار سے اپنی آپ نظیر ہوگی۔ آپ نے اس کتاب کی تکمیل کے لئے بڑی کاوش سے مرثیوں اور مرثیہ نگاروں کے حالات جمع کئے ہیں۔ ان میں تقریباً تین سو مرثیہ نگاروں کے کہے ہوئے مرثیے شامل ہیں

آپ کی دیگر علمی و ادبی مصروفیتیں بھی قابل ذکر ہیں آپ "ہندوستانی اکیڈیمی" کے ممبر ہیں اور اکیڈیمی کے سہ ماہی رسالہ "ہندستانی" کے ایڈیٹوریل بورڈ کے رکن بھی۔ کئی سال تک انجمن اُردو کے سکریٹری رہے اور انجمن کی طرف سے ۱۹۲۵ء میں ایک ادبی جلسہ اور ایک ادبی نمائش کی آپ نے جن مختلف علمی و ادبی انجمنوں میں مقالے پڑھے ان کے نام یہ ہیں۔ آل انڈیا اورنیٹل کانفرنس، آل انڈیا شاعر کانفرنس مسلم اکیڈیمی وغیرہ۔ مسلم اکیڈیمی لکھنؤ کے سکریٹری، نائب صدر اور صدر بھی رہ چکے ہیں۔

جناب مسعود حسن صاحب رضوی اُردو اور فارسی دونوں زبانوں کے مسلمہ ماہر اور ادیب ہیں آپ کی ذات سے اُردو کو بالخصوص ایک بیش بہا امداد اور ترقی کی توقع ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ صاحب موصوف کی بیشتر مصروفیتیں اسی کے لئے وقف ہیں۔ ہندوستان کی وہ تمام انجمنیں جنھیں اُردو کی ترویج و توسیع سے دلچسپی ہے آپ کی خدمات کو حاصل کرنا اپنے مقصد کی کامیابی کے لئے لازمی سمجھتی ہیں آپ کی ہر دلعزیزی، علمی تبحر، اخلاق کی برگزیدگی۔ ایسی خصوصیات ہیں جو آپ کو ایک ایسے درجے پر پہنچا دیتی ہیں جہاں پہنچنا ہر بہی خواہ اُردو کا مقصد ہوتا ہے۔

(۲) کیپٹن سید ضامن علی صاحب ایم اے (الہ آباد یونیورسٹی)

سید ضامن علی صاحب ۱۸۹۷ء میں قصبہ مصطفےٰ آباد ضلع رائے بریلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق خاندان گرویز سے ہے یہ خاندان اپنی عزت و وقار کے لحاظ سے کافی شہرت رکھتا ہے اس کے اکثر افراد ممتاز عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں اس خاندان نے علم و ادب کے بہی خواہ بھی پیدا کئے۔ آپ کے جد امجد سید نوروز علی صاحب فارسی کے اسکالر اور ہندی کے زبردست شاعر تھے اور شاہان اودھ کے عہد میں ناظم سلطنت جیسے جلیل القدر عہدے پر فائز تھے۔ ضامن علی صاحب کا ننھیال اور ددھیال علم و فضل اور جاہ و منصب دونوں حیثیتوں سے قابل ذکر ہے۔ آپ کے ماموں میر علی عباد صاحب سیناؔن ایک اچھے اور قادر الکلام شاعر تھے آپ کے والد سید واحد علی صاحب بھی اُردو کے بہت اچھے شاعر تھے۔

سید ضامن علی صاحب کی آنکھیں ایسے ماحول میں کھلیں، جس میں علم و ادب کے تذکروں کے سوا کچھ نہ تھا۔ آپ کا مکتب آپ کا گھر ہی تھا۔ بچپن کا بیشتر حصہ لکھنؤ میں گزرا۔ علامہ سید جواد صاحب اور مولٰنا شیخ فدا حسین سے شرف تلمذ رہا علوم شرقیہ کی تعلیم لکھنؤ ہی میں ہوئی۔ البتہ انگریزی تعلیم کے آغاز کے بعد سے آپ کو مختلف مقامات سے امتحانات پاس کرنے پڑے آپ نے آگرہ سے انٹرمیڈیٹ اور الہ آباد سے بی اے اور ام اے کی اسناد حاصل کیں ۱۹۱۶ء میں کریجویٹ ہو ... [illegible] ... مترجم کی حیثیت سے مامور ہوئے اور کچھ دنوں بعد ڈپٹی کلکٹری کے لئے بھی نامزد کئے گئے لیکن علم و ادب کی خدمت کے شوق نے آپ کو اس کام سے بیزار کر دیا اور آپ نے ایونگ کرسچین کالج میں فارسی کا پروفیسر بننا پسند کیا۔ اور کم و بیش چھ سال تک اس کالج میں اپنا فرض منصبی نہایت خوش اسلوبی سے ادا کرتے رہے۔ الہ آباد یونیورسٹی کے فارسی پروفیسر جناب ناصری مرحوم جب بجنور ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہو کر چلے گئے تو یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد کی نظر انتخاب آپ ہی پر پڑی۔ اور جب اس یونیورسٹی میں پہلے پہل شعبۂ اُردو کھولا گیا تو آپ ہی اس کے صدر مقرر کئے گئے آپ کی علمی قابلیت، طریقۂ تعلیم اور حسن خلق کا ہر شخص معترف ہے اور آپ نہایت کامیابی کے ساتھ اپنے اہم فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہیں

آپ کی دماغی صلاحیتوں کو شاعرانہ ماحول ملا۔ علم و ادب آپ کی گھٹی میں پڑا تھا ... [illegible] ... اس آب حیات کے پیاسے تھے اور اپنی تمام کوششوں کو حصول اور خدمت علم کے لئے وقف کر چکے تھے۔ آپ کا شمار ہندوستان کے اچھے شاعروں اور ادیبوں میں ہوتا ہے آپ کی شاعری حضرت منیاؔں کے فیض صحبت کی مرہونِ منت ہے۔ یونیورسٹی کے لکچروں کے علاوہ آپ اُردو کی خدمت کے لئے کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں اُردو زبان اور ادب پر آپ نے ایک زبردست اور عالمانہ مقالہ سپرد قلم کیا ہے۔ جو ہندوستانی اکیڈیمی اور سپرو کمیٹی کی رپورٹ پر پیش کیا گیا۔ تاریخ زبان اور اُردو ادب پر اس مقالے کے پڑھنے سے کافی عبور حاصل ہو سکتا ہے۔

قصائد، سلام، رباعی، مرثیے بھی آپ کی طبع موزوں اور فکر رسا کا نتیجہ ہیں۔ جو وقتاً فوقتاً ہندوستان کے مقتدر رسائل میں شائع ہوا کرتے ہیں۔ آپ نے ایک تاریخی مقالہ "واقعات کربلا" پر اورینٹل کانفرنس میں پڑھا۔ علم تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ مقالہ قابل قدر چیز ہے۔ اور وہی لوگ آپ کی کاوش اور محنت کی داد دے سکیں گے۔ اس مقالہ کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اب تک کئی بار طبع ہو چکا ہے۔

مرثیہ نگاری آپ کا مرغوب موضوع ہے آپ نے اس کی تحقیق و تاریخ کی ترتیب کا کام شروع کر دیا ہے۔ بہت جلد اس صنف پر سیر حاصل مواد منظر عام پر آجائے گا۔ آپ کی دوسری تصانیف "سیر کشمیر اور گوہر سیلون" ہیں۔ ان کتابوں میں سیر کشمیر اور سیلون کے حالات درج ہیں۔

آپ اُردو ادب سے تعلق رکھنے والی کئی انجمنوں کے صدر اور ممبر ہیں۔ آپ اکثر تعلیمی بورڈوں اور یونیورسٹیوں کے ممتحن بھی ہوتے رہتے ہیں اور کئی سال تک انڈین سیول سروس کے بھی ممتحن رہ چکے ہیں۔ آپ کو فوجی تعلیم سے بھی کافی دلچسپی ہے۔ ایک ادب کے پروفیسر کے لئے یہ دلچسپی یقیناً شاذ کا حکم رکھتی ہے۔ آپ الہ آباد یونیورسٹی کی یو۔ ٹی۔ سی کے کمانڈنگ افسر کی حیثیت سے اپنا کچھ وقت دیتے ہیں اور گورنمنٹ نے آپکو کیپٹن کا عہدہ دیا ہے۔

آپ کی گرانمایہ خدمات اُردو کے لئے ایک بیش بہا اضافے کی ضامن ہیں خدا کرے کہ آپ کی غیر مطبوعہ کتابیں جلد شائع ہو کر منظرعام پر آسکیں۔

(۳) ڈاکٹر ایم حفیظ سیّد صاحب۔ ام اے۔ پی اچ۔ ڈی۔ ڈی لٹ۔ ال ٹی۔ (الہ آباد یونیورسٹی)

میرے پہلے عریضے کے جواب میں صاحب موصوف نے لکھا "مجھے افسوس ہے کہ میرے یہاں اپنی کوئی تصویر موجود نہیں اور نہ فی الحال تصویر کھینچوانے کا ارادہ ہے۔ میرے حالات نہایت مختصر ہیں۔ میں چودہ برس سے الہ آباد یونیورسٹی میں اُردو بی اے اور ام اے کی جماعتوں کو پڑھاتا ہوں۔ اس اختصار نے مجھے مایوس سا کر دیا اس صورت میں آپ کے مفصل حالات زندگی اور کام سے اُردو دنیا کو متعارف کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ جانتا تھا کہ صاحب موصوف "گم نامی کی زندگی کو شہرت اور ناموری پر ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن دوسری دفعہ پھر اسی سلسلے میں یاد دہانی کی۔ بارے جواب خط کے ساتھ تصویر بھی وصول ہوئی۔ حالات اور کام "کافی" کے بجائے صرف "مختصر" رہ گئے۔ جس کے لئے میں آپ کا مشکور ہوں۔

آپ کے والد کا نام نظر حسن اور وطن ضلع غازی پور ہے۔ ضلع کے زمینداروں میں ان کا شمار تھا۔ شعروسخن کا اچھا ذوق رکھتے تھے خود بھی ایک "خوب کہنے والے" شاعر تھے۔ نظر تخلص کرتے تھے۔ ایک مثنوی "جلوۂ طور" انھوں نے اپنی یادگار چھوڑی ہے۔

آپ کی ابتدائی تعلیم مکتب میں ہوئی۔ انگریزی تعلیم دیر میں شروع کی۔ لکھنو اور الہ آباد کے اسکول اور کالجوں میں بی اے کی تعلیم پائی بی اے کی ڈگری لینے کے بعد آپ نے الہ آباد ٹرینگ کالج سے ال ٹی کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد آپ نے ملازمت اختیار کر لی۔ دس سال تک مختلف مدارس اور کالجوں میں ہیڈ ماسٹر اور پرنسپل رہے۔ ۱۹۲۵ء سے الہ آباد یونیورسٹی میں اُردو کی لکچراری پر مامور ہیں۔ ۱۹۳۲ء میں آپ نے لندن یونیورسٹی سے پی اچ۔ ڈی اور ۱۹۳۳ء میں ڈی لٹ کی ڈگری جامعۂ ماپل لئے سے حاصل کی۔

آپ نے حصولِ علم اور تحقیقاتی کام کے لئے بہت دور دراز سفر کئے۔ ڈی لٹ کی ڈگری فرانس کی ایک قدیم یونیورسٹی "ماپل لئے" سے حاصل کی۔ آپ کو فلسفہ و تصوف سے بھی گہری دلچسپی ہے۔ درس و تدریس میں آپ کا تجربہ بہت بڑھا ہوا ہے۔ لندن سے ٹیچرس ڈپلوما حاصل کیا۔ الہ آباد کے ال ٹی ہیں۔ اور عمر کا بیشتر حصہ محکمہ تعلیمات کی خدمت میں صرف کر چکے ہیں۔

آپ کی ادبی کاوشیں، مقالوں، مضمونوں اور کتابوں کی صورت میں منظرعام پر آچکی ہیں۔ آپ نے صرف اُردو ہی میں نہیں بلکہ انگریزی میں بھی اپنے علمی شغف اور تبحر کا ثبوت دیا ہے۔ آپ کی حسب ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

سکھ سہیلا، از برہان الدین شاہ جانم۔

منفعت الایمان۔ از برہان الدین شاہ جانم۔

قاضی محمود بحری یہ کتاب (A mystic poet of 12 th century) کے عنوان سے مستقل طور پر انگریزی میں بھی لکھی گئی ہے

کلیاتِ قاضی محمود بحری مع مقدمہ تشریح اور فرہنگ۔ یہ ڈاکٹر صاحب کا نہایت معرکۃ الآرا اور اہم کارنامہ ہے جس میں دکنی سلطنتوں کے آخری دور کے شاعر بحری کے کلام کو بڑی تحقیق کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ یہ کام ہر شخص نہیں کر سکتا۔ کیونکہ قدیم اردو کے قلمی نسخوں کو پڑھنا اور متروک الفاظ کو سمجھنا بڑے بڑے عالموں کے لئے بھی مشکل ہے۔ اس کلیات کی اشاعت نے ڈاکٹر سید صاحب کو اردو کے بلند پایہ محققوں کی صف میں ممتاز جگہ دے دی ہے۔

"دکن کی اردو شاعری"۔ (یہ مضمون نگار میں چھپا تھا) "بنگالی شعرائے اردو"۔ "یورپین شعرائے اردو" (زمانہ کانپور)
"غالب کے کلام کا مطالعہ" (الہ آباد یونیورسٹی میگزین)

اسی طرح حالیؔ، شبلیؔ، محمد حسین آزادؔ، دیوان جہاںؔ وغیرہ پر آپ کے مضامین شائع ہوئے۔ فرانسیسی میں آپ نے ایک کتاب "آپٹی میزم ان انڈین تھاٹ" (ہندوستانی تخیل میں رجائیت) شائع کی ہے۔

آپ کئی انجمنوں کے معتمد اور ممبر ہیں۔ کئی کمیٹیوں کے سرگرم کارکن اور مختلف "Boards" مجالس کے ممبر بھی ہیں۔ الہ آباد آگرہ اور یوپی کی اکثر تعلیمی کمیٹیوں کے مشیر اور ممبر ہیں۔ اپنے ذاتی تجربہ کی بناء پر آپ کا شمار شمالی ہند کے سربرآوردہ ماہرینِ تعلیم میں ہو سکتا ہے آپ نے ہندوستان اور دیگر مقامات کا سفر کیا۔ صوبجات بمبئی، متوسط اور یوپی کے مختلف مدارس کا معائنہ کیا اور وہاں کے اصول تعلیم کے متعلق معلومات حاصل کیں اردو زبان اور ادب کے علاوہ فلسفہ اور فن تعلیم پر بھی آپ کے پچاسوں مضامین اکثر انگریزی اردو رسائل میں شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ آپ کی ذات اردو اور سررشتۂ تعلیم کے لئے بے حد غنیمت ہے۔

صاحب موصوف کی تصنیفات اور مضامین اردو زبان کی اہم ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں۔ مشاہیر اردو ادب، جن کے جواہر پاروں کو صرف سطحی نظروں سے جانچا جاتا تھا، آپ نے ایک ایسے انداز میں روشناس کرایا ہے جس سے ان کی عظمتوں پر ہر پہلو سے روشنی پڑتی ہے۔ اور وہ منور گوشے جن پر کورذوقی نے پردے ڈال رکھے تھے روشن نظر آتے ہیں۔ آپ نے شاہ برہان الدین جانمؔ، قاضی محمود بحریؔ، محمد حسین آزادؔ، شبلیؔ، حالیؔ، غالبؔ اور دوسرے شعرا اور مصنفین کا جس غائر نظری سے مطالعہ کیا ہے، اور اس کے بعد جس انداز سے ان پر اپنے خیالات اور ان کے محاسن کو پیش کیا ہے، اس سے آپ کی تنقیدی صلاحیتوں اور قوتِ اخذ و تحقیق کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ دکن سے بھی آپ کو خاص دلچسپی ہے۔ شمالی ہند میں دکن کے قدیم شاعروں کو روشناس کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے قدیم زبان کو سمجھنا اور اس پر کام کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔

(۴) مولوی سید نجیب اشرف صاحب ندوی ایم اے۔ (اسمٰعیل کالج جوگیشوری بمبئی)

ولادت ۶ر جون ۱۹۰۱ء۔ مقام ولادت ارموری۔ ضلع چاندہ۔ آپ کے والد ڈاکٹر سید محمد حسین صاحب ارموری کے سرکاری ڈاکٹر تھے۔ آپ زیدی واسطی سید ہیں اور سادات بارہا سے خاندانی تعلق رکھتے ہیں جو فرخ سیر کے زمانے سے دیسنہ ضلع پٹنہ صوبہ بہار میں سکونت پذیر رہے۔

آپ کی ابتدائی تعلیم مرہٹی سے ہوئی چنانچہ اس زبان میں ورنا کا رفائیل [illegible] اس کے بعد قرآن شریف، اردو اور فارسی زبان کی تعلیم پائی۔ ۱۹۰۹ء میں آپ کو دارالعلوم ندوہ بھیج دیا گیا۔ آپ ندوہ میں چار سال تک رہے۔ اس دوران میں آپ اپنی جماعت میں ہر سال اول آتے رہے۔ اور ایک ممتاز حیثیت کے مالک رہے۔ آپ مولانا شبلی کے شاگرد رہ چکے ہیں

مولانا نے آپ کی ادبی و علمی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں خاص توجہ سے کام لیا۔ مولانا جس وقت سیرۃ لکھ رہے تھے آپ ان سے "بلاغ المرام" کا درس لیا کرتے تھے۔

آپ کی انگریزی تعلیم ۱۹۱۳ء سے شروع ہوئی ہے۔ میٹرک اور ایف اے کے امتحانات درجۂ اول میں کامیاب کئے اور وظائف سرکاری کے مستحق قرار پائے۔ بی اے میں زیر تعلیم تھے کہ ترک موالات کی وبا اٹھی اور آپ کو سلسلۂ تعلیم قطع کرنا پڑا آپ ۱۹۲۰ء میں دار المصنفین اعظم گڑھ چلے گئے۔ وہاں آپ کی مصروفیتیں زیادہ تر علمی و تحقیقی رہیں۔ اس دوران میں ترک موالات کا ہنگامہ کچھ کم ہوا آپ نے پھر تعلیم کی طرف توجہ کی اور بی اے میں شرکت کی۔ ۱۹۲۴ء میں بی اے کا امتحان آنرز کے ساتھ کامیاب کیا۔ اور یونیورسٹی کے جملہ طلباء میں اول رہے۔ یونیورسٹی نے وظیفہ عطا کیا۔ اس کے بعد ۱۹۲۶ء میں ام اے فارسی و عربی بھی درجہ اول میں پاس کیا اور سب میں اول رہے۔ اس صلے میں یونیورسٹی نے طلائی تمغہ اور دو سو روپے کی کتابیں دیں۔

سلسلۂ تعلیم کو ختم کرنے کے بعد آپ علمی خدمت میں منہمک ہو گئے اور دار المصنفین کا کام کرتے رہے۔ اور اپنی بیش بہا خدمات سے اُردو اور دار المصنفین کو مستفیض کیا۔ ساتھ ہی مختلف رسائل کو مضامین بھی روانہ کرنے لگے۔ آپ ۱۹۳۰ء میں گجرات کالج احمد آباد میں فارسی کے استاد مقرر ہوئے۔ آپ اُردو کے سچے بہی خواہ اور خدمت گذار ہیں۔ صوبہ کی انجمن ترقی اُردو کے سکریٹری ہیں۔ آج کل آپ ایک نہایت ہی گرانمایہ اور اہم کتاب کے لکھنے میں مصروف ہیں۔ اس کتاب کی اہمیت نام ہی سے ظاہر ہے یعنی "گجرات میں اُردو" اور یہ صاحب موصوف کی دس سالہ تحقیق و کاوش کا نتیجہ ہو گی۔ ۱۹۳۱ء سے آپ اسمٰعیل کالج جوگیشوری کے اُردو کے استاد ہیں۔ رقعات عالمگیری کی دوسری جلدوں کی ترتیب کا کام بھی آپ کے پیش نظر ہے دوسری علمی مصروفیتوں کے ذکر میں آپ یونیورسٹی کے اُردو بورڈ کے رکن، اور اردو ٹکسٹ بک کمیٹی کے ممبر ہیں۔

نجیب اشرف صاحب ندوی کا نام اُردو کی دنیا میں محتاج تعارف نہیں۔ آپ کی کتابیں اور مضامین اہمیت اور معلومات کے اعتبار سے بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ اور آپ ہندستان کے اچھے محققین اور ادیبوں کی صف میں اپنے لئے جگہ پاتے ہیں۔ آپ کا سب سے اہم کارنامہ جو منظر عام پر آچکا ہے رقعات عالمگیر اور ان کا معرکۃ الآرا مقدمہ ہے جس کی ترتیب و تالیف نے آپ کو ایک بلند پایہ محقق ثابت کر دیا۔

(۵) مولانا محمد طاہر صاحب فاروقی ام اے۔ مولوی فاضل، ادیب فاضل، دبیر کامل (آگرہ یونیورسٹی)

مولانا السنۂ ارلبعہ (عربی، فارسی، اُردو، انگریزی) کے مستند اور متبحر عالم ہیں۔ اور ساتھ ہی ہومیوپیتھک کے امتحان۔ ایچ ایل، ایم، ایس کے سند یافتہ اور گولڈ میڈلسٹ ہیں۔ ہندوستان کی مختلف جامعات سے آپ نے امتیازی کامیابی حاصل کی لکھنو سے دبیر کامل، الہ آباد سے منشی کامل اور مولوی فاضل پنجاب سے مولوی عالم اور ادیب فاضل کی اسناد حاصل کیں اور تقریباً پندرہ سال سے اردو اور فارسی زبان کی تعلیم دیتے ہیں۔ پانچ چھے سال سے آگرہ کالج میں صدر شعبۂ اُردو فارسی ہیں۔

آپ کے اکثر مضامین رسائل میں طبع ہوا کرتے ہیں۔ آپ نے طلبہ کے لئے متعدد نصابی کتب لکھیں۔ ان کے علاوہ چند قابل ذکر تصانیف یہ ہیں:۔

(۱) سیرت مولانا محمد علی۔ مولانا کی وفات کے بعد ۱۹۳۱ء میں سب سے پہلے فاروقی صاحب ہی نے یہ مختصر لیکن جامع سیرت لکھی

اس کتاب میں مصنف نے بعض ایسے حالات بھی لکھے ہیں جو خاندانی ذرایع سے حاصل کئے گئے۔ فاروقی صاحب کو مولنا سے ایک خاص تعلق، اپنے والد کی طرف سے تھا۔ مولنا اور فاروقی صاحب کے والد محمد محسن مرحوم بڑے گہرے دوست تھے۔ اور اسی دوستانہ کی وجہ سے فاروقی صاحب کو بعض ایسی معلومات بہم پہونچیں جو دوسروں کی دسترس سے باہر ہیں۔ اسلوب بیان نہایت عمدہ اور محققانہ شان لئے ہوئے ہے۔ مولنا کی سیرت پر ایک تشفی بخش اور کامل ریویو کیا گیا ہے۔ ہندستان میں اس کتاب کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔

سرکار دو عالم۔ حضور سرور کائنات صلعم کی مختصر سیرت پاک ہے جامعہ ملیہ دہلی نے بھی اپنی کتاب کے لئے یہی نام انتخاب کیا ہے لیکن فاروقی صاحب کی کتاب بہت پہلے طبع ہو چکی ہے۔ اس کتاب میں آنحضرتؐ کی زندگی کو مختلف پہلوؤں سے پیش کیا گیا ہے طرز بیان نہایت موزوں اور موضوع کے شایانِ شان ہے۔

ادبیات ایران نو۔ ایران کی جدید شاعری کو ہندستان میں روشناس کرنے کے لئے پروفیسر فاروقی نے شعرائے ایران کے نظم و نثر کے مختلف نمونے جمع کر کے پیش کئے ہیں اور موجودہ ایران کی ذہنی کش مکش اور رجحان کو ایک مبسوط مقدمہ میں ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب پر مختلف جامعات کے پروفیسر صاحبان نے بڑی اچھی تنقیدیں کی ہیں۔

سیرت اقبال یہ کتاب فاروقی صاحب کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ ہے اقبال پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بہت کچھ لکھا جائے گا۔ لیکن فاروقی صاحب نے اقبال کے کلام کو صحیح معنوں میں سمجھا ہے۔ اور آپ کی کتاب کو "اقبالیات" میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔

مولنا فاروقی بزم اقبال آگرہ کے بانی بھی ہیں۔ اسی بزم کی سرپرستی میں دو شاندار جلسے "یوم اقبال" اور "یوم اردو" کے ترتیب دئے گئے۔ اس بزم کے پیش نظر دو مقاصد ہیں ایک تو یہ کہ زبان اُردو کی خدمت اور دوسرا پیغام اقبال کی اشاعت۔

جامعۂ اُردو۔ مولنا فاروقی کی تحریک سے بزم اقبال کی سرپرستی میں آگرہ میں ایک اُردو یونیورسٹی کا انعقاد عمل میں لایا گیا ہے جس کو سر محمد یعقوب ممبر کونسل ڈاکٹر سر شفاعت احمد خاں، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں۔ خواجہ غلام السیدین کی سرپرستی حاصل ہے۔ فاروقی صاحب اس کے رجسٹرار ہیں۔ جامعہ مذکورہ کی نگرانی میں تین امتحانوں کا انتظام کیا گیا ہے۔ ادیب، ادیب ماہر، ادیب کامل۔ اس تحریک کا اولین مقصد ترویج و خدمت اُردو ہے۔ فاروقی صاحب کی مساعیٔ جمیلہ کو مشکور اور کامیاب دیکھنے کی آرزو ہر بہی خواہ اُردو کے دل میں ہونی چاہئے۔

(۶) پروفیسر حامد حسن صاحب قادری۔ (آگرہ)

میرے خط کے جواب میں، جس میں میں نے صاحب موصوف سے تصویر، حالات زندگی اور کام کا خاکہ روانہ کرنے کی درخواست کی تھی آپ نے تحریر فرمایا ہے "آپ مجھ سے مری تصویر اور حالات مانگتے ہیں۔ میں تصویر کے جواب میں نہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ

"مجھ کو دیکھو میری تصویر میں کیا رکھا ہے" نہ یہ کہ

"ہر کہ دارد میل دیدن در سخن بیند مرا"

تصویر کھینچوانے سے مجھے پرہیز نہیں۔ لیکن دوا کے طور پر گوارا کر لیتا ہوں اب کئی سال سے کوئی تصویر نہیں کھینچی۔ اس لئے بھیجنے سے معذور ہوں مجھے نہ صرف تصویر کی عدم وصولی کا بلکہ آپ نے حالاتِ زندگی بیان کرنے میں جس اختصار سے کام لیا ہے اس کا بھی ذکر کر دینا چاہئے۔ میں

قارئین سب رس کو صرف اسی حد تک متعارف کرواسکتا ہوں کہ آپ کی زندگی نہایت پرسکون گزری ہے اور آپ ایک مقدس خاندان کے نام لیوا ہیں۔ آپ کا سلسلۂ نسب بابا فرید گنج شکر سے ملتا ہے۔ تقریباً چالیس سال سے شعروسخن اور مضمون نگاری کا شغل ہے۔ درس و تدریس کا سلسلہ کوئی بارہ سال سے جاری ہے۔ سینٹ جانس کالج آگرہ کی اُردو اور فارسی تعلیم آپ ہی کے تفویض ہے۔

آپ کی علم دوستی اور لیاقت کا ہر اُردو داں معترف ہے۔ ہندستان کے اکثر و بیشتر رسائل آپ کے مضامین، نظموں اور غزلوں سے مزین رہتے ہیں۔ تالیف و تصنیف کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ جب ساتویں جماعت میں تعلیم پارہے تھے، ایک انگریزی ناول کا خلاصہ مرتب کیا۔ جسے اخبار پھول نے چھپوایا۔ اور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۶ء تک تین چھوٹی کتابیں گلدستۂ اخلاق، رفیق تنہائی اور حسنین لکھیں ۱۹۰۶ء سے آپ نے میدانِ صحافت میں باقاعدہ قدم رکھا۔ آپ کی نظمیں اور مضامین زمانہ، مخزن، علی گڑھ منتھلی وغیرہ جیسے مقتدر رسائل میں طبع ہونا شروع ہوئے اور علمی طبقہ میں آپ ایک اچھے شاعر اور کامیاب انشا پرداز سمجھے جانے لگے۔

آپ نے ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۴ء تک بچوں کا ایک پرچہ "اخبار سعید" نکالا اور اسی اخبار کے سلسلہ میں "بچوں کا کتب خانہ" جاری کیا اور بچوں کے لئے متعدد اخلاقی کتابیں لکھیں۔ آپ کی مختلف چھوٹی اور بڑی تصنیفات ایک کثیر تعداد میں ہیں جن میں سے اکثر مختلف صوبوں اور محکموں کے نصاب میں جاری اور رائج ہیں۔ بالخصوص شعبۂ تعلیم سے متعلق اور طلبہ کی ضرورتوں کا لحاظ کرتے ہوئے آپ نے بعض بہت قیمتی اور کارآمد کتابیں لکھی ہیں یہاں میں آپ کی چند مشہور تصانیف و تراجم کا نام دے دینا ضروری سمجھتا ہوں (۱) باغبان۔ یہ کتاب ڈاکٹر ٹیگور کی مشہور تصنیف "گارڈنر" کا ترجمہ ہے جو مکملن کمپنی کی فرمائش پر کیا گیا، ترجمہ رفتہ و شستہ اُردو میں ہے (۲) الکہل اور زندگی۔ یہ کتاب بھی مکملن کمپنی کی فرمائش پر لکھی گئی۔ (۳) فطرت اطفال۔ ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے جسے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ نے طبع کیا۔ (۴) کمال داغ۔ داغ دہلوی کے چاروں دیوانوں کا انتخاب ایک مبسوط ناقدانہ اور بصیرت افروز مقدمہ کے ساتھ ہے۔ (۵) تاریخ مرثیہ گوئی۔ اپنی کتاب میں مختصراً مرثیہ کی ابتدا اور عروج کے حالات بیان کئے ہیں اور مرثیہ سے متعلق جملہ معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ (۶) تاریخ و تنقید ادبیات اُردو۔ شعر و ادب اُردو کے متعلق تاریخی و تنقیدی مضامین اس کتاب میں جمع کئے گئے ہیں۔ مزید براں ایک مقدمہ بھی شامل ہے جس میں "اردو، ہندی، ہندستانی" کے مسئلہ پر فاضلانہ بحث کی گئی ہے۔ ایک اور کتاب "داستان تاریخ اُردو" کے نام سے زیر طبع ہے۔ اس کتاب میں اردو کی مکمل تاریخ مل سکتی ہے اور بعض گم نام ہستیاں جنھیں دوسرے تذکروں میں نظر انداز کر دیا گیا ہے منظر عام پر آجاتی ہیں۔ اور مصنف کو بعض ذرائع سے ایسے نایاب نسخے بھی ملے ہیں جنھیں اُردو سے بہت گہرا تعلق ہے۔ مثلاً فضلی کی "کربل کتھا"

آپ کی مرتبہ دوسری اور بہت سی کتابیں ہیں۔ جو ابھی زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئی ہیں۔ ان کتابوں میں اکثر آپ کے علمی و ادبی مضامین کے مجموعے۔ ناول اور تنقیدی و تاریخی تحریریں شامل ہیں۔ ان مرتبہ کتابوں میں سے چند کے نام یہ ہیں (۱) مرأت سخن۔ (۲) دفتر تواریخ (۳) صید و صیاد (۴) تذکرہ ہمایوں وغیرہ۔

صاحب موصوف کی تصنیفات اُردو کے لئے ایک اضافہ ہیں تقریباً ہر موضوع پر آپ نے قلم اٹھایا ہے اور جو کچھ بھی لکھا ہے بڑی کاوش اور تحقیق کے ساتھ لکھا ہے اور یہی خصوصیات آپ کو اپنے دوسرے ہمسروں سے ممتاز بناتی ہیں، زمانہ ایسے باہمت اور لایق اصحاب کے لئے مواقع مہیا کرے تو اردو ادب کی کم مایگی کا بہت کچھ ازالہ ہوسکتا ہے۔ آپ کی پوری زندگی علمی انہماک میں بسر ہوئی

پروفیسر سید محمد

پروفیسر عبدالقادر سروری

نواب مرزا سیف علی خاں
ناظم اعزازی کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو

خواجہ حمید الدین شاہد
مہتمم مدرسہ سب رس و ادارۂ ادبیات اردو

بچپن ہی سے تالیف و تصنیف کا سلسلہ شروع ہوا اور اب تک کئی قابل قدر کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

(۷) عبدالقادر صاحب سروری ام اے۔ال ال بی (عثمانیہ)

حیدرآباد کی علمی بیداری، جامعہ عثمانیہ کے چند ہونہار فرزندوں کی مساعیٔ جمیلہ کی مرہونِ منت ہے۔ انھیں ادیبوں اور انشا پردازوں کی کوششوں نے دکن کو علم و ادب کا مرکز اور ایک خاص اہمیت کا مالک بنا دیا ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری کا شمار بھی انہیں ادیبوں میں ہوتا ہے جنھوں نے حیدرآباد کی علمی دنیا میں انقلاب کی روح پھونکی جن کی تالیفات اور تصانیف نے ایک ایسے دور کی ابتدا کی جو بجاطور پر اُردو کا "دورِ نشاط" کہلایا جاسکتا ہے۔ صاحب موصوف نے تنقید، ترتیب، اور انشا پردازی کے لئے نئے اصولوں اور انوکھے اسلوب اختیار کئے اور تشنگانِ علم و ادب کے لئے نئے نئے راستے کھول دئے۔ حیدرآباد کے اکثر ادیب اور انشاپرداز کسی نہ کسی طرح آپ کی تحریروں سے متاثر نظر آتے ہیں۔

سروری صاحب کی شہرت حیدرآباد تک ہی محدود نہیں بلکہ سارے ہندوستان میں آپ کی تصانیف قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔ گزشتہ سال مجھے علی گڑھ جانے کا موقع ملا۔ وہاں میرے ایک دوست زیر تعلیم تھے۔ ان کے توسط سے مجھے وہاں کی علمی فضا میں کچھ دن گزارنے کا موقع ملا۔ پروفیسر صاحب موصوف کے شاگرد ہونے کی سعادت نے مجھے جس "لطفِ خاص" کا مستحق قرار دیا، اس سے میں آپ کی عظمتوں کا اور بھی معترف ہوا۔ سروری صاحب کی گرانمایہ تصنیف "جدید اردو شاعری" نے آپ کو اکثر یونیورسٹیوں میں ایک فاضل ادیب کی حیثیت سے روشناس کیا ہے۔ علی گڑھ میں اسی کتاب کو "نصابی کتب" کا درجہ حاصل ہے۔ وہیں مجھے اس حقیقت کا بھی احساس ہوا کہ حیدرآباد علمی حیثیت سے چاہے کتنا ہی آگے ہو۔ محسن شناسی اور قدردانی کے میدان میں اس نے قدم نہیں اٹھائے۔ سروری صاحب علم و ادب کی خدمت میں اپنی پوری صلاحیتوں کو وقف کئے ہوئے ہیں اور صلہ و تحسین کا خیال کئے بغیر خدمتِ علم و ادب میں مصروف ہیں۔

آپ کی ولادت ۱۳۲۴ھ میں حیدرآباد دکن کے محلہ سلطان شاہی میں ہوئی یہ مشہور قطب شاہی محلہ حیدرآباد کے اکثر علماء و فضلا کا مسکن رہ چکا ہے۔ یہیں کے ادبی ماحول میں آپ کی ذہنی صلاحیتوں نے ایک خاص رنگ اختیار کرنا شروع کیا۔ آپ کے والد ماجد حاجی محمد سرور قادری، معاشدار اور بڑے پابند اوقات بزرگ ہیں۔

آپ کے جد امجد حضرت سرور سلطان کشمیر سے تشریف لائے تھے، انہیں بزرگ کی نسبت سے آپ سروری کہلاتے ہیں حضرت سرور سلطان ایک باخدا بزرگ تھے۔ حیدرآباد آکر نوبت پہاڑ پر چلہ نشین ہوئے اور ارادتمندوں اور اہل غرض کو اپنی روحانی برکات سے مالامال کرتے رہے۔ آپ کی رحلت کے بعد آپ کا مزار اسی پہاڑ پر بنایا گیا اور آج تک آپ کا عرس بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے انھیں بزرگوں کے سائے میں پروان چڑھتے ہوئے سروری صاحب نے میدانِ علم میں قدم رکھا۔ آپ کے والد انگریزی تعلیم کے مخالف تھے وہ آپ کو مشرقی علوم و فنون کی تعلیم دلانا چاہتے تھے۔ لیکن قسمت نے آپ کو اُردو کی خدمت کے لئے منتخب کرلیا تھا۔ آپ نے ہر قسم کی قربانی قبول کی۔ اور ایک ایسی منزل میں قدم رکھا جہاں دشواریاں سدراہ تھیں۔ اور سب سے بڑی مصیبت سرپرستوں کی توجہ سے محرومی تھی۔ اس پر بھی آپ نے جدید علوم کی تحصیل کو اپنا مقصد بنایا۔ ایک ادیب کی زندگی کو جن "روایتی" مصایب سے دوچار ہونا پڑتا ہے آپ کی قسمت میں بھی تھیں۔

آپ کی ابتدائی تعلیم مکتب سے شروع ہوتی ہے "زماں خاں شہید" کے گنبد میں ایک "مولوی صاحب" درس دیا کرتے تھے۔ آپ نے ان کے آگے زانوئے شاگردی تہہ کیا۔ پھر آپ "مدرسہ منصبداران" میں اور یہاں سے نکل کر "دھرم ونت دنیکو لرہائی اسکول" میں شریک ہوئے۔ ان مدارس میں آپ کا شمار ذہین اور محنتی طلبہ میں ہوتا تھا ادبی سرگرمی کا آغاز انہیں ابتدائی منزلوں میں ہو چکا تھا اور جس قلیل عرصے میں آپ نے منزلِ مقصود تک رسائی حاصل کی وہ انہیں ابتدائی کوششوں کا نتیجہ ہے سٹی کالج حیدرآباد کا قدیم اور مشہور کالج ہے حیدرآباد کا کوئی ادیب ایسا نہیں جسے اس کالج کی فیض رسانیوں نے ممنون نہ کیا ہو "مفید الانام" کے بعد آپ مدرسہ فوقانیہ بلدہ میں شریک ہوگئے۔ میٹرک کامیاب کرنے کے بعد جامعہ عثمانیہ میں داخلہ حاصل کیا۔ اُردو، فارسی آپ کے اختیاری مضامین رہے۔ مولنا وحیدالدین سلیم کی شاگردی میں آپ کے علمی جوہر اجاگر ہونے لگے۔ آپ مولنا کے چہیتے شاگرد تھے۔ مولنا کی جوہر شناسی نے آپ کی ہر قسم کی رہنمائی کی اور جب رخصت پر تشریف لے جارہے تھے تو مولنا نے اُردو کی مددگار پروفیسری کے لئے آپ ہی کی سفارش کی۔ اسی سفارش اور ذاتی قابلیت کی بناء پر آپ موجودہ عہدے پر مامور ہوگئے۔

سروری صاحب ام اے۔ ایل ایل بی ہیں۔ ان دونوں امتحانوں میں امتیازی درجہ سے کامیابی حاصل کی۔ ام اے میں ساری یونیورسٹی میں دوم اور ال ال بی میں درجہ اول اور بعض مضامین میں اول رہے۔ قانون کے امتحان کی کامیابی کا اثر آپ کی ادبی مصروفیتوں میں نمایاں نظر آتا ہے۔ اکثر جدید مطبوعات کے "مقدمے" آپ نے لکھے ہیں "مقدمے" لکھنے میں سروری صاحب کو خاص کمال حاصل ہوگیا ہے۔ آپ کی علمی مصروفیت قابل تقلید ہے۔ اپنے فرائض منصبی کو ادا کرنے کے بعد آپ کا بیشتر وقت مطالعہ اور تالیف و تصنیف میں گزرتا ہے۔ کالج میں بھی آپ اسی طرح مصروف رہتے ہیں۔ آپ جو کچھ لکھتے ہیں احتیاط اور کاوش سے لکھتے ہیں اس کے باوجود آپ کی تحریر میں روانی بے ساختگی اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔ جو قابل تعریف ہے۔ سروری صاحب کی کتابیں مختلف موضوع پر مشتمل ہے۔ آپ کے مرغوب موضوع، تنقید، افسانہ نگاری تاریخ اور مثنوی ہیں۔

"جدید اردو شاعری" کا ذکر اوپر آچکا ہے یہ کتاب آپ کی سب سے بڑی تصنیف ہے۔ اس کتاب پر ہندستان کے مختلف مقتدر جرائد نے بلند پایہ تنقیدیں کی ہیں اور یہ اکثر یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہے۔ جدید اُردو شاعری کے متعلق یہ سب سے پہلی اور مستند تنقیدی کتاب ہے۔ اس کے پڑھنے سے موجودہ زمانے کے شاعرانہ رجحانات کا عمدگی سے پتہ چلتا ہے۔ اور اردو شاعری کی مکمل تاریخ سے واقف ہوسکتے ہیں۔ اس کے لکھنے میں بڑی کاوش اور تحقیق سے کام لیا گیا ہے۔ اب تک اس کے دو ایڈیشن شایع ہوچکے ہیں۔

سروری صاحب ہندستان کے بہترین افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں آپ کے افسانے سنجیدہ ظرافت کے نمونے ہوتے ہیں اکثر رسائل آپ کے افسانوں کو چھاپنا اپنی کامیابی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ نفسیاتی جز و بھی آپ کے افسانوں میں شریک رہتا ہے، اور جس خوبی سے آپ ان مسائل کو سلجھاتے اور پیش کرتے ہیں وہ آپ ہی کا حصہ ہے آپ کے افسانوں کا مجموعہ زیر طبع ہے۔ اور اسی فن سے متعلق آپ کی دو کتابیں "دنیائے افسانہ" اور "کردار اور افسانہ" شایع ہوچکی ہیں۔ نیز آپ نے ایک سلسلہ "دنیا کے شاہکار افسانے" کے نام سے جاری کیا تھا۔ آپ رسالہ "مکتبہ مجلہ" کے ایڈیٹر بھی کئی سال تک رہ چکے ہیں۔ دوسری ادبی کوششیں یہ ہیں:- "حیدرآباد کی تعلیمی ترقی" یہ کتاب اس موضوع پر سب سے پہلی کتاب ہے۔ آپ نے کئی مشہور قدیم کتابوں کو مرتب بھی کیا ہے

جن میں قابل ذکر، مثنوی پھول بن، از ابن نشاطی - کلیات سراج اورنگ آبادی - مثنوی قصۂ بے نظیر، از صنعتی بیجا پوری - ان کتابوں کے سلسلے میں آپ نے خاص تحقیقی کام کیا ہے - اور ہر ایک پر مبسوط اور مفصل مقدمہ مع تشریح کے سپرد قلم کیا ہے -

آپ ادارۂ ادبیات اُردو کے سرگرم اربابِ کار میں سے ہیں اور عالی جناب ڈاکٹر زور کے دستِ راست ہیں - ادارہ کے شعبۂ امتحانات وتنقید کے معتمد بھی ہیں -

آپ کی ذات سے اُردو کو بڑی بڑی امیدیں ہیں اور بالخصوص حیدرآباد کا ادبی ماحول آپ کے وجود کو بہت غنیمت سمجھتا ہے - آپ کا سب سے بڑا کارنامہ تو یہ ہے کہ آپ نوجوان انشاپردازوں اور بالخصوص افسانہ نگاروں کی صحیح تربیت دماغی کرتے ہیں اور ان کے رجحان کے مطابق ان کو ایک راستے پر ڈال دیتے ہیں - اب تک کئی افراد آپ کی ان کوششوں سے متمتع ہوکر "افسانوی دنیا" میں شہرت حاصل کر چکے ہیں -

(۸) سید محمد صاحب ام اے (عثمانیہ)

سید محمد صاحب ۱۹۰۶ء میں شہر حیدرآباد میں پیدا ہوئے - ابتداً مدرسہ مفید الانام میں شریک ہوئے - اس مدرسے سے مڈل کا امتحان بدرجہ اول کامیاب کیا اور سٹی ہائی اسکول میں شرکت کی ۱۹۲۲ء میں ہائی اسکول لیونگ سرٹیفکٹ کا امتحان کامیاب کیا اور جامعہ عثمانیہ میں داخلہ لیا ۱۹۲۴ء میں انٹرمیڈیٹ بدرجۂ اعلیٰ کامیاب کیا اور اُردو میں صد فی صد نمبر لئے - ۱۹۲۶ء میں بی اے اور ۱۹۲۸ء میں ام اے کی ڈگری حاصل کی - مولانا سلیم کے زمرۂ تلامذہ میں آپ کو خاص امتیاز حاصل رہا - اور اپنی جماعت میں ہمیشہ اُردو میں اول آتے رہے -

آپ کا تعلیمی دور بے حد شاندار رہا خصوصاً اُردو میں جو امتیازات آپ کو شروع ہی سے حاصل رہے وہ شاہد ہیں کہ آپ کو اُردو سے خاص اور فطری لگاؤ ہے - زمانۂ طالب علمی ہی سے آپ کو تحریر و تقریر کے مقابلوں میں حصہ لینے کا شوق تھا اور ہر مقابلہ میں آپ اول آتے -

سٹی کالج کے ادبی ماحول کو آپ ہی کی ذات سے زندگی حاصل ہے - کئی نوجوان آپ کی تربیت کے زیر اثر ادبی دنیا میں روشناس ہیں - حیدرآباد کے نوجوان ادیبوں میں سید محمد صاحب کا درجہ بہت بلند ہے - آپ نے اپنی گرانمایہ تصانیف کے ذریعہ ایک مقتدر ادیب اور محقق کی شہرت حاصل کرلی ہے - آپ کی سب سے پہلی تصنیف "ارباب نثر اردو" ہے یہ کتاب فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے اُردو نویسوں کا تحقیقی و تنقیدی تذکرہ ہے - ہر مصنف کے متعلق نہایت تحقیق کے ساتھ مواد جمع کرکے سیر حاصل بحث و تبصرہ کیا گیا ہے - اس کتاب کو علمی حلقے میں خاص مقبولیت حاصل ہوئی اور یہ کئی جامعات کے اُردو کے اعلیٰ امتحانات میں شریک نصاب کی گئی ہے اس کے دو ایڈیشن نکل چکے ہیں -

سید محمد صاحب ۱۹۲۸ء سے سٹی کالج کے اُردو کے لکچرار ہیں - اس دوران میں آپ نے طلبہ میں ادب کا صحیح ذوق پیدا کرنے اور پھر ان کی ادبی رہنمائی کرنے میں خاص محنت اور دلچسپی سے کام لیا ہے اور اسی دلچسپی کا نتیجہ ہے کہ سٹی کالج اب بھی اپنی "مردم خیزی" کی شہرت کو برقرار رکھ سکا - صاحب موصوف کا بیشتر وقت علمی خدمت اور تالیف و تصنیف میں گزرتا ہے - آپ کئی انجمنوں کے سرگرم کارکن ہیں - مجلہ طیلسانین کے رکن ادارت اور معتمد ہیں اور آپ کے اکثر مضامین مقتدر رسائل میں شایع ہوا کرتے ہیں

ترجمہ کرنے میں بھی آپ کو خاص مہارت حاصل ہے، آپ کئی کتابوں کے مولف ہیں ۔

گلشن گفتار ۔ خواجہ خاں حمید کا تذکرہ جو اُردو کا اولین تذکرہ ہے ۔

مثنویات میر ۔ (میر تقی میرؔ کی مثنویات جواب تک متفرق اور غلط سلط طور پر ملتی تھیں)

ایمان سخن ۔ شیر محمد خاں ایمانؔ کے کلام کا انتخاب ۔

یادگار ولی ۔ بابائے ریختہ کے جشن یادگار کا مجموعہ

قواعد فارسی ۔ راست اصول تعلیم پر فارسی کی ابتدائی قواعد ۔

مرقع اُردو ۔ اردوئے جدید کے نظم و نثر کا انتخاب

ان کتابوں کو بڑے سلیقہ کے ساتھ ترتیب دیا گیا ہے ۔ اور ہر ایک کے ساتھ ایک تنقیدی مبسوط مقدمہ بھی شامل ہے ۔ جس سے کتاب کی اہمیت میں بہت کچھ اضافہ ہو جاتا ہے ۔

مثنویات میر ۔ جامعہ عثمانیہ کے نصاب اردو میں داخل ہے ۔ قواعد فارسی اور دوسری کتابیں اکثر مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں ۔ سید صاحب کو قدیم اردو سے بھی گہری دلچسپی ہے ۔ مجلس اشاعت دکنی مخطوطات کے آپ معتمد ہیں ۔ حال ہی میں آپ کی مرتبہ دو نایاب کتابیں شائع ہوئی ہیں ۔ ملک الشعرا نصرتی کی مثنوی گلشن عشق اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کا نایاب دیوان ۔

سید صاحب کی تحریر میں تنقیدی شان ہوتی ہے ۔ طرز نگارش سادہ اور سلیس ہوتی ہے اور آپ کے قدرت بیان کی شاہد ۔ حیدرآباد کے موجودہ دور میں اُردو ادب کے سچے خدمت گذار اور بہی خواہ ڈھونڈے جائیں تو جناب ڈاکٹر زورؔ ۔ عبدالقادر سروری اور جناب سید محمد صاحب پر ہی نظریں اٹھتی ہیں ۔ اور دکن میں یہی "ارباب نثر اُردو" کہلانے کے مستحق ہیں ۔

رشید قریشی

سب رس

کا

"فضائی ادب" نمبر

مارچ سنہ ۱۹۴۰ء میں شایع ہوگا

اس نمبر میں نشر گاہ حیدرآباد کی نشر شدہ تقاریر کا معیاری انتخاب شایع کیا جا رہا ہے ۔

ملک کے مشاہیر کی اپنے خاص موضوعوں پر دلچسپ اور عام فہم تقریریں

اپنے تنوع اور معیار کے لحاظ سے یہ نمبر قابل دید ہوگا ۔

نصرتی کا سنہ وفات

بیجاپور کے قدیم اردو شاعروں ملا نصرتی کو غزل، قصیدہ، اور مثنوی وغیرہ تمام اصنافِ سخن میں یکساں کمال حاصل تھا اور وہ اپنے تمام ہم عصر شاعروں میں اپنی دل پذیر طرزِ نگارش اور بلند فکر کی وجہ سے سب سے زیادہ شہرت اور مقبولیت رکھتا ہے۔ اس کی رزمیہ مثنوی علی نامہ خصوصیت کے ساتھ مشہور ہے اور اردو ادب میں اپنی طرز کی ایک لاجواب شاہکار ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ جو شخصیتیں بہت زیادہ مشہور ہوتی ہیں، ان کے حالات و واقعات زندگی کے متعلق طرح طرح کے اختلافات مورخوں اور تذکرہ نویسوں میں نظر آتے ہیں اور عجیب بے سروپا باتیں مشہور ہو جاتی ہیں۔ نصرتی کا بھی یہی حال ہے۔ کسی نے اس کو برہمن بتایا ہے اور کسی نے بیجاپور کی بجائے کرناٹک کو اس کا وطن قرار دیا ہے۔ اس کی تصانیف اور ان کی تاریخوں، نیز اس کے سنہ وفات کے بارے میں بھی کئی اختلاف موجود ہیں۔

غزلوں اور متفرق کلام کے علاوہ اس کی تین مثنویاں مستقل ہیں۔ ایک گلشنِ عشق[1]، دوسری علی نامہ اور تیسری تاریخ اسکندری۔ ان میں سے پہلی مثنوی گلشنِ عشق کا سنہ تصنیف ۱۰۶۸ھ ہے اور اس کے متعلق کسی کو اختلاف نہیں۔

علی نامے کی تاریخ تصنیف مولف اردوئے قدیم نے ۱۰۷۱ھ بتائی ہے اور وہ اس بنا پر ہے کہ اس مثنوی میں پنالے کے قلعہ کی فتح کا ذکر ہے اور خود نصرتی نے اس فتح کا جو مادۂ تاریخ نکالا ہے اس سے ۱۰۷۱ھ برآمد ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف تذکرۂ شعرائے دکن کے مولف نے اس کا سنہ تصنیف ۱۰۷۶ھ بتایا ہے۔ مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب نے اپنی کتاب "یورپ میں دکنی مخطوطات" میں علی نامے کے نسخے کو دیکھنے کے بعد آخر الذکر تاریخ سے اتفاق کیا ہے اور اپنے رائے کی تائید میں عجائب خانہ برطانیہ کے قدیم اور معتبر نسخے میں جو شعر تاریخی درج ہے وہ بھی نقل کر دیا ہے۔

لکھا شہ میں جس جو یو کرامس　　　ہزار یک ہو ستر پہ تھے چھ برس

تاریخ اسکندری کا سنہ تصنیف مولوی عبدالحق صاحب کے مملوکہ نسخے کے بموجب ۱۰۸۳ھ ہے۔ بظاہر یہ نصرتی کے آخری مستقل تصنیف ہے۔ اسی سنہ کے اوائل میں اس کے مربی علی عادل شاہ ثانی کا انتقال ہوا اور اس کا کمسن بیٹا سکندر عادل شاہ تخت نشین ہوا جو ۱۰۹۷ھ میں فتح بیجاپور کے بعد عالمگیر کے حکم سے قید کر دیا گیا۔

مولوی عبدالحق صاحب اپنی کتاب نصرتی میں لکھتے ہیں۔

"نصرتی نے تین بادشاہوں یعنی محمد عادل شاہ، علی عادل شاہ ثانی اور سکندر عادل شاہ کا زمانہ دیکھا۔ فتوت نے اپنے تذکرۂ ریاض حسینی میں لکھا ہے کہ جب شاہ اورنگ زیب عالمگیر نے دکن فتح کیا تو وہاں کے شعرا کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ ان میں

---

[1] مجلس اشاعتِ دکنی مخطوطات کی طرف سے گلشنِ عشق اور علی نامہ دونوں کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ اول الذکر کو راقم نے اور موخر الذکر کو مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی پروفیسر جامعہ عثمانیہ نے ترتیب دیا ہے۔

نصرتی بھی تھے اور ان کے کلام کو سب سے افضل تسلیم کیا اور خطاب ملک الشعرائے ہند سے سرفراز فرمایا۔ مولوی عبد الجبار مرحوم نے تذکرۂ شعرائے دکن میں ان کا سنہ وفات ۱۰۹۵ھ لکھا ہے لیکن یہ معلوم نہیں ہوا کہ یہ اطلاع انھیں کہاں سے حاصل ہوئی۔ اگر یہ سنہ وفات صحیح ہے تو فتوت کا بیان صحیح نہیں ہو سکتا عالمگیر نے بیجا پور کو ۱۰۹۷ھ میں فتح کیا تھا۔

یہ سچ ہے کہ تذکرہ شعرائے دکن کے مولف نے ۱۰۹۵ھ کو سنہ وفات قرار دینے کی نسبت اپنے ماخذ کا ذکر نہیں کیا لیکن خطاب ملک الشعرا پانے کے بارے میں ان کا بیان فتوت سے بالکل ایک ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ :۔

"علی نامہ ختم کرنے کے بعد نصرتی کو علی عادل شاہ نے خلعت اور ملک الشعرائی کا خطاب عطا فرمایا تھا" عام طور پر اردو تذکرے نصرتی کے ذکر سے خالی ہیں اور فتوت کے سوا کسی اور روایت سے یہ امر ثابت نہیں ہوتا کہ اورنگ زیب نے دکن کی مفتوحہ سرزمین کے دکنی گو شاعر کی اس طرح قدر افزائی کی ہوگی۔ اورنگ زیب کی افتاد طبیعت، فاتحانہ شان اور ادب و دیگر فنون لطیفہ کے ساتھ اس کی طبعی بے پروائی کو دیکھتے ہوئے فتوت کا یہ بیان مشتبہ معلوم ہوتا ہے۔ اور اس کے مقابلے میں یہ زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ علی نامہ جیسی بلند پایہ رزمیہ مثنوی لکھنے پر جس میں رزم و بزم کے بے نظیر مرقعوں کے علاوہ علی عادل شاہ ثانی کی مدح میں ایسے بلیغ قصیدے بھی ہیں جو فارسی کے اعلیٰ درجے کے قصائد کے مقابلے میں پیش کئے جا سکتے ہیں، بہادر اور ادب پرور بادشاہ نے نصرتی کو ملک الشعرا کا خطاب عطا کیا ہو۔

نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانے میں گلشن عشق کے ایک قلمی نسخے پر نصرتی کی وفات کے متعلق یہ قطعہ تاریخ درج ہے۔

ضرب شمشیر سوں یہ دنیا چھوڑ　　جا کے جنت کے گھر میں خوش ہو رہے
سال تاریخ آ ملائک نے　　یوں کہے نصرتی شہید اہے

"نصرتی شہید اہے" سے ۱۰۸۵ برآمد ہوتے ہیں۔ اس نسخے کا سنہ کتابت ۱۰۹۳ھ ہے اور یہ بہت ہی قدیم نسخہ معلوم ہوتا ہے۔ جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے نصرتی کی آخری مثنوی ۱۰۸۴ھ کی لکھی ہوئی ہے اور فتوت کا روایت بھی غور طلب معلوم ہوتی ہے۔ نصرتی کے متفرق کلام مثلاً رباعیات وغیرہ سے بھی اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ وہ انقراض دولت بیجاپور کے بعد زندہ رہا ہوگا اس سے بحالات موجودہ اس قطعے کی بنا پر اس کا سنہ وفات ۱۰۸۵ھ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس قطعے سے اس امر پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ نصرتی پر کسی نے تلوار سے حملہ کیا تھا اور وہ اس صدمے سے شہید ہوا۔

سید محمد

ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور

ڈاکٹر زور

"میں نے اپنے مضمون میں ڈاکٹر زور کی کسی برائی کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ محض اس لئے کہ مجھے ان میں برائی کا کوئی پہلو نظر نہیں آیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں ناقدین اسے عقیدت سے تعبیر نہ کریں اور میں یہ سوچتا رہا کہ کوئی بات ایسی مل جائے جس کے ذریعے سے ان کی کسی برائی کو ظاہر کرنے کا موقع ملے۔ مضمون مکمل ہو گیا لیکن "عیب جوئی" کی ناکام کوشش نکتہ چینوں کا منہ بند کرنے کے لئے اس "گناہ بے لذت" کے ارتکاب سے قاصر رہی۔ جب مضمون "سب رس" میں چھپنے کے لئے "نگرانی" کی زد میں آیا تو انھوں نے "اپنی نگرانی" سے "جائز" فائدہ اٹھا کر اسے چھاپنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا لیکن مادر جامعہ جانتی ہے کہ میں ایک "گستاخ شاگرد" رہا ہوں۔

میری گستاخی بعض اوقات حد تعینات کی پروا نہیں کرتی۔ ان کی "خو" اور میری "وضع" میں ایک تصادم ہوا اور جس کا نتیجہ ظاہر ہے یعنی "نگران کار" سے بچ کر "مدیر" کا یہ مضمون "سب رس" کے صفحات پر ایک کی نیکی اور دوسرے کا جرم بن کر نمایاں ہو گیا۔ ناقدین خوش ہوں کہ میں نے ڈاکٹر زور کی ایک برائی ظاہر کر دی اور ڈاکٹر زور معاف فرمائیں کہ میں نے اپنی گستاخی کا اظہار کر دیا۔"

میکش

ایک زمانے سے خیال تھا کہ ڈاکٹر زور پر مضمون لکھوں۔ اس لئے کہ اس غلط نواز اور ظاہر پرست ملک میں جب تک اپنے محسنوں کو پہچاننے کی صلاحیت پیدا نہ ہوگی ہم صحت بخش مستقبل کی تعمیر نہ کر سکیں گے۔ کورانہ "شخصیت پرستی" بلاشبہ ایک کمزوری ہے۔ لیکن کسی نصب العینی انسان کی زندگی کو سامنے رکھ کر اس سے اپنی زندگی کی تعمیر کرنا بہرحال ضروری ہے۔ کھیت نہر سے پانی لے کر پانی نہیں اگاتا بلکہ اس پانی سے ایک لہلہاتی ہوئی فصل تیار کرتا ہے۔ "انفرادیت" کو کھوئے بغیر بھی انفرادیت میں بلندی پیدا کی جا سکتی ہے۔ دنیا کی بڑی بڑی ہستیاں ہمیشہ بڑی ہستیوں ہی سے عظمت کا سبق لیتی رہی ہیں۔ میری نظر میں ڈاکٹر زور کے نام سے دکنی مستقبل کے لئے بھی ایک "نصب العینی ہستی" ملی ہے۔ جس کی روح میں لطافت اور دل میں جذبۂ عمل ہے، جو ماضی سے کچھ حاصل کر رہی ہے اور مستقبل کو کچھ دے رہی ہے، جس نے مشکلات پر قابو حاصل کر کے ایک ماحول پیدا کیا، اور جو آگے بڑھتے ہوئے ایک وسیع تر ماحول تیار کر رہی ہے۔ ہماری جدید نسلیں، اگر ان میں زندہ رہنے کی تڑپ ہے تو، اس نصب العینی ہستی کو ضرور سامنے رکھیں گی۔

میں ڈاکٹر زور کو صرف نثر نگار کی حیثیت سے دیکھوں تو میرا یہ زاویۂ نگاہ سطحی ہوگا۔ بالکل اسی طرح جس طرح اقبال کو کوئی صرف شاعر کہہ دے، اقبال کو خراج تحسین ادا کرنے والا صرف اس کے شعروں پر جھوم کر نہیں رہ جاتا بلکہ اپنی روح میں، اپنی فکر میں، اور اپنی زندگی میں ایک انقلاب محسوس کرتا ہے۔ شعر نہیں بلکہ شعر کے ذریعے سے جو انقلاب پیدا ہوا وہی اقبال کی شاعری کی پیغمبرانہ کامیابی ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر زور کی نثر نگاری نہیں بلکہ ان کی وہ تحریر جس نے دائرۂ عمل پیدا کیا، ان کی وہ گفتگو جو ہمیشہ پیام عمل دیتی رہی ہے، اور ان کی بے پناہ مصروفیتیں، اور دوسروں کو مصروف رکھنے کی کوششیں اصل میں ایک مضمون کا عنوان بننے کے قابل ہیں اس لئے کہ دکن کے نوجوان ادیبوں میں خود اعتمادی اور ذوق عمل پیدا کرنے میں انہی کا حصہ رہا ہے۔

۲

ڈاکٹر زور پر ایک لکھنے والا یوں بھی لکھ سکتا ہے کہ "آپ حضرت شاہ عالم شہید کے پوتے قاری حافظ مولوی سید غلام محمد شاہ قادری صاحب کے فرزند اور خانوادۂ حضرت سید علی سانگڑے سلطان مشکل آسان رفاعی کے چشم و چراغ ہیں۔ ۲۸ رمضان المبارک ۱۳۲۲ھ کو پیدا ہوئے۔ تعلیم عربی و فارسی سے دار العلوم میں شروع ہوئی۔ اور بعد کو سٹی کالج میں شریک ہوئے۔ اکیس سال کی عمر میں (۱۹۲۵ء) میں بی اے کی ڈگری حاصل کی اور اپنے مضامین فارسی اور اردو میں اول آئے۔ ۱۹۲۷ء میں جامعہ عثمانیہ سے ام اے کی ڈگری لی اور اس دفعہ بھی اول آئے۔ ان امتیازی کامیابیوں کے پیش نظر حکومت نے یورپی وظیفہ دیا۔ چنانچہ اگست ۱۹۲۷ء میں یورپ روانہ ہوئے۔ وہاں آریائی زبانوں کی لسانی تحقیقات کی۔ ۱۹۲۹ء میں پی ایچ ڈی ہوئے۔ اردو کے آغاز اور ارتقا پر ایک مقالہ لکھا۔ اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز اور یونیورسٹی کالج (لندن) میں صوتیات کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۳۰ء میں تجرباتی صوتیات کا تحقیقاتی کام پیرس کے مشہور ادارۂ صوتیات "لے انسٹی تیوت دی فونیتک" میں ختم کیا۔ جو پیرس ہی سے انگریزی میں "ہندوستانی صوتیات" کے نام سے کتابی صورت میں شایع کیا گیا۔ اس زمانے میں ہند آریائی لسانیات اور خاص کر پہلوی اور جپسی زبانوں کے درس "سوربون یونیورسٹی پیرس" میں حاصل کئے۔ ۱۹۳۱ء میں یورپ سے واپس ہوئے اور جامعہ عثمانیہ میں زبان اردو کے پروفیسر مقرر کئے گئے۔ اور اب تک یہی خدمت انجام دے رہے ہیں

۳

ایک مضمون یوں بھی لکھا جا سکتا ہے کہ "ڈاکٹر زور نے سب سے پہلی کتاب ۱۹۲۵ء میں "روح تنقید" لکھی جب کہ وہ بی اے میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ "روح تنقید" فن تنقید پر اردو میں سب سے پہلی کتاب ہے۔ اس کے بعد سے ان کی کئی کتابیں شایع ہوئیں۔ مثلاً

(۱) تنقیدی مقالات۔ اس کتاب میں اصل تنقید نگاری کی وضاحت کے لئے اردو کے بہترین ادیبوں اور کارناموں پر بلند پایہ تنقیدیں درج ہیں۔ یہ کتاب کئی جامعات کے نصاب میں شامل ہے۔

(۲) اردو کے اسالیب بیان۔ یہ اصل میں اردو نثر نگاری کی تاریخ ہے جس میں آغاز سے عہد حاضر تک کے بلند پایہ اور معیاری انشا پردازوں کی نثر اور اس کے اسلوب کی خصوصیات پر ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے۔

(۳) اردو شہ پارے۔ اردو کے آغاز سے ولی اورنگ آبادی تک کے اردو ادب کے متعلق جدید ترین تحقیقات اور ادبی کارناموں کے اعلیٰ پایہ اور دلچسپ نمونے شامل ہیں جو یورپ اور ہندوستان کے متعدد کتب خانوں کے کم یاب قلمی نسخوں سے منتخب کئے گئے ہیں۔

(۴) عہد عثمانی میں اردو کی ترقی۔ گزشتہ تیس سال سے اردو ادب میں جو ترقیاں ہوئی ہیں ان کا مفید و مکمل تذکرہ۔

(۵) سلطان محمود غزنوی کی بزم ادب۔ غزنین کے فارسی شاعروں اور وہاں کی ادبی و علمی چہل پہل کا دلچسپ تذکرہ جو معلومات آفریں ہے۔

(۶) ہندوستانی صوتیات (انگریزی) اردو زبان کا صوتی تجزیہ و تشریح جس کا تذکرہ گزر چکا ہے۔

(۷) ہندوستانی لسانیات۔ اردو زبان کا لسانی تجزیہ و تشریح جس کے پہلے حصے میں علم لسان کے مقاصد، فوائد، تاریخ اور زبان کی اہمیت، ارتقا اور تشکیل سے متعلق اصولی معلومات ہیں اور دوسرے حصے میں اردو کے آغاز، ارتقا، ادبی بولیوں اور اردو کی ہمہ گیری پر جدید ترین تحقیقات پیش کر کے اردو و ہندی کے جھگڑے اور اردو کے جدید رجحانوں اور ضرورتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

(۸) فن انشا پردازی۔ مضمون نگاری اور انشا پردازی کے اصول اور فن تحریر میں تکمیل کے عملی طریقے بتائے گئے ہیں۔

(۹) طلسم تقدیر۔ زوال گولکنڈہ کے وقت کا ایک نیم تاریخی افسانہ ہے جو اتنا مقبول ہوا کہ دوسرا ایڈیشن بھی قریب الختم ہے۔

(۱۰) سیر گولکنڈہ۔ گولکنڈہ کی زندگی کے مختلف پہلو دلچسپ افسانوں کی شکل میں پیش کئے گئے ہیں۔

(۱۱) گولکنڈے کے ہیرے۔ سیر گولکنڈہ کا دوسرا حصہ ہے۔

(۱۲) روح غالب۔ غالب کے خطوط کے ادبی حصے ایک عالمانہ مقدمہ کے ساتھ شائع کئے گئے ہیں۔

(۱۳) سرگزشت غالب۔ غالب کی دلچسپ اور مستند و مکمل سوانح عمری جو اصل میں روح غالب کا ابتدائی حصہ ہے۔

(۱۴) گلزار ابراہیم۔ اردو کے مشہور تذکروں گلشن ہند اور گلزار ابراہیم کا مجموعہ۔ (مطبوعہ انجمن ترقی اردو)

(۱۵) گارسان دتاسی۔ مشہور محسن اردو کے حالات اور تصنیفات پر تبصرہ (مطبوعہ ہندوستانی اکاڈمی)

(۱۶) دیوان زادۂ حاتم۔ دہلی کے مشہور شاعر کا کلام اور حیات۔ (۱۷) متاع سخن۔ کلام عزیز کا انتخاب مع حالات۔

(۱۸) بادۂ سخن۔ کلام مائل کا انتخاب مع حالات۔ (۱۹) کیف سخن۔ کلام کیفی کا انتخاب مع حالات۔

(۲۰) فیض سخن۔ کلام فیض کا انتخاب مع حالات۔ (۲۱) مرقع سخن دو جلدیں۔ دکن کے بہترین شاعروں کا تذکرہ جس کی ترتیب نہایت اعلیٰ پایہ ہے اور جس میں مختلف اصحاب سے تحقیقی و تنقیدی مضامین لکھوا کر شامل کئے گئے ہیں۔

(۲۱) مکتوبات شاد عظیم آبادی۔ بہار کے استاد سخن کے مکتوبات مع مقدمہ۔

ان کتابوں کے علاوہ کئی کتابیں زیر ترتیب یا زیر طبع ہیں اور سیکڑوں مضامین جو بجائے خود مستقل تصانیف کی حیثیت رکھتے ہیں یورپ اور ہندوستان کے معیاری رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر زور کی نثر عام فہم اور سادہ ہوتی ہے جس میں روانی اور بے ساختہ پن ہوتا ہے۔ ان کی کتابیں ہندوستان بھر میں مشہور ہیں، جامعات کے نصابوں میں شریک ہیں، قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں، اس لئے ان کے نثری نمونے پیش کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ البتہ میں ان کے مکتوبات سے جو میرے نام ہیں بعض عبارتیں نقل کرتا ہوں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ خط لکھتے وقت اس کو چھپوانے کا خیال پیش نظر نہیں رہتا اور اسی لئے خط میں کسی کے اصلی اسلوب کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

"اردو شاعری میں ہندوستانی عنصر" اچھا موضوع ہے۔ اس پر مواد جمع کرتے رہیے۔ جتنا زیادہ مواد جمع ہو کتاب اتنی ہی شاندار ہوگی اور آپ کا مطالعہ بھی وسیع ہوتا جائے گا۔ کوشش کیجیئے کہ دن کے بعض خاص اوقات روزانہ"

" محض مطالعہ کے لئے وقف رہیں۔ یہ عمر آپ کی استفادہ کی ہے۔ جتنا بھی ہو حاصل کیجئے۔ دینے کا وقت بعد میں آئے گا "
" اور ماشاء اللہ سے اب تک آپ نے جو کچھ لکھا ہے قابلِ فخر ہے اور خوش قسمت ہیں آپ کہ اس قدر جلد قدر دان بھی "
" پیدا ہو گئے ورنہ کتنے ایسے پھول ہوں گے جن کی بہار بے کسی اور ناقدر دانی کی وجہ سے بہت جلد ختم ہو گئی اور آج دنیا "
" انھیں جانتی بھی نہیں انسان ہمیشہ اپنے سے خراب حالت والوں کا مقابلہ کر کے اپنی حالت کو دیکھے تو کبھی مایوسی اور "
" ناکامی کا شکار نہ ہو اور جو لوگ آج آپ کو کامیاب اور سرخرو نظر آ رہے ہیں، آپ نہیں جانتے کہ ان میں کتنے ایسے "
" ہیں جن کو ابتداء میں بڑی بڑی سختیاں جھیلنی پڑی ہیں! اور رشک و حسد اور مخالفتیں اور سختیاں اور فضا کی "
" ناموافقتیں سب آہستہ آہستہ غائب ہونے لگتی ہیں اگر انسان ذرا ہمت و استقلال اور صبر و شکر سے کام لے۔ "
" اور مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ آپ میں یہ سب صفات موجود ہیں۔ آپ ضرور ایک روز "
" اردو ادب کے جگمگاتے ستارے بنیں گے اگر یہی ہمت و استقلال اور محنت و مطالعہ جاری رکھیں اور کبھی برخود "
" غلط نہ ہوں بلکہ خواہش مند رہیں کہ ع اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے "

" ہم سب کی اور ہماری کیا تمام ملک کی عرصۂ دراز کی خواہش، سب رس کی شکل میں پوری ہوئی ہے اور ہم اگر ذرا "
" اور توجہ اور محنت سے کام کریں تو یقین ہے کہ یہ کامیاب رہے گا۔ ہم کو ابھی سے ناامید ہونے کی ضرورت نہیں ہے "
" بلکہ موجودہ حالات سے سبق لے کر آئندہ کے لئے استحکام اور قوت پیدا کرنی چاہیے۔ خاص کر آپ کے لئے یہ بڑی "
" آزمائش کا وقت ہے۔ اگر اس میں آپ کے قدم ڈگمگا جائیں تو یاد رکھئے آئندہ کے لئے بڑا خراب اثر پڑے گا اور "
" کوئی نیا اور اچھا کام شروع کرنے کی خواہش نہ ہو گی "

" آپ کی ذات سے ملک کی اور ہماری بڑی توقعات وابستہ ہیں اور ہم سب کی یہی کوشش ہے کہ آپ سرخرو رہیں۔
" میں نے جو مشکلات اور موانعات پیش کئے ہیں وہ اس لئے پیش نہیں کئے کہ ان کو سن کر آپ پست ہمت ہو جائیں "
" اور ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں بلکہ اس لئے کہ آپ میں شدائد کے مقابلہ کی قوت پیدا ہو اور آپ موجودہ سے زیادہ سرگرمی "
" دکھائیں۔ ناامیدی اور پست ہمتی ان لوگوں سے ہمیشہ دور رہتی ہے جن کے سینے خلوص اور جذبۂ خدمت گزاری سے "
" معمور ہوں اور جن کے کام محض اپنے ملک کی بہبودی اور زبان کی فلاح پر مشتمل ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کے دل میں "
" خلوص اور بے غرضی کا سمندر موجیں مارتا رہتا ہے۔ آپ ہر اس کام میں اپنی پوری قوتوں کے ساتھ ہاتھ بٹانے کے لئے "
" شریک ہو جاتے ہیں، جو ملک کے کسی پہلو سیاسی، علمی، ادبی کی تقویت کا باعث ہوتا ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ آپ کا "
" جذبۂ عمل آپ کو مایوس ہونے دے، کام کرنے والوں اور مخلص خدمت گزاروں کو قدم قدم پر دشواریاں پیش آتی "
" ہیں۔ ان کا راستہ اتنا صاف نہیں ہوتا جتنا ان غرضی بندوں کا ہوتا ہے جو محض نام و نمود یا ذاتی اغراض کی خاطر سرگرمی "
" دکھاتے ہیں اور دوسروں کو دھوکہ دیتے ہیں لیکن یہ بھی یاد رہے کہ اس قسم کے لوگوں کی شہرت یا قدر و منزلت قطعیہ "

" ہوتی ہے جب تک عروج ہے یا ان کا دھوکہ چل سکتا ہے وہ سرخرو رہتے ہیں۔ ایک زمانہ جلد یا دیر سے ایسا آتا ہے جب "
" اُن کی قلعی کھل جاتی ہے "۔

" ہمارا کام محض [illegible] خدمتِ ملک کی خاطر اسی وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ ہم "
" بالکل مجبور نہ کر دئیے جائیں۔ ورنہ ہماری ساری توجہیں اس کام کو جاری رکھنے کے لئے وقف رہیں گی۔ ہمارے "
" اہل ملک ابھی پوری طرح سے بیدار نہیں ہوئے ہیں۔ اسی لئے ہم کو زیادہ توجہ اور محنت اور ایثار کی ضرورت ہے "
" میری دلی خواہش ہے کہ آپ ایک کامیاب مدیر، انشا پرداز اور شاعر بنیں اور ملک کے جمود اور غفلت کو دور کرنے "
" میں کامیاب ہوسکیں۔ میری بہترین توقعات آپ کے ساتھ ہیں "۔

" [illegible] ہوا۔ میری ہمشیرہ عزیزہ کی علالت اور وفات کا مجھ پر بے حد اثر ہے۔ میری عمر میں یہ پہلا موقع ہے کہ "
" [illegible] بہرحال مرضی مولا از ہمہ اولیٰ "۔
" آپ اپنی صحت کا [illegible] خیال رکھئے [illegible] سب سے اہم ہے اور اسی صحت اور مشغولیت کی خاطر رسالہ بھی نکالا "
" گیا ہے۔ آپ بے فکر رہیں۔ آپ کی غیر موجودگی میں آپ کے رسالہ کا سب کام آپ کے حسب منشا انجام پا رہا ہے "۔
" آپ کی تقریر اخبار میں چھپی تھی۔ بہت اچھی اور پختہ اور شائستہ ہے۔ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی "

کیا اس [illegible] ادب کو ترقی دینے والے اور اردو دانوں میں ادبی ذوق کو عام کرنے والے سرگرم عمل انسان کی روح [illegible] رہی ہے :

۴

ایک مضمون یوں بھی لکھا جا سکتا ہے کہ " ڈاکٹر زور کی کتابوں اور ان کے ذوق عمل کے بارے میں ملک کے مشہور انشا پردازوں نے ان کے طالب علمی کے زمانے ہی سے اچھی رائیں دیں۔ چنانچہ پروفیسر وحید الدین سلیم نے لکھا تھا کہ :۔

" اگرچہ وہ بظاہر چپ چاپ دکھائی دیتے ہیں مگر درحقیقت وہ اور ان کا دماغ علمی خیالات میں ہر وقت مصروف ہے "
" اردو و فارسی کے ادب سے ان کو خاص دلچسپی ہے۔ عجب نہیں کہ اگر ان کی یہی مشغولیت اور دماغی مستعدی رہی تو وہ "
" اردو انشا پردازوں کے دائرے میں خاص طور سے ممتاز خیال کئے جائیں اور دکن کو ان کی ذات پر ناز کرنے کا موقع "
" حاصل ہو۔

عبد الحلیم شرر لکھنوی نے لکھا تھا کہ :۔

" روح تنقید آپ نے بڑی محنت اور قابلیت سے لکھی ہے۔ میں آپ کی اس کوشش کو بہت ہی قابل قدر تسلیم کرتا ہوں "
" اور اردو لٹریچر کی جانب سے آپ کا شکر گزار ہوں "۔

غلام بھیک صاحب نیرنگ نے لکھا تھا کہ :۔

"میں بڑے وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ آپ کی یہ کتاب ادبیات میں ایک نہایت ضروری اور مفید اضافہ ہے۔"

پروفیسر سید اشرف شمسی مرحوم نے لکھا تھا کہ :۔

"ان کی اس عمدہ قابلیت کی ملک قدر کرے اور ان کو ممتاز افتخار حاصل ہو۔"

نیاز فتح پوری نے لکھا تھا کہ :۔

"جناب زورؔ کا اردو پر احسانِ عظیم ہے کہ انھوں نے اس فن کے متعلق ایسی بیش بہا تصنیف پیش کی۔"

مولانا عمادی نے لکھا تھا کہ :۔

"اپنے موضوع پر اس صدی کی سب سے نمایاں کتاب کہی جاسکتی ہے۔"

مولوی عبدالحق نے لکھا ہے۔

"یہ بہت دلچسپ کتاب ہے اور دلچسپ طرز میں لکھی گئی ہے۔"

غرض کہاں تک لکھیے۔ یورپ کے چند مشہور مستشرقین کی بھی ان کے بارے میں رائے دیکھیے کیونکہ بعض لوگ اپنوں سے زیادہ غیروں کی رائے کو مستند سمجھتے ہیں۔

پروفیسر لائیڈ جیمس صدر شعبۂ صوتیات نے لکھا کہ :۔

"مسٹر ایس جی ام قادری نے اس مدرسہ میں دو سال تک تعلیم حاصل کی۔ پہلے سال انھوں نے عام صوتیات پر میرے"
"درسوں میں شرکت کی۔ انگریزی صوتیات کی عملی جماعتوں میں یہ حاضر رہے اور میری ذاتی نگرانی میں انھوں نے"
"اردو کی صوتیات پر کام کیا جس میں دکنی صوتیات پر خاص توجہ دی گئی ہے۔
"اس عرصہ میں یونیورسٹی کالج کی انگریزی صوتیات کی بعض جماعتوں میں بھی وہ شریک رہے اور میری"
"نگرانی میں انھوں نے اپنی زبان کا تجزیہ کیا۔ یہ کام جب تکمیل کو پہونچے گا تو علم زبان میں ایک گرانقدر اضافہ"
"ثابت ہوگا۔"

ڈاکٹر ٹی گریہم بیلی ام اے۔ ڈی لٹ صدر شعبۂ اردو و ہندی اور پروفیسر ولکنسن ناظم شعبۂ مشرقی برٹش میوزیم نے لکھا کہ :۔

"مسٹر قادری کا مقالہ ایک گرانقدر کارنامہ ہے۔ یہ بڑی حد تک اچھی ہے۔ یہ برٹش میوزیم دفتر وزیر ہند، اڈنبرا یونیورسٹی"
"قومی کتب خانۂ پیرس کے کتب خانوں کے تحقیقاتی مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ اس میں بہت سے ایسے ادیبوں کا تذکرہ"
"ہے جن سے آج تک دنیا واقف نہ تھی۔

"نظم و نثر کے بہت سے ایسے کارناموں کا ذکر اس میں موجود ہے جو کسی اور ایسے تذکرے میں موجود نہ تھے"
"جو اس وقت تک شایع ہوا ہو موجودہ تذکروں کی غلطیاں اس میں درست کر دی گئی ہیں۔ مسٹر قادری اردو کے"
"مختلف پہلوؤں پر کئی کتابیں لکھ چکے ہیں۔ انھوں نے اردو لسانیات انڈو آرین فیلالوجی پر جو تحقیقی کام کیا ہے اس سے"

" انھیں بڑی بصیرت حاصل ہوئی ہے ۔ ان کے مقالے کے وہ حصے بہت دلچسپ ہیں جن میں اردو کی ابتدائی "
" شکلوں پر بحث کی گئی ہے ۔ یہ مقالہ علم میں ایک حقیقی اضافہ ہے خصوصاً اس کے وہ حصے جن میں دکنی اور شمالی "
" ہند کی زبان کے تعلق پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔ جو دکنی صوتیات ابتدائی دکنی ادب پنجابی سے اردو کے تعلق "
" اور شمال میں اردو کے ابتدائی کارناموں سے متعلق ہیں ۔ ہمیں توقع ہے کہ مصنف کئی اور گرانقدر تصنیفیں شایع کریں گے "

پروفیسر آر ایل ٹرنر ناظم اسکول آف اورنٹیل اسٹڈیز نے لکھا کہ :-

" انڈو آرین زبانوں کی تقابلی گرامر پر میں نے جو لکچر دیے تھے ان میں سید محی الدین قادری شریک رہے ۔ میں نے "
" دیکھا کہ وہ ایک ذہین طالب علم ہیں اور انھیں اس موضوع سے بہت دلچسپی ہے ۔ مجھے اس کا اندازہ خاص طور پر "
" اس وقت ہوا جب میں نے ان سے پی ایچ ڈی کے مقالہ کے اس حصہ کی نسبت تبادلۂ خیال کیا جو انھوں نے "
" لسانیاتی پہلوؤں پر لکھا ہے ۔ اس مطالعہ کی تیاری کے لئے ابتدائی سنسکرت کے درس کی جماعتوں میں بھی "
" شریک رہے اپنے پچھلے مطالعہ اور اس مطالعہ سے جو انھوں نے یہاں آنے کے بعد کیا اردو کی تقابلی تاریخی "
" تحقیقات کی بنیاد رکھ دی ہے جس کی بہت ضرورت تھی "

پروفیسر سیٹن سابق پرنسپل نظام کالج و نگران کار طلبہ حیدرآباد نے لکھا کہ :-

" وہ ہمارے انتہائی ذہین طالب علموں میں سے ہیں اور ان کا کیرکٹر ایسا ہے کہ کوئی شخص اس پر حرف نہیں رکھ سکتا "

۵

ایک مضمون اس طرح بھی لکھ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر زور نے اپنے زمانۂ طالب علمی سے اب تک ملک کے مختلف اداروں کی تخلیق، تعمیر اور تکمیل میں گرمجوشانہ حصہ لیا ہے ۔ مجلۂ عثمانیہ، مجلۂ مکتبہ، ارتقا، اور مجلۂ طیلسانین کی اجرائی میں ان کی کوششوں کو نہیں بھلایا جا سکتا ۔ مختلف چھوٹی بڑی انجمنوں کی سرپرستی اور صدارت کے علاوہ ان کا سب سے بڑا کارنامہ " ادارۂ ادبیات اردو " کی تشکیل ہے ۔ یہ ادارہ جیسا کہ اردو داں طبقہ جانتا ہے روزافزوں ترقی پذیر ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر زور نے اس ادارہ کے لئے اپنی حیات عمل وقف کردی ہے ۔ ان کی مسلسل دلچسپیوں اور مستقل سرگرمیوں کے باعث اس نے اب تک کئی معیاری کتابیں شایع کی ہیں اور اپنے اطراف اہل ملک کا ایک وسیع طبقہ پیدا کر دیا ہے جو ترقی اردو کے لئے بے غرض خدمات انجام دے رہا ہے " سب رس " اسی ادارہ کا ترجمان ہے ۔ دکنی مخطوطات کی اشاعت کے لئے سٹی کالج کے یوم ولی کے بعد ایک مجلس مقرر کی گئی اس مجلس کے روح رواں بھی ڈاکٹر زور رہی ہیں ۔ اس مجلس نے بھی بعض نایاب کتابیں شایع کردی ہیں اور کئی کتابیں زیر ترتیب اور زیر طبع ہیں ۔ وہ انٹرنیشنل فونیٹک اسوسی ایشن کے واحد مسلمان رکن ہے جو ہندستان کی نمایندگی کرتے ہیں ۔ ان کا یہی شغف اور ذوق ہے جس کے باعث وہ ہندوستان بھر میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں ۔ چنانچہ حیدرآباد کے باہر بھی کئی اداروں نے ان کے علم و عمل سے فائدہ اٹھایا، کئی عظیم الشان جلسوں کی انھوں نے صدارت کی انجمن ترقی اردو سے متعلق کئی مسائل کے حل میں مدد دینے کے لئے ان کو مدعو کیا گیا اور ان کی تصنیفات کئی ہندستانی جامعات کے نصاب میں داخل ہیں ۔ الغرض حیدرآباد میں اور حیدرآباد کے باہر ان کی شہرت ان کی قوت عمل نے پیدا کی اور جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھتا جا رہا ہے وہ ترقی اردو میں زیادہ قوت کے ساتھ اپنی عملی صلاحیتوں کو صرف کر رہے ہیں

۶

یہ چند پہلو تھے ڈاکٹر زور کی زندگی کے جن میں سے ہر ایک پر ایک طویل مضمون لکھا جا سکتا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے اپنے اس مضمون کے ابتدائی حصہ میں لکھا ہے' ان کی زندگی کا صرف یہی ایک پہلو ایسا ہے جو ان کی خدمات کو زندۂ جاوید بنانے کے لئے کافی ہے۔ میں یہاں یہ بھی نہیں کہنا چاہتا کہ انھوں نے دکن کے اس صحت بخش تمدن کو جو جدید زمانے کے تیز دھارے پر بہا جا رہا ہے بچانے کی کوشش کی۔ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ انھوں نے دکن کی قدیم ادبیات کو دنیا کے سامنے پیش کر کے یہ بتا دیا کہ دکن ترقی اردو میں کئی سو برس پہلے سے مصروف ہے۔ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ انھوں نے اپنی تصنیفات اور تالیفات سے اردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ کیا بلکہ میں صرف ان کے ذوق عمل اور خلوص خدمت پر یہاں زور دوں گا جس کی وجہ سے حیدرآباد میں مخلص خدمت گزاران اردو کی ایک قابل لحاظ جماعت پیدا ہو گئی ہے۔

ڈاکٹر زور حیدرآباد کی ان چند ہستیوں میں سے ہیں جنھوں نے ایسے سوکھے ریگستان میں ایک چشمہ پیدا کیا۔ ایسا چشمہ جس کا پرسکون پانی سارے ریگستان کو ایک نخلستان میں بدل دیتا ہے۔ ان ایام کی یاد ابھی دلوں سے نہیں نکلی ہے جب دکن کے "بے زبانوں" کی راہ میں فلک بوس پہاڑ تھے۔ ان کی آواز سانس بن کر نکلتی تھی اور سانس بن کر سینے میں دفن ہو جاتی تھی۔ یہ حقیقت بھلا دی گئی تھی کہ دکن اور صرف دکن ہی وہ مقام ہے جس نے اردو کی مستقل سرپرستی کو اپنے ذمہ لیا ہے۔ اس وقت بھی جب کہ قطب شاہی زمانۂ حکومت میں اردو نثر و نظم کے زندۂ جاوید کارنامے ظہور پذیر ہوئے اور آج بھی جب کہ جامعۂ عثمانیہ کی حیات آفریں سرگرمیوں نے اردو کے قافلہ کو بہت آگے بڑھا دیا ہے، کوئی شخص مجرمانہ انداز میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ دکن اردو سے غافل رہا۔

ڈاکٹر زور ملک کے ان گنتی کے فرزندوں میں سے ہیں جنھوں نے مرعوب ہوئے بغیر اپنی کتابیں شائع کیں۔ لکھتے وقت ان کے ہاتھ کانپے نہ قلم تھرایا بلکہ وہ ایک جرأت رندانہ کے ساتھ آگے بڑھے اور اپنوں اور بیگانوں کو بتا دیا کہ اہل دکن "بے زبان" نہیں ہیں۔ خود اعتمادی کا یہی مستحکم احساس ہے جس سے ڈاکٹر زور نے جدید حیدرآباد کی خدمت زبان و ادب میں روح عمل پھونک دی اور اب جب کہ وہ دلوں سے مرعوبیت دور کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ ترقی اردو کے لئے ان کی جد و جہد تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ حیدرآباد میں یوں تو بہت سے ایسے اصحاب ملیں گے جو انفرادی طور پر اردو کی پرخلوص خدمت کر رہے ہیں لیکن اس کی اشاعت اور ترقی کی منظم کوشش کا مرکز صرف ڈاکٹر زور کی ذات ہے۔

میکش

پیارے وطن کی پیاری

اُردو ہے سب کی پیاری، اُردو ہے سب کی پیاری — پیارے وطن کی پیاری، یعنی زباں ہماری
قومی یگانگت کا پیغام دینے والی — اک خوشگوار خدمت انجام دینے والی
اک یادگار ہے یہ بیتے ہوئے دنوں کی — الفت بھرے دنوں کی بھولے ہوئے دنوں کی
بچھڑے ہوئے دلوں کو آپس میں ہے ملاتی — پردے کو غیریت کے بالکل ہے یہ اٹھاتی
پھر رشتۂ اخوت اُردو ہی جوڑتی ہے — بھائی بنا کے "ہم[1]" کو اُردو ہی چھوڑتی ہے

ملکی زباں یہی ہے، قومی زباں یہی ہے
اپنا جہاں یہی ہے، ہندوستاں یہی ہے

اُردو میں کیا نہیں ہے کیا کیا نہ ہوگا اس میں — جلوہ نما نہیں کیا دنیا کی سب زبانیں؟
اُردو میں ہے نزاکت، اُردو میں ہے لطافت — اُردو میں ہے فصاحت، اُردو میں ہے بلاغت
اردو میں ہے روانی، اُردو میں ہے سلاست — اُردو میں ہے ملاحت، اُردو میں ہے حلاوت
اُردو میں ہے متانت، اُردو میں ہے طلاقت — اُردو میں ہے تقدس، اُردو میں ہے صداقت
اُردو میں وسعتیں ہیں ہندوستاں سے زیادہ — اُردو کی شہرتیں ہیں ہندوستان سے زیادہ
اُردو کی رفعتوں پر ہے سرنگوں فلک بھی — وہ خوبیاں ہیں اس کی ہوں تر زباں ملک بھی
اس پر بھی تم کو اُردو بھاتی نہیں ہے، حیرت! — شاید نہیں وطن کی دل میں تمہارے چاہت

پیارے وطن کی ہر شئے جاں سے عزیز تر ہے
اُردو کے مٹنے کو پھر کیوں یہ شور و شر ہے؟

سلیمان اریب

[1] ہندو مسلمان۔

ذکرِ میر

اُردو کا ذکر ہو اور دنیا میر تقی میر کو بھول جائے۔ ایسا تو نہیں ہو سکتا۔ میر پر بہت سے مقالے نکل چکے ہیں۔ یونہیں سہی۔ مگر آج ہم میر کا ہی ذکر کریں گے۔ خواہ موجِ خوں سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے۔ شیلے کہتا ہے "ہمارے شیریں ترین نغمات وہ ہیں جو غم آگین حسیات کا اظہار کریں"۔ کتنا سچ کہتا ہے۔ واقعی ؎

تو اے کبوتر بام حرم چہ میدانی
طپیدن دل مرغان رشتہ بر پارا

اسی جاذبیت و کشش نے آج میر کو قلمروئے سخن کی صدارت پر متمکن کر دیا ہے۔ فرماں روایانِ ادب نے میر کو اُردو غزل گویوں کا سرتاج تسلیم کر لیا ہے۔ وہ ایک عاشق کی زبان سے اس کی رودادِ قلب کا اظہار کرتے ہیں۔ میر کے اندوہناک جذبات میں شدتِ غم، دل تنگی اور مایوسی کا پیچ و تاب شامل ہے۔ اس کے کلام کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ "خاموش انسانوں کے قلب میں غموں کی کتنی پر اسرار گہرائیاں پوشیدہ ہیں"۔ ابونواس نے سچ کہا تھا "قدرتِ خداوندی سے کیا بعید ہے کہ وہ ایک عالم ایک ہی شخص میں پیدا کر دے"۔

یونان کی ایک بہت پرانی کہاوت ہے "مصوری شاعریٔ صامت ہے اور شاعری مصوریٔ ناطق"۔ اگر شاعری فی الحقیقت "مصوریٔ ناطق" کہتے ہیں تو ہم میر کو بھی ایک بہت بڑا شاعر ماننے پر مجبور ہیں۔ اور یوں بھی شاعر مصورِ فطرت تو ہے ہی۔

بیکن کا نظریہ ہے "شاعری دماغ کو بلند کرتی ہے"۔ ڈاکٹر گریہم بیلی کی نظر میں اُردو زبان کے بہترین شعرا انیسؔ، غالبؔ اور میرؔ ہیں۔

انسانی جذبات و احساسات ہی شاعری کی اصل روحِ رواں ہیں اور اگر مل صاحب کی رائے سے اتفاق کیا جائے تو صرف اسی چیز کا نام شاعری ہے۔

میر شرفائے اکبرآباد سے تھے۔ لیکن ان کے رشتے ناتے سے اس وقت ہم کو بحث نہیں۔ ہم ایک طائرانہ نگاہ ان کے زندگی کے انوکھے حالات پر ڈالتے ہیں۔ اب اس نگاہ میں ہمیں جو کچھ بھی مل جائے اس کو قلم بند کر دیا جائیگا، ان کے میر تخلص کرنے پر ان کے والد بزرگوار نے انھیں منع کیا کہ ایسا نہ کرو۔ ایک دن خواہ مخواہ سید ہو جاؤ گے لیکن ان کے سید ہونے میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ ان کی مسکینی و غربت، صبر و قناعت، تقویٰ و طہارت ایک محضر پیش کرتے ہیں اور یہ اوصاف خود ایک شہادت ہیں میر کی سیادت کے۔ رہا زمانے کا۔ اس نے کس کو چھوڑا ہے۔ کس کس کو کیا نہیں کہتا۔ اگر وہ سید نہ ہوتے تو خود کیوں کہتے ؎

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

آزاد کہتے ہیں "ہر چند کہ تخلص ان کا میر تھا۔ مگر گنجفۂ سخن کی بازی میں آفتاب بن کر چمکے۔ قدردانی نے ان کے کلام کو جواہر اور موتیوں کی نگاہوں سے دیکھا۔

اورنام کو پھولوں کی مہک بنا کر اُڑایا۔ ہندوستان میں
یہ بات انھیں کو نصیب ہوئی ہے کہ مسافر غزلوں کو
تحفے کے طور پر شہر سے شہر لے جاتے تھے۔"

میرؔ اپنی نازک مزاجی اور بددماغی میں بڑی شہرت
رکھتے تھے۔ باوجود فلاکت و نحوست کے جو اہل کمال کا
سرمایۂ زندگی ہے ان کے دماغ ہی نہ ملتے۔ وہ کسی کو
خاطر میں نہ لاتے۔ وضعداری کو نباہنے کا فن انھیں
خوب یاد تھا۔

دلی میں شاہ عالم کا دربار اور امراء و شرفا کی
محفلوں میں ادب ان کی جگہ خالی رکھتا تھا مگر بقول آزادؔ
"خالی آدابوں سے خاندان تو نہیں پل سکتے۔" ناقدری
نے ان کا دل توڑ دیا اور اسی اجڑے ہوئے دل کو لیے
ہوئے یہ دلی کو خیرباد کہتے ہیں۔ وہی دلی جس پر انھوں
نے کبھی اس طرح سر دھنا ہے :۔

؎ دلی کے جو تھے کوچے اوراق مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

اسی دلی کے کھنڈر ہو جانے پر یوں کفِ افسوس ملتے
ہیں ؎ اب خرابہ ہوا جہان آباد
ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا

اب یہاں سے میرؔ لکھنؤ چلے ہیں۔ ذرا اس لطیفہ کو
آزادؔ سے سنیے :۔

"جب لکھنؤ چلے تو ساری گاڑی کا کرایہ بھی پاس نہ تھا۔
ناچار ایک شخص کے ساتھ شریک ہو گئے اور دلی کو خدا
حافظ کہا۔ تھوڑی دور آگے چل کر اس شخص نے بات کی۔
یہ اس کی طرف سے منہ پھیر کر ہو بیٹھے۔ کچھ دیر کے بعد پھر
اس نے بات کی۔ میر صاحب چیں بجبیں ہو کر بولے کہ صاحب
قبلہ آپ نے کرایہ دیا ہے۔ بیشک، گاڑی میں بیٹھیے۔ مگر
باتوں سے کیا تعلق! اس نے کہا۔ حضرت کیا مضائقہ ہے۔
راہ کا شغل ہے۔ باتوں میں ذرا جی بہلتا ہے۔ میرؔ صاحب
بگڑ کر بولے کہ خیر آپ کا شغل ہے۔ میری زبان خراب ہوتی ہے۔"

لکھنؤ پہنچ کر ایک سرا میں اُترے۔ معلوم ہوا یہاں
ایک جگہ مشاعرہ ہے۔ صبر نہ آیا۔ جی مچل گیا۔ اسی وقت
ایک غزل لکھی اور مشاعرہ میں جا پہنچے۔ اپنی وضع قطع
سے ایک قدیم مُلّا سے آدمی دکھائی پڑتے تھے۔ ان کے
عجیب و غریب سج دھج دیکھ کر حاضرین محفل میں ہنسی کے
ساغر چلنے لگے۔ لوگ سرگوشیوں میں اپنے قہقہے چھپانے
لگے۔ میرؔ صاحب ایک تو غریب الوطنی کا الم لیے ہوئے
تھے۔ دوسرے ناقدرئ زمانہ کے ہاتھوں دلگیر و
دل گرفتہ۔ ایک طرف بیٹھ گئے۔ جب شمع ان کے
سامنے آئی تو پھر سب نے ان کی طرف ٹکٹکی لگا دی۔
کسی نے وطن پوچھا۔ میرؔ تو بھرے ہی بیٹھے تھے۔ فی البدیہہ
یہ مشہور قطعہ سنا دیا۔ ؎

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

سارے ہنسنے والے اس درد بھرے موثر کلام کو سن کر
کھسیانے ہو گئے۔ صبح ہوتے ہوتے سارے شہر میں

یہ خبر پھیل گئی کہ میر صاحب تشریف لائے ہیں۔ نواب آصف الدولہ مرحوم نے سنا اور دو سو روپیہ مہینہ مقرر کر دیا۔ میر کی نازک مزاجی کے تو بہت سے قصے مشہور ہیں۔ جن میں سے بعض تو بہت دلچسپ ہیں۔ مثلاً یہ کہ ایک دن نواب صاحب موصوف نے ان سے ایک غزل کی فرمائش کی۔ دوسرے تیسرے دن جو گئے تو پوچھا کہ میر صاحب! ہماری غزل لائے؟ میر نے تیوری بدل کر کہا۔ جناب عالی! مضمون غلام کی جیب میں تو بھرے ہی نہیں کہ کل آپ نے فرمائش کی اور آج حاضر کر دے۔ اس فرشتہ خصال نے کہا۔ خیر میر صاحب جب طبیعت حاضر ہو گی کہہ دیجئے گا۔

ایک دن نواب صاحب نے بلا بھیجا۔ جب پہنچے تو انھیں حوض کے کنارے رنگین مچھلیوں سے کھیلتا دیکھ کر ناک، بھوں سکیڑ لیا۔ نواب حسبِ معمول انھیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ کہا میر صاحب کچھ فرمائیے۔ انھوں نے غزل پڑھنی شروع کی۔ نواب کھیلتے بھی جاتے تھے۔ سنتے بھی جاتے تھے۔ میر صاحب چیں بہ جبیں ہوتے اور ہر شعر پر ٹھہر جاتے۔ وہ کہتے کہ ہاں پڑھیے۔ آخر چار شعر سنا کر میر خاموش ہو گئے، اور بولے پڑھوں کیا آپ تو مچھلیوں میں مشغول ہیں۔ متوجہ ہوں تو پڑھوں۔ نواب نے کہا جو شعر ہو گا آپ متوجہ کر لیگا۔ میر صاحب بھلا کہاں تاب لا سکتے تھے۔ ان کے دکھی من کے لیے یہ فقرہ ایک تازیانہ تھا۔ غزل جیب میں ڈال گھر کا راستہ لیا اور پھر جانا چھوڑ دیا۔ کچھ دنوں بعد بازار میں نظر آئے۔ نواب کی سواری سامنے سے آ گئی۔ دیکھتے ہی محبت نے کہلوا دیا "میر صاحب آپ نے بالکل ہمیں چھوڑ دیا۔ کبھی تشریف بھی نہیں لاتے"۔ میر صاحب نے ٹوک دیا۔ بازار میں باتیں کرنا آداب شرفاء نہیں۔ یہ کیا گفتگو کا موقع ہے۔ غرض بدستور گھر بیٹھے رہے۔ اور فقر و فاقہ میں عمر بسر کی۔ سو برس کی عمر پائی۔ امراء کی تعریف و توصیف میں قصیدہ نہ کہنے کا یہ بھی ایک سبب تھا کہ توکل و قناعت انھیں بندہ کی خوشامد کی اجازت نہ دیتے تھے۔ یا پھر شاید خودبینی و خودپسندی جو انھیں لیے دیے رہتی تھی، وہ زبان سے کسی کی تعریف نکلنے نہ دیتی تھی۔

میر کے دیوان میں یوں نام کو ستر دو بہتر نشتر ہیں۔ لیکن بقول آزاد "یہ بہتر کی رقم فرضی ہے کیونکہ جب کوئی تڑپتا ہوا شعر پڑھا جاتا ہے تو ہر سخن شناس یہ کہہ اٹھتا ہے کہ دیکھیے یہ انھیں بہتر نشتروں میں سے ہے"۔[1]

غزل گوئی میں میر جس مقام پر پہنچے ہیں وہاں تک اب کسی کی رسائی ناممکن ہے۔ ان کا صاف اور سلجھا ہوا کلام اپنی سادگی میں ایک عجیب انداز دکھاتا ہے۔ آزاد کہتے ہیں "حقیقت میں یہ انداز انھوں نے میر سوز سے لیا۔ مگر ان کے ہاں فقط باتیں ہی باتیں تھیں۔ انھوں نے اس میں مضمون داخل کیا اور گھریلو زبان کو متانت کا رنگ دے کر محفل کے قابل کیا"۔

یہاں پر ان کے کلام کا ایک مختصر سا نمونہ دیا جاتا ہے:۔

عشق کا گھر ہے میر سے آباد ایسے پھر خانماں خراب کہاں

دیر و حرم سے تو تو ٹک گرم ناز نکلا
ہنگامہ ہو رہا ہے اب شیخ و برہمن میں

---

[1] آب حیات ۱۳

کعبے جانے سے نہیں کچھ مجھ کو اتنا شوق ہے
چال وہ بتلا کہ میں دل میں کسو کے جا کروں

مثل عنقا مجھے تم دور سے سن لو ورنہ
ننگ ہستی ہوں مری جائے بجز نام نہیں

اس بتکدے میں معنی کا کس سے کریں سوال
آدم نہیں ہے صورت آدم بہت ہیں یاں

مجھ دیوانے کی مت ہلا زنجیر   کہیں ایسا نہ ہو کہ پھر غل ہو

لاگ اگر دل کو نہیں لطف نہیں جینے کا
الجھے سلجھے کسی کاکل کے گرفتار رہو

کہتا ہے کون میر کو بے اختیار رو
ایسا تو رو کہ رونے پہ تیرے ہنسی نہ ہو

اثر ہوتا ہماری گر دعا میں
لگ اٹھتی آگ سب ارض و سما میں

ان اجڑی ہوئی بستیوں میں دل نہیں لگتا
ہے جی میں وہیں جا بسیں ویرانہ جہاں ہو

رات مجلس میں تری ہم بھی کھڑے تھے چپکے
جیسے تصویر لگا دے کوئی دیوار کے ساتھ

کچھ نہ دیکھا تھا ہم نے پر تو بھی
آنکھ میں آئی ہے نہ دنیا کچھ

الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنھیں ہے بندگی خواہش
ہمیں تو شرم دامنگیر ہوتی ہے خدا ہوتے

رشک یوسف ہے آہ وقت عزیز
عمر اک بار کاروانی ہے

سو ملک پھرا لیکن پائی نہ وفا اک جا
جی کھا گئی ہے میرا اس جنس کی نایابی

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آئے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آئے

کٹے ہے دیکھیے یوں عمر کب تلک اپنی
کہ سنیے نام ترا اور چشم تر کریے

یاقوت کوئی ان کو کہے ہے کوئی گلبرگ
ٹک ہونٹ ہلا تو بھی کہ اک بات ٹھہر جائے

ترا ہے وہم کہ میں اپنے پیرہن میں ہوں
نگاہ غور سے کر مجھ میں کچھ رہا بھی ہے

ہوگئی شہر شہر رسوائی   اے مری موت تو بھلی آئی

مصائب اور تھے پر دل کا جانا   عجب اک سانحہ سا ہوگیا ہے

سر کسو سے فرو نہیں ہوتا   حیف بندے ہوئے خدا نہ ہوئے

دنیا کی قدر کیا جو طلبگار ہو کوئی
کچھ چیز مال ہو تو خریدار ہو کوئی

فرصت کم ہے یاں رہنے کی بات نہیں کچھ کہنے کی
آنکھیں کھول کے کان جو کھولو بزم جہاں افسانہ ہے

میں چراغ صبح گاہی ہوں نسیم
مجھ سے اک دم کے لیے کیا دشمنی

نہ وے لوگ ہیں اب نہ اجماع وہ
جہاں وہ نہیں یہ جہاں اور ہے

کہاں تک لکھوں۔ ایسے بیسیوں نشتر ہیں۔ اب انھیں کے ایک شعر پر یہ داستان ختم کر دی جاتی ہے۔ ؎

کھول کر دیوان میرا دیکھ قدرت مدعی
گرچہ ہوں میں نوجواں پر شاعروں کا پیر ہوں

جہاں بانو بیگم

غزل

ہوا معلوم جب سے۔ میرے دل میں آپ کا گھر ہے
یہ دل اُس دن سے اب تک دل نہیں ہے مجھ کو دلبر ہے

بس اب راضی خوشی سے اُس پہ مرنا ہی بہتر ہے
یہ دنیا جس میں دنیا جی رہی ہے موت کا گھر ہے

ہوا کرتے ہیں ظلم و جور بھی دلکش حسینوں کے
جو سب کے واسطے ہے عیب ان کے حق میں زیور ہے

میں بے دل اور وہ دل دار۔ میں بے آس وہ آسا
نبھے کیا خاک یاری۔ ایک مفلس، اک تونگر ہے

گل انداموں سے مل کر دل پہ وہ چوٹیں اُٹھائی ہیں
کہ باغِ دہر کا ہر پھول میرے حق میں پتھر ہے

عدو نے بھی اُڑا لیں ہیں ادائیں دل دکھانے کی
ستمگر جو تری صحبت میں بیٹھا ہے ستمگر ہے

نہیں کوئی کسی کا دوست بازی گاہِ دنیا میں
یہاں ہر ایک اپنے داؤ پہ ہے اپنے ڈھب پر ہے

بُرا کہتا ہے جب اس سے بُرا دیکھا نہیں جاتا
نصیحت گر اگر دشمن سے بُرا ہے تو سب سے بہتر ہے

وہ دینے میں نہیں رُکتا ہے لیکن اور کیا مانگوں
ضرورت سے زیادہ ہے مجھے جو کچھ میسر ہے

وہ مُردے جن کو اُس کے حکم پر جینا نہیں آتا
وہی کہتے ہیں ایسی زندگی سے موت بہتر ہے

نہیں بڑھتے ہیں اپنی حد سے زندے ہوں کہ مُردے ہوں
سب اُتنے پانو پھیلاتے ہیں جتنی اُن کی چادر ہے

یہ دو باتیں ہیں بس اے چارہ گر آگے تری مرضی
جو غم نکلے تو اچھا ہے جو دم نکلے تو بہتر ہے

وہ چاہے سننے والوں کے لیے بے جوڑ باتیں ہوں
پڑھانے والے نے جو کچھ پڑھایا مجھ کو ازبر ہے

نہیں کی میں نے مال و جان و ایماں کے لیے کوشش
تو ان کے بدلے وہ مل جائے جو ان سب سے بڑھ کر ہے

پلا ساقی کہ باقی عمر بے ہوشی میں کٹ جائے
یہ میرے سر کا چکر اب مری قسمت کا چکر ہے

طلسمِ شارعِ عامِ محبت کھل نہیں سکتا
کہ ایسا صاف رستہ اور پھر ٹھوکر پہ ٹھوکر ہے

ہر اک چھالا ہے شاہد گرمئی سوزِ محبت کا
کہ جو کچھ میرے دل میں ہے وہی میری زباں پر ہے

میں اُس کو دیکھتا ہوں آئینہ کیا ہے سکندر کیا
جو آئینہ کا آئینہ سکندر کا سکندر ہے

نہ پوچھو ہائے بیمارانِ غم کی زندہ درگوری
اسی پر جی رہے ہیں موت کا ایک دن مقرر ہے

ہیں کم سے کم زیادہ سے زیادہ عشق کے معنی
سمجھنے والوں کو اک لفظ بے سمجھوں کو دفتر ہے

شہیدانِ محبت زندۂ جاوید ہوتے ہیں
جو سب کے واسطے ہے گور ان کے واسطے گھر ہے

صفیؔ کو طفلِ مکتب جانتے ہیں اس لیے شاعر
کہ ہر اک شعر اس کا بچے بچے کی زباں پر ہے

صفیؔ (اورنگ آبادی)

صاحبزادہ میکش کی کتابیں

گریہ و تبسم

"گریہ و تبسم" کے نوجوان مصنف صاحبزادہ میکش کی شاعرانہ صلاحیتوں اور پاکیزہ ادبی ذوق سے اہل ملک بخوبی واقف ہیں۔ "گریہ و تبسم" کے متعلق چند رائیں جو یہاں نقل کی جا رہی ہیں، یہ واضح کرنے کے لیے کافی ہیں کہ وہ اُردو ادب کی دنیا میں اپنا ایک شاندار مستقبل رکھتے ہیں۔

"ادبی خدمت گزاروں کی شستہ و منتخب جماعت کے ایک رکن میکش صاحب بھی ہیں جو مدت سے اپنے میخانہ سے شعر و ادب کے جام بھر بھر کر تقسیم کر رہے ہیں گریہ و تبسم انھیں کے کلام کا مجموعہ ہے اور رنگ و بو کا ایک خوش منظر گلدستہ۔ بعض بعض نظموں پر بے اختیار کلام اقبال کا دھوکا ہو جاتا ہے" (مولٰنا عبدالماجد دریابادی)

"صاحبزادہ میکش کا شمار ان نوجوان شعراء میں ہے جو اپنے شاعرانہ وجدان کو محض ادبیات تک محدود نہیں رکھتے بلکہ جنہوں نے اپنے لیے خیال و بیان کے کچھ نئے میدان بھی پیدا کر لیے ہیں۔ نوجوان حیدرآباد کی شاعری میں جو ذوقِ جدید پیدا ہو رہا ہے، اسی کا نقیب گریہ و تبسم ہے"

(قاضی عبدالغفار)

"آپ کے اشعار غیر معمولی صداقت اور جذبۂ محبت سے مملو ہیں۔ ملک و مالک کے ساتھ سچی اور بے غرض وفاداری ان سے عیاں ہے۔ جب تک دل میں کسی چیز کی محبت نہ ہو زبان اور قلم سے ایسے احساسات کی ترجمانی نہیں ہو سکتی جیسی کہ آپ کے کلام سے ظاہر ہے"

(محمد عبدالرحمٰن خاں سابق صدر جامعہ عثمانیہ)

"شاگردوں کے ادبی انہماک اور ادبی خدمات سے خوشی ہوتی ہے اپنے کلام پر مبارکباد قبول کیجیے"

(مرزا حسین علی خاں وائس پرنسپل جامعہ عثمانیہ)

"میکش کی شاعری کے پیچھے اُردو شاعری کی وہ تمام تحریکات کام کر رہی ہیں جو میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ اور جوشؔ کے کلام میں مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوئی ہیں، ان کے کلام کی سادگی اس بات کی شاہد ہے کہ وہ دماغ سے نہیں بلکہ دل سے شاعری کرتے ہیں۔ موضوع اور نقاطِ نگاہ عصرِ حاضر سے ہم آہنگ اسالیب قدیم اساتذۂ سخن سے مشابہ، یہی ہے خاص انداز جس کو میکش ترقی دے رہے ہیں" (عبدالقادر سروری)

"گریہ و تبسم جدید اُردو شاعری میں ایک اضافہ ہے اور ظاہر کرتا ہے کہ اگر اس نوجوان شاعر کی کماحقہٗ قدر کی گئی تو اُردو زبان مستقبلِ قریب میں ایک اچھے شاعر سے بہرہ مند ہوگی" (ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ)

کاغذ کی ناؤ

صاحبزادہ میکش خاموشی کے ساتھ زبان و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ چنانچہ ان کے حزنیہ ڈراموں کا مجموعہ "کاغذ کی ناؤ" ثابت کرتا ہے کہ وہ ادب کے ترقی پسند عنصر پر بھی اپنی قوت نگارش صرف کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

کھوئے ہوؤں کی جستجو

ان کی تیسری کتاب "کھوئے ہوؤں کی جستجو" عنقریب شائع ہوگی اس کتاب میں قطب شاہی حیدرآباد کے متعلق نیم تاریخی نظمیں ہوں گی جن میں سے بعض "سب رس" کے دکن نمبر میں شائع ہو چکی ہیں۔ علامہ اقبال نے

فرمایا تھا:۔ "میری تمام زندگی کھوئے ہوؤں کی جستجو"

صاحبزادہ میکش کھوئے ہوؤں کی جستجو کو شاندار مستقبل کی تعمیر کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ ماضی کا ہر لمحہ حال کی رو میں بہا دینے کے قابل نہیں ہے۔ بیتے ہوئے دنوں سے، آنے والے دنوں کے لیے بھی کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ شاندار ماضی کبھی دفن نہیں ہو سکتا بلکہ وہ عظیم تر مستقبل کی بنیاد بنتا ہے۔

اُلٹی گنگا (زیرِ طبع) صاحبزادہ میکش کی چوتھی کتاب ان کے مزاحیہ ڈراموں کا مجموعہ ہوگی۔ اس مجموعہ میں بھوت، بدگمانی اور اُلٹی گنگا جیسے ڈرامے شریک ہیں۔ ان ڈراموں میں مزاح کو زندگی سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

"آواز کی دنیا" نے آواز میں زندگی کو سمٹا دیا ہے۔ موصولی آلے ابھی "صورت نمائی" کے قابل نہیں ہوئے ہیں آواز کے ذریعے سے منظر کی تصویر پیش کرنا نشر نگار کا سب سے بڑا کمال ہے۔ صاحبزادہ میکش کے غنائیوں (Musical Features) نے جو نشرگاہ حیدرآباد سے نشر ہو چکے ہیں، ہندوستان کے ہر خطے سے خراجِ تحسین حاصل کیا ہے۔ "نغموں کی وادی" ان کے نشر شدہ غنائیوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ اس مجموعہ میں طوفان کی رات، اندھی بھکارن، پھولوں کی خواب گاہ، نغموں کی وادی اور دوسرے غنائیے شامل رہیں گے، (زیرِ طبع)

کنول آخر میں ہم صاحبزادہ میکش کی غزلوں، نظموں، رباعیوں اور گیتوں کے دوسرے مجموعے کا تذکرہ کریں گے جو زیرِ ترتیب ہے۔ اس مجموعے کی "دنیائے شباب و شعر" کا اندازہ ان مثالوں سے ہو سکتا ہے۔

نظم ہندوستان کے دو بند:۔

دھوپ سے جھلسے ہوئے بچے پہ ماؤں کے ستم　　جس کی ننھی سی زباں سوکھی ہوئی اور آنکھ نم
جیسے کچی نیند سے نازک پپوٹوں پہ ورم　　جیسے مینائے تہی کے دل میں فکرِ بیش و کم

جیسے بے رس پھول، جیسے بند مٹھی کا بھرم
کیا اسی کو پالتی ہے، مادرِ ہندوستان

اک سسکتا سانس، اک ٹوٹا ہوا تارِ رباب　　جیسے گہری فکر میں پچھلے پہر کا ماہتاب
جیسے باسی پھول کی بو، جیسے پت جھڑ کا گلاب　　جیسے دن میں چاند تارے، جیسے دریا میں حباب

جیسے دیوانے کی جنت، جیسے مفلس کا شباب
کیا اسی کو زندگی کہتے ہیں، اے ہندوستان

نظم "اقبال کے شعر" سے چند شعر:۔

ایمان کی تفسیر، قلندر کا ترانہ　　سمجھے تو پلٹ آئے بلندی پہ زمانہ
بے تابیٔ فطرت کی سکوں بخش کہانی　　شعلوں سے بنائی ہوئی شبنم کی روانی
الہام میں تکمیلِ حقیقت کی ادائیں　　شاہین کی پرواز، مجاہد کی نوائیں
سوئی ہوئی قسمت کو جگاتا ہوا نغمہ　　ہر سانس کو ہنگامہ بناتا ہوا نغمہ
پت جھڑ کی طرف دیکھ کے ہنستا ہوا بادل　　سوکھی ہوئی کھیتی پہ برستا ہوا بادل

اک روح جو انسان کو انسان بنا دے
اک درد جو جذبات کو ایمان بنا دے

نظم "پرچھائیاں" (تین بند)

کس وقت سے ہوا ہے احساسِ زندگانی
لو، میں تمھیں سنا دوں اس وقت کی کہانی

ہلکی سی چاندنی میں لہرا کے رات آئی　　تاروں سے کہہ رہی تھی جب عشق کی کہانی
لے کر نئی امنگیں آئی نئی جوانی

نزدیک آ کے مجھ کو جب دور ہو رہی تھیں　　مہندی کی باڑ میں تم مستور ہو رہی تھیں
بچپن بنی ہوئی تھی معصوم نوجوانی

پرچھائیوں سے اپنی گھبرا کے آ گئیں تم　　سینے پہ ہاتھ رکھ کر دل میں سما گئیں تم
شرما رہی تھی مجھ سے سہمی ہوئی جوانی

اس رات سے ہوا ہے احساسِ زندگانی
اب یاد آ گئی نا! بھولی ہوئی کہانی

مہتمم "سب رس"

غزلیات

فکر و نظر

مشاہداتِ جمال اور کم نگر کے لئے
یہ انکشاف ہیں مخصوص دیدہ ور کے لئے

نہ پوچھ کب سے ہوں بیتاب اس نظر کے لئے
جو ہو سکے نہ جدا پل کے عمر بھر کے لئے

بڑھا نہ بانگِ فغاں، ضبطِ سوز کر، جل جا
نمودِ رقص کا موقع نہیں شرر کے لئے

تری لطیف تجلی نظر میں بھر بھر کر
بنا رہا ہوں نئے آئینے نظر کے لئے

فضا خموش، ستارے اداس، پھیکا چاند
یہ اہتمام شبِ عیشِ مختصر کے لئے

یہ چھپ چھپا کے نظر بازیاں تو ہمیں ہیں
روش نئی کوئی ایجاد کر نظر کے لئے

وہ نالہ کر جو لبِ حسن پر فغاں بن جائے
وہ آہ کیا جو بھٹکتی پھرے اثر کے لئے

ہے شوقِ دید کسی ڈھب سے دیکھ ہی لوں گا
لگا نہ قید کوئی میری چشمِ تر کے لئے

نمودِ لالہ، ضیائے قمر، فروغِ شفق
یہ جتنے رنگ ہیں دھوکے ہیں سب نظر کے لئے

مطالباتِ وفا میں شریک ہوں دونوں
کروں میں نالہ، دعا تم کرو اثر کے لئے

ترے خیال میں بت، ذہن میں بتخانے
یہ سجدے بار نہ ہو جائیں سنگِ در کے لئے

شباب کا تو نہیں ہوش، ہاں خیال یہ ہے
کہ ایک نیند سی آئی تھی رات بھر کے لئے

پھر آئے عالمِ ہستی میں انقلاب اعجازؔ
کہ منتظر ہے نظر عالمِ دگر کے لئے

اعجاز صدیقی
مدیر شاعر آگرہ

غزل

کرم مجھ پہ کیا کیا وہ فرما رہے ہیں
ستم کر رہے ہیں، ستم ڈھا رہے ہیں

تبسم تھا اس رنگ سے انکے لب پر
میں سمجھا کوئی جام چھلکا رہے ہیں

تمہیں وجہ بیتابیٔ دردِ دل ہو
تمھاری ہی جانب کھنچے جا رہے ہیں

خوشی کا سماں ہے، ہنسی گلفشاں ہے
خبر آ رہی ہے کہ وہ آ رہے ہیں

بہار ایک دم کی ہے کھلتا نہیں کچھ
یہ گل کھل رہے ہیں کہ مرجھا رہے ہیں

ہے آباد میرے تصور کی دنیا
حسیں آ رہے ہیں، حسیں جا رہے ہیں

جلیل اُن کے صدقے جو صہبائے رنگیں
پلا کر مجھے ہوش میں لا رہے ہیں

نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل

رضوانیات

حیا رخصت ہوئی شوخی اٹھاتی ہے نقاب اُن کا
الٰہی خیر رخصت ہو رہا ہے اب حجاب ان کا

کشش ہے یہ محبت کی کہ ہے یہ بھی حجاب اُن کا
جو مجھ سے روز بڑھتا جا رہا ہے اجتناب اُن کا

دلِ مرحوم کی کیا اب وفائیں یاد آئی ہیں
ہوا جاتا ہے کیوں محجوب حسنِ کامیاب اُن کا

جفائیں ہو رہی ہیں پردۂ صبر آزمائی میں
کرم بھی ہوتا ہے مجھ پر باندازِ عتاب اُن کا

سوالِ وصل پر پہلو سے اٹھ کر روٹھے جاتے ہیں
شکیب و صبر کا دشمن ہے یہ رنگِ عتاب اُن کا

ہمیں سے ہو رہی ہیں چھیڑ کی باتیں بھی محفل میں
ہمیں دشمن بھی ہیں اور پھر ہمیں سے ہے حجاب ان کا

نگاہِ واپسیں بس رحم کر دیکھا نہیں جاتا
یہ منھ کو پھیر کر رونا یہ حالِ اضطراب ان کا

لکھی ہیں خط میں وہ باتیں نہیں جو میری قسمت میں
مری تقدیر کا لکھا ہوا آیا جواب ان کا

اٹھائی جا رہی ہے اس طرح تمہیدِ محشر کی
قیامت کا نمونہ بن کے آیا ہے شباب ان کا

نگاہِ قہر میں شوخی ذرا آواز میں تیزی
لئے ہے ساتھ میں لاکھوں ادائیں اک عتاب ان کا

علامہ سر شیخ محمد اقبال مرحوم

نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل

مزے کے آئے دن امید امین عشق کی راتیں
کہ ہم آغوش ہوتا ہے لڑکپن سے شباب ان کا

امید رضوی بریلوی

غزل

اور دل توڑ کے جانے والے ۔ دل کی بات بتاتا جا
اب میں دل کو کیا سمجھاؤں مجھکو بھی سمجھاتا جا

میری چپ رہنے کی عادت ۔ جس کارن بدنام ہوئی
اب وہ حکایت عام ہوئی ہے سنتا جا شرماتا جا

تجھکو ابر آلود دنوں سے کام نہ چاندنی راتوں سے
بہلاتا ہے باتوں سے بہلاتا جا ۔ بہلاتا جا

یہ دکھ درد کی برکھا بندے دین ہے تیرے آتا کی
شکر نعمت بھی کرتا جا ۔ دامن بھی پھیلاتا جا

دونوں سنگ راہِ طلب ہیں راہنما بھی منزل بھی
ذوق طلب ۔ ہر ایک قدم پر دونوں کو ٹھکراتا جا!

نغمے سے جب پھول کھلینگے چننے والے چن لینگے
سننے والے سن لینگے ۔ تو اپنی دھن میں گاتا جا

حفیظ جالندھری

غزل

نہیں بہار ہی کچھ زمزمہ سرائے بہار
کلی کلی کا چٹخنا بھی ہے صدائے بہار

ریاضِ دہر میں ہوں میں مثال نکہتِ گل
مجھے اڑائے لئے پھرتی ہے ہوائے بہار

دبی نہ آگ جدائی کی سیر باغ سے بھی
غضب ہے اور بھی بھڑکا گئی ہوائے بہار

لگا دے لکھ کے یہ کوئی مزار بلبل پر
شہید غمزۂ گل کشتۂ ادائے بہار

ہزاروں حسن برستے ہیں غنچۂ گل پر
نہ جانے کون ہے صورت گرادائے بہار

بڑے مزے میں ہیں وہ لوگ باغ عالم میں
جو آشنائے خزاں ہیں نہ آشنائے بہار

چمن میں جوشِ نمو سے نکھر کے رنگِ گلاب
ہوا ہے روکش رنگینی حنائے بہار

زوال ایک کا ہے دوسرے کو وجہ عروج
جو ابتدائے خزاں ہے وہ انتہائے بہار

چمن میں آکے ذرا جامہ زیبیاں دیکھو
گلوں کے جسم پہ پھبتی ہے کیا قبائے بہار

ہنسا دے باد صبا گدگدا کے غنچوں کو
اٹھا دے آج ذرا پردۂ حیائے بہار

ابھی تو ان کا شباب اور گل کھلائیگا
ابھی تو نام خدا سے ہے یہ ابتدائے بہار

قفس میں گزرے نہ معلوم کیا عنادل پر
جب آشیانے ہی میں رات دن رلائے بہار

بہار تھی تو نہ کی ہم نے کچھ بہار کی قدر
گئی بہار تو اب چیختے ہیں ہائے بہار

نہیں ہے کام کسی سے قفس نصیبوں کو
چمن سے جائے خزاں یا چمن میں آئے بہار

ہنسی ہے پھولوں کے لب پر خموش ہیں غنچے
بقدر فہم جو سمجھے ہیں مدعائے بہار

جو تجھ سے کوئی سنے تو سناؤں اے خنجر
عجیب قصۂ دلکش ہے ماجرائے بہار

میر یاور علی خنجر

بہاراں

بادِ صبا یہ جھومتی آئی ہے کس دیار سے
جیسے شمیم پھٹ پڑے سینۂ لالہ زار سے

گاہ چمن میں جھومنا، گاہ چمن کو روندنا
کیف اڑا کے لائی ہے موجِ خرام یار سے

[illegible] گی موجِ خرام یار سے
حشر ہمیں بپا کریں کون اٹھے مزار سے

برق سی کوندنے لگی اٹھنے لگے شرار سے
میری نگاہ لڑ گئی جب بھی نگاہِ یار سے

ضبطِ نظر نہ ہو سکا عشقِ کرشمہ کار سے
بڑھ کے نقاب الٹ دیا روئے حسینِ یار سے

منزلِ رنگ و نور سے مرحلۂ بہار سے
مثلِ نظر گزر بھی جا عالمِ اعتبار سے

فقر کو بہرہ ہے نہ ہے دولتِ لالہ زار سے
جنسِ جنوں بھی ہو تو میں بھیک نہ لوں بہار سے

موڑ کے منہ بہار سے پھیر کے رخ ہزار سے
کھیل رہی ہیں نکہتیں، اُن کے گلے کے ہار سے

زلف میں یاسمن کے پھول، موسمِ گل کے وہ رسول
توڑے ہوئے بہار کے چھینے ہوئے بہار سے

روح نہ تھی نسیم میں، جان نہ تھی بہار میں
کچھ بھی نہ تھا کنار میں، وہ جو اٹھے کنار سے

جوشِ نمو کو گل بہ گل لالہ بہ لالہ دیکھ کر
روحِ جنوں ابل پڑی خم کدۂ بہار سے

فطرتِ حسن و عشق کی ہائے رے بیقراریاں
میں جو ہوں، نا شکیب سا وہ بھی ہیں بیقرار سے

آج یہ ڈوبتے ہوئے نجمِ سحر نے کیا کہا
خون سا کچھ ٹپک پڑا دیدۂ انتظار سے

حسن ہی کو نہیں گلہ عشق بھی تنگ آ گیا
ان کو رلا رلا دیا شکوۂ بار بار سے

دل سے کسی کی یاد بھی کرتی ہے یوں ہی شوخیاں
جیسے صبا الجھ پڑے گل کدۂ بہار سے

خود وہ الجھ کے رہ گئی میرے جنوں کے دام میں
میرا جنوں نہ دب سکا گردشِ روزگار سے

ساغر خامکار پی، بادۂ مشکبار پی
بادہ نہیں بہار پی میکدۂ بہار سے

ساغر نظامی

غزل

مآلِ زندگانی ہے محبت کیش ہو جانا
دلیلِ کامرانی آفتیں درپیش ہو جانا

ہمارا حاصلِ ہستی یہی ہے حضرتِ ناصح
جگر مجروح - سر آشفتہ اور دل ریش ہو جانا

ہمیں مطلب نہیں ہے نیک و بد سے کیشِ الفت میں
رقیبوں کو مبارک ہو مآل اندیش ہو جانا

کسی کو دیکے دل ہمنے اگر سیکھا تو یہ سیکھا
جفا سہنا - وفا کرنا - محبت کیش ہو جانا

جنہیں ہو عشقِ صادق روک سکتا ہی نہیں انکو
مصیبت ہائے گوناگوں کا گردو پیش ہو جانا

محبت اوّل و آخر ہے دنیا ہو کہ عقبیٰ ہو
مبارک عاشقوں کو عاقبت اندیش ہو جانا

رہو دنیا میں دنیا سے الگ اے حضرتِ عابد
وگرنہ کونسا دشوار ہے درویش ہو جانا

قاضی محمد زین العابدین عابد

غزل

ہنس رہا ہوں لب مجبور پہ فریاد نہیں
کوئی کیا جانے کہ خوں گشتہ ہے دل شاد نہیں

کیا کہوں کس لئے رہ رہ کے تڑپ اٹھتا ہوں
دل میں اک تیر ہے پیوست تری یاد نہیں

کیا کروں آہ بھلایا نہیں جاتا مجھ سے
وہی پیمانِ محبت جو تمہیں یاد نہیں

کیا مرے خواب میں آنے کا بھی قدغن ہے تمہیں
قید ہے جسم میں تو کیا روح بھی آزاد نہیں

چاندنی، کاہکشاں، پھول گھٹائیں، نغمے
کیا یہ سب میری تمناکی ہیں روداد نہیں

یاد ہے وہ شبِ مہتاب میں آہنگِ رباب
اور وہ نکہتِ صحرا جو چمن زاد نہیں

یاد ہے عکسِ شفق سے وہ دلِ دریا میں
منظرِ حسن کہ "منت کشِ" بہزاد نہیں

یاد ہے چھاؤں میں تاروں کی وہ سرگوشی
اور وہ شکوۂ قدرت کہ ہم آزاد نہیں

وجاہت حسین عندلیب شادانی
(ڈھاکہ)

نغمہ و فریاد

میں باغ میں گر نغمۂ دلگیر سنادوں — بلبل کو بھی فریاد کے آداب سکھادوں

کیا تجھ سے کہوں کیا ہیں مری آہ کے جوہر — چاہوں تو ستاروں کے چراغوں کو بجھادوں

اچھا ہے کہ سجدے مرے بیکار نہ جائیں — تقدیر کی پیچیدہ لکیروں کو مٹادوں

ڈرتا ہوں کہیں پھول کی پتی نہ لچک جائے — شبنم کو جو کرنوں کی کشاکش سے چھڑادوں

میں حسن کے ہر ظلم کو، ہر جور کو سہہ کر — اوروں کے لئے عشق کو آسان بنادوں

ہنس ہنس کے وہ کہتے ہیں کہ ہم بھول گئے تھے — مطلب یہ ہے گزری ہوئی باتوں کو بھلادوں

ساغر کی کھنک، قلقل مینا میں سمو کر — دنیا کیلئے ایک نیا ساز بنادوں

گلشن جسے کہتے ہیں وہ آتشکدہ بن جائے — میں آتش گل کو جو نگاہوں سے ہوا دوں

جس نظم پہ ماہر کو بہت داد ملی تھی
کہیے تو وہی نظم، ترنم سے سنادوں

ماہر القادری

غزل

ہمارے اشک خونیں کی روانی دیکھتے جاؤ — لہو کا ہے لہو پانی کا پانی دیکھتے جاؤ

ہوئی ہے شادیٔ مرگ آج تم سے ملکے دشمن کو — تماشائے وفور شادمانی دیکھتے جاؤ

تمھاری رہ گزر میں قتل ہو کر سیکڑوں تڑپے ہیں — ادھر آؤ تم ان کی بے زبانی دیکھتے جاؤ

تمہارے دیکھنے والوں کا دم اب تو لبوں پر ہے — اثر لایا ہے کیا سوز نہانی دیکھتے جاؤ

نہ دیکھو آئینہ جاتے ہوئے دشمن کی محفل میں — تم اپنا حسن اپنی نوجوانی دیکھتے جاؤ

نہیں ہے بے سبب طوفان آنا دیدۂ تر کا — مری حالت کی ہے یہ ترجمانی دیکھتے جاؤ

معین کے شعر سن کر بندہ پرور تم بھی خوش ہو گے
ذرا اس کی طبیعت کی روانی دیکھتے جاؤ

معین

جناب ماہرالقادری صاحب

جناب رگھویندر راؤ صاحب جذب

غزل

اے پیکرِ خیال نگاہوں پہ چھا کے دیکھ
میرا عیارِ ذوقِ نظر آزما کے دیکھ

جنّتِ نظر ہے، منظرِ رنگینیٔ جہاں
آنکھوں سے امتیاز کا پردہ ہٹا کے دیکھ

کتنی جنوں نواز ہے دنیائے رنگ و بو
اک بار دل میں شمعِ محبت جلا کے دیکھ

نازِ نظر ہو تارِ رگِ جاں بنا ہوا !
لایا ہوں نذرِ عمر، اِدھر مسکرا کے دیکھ

ہمدم نگاہِ ناز عجب کام کر گئی
تیور بدل گئے، دلِ بے مدعا کے دیکھ

طغیانِ عشق سیلِ حوادث پہ چھا گیا
اے حسن تو بھی زحمتِ طوفاں اٹھا کے دیکھ

سکندر علی وجد

"کچھ نہیں" کے دو پہلو

جنہیں عشق سے واسطہ کچھ نہیں
اُنہیں حُسن سے کیا ملا ؟ کچھ نہیں

جہاں زُہدِ خشک آ گیا، اُس جگہ
محبت، مروّت، وفا کچھ نہیں

خدا جانے کس دل سے کہتے ہیں لوگ
حسیں اور اُن کی ادا کچھ نہیں

نہیں دل کی طلعت، جو یہ ماہوش
شبِ ماہ میں بھی مزا کچھ نہیں

شرر ہیں یہ ہنس مکھ ستارے اگر
تو ہر خندۂ خوش نما کچھ نہیں

نظر کے ہیں دھوکے مناظر اگر
تو پھر یہ چمن یہ فضا کچھ نہیں

حکیموں پہ حیرت نہ ہو کیوں مجھے
بڑھا علم تو کہہ دیا کچھ نہیں

نہ ساقی نہ ساغر نہ شاہد نہ باغ
مآل اُن کی تحقیق کا کچھ نہیں

— ۲ —

وجود ان کا میری نظر میں بھی کیا
عدم ہے، عدم کے سوا کچھ نہیں

کہوں کیسے ہستی کے گلزار میں
فنا ہی فنا ہے بقا کچھ نہیں

میں خوش حسن سے ہوں سوا حسن کے
مری زیست کا مدعا کچھ نہیں

اگر میری نظروں سے دیکھے کوئی
بقا ہی بقا ہے فنا کچھ نہیں
یہ معمورۂ حسن ہے تو یہاں
خوشی ہے خوشی کے سوا کچھ نہیں
نگاہِ حقیقت رسِ حسن سے
تعلق غم و رنج کا کچھ نہیں
مزے اہلِ دل کے لئے ہیں بہت
کہا میں نے کب ؟ یاں مزا کچھ نہیں
یہ ساقی یہ ساغر یہ شاہد یہ باغ
حلاوت ہے دل میں کیا کچھ نہیں

علی منظور

میری ہمسائی

حسین نغموں سے پُر نگاہیں
دریچہ میں مسکرا رہی تھیں
وہ نوجوانی کی داستانیں
پیام عشرت سنا رہی تھیں

شباب انگڑائی لے رہا تھا
جبین نوریں چمک رہی تھی
گلاب کی بھینی بھینی خوشبو
فضا میں سارے مہک رہی تھی

ندیم! ہمسائی آج میری دریچہ میں گنگنا رہی تھی!
فضا میں مستی سی چھا رہی تھی نسیم بربط بجا رہی تھی

عجیب منظر عجب سماں تھا
مری نگاہوں کے عین آگے
بہار کی چاندنی میں جیسے
دکھائی پڑتے ہیں چاند تارے

لطیف ہونٹوں پہ تھا تبسم
جمال افروز خواب آسا
نظر سے مستی ٹپک رہی تھی
شراب آسا، شباب آسا

ندیم، ہمسائی آج میری دریچہ میں گنگنا رہی تھی
فضا میں مستی سی چھا رہی تھی نسیم بربط بجا رہی تھی

نگاہِ بد سے خدا بچائے
بہار تصویر سامنے تھی
جمیل خوابوں کی گویا میرے
حسین تعبیر سامنے تھی

ملاحتوں میں صباحتوں میں
رخِ حسیں جگمگا رہا تھا
ادائے دوشیزگی کے صدقے
شباب بھی گنگنا رہا تھا

ندیم، ہمسائی آج میری دریچہ میں گنگنا رہی تھی
فضا میں مستی سی چھا رہی تھی نسیم بربط بجا رہی تھی

محبوب حسن جگر (عثمانیہ)

مشاہیر کے غیر مطبوعہ خطوط

ادارۂ ادبیات اُردو نے مشاہیر اُردو کے غیر مطبوعہ خطوط اور تحریروں کے جمع کرنے کا خاص طور پر اہتمام کیا ہے۔ اس وقت تک متعدد کرم فرماؤں نے اُردو ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ دیگر مشاہیر کے بھی بیسیوں خطوط اور تحریریں عنایت کی ہیں جن میں سے صرف چند خطوط اس اُردو نمبر میں شایع کیے جا رہے ہیں۔ ان خطوط میں نمبر (۱) معصومہ بیگم مرزا حسین علی خاں صاحب نمبر ۲، ۴، ۵، ۸ اور ۹ سکینہ بیگم سید رحمت اللہ صاحب ۳، ۱۰ تا ۱۶ صغریٰ بیگم سید ہمایوں مرزا کے اور ۶، ۷ . . . ڈاکٹر زور کے عطیہ ہیں۔

شبلی نعمانی کے خطوط

بنام طیبہ بیگم صاحبہ بلگرامی بنت عماد الملک

مکرمہ من۔ تسلیم

کل میں نواب عماد الملک بہادر سے ملا اور اتفاق سے کل ہی میرے نام ایک خط خواجہ صاحب کا ووکنگ سے آیا۔ نواب صاحب نے فرمایا کہ ریاست سے تو امداد ممکن نہیں لیکن خواجہ صاحب کو لکھ دو کہ بہت جلد (یعنے دس پندرہ دن کے بعد) ہم لوگ ان کے مشن کے لیے ایک معقول ماہوار رقم مہیا کردیں گے۔ جناب نواب صاحب موصوف اور مولوی انوار اللہ صاحب مل کر اس کام کو کریں گے۔

لکچر کے لیے میں حاضر ہوں۔

خواجہ صاحب کا خط مع اپنی تائید کے کسی اخبار میں شایع کرونگا۔

شبلی شہریور سنہ ۱۳ف

(کاچی گوڑہ)

بنام طیبہ بیگم (بنت عماد الملک)

بھوپال

مکرمہ من

تسلیم۔ خواجہ کمال الدین کے لیے جو کچھ یہاں کرسکا اس کی اطلاع دے چکا ہوں۔

اس وقت یہ تحریر ہے کہ "ظل السلطان" خاص خواتین کا پرچہ ہے اور حضور سرکار عالیہ کی سرپرستی میں نکلتا ہے۔ اس لیے آپ کبھی کبھی اس میں کچھ لکھا کریں تو بہت منت ہوگی۔

شبلی ۱۰ دسمبر سنہ ۱۹۱۳ء

بنام سید ہمایوں مرزا بیرسٹرایٹ لا

مکرمی

ہم لوگ نیلام جا رہے ہیں۔ اگر آپ کے سونے یا کسی اور کام کا وقت نہ ہو تو چلیے۔

شبلی ۱۹ اکتوبر سنہ ۱۸۹۰ء

طیبہ بیگم کے خطوط

بنام لیڈی سر آسمان جاہ

جناب بیگم صاحبہ معظمہ و محتشمہ دام عنایتہا

بعد تسلیم عرض خدمت گرامی ہے کہ اگر ۱۵ ماہ محرم

کے لیے صرف وہ دربار ہال جو آپ نے مس اونس کو
انعام کے جلسہ کے لیے عنایت فرمایا تھا مجھے بھی
عنایت ہو تو میں نہایت ممنون ہوں گی صرف
ہال اور اس کے اندر کا پاسیج باقی سب کمرے
بند رکھے جائیں۔ اگر چودہ تاریخ سے اجازت
ہو جائے تو پردہ کا انتظام کروا دیا جائے۔
مولوی شبلی صاحب جو ایک مشہور و معروف
لکچر دینے والے ہیں، اشاعت اسلام پر لکچر دینگے۔
سامنے کے اسٹیج پر وہ رہینگے اور اس کے مقابل
کے دروں پر پردہ باندھ دیا جائے گا۔

اگر ہال کی اجازت دلوادی جائے تو میں
نہایت ممنون ہونگی۔ ۱۵ محرم کو اتوار کا روز بھی
رہے گا۔ دفتر بھی بند رہیگا۔

طیبہ بیگم

بنام عزیز فاطمہ بیگم شمس العلماء نواب عزیز جنگ ولا

جناب ہمشیرہ صاحبہ

آپ کا مضمون ماشاءاللہ نہایت عمدہ ہے۔
اردو تو آپ ہمیشہ سے پُر زور لکھتی ہیں مگر جہاں
خدا کا ذکر ہو پھر وہاں کا کیا کہنا ہے۔ اُبلا ہوا
دل چھلک پڑتا ہے۔ آپ تو عشق اللہ میں صوفیوں
کا درجہ رکھتی ہیں۔ آپ کے مضمون میں صرف جو
بات کانوں کو ناگوار گذرتی ہے وہ میرا ذکر ہے۔
میں اس کے خلاف ہوں۔ بہت سی وجوہ ہیں۔
صرف اس کو انکسار نہ سمجھئے۔ عند الملاقات
کہونگی۔ خدا ہم کو آپ کی دعوت میں شریک
ہونا نصیب کرے فقط

طیبہ بیگم

فصیح الملک مرزا داغ دہلوی کے خطوط

بنام نواب ڈاکٹر لقمان الدولہ ذل

مہربان من

آپ کی غزل بہت اچھی ہے۔ آپ کے اُستاد
شاگرد فیض صاحب نے بہت خوب بنائی ہے۔
غزل کی تعریف، آپ کی طبیعت کے ... رسا
کی اور ان کی اصلاح کی داد دیتا ہوں۔ اس میں
کہیں گنجائش اصلاح نہیں ہے۔ نسخہ جو ممکن ہے
اس کو آپ خوب دیکھ سکتے ہیں۔

ہیچمداں فصیح الملک داغ دہلوی

بنام نواب ڈاکٹر لقمان الدولہ ذل

الحمدللہ کہ خیریت سے ہوں۔ روزہ رکھ رہا ہوں۔
کمشنر صاحب صفائی چادر گھاٹ سے جھگڑا ہے۔
مثانہ کے درد کے واسطے دوا بھجوا دو پہلی دوا
مفید ہوئی۔ فقط

گرامی کے خطوط

بنام نواب قادر نواز جنگ بہادر

ہوشیارپور۔ پنجاب

عالی جناب نواب قادر نواز جنگ بہادر

تسلیم۔ آپ کی صورت دل نواز، آپ کی سیرت
وفاطراز، آپ کا مکان دلفریب، آپ کا وہ

خلق گرامی نواز، گرامی کی آنکھوں میں پھر رہا ہے۔

حضرت قاضی صاحب کو کہہ دیجئے کہ گرامی کو صوبہ صاحب بہادر کا جذبۂ اخلاص حیدرآباد میں کھینچ رہا ہے۔ بفضلِ خدا فروری کے مہینے میں گرامی نواب قادر نواز جنگ بہادر کی مجلس سماع میں حاضر ہو جاوے گا۔

گرامی حضرت قاضی صاحب کی محبت کا دلدادہ ہے۔ اور صوبہ صاحب بہادر کا رہینِ منت سپاسگزار(؟) ہے۔ گرامی چند رباعیاں بھیجتا ہے۔ مجھے امید ہے نواب قادر نواز جنگ بہادر پسند فرماویں گے۔

راقم۔ گرامی

بنام مولوی سید احمد

حضرت سید صاحب

رطب و یابس لکھدیا گیا ہے۔ طول بے معنی ہوتا ہے۔ ہرچہ گیرید مختصر گیرید۔ دو شعر نکال دئے گئے۔ خط کھینچ دیا گیا ہے۔ خوشخط لکھوا لیجئے۔

راقم۔ گرامی

راشد الخیری کا خط

بنام صغریٰ بیگم ہمایوں مرزا

عزیزہ محترمہ۔ سلام مسنون

میں خود آپ سے اسوقت ٹیلیفون پر گفتگو کرتا کہ آپ کا پرچہ پہنچا۔ کھانا یہاں بھی آپ کا ہے اور وہاں بھی۔ اصلی چیز آپ کی محبت، خلوص اور قدردانی ہے جس کا میں ممنون ہوں، بیگم راشد الخیری آج دہلی جارہی ہیں اور ان کا جانا نہایت ضروری ہے کیونکہ یکم اکتوبر سے نیا سیشن شروع ہوتا ہے اور روپیہ کی تعداد دیکھ کر فیصلہ ہوتا ہے وہ آپ کے ہاں چاء پی چکی ہیں۔ میں دو دفعہ چاء پی چکا ہوں اگر آپ کی رائے میں کھانا نہایت ضروری چیز ہے تو میں حاضر ہوں اور آپ کے گھر کو اپنا گھر سمجھتا ہوں کسی روز آکر بغیر اطلاع جو موجود ہوگا کھا پی لوں گا۔

نواب معین الدولہ بہادر سے اس وقت ملنے جارہا ہوں امید ہے روپیہ مل جائیگا۔

بیگم مرزا یار جنگ صاحبہ گھر پر موجود نہ تھیں شاید آج کل میں آجائیں۔

میں ابھی ایک ہفتہ اور ٹھیرونگا روانگی سے قبل یہاں کا حساب پریس میں بھیجکر آپ سے انشاءاللہ ملتا ہوا جاؤنگا۔

سید ہمایوں مرزا صاحب کی خدمت میں سلام علیک فرما دیجئے۔ دعاگو

راشد الخیری

نواب امداد امام اثر کے خطوط

بنام سید ہمایوں مرزا بیرسٹر

کیمپ بڑکاڈانڈی مورخہ ۲۴ مارچ سنہ ۱۹۱۳ء

مجمع فضائل و جود دلیل خلاصۂ خاندان مصطفوی و مرتضوی دام مجدکم

بعد گزارش آداب و تسلیم عرض ہے کہ محبت نامہ وارد ہوا۔ دریافت خیریت سے مسرت قلبی حاصل ہوئی۔ خدائے تعالیٰ آپ کو ترقی اقبال کے ساتھ حی و قایم رکھے۔

میری سرگزشت یہ ہے کہ آپ کی لقائے صوری کے بعد جب سے میں وطن کو کلکتہ سے واپس آیا انواع اقسام کی تکلیفات روحی و جسمانی میں مبتلا رہا اور اس وقت تک بلاؤں سے نجات نہیں ملی ہے۔ دو مہینے سے ہز ہائنس نواب صاحب فرمانروائے رامپور کا مہمان ہوں۔ یہاں تقریب شکار سے ہمرکاب آیا ہوں۔ نہیں معلوم کہ کب تک وطن کو معاودت کر سکوں گا۔ وطن کی یہ حالت ہے کہ دس مہینے سے نیورہ نہیں گیا ہوں۔ میں اپنی پریشانیوں کو کیا عرض کروں۔ آپ کی تصنیف شریف گیا میں ہے ساتھ نہیں ہے۔ اُس پر ریویو لکھنے کا مجھے کوئی موقع حاصل نہیں ہے۔ البتہ گیا جا کر تعمیل حکم کر سکونگا۔ اس وقت امیدوار معافی ہوں۔ فقط زیادہ حد ادب دعاگو

امداد امام عفی عنہ

بنام سیّد ہمایوں مرزا بیرسٹر

آبنگلہ۔ گیا۔ صوبہ بہار مورخہ ۳ر فروری سنہ ۱۹۲۸ء

قبلہ و کعبہ جناب عمی صاحب مدظلہ العالی۔

بعد بجا آوری مراتب تسلیم و کورنش عرض ہے کہ بخیریت ہوں اور خیریت بندگان حضرت کا درگاہ الٰہی سے طالب۔ ورود سرفراز نامہ نے افتخار دارین بخشا۔ امور ضروری ذیل میں گزارش ہوتے ہیں۔

میری شومی بخت کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ بندگان حضرت پٹنہ تشریف لاویں اور میں شرف قدمبوسی سے محروم رہ جاؤں۔ اگر تشریف آوری کے قصد سے اطلاع ہوتی تو میں ضرور پٹنہ میں حاضر رہتا۔ حق یہ ہے کہ کوتاہی بخت کا کیا جواب ہے۔ اب پایانِ عمر کو پہنچ چکا ہوں۔ ایسی حالت میں کیا امید ہو سکتی ہے کہ پھر شرف اندوزِ ملازمت ہو سکونگا۔

میری چند تصنیفات تو ضرور شایع ہو چکی ہیں مگر میں نہیں جانتا کہ کہاں سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔ میرے پاس میری تصنیفات کے نہ کوئی قلمی نسخے موجود ہیں اور نہ کوئی چھپے ہوئے۔ تعمیل ارشاد میں مطلق دیر نہ ہوتی مگر کیا کروں مجبور ہوں۔

بحضور جناب چچی صاحبہ مدظلہا۔ آداب و تسلیم عرض ہے اور میری اہلیہ بھی آداب و تسلیم عرض کرتی ہیں۔ بچوں کی طرف سے آداب و تسلیم قبول ہو۔

مجھے حصول ملازمت کی بیحد تمنا ہے۔ مگر کیا کروں مجبور ہوں۔ پیرانہ سالی مانع نقل و حرکت ہے، تعجب یہی ہے کہ اب تک کیونکر زندہ ہوں، خاص کر حسین امام مرحوم کی رحلت کے بعد فقط

فدوی امداد امام عفی عنہ

بنام سیّد ہمایوں مرزا بیرسٹر

آبنگلہ۔ گیا۔ مورخہ ۲۹ر اپریل سنہ ۱۹۳۲ء

جناب عموی صاحب قبلہ و کعبہ دام ظلہ العالی۔

بعد گزارش آداب و تسلیم عرض ہے کہ ورود سرفراز نامہ نے سرفراز و ممتاز فرمایا۔ دریافت خیریت مزاج عالی سے اطمینان قلبی نصیب ہوا۔ ذرّہ نوازی کا شکریہ

قبول ہو۔ شرف قدم بوسی کی تمنا احاطۂ بیان سے
باہر ہے۔ کیا کروں کوئی امر اپنے اختیار کا نہیں
ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمنا پوری نہ ہو سکے گی۔
اس لیے کہ پایان عمر کو پہونچ چکا ہوں۔ صرف فرمان
خداوندی کی دیر ہے۔ علاوہ اس کے زمانے نے
ایسی کروٹ لی ہے کہ اکثر افراد کو اپنی جگہ سے
جنبش کرنی دشوار ہو رہی ہے۔ یہ زمانہ امرا گردی
کا آیا ہے۔ مگر ہم غربا بھی اُن کے شریکِ حال
ہو رہے ہیں۔ اب اس دیار کی حالت قابلِ
عرض نہیں رہی ہے اور روز بروز بدتر ہوتی جاتی
ہے۔ اہل غیرت خودکشی سے اپنی آبرو کو بچا سکیں تو
بچا سکیں، ورنہ اور کوئی ذریعہ حفظان آبرو کا
نظر نہیں آتا ہے۔ خیر۔ مرگ انبوہ جشنے دارد۔
بالیقیں میں نے اپنی عمر طویل میں کسی زمانے کا ایسا
رنگ نہیں دیکھا تھا جیسا کہ اس وقت دیکھ رہا ہوں۔
اہلیہ آداب و تسلیم عرض کرتی ہیں اور بحضور
جناب حضرت چچی اماں صاحبہ مدظلہا آداب و تسلیم
کے پہونچا دینے کی مستدعی ہوتی ہیں۔ نخیف کی
استدعا بھی یہ ہے۔ دنیا میں جس قدر خیریت ممکن
ہے میرے جمیع متعلقان کو بفضلہ تعالی نصیب ہے
پریشانی عام کی اور بات ہے فقط زیادہ حدِ ادب

فدوی امداد امام عفی عنہ

بنام سید ہمایوں مرزا بیرسٹر

آبگلہ۔ گیا۔　　مورخہ ۲۱ ستمبر سنہ ۱۹۳۲ء

حضرت عم قبلہ و کعبہ مدظلہ العالی۔ بعد گزارش آداب
تسلیم عرض ہے کہ شرف بخشی کا شکریہ تہ دل سے
ادا کرتا ہوں، قرین پذیرائی ہو۔ یہاں یا صوبۂ
بہار میں چچی اماں سلمہٗ کی خدمت حیدرآباد کا مذکور
ابھی تک سننے میں نہیں آیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ
یہ خبر تمامتر بے بنیاد ہے۔ ایک مہینے کا عرصہ
ہوتا ہے کہ موصوف یہاں آئے تھے مگر حیدرآباد کا
کوئی ذکر درمیان میں نہیں آیا۔ مجھے حاضری کی
بڑی تمنا ہے خاص کر ایسی حالت میں کہ پایان عمر
کو پہونچ گیا ہوں۔ مگر بہت موانع درمیان میں
حائل دکھائی دیتے ہیں۔ کاش ایسا ہوتا کہ سفر
آخرت کے پہلے شرف قدم بوسی حاصل کر لیتا۔
بیگم صاحبہ آداب و تسلیم عرض کرتی ہیں۔
ہم لوگوں کی طرف سے بحضور جناب چچی اماں صاحبہ
مدظلہا آداب و تسلیم فرما دیجیگا، سایۂ عاطفت
ممدود زیاد فقط زیادہ حدِ ادب

فدوی امداد امام عفی عنہ

ممتاز علی ایڈیٹر تہذیب نسواں کا خط

بنام صغریٰ بیگم سید ہمایوں مرزا

لاہور۔ جمعرات۔　　۲۹ دسمبر سنہ ۲۸ء

پیاری بیٹی صغریٰ۔ بعد دعا ہائے فراوان
واضح ہو کہ تمہارا محبت نامہ ملکر بے انتہا خوشی
ہوئی۔ چونکہ تم نے مجھے یہ لکھا ہے کہ آپ مجھے اپنی
بیٹی سمجھیں۔ اس لیے میں یہ خط بیٹی ہی کی طرح
لکھ رہا ہوں۔ میں پہلے بھی تم کے لفظ سے خط و کتابت

کیا کرتا تھا۔ لیکن اُس وقت تم میرے ذہن میں کم عمر متصور ہوئی تھیں۔ پھر جب موقع ملاقات کا ہوا تو عمر زیادہ پاکر میں آپ کے لفظ سے مخاطب ہوا۔ اب اپنی بیٹی جان کر پھر اُسی طرح خطاب کر رہا ہوں جس طرح اپنی پیاری وحیدہ کو خط لکھا کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ تمھیں مع اپنے شوہر محترم کے خوش اور خیریت سے رکھے اور حکیم نابینا صاحب کا علاج راس لائے کہ آپ پورے تندرست ہو کر وطن کو جائیں۔

میں ضرور آتا مگر ڈیرہ اسمٰعیلخاں سے اطلاع آئی کہ سید نذر الباقر صاحب والد مسز سجاد حیدر کا یک بیک حرکت قلب کے بند ہو جانے سے انتقال ہوگیا۔ میں وہاں جانے والا ہوں۔ مگر تمھاری موجودگی ہی میں مجھے سخت قبض ہوگیا تھا جو بعد جاری رہا۔ اس سے میں بہت ڈرتا ہوں اور یہ سفر میں زیادہ ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ جلاب لینے کے بعد جاؤ۔ مگر جلاب سے میرے امعا میں بہت گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ میں غذا سے درستی کی کوشش کر رہا ہوں۔ ساگ پر زیادہ زور دے رکھا ہے اور موٹے آٹے کا حریرہ گڑ کا کھاتا ہوں۔ اس میں گھی ڈال کر قبض دُور ہو جائے تو میں ڈیرہ اسمٰعیل خاں جاؤں۔

تمھارے جانے کے بعد ہمارا گھر بہت سُونا سُونا معلوم ہونے لگا۔ بالکل سُنسان، خاموش اور بے رونق۔ مگر رفتہ رفتہ اپنی قدیمی بے رونقی کا عادی ہو جاؤنگا۔

تمہارا بار بار ہنسنا اور ہنستے وقت شرم سے ہاتھ مُنہ پر رکھ لینا، بہت یاد آتا ہے۔ مُنیا بار بار یاد کرتی اور کہتی ہے کہ اُنھیں پھر بُلالو۔

اللہ پھر خوشی سے ملائے اور دونوں جانب خیریت رکھے۔

مسز شاہ نواز نے اب تک کوئی فارم نہیں بھیجا حالانکہ میاں حمید نے انھیں خط بھی لکھا۔ مہربانی کرکے تم انھیں تاکیدی خط لکھدو اور یہ لکھو کہ "میں سید ممتاز علی صاحب اور مسز حمید سے وعدہ کرچکی ہوں کہ مسز شاہ نواز بچی کو ضرور داخل کروادینگی۔ پس آپ مجھے ان کے آگے شرمندہ نہ کرائیں اور جلد انتظام داخلہ کے کرکے بچی کو خود ساتھ لے جائیں۔ میں بے انتہا شکر گزار ہوں گی۔"

اس طرح کا خط اپنے دوسرے حالات کے ساتھ جلد لکھ دیجئے۔

سید صاحب محترم کے اشعار اور لکچر نما تقریریں بہت یاد آتی ہیں۔ کاش میرا حافظہ ہوتا اور ان جواہر ریزوں کو محفوظ رکھ سکتا۔ ان سے مل کر دل بہت ہی خوش ہوا۔ اس نمونے کا بیرسٹر پنجاب میں تو ایک بھی نہیں۔ یہاں کے بیرسٹروں میں تو بوٹ سوٹ کے سوا اور کچھ بھی نہیں نہایت بدمذاق، ناسخن شناس، بے علم ہیں۔ ان میں صاحب لوگیت کے سوا کچھ نہیں۔ اللہ آپ کے شوہر محترم کو تا دیر سلامت باکرامت رکھے۔ کاش حیدرآباد نزدیک ہوتا اور میں آسانی سے

مل سکتا۔ یا تم دس بارہ برس پہلے میری بیٹی بنی ہوئیں تو پیاری بیٹی اب ختم کرتا ہوں۔ قلم سے بوجہ رعشہ لکھ نہیں سکتا۔ پنسل سے بہت آہستہ آہستہ مشکل سے لکھا جاتا ہے۔ اتنا لکھنے میں ایک گھنٹے سے کم نہیں لگا۔ ثریا تم دونوں کو اداب کہتی ہے اور سب عزیز سلام کہتے ہیں۔ حمید بیرسٹر صاحب کو بہت یاد کرتے ہیں۔ عزیزی حیدر صاحب کو بھی میرا اسلام شوق پہنچا دیجئے۔ اب بالکل رخصت محبت کے ساتھ

ممتاز علی

مکرر آنکہ۔ اس وقت بارش ہو رہی ہے۔ چائے کا وقت ہو گیا تھا۔ میرا کوئی آدمی چائے بنانے والا نہ تھا۔ دلہن نے اوپر سے چائے بھیجی ہے اور ساتھ کچھ پکوان۔ میں خط بند کرنے نہ پایا تھا کہ چائے آ گئی۔ میں نے یہ بھی خط میں درج کر دیا۔ لو اب تو سچ مچ ختم و الدعا۔

ممتاز علی

شاد عظیم آبادی کا خط

بنام سید ہمایوں مرزا

دوم جولائی ۱۹۰۹ء عظیم آباد

حبیب محتشم عزیز مکرم دام لطفکم بعد سلام شوق و اشتیاق دیدار کے واضح خدمت ہو یہ خط میرا عزیز از جان مسٹر محمد سلیمان صاحب اور برادر شفیق سید ہمایون میرزا صاحب دونوں حضرات کے نام نامی سے ہے۔ کیفیت یہ ہے کہ بعد تشریف بری آپ کے مولوی سید نور الدین احمد صاحب وکیل میری ملاقات کو تشریف لائے اور از راہِ عنایت مجھ سے فرمایا کہ آپ حیدرآباد کا ضرور قصد کیجئے اور وہاں آ کر میرے گھر میں چندے قیام کیجئے میں اپنے گھر میں ایک مجلس سید الشہدا برپا کر کے فخر الملک وغیرہ اُمرا سے آپ سے ملوا دُونگا (چونکہ اِدھر میں نے بہت سے مرثیے نظم کئے اور مجالس میں خود پڑھے اور ان کی رونق اور تعریف بے حد و حساب ہوئی چنانچہ ایک مجلس عظیم الشان میں اکثر حضرات بیرسٹر بھی شریک تھے اور یک زبان ہو کر بے حساب داد دی اسلئے ہمارے نو دمیاں کو بہت جوش پیدا ہوا اور یہ صلاح دی)

اوسکے جواب میں اپنے عزیز مسٹر سلیمان صاحب کی رائے ظاہر کی کہ بغیر خط سفارشی مسٹر پلوڈن صاحب کے آنا اچھا نہیں معلوم ہوتا با ایں ہمہ آج میں صاحب کمشنر بہادر سے ملنے گیا تھا چونکہ چند روز بعد لفٹنٹ گورنر آنے والے ہیں ایک قطعہ اُن کے ورود کیلئے حسبِ معمول نظم کر کے کمشنر صاحب کو دکھانے گیا تھا مجھ سے بے اختیار خود کہنے لگے کہ آپ کے لئے ہم حیدرآباد جانا بہت پسند کرتے ہیں اگر آپ کہئے تو ہم مسٹر پلوڈن صاحب کو چھٹی لکھ دیں بشرطیکہ آپ جانے پر مستعد ہو جئے میں نے کہا کہ میرے دو عزیز بیرسٹر بالفعل حیدرآباد میں پریکٹس کرتے ہیں میں اُن سے صلاح کر کے آپ کی خدمت میں عرض کرونگا۔

اس وقت یہ خط اس لئے آپ کی خدمت میں

بھیج رہا ہوں ذیل کی باتوں کا جواب دیجئے اور خوب سوچ کر میرے حق میں جو مناسب ہو وہ لکھئے

(۱) خط صاحب کمشنر پٹنہ بنام رزیڈنٹ کافی ہوگا یا اور کچھ بندوبست کریں یعنی کلکتہ جاکر اور اور انگریزوں سے بھی کہیں۔

(۲) اگر کمشنر صاحب سے خط لکھوائیں تو اُس کا کیا مضمون ہو۔

(۳) اپنے لڑکے کو ساتھ لائیں یا نہیں مشکل یہ ہے کہ بغیر لڑکے کے زیادہ قیام میرا ناممکن ہوگا۔

(۴) ایسی حالت میں میرے خرچ آمد ورفت کو پانچ سو روپے کافی ہونگے یا نہیں۔

(۵) لباس کس قسم کا وہاں درکار ہے؟ مطلب یہ ہے کہ جو لباس کی قطع ہے وہ بدلنا ناممکن مگر قسم پارچہ کیا ہو۔

(۶) مولوی خدا بخش خاں صاحب سے امید نہیں، شاید حافظ صاحب بھی کچھ معین ہوں تو اپنے وہاں آنے کی خبر اُن کو خواہ مولوی سید حسن صاحب کو دینا چاہئے یا نہیں۔

(۷) رزیڈنٹ کے ذریعے سے مکان قیام مجھے مل سکتا ہے یا نہیں۔

امید ہے کہ آپ لوگ خوب سوچ بچار کر اس کا جواب تحریر فرماکر مجھ کو مشکور احسان فرمائیے تاکہ اگر میرے ہزار پانچ سو خرچ ہوں تو بیکار نہ جائیں۔

یہاں گرمی کی شدت ہے ایک دو پانی برسا ہے مگر کافی نہیں ہے۔

باقی سب خیریت ہے فقط

آپ کا دعاگو

سید علی محمد شاد غفرلہٗ

رباعیات

گر گل کی ہوس ہے تو کچھ خاروں سے
لے درس حقیقت کا نوافسانوں سے
احساس غم و درد مٹا دے یاں تک
کہ نغمہ کی پیدا ہو ترے نالوں سے

(۲)

یوں ہمدمو! مشکل کو تم آساں کر لو
بجلی کو نشیمن کا نگہباں کر لو
چھوڑو کوئی اچھی سی نشانی اپنی
مرنا ہے یہاں جینے کا ساماں کر لو

(۳)

اے دوست بتا دے مجھے کچھ رازِ حیات
قبل اس سے کہ اڑ جائے یہ شہبازِ حیات
کس نے چھیڑا ہے اور کیونکر چھیڑا؟
دلچسپ ہے بسکہ نغمۂ سازِ حیات

(۴)

سننے کو نصیحت تجھے خود گوش نہیں
غفلت میں تو مدہوش ہے کچھ ہوش نہیں
دیتے ہیں خبر خزاں کی گل گلشن میں
گویا ہے زبانِ غنچہ خاموش نہیں

منشی محمد عطاء اللہ عطا کلیانی

سب رس معلومات

(ضمیمہ سب رس)

کمال اتا تُرک

غازی مصطفےٰ کمال پاشا جو ۱۸۸۱ء میں سیلونیکا میں پیدا ہوئے، بیسویں صدی کے ایک بہت بڑے آدمی ہیں۔ انھوں نے ایک غریب گھرانے میں جنم لیا تھا، اور ان کے والد علی رضا کروڑگیری کے ایک معمولی عہدہ دار تھے جو ان کے بچپن ہی میں انتقال کر گئے، مگر اس ہونہار بچے کے سر پر اس کی والدہ زبیدہ کا سایہ تھا جو مصطفےٰ کے لئے بڑی نعمت تھی۔ زبیدہ نے سب سے پہلے ایک قدیم مکتب میں مصطفےٰ کی تعلیم کا انتظام کیا تاکہ اس کو مذہبی باتوں سے پوری واقفیت ہو جائے۔ اس کے ایک سال بعد مصطفےٰ ایک ثانوی مدرسے میں منتقل کئے گئے، جہاں ان کی ذاتی قابلیت اور پوشیدہ جوہر نے ان کو تعلیمی وظیفے اور "کمال" کے لقب سے سرفراز کیا۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصطفےٰ کمال کو تعلیم کی نسبت درج سے زیادہ دلچسپی تھی، چنانچہ وہ مدرسہ چھوڑ کر بھاگ نکلے اور سیلونیکا کے ایک فوجی مدرسے میں شریک ہو گئے۔ یہاں انھوں نے زیادہ دلچسپی اور انہماک سے کام کیا، اور بہت سے امتیاز حاصل کئے۔

جس زمانے میں مصطفےٰ سنِ شعور کو پہنچے وہ ایک پُر آشوب زمانہ تھا۔ ترکی کی فضا پر ظلم وجور، ذلت اور بےبسی چھائی ہوئی تھی۔ سلطان عبدالحمید خاں کے عہد میں عثمانی ترکوں کی حکومت آخری سانسیں لے رہی تھی۔ ایک وہ زمانہ بھی تھا کہ سلطان سلیم اور سلیمان کا مقابلہ دُنیا کی کوئی طاقت نہ کر سکتی تھی۔ سات سرزمینیں اور سات سمندر ان کے قبضے میں تھے۔ مگر زمانے نے ایسا پلٹا کھایا کہ علم و تدبر کے مالک تعیشات کے غلام بن گئے۔ سلاطین عیاشی میں پڑ گئے، فوج بے سری رہ گئی اور حکومت نا اہلوں کے ہاتھوں میں آ گئی جن کا شعار ظلم وجبر اور کمزور عوام کو کچلنا تھا۔ رعایا تباہ تھی۔ کوئی غیرت مند نوجوان جاسوسوں کے ہاتھ سے محفوظ نہ تھا۔ ملک کی ابتری سے فائدہ اُٹھا کر یورپی حکومتوں نے سلطنت کے حصے بخرے کرنے شروع کئے۔ برطانیہ نے مصر دبا لیا، اور فرانس نے ٹیونس۔ بلقان کی ریاستیں ایک ایک کر کے آزاد ہو گئیں۔ روس کی یہ حالت تھی کہ جب کبھی موقع ملتا قسطنطنیہ پر چڑھ دوڑتا۔ خود سلطنت میں عیسائی اقلیتیں یورپی حکومتوں کے بل بوتے پر آئے دن آمادۂ فساد رہتیں۔ نیز سلطنت دیوالیہ ہو چکی تھی اور قرضوں پر حکومت کا کام چلتا تھا۔ ہر نئے قرض دینے والے کو ملک کا کوئی نہ کوئی انتظامی شعبہ سپرد کر دیا جاتا۔ اس کے علاوہ بڑی مصیبت یہ تھی کہ سلطنت میں جو غیر ملکی آباد تھے وہ ترکی قوانین سے بالاتر تھے اور یہ ذلت و استبداد کی انتہا تھی۔ پھر ۱۸۸۶ء کی جنگ میں جو روس اور ترکی کے درمیان ہوئی تھی، ترکی کے ماتھے پر "بیمارِ یورپ" کا دل خراش دھبہ لگ چکا تھا۔ اس ابتری کی تمام تر ذمہ داری سلطان عبدالحمید پر تھی۔ مگر اس کے باوجود وہ ظلِ اللہ کے نام سے پوجے جاتے تھے اور مذہبی طبقے اس کے مظالم کی تائید میں تھے۔ لیکن ملک کے نوجوان جن پر ملک کو تباہی سے بچانے کی بڑی ذمہ داری تھی،

اپنے کو منظم اور مستحکم کرنے لگے۔ چنانچہ نوجوان ترکوں کی بہت سی انجمنیں قائم ہوگئیں اور ان کی یہ کوشش ہونے لگی کہ موجودہ حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے۔ نوجوان مصطفےٰ کمال پر نئے خیالات اور نئی تحریکوں کا جنھیں بڑی حد تک بیرونی انتداب اور انقلاب فرانس کا ردِ عمل سمجھنا چاہیے، بہت زیادہ اثر پڑا اور کمال نے "ترقی پذیر جماعت" میں شرکت کرلی جو ایک بہت بڑی خفیہ جماعت تھی۔ اسی خفیہ جماعت سے کمال کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔ اس وقت تک کمال نے فوجی مدرسوں سے فراغت حاصل کرلی تھی اور اب بائیس سال کی عمر میں قسطنطنیہ کی جنگی اکاڈیمی میں لفٹنٹ ہوگئے تھے اس زمانے میں کمال کے خیالات پر سب سے زیادہ اثر جس چیز کا پڑا وہ ایک ممنوعہ کتاب "وطن" تھی۔ کمال نے اس کتاب کا پرچار کیا، اور اس پر تقریریں کیں اس کے علاوہ انھوں نے اپنی ادارت میں ایک اخبار بھی جاری کیا جو بہ بانگ دہل حکومت کی مخالفت کرتا تھا۔ مگر نوجوانوں کی سرگرمیاں زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکیں چنانچہ ۱۹۰۵ء میں مصطفےٰ کمال اور ان کے ساتھی پکڑ لئے گئے۔ کمال کو فوج میں لفٹنٹ بناکر وطن سے دُور دمشق بھیج دیا گیا، مگر یہاں ان کو اپنی جد و جہد کے لئے زیادہ آزادی ملی۔ چنانچہ "وطن" کے نام سے ایک انجمن بنی اور فوج کے نوجوان افسر اس میں شریک ہوئے۔ اسی سلسلے میں کمال سیلونیکا پہنچے، مگر چونکہ حکومت کے جاسوسوں کو اس کی خبر ہوگئی تھی اس لئے وہ بھاگ نکلے چند دنوں بعد فوجی وزارت میں تبدیلیاں ہوئیں اور کمال سیلونیکا کی فوج میں آگئے جو انقلابی جماعتوں کا مرکز تھا۔ اب انھوں نے اپنی پوری قوت کے ساتھ کام کرنا شروع کیا؛ اور موجودہ دو بڑی خفیہ انجمنوں یعنی "آزاد جماعت" اور "ترقی پذیر جماعت" کو متحد کردیا۔ کمال اس نئی "انجمن اتحاد و ترقی" کے سرگرم رکن بن گئے اور انور و جمال کے ساتھ کام کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ انجمن اتحاد و ترقی اتنی طاقتور ہوگئی کہ ۱۹۰۸ء میں سلطان دستوری حکومت قائم کرنے پر مجبور ہوا، اور ایک پارلیمنٹ بنا دی گئی۔ بعد میں سلطان نے اپنے اقتدار کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کی تو انھیں معزول کردیا گیا، اور وہ نظربند ہوگئے اب ملک کے نوجوانوں نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی اور نا اہل لوگ برطرف ہوگئے۔

مگر اس نئے دَور کو شروع ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا کہ ملک پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے! اس نازک وقت میں جبکہ ترکی فوج منظم نہ ہوسکی تھی اور ترکوں کے پاس سمندری بیڑا بھی نہ تھا، اٹلی نے طرابلس پر حملہ کردیا۔ جوں توں کرکے انور اور مصطفےٰ کمال طرابلس پہنچے اور عربوں کی مدد سے دشمنوں کو روکنا چاہا۔ وہ اس طرف متوجہ ہی تھے کہ بلقان کی مملکتوں نے قسطنطنیہ پر چڑھائی کردی۔ ترکوں نے تو دونوں جگہ مقابلہ کیا مگر ان کو ہر محاذ پر شکست ہوئی، اور ترکوں نے جن لوگوں پر برسوں حکومت کی تھی ان کے ہاتھوں ذلتیں اٹھانی پڑیں۔ انور اور کمال طرابلس سے وطن واپس آئے تو کمال کو اور زیادہ مزاحمتوں کا مقابلہ کرنا پڑا کیونکہ اب سلطنت کے سیاہ و سپید کے مالک انور، طلعت اور جمال ہوگئے تھے اور پارلیمنٹ صرف نام کو باقی تھی۔ ان تینوں نے کمال کو نظرانداز کردیا

اور اپنے معاملات سے بے دخل کرنے کے لئے انھیں صوفیا کی ترکی سفارت میں بھجوا دیا۔ پھر جب سنہ ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم شروع ہوئی اور ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا تو انور نے جو اب وزیر جنگ تھے کمال کو صوفیا ہی میں رہنے دیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ سنہ ۱۹۱۵ء میں کمال سخت بیمار ہو گئے اس بنا پر وہ قسطنطنیہ پہنچے اور چند دنوں بعد صحت ہوئی تو ان کو درہ دانیال کی حفاظت پر متعین کیا گیا۔ برطانوی فوجیں پوری طاقت سے درہ دانیال پر حملہ کر رہی تھیں، مگر مصطفےٰ کمال کی حیرت انگیز شجاعت اور جنگی مہارت نے معجزہ دکھایا اور بے بس ترکوں نے دنیا کی زبردست سلطنت کو شکست دی چنانچہ انگریز درہ دانیال سے بری طرح پسپا ہوئے اس کا اثر یہ ہوا کہ ترکی میں مصطفےٰ کمال کا نام خوب چمکا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ کمال کے حریف انھیں آگے بڑھنے نہیں دیتے تھے۔ مگر دوسری طرف جنگ طول کھینچی تو جرمنوں کے ساتھ ترک بھی ہر محاذ پر شکست کھانے لگے۔ عربوں نے بغاوت کر دی اور عراق و فلسطین کی طرف سے انگریزوں نے پیش قدمی شروع کی۔ اس نازک وقت میں سلطان کی طرف سے کمال کو ہدایت ہوئی کہ فلسطین کے محاذ جنگ پر روانہ ہو جائیں۔ مگر فلسطین میں دشمن کا روکنا آسان نہ تھا۔ کمال پیچھے ہٹتے گئے اور فلسطین، دمشق اور حلب سب ہاتھ سے نکل گئے۔ مگر مسلسل شکستوں کے بعد جب وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے موجودہ ترکی سرحد پر پہنچے تو انھوں نے کہا کہ اب ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹ سکتا اور وطن کی سرزمین پر دشمنوں کے ناپاک قدم نہیں آسکیں گے۔ مگر اس وقت تک عارضی صلح کا اعلان ہو چکا تھا، چنانچہ جنگ رک گئی اور کمال قسطنطنیہ آگئے۔

مصطفےٰ کمال کی غیر معمولی قابلیت اور ان کے پوشیدہ جوہر کے ساتھ ساتھ انھیں کچھ غیبی امداد بھی تھی چنانچہ ایک موقع پر جب ان کے دشمن کی گولی لگی تو انھیں کوئی ضرر نہیں پہنچا اور انھوں نے نہایت اطمینان کے ساتھ اپنی جیب سے ایک گھڑی نکال ڈالی جو گولی کی زد سے ٹوٹ گئی تھی۔ یہی نہیں بلکہ بہت سے موقعوں پر یہ خطرے سے بال بال بچ گئے۔ اس کے معنے صاف طور پر یہ تھے کہ قدرت کو کمال کے ہاتھوں ترکی کی خدمت کروانی منظور تھی۔ مگر مشکل یہ تھی کہ جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد مصطفےٰ کمال کے لئے بہت سی گتھیاں تھیں۔ سلطان وحیدالدین نے برطانیہ کے ساتھ سازش کر لی تھی۔ دشمنوں کی فوجیں قسطنطنیہ پر قابض تھیں اور ان کے جہاز آبنائے باسفورس پر جمے ہوئے تھے۔ یہ ایسا نازک موقع تھا کہ ملک میں ہر طرف مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ انور پاشا وغیرہ ترکی سے بھاگ گئے تھے اور اب پرانے عافیت پسندوں کا راج دوبارہ قائم ہو گیا تھا جو ترکی کے اقتدار کو کھو کر انگریزوں کی غلامی اختیار کرنا پسند کرتے تھے۔ اس کٹھن گھڑی میں مصطفےٰ کمال اٹھے اور ملک کے نوجوانوں کو جن کی رگوں میں زندگی اور حمیت کا خون دوڑ رہا تھا، ایک جگہ جمع کیا۔ یہ نوجوان جن پر ایک بھاری ذمہ داری تھی اپنی قوم کو موت سے بچانے کی فکر کرنے لگے۔ اسی اثناء میں مصطفےٰ کمال مشرقی مقبوضات کے قائد اعلیٰ بنے اور انگورہ کی طرف بھجوائے گئے تاکہ وہ عارضی صلح کی شرائط کے بموجب فوج کو برخاست کر کے ہتھیار جمع کر لیں۔ اس موقع کو مصطفےٰ کمال نے

بہت غنیمت جانا اور انھوں نے فوج کی تنظیم شروع کردی اور اپنے ہم وطنوں کو آنے والے غلامی کے عذاب سے ڈرایا اس کا اثر یہ ہوا کہ "مرد بیمار" نے پھر سے کروٹ لی اور اپنا علاج آپ کرنے پر تیار ہوگیا چنانچہ سلطنت کے ہر طبقے اور سمت کے لوگ مصطفےٰ کی طرف کھنچے چلے آئے۔ زندگی کی اس نئی روح سے سلطان وحیدالدین اور اتحادی گھبرائے مگر کمال ان کے قابو سے باہر ہوچکے تھے۔ مجبور سلطان نے اتحادیوں کی شہ پر کمال اور ان کے ساتھیوں کو باغی قرار دیا اور شیخ الاسلام نے ان پر کفر کا فتویٰ صادر کیا اس کا اثر یہ ہوا کہ خلیفہ کے ہمدرد ان لوگوں کی سرکوبی کے لئے قسطنطنیہ سے روانہ ہوئے، مگر اسے اتفاق ہی کہنا چاہیے کہ عین اس وقت عہدنامہ سیورے کا اعلان ہوا اس کی رو سے ترکی کے سب مقبوضات اس سے چھین لئے گئے، قسطنطنیہ پر اتحادیوں کا قبضہ مانا گیا، سمرنا یونانیوں کو بخشا گیا اور انگورہ کی مختصر سرزمین ترکی کے حصے میں رہی۔
ان زیادتیوں کا ایک مفید نتیجہ یہ نکلا کہ ترک قوم اب اپنے زندگی اور موت کے سوال کو حل کرنے کھڑی ہوگئی اور تمام ترکوں نے کمال کا ساتھ دیا۔ سواک کے مقام پر اسمبلی کی بنیاد رکھی گئی اور خلیفہ عبدالمجید خاں کے احکام کو ماننے سے انھوں نے انکار کردیا۔

ادھر یونانیوں نے سمرنا پر قبضہ کرنے کے بعد آگے بڑھنا شروع کیا، اور ترکوں کو پیچھے ہٹاتے نئے پایہ تخت انگورہ کے قریب تک پہنچ گئے اس پر ترکوں کے خون نے جوش کھایا اور سقاریہ کے میدان میں دونوں کا مقابلہ ہوا۔ اکیس دن کی معرکہ آرائی کے بعد ترکوں نے فتح حاصل کی اور انھوں نے سمرنا تک کا علاقہ یونانیوں سے دوبارہ حاصل کرلیا اس کے بعد ترک قسطنطنیہ کی طرف بڑھے اور انگریزوں کو مقابلہ کی دعوت دی مگر انگریز جو ابھی جنگ عظیم کے بعد سستانے نہ پائے تھے، ترکوں سے نہ لڑسکے اور انھوں نے صلح کی بنیاد ڈالی چنانچہ معاہدۂ لوزان میں ترکوں کے تمام مطالبات مان لئے گئے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قسطنطنیہ پر پھر سے پرچم ہلال لہرانے لگا اور باسفورس سے انگریزوں کے جہاز نکال دئے گئے۔ یورپی علاقے کو بھی انھوں نے حاصل کرلیا اور تمام اجنبی مراعات ختم کردیں ترکی کے حدود معین کئے اور ایک جمہوری دستور سے ملک کو سرفراز کرکے پارلیمنٹی حکومت قائم کردی جس کا صدر مقام انقرہ (انگورہ) قرار پایا۔ مصطفےٰ کمال ترکی کے پہلے صدر ہوئے اور انھوں نے صحیح معنوں میں ملک کی قیادت کی۔

اسے مصطفےٰ کمال کی اولوالعزمی ہی کہنا چاہیے کہ دو سال کے اندر ترک قوم پھر سے زندہ ہوگئی اور اپنے پیر پر آپ کھڑے ہونے کے قابل ہوگئی۔ کمال سب سے پہلے آدمی ہیں جنھوں نے اتحادیوں کے بنائے ہوئے معاہدے کو ٹھکرایا اور دوسری مظلوم قوموں کو زندگی کا سبق دیا۔ دو سال کی قلیل مدت میں یورپ کے "مرد بیمار" کو جس کے ہاتھ پیر بالکل شل ہوچکے تھے، طاقتور قوموں کی صف میں اس طرح لاکر کھڑا کردینا کہ اچھے سے اچھے مرد تندرست اور ہر بڑی طاقت کا مقابلہ کرسکے، کوئی معمولی بات نہ تھی۔ یہ کمال کا معجزہ تھا۔ ترکی کی زندگی اور موت کا سوال

دنیائے اسلام کی زندگی اور موت کا سوال تھا کیونکہ دنیائے اسلام ترکی کو اپنا نمائندہ سمجھتی ہے۔ چنانچہ جب ترکی پر مصیبت آئی اور ایک طرف سے انگریزوں اور باغی عربوں، اور دوسری طرف سے یونانیوں نے ترکی کو کچلنا چاہا تو ساری اسلامی دنیا میں سخت پریشانی سی پھیل گئی اور پوری دنیا کے مسلمان ہر طرح ترکی کی مدد کرنے کے لئے تیار ہو گئے تھے، مگر جب کمال نے فوق العادت ہمت سے کام لیا اور ترکوں کو زندہ کر دیا تو وہ دنیائے اسلام کی آنکھوں کا تارا بن گئے اور سب مسلمان کمال کو اپنا رہنما سمجھنے لگے۔ صرف یہی نہیں بلکہ کمال اتاترک نے دنیا کی دوسری قوموں کو بھی زندہ رہنے کا طریقہ بتایا اور یہ ان کا بہت بڑا احسان ہے مسولینی نے انہی سے بصیرت حاصل کی اور ہٹلر نے انہی کے نقش قدم پر چل کر معاہدۂ ورسائے کے پرخچے اڑا دیئے اور اپنی قوم کو اس قابل بنا دیا کہ ورسائے میں زیادتیاں کرنے والوں سے پورا بدلہ لے سکے۔

کمال کی کامیابی کا بڑا راز ان کی سیاسی حکمت عملی اور خارجی مسلک میں ہے ملک کی اندرونی اصلاح کے لئے باہر سے اطمینان حاصل کرنا ضروری تھا اور اسے کمال اچھی طرح سمجھ گئے تھے! اس کے لئے انھوں نے دشمنوں اور دوستوں سبھی کو اپنا ہموار بنانے کی کوشش کی۔ روس سے، جس کے ساتھ ترکوں کی بہت پرانی اور قومی دشمنی تھی، دوستی کی۔ مگر قابل تعریف بات یہ ہے کہ اس دوستی کے باوجود اشتمالیت کی مسموم ہوائیں ترکی کا رخ نہ کر سکیں۔ یونان جس نے ترکوں کو پریشان کیا تھا اور جو بعد میں ترکوں سے پٹ چکا تھا، اس سے بھی صلح، صفائی کی اور راہ و رسم پیدا کیا۔ برطانیہ اور فرانس سے جو ترکی کے سخت دشمن تھے اور جنھوں نے ترکی کو پریشان کر کے اس کے بہت سے علاقے دبا لئے تھے، اب کمال نے دوستی کر لی بلکہ موقع سے فائدہ اٹھا کر فرانس سے اپنے بہت سے مطالبات بھی منظور کرا لئے۔ پھر جرمنی سے بھی دوستی قائم رکھی، اور روس و برطانیہ کی دوستی کے باوجود جرمنی کے ساتھ اچھے تعلقات برابر قائم رکھنا ترکوں کی بڑی حکمت عملی سمجھی جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ اس انوکھے مسلک کی وجہ سے کمال کو ترکی کی اندرونی اصلاح کا بہت اچھا موقع ہاتھ آیا۔ اگرچہ کمال نے ترکی کے کندھے سے استبداد کا جوا اتار پھینکا تھا اور ترکوں میں زندگی کی ایک نئی روح پھونک دی تھی مگر اب نئی زندگی کے ساتھ ترکی کو ایک نئے جسم کی بھی ضرورت تھی۔ ترکوں کا جسم قومی انحطاط سے کمزور پڑ گیا تھا۔ سالہا سال کی مسلسل جنگوں سے ملک کا برا حال ہو گیا تھا۔ غیر ملکی تجارت اور صنعت پر قبضہ جمائے ہوئے تھے۔ زراعت پیشہ اب سپاہی بن گئے تھے اور ملک کی زراعت ختم ہو رہی تھی۔ سرمایہ دار طبقے عیش پسند زندگی کے سبب زمین کی پیٹھ کا غیر ضروری بوجھ ہو گئے تھے۔ ملک میں تعلیم نہ تھی۔ علماء ہر نئی چیز کے دشمن اور اپنے مفاد کی خاطر ہر طرح کی قربانی کرنے آمادہ تھے۔ ظاہر ہے کہ ترکی کے ایسے جسم کو بدلنا کمال کے لئے ضروری تھا، چنانچہ انھوں نے ترکی قوم کو نئی زندگی اور نئی روح کے ساتھ ایک نیا قالب بھی دیا جو نئی زندگی

برسوں کی انتھک کوششوں، خونریزیوں، سازشوں، بغاوتوں اور جنگوں کے بعد نوجوان کمال کو ملی تھی اس زندگی کی بقا کے لئے اس نے وہ سب کچھ کیا جو وہ کرسکتا تھا جس جذبے نے طرابلس اور بلقان کی جنگیں سر کیں، اور جس روح نے درہ دانیال سے برطانیہ کو ہٹایا اور سقاریہ میں یونانیوں کو شکست دی، وہی جذبہ اور وہی روح اب ترکی کے نئے جسم کی تعمیر میں کارفرما ہوگئی۔ کمال نے دشمنوں کے خون میں نہا کر اپنی قوم کی رہنمائی کی تھی اور اسی کا نتیجہ ہے کہ وطن کی خاطر انھوں نے اپنے دشمنوں اور دوستوں دونوں کو کچلا، اور اگر یہ سنگدلی اور سختی تھی تو نئے جسم کی تعمیر کے لئے یہ ضروری تھی۔ کمال نے خلیفہ اور سلطان کے ڈھونگ کو ختم کیا، علماء کا زور توڑا جو قوم کی زندگی کے لئے وبال بن چکے تھے۔ جو لوگ مذہب کی آڑ میں ہر نئی چیز کی مخالفت کرتے تھے، وہ گولی کا نشانہ بنے، پیر، مجاور، صوفی اور بھک منگے فقیر جو قوم کا خون چوس رہے تھے، سب ختم ہوئے۔ بے حس عوام میں وطنیت کا جذبہ مفقود ہوچکا تھا، کمال نے ان میں حب وطن پیدا کیا جو ایمان کا جزو ہے۔ عوام جاہل تھے، ان کو علم سے سرفراز کیا۔ عیسائی مشنریوں کا سدباب کیا جو قوم کو سخت نقصان پہنچا رہے تھے۔ ترکوں میں زراعت کا شوق پیدا کیا اور زرعی تعلیم کا بڑا انتظام کیا۔ لوگوں کو قانون کے ذریعہ صنعت و حرفت کے قابل بنایا۔ بچوں اور بڑوں میں قومی کاموں کا احساس پیدا کیا۔ عورتوں کو جو پردے میں بیٹھ کر عمریں ضائع کرتی تھیں کاروبار میں لگایا۔ پرانی چیزوں کو بہت مقدس سمجھا جاتا تھا، کمال نے ان کے خلاف بغاوت کی اور سب پرانی چیزیں ختم ہوئیں۔ ترکی ٹوپی اور پردہ سب رخصت ہوئے۔ حتیٰ کہ ترکوں کو پیام سلام کے نئے طریقے بتائے گئے اور پرانے عاجزی کے سلام بدل گئے، اور موسیقی جو صرف رونے دھونے کے جذبات پیدا کرسکتی تھی، اب ختم ہوئی اور اس میں نئی زندگی آگئی۔

کمال اتاترک کے تمام کارنامے ترکی کی شاندار تاریخ کے زرین ورق ہیں۔ ان کی عجیب و غریب اور حیرت انگیز شخصیت ہر قدم پر اپنا لوہا منواتی تھی۔ ان کے کام بڑے تھے جس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ انھوں نے اس جمود کو جو صدیوں سے اسلام کی روح کو مسخ کررہا تھا، توڑ دیا اور نئی نسل پر بہت بڑا احسان کیا۔ ان کی بڑائی کا ایک بڑا ثبوت یہ بھی ہے کہ جو ان کے دشمن تھے وہ دوست بن گئے اور جو انھیں کافر کہتے تھے وہ "مرد مومن" کہنے لگے۔ وہ صحیح معنوں میں مرد مومن تھے اور مسلمانوں اور خصوصاً ترکوں کے بہت بڑے محسن۔ ۲۱ نومبر ۱۹۳۸ء کو وہ دنیا سے رخصت ہوگئے، مگر ان کی روح ترکوں کے زندہ قالب میں ہمیشہ زندہ رہے گی اور ان کی ذات جس نے خود جل کر افق اسلام کو روشن کیا، نوجوانوں کے دلوں میں نئی نئی امنگیں اور آرزوئیں پیدا کرتی رہے گی جو ان کی بقا کے لئے ضروری ہے۔

(عبدالحفیظ صدیقی)

ہماری غذا

یہ سوال کہ ہمارے کھانے پینے کی چیزیں کن اشیا سے مرکب ہیں، اپنے اندر بہت سی دلچسپیاں رکھتا ہے کیونکہ ہماری غذا جن عناصر اور مرکبات پر مشتمل ہے وہ بظاہر بہت حقیر معلوم ہوتے ہیں اور ایک عام انسان کا خیال اس طرف جا بھی نہیں سکتا کہ یہ چیزیں ہماری غذا کے اجزا ہوں گی لیکن ایک سائنس داں کی نظر جو ہر وقت کسی نہ کسی شے کے تجزیہ اور ترکیب کی تلاش میں رہتی ہے، ہر چیز کو اپنے خاص انداز سے دیکھتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اکثر و بیشتر بال کی کھال بھی نکال لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہماری غذا کا سوال ہماری اولین توجہ کا محتاج ہے۔ اگر ہم کو یہ نہ معلوم ہو کہ ہماری غذا کی ترکیب کیا ہے اور غذا کا ہر جزو ہماری زندگی پر کیا اثر رکھتا ہے تو یہ بہت بڑی ستم ظریفی ہوگی اور اپنے آپ پر ایک بڑا ظلم۔ بات یہ ہے کہ جو اجزا ہماری غذا کو بناتے ہیں ان میں سے ہر ایک کا ایک خاص فعل ہوتا ہے اور ہر جزو ہمارے جسم کے کسی نہ کسی عضو کی خدمت کرتا ہے۔ اگر ہماری غذا میں کسی جزو کی کمی ہو جائے تو اس کے نتائج کسی نہ کسی بیماری یا کسی عضو کی کمزوری کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اس لئے ایک محتاط اور حکمی زندگی کے لئے یہ ضروری ہے کہ غذا کی ترکیب معلوم کی جائے اور اس کے مفید اجزا سے فائدہ اٹھایا جائے۔

ہماری غذا حسب ذیل اشیا پر مشتمل ہوتی ہے:۔

(۱) پروٹین:۔ یہ ان مرکبات کا نام ہے جن کے اجزا کاربن، ہیڈروجن، آکسیجن، نائٹروجن اور گندک جیسے عناصر ہیں اور ان کو نائٹروجنی مرکبات کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ پروٹین کا فعل یہ ہوتا ہے کہ جسم کی بافتوں کو قوی بنائے اور اگر ان میں کسی قسم کی خرابی پیدا ہو جائے تو اسے دور کرے۔ پروٹینی غذا میں انڈا (البیومن) گوشت، گیہوں، دودھ، مٹر، بنس اور دالیں ہیں۔

(۲) کاربوہیڈریٹ:۔ یہ ایسے مرکبات کا نام ہے جو صرف کاربن، ہیڈروجن اور آکسیجن پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اس کے ماخذ سبزی اور ترکاریاں ہیں، اور اس کا فعل یہ ہے کہ یہ توانائی پیدا کرتا ہے اور حرارت غریزی اور چربیاں بھی اسی سے پیدا ہوتی ہیں۔

مثالیں:۔ نشاستہ خواہ کسی اناج سے ہو شکر۔ دودھ کی شکر اور جگر سے حاصل کیا ہوا نشاستہ۔

(۳) چربیاں:۔ ایسے مرکبات جو کاربن، ہیڈروجن اور آکسیجن پر مشتمل ہوتے ہیں۔ یہ حرارت اور توانائی پیدا کرتے ہیں۔

مثالیں:۔ مسکہ، گھی، اور دوسرے نباتی تیل۔

پروفسر ہارون خان صاحب شروانی
صدر شعبہ تاریخ جامعہ عثمانیہ

(۴) معدنی نمک :۔ ان میں معمولی نمک یا سوڈیم کلورائیڈ سب سے اہم ہے اس کی بدولت ہیڈروکلورک ترشہ پیدا ہوتا ہے جو ہضمی رس کے لئے ضروری ہے۔ چونے کے فاسفیٹ بھی جو غذا کے اہم ٹکڑوں سے ہے، ہڈیوں کو مضبوط بنانے کے لئے ضروری ہے اور لوہے کے نمک بھی کافی اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ انہی سے خون کا سُرخ مادّہ یعنے ہیموگلوبن پیدا ہوتا ہے۔

(۵) پانی :۔ غذا ہضم ہو جانے کے بعد پانی اس ہضم شدہ غذا کو حل کرتا ہے اور غذا کی تحلیل میں مدد دیتا ہے۔ اس کے علاوہ پانی کا بڑا فعل یہ ہے کہ خون کو سیال حالت میں رکھتا ہے اور اخراج میں مدد کرتا ہے۔

(۶) ویٹامن :۔ یہ ان اشیا کا گروہ ہے جو ہماری غذا کے سب سے اہم اجزا ہیں اور جو ہماری صحت اور نشو و نما کے لئے بیحد ضروری ہیں۔ ویٹامن کی ترکیب ابھی تک اچھی طرح سمجھ میں نہ آسکی بگران میں بہت سے ایسے ہیں جن کو کیمیائی اور فعلیاتی لحاظ سے اچھی طرح سمجھا گیا ہے۔ اب تک کوئی چھ ویٹامن دریافت ہوئے ہیں۔ اے، بی (یا بی) بی۲ (یا جی) سی، ڈی اور ای۔ ان میں کے چار یعنے ویٹامن بی، بی، سی اور ڈی اب کیمیاوی طور پر الگ کرلئے گئے ہیں۔ تمام ویٹامن فعلیاتی لحاظ سے اہمیت رکھتے ہیں اور ہر ایک کے جداگانہ افعال ہیں۔ یہ سب تازہ غذا میں موجود ہوتے ہیں۔ (ع۔ ح۔ ص) (نوٹ:۔ ویٹامن پر ایک تفصیلی مضمون آئندہ اشاعت میں آئے گا)

آئندہ امتحانات

امتحان مقابلہ برائے انڈین ملٹری اکاڈیمی اور رائل انڈین نیوی :۔

انڈین ملٹری اکاڈیمی ڈیرہ دون اور رائل انڈین نیوی میں شرکت کے لئے فیڈرل پبلک سروس کمیشن کی طرف سے ایک امتحان لیا جائے گا جو ۲۷ مارچ ۱۹۴۰ء سے دہلی میں ہوگا۔ ملٹری اکاڈیمی کے لئے امیدواروں کی عمر ۱۸ سال سے کم اور ۲۰ سال سے زائد نہ ہونی چاہیے، اور انڈین نیوی کے لے ۱۷ سال سے کم اور ۱۹ سال سے زائد نہ ہونی چاہیے۔ شرکت کے لئے درخواستیں ۶ جنوری ۱۹۴۰ء تک فیڈرل پبلک سروس کمیشن کے دفتر میں وصول ہو جانی چاہئیں۔ درخواستوں کے ساتھ ساڑھے سات روپیے فیس بھی بھجوانی ضروری ہے۔ انتخابات کے بعد پچاس روپیے داخل کرنے ہوں گے۔ اس امتحان کی شرائط یہ ہیں کہ امیدوار شادی شدہ نہ ہوں۔ منتخب امیدواروں کے ضامنوں کو ہر طرح کی ذمہ داری لینی چاہیے کہ امیدوار کے والدین یا سر پرست ٹریننگ سے متعلق امیدوار کی تمام مالی ضروریات پوری کریں گے۔ اور اگر کسی وجہ سے امیدوار ملازمت کو قبول نہ کرے تو وہ اس پوری رقم کی پابجائی کریں گے جو امیدوار پر خرچ کی گئی ہے۔

شرکت کی درخواستیں اور قواعد امتحان مقامی حکومتوں سے حاصل کئے جاسکتے ہیں اور حیدر آباد کی حد تک حسب ذیل پتوں سے :-

سکرٹری صاحب، رزیڈنٹ بہادر، رزیڈنسی حیدر آباد
معتمد صاحب، محکمۂ سیاسیات سرکار عالی و ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سکندر آباد
جوڈیشل افسر اورنگ آباد

کھیل

کھیلوں کے امتیازات :-

ڈیوس کپ کے نتائج :-

۱۹۳۲ء میں .... فرانس نے امریکہ کو شکست دی ــــــ ۳-۲
۱۹۳۳ء میں .... انگلستان نے فرانس کو شکست دی ــــــ ۳-۲
۱۹۳۴ء میں .... انگلستان نے ممالک متحدہ امریکہ کو شکست دی ــــــ ۴-۱
۱۹۳۵ء میں .... " " " " ــــــ ۵-۰
۱۹۳۶ء میں .... انگلستان نے امریکہ کو شکست دی ــــــ ۳-۲
۱۹۳۷ء میں .... ممالک متحدہ امریکہ نے انگلستان کو شکست دی ــــــ ۴-۱

حسب ذیل ومبل ڈن ٹینس میں ممتاز رہے :-

سال	سنگلز (مرد)	سنگلز (عورتوں کا)
۱۹۳۳ء	جے کرافورڈ (آسٹریلیا)	مسز ولز موڈی (ممالک متحدہ امریکہ)
۱۹۳۴ء	ایف پیری (انگلستان)	مسز ڈروتھی راؤنڈ (انگلستان)
۱۹۳۵ء	" " "	مسز ولز موڈی (ممالک متحدہ)
۱۹۳۶ء	" " "	مس ایچ جیکبس (ممالک متحدہ)
۱۹۳۷ء	ڈونال بج (ممالک متحدہ)	مس ڈی۔ راونڈ (برطانیہ)
۱۹۳۸ء	" " (" ")	مسز ولز موڈی (ممالک متحدہ)

حسب ذیل باکسنگ میں ممتاز ہیں :-

فلائی ویٹ (۱۱۲ پونڈ) ــــــ بینڈ کین (انگلستان)

بنٹم ویٹ (۱۱۸ پونڈ) سکسٹو اسکوبارل۔ فدر ویٹ (۱۲۶ پونڈ) ہنری آرم اسٹرانگ (ممالک متحدہ)۔ لائٹ ویٹ (۱۳۵ پونڈ) ہنری آرم اسٹرانگ (ممالک متحدہ)۔ ولٹر ویٹ (۱۴۷ پونڈ) ہنری آرم اسٹرانگ (ممالک متحدہ)۔ مڈل ویٹ (۱۶۰ پونڈ) فریڈ اپاشلی (ممالک متحدہ)۔ لائٹ ہیوی ویٹ (۱۷۵ پونڈ) ایف۔ ایچ۔ لوئیس (ممالک متحدہ)۔ ہیوی ویٹ (زائدازہ ۱۷۵ پونڈ) جو لوئی (متحدہ)

ڈربی: ۱۹۳۲ء۔ اپریل دی ففتھ (مالک مسٹر ٹی۔ وال)۔ ۱۹۳۳ء۔ ہائی پیرین (مالک لارڈ ڈربی)۔ ۱۹۳۴ء ونڈسر لیاڈ (مالک مہاراجہ راج پیپلا)۔ ۱۹۳۵ء۔ بہرام (مالک ہز ہائنس آغاخان)۔ ۱۹۳۶ء۔ محمود (" ہز ہائنس آغاخان)۔ ۱۹۳۷ء۔ مڈ ڈے سن (" مسٹر جی۔ ملر)۔ ۱۹۳۸ء۔ بوئی روسل۔ ۱۹۳۹ء۔ بلیو پیٹر (مالک لارڈ روز بیری)۔

مہدی جنگ ٹینس:۔ حیدرآباد میں ۱۳ ردسمبر سے مہدی جنگ ٹینس چمپین شپ ٹورنمنٹ کے کھیل شروع ہوئے ہندوستان کے مشہور کھلاڑی نمبر (۱) غوث محمد اور نمبر (۲) افتخار، اور ان کے علاوہ نارائن راؤ اور راما راؤ وغیرہ بھی اس میں شریک تھے۔ ۱۶ ردسمبر کو غوث محمد (ہندوستان نمبر ۱) اور افتخار احمد (ہندوستان نمبر ۲) کے درمیان سنگلز کا فائنل ہوا۔ غوث نے افتخار کے مقابلے میں کامیابی حاصل کی۔ ۱۷ ردسمبر کو سولہ سال سے کم عمر کے بچوں کا کھیل ہوا جس میں سجاد نے مقصود علی خاں کو شکست دی۔ اس کے بعد ڈبلز کا مقابلہ ہوا جس میں غوث، افتخار اور نارائن راؤ و راما راؤ نے حصہ لیا۔ غوث اور افتخار نے پہلا سٹ ۶۔۴ پر دوسرا ۶۔۲ پر لیا۔ تیسرا سٹ نارائن راؤ اور راما راؤ نے ۷۔۵ پر لیا، اور چوتھے سٹ میں غوث اور افتخار نے ۶۔۴ سے کامیابی حاصل کی اور اس طرح فائنل جیت گئے۔

(بقیہ مضمون "حالات حاضرہ") روس کے حصے میں یہ علاقے آئے:۔ یوکرین، وہ علاقے جہاں سفید روسی آباد ہیں اور رومانیہ و ہنگری کی سرحدوں کے قریب کا وہ ضلع جہاں پولستانی تیل کا مخزن ہے! اور اس کے علاوہ پولستان کے باقی حصے جرمنی کو ملے۔ اس تقسیم کا اثر یورپی سیاست پر:۔ (۱) اتحادی روس کے مخالف ہو گئے (۲) جرمنی کے حصے میں پولستان کا زیادہ علاقہ آیا مگر پٹرول کے قیمتی ذخائر روس کی ملکیت میں آگئے (۳) روس کی سرحدیں ہنگری اور رومانیہ سے مل گئیں اور یہ صورت حال بلقان کے لئے بہت خطرناک تھی لیکن ترکی کے اتحادیوں کے ساتھ مل جانے کی وجہ سے بلقان میں روس کی سرگرمیاں ابھی شروع نہ ہو سکیں اور اس نے بالٹک کی مملکتوں کی طرف توجہ کی۔

بالٹک کی مملکتیں:۔ موجودہ جنگ سے روس نے بہت زیادہ فائدہ اٹھایا۔ بحر بالٹک روس کے لئے بہت اہمیت رکھتا ہے اور اسی وجہ سے روس کی نظریں بالٹک کی مملکتوں پر ایک عرصے سے لگی ہوئی تھیں۔ اب بین الاقوامی صورت حال کی نزاکت سے روس کو اچھا موقع ہاتھ آگیا اور اس کا ارادہ یہ ہے کہ یکے بعد دیگرے بالٹک کی تمام مملکتوں کو ہضم کیا جائے۔ سب سے پہلے روس نے اسٹونیا، لٹویا اور لتھونیا کے ساتھ باہمی تعاون کے معاہدے طے کئے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ روس کو اپنی قلعہ بندیوں اور ہوائی و بحری مرکزوں کی تعمیر کے لئے ان مملکتوں میں جگہ مل گئی۔ جرمنی کی قلت کو جو لٹویا میں .... ۵ کی تعداد میں مشتمل تھی ہٹلر کے حکم کی بنا پر ۴۸ گھنٹوں کے اندر ان مملکتوں سے چلے جانا پڑا۔ ان لوگوں کو ہٹلر نے پولستان میں بسانا چاہا، اور جرمنی کی اقلیتیں جو بلقان میں آباد تھیں ان کو بھی پولستان میں آکر بس جانے کا حکم ملا۔

حالاتِ حاضرہ

ڈانزگ اور پولستان :-

۱۹۳۹ء کا سب سے بڑا واقعہ جنگ یورپ کی ابتدا ہے۔ اب اس جنگ کو شروع ہوئے صرف چار مہینے ہوئے ہیں اور ڈانزگ کے سوال سے اس کی ابتدا ہوئی تھی۔ واقعہ یہ تھا کہ جرمنوں نے ڈانزگ میں اپنی قلعہ بندی کرنی شروع کی جو اگست کے مہینے میں مکمل ہوگئی اور ۲۲ اگست کو ڈانزگ کے نازی لیڈر ہر فورسٹر آزاد شہر ڈانزگ کے صدر بھی بنا دئے گئے۔ چونکہ یہ پولستان کی بندرگاہ تھی اس لئے یہ ایک دست درازی کے مترادف تھا۔ نازیوں کی اس نقل وحرکت کے صاف معنے یہ تھے کہ ہٹلر جمہوری مملکتوں کو دعوتِ مقابلہ دے رہا تھا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ پولستان، برطانیہ اور فرانس جنگ کے لئے تیار ہوگئے۔ جمہوری مملکتیں پولستان کو بچانا اس وجہ سے اپنا فرض سمجھتی تھیں کہ از روئے معاہدہ وہ اس کے ساتھ تھیں، اور پولستان کی شکست ایک طرح سے جمہوری مملکتوں کی شکست تھی۔

پہلی ستمبر کو تو ایک نیا شگوفہ کھلا۔ ہر فورسٹر نے مجلس اقوام کے عطا کردہ دستور کو منسوخ کر دیا اور اس اعلان کے بعد کہ اب ڈانزگ جرمنی سے ملحق ہو چکا ہے، ڈانزگ میں نازی دستور کا نفاذ کر دیا۔ اس کے جواب میں ہٹلر نے اس الحاق کی توثیق کر دی اور فورسٹر کو ڈانزگ کا صدر اعلیٰ بنا کر اس کے تمام نظم ونسق کا اسے ذمہ دار قرار دیا۔ ڈانزگ کے الحاق کے بعد اسی روز نازی فوجیں پولستانی "گذرگاہ" میں داخل ہوگئیں اور اس کے بعد طیاروں نے وارسا پر بم باری شروع کر دی۔ ۴۸ گھنٹوں کے اندر پولستان پر کوئی ۹۴ ہوائی حملے ہوئے اور پولستانی شہر اور دیہات پر خوب بم برسائے گئے۔ پولستانیوں کے دل نا تواں نے بھی مقابلہ کیا اور بجائے اس کے کہ ہٹلر کی شرطوں کو مان لیں اور غلامی کی زندگی اختیار کریں، بہادروں کی طرح لڑ کر مرنے کو ترجیح دی۔ مگر یہ ناتواں اور زبردست کا مقابلہ تھا۔ انگریز اور فرانسیسی راست پولستان کی مدد نہیں کر سکے۔ چنانچہ اس دلیری کے باوجود پولستانی بہادر جرمنوں کے مقابلے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پولستان ختم ہوگیا اور جرمنی و روس نے جو بعد میں جرمنی کے ساتھ اتحاد کر کے مشرق کی طرف سے پولستان میں گھس آیا تھا اس ملک کے حصے بخرے کر لئے۔

اتحادی :-

پولستان پر حملہ ہوتے ہی انگریز اور فرانسیسیوں نے بھی جرمنی کے ساتھ لڑائی کے لئے کمر باندھی برلن کے

انگریز سفیر مسٹر ہنڈرسن نے ستمبر کی پہلی تاریخ سے چوتھی تک جرمنی اور برطانیہ کے مابین سمجھوتہ کرانے کی پوری کوشش کی مگر ان کی تمام کوششیں ناکام ہوئیں۔ اس بنا پر ۴ ستمبر کو دن کے سوا گیارہ بجے برطانیہ نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ان جدید حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے برطانیہ کی وزارت میں بعض ضروری تبدیلیاں بھی ہوئیں اور ایک جدید کابینہ کی تشکیل عمل میں آئی جس کے حسب ذیل عہدہ دار مقرر ہوئے :-

مسٹر چیمبرلین، صدر اعظم۔ سر جان سائمن، چانسلر آف دی اکسچیکر وزیر مالیات۔ لارڈ ہیلی فاکس، وزیر خارجہ۔ لارڈ چیٹ فیلڈ، وزیر مدافعت۔ مسٹر چرچل، امیر البحر۔ مسٹر ہور بلیشا، وزیر جنگ۔ سر چارلس کنگس لی وڈ، وزیر ہوائیہ۔ سر سیمول ہور، لارڈ پریوی سیل۔ سر جان اینڈرسن، نائب لارڈ پریوی سیل

ان کے علاوہ مسٹر ایڈن وزیر مقبوضات بنائے گئے جن کو کابینہ میں بیٹھنے کا خاص دیا گیا۔ اور لارڈ ہینکی وزیر بلا قلمدان مقرر ہوئے۔

برطانیہ کے ساتھ فرانس نے بھی ۴ ستمبر کو اعلان جنگ کر دیا اور جرمنی کے خلاف بحری، برّی اور ہوائی جنگ کا آغاز ہو گیا۔ فرانسیسی فوجیں زیگفریڈ لائن کی طرف پیش قدمی کرنے لگیں اور آہستہ آہستہ آگے قدم بڑھانے لگیں۔ عربی علاقے جو فرانس کے زیر انتداب تھے، ہٹلر کی مخالفت پر آمادہ ہو گئے اور جمہوری مملکتوں کے ساتھ اپنی ہمدردی ظاہر کر دی جو عربی ملک برطانیہ کے زیر اقتدار تھے انھوں نے بھی اتحادیوں کا ساتھ دینے پر رضامندی ظاہر کی چنانچہ شام، ٹیونس، ماورائے زوردان، عراق، مصر اور فلسطین سب اتحادیوں کے ساتھ ہو گئے۔ سلطنت برطانیہ کے قلمروؤں نے بھی اس اڑے وقت میں ساتھ دیا۔ چنانچہ آسٹریلیا، کناڈا اور نیوزی لینڈ نے سب سے پہلے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ جنوبی افریقہ میں جنرل ہرٹزوگ جو اس لڑائی میں غیر جانبدار رہنا چاہتے تھے، کامیابی ہوئی چنانچہ اس قلمرو نے بھی جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا، اور برطانوی ہند کی طرف سے والسرائے بہادر نے بھی اس بات کا اظہار کیا کہ ہندوستان برطانیہ کی تائید کے لئے تیار ہے۔ چند دنوں بعد ترک بھی انگریزوں سے متحد ہو گئے لیکن ان کے علاوہ بعض مملکتیں غیر جانبدار بھی ہیں اور وہ یہ ہیں :-

سیام، جاپان، اطالیہ، اسپین، ممالک متحدہ امریکہ، مکسیکو، آئرستان اور بلقان، اسکان ڈی نیویا اور بالٹک کی مملکتیں۔

جرمنی کی آب دوزیں :-

جنگ کے پہلے دو ہفتوں میں جرمنی کی آب دوز کشتیاں بہت سرگرم عمل تھیں چنانچہ ۴ ستمبر کو برطانیہ کا بڑا جہاز "اتھی نیا" ڈبو یا گیا۔ جہاز کے (۱۴۰۰) آدمیوں میں نصف سے زائد ڈوب گئے اور باقی لوگوں کی جان

بمشکل بچائی گئی۔ ایک اور جہاز جس کا نام "کرے جیبس" ہے، دو آب دوزوں کے حملے کا شکار رہا۔ مسٹر چرچل کے بیان کے مطابق یہ بہت بڑا نقصان تھا۔ مگر انگریزوں نے جن کو اپنی بحری قوت پر پورا بھروسہ ہے، ایک طویل جنگ کے لئے تیاری کر لی اور جرمنی کے مقابلے میں ڈٹ گئے۔ مسٹر چیمبر لین نے اعلان کیا کہ ہم کو کم از کم تین سال کی جنگ کے لئے تیار رہنا چاہیے۔ دوسری طرف سے ہٹلر نے جواب دیا کہ جرمنی آٹھ سال کے بعد بھی شکست نہیں کھا سکتا اور جرمن قوم پھر کبھی ایسے معاہدہ کے لئے تیار نہیں ہوگی جیسے پچھلی جنگ کے بعد معاہدۂ ورسائے ہوا تھا۔"

جرمنی:۔

جرمنی کی کابینۂ جنگ جس کی تشکیل ۳۱ اگست کو ہوئی حسب ذیل افراد پر مشتمل تھی:۔

فیلڈ مارشل گوئرنگ، صدر۔ ہرہس، ہٹلر کے نائب۔ ہرفرک، مختار کل (نازی نظم و نسق کے)

ڈاکٹر فنک، مختار امور معاشی ڈاکٹر لیامس، وزیر ملک اور صدر رائش چانسلری جنرل کیٹال سپہ سالار

جرمنی میں گرفتاریاں:۔

۸ نومبر کی رات میں جب ہٹلر میونچ کے ہال سے جرمنوں کے ایک بڑے مجمع کو مخاطب کر کے واپس ہوا تو اس کے ۱۰ منٹ بعد ایک بم کا حادثہ ہوا جس میں ہٹلر تو بچ گیا لیکن چھ آدمی مرے اور ۶۰ کے قریب زخمی ہوئے۔ ہٹلر نے خود تحقیقات کی اور بہت سے آدمی گرفتار ہوئے۔ جرمنی میں بہت سے آدمیوں نے جنگ کے خلاف پروپگنڈا کرنا شروع کیا تھا اس لئے ہٹلر اس قسم کا پروپگنڈا کرنے والوں کو گرفتار کرنے لگا چنانچہ تقریباً (۱۸۰) آدمی قید کر لئے گئے۔ سابق قیصر جرمنی کے چوتھے لڑکے شہزادہ اگسٹ ولہلم کو بھی شبہہ کی بنا پر گرفتار کیا گیا جرمنی کے سابق سپہ سالار فیلڈ مارشل فان بلومبرگ اور دوسرے پرانے فوجی عہدہ دار بھی گرفتار ہوئے بلکہ ایک غیر مصدقہ خبر کی رو سے بلومبرگ کو گولی سے مار دیا گیا اور اس کی وجہ اب تک معلوم نہیں ہو سکی۔

پراگ کے ہنگامے:۔

پراگ بھی سیاسی آشوب سے خالی نہیں ہے چنانچہ یہاں سیاسی شورش کی بنا پر چند طالب علم گرفتار ہوئے تھے جب اس کے خلاف دوسرے طلبا نے احتجاج کیا تو تقریباً ۱۲۰۰ طالب علم گرفتار کر لئے گئے اور فوجی قانون نافذ کر دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ پراگ میں ایک دن کے اندر ۱۲۴ چک قید کئے گئے۔ ۸۰۰۰ طلبا کو گرفتار کیا گیا اور ۲۰۰۰۰ مسلح آدمی زیر حراست ہیں۔

اطالوی کابینہ:۔

اطالوی کابینہ میں بھی بعض اہم تبدیلیاں عمل میں آئی ہیں، کیونکہ معلوم ہوتا ہے کہ کابینہ کے وزیروں نے استعفیٰ دے دیا۔ سینیر اسٹیریس جو فاشسٹی جماعت کے معتمد ہیں مستعفی ہو گئے اور ان کو فاشسٹی فوج کا چیف آف دی سٹاف

بنادیا گیا ہے۔ مارشل گریزیانی، چیف آف دی آرمی اسٹاف۔ سینیر الغیری، سفیر۔ جنرل ٹروزی وزیر اطالوی افریقہ مقرر ہوئے اور سینیر آرس ساٹڈرو، پاپولر کلچر کے وزیر بنائے گئے۔

روس کا مسلک:۔

جس وقت ڈانزگ کا سوال پیدا ہوا تھا اور جرمنوں نے ڈانزگ کو بغیر لڑائی کے ہضم کرنا چاہا تو برطانیہ اور فرانس کو روس کے آئندہ مسلک کے متعلق تشویش ہوگئی۔ انھوں نے روس کو اپنی "امن پسند برادری" میں شامل کرنا چاہا تھا اور اس سلسلے میں ان جمہوری مملکتوں کے نمائندے ایک عرصے سے روس کے ساتھ گفت وشنید میں مصروف تھے لیکن بدقسمتی سے حالات نے ایک نازک صورت اختیار کرلی اور اتحادیوں کی کوششیں بے کار ثابت ہوئیں، کیونکہ اچانک یہ معلوم ہوا کہ روس نے جرمنی کے ساتھ ایک معاہدہ عدم اقدام پر دستخط کردئے ہیں اور برطانیہ، فرانس کو جرمنی سے لڑنے کے لئے تنہا چھوڑ دیا۔ اگرچہ جمہوری مملکتوں نے اس عدم اتحاد کی ذمہ داری روس پر عائد کی مگر روسی وزیر خارجہ مولوٹوف نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ برطانیہ اور فرانس اس ناکامی کے ذمہ دار ہیں کیونکہ انھوں نے بات چیت میں بہت سا وقت لے لیا۔ روس اس شرط پر جرمنی کے خلاف معاہدہ میں شریک ہونا چاہتا تھا کہ اس میں بالٹک کی مملکتیں یعنے لیتھونیا، لٹویا، اسٹونیا اور فن لینڈ بھی شریک ہوں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ان مملکتوں کو حفاظت کی ضمانت دی جائے مگر چونکہ وہ آزاد مملکتیں تھیں اس لئے وہ اس قسم کی ضمانت کے لئے راضی نہ ہوئیں اور اتحادیوں کی بات چیت کے ناکام رہنے کا سبب بن گئیں۔ روس نے اتحادیوں کے سامنے جو دوسری شرط پیش کی وہ یہ تھی کہ روسی فوجوں کو ڈانزگ تک جانے کے لئے پولستان میں سے حق راہ دیا جائے تاکہ روس جرمنی کے خلاف عملی طور پر پولستان کی مدد کرسکے، مگر پولستان اس شرط پر تیار نہیں ہوا اور اسی بنا پر روس نے پولستان کی مدد کرنے سے انکار کردیا۔ اس نازک صورت حال سے ہٹلر نے فائدہ اٹھایا اور روس سے معاہدۂ عدم اقدام پر دستخط کرالئے۔

روس اور جرمنی کا معاہدۂ عدم اقدام:۔

روس اور جرمنی کے معاہدۂ عدم اقدام سے پہلے برلن میں ان دونوں مملکتوں کے درمیان ایک تجارتی معاہدہ بھی طے پایا تھا جس پر ۲۰/ آگست کو دستخط ہوگئے۔ اس معاہدے کی روسے جرمنی نے سات سال کے لئے روس کو بیس کروڑ مارک پانچ فی صد شرح سود سے قرض دے دئے تاکہ روس دو سال کے اندر جرمنی سے سامان خریدے۔ اس کے علاوہ یہ بھی طے پایا کہ جرمنی دو سال کے اندر روس سے اٹھارہ کروڑ مارک کی پیداوار خام خریدے، اور معاہدۂ عدم اقدام ماسکو میں ۲۳/ آگست کو طے پایا جس پر مولوٹوف اور فان ربن ٹراپ نے اسٹالن اور جرمن سفیر فان شولن برگ کے سامنے دستخط کئے۔ یہ معاہدہ سات دفعات پر

مشتمل ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:۔ اس مدعا کے لئے کہ جرمنی اور روس کے درمیان امن قائم رہے اور اس قدیم رشتے کی بنا پر جو اپریل ۱۹۲۶ء کے معاہدۂ غیر جانبداری کے وقت قائم ہوا تھا، جرمنی اور روس کی حکومتوں کے مابین ذیل کا معاہدہ طے پایا:۔ (۱) فریقین معاہدہ ایک دوسرے پر کسی قسم کا دباؤ ڈالیں گے اور نہ ایک دوسرے پر یا کسی ملحقہ یا حلیف ملک پر حملہ کر سکیں گے۔ (۲) اگر فریقین معاہدہ میں سے کوئی فریق کسی تیسری طاقت کے ساتھ حالت جنگ میں ہو تو دوسرا فریق اس تیسری طاقت کی کسی طرح مدد نہیں کرے گا۔ (۳) فریقین کی حکومتیں آئندہ ایک دوسرے سے مشورہ کرتی رہیں گی تاکہ جن معاملات میں دونوں کا مفاد وابستہ ہے ان سے پوری واقفیت رہے۔ (۴) فریقین میں سے کوئی فریق دوسری طاقتوں کے کسی ایسے متحدہ گروہ سے نہیں مل سکے گا جو بالواسطہ یا بلا واسطہ کسی ایک فریق کا مخالف ہو۔ (۵) اگر دونوں کے درمیان کسی قسم کا اختلاف یا کوئی نزاعی مسئلہ پیدا ہو تو دونوں مل کر ان جھگڑوں کو دوستانہ طریق پر طے کریں گے اور اگر ضرورت ہو تو ایک کمیشن کے ذریعہ ان مسائل کو حل کیا جا سکے گا۔ (۶) اس معاہدے کی مدت دس سال ہوگی، مگر اختتام مدت سے ایک سال پہلے کوئی فریق اس معاہدہ کو ختم کرنا چاہے تو وہ دوسرے فریق کو اس کی اطلاع دے۔ ورنہ مدت معاہدہ میں خود بخود پانچ سال کی توسیع ہو جائے گی۔ (۷) اس معاہدے کی برلن میں بہت جلد توثیق کی جائے گی اور توثیق سے متعلق دستاویزات کا تبادلہ بھی وہیں ہوگا۔

اس معاہدے کے اثرات:۔ روس اور جرمنی کے اس معاہدے کا سب سے بڑا اثر یہ ہوا کہ یورپی طاقتوں کا توازن بگڑ گیا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ترازو کا پلڑا کچھ جرمنی کی طرف جھک گیا۔ فاشسٹی حلقوں میں بھی اس معاہدے کا اثر محسوس ہوتا ہے۔ چنانچہ اس معاہدے کی بنا پر اطالیہ اور جرمنی کی دوستی تقریباً ختم ہو گئی اور جاپان، جرمنی سے برہم ہو گیا۔ ادھر اسپین سے جنرل فرانکو نے اس معاہدے سے ناراضگی ظاہر کی اور ہٹلر کی دوستی چھوڑ دی۔ روس کو پوری سیاست میں عمل دخل کا اچھا موقعہ مل گیا۔ روس کو دوست بنانے کی وجہ سے جرمنی کو پولستان کے حملے میں بڑی مدد ملی۔

پولستان کی تقسیم:۔ جب پولستان جرمنی کے مقابلے میں برسرپیکار تھا تو مشرق سے سرخ فوجیں پولستان میں داخل ہو گئیں۔ روس کے پولستان میں گھس آنے کی وجہ یہ بتائی گئی کہ اس کو یوکرین وغیرہ کی قلتوں کی حفاظت کرنی ضروری تھی۔ جب روسی پولستان میں داخل ہوئے تو ان کی کسی نے مزاحمت نہیں کی چنانچہ ان لوگوں نے پولستان کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کر لیا۔ سرمایہ دار اور زمیندار گرفتار کر لئے گئے اور پولستانی عہدہ داروں کو گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ جرمنی اور روس دونوں حکومتوں نے مل کر پولستان کو آپس میں بانٹ لیا۔ (بقیہ مضمون صفحہ ۱۱۱ پر)

عہد آفریں مشین پریس میں چھپ کر دفتر ادارۂ رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا۔ اڈیٹر عبدالحفیظ صدیقی بی۔ ایس۔ سی

مستقبل

چلا آ رہا ہے　　چلا آ رہا ہے
چلا آ رہا ہے　　چلا آ رہا ہے

دھڑکتے دلوں کی صدا آ رہی ہے
اندھیرے میں آوازِ پا آ رہی ہے
بلاتا ہے کوئی ندا آ رہی ہے

چلا آ رہا ہے　　چلا آ رہا ہے
چلا آ رہا ہے　　چلا آ رہا ہے

نہ سلطانیٔ تیرگی ہے نہ زاری
نہ تختِ سلیماں نہ سرمایہ داری
غریبوں کی چیخیں نہ شاہی سواری

چلا آ رہا ہے　　چلا آ رہا ہے
چلا آ رہا ہے　　چلا آ رہا ہے

اڑاتا ہوا پرچمِ زندگانی
سناتا ہوا عہدِ نو کی کہانی
جلو میں ظفرمندیاں شادمانی

چلا آ رہا ہے　　چلا آ رہا ہے
چلا آ رہا ہے　　چلا آ رہا ہے

سفینہ مساوات کا کھے رہا ہے
جوانوں سے قربانیاں لے رہا ہے
غلاموں کو آزادیاں دے رہا ہے

چلا آ رہا ہے　　چلا آ رہا ہے

مخدوم محی الدین

نیا سال مبارک!!

سب رس کا اردو نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ہم نے بڑی محنت سے اسے شایع کیا ہے اس میں زیادہ تر مضامین اردو ہی سے متعلق ہیں تاکہ آپ انہیں پڑھیں اور اپنی زبان کی ترقی کے لیے کوشش کریں۔ اردو دنیا کی جدید زبانوں میں سے ہے اس نے بہت کم مدت میں کافی ترقی کی ہے۔ اس میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ایک مشترکہ زبان ہے جسے ہر شخص بول سکتا اور سمجھ سکتا ہے اردو سے متعلق تفصیلی حالات آپ کو سب رس پڑھنے سے معلوم ہوں گے اردو میں ایسی خوبیاں موجود ہیں جو کسی اور زبان میں نہیں پائی جاتیں ہم کو کوشش کرنی چاہیے کہ اسے ترقی دیں اسی مقصد کے لیے ۲۵ ڈسمبر ۱۹۳۹ء شام میں ۵ بجے ادارہ کے ایک نئے شعبہ کا قیام عمل میں آیا جس میں طبقۂ فوقانیہ تک کے طلبہ شریک تھے۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور معتمد ادارہ نے اس جلسہ کی صدارت فرمائی ایک ننھے طالب علم نے "بچے کی دعا" سے جلسہ کا آغاز کیا پھر صدر نشین نے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی اس کے بعد انتخابات عمل میں آئے۔ رحیم الدین صاحب ظہیر آبادی نائب صدر، معین الدین احمد انصاری معتمد، مجید احمد صاحب فاروقی نائب معتمد، اراکین کابینہ، شعیب اللہ خاں صاحب، حبیب احمد صاحب، محمد علی صاحب جماعت اول۔ خدا بخش صاحب سلیم، عارف علی صاحب انصاری۔ عبدالرزاق صاحب۔ محی الدین علی صاحب۔ معتمد کے شکریہ کے بعد جلسہ برخاست ہوا اور اس کے بعد مجلس انتظامی کا اجلاس منعقد ہوا جس میں آئندہ تقریر کے لیے یہ عنوان مقرر کیا گیا "ہندوستانی طلبہ کو فوجی تعلیم لازمی ہے" جلسہ ۱۶ اسفندار ۱۳۴۹ف م ۱۹ جنوری ۱۹۴۰ء بوقت ۴ ساعت شام منعقد ہوگا۔ فوقانی جماعتوں تک کے طلبہ اس جلسے میں شریک ہو سکتے ہیں۔

نومبر کے پرچے میں جو معمہ دیا گیا تھا اس کے حل بہت سے وصول ہوئے۔ مگر ایک بھی صحیح نہ تھا اسی وجہ سے انعام کسی کو نہیں دیا گیا۔

معمہ کا صحیح حل

اردو نمبر کو آپ نے کیسے پایا ہمیں معلوم کیجیے

نوٹ: جن خریدار اصحاب کے چندے ختم ہو گئے ہیں۔ براہ کرم وہ جلد از جلد نئے سال کا چندہ روانہ کردیں

معین الدین احمد انصاری

پیدائش ۱۸۴۶ء لسان العصر سید اکبر حسین اکبر آبادی وفات ۱۹۲۱ء

ان کا کلام طنزیہ ہوتا ہے جس کی کامیاب ابتدا اردو میں انھیں کے ہاتھوں ہوئی سماج کو انھوں نے اس طرح ہنسایا کہ دل رونے لگا۔

پیدائش ۱۸۶۸ء مصورِ غم علامہ راشد الخیری وفات ۱۹۳۶ء

اردو کے بڑے نثر نگار تھے طرزِ تحریر دردانگیز اور تاثیر سے بھرا ہوا عورتوں کی اصلاح اور ترقی ان کے پیشِ نظر تھی۔

پیدائش ۱۸۳۷ء شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی وفات ۱۹۱۴ء

سرسید کے گہرے دوست تھے اور انہیں کے کہنے پر مسدس لکھا جس نے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے چونکایا۔ جدید اردو شاعری کی بنیاد ڈالی۔

پیدائش ۱۸۱۷ء محسنِ قوم سر سید احمد خاں وفات ۱۸۹۸ء

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی بنیاد ڈالی ان کی زندگی قومی کاموں کے لئے وقف تھی قوم کو غدر کے سیلاب میں بہہ جانے سے بچایا۔

پیدائش ۱۸۳۶ء وفات ۱۹۱۲ء

شمس العلماء حافظ نذیر احمد

اردو ناول نگاری میں زندگی کو جیتا جاگتا پیش کیا۔ قرآن شریف اور کئی انگریزی کتابوں کا اردو میں بامحاورہ ترجمہ کیا اچھے ادیب۔ اچھے مقرر تھے۔

پیدائش ۱۸۷۳ء۔ وفات ۱۹۳۸ء

سر شیخ محمد اقبال

ہندوستان کے بہت بڑے شاعر تھے۔ قومی اصلاح سے شاعری شروع کی جو آگے چل کر انسانیت کی اصلاح کے لئے مستقل پیام بنی۔ زمانہ صدیوں بعد ہی ایسا شاعر پیدا کر سکے گا۔

پیدائش ۱۸۴۴ء مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی وفات ۱۹۱۷ء

نیچرل کے شاعر تھے۔ ان کی نظمیں اردو ادب میں ایک غیرفانی اضافہ ہے۔ مناظرِ فطرت اور قدرت کی کاریگریوں کو اردو ادب میں سب سے پہلے پیش کیا۔

اردو

بچو تمہیں سناؤں اردو کی میں کہانی — دلچسپ داستاں ہے سن لو مری زبانی
کہتے تھے اس کو لشکر، پھر یہ زباں ہوئی ہے — یہ مادری زبانِ ہندوستاں ہوئی ہے
ہندوستاں نے اس کو اپنی زباں بنایا — شاہوں نے اس کا رتبہ دنیا میں ہے بڑھایا
آغوشِ مغلیہ میں برسوں پلی ہے اردو — شمشیر بن کے ان کے منہ سے چلی ہے اردو
شاہانِ ہند نے بھی جینے کا گُر سکھایا — پستی میں یہ پڑی تھی بامِ فلک پہ لایا
"جنت نشانیوں کی" ہے مادری زباں یہ — مشرق کے کارواں کی واحد ہے سارباں یہ
غالب نے اس کی عظمت غالب جہاں میں کر دی — شعر و ادب میں جس نے اک روحِ تازہ بھر دی
مومن، انیس، سودا اردو کے پاسباں تھے — یہ ان کی ہم زباں تھی وہ اس کے ہم زباں تھے
شبلی[1]، نذیر[2]، سید[3]، آزاد[4]، میر، حالی — اردو کے گلستاں میں ان سب نے جان ڈالی
انشا، تراب، آتش، ناسخ، ظفر سبھوں نے — امکان کے موافق خدمات کیں زباں کی
اقبال نے بھی اپنا خونِ جگر دیا تھا — اردو کا جس نے گلشن سرسبز کر دیا تھا
ندوی[5]، نیاز[6] و حق[7] سے پھولی بہارِ اردو — اور "شیخ چاند"[8] بھی تھے خدمت گزارِ اردو
احسان[9]، جوش[10]، اختر[11]، مرزا ادیب، شبلی[12] — کرتے ہیں نگہبانی اردو کی سرزمیں کی
ماہر[13] و ساز، امجد[14] ماہر ہیں اپنے فن کے — سرسبز کرنے والے اردو ترے چمن کے
مخدوم، وجد، سیکش اردو کے نغمہ خواں ہیں — زور[15] اور سروری[16] اس گلشن کے باغباں ہیں
ڈر ہے کہ ہوں نہ عریاں تیرے زبان گیسو — ہندی[17] سے ہو رہی ہے مٹ بھیڑ تیری اردو

پر ہے یقین زاہد عالم میں یہ رہے گی
بن کر زبانِ عالم پھولے گی اور پھلے گی

باقر علی زاہد

---

[1] شبلی نعمانی، [2] نذیر احمد، [3] سر سید، [4] ابوالکلام آزاد، [5] سلیمان ندوی، [6] نیاز فتحپوری، [7] عبدالحق، [8] شیخ چاند، [9] احسان دانش، [10] جوش، [11] اختر شیرانی، [12] شبلی (بی کام)، [13] ماہر، [14] امجد، [15] ڈاکٹر زور، [16] عبدالقادر سروری، [17] موجودہ ہندی اردو نزاع کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

ہمیں اردو سے کیوں محبت ہونی چاہیے؟

پیارے بچو! تمھیں اپنے ماں باپ سے، اپنے بھائی بہن سے، اپنے دوستوں سے محبت ہے۔ تم ان سے بات چیت کرکے ہنس بول کے خوش ہوتے ہو۔ یہی بات چیت تمھاری ان کی محبت کو بڑھاتی ہے۔ جو تمھارے دل میں ہوتا ہے تم ان سے کہتے ہو اور وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں، تم سے کہہ کر خوش ہوتے ہیں۔ ذرا سی دیر کے لئے سوچو کہ تمھارے ماں باپ، تمھارے بہن بھائی، تمھارے دوست تم سے بولنا چھوڑ دیں تو تمھیں کتنی تکلیف ہو؟ زندگی کا لطف آدھا رہ جائے۔ تم یہ محسوس کرو گے کہ تمھاری کوئی بہت قیمتی چیز کھو گئی ہے۔ تمھاری محبت اور دوستی کا رشتہ تمھاری بات چیت ہے۔ جب سے تم نے ہوش سنبھالا بلکہ اس سے بھی بہت پہلے سے جب تم بالکل بچے تھے تم نے اپنی پیاری ماں سے اپنے پیارے ابا سے اپنے چھوٹے بڑے بہن بھائیوں سے اردو میں بات چیت کی۔ پھر تم ہی بتاؤ کہ اردو سے تمھیں محبت کرنی چاہیے یا نہیں؟ اگر تم اردو نہ جانتے ہوتے تو محبت کے جتنے رشتے اب تک تم نے ایک دوسرے سے باندھے ہیں، ان میں سے ایک بھی نہ ہوتا۔

اب ذرا ایک بات اور سوچو تم اپنی ماں سے کھانے پینے کی چیزیں مانگتے ہو اپنے ابا سے بازار سے اچھے اچھے کھلونے اور کپڑے منگاتے ہو۔ بازار جا کر طرح طرح کی چیزیں خریدتے ہو۔ اپنے دوستوں کے ساتھ مل جل کر بیٹھتے ہو۔ ان کی باتیں سمجھتے ہو اور انھیں اپنی باتیں سمجھاتے ہو۔ تمھاری زندگی کی ساری ضرورتیں ایک دوسرے سے بول کر ہی پوری ہوتی ہیں۔ اگر تم بول نہ سکتے تو تمھیں کتنی دقت ہوتی۔ تمھیں کھانے پینے کی چیزیں، پہننے کے کپڑے، کھیلنے کے کھلونے اور اسی طرح کی اچھی اچھی چیزیں ملنے میں کتنی دقت ہوتی۔ تم گونگوں کی طرح اشارے کرتے۔ کبھی کوئی تمھارے اشارے سمجھتا اور کبھی نہ سمجھتا۔ تمھیں الجھن اور تکلیف ہوتی کہ جو کہہ رہے ہو اسے دوسرا سمجھ نہیں سکتا یا جو کچھ تم سے کہا جا رہا ہے وہ تمھاری سمجھ میں نہیں آتا۔ محبت اور ضرورت کے یہ سارے رشتے اس زبان کی وجہ سے قایم ہیں جو تم دن رات ایک دوسرے سے بولتے ہو، جسے تم پیدا ہونے کے بعد سے اب تک اپنی ماں کی گود میں اپنے باپ کے پاس بیٹھ کر اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ کھیل کر سیکھا۔ اس لئے تمھیں چاہیے کہ اس زبان سے محبت کریں۔ اردو ہی کی بدولت تمھیں زندگی کی یہ ساری خوشیاں اور نعمتیں ملی ہیں۔ اس لئے تمھیں چاہیے کہ تم اس کو دل وجان سے زیادہ پیاری سمجھو۔

تم میں سے ہر ایک نے مدرسے میں پڑھا ہے۔ کورس کی کتابیں مثلاً تاریخ جغرافیہ اور حساب کے علاوہ تم نے طرح طرح کی کام کی باتیں پڑھیں۔ اور روز بروز نئی باتیں سیکھیں۔ بتاؤ اگر تم اردو نہ جانتے ہوتے تو تمھیں یہ پیاری پیاری باتیں کیسے معلوم ہوتیں۔ تم "بچوں کی دنیا" اور "سب رس" پڑھتے ہو۔ اچھی اچھی نظمیں اچھے اچھے قصے۔ اچھے اچھے لوگوں کے حالات دنیا کی نئی نئی باتیں تمھیں معلوم ہوتی ہیں اور تمھارا وقت کتنی دلچسپی سے کٹتا ہے۔ تم واقعی کتنے خوش قسمت ہو۔

ذرا سوچو کہ وہ بچے جو اردو سبق نہیں پڑھ سکتے۔ کتنے بدنصیب ہیں کہ انھیں یہ اچھی اچھی باتیں نہیں معلوم ہوتیں۔ انھیں نصیحت کی باتیں نہیں معلوم ہوتیں وہ اچھی باتیں سوچنے اور اچھی باتیں کرنے کے فائدے نہیں جان سکتے۔ اور اس لئے ان کی زندگی بُری کٹتی ہے۔ لوگ ان سے نفرت کرتے ہیں۔ انھیں اچھا نہیں سمجھتے۔ تمھیں سب پیار کرتے ہیں۔ تم سے سب محبت کرتے ہیں۔ تمھیں اچھا سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ تم اردو جانتے ہو۔ اور اردو کی کتابیں پڑھ کر تم نے اچھی اچھی باتیں سیکھی ہیں۔ اب بتاؤ تمھیں اردو سے محبت کرنی چاہیے یا نہیں؟

اردو میں ہزاروں کتابیں ہیں۔ کچھ آج کل کی لکھی ہوئی ہیں اور کچھ اب سے چند سال پہلے لکھی گئی تھیں اور کچھ اب سے سیکڑوں برس پہلے۔ ہر زمانہ میں اچھے اچھے لکھنے والے پیدا ہوئے انھوں نے اردو میں ایک سے زیادہ عمدہ کتابیں لکھیں۔ یہ سب لکھنے والے اب مر گئے مگر انھوں نے جو اچھی باتیں کہی تھیں وہ ان کتابوں کے ذریعہ سے اب تک تمھارے پاس موجود ہیں۔ تمھارے ان بزرگوں نے پرانے زمانہ میں تمھارے ملک میں کیا کیا ترقیاں کیں۔ اسے کس کس طرح اچھا بنایا۔ انھوں نے کیا کیا کہ دنیا آج تک ان کا نام عزت سے لیتی ہے۔ یہ سب باتیں تمھیں ان پرانی کتابوں میں لکھی ہوئی ملتی ہیں۔ تم اگر انھیں پڑھو گے تو تمھیں اپنے پیارے ملک کی ترقی کا حال معلوم ہوگا تم ان باتوں کو پڑھ کر اپنے ملک پر فخر کرو گے۔ تمھیں خوشی ہوگی تم دوسرے لوگوں کے آگے عزت اور فخر کے ساتھ سر اٹھا کر کہہ سکو گے۔ تمھارے دل میں اپنے ملک کی سچی محبت پیدا ہوگی۔ بتاؤ کہ جو کتابیں پڑھ کر تمھارے دل میں اتنی اچھی اچھی باتیں پیدا ہوں ان سے تمھیں محبت ہونی چاہیے یا نہیں؟ تم کہو گے کہ ہاں ضرور ہونی چاہیے۔ اگر تمھارے دل میں یہ خیال اچھی طرح جم جائے گا تو تم خود اردو سے محبت کرنے لگو گے۔

پیارے بچو! اردو سے محبت کئے بغیر نہ تمھاری زندگی اچھی بن سکتی ہے نہ تم ملک کی سچی خدمت کے قابل بن سکتے ہو۔ اس لئے اگر تم چاہتے ہو کہ دنیا کے لوگ اقبال، اکبر، مہاتما گاندھی، جواہر لال اور ابوالکلام آزاد کی طرح تمھارے نام پر فخر کریں تو تم پہلے اپنی پیاری اردو سے محبت کرو کہ اس کی مدد سے دنیا کے بہت بڑے آدمی بن جاؤ۔

ماخوذ از "بچوں کی دنیا"

رمن راج سکسینہ
(سٹی کالج)

زبان اردو کی ترقی

اردو زبان میں علوم و فنون کی کمی ہے لیکن پھر بھی دوسری زبانوں کے خیالات سے اردو کے دامن کو لبریز کرنا چاہیے۔ اگر ہم وطن کی محبت اپنے دلوں میں رکھتے ہیں اور اس کی ترقی اور بہبودی کے خواہاں ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ اُس کی زبان سے بھی محبت کریں اور ہر ممکن طریقے سے اسے ترقی دینے کی کوشش کریں۔ اردو زبان میں ادب کے بیش بہا ذخیرے ملیں گے۔ اور اس دریا میں بھی بہت سے موتی دستیاب ہوں گے۔ اگر ہماری زبان میں کسی چیز کی کمی ہے تو اس کو پورا کرنا چاہیے اور اسے دوسری زبانوں کی طرح ترقی یافتہ بنانا چاہیے۔ اردو زبان کو اگر ہم ترقی دینا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ خیالی مضامین سے پرہیز کریں اور اس کے دامن کو اپنی تیزیٔ طبع سے رنگ برنگ کے پھولوں سے بھر دیں۔ جن کی خوشبوؤں سے لوگوں کے

دماغ معطر ہو جائیں۔ ہمیں ان کا شکریہ ادا کرنا چاہیے جو انگریزی علوم فنون کے خزانوں سے الا مال ہیں۔ اور ہماری زبان کو اس سے معمور کر رہے ہیں دراصل ہماری زبان کی ترقی ایسے ہی لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ جو دونوں خزانوں پر قابض ہیں۔ ایسے لوگوں سے ہماری التجا ہے کہ وہ اس طرف توجہ کریں اور اپنی زبان کو ترقی دینے کی کوشش کریں۔ اس پر عمل کرنے سے امید ہے کہ اس میں علوم فنون کے دریا اُبل پڑیں گے۔

محمد معین الدین جنیدی
(گلبرگہ)

لکھیں تو کیسے لکھیں

خیال تو ہوتا ہے کہ مضمون لکھیں مگر لکھیں تو کیسے لکھیں۔ پہلے تو عنوان کا سوچنا ہی مشکل ہے۔ اور جب عنوان مل گیا تو اب یہ فکر دامنگیر ہے کہ آغاز کیسے ہو۔ خیر جوں توں کر کے جب مضمون شروع کیا۔ مشکل سے چند سطریں ہی لکھی گئی تھیں کہ اندر سے آواز آئی جمیل میاں، خالہ جان آئی ہیں۔ پردے لیجاؤ۔ خالہ جان کو اتارنے کے بعد جب میں اپنے کمرے میں آیا۔ دیکھا کہ قلم کی پتی ٹوٹی ہوئی ہے۔ معلوم ہوا کہ میرا چھوٹا بھائی خلیل کمرہ میں آیا تھا۔ میں نے تاڑ لیا کہ یہ ان ہی کی کارگزاری ہوگی۔ میں امی کے پاس گیا اور کہا کہ خلیل نے میرے قلم کی پتی توڑ دی ہے۔ مجھے دوسری پتی منگا دیجئے۔ امی کہنے لگیں۔ پرسوں ہی تو پیسے دیے تھے۔ تجھے کسی چیز کے رکھنے کا سلیقہ ہی نہیں۔ ہمیشہ یہی رونا ہے آج پتی غائب کل قلم غائب اور پرسوں کاپی غائب ادہر سے آتے ہو پیسے دیجئے، ادہر سے آتے ہو پیسے دیجئے پڑوسن کے لڑکے سردار میاں کو دیکھو کتنا اچھا لڑکا ہے ہمیشہ اپنی ہر چیز سلیقے سے رکھتا ہے۔ اور ایک تم ہو کہ ہمیشہ یہ غائب وہ غائب۔ اتنے میں خالہ جان بھی آگئیں اور کہنے لگیں۔ جمیل تو بہت اچھا لڑکا ہے ہمارے ہاں کا شیطان نعیم تو ان سے بدتر ہے۔ کل ہی کا ذکر ہے کہ وہ دفتر جانیکی تیاری میں تھے اور آپ سیکل لے کر اسکول چل دیے۔ آخر ان کو پیدل ہی جانا پڑا۔ بڑی دیر بعد پتی آگئی میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ خدا جانے امی اور خالہ جان میں کیا کیا باتیں ہوتی رہیں۔ امی میری شکایتیں کرتیں اور خالہ جان اپنے لڑکے نعیم کی۔

میں اپنے کمرے میں بیٹھا سوچ رہا تھا۔ تمام خیالات منتشر ہو چکے تھے آخر بڑی مشکل سے آدھا صفحہ بھی نہ ہوا تھا کہ خالہ جان آئیں اور کہنے لگیں۔ کونسے اسکول میں پڑھتے ہو بیٹا اور کس کلاس میں، اتنے میں امی بھی آگئیں اور کہنے لگیں کہ چار بج چکے ہیں اب تک رامو کا پتہ نہیں۔ ابا کی سیکل ہے دوڑ کر سودا تو لا دو۔ سچ کہتا ہوں۔ سودے کا نام سنتے ہی میرا جسم سرد پڑ گیا مجبور تھا سیکل لے کر (معظم جاہی) مارکٹ پہنچا۔ سودا لے کر واپس ہو رہا تھا مگر تمام خیالات مکان میں تھے کہ اب بھی مضمون لکھنے کا موقع ملتا ہے کہ نہیں۔

یکایک مجھے ایک جھٹکا سا محسوس ہوا۔ اب جو آنکھ کھولتا ہوں تو معلوم ہوا کہ دواخانہ میں ہوں۔ اور ہاتھ ٹوٹ گیا ہے۔ شاید موٹر سے ٹکر ہو گئی ہوگی ـــــ یہ مضمون لکھنے کا نتیجہ ہے۔ اب آپ ہی کہیے کہ مضمون لکھیں تو کیسے لکھیں۔

سید سجاد محسن (دار العلوم ہائی سکول)

ہماری زبان

زبانِ اردو ہے مجموعۂ علوم جہاں   جو اس زبان میں خط ہے کسی زباں میں نہیں

ہمارا ملک وطن ہندوستان کا ایک حصہ ہے۔ ہندوستان ایک بڑا ملک ہے جس میں بہت سی قومیں رہتی ہیں۔ ان قوموں کی زبانیں بھی الگ الگ ہیں۔ مثلاً بنگالی، تلنگی، مرہٹی، تامل وغیرہ یہ سب زبانیں اچھی ہیں۔ لیکن ان کے بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ان میں سے کوئی زبان ایسی نہیں جس کو ہندوستان کے ہر حصے کے لوگ سمجھ سکیں۔

ہم جو زبان بولتے ہیں یعنی اردو ہندوستان کی عام زبان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو انگریزوں نے "ہندوستانی" کا نام دیا، جو آج بھی استعمال کیا جارہا ہے۔ "ہندوستانی" کا نام اردو کو اس وجہ سے دیا گیا ہے کہ وہ ہندوستان کی عام زبان ہے۔ جس طرح ایران کی زبان کو ایرانی، عرب کی زبان کو عربی، چین کی زبان کو چینی اور جاپان کی زبان کو جاپانی کہتے ہیں۔

اردو ایک مخلوط زبان ہے۔ یوں تو ہر زبان میں دوسری زبانوں کے کچھ نہ کچھ الفاظ ضرور ہوتے ہیں۔ لیکن مخلوط کا لفظ ایسی زبان کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جو دو یا دو سے زیادہ زبانوں سے مل کر بنے۔ لیکن جن زبانوں سے مل کر بنی ہو ان میں سے کسی میں ضم نہ ہو جائے۔ بلکہ ایک تیسرے نام سے علٰحدہ اور آزاد حیثیت اختیار کرے۔

اردو شمالی ہندوستان کی پرانی زبان پراکرت اور فارسی سے مل کر بنی ہے۔ لیکن اُس کا نام نہ تو پراکرت ہے اور نہ فارسی۔ بلکہ وہ ایک تیسرے ہی نام سے مشہور ہوگئی یعنی اردو کہلانے لگی۔ مخلوط زبانیں دو قوموں کے میل ملاپ سے بنتی ہیں۔ ہندوستان کی حد تک یہ دو قومیں ــــ ہندو اور مسلمان ہیں۔ اور دونوں اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ ہندوستان کی مشترک قومی زبان، اردو یا ہندوستانی ہی ہونا چاہیے۔ کیونکہ یہی زبان ہندوستان میں ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اردو کی ترقی میں ہندو اور مسلمان برابر کے شریک ہیں۔ یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ اردو کے سوائے کسی اور زبان میں ہندوستان کی مشترک قومی زبان بننے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔

اردو یا ہندوستانی میں۔ فارسی، عربی، سنسکرت، پراکرت، ہندی، پنجابی، مرہٹی، گجراتی، بنگالی، مارواڑی، تامل، ترکی، عبرانی، یونانی، پرتگالی، انگریزی وغیرہ کے بھی الفاظ ہیں اور ان زبانوں کے الفاظ کو۔ اردو نے اپنالیا ہے۔

سنسکرت۔ درشن، روپیہ۔ پراکرت۔ راؤ، رانا۔ ہندی۔ سونا، سنا۔ گجراتی۔ ننھا۔ مارواڑی۔ بتل۔ ترکی۔ انا۔ انگریزی۔ گلاس، جنگل، کوٹ، کاروان۔

سر تیج بہادر سپرو نے کیا خوب کہا ہے۔ "اردو زبان ہندو اور مسلمان دونوں کو اپنے آباواجداد سے ایک مشترکہ مقدس ترکے کی حیثیت سے ملی ہے جو قطعاً ناقابلِ تقسیم ہے۔" راقم الحروف کا ذاتی خیال ہے کہ اردو میں ہندوستان کی مشترک قومی زبان بننے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے ــ ہر ہندوستانی کا فرض ہے کہ وہ اردو کی ترقی اور اشاعت میں حتی المقدور کوشش کرے۔ تاکہ اردو کو زیادہ سے زیادہ مقبولیت حاصل ہو۔

اشرف عابدی

اردو ادب کی ابتدا و ارتقاء

ادب اور زندگی دو ایسے لازم و ملزوم عناصر ہیں جن میں ایک کا وجود دوسرے کے لئے ناگزیر ہے۔ زندگی گویا ایک آئینہ ہے اور ادب اس کا عکس، ادب زندگی کی لطافتوں، رنگینیوں اور انقلابات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ہر انقلاب انگیز واقعہ جو کسی قوم کی تاریخ پر اثر انداز ہوتا ہے وہ اس قوم کے ادب پر بھی اپنے نقوش ثبت کرتا ہے۔ چنانچہ ادبیاتِ اردو کی تاریخ بھی ہمیشہ ہندوستان کے انقلابات، کشمکشوں اور عروج و زوال کے واقعات سے ہمیشہ متاثر ہوتی رہی۔ چنانچہ اس نے جس ماحول اور فضا میں پرورش پائی ہے اور ترقی کی ہے اس کی تاریخ بڑی دلچسپ ہے۔

قدرت کا یہ ایک اٹل قانون ہے کہ ایک بچہ ہمیشہ بچہ نہیں رہ سکتا۔ اس قانونِ فطرت کا اطلاق کائنات کے ذرے ذرے پر ہوتا ہے اس لئے کسی ملک کی زبان اور ادب بھی اس قانون کی عملداری سے باہر نہیں ہو سکتے۔ اردو زبان نے بتدریج ارتقائی منازل طے کرنے شروع کردیے۔ لیکن یہ کچھ عجیب بات ہے کہ شمالی ہند جہاں سب سے پہلے اردو کی تخلیق عمل میں آئی وہاں اس کی رفتار ترقی کچھوے کی رفتار سے زیادہ سست رہی۔ البتہ جنوبی ہند میں یہ زبان بہت پھلی پھولی۔ چنانچہ اسی اعتبار سے دکن کو اردو کا وطن کہا جاتا ہے۔

دکن میں شمالی ہند سے بہت پہلے تصنیفی اور تالیفی دور شروع ہو چکا تھا۔ لوگ ادب کتابی کی طرف جوق جوق رجوع ہونے لگے تھے۔ کچھ تو بادشاہوں کی سرپرستی اور کچھ اس زمانے کی علمی فضا ان دونوں نے مل کر سرزمینِ دکن پر اردو ادب کے بہت سے عالم پیدا کر دیے تھے۔ چنانچہ حضرت سید محمد حسینی گیسو دراز خواجہ بندہ نوازؒ سرآمد اقران و امثال ہیں۔ آپ کی معرکتہ آلارا تصنیف "معراج العاشقین" ادبیات اردو کے اولین کارناموں میں سے ہے۔ یہ کتاب ۱۳۹۸ء میں لکھی گئی اور اس کتاب کا طرزِ انشا یا ائی ۔ ۔ و کا نمونہ پیش کرتا ہے: "پرہیز کئے سوں پرہیز کرنا۔ مراقبے کی گولی مشاہدے کے کانسے میں میکائیل کی مدد کے پانی سوں جلی کا کاڑا کر کو پیلا نا سکن کا کاڑا دینا۔ نرگن ہوا تو شفا پاوے گا۔ طبیب فرمائے تیوں پرہیز کرنا تو اتنے بھی طبیب ہو جاوے گا۔ ہور ماٹی میں ماٹی، ماٹی میں پانی، ماٹی میں آگ، ماٹی میں بارا، ماٹی میں خالی۔ ان پانچ عناصراں کا واجب الوجود ہو جاوے تو معرفت تمام ہوا۔"

بعض محققین نے امیر خسرو کی لغت "خالق باری" کو اردو کی پہلی تصنیف قرار دیا ہے لیکن امیر خسرو کی اس تصنیف میں بھاشا اور فارسی اس تناسب سے لائی گئی ہے کہ یہ تصنیف اردو کہلانے کی مستحق نہیں۔ گو یہ ضرور ہے کہ امیر خسرو ہی نے پہلے پہل بھاشا اور فارسی کو ملانا شروع کر دیا تھا لیکن ان کے اشعار، پہیلیوں، کہہ مکرنیوں سے پتہ چلتا ہے کہ بھاشا فارسی پر اس قدر بھاری تھی کہ اس نئی زبان کو ہندی کہا جاتا تھا جیسا کہ خود حضرت امیر خسرو کو اس کا اعتراف ہے۔

یہ "ہندی زبان" خانہ ہم بیت گھر ہے
چو خوف و خطر بیم ہم ترس ڈر ہے

بہر حال اس لحاظ سے "معراج العاشقین" ہی ادبیات اردو کی پہلی کتاب ہے۔ "معراج العاشقین" کے بعد حضرت خواجہ بندہ نوازؒ نے علم تصوف پر تیس سے زاید کتابیں لکھیں۔ اسی زمانے میں حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کے ایک عزیز سید محمد عبداللہ حسینی نے عبدالقادر جیلانی کے رسالے "نشاط العشق" کا دکھنی اردو میں کامیاب ترجمہ کیا۔ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کے شغلِ تصنیف و تالیف نے اس زمانے پر گہرا اثر ڈالا چنانچہ ان کی تصانیف نے دوسرے علما اور شعرا کے ذوقِ تصنیف و تالیف کو ابھارا اور اس طرح اکثر علما اور صوفیائے کرام نے اپنی توجہات تصنیف و تالیف کی طرف منعطف کیں۔ چنانچہ حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق نے ۱۴۹۵ء میں "مرغوب القلوب" شاہ برہان الدین نے ۱۵۸۲ء میں "کلمتہ الحقایق" اور شاہ امین الدین بیجاپوری نے ۱۶۱۰ء میں گنجِ مخفی جیسی مشہور و معروف ادبی تصانیف سے اردو ادب کو مالا مال کیا۔ انہی بزرگوں کی مساعی کا یہ نتیجہ نکلا کہ اردو رفتہ رفتہ دکن کے ہر باشندے کے دل میں اپنا گھر کرتی رہی۔ بہادر شاہ کے طوطے کا قصہ بہت مشہور ہے۔ ایک مرتبہ سلطان نصیر الدین ہمایوں نے بہادر شاہ حاکمِ گجرات و دکن پر چڑھائی کی۔ بہادر شاہ کا ایک نمک حرام سردار رومی خاں ہمایوں سے جا ملا۔ بہادر شاہ کی شکست کے بعد مالِ غنیمت کے ساتھ بہادر شاہ کا چہیتا طوطا بھی لایا گیا جونہی طوطے نے رومی خاں کی صورت دیکھی چیخ اٹھا۔

"پھٹ پاپی رومی خاں نمک حرام"

اس قصے سے صرف اتنا اظہار مقصود ہے کہ اردو نے دکن میں کتنی ترقی حاصل کی تھی نہ صرف کتابی ادب بلکہ بول چال میں بھی دکن شمالی ہند سے بہت آگے تھا۔ شمالی ہند چونکہ ہر دور میں بیرونی حملہ آوروں کا آماجگاہ بنا رہا اس لئے وہاں کی تہذیب و تمدن ادب اور زبان کو ترقی کا موقع کم ملا۔ البتہ دکن دور ہونے کی وجہ سے ہمیشہ حملہ آوروں کی دست برد سے محفوظ رہا۔ اس پر ہمیشہ امن کا دیوتا حکمران رہا۔ اس لئے تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ ادب اور زبان نے بھی ترقی حاصل کرنی شروع کی نیز دکن میں اردو کو ہمیشہ شاہی سرپرستی حاصل رہی۔ چنانچہ عادل شاہی اور قطب شاہی فرمانرواؤں نے زبان اور ادب کی ترقی میں اپنی ساری توجہات صرف کردیں۔ ان کی سرپرستی نے نصرف اردو کو اپنے بل بوتے پر کھڑا رہنا سکھایا بلکہ بہت سے شاعر مصنفین اور مولفین بھی پیدا کئے۔ بادشاہ اور سلاطین خود شاعر اور عالم ہوتے تھے۔ چنانچہ عادل شاہی خاندان اور قطب شاہی مملکت کا تقریباً ہر فرمانروا عالم فاضل اور شاعر گذرا ہے۔ ان کے دربار علما و فضلا شعرا اور ادیبوں کا مرجع بنے رہتے تھے۔ چنانچہ نصرتی، وجہی، غواصی، شاہ ملک، ابن نشاطی، رستمی، امین، سیوا، مومن اور ہاشمی دربار گولکنڈہ اور بیجاپور کے "نورتن" کہلاتے ہیں۔ ان شعرا اور انشا پردازوں نے اپنے آپ کو صرف درباری شاعری تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ قلمی کاوشوں سے بھی اردو ادب کے خزانے میں اضافہ کرتے رہے چنانچہ نصرتی کا "علی نامہ" وجہی کی "سب رس" اور قطب مشتری" ابن نشاطی کی "پھول بن" فائز کا منظوم قصہ "رضواں شاہ" امین بیجاپوری کی "جوہر الاسرار" کے نام آج تک ادبیات اردو میں بڑی فخر کے ساتھ لئے جاتے ہیں۔ انہی عادل شاہی فرمانرواؤں کے عہد میں اردو سرکاری اور دفتری زبان بنائی گئی اس کے بعد پھر کیا تھا اس زبان نے

غرب ہاتھ پاؤں نکالے۔

سلاطین بیجاپور کی طرح سلاطین گولکنڈہ نے بھی اردو ادب کی بے لوث خدمت کی خصوصاً محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں اردو، مملکت گولکنڈہ کی مقبول عام زبان تھی۔ بادشاہ خود اردو کا ایک قادر الکلام شاعر اور بلند پایہ ادیب تھا۔ اس نے اردو شاعری میں حسن و عشق، تصوف و معرفت کے علاوہ انسانی معاشرت پر بھی نظر دوڑائی شادی بیاہ، ہولی بسنت، صراحی و پیالہ کا مکالمہ، کالی گوری کا مکالمہ وغیرہ۔ قلی قطب شاہ معانی تخلص کرتا تھا۔ اس نے اردو ادب میں اپنی ایک یادگار کلیات کی شکل میں چھوڑی ہے۔ اکبر کے دربار کے نورتنوں کی طرح اس کے دربار کے بھی "رتن" بہت مشہور و معروف ہیں۔ ملّا وجہی ان سب میں ممتاز و نمایاں ہے۔ اس نے دو معرکۃ الآرا تصانیف "سب رس" اور "قطب مشتری" تصنیف کیں "سب رس" اردو نثر کی شاہکار تصنیف ہے اور قطب مشتری ایک نہایت اعلیٰ مثنوی ہے۔ سب رس صرف ایک علمی کاوش ہی نہیں بلکہ اس زمانے کی اردو کی صرف و نحو کا ایک شفاف آئینہ ہے۔ اس دور کے بعد ولی، جعفر، سالک، فضلی، لطفی، احمد، اشرف، ہاتفی وغیرہ پیدا ہوئے بشعر و سخن کا سیلاب آیا ان کا بچا کچا مال و متاع دیوان اور کلیات کی شکل میں اردو ادب کو ملا ولی ان تمام شعرا میں ممتاز اور نمایاں شخصیت کا حامل تھا۔

محمد شاہ کے عہد میں شمالی ہند میں اردو نے ترقی کے منازل طے کرنے شروع کر دیے تھے۔ چنانچہ اس زمانے کے بہت سے شعرا آج تک اردو ادب کے مربی و محسن سمجھے جاتے ہیں۔ شیخ ظہور الدین حاتم، نجم الدین آبرو، شرف الدین علی خاں فغاں، محمد شاکر ناجی، مرزا رفیع سودا قابل ذکر ہیں۔ ان سب میں بہتر شیخ ظہور الدین حاتم تھے۔ مرزا رفیع سودا انہی کے شاگرد تھے۔ ان ارباب اردو نے شاہ جہاں آباد (دہلی) میں اردو کو اتنی ترقی دی کہ شاہ جہاں آباد (دہلی) کو "اردو کا شیراز" کہا جانے لگا۔ چنانچہ سرسید لکھتے ہیں۔

"یہ زبان اب اتنی منج گئی ہے کہ قیامت تک اس سے بہتر ہونی ممکن نہیں اور اس زبان کو شاہ جہاں آباد سے ایسی ہی نسبت ہے جیسے فارسی کو شیراز سے۔"

یہ کچھ عجیب بات ہے کہ جس نے شاہ جہاں آباد کو بسایا۔ اس کے عہد تک اردو صرف بول چال کی زبان تھی۔ کتابی ادب سے لوگ بے بہرہ تھے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ سنہ ۱۱۴۵ھ سے قبل کسی کتاب کا نام نہیں سنا گیا۔ البتہ ۱۷۳۲ء میں شاہ فضل اللہ فضلی نے "دہ مجلس" یا "کربل کتھا" کے نام سے اردو نثر کی پہلی کتاب لکھی۔ جس میں واقعات شہادت کربلا مندرج ہیں۔ شمالی ہند میں فضلی کی اس کتاب کو اردو نثر کی اولین تصنیف اور فضلی کو اردو نثر کا باوا آدم تسلیم کیا گیا ہے۔ فضلی کی اس تصنیف میں ہمیں پاکیزہ اردو نظر آتی ہے جو حال حال کے زمانے تک بھی ہندوستان میں رائج تھی۔

اس تصنیف کے بعد سے شمالی ہند میں تصنیفی و تالیفی شغل دھیرے سے شروع ہو گیا۔ ۱۷۶۶ء میں مرزا رفیع سودا نے "دیباچۂ دیوان مرثیہ" لکھا۔ مرزا رفیع سودا کا طرز فضلی کی طرز انشا سے بالکل مختلف ہے۔ رفیع اس قسم کی عبارت آرائی کرتے تھے۔

"مضمون سینے میں بیش از مرغ نہیں کہ ہو بیچ قفس کے جس وقت زبان پر آیا فریاد بلبل ہے واسطے گوش داور گئی"
رفیع سودا نے مثنوی "شعلۂ عشق" بھی اسی عبارت میں لکھی ہے۔ نیز شعری تاریخ گوئی کے موجد بھی رفیع سودا ہیں
یہ وہ زمانہ تھا جب مغلیہ سلطنت موت کی ہچکیاں لے رہی تھی جب وہ آخری ہچکی لے کر ختم ہو گئی تو اردو کا کوئی سرپرست
نہ رہا اس لئے ایسٹ انڈیا کمپنی نے اردو کی انگلی پکڑی۔ اور اس کی اپنے بچے کی طرح پرورش کی۔ ۴ مئی سنہ ۱۸۰۰ء میں
اردو کی ترویج و اشاعت کے لئے فورٹ ولیم کالج قائم کیا گیا۔ اس کے بعد ایک اور کالج اس غرض کے تحت دہلی میں
قایم کیا گیا۔ فورٹ ولیم کالج سیاسی ضروریات کے مدنظر قایم کیا گیا۔ یعنی اس کے قیام کا مدعا یہ تھا کہ انگریزوں کو ہندوستان
ہندوستانی زبان اور ہندوستانی معاشرت سے روشناس کرایا جائے۔ بمقصد خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو مگر یہ ضرور کہا جا سکتا
ہے کہ اردو نے اس کے دامن عاطفت میں پرورش پائی اور خوب ترقی کی بلکہ فورٹ ولیم کالج ہی دراصل حقیقی معنوں میں
اردو کا سرپرست رہ چکا ہے۔ اس کالج کی بنا ایک ایسی قوم نے ڈالی جس کے لٹریچر کی وسعت اظہر من الشمس ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ
اپنے لٹریچر کو اردو میں منتقل کرے لیکن چونکہ ہندوستانی انگریزی ادب سے بے بہرہ اور ناواقف محض تھے اس لئے
یہ ارادہ خواب بن کر رہ گیا۔ البتہ اس قوم کی کوششوں سے اس دور کے مصنفین نے فارسی اور عربی تراجم شروع کئے۔
میر شیر علی افسوس نے "گلستان" کا ترجمہ "باغ اردو" کے نام سے شایع کروایا۔ مولوی شاہ عبدالقادر نے قرآن شریف کا
ترجمہ "آرایش محفل" کے نام سے پیش کیا۔ اسی طرح ڈاکٹر گلکرسٹ پرنسپل فورٹ ولیم کالج نے جو اردو کا محسن اعظم
سمجھا جاتا ہے اردو صرف و نحو پر ایک کتاب لکھی جو "ادبیات اردو میں" رسالہ گلکرسٹ کے نام سے مشہور ہے۔ غرض کہ
ڈاکٹر گلکرسٹ کی مسیحا نفسی سے اردو کے قالب میں نئی روح پھونکی گئی۔

پہلے پہل تو فورٹ ولیم کی اردو کا رجحان زیادہ تر قصوں اور افسانوں کی طرف تھا چنانچہ ابتداً جتنی تصانیف
پیش کی گئیں وہ سب حسن و عشق اور گل و بلبل کے رومانوی قصے تھے۔ لیکن بعد میں گلکرسٹ کی کوششوں سے
فورٹ ولیم تاریخ اور تذکرہ نویسی میں بھی کبھی پیچھے نہ رہا۔ شیر علی افسوس کی "آرایش محفل" حیدری کی "تاریخ نادری"
مظہر علی خاں ولا کی "تاریخ شیر شاہی" اور سینی کی "تاریخ آسام" اس دور کی نہایت معتبر اور مستند تاریخیں ہیں۔
اس کالج کے عہد میں سب سے پہلی مرتبہ پتھر کے چھاپے خانے قایم کئے گئے جن کی وجہ سے تصنیف و تالیف میں غیر معمولی
سرعت پیدا ہو گئی۔ اگرچہ فورٹ ولیم کالج کے ارباب حل و عقد نے اردو کی ترویج و اشاعت کا بیڑا اٹھایا تھا لیکن
انھوں نے اردو ادب کے لازمی عنصر نظم کو فراموش کر دیا۔ اسے اردو نظم کی خوش قسمتی سمجھئے کہ قدرت نے اس کی
بقا کے لئے ولی، میر، مصحفی، انشا، آتش، ذوق، غالب اور نظیر کو پیدا کیا۔ انھوں نے اردو نظم کی گرتی ہوئی دیوار
کو سنبھالا اور اس کو کبھی نثر سے پیچھے نہ رہنے دیا۔ پہلے پہل اردو میں جتنی بھی کتابیں لکھی گئیں ان میں فارسیت کا بہت
زیادہ غلبہ تھا۔ شاعر اور ادیب عموماً اپنی قابلیت کے مظاہرے کے لئے فارسی کے الفاظ زبردستی اردو میں ٹھونستے تھے۔

سر سید اور محمد حسین آزاد ہی وہ اشخاص ہیں جنھوں نے اردو کو سلیس اور عام فہم بنانے کی کوشش کی۔ سر سید اور محمد حسین آزاد کا نذیر احمد حالی اور شبلی نے بھی ساتھ دیا چنانچہ تاریخ ادبیاتِ اردو میں انھیں "اردو کے عناصر خمسہ" کہا گیا ہے۔ ان تمام کی تحریریں اتنی آسان اور دلکش عبارت میں لکھی ہوئی ہیں کہ ایک معمولی اردو داں بھی بخوبی پڑھ سکتا اور سمجھ سکتا ہے۔

شروع شروع میں یہ طرز انشا مقبول نہ ہو سکی چنانچہ رجب علی سرور جیسے ادیب نے اس سلاست اور سادگی کا مذاق اڑایا۔ لیکن ان عناصر خمسہ کی سعی مبہم سے یہ بیل جلد جلد منڈھے چڑھنے لگی۔ سر سید، نذیر احمد اور شبلی نے اگر نثر میں انقلاب پیدا کیا تو آزاد اور حالی نے پرانی اور کلاسک شاعری کا خاتمہ کیا اور جدید شاعری کی بنیاد ڈالی۔ چنانچہ آزاد اور حالی نے حسن و عشق اور گل و بلبل کے قصوں سے اپنے قلم کو نا آشنا رکھا۔ ان کی شاعری کی ہر تان فطرت پرستی، حقایق اور حیاتِ انسانی کے واقعات پر ٹوٹتی تھی۔ چنانچہ محمد حسین آزاد نے جدید طرز کی پہلی نظم "شب قدر"، ۸ مئی ۱۸۷۴ء انجمن پنجاب کے جلسہ میں پڑھی جو کرنل ہالرائیڈ کی زیر صدارت منعقد ہوا تھا۔ اس کے بعد سے اردو میں اسی قسم کی شاعری کا آغاز ہوا۔ حالی اور دوسرے ہم عصر شعرا نے آزاد کا تتبع شروع کیا۔ نیز اس جدید رنگ کی شاعری کی آبیاری کرنے والوں میں اکبر، اقبال، سرور جہاں آبادی، چکبست، تلوک چند محروم اور جوش ملیح آبادی بھی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک جب کسی موضوع پر قلم اٹھاتا تو وہ اس کی قوم سے اس کے ماحول (.................) سے متعلق ہوتا۔ نظم کی طرح نثر میں بھی سر سید، نذیر احمد، شبلی اور غالب کی وجہ سے انقلاب ہوا خصوصاً غالب نے اردو زبان کو آسان بنانے میں بڑی مدد دی۔ ان کی عبارت میں سادگی بے تکلفی، بے ساختگی اور لطف پایا جاتا ہے۔ ان کے مکاتب اردو ادب میں "اردوئے معلیٰ" کے نام سے معروف ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ "خطوط نویسی" دراصل مرزا غالب کی ایجاد ہے۔

یہ سب کچھ انہی اربابِ نثر کی کوششوں و مساعی کا نتیجہ ہے کہ ادبیات اردو آج اس قدر مالا مال نظر آتی ہے۔ موجود دور کو اگر چہ کہ اردو کے انتہائی عروج کا دور نہیں کہا جا سکتا مگر پھر بھی یہ دور اردو کے شاندار مستقبل کا ضامن ہے ادبیاتِ اردو کے بازار میں آج ہمیں سیکڑوں یوسف اوراق میں لپٹے نظر آتے ہیں چنانچہ اردو شاعری میں جگر، جوش، حفیظ اور امجد کا نام رہتی دنیا تک قایم رہے گا۔

اعلیٰ پایہ کے علمی، ادبی مضامین اور تحقیقی مقالے لکھنا گویا مولوی عبدالحق، نیاز فتح پوری، قاضی عبدالغفار، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور اور مولوی عبدالقادر صاحب سروری کا حصہ ہے۔

جدید افسانہ نگاری کے متعلق ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ جدید افسانے سارے انگریزی ادب کی پیداوار ہیں اور اردو کے انشا پرداز مغربی افسانوں کو اردو کا جامہ پہنا کر پیش کر رہے ہیں۔ چنانچہ نیاز فتح پوری نے ٹیگور کے اثر کو اردو میں رائج کیا۔ سجاد حیدر یلدرم نے ترکی افسانوں کے متعدد ترجمے شایع کئے۔ عنایت اللہ دہلوی مستقل طور پر انگریزی تصانیف کو اردو میں منتقل کر رہے ہیں۔ اس طرح جلیل قدوائی، مجنون گورکھپوری، امتیاز علی تاج،

صادق الخیری، حجاب امتیاز علی، اختر حسین رائے پوری اور علیگڈھ و جامعہ عثمانیہ کے اکثر اصحاب قلم انگریزی، فرانسیسی اور روسی افسانوں کو رائج کر رہے ہیں۔

طبعزاد افسانہ نگاروں میں منشی پریم چند مرحوم، اعظم کریوی، ام اسلم، آغا حیدر حسن اور خواجہ حسن نظامی قابل ذکر ہیں۔

اردو کا مزاحیہ لٹریچر اکبر الہ آبادی، پطرس، فرحت اللہ بیگ اور رشید احمد صدیقی کا ممنون احسان ہے۔

اس تمام بحث کے بعد اگر ہم اردو ادب کا دوسری زبانوں کے ادب سے تقابل کریں تو معلوم ہوگا کہ اردو ادب ابھی عالم طفولیت سے گزر رہا ہے۔ جامعہ عثمانیہ، انجمن ترقی اردو، دار المصنفین اعظم گڑھ، ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد نیز ہندوستان کے اکثر رسائل و اخبارات اردو ادب کے تمول و ارتقا کی ممکنہ کوششیں کر رہے ہیں، ان کی یہ قابل قدر مساعی یقین دلاتی ہیں کہ اردو ادب کا مستقبل نہایت شاندار اور درخشاں ہے۔

ابراہیم حسین جلیس
(اورنگ آباد)

کاغذی دوات

اک بچے نے بنائی جو اک کاغذی دوات
ماں سامنے ہی بیٹھی تھی، بولا کہ اماں جان
کیا خوب یہ دوات ہے، کیا بات ہے مری
اس میں سیاہی بھر کے میں لکھوں گا اب سبق
ماں نے کہا یہ سن کے کہ اچھی ہے یہ دوات
یہ کاغذی دوات فقط دیکھنے کی ہے
لکھو پڑھو تمہارے یہی کام آئے گا
لکھ پڑھ کے تم جو سونے کی بنواؤ گے دوات
اب کاغذی بنا کے دوات اس قدر ہو شاد
صنعت بھی اچھی چیز ہے تم یہ بھی سیکھ لو
علم و ہنر کو سیکھ کے جو طاق ہو گئے
محنت اٹھا کے سیکھا ہے جن لوگوں نے کمال
میں خوش ہوں تم کو علم کا صنعت کا شوق ہے

خوش ہو گیا کہ سب سے ہے اچھی مری دوات
یہ دیکھیے دوات کی میری انوکھی شان
ہوتی ہے دیکھ دیکھ کر اس کو بڑی خوشی
معنی لکھوں گا ان کے جو الفاظ ہیں ادق
لیکن میں تم سے کہتی ہوں بیٹا اب ایک بات
جو کام دینے والی ہو وہ تو نہیں یہ شئے
لکھ پڑھ چکو تو اس کا ہے پھر پوچھنا ہی کیا
اس وقت پھر کچھ اور ہی ہوگی تمہاری بات
جب علم سیکھ لوگے تو بر آئے گی مراد
چھوڑو نہ کاہلی سے ہنر اور علم کو
بیٹا! وہ لوگ شہرۂ آفاق ہو گئے
ہے وہ کمال ان کے لئے دولت اور مال
اس کا اٹھاؤ لطف کہ اچھا یہ ذوق ہے

علم و ہنر سے عزت انساں جہاں میں ہے
فیاض اس سے بڑھ کے نہیں اور کوئی شئے

ابو الفیض فیاض
(ولید کنڈہ)

بوڑھا سادھو

شام ہو رہی تھی۔

بوڑھا سادھو چلا جا رہا تھا۔

بائیں ہاتھ کی جھولی میں دو چار سڑے گلے آم تھے۔

کندھے پر پوٹلی، دائیں ہاتھ سے کندھے پر سنبھالا ہوا ایک لکڑی کا — موٹا کالا سا — ڈنڈا!

داڑھی الجھی ہوئی۔ ذرا سفید مگر مٹیالے بال۔ بالوں میں دھول۔ گڑھے میں دھنسی ہوئی آنکھیں اور...... اور ہاں، تکان سے لڑکھڑاتے ہوئے پیر! جھکے ہوئے کندھوں پر گویا مصیبت کا بوجھ لادے چلا جا رہا تھا۔

جھکی ہوئی آنکھیں اٹھا کر اس نے دیکھا، سامنے ہی دو نوجوان چلے آ رہے تھے۔ سفید ڈھیلے پاجامے، لمبے انگریزی وضع کے بال اور منہ میں سگار!

"بابوجی کا بھلا ہو...... " بھکاری نے نہایت عاجزانہ انداز میں کہا۔

نوجوانوں کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ غصہ سے ایک نے کہا "سر پر چڑھا آتا ہے اندھے؟ منہ سے مانگتے مانگتے نیت نہیں بھری؟"

"ارے یار، یہ تو بدمعاش معلوم ہوتا ہے!" دوسرے نے سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے کہا۔

بوڑھا سادھو اپنی جگہ دنگ کھڑا رہ گیا، دونوں کو جاتے دیکھتے ہوئے!

لمبی سانس لے کر پھر چل دیا۔ حالانکہ اس کے پیروں میں وہ طاقت باقی نہ تھی۔ کندھے کا بوجھ بھاری محسوس ہوتا تھا۔ بے عزتی کے بارے کلیجہ منہ کو آ رہا تھا!

سامنے دیکھا، ایک ادھیڑ عورت ایک بوڑھے کے ساتھ چلی آ رہی ہے۔

بھکاری نے سوچا، عورت کا دل مرد کی طرح لوہے کا نہیں ہوا کرتا۔ وہ رحم دل ہوتی ہے۔ شاید...... وہ ٹھہر گیا۔

عورت نے دیکھا اور دیکھ کر بھی نہ دیکھنے کی کوشش کی۔

"مائی...... !" سادھو نے کہا۔

بھوں چڑھا کر عورت نے کہا "اتنی بڑی پوٹلی تو بھری ہے، اس سے بھی تیرے پیٹ کی آگ نہیں بجھتی؟"

بوڑھے نے ہاتھ بتا کر کہا "ارے باپ رے، ڈنڈا تو دیکھو اس کا!"

سادھو نے دیکھا، بوڑھی کے ہاتھ میں سونے کی چمک دار چوڑیاں، کڑے نہ معلوم اور کیا کیا ہیں!

سادھو کی آنکھیں دھندلی ہو گئیں۔ شاید اس میں کندھے کے بوجھ کو سنبھالنے کی طاقت ہی نہ تھی۔ مجبوراً وہ چلتا ہی رہا۔ چلنا تو تھا ہی۔ شام قریب تھی۔ اور رات سے قبل اس کو ندی کے کنارے پہنچنا تھا۔ ورنہ...... ؟

اور ندی؟ کتنی دور پر تھی وہ! دو...... تین...... یا...... اور زیادہ میل؟ سادھو نے ہمت کر کے اپنی رفتار تیز کی۔

تھکے ماندے لڑکھڑاتے پیروں میں ٹھوکریں لگتی تھیں مگر وہ چلتا ہی جاتا تھا!

کسی بچی کی سریلی آواز اس کے کان میں پڑی۔

دیکھا کہ حسین معصوم لڑکی اپنی ہمجولیوں سے کھیل رہی ہے۔

سادھو رک گیا۔

اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ ندی کا کنارا کتنا دور تھا!

پھر بھی بوڑھا سادھو سب کچھ بھول کر اس حسین لڑکی کو
دیکھ رہا تھا، ہنستے ہوئے!
اتفاقاً بچی کی نظر اپنی جانب گھورنے والے
بوڑھے سادھو پر پڑی. وہ گھبرا کر خاموش ہوگئی.
سادھو نے مسکرا دیا، اس کا ڈر مٹانے کے لئے!
بچی پیچھے ہٹ گئی. اور مارے خوف کے اس کے
منہ سے چیخ نکل گئی "ارے ڈنڈے والا!" اور وہ بھاگ گئی.
رات ہوگئی تھی. سادھو آہستہ آہستہ قدم بڑھائے
چلا جا رہا تھا، سایہ کی طرح، بے ہوش سا!
زندگی کے لمبے لمبے پچاس سال..... تب ہاں،
وہ بھی بچہ ــــ ایسا ہی بچہ ــــ تھا!...... ہوگا. مگر اب؟
تین دن کا بھوکا بدن کام کرنے سے انکار کر رہا تھا!
اتنی تھکان اور اس درجہ کمزوری کا اس کو احساس
ہو رہا تھا کہ شاید وہ پچاس سال سے چل ہی رہا ہے!

آج ..... وہ ڈنڈے والا..... بچوں کا ہوّا آف!
اس کا سر چکرانے لگا.
کانوں میں سنسناہٹ....... آنکھوں میں اندھیرا
..... رات شاید آگے بڑھ کر اس کا گلا دبا رہی تھی!
ہائے! ندی کا کنارا کتنا دور تھا! ڈنڈے والا... اف... بد معاش!
سادھو اک بار لڑکھڑایا. آنکھوں پر ہاتھ پھیر کر سنبھلنے کی
کوشش کی. اور ایک قدم بڑھایا!
مگر ٹھوکر لگی، اور..... گر پڑا.

صبح لوگوں نے معلوم کیا کہ سادھو ــــ ایک بوڑھا
سادھو ــــ مرا پڑا ہے! اس کی پھٹی پوٹلی سے کچھ
چیزیں ادھر ادھر جھانک رہی ہیں. اور وہ ڈنڈا پکڑے
ہوئے ہے، مضبوطی سے!

ین پن کٹی
(رنگ گری)

اردو

ہر اک زباں سے اچھی اردو زباں ہماری — کہتے ہیں اس زباں کو پیر و جواں ہماری
بے خود بنا ہی دے گی نغمے سنا سنا کر — جذبات کی وہ اے دل پیاری زباں ہماری
مٹنا ترا ہے مشکل جب تک کہ دم میں دم ہے — پیاری زباں ہے اردو جانِ جہاں ہماری
اغیار گو ہوں دشمن مطلق نہ خوف کھا تو — کیا جانے تیری عظمت کیا جانے شاں ہماری
اقبال اور حالی گویا تھے یوں ولی بھی — پیاری ہے جاں سے ہم کو اردو زباں ہماری

اردو کی شان و شوکت دیکھی ہے جب سے اے درد
کہتا ہے ہو کے قرباں ہندوستاں ہماری

حسین شریف درد
(سٹی کالج)

مطبوعہ مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس

میر حسن ایم اے کی کتابیں

ورڈز ورتھ اور اس کی شاعری۔ میر حسن صاحب ایم اے ملک کے ان لائق فرزندوں میں سے ہیں جنھوں نے اردو زبان وادب کی خدمت کو اپنا نصب العین بنا رکھا ہے۔ ان کی علمی وادبی خدمات محتاج تعارف نہیں ہیں۔ انھوں نے سب سے پہلی کتاب "ورڈز ورتھ اور اس کی شاعری" لکھی اور اسی کتاب سے "ادارۂ ادبیات اردو" کے اشاعت کتب کا سرگرم دور شروع ہوتا ہے۔
ورڈز ورتھ کے متعلق ملک کے جرائد و مشاہیر کی رائیں اس کے مصنف کی پہلی کوشش کی غیر معمولی کامیابی کا ثبوت ہیں۔

"ورڈس ورتھ انگریزی ادب کا معیاری شاعر ہے جناب میر حسن نے اس کو اردو داں طبقے سے روشناس کیا ہے"
"مولف نے یہ ایک اچھا طریق سوانح نگاری اختیار کیا ہے۔ اگر اسی رنگ پر وہ دوسرے باکمال شعرائے یورپ کو"
"روشناس کرنے میں کامیاب ہو جائیں جیسا کہ ان کا مقصد ہے تو اردو کی ایک مفید خدمت انجام دیں گے۔ (مولانا سلیمان ندوی)

"مولوی میر حسن صاحب ..... نے اس کتاب میں نہایت خوبی و جامعیت کے ساتھ انگلستان کے اس مشہور شاعر"
"کی حیات اور کلام اور اس کے معاصرین اور عہد حاضر کے انگریزی اور اردو شاعروں پر اس کے اثرات تنقیدی"
"نقطۂ نظر سے بیان کئے ہیں۔ اسلوب بیان اس قدر دلکش اور دلاویز ہے کہ بے اختیار مصنف کے حق میں"
"..... دل سے دعا نکلتی ہے کہ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ"۔ (مشیر دکن)

"سوانح نگاری کا یہ طرز عام روش سے علحدہ ہے اور چونکہ فطری اصول کے مطابق ہے اس لئے نہایت پسندیدہ ہے۔"
"بہ حیثیت مجموعی ہمارے جدید مطبوعات میں یہ ایک مفید و دلچسپ اضافہ ہے۔ (ہندوستانی الہ آباد)

"جامعۂ عثمانیہ کی بدولت حیدرآباد اور اس کے متعلقات میں خوش فکر اور نوجوان انشا پردازوں کی ایک ایسی"
"اولعزم جماعت پیدا ہو گئی ہے جو ہر وقت اردو ادب کی توسیع و ترقی کی فکر میں منہمک ہے۔ اسی جماعت میں"
"..... میر حسن صاحب بھی ہیں۔ قابل مصنف نے نہایت محنت اور دماغ سوزی سے کام لے کر یہ کتاب مرتب"
"کی ہے۔ اردو داں پبلک خصوصاً شعرا کو اس کی قدر کرنی چاہیے۔ (دیا نرائن نگم بی اے)

"موضوع نام سے ظاہر ہے اور افادیت اس کے موضوع سے مترشح۔ وہ لوگ جو خالص ادبی ذوق رکھتے ہیں اور"
"مشرق و مغرب دونوں جگہ کی شاعری پر متقابلانہ نگاہ ڈالنا چاہتے ہیں، ان کے لئے یہ کتاب خصوصیت"
"کے ساتھ قابلِ قدر ہے۔ (نیاز فتح پوری)

"میر حسن صاحب نے یہ بہت قابل قدر کام کیا ہے۔ میر حسن صاحب کی محنت قابلِ شکر اور لائق قدر ہے۔ نظم کا"
"ترجمہ بہت دشوار کام ہے لیکن مولف نے عموماً اس دشوار کام کو بھی خوبی سے انجام دیا ہے۔ اردو شعرا کو یہ"
"کتاب ضرور پڑھنی چاہیے۔ (پروفیسر اسمیٹ)

"کتاب اچھی اور بہت اچھی ہے اور بہت سلیقہ سے مرتب کی گئی ہے۔ ورڈسورتھ کی شاعری کے اثرات اردو شاعری کے

"نئے دور پر آپ نے کامیابی کے ساتھ دکھائے ہیں۔ ہوشمند طبیعتیں ضرور ورڈس ورتھ کے کلام کا مطالعہ اب اس نقطۂ نظر سے کریں گی جس کی طرف آپ کی کتاب اشارہ کر رہی ہے۔" (ڈاکٹر عبدالستار صدیقی)

"ورڈس ورتھ اور اس کی شاعری پر انھوں نے قابلِ قدر کام کیا ہے اور اس موضوع پر اردو میں ایک دلچسپ کتاب لکھی ہے۔" (عبدالرحمن خاں سابق صدر جامعۂ عثمانیہ)

"یہ بیش قیمت رائیں" "ورڈز ورتھ اور اس کی شاعری" کے اس قابل مصنف کے متعلق ہیں جو پروفیسر قاضی محمد حسین صاحب نائب معین امیر جامعہ عثمانیہ کی نظر میں "کردار اور عمل کے ایک بلند معیار کا مالک" ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جامعۂ عثمانیہ کے سانچے میں جو آزادئ فکر و عمل ڈھلتی ہے اس کی تعمیر ایسے ہی طلبا کی تعمیری جد و جہد سے ممکن ہے۔"

"ورڈز ورتھ اور اس کی شاعری کی دوسری اشاعت، سات سال بعد نظر ثانی اور اضافوں کے بعد عمل میں لائی جا رہی ہے۔ اس میں ورڈز ورتھ کی نظموں کا منظوم ترجمہ بھی شریک رہے گا جو صاحبزادہ میکش نے کیا ہے۔"

مغربی تصانیف کے اردو تراجم۔ میر حسن صاحب کی دوسری کتاب جو حال میں شائع ہوئی ہے مغربی تصانیف کے اردو تراجم سے متعلق ہے۔ پروفیسر سروری نے سچ فرمایا ہے کہ "نقد ادب اور تاریخی طریقۂ تنقید کے علاوہ ماخذوں کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں ایسی کتابوں کی خاص اہمیت ہوتی ہے۔ اس کتاب میں مغربی زبانوں کی تصانیف اور تالیفات کو اردو زبان میں منتقل کرنے کی تمام انفرادی اور اجتماعی کوششوں کا مبسوط تذکرہ کیا گیا ہے ۱۸۰۰ء سے ۱۹۱۷ء تک کے اردو ادب کا یہ پہلو ہر اس شخص کے لئے باعثِ دلچسپی ہوگا جو ترقیٔ اردو کے متمنی ہیں۔

سائنس کے کرشمے۔ "سائنس کے کرشمے" ان نشری تقاریر کا مجموعہ ہے جو نشرگاہ حیدرآباد سے علمی موضوعوں پر نشر ہو چکی ہیں۔ میر حسن صاحب نے ان کو ترتیب دے کر عوام کو علمی موضوعوں سے واقف ہونے کا ایک موقع پیدا کر دیا ہے۔

حسبِ ذیل کتابیں مرتب ہو چکی ہیں اور زیرِ طبع ہیں

بچوں کی کہانیاں۔ اردو زبان میں بچوں کے لئے تعمیری ادب کی کمی کا احساس روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ اور ان تمام خدمت گزاران ملک کے نزدیک یہ ایک ایسی کمی ہے جس کی تلافی کے لئے تیز رفتاری کے ساتھ مساعی کا آغاز ہونا چاہیے۔ میر حسن صاحب نے شستہ اور سلیس کہانیوں کا مجموعہ بچوں کے لئے مرتب کیا ہے جو عنقریب شائع ہوگا۔

تہذیب و تمدن کے اجزائے لطیف۔ صنفِ لطیف کے مسائل پر صنفِ لطیف کے افکار کا مجموعہ۔ میر حسن صاحب نے ملک کی صاحبِ فکر خواتین کے مضامین ایک مقدمہ کے ساتھ مرتب کئے ہیں۔ ان مضامین میں خواتین کے مسائل پر خواتین ہی نے عام فہم اور سلیس زبان میں روشنی ڈالی ہے۔

تاریخ ادب انگریزی۔ اردو ادب کی ترقی کے لئے یہ ضروری ہے کہ اردو داں مختلف ترقی یافتہ زبانوں کی تاریخ سے واقف ہوں۔ انگریزی ادب نے جو ترقی کی ہے وہ اردو ادب کی ترقی کے لئے مشعل راہ بن سکتی ہے۔ اسی تعمیری احساس کے تحت میر حسن صاحب کئی سال سے انگریزی ادب کی تاریخ مرتب کر رہے ہیں۔ توقع ہے کہ یہ قابل قدر کتاب جلد شایع ہو جائے گی۔

پروین۔ "پروین" ایک دلچسپ ڈراما ہے جس میں نفسیاتی نقطۂ نظر سے زندگی اور محبت کے ایک نازک مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ محبت کی بے اختیاری جذبۂ ایثار کو پامال نہیں کر سکتی۔ محبت اور ایثار دراصل ایک ہی جذبہ ہے۔ محبت کی انتہائی شکل ایثار کی تعبیر کرتی ہے۔ اس ڈرامے میں اسی کو بے ساختگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

"حق محبوب" اور دوسرے ڈرامے۔ زندگی کی سنجیدگی بعض وقت قہقہوں کا ماحول ڈھونڈتی ہے۔ میر حسن صاحب ایک ڈراما نویس کی حیثیت سے کافی مشہور ہیں۔ اس کتاب میں ان کے مزاحیہ مختصر ڈرامے جمع کئے گئے ہیں۔ ان ڈراموں میں تبسم اور قہقہہ زندگی کے نازک پہلوؤں سے ہم آہنگ نظر آئے گا۔

اللہ نے بچا لیا۔ جدید ادب میں مختصر قصوں کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے۔ میر حسن صاحب مختصر قصے لکھنے میں ہمیشہ کامیاب رہے ہیں۔ "اللہ نے بچایا" کتاب کا جس قدر دلکش نام ہے اسی قدر دلچسپ افسانے اس میں ملیں گے۔

مہتمم "سب رس"

کون کیا ہیں

وقت کی اس ضرورت کو محسوس کر کے کہ ملک کی مشہور اور قابل شخصیتوں کے حالات کا یکجا جمع ہو جانا ازبس ضروری ہے "دکن نیوز" کی مجلس انتظامی نے طے کیا ہے کہ "کون کیا ہیں" کے نام سے ایک نہایت ہی عظیم الشان کتاب ترتیب دیجائے جو زمانہ حاضرہ کی معیاری تاریخ سمجھی جاکر۔

اس کتاب میں ملک کے قابل اہل قلم قومی کارکن، علماء، و مشائخین امراء جاگیردار و وکلاء، حکماء، شعراء، اور عہدہ داران سرکاری غرض ہر طبقہ کی ایسی شخصیتوں کے حالات ان کی تصاویر کے ساتھ ہوں گے جن کی زندگیاں قابل تقلید نمونہ بن سکتی اور جو اپنی ایک انفرادی حیثیت رکھتی ہیں۔

جملہ مراسلت مجلس انتظامی "دکن نیوز" بازار سدی عنبر سے کیجائے

روغن گیسو سنگھار کے
رجسٹرڈ (۱۱۱) دولت آصفیہ

متعلق محقق و مستند اطبا و تجربہ کار نامور ڈاکٹروں کا اظہار خیال ملاحظہ فرمائیے

عالیجناب ڈاکٹر نواب ارسطو یار جنگ بہادر

یہ فرماتے ہیں کہ۔ روغن گیسو سنگھار رجسٹرڈ نمبر (۱۱۱) کے نسخہ کو میں بطور خود دیکھا اور تیل کی آزمایش بھی کیا یہ روغن دماغ کے لئے مفید اور بالوں کی درازی و سیاہی اور پائیداری کے لئے فائدہ مند ہے جسکی میں تصدیق کرتا ہوں۔

عالیجناب الحاج حکیم محمود خاں صاحب (ساکن نامپلی)

یہ فرماتے ہیں کہ۔ روغن گیسو سنگھار میری تجویز سے ہے جو مقوی دماغ اور سر کے بالوں کی درازی و دائمی سیاہی کا ضامن ہونے کے علاوہ خوشگوار عطریت بھی رکھتا ہے جو میرا مجرب ہے۔ اور ہر موسم میں استعمال عورت و مرد کے لئے مفید ہے۔

عالیجناب ابن منصور حکیم محبوب علی خاں صاحب اول مددگار

نظامیہ شفاخانہ سرکار عالی۔ یہ فرماتے ہیں یہ تیل نہایت اچھا رنگین و خوشبودار اور فرحت بخش ہے امید ہے کہ استعمال کرنے کے بعد تجربہ بتلا دیگا کہ موجد کا اعتبار ضرور قابل ستایش ہے خدا کرے جلد غیر ممالک میں بھی روغن گیسو سنگھار ہر دلعزیز ثابت ہو۔

علامۂ وقت مولانا حکیم ابوالفدا محمود احمد صاحب مرحوم

سابق معتمد انجمن اطبا دکن و طبی بورڈ و ممتحن طبیہ کالج سرکار عالی کی یہ رائے یادگار رہیگی۔ روغن گیسو سنگھار جس کو غلام قادر صاحب صدیقی و قاضی غلام محی الدین صاحب نے خاص اہتمام سے تیار کیا ہے اسکے نسخہ کو مینے دیکھا تمام عمدہ اجزاء ہیں اور ترکیب بھی خاص ہے دماغ کی قوت اور بالوں کے لئے سب اچھی چیز ہیں ہیں امید کہ اسکی اہل ملک قدر کریں گے اور اس سے ضرور فائدہ اٹھائیں گے۔

قیمت شیشہ کلاں [illegible] شیشہ خورد [illegible]

عہ ۱۲

تیار کردہ محمد غلام قادر صدیقی و قاضی غلام محی الدین کارخانہ معطر گھر جوہری گلی حیدرآباد دکن سے خرید فرمائیے

(مندرجہ ذیل مقامات سے بھی دستیاب ہو سکتے ہیں)

دواخانہ الحاج حکیم محمود خاں صاحب نامپلی۔ انجمن صدر محاسبی سرکار عالی حیدرآباد بوٹ ہوز پتھر گٹی۔ صدر مخزن کارخانہ روغن گیسو سنگھار معطر گھر جوہری گلی حیدرآباد دکن

نور اللغات

ہماری اردو زبان کی ترقی کے ساتھ ساتھ ایک مفصل اور مستند لغت کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی تھی۔ شکر ہے کہ ملک کے نامور ادیبوں نے اس طرف توجہ کی۔ امیر الشعرا حضرت امیر مینائی کے بعد حضرت سید احمد دہلوی نے فرہنگ آصفیہ کے نام سے کئی جلدوں میں ایک مفصل لغت لکھا اس کے ایک عرصہ کے بعد حضرت نیّر کاکوروی نے برسوں کی تلاش و تحقیق کے بعد ایک نہایت ضخیم لغت تیار کیا ہے جو چار حصوں پر مشتمل ہے اس میں اردو زبان کے ایک ایک حرف کے متعلق بہت خوبی اور خوش اسلوبی سے داد تحقیق دی گئی ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ اتنا بڑا کام ایسے اچھے پیمانے پر ایک فرد واحد سے کیسے انجام پا گیا بعض بعض جگہ ایک ایک لفظ کی تشریح و تحقیق میں کئی کئی صفحے بھرے ہوئے ہیں انداز بیان بہت سادہ لیکن عالمانہ اور حکیمانہ۔ غرض لغت کے سلسلے میں اب تک یہ آخری اور مستند کوشش ہے اور حامیان اردو کی قدر دانی کی مستحق۔

ریویو

مرتبہ مولوی نور الحسن صاحب نیّر بی۔ اے۔ ال ال بی

بڑی تقطیع (۸۰۲۹) صفحات قیمت مجلد للعہ

اُردو زبان کی لغات میں نور اللغات اپنے طرز کی تنہا لغت ہے جو بالکل جدید اصول پر مرتب کی گئی ہے اور الفاظ کے ذخیرے کے لحاظ سے بھی غالباً تمام دوسرے لغت سے افضل ہے مرتب نے اسے بے حد محنت جانفشانی کے بعد مکمل کیا ہے اس لغت کی اشاعت سے اردو زبان کی کتابوں میں ایک قابل قدر اضافہ ہوا ہے امید ہے کہ اہل علم و زبان دان حضرات اس کی قدر کما حقہ کریں گے اور مرتب کی محنت کی داد دیں گے۔

"زمانہ"

مولوی نور الحسن صاحب نیّر بی۔ اے۔ ال ال بی

بڑی تقطیع (۸۰۲۹) صفحات پر مشتمل ہے۔

اردو کے تمام مروجہ الفاظ، محاورات، ضرب الامثال، دخیل کلمات کا پورا استقصا کیا گیا ہے اور شعرا و اساتذہ کے کلام نظم و نثر سے ہر جگہ استناد کیا گیا ہے دیباچہ میں متروک الاستعمال سے بھی عجیب بحث کی گئی ہے اور قواعد کے لحاظ سے الفاظ کی فصاحت پر جس قدر اثر پڑتا ہے متعدد مثالوں سے سمجھایا ہے۔

"نگار"

نور اللغات ۔۔۔۔ جلد اوّل الف۔ ب صفحات (۸۴۲)، قیمت عـہ

" " ۔۔۔۔ جلد دوم پ سے خ " (۵۱۴) " لـہ

نور اللغات ۔۔۔۔ جلد سوم د سے ق صفحات (۹۲۱) قیمت عـہ

" " ۔۔۔۔ جلد چہارم ک سے ی " (۱۰۳۲) " مـہ

تمام یونانی مرکبات کا مخزن
(یونانی طبی بورڈ قائم شدہ ۱۳۲۳ف)
خصوصیات
یہاں کے ادویہ ملک کے نامور اطباء کی زیر نگرانی تیار ہوتی ہیں۔ اس دواخانہ میں عالیجناب حکیم محمد ہبتہ اللہ صاحب مولوی فاضل و حکیم کامل طبیہ کالج دہلی پروفیسر نظامیہ طبیہ کالج معتمد انجمن اطباء یونانی صبح ۸ تا ۱۰ شام ۵ تا ۸ مطب فرماتے ہیں
جمعہ اور یکشنبہ کو ۴ سے ۶ تک ملک کے مشہور اطباء مریضوں کا معائنہ و علاج کرتے ہیں۔
تفصیلی فہرست ٹکٹ روانہ فرما کر مفت حاصل کیجیے
یونانی طبی بورڈ۔ افضل گنج حیدرآباد دکن
قلموں کا خزانہ
ہر قسم کے فونٹن پن کم سے کم زیادہ سے زیادہ قیمتوں میں دکن پن اسٹور شاہراہ عثمانی
عابد روڈ سے طلب فرمائیے نیز ہمہ اقسام کے فونٹن پن کی درستگی
گیارنٹی کیساتھ کیجاتی ہے
حیدرآباد کا ممتاز مقام
چوراہا افضل گنج روڈ
مجسٹک ریڈیو ہوس
جہاں تجربہ کار ماہرین ریڈیو موجود ہیں۔ ریڈیو سٹ اور لابرقی ریڈیو کی خریداری اور ہمہ اقسام کے ریڈیو کی مرمت کیلئے ہماری خدمات حاصل فرمائیے
ہر گھر میں آج کل یہی چرچا ہے
کیونکہ خوش رنگ خوشبودار ذائقہ میں بے مثال ہونیکے علاوہ فرحت بخش ہے
آپ بھی ایکبار آزمائش فرمائیے
(رجسٹرڈ آصفیہ ۳۲۵)
گولکنڈہ مکسچر چائے
ایجنٹ حمید اینڈ کمپنی شاہ علی بنڈہ حیدرآباد دکن

SPECIAL OFFER
خصوصی پیش کش
۱۵ فیصد رعایت
پوری جیول سے مرصع لیور۔ اعلیٰ درجہ کے نمونے نہایت مضبوط۔
خول نمایاں۔ سوئیاں وہندسے۔ تین سال کی گیارنٹی، گولڈ۔
رولڈ گولڈ۔ اور کرومیم۔ میں مل سکتی ہیں۔
جلال اینڈ سنس
گورنمنٹ وریلوے سپلائرس ماہرین مرمت
عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن (صدر دفتر مدراس)

اردو نمبر

ادارۂ ادبیات اردو

حیدرآباد دکن

نشان ٹپہ آصفیہ (۱۵۳)

رجسٹرڈ نمبر (M 3350)
ٹیلیفون نمبر (۲۲۰۹)

اردو نامہ

یعنی

ادارہ ادبیاتِ اردو کے ماہنامہ

سب رس

کا سالگرہ نمبر بابتہ جنوری سنہ ۱۹۴۲ء

زیرِ نگرانی

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

مجلسِ ادارت

صاحبزادہ میر محمد علی خان میکش — سکینہ بیگم
خواجہ حمید الدین شاہد — عبدالحفیظ صدیقی (بی اس سی)

معین الدین احمد انصاری

دفتر ادارۂ ادبیاتِ اردو خیریت آباد حیدرآباد دکن سے شائع ہوا

سب رس کے مقاصد و قواعد

(۱) یہ ادارہ ادبیات اردو کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ ہے جس میں اردو زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوگی۔

(۲) مضامین متعلقہ سیاسیات حاضرہ اور مذہبی مباحث کسی صورت میں قابل اشاعت متصور نہ ہوں گے۔

(۳) اردو مطبوعات پر بے لاگ تنقید کر کے اردو تصنیف و تالیف کا ذوق صحیح پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

(۴) غیر زبانوں کے شاہکار مضامین کو اردو میں منتقل کر کے اردو کے علمی و ادبی سرمایہ میں اضافہ کیا جائے گا۔

(۵) یہ رسالہ کم از کم (۶۴) صفحات اور زیادہ سے زیادہ (۹۶) صفحات پر ہر ماہ عیسوی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوا کرے گا۔

(۶) رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع پندرہ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جانی چاہیے۔

(۷) جواب طلب امور کے لیے جوابی پوسٹ کارڈ یا لفافہ آنا ضروری ہے۔

(۸) خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا جائے۔

(۹) اشتہارات کی اجرت پیشگی لی جائے گی۔ وی پی کے ذریعے سے وصولی منظور نہیں کی جائے گی۔

سب رس کی قیمت

بلدہ حیدرآباد کے لئے

سالانہ	شش ماہی	فی پرچہ
چار روپے	دو روپے آٹھ آنے۔	چھ آنے

شہر میں یا شہر سے باہر بذریعہ ٹپہ

سالانہ	شش ماہی	فی پرچہ
۴ روپے آٹھ آنے۔	دو روپے بارہ آنے	سات آنے

بچوں کے سب رس کی قیمت

بلدہ حیدرآباد کے لئے

سالانہ	شش ماہی	فی پرچہ
ایک روپیہ	دس آنے	ڈیڑھ آنہ

شہر میں یا شہر سے باہر بذریعہ ٹپہ

سالانہ	شش ماہی	فی پرچہ
ایک روپیہ آٹھ آنے	بارہ آنے	دو آنے

سب رس معلومات کی قیمت

بلدہ حیدرآباد کے لئے

سالانہ	شش ماہی	فی پرچہ
ایک روپیہ	دس آنے	ڈیڑھ آنہ

شہر میں یا شہر سے باہر بذریعہ ٹپہ

سالانہ	شش ماہی	فی پرچہ
ایک روپیہ آٹھ آنے	بارہ آنے	دو آنے

خاص نمبر — محرم نمبر ۱۲ / - اقبال نمبر ۸ / - دکن نمبر ۱ / - اردو نامہ ۱ /

سب رس معلومات

حیدرآباد کے مشہور و مقبول رسالہ سب رس کے اس ضمیمے میں مشاہیر کی زندگیاں عام فہم سائنس کے مضامین تعلیمی اور سیاسی خبریں مسابقتی امتحانات سے متعلق معلومات کھیل کی خبریں وغیرہ شامل رہیں گی۔ اس ضمیمے کا اصل مقصد یہ ہے کہ جو لوگ حیدرآباد یا برطانوی ہند کے مسابقتی امتحانات میں حصہ لینا چاہیں ان کے لئے اردو زبان میں قیمتی معلومات اور حالات حاضرہ سے متعلق تمام باتیں فراہم کی جائیں ایسے حضرات کے علاوہ جن لوگوں کو علمی باتوں اور معلومات سے دلچسپی ہے اور غزلوں اور افسانوں کو چھوڑ کر زمانے کی رفتار پر بھی نظر رکھنا چاہتے ہیں یقین ہے کہ وہ اس حصے سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں گے۔

سب رس - اردو نامہ جنوری سنہ ۱۹۴ء

فہرست تصاویر

مشاہیر اردو کا تاریخی گروپ

فرش پر بیٹھے ہوئے:- (۱) سر عبد القادر (۲) حافظ ساجد علی وکیل اورنگ آباد (۳) ظفر عمر۔

کرسیوں پر سامنے:- (۱) غلام محمد منشی (۲) سر اکبر حیدری (۳) وقار الملک (۴) حکیم محمد اجمل خاں (۵) حالی (۶) عزیز مرزا (۷) محسن الملک۔
(۸) مرزا محمود علی خاں (۹) منشی محبوب عالم۔

کرسیوں پر دوسری صف:- (۱) علی الدین حسن (۲) شبلی (۳) پروفیسر آرنلڈ (۴) نذیر احمد (۵) نواب ابو الحسن خاں۔

کرسیوں پر تیسری صف:- (۱) ظفر علی خاں (دستار میں) (۲) سر محمد اقبال (۳) نور المنیب اللہ حیدر آبادی (شملے میں)

پیچھے کھڑے ہوئے:- (غلام محمد منشی سے حکیم اجمل خاں تک) (۱) ابو الحسن (۲) خواجہ غلام الثقلین (شملے میں) (۳) حبیب الرحمٰن خاں شروانی (۴) مسعود علی محوی۔

پیچھے کھڑے ہوئے:- (منشی محبوب عالم کے پیچھے) (۱) قاسم دین (شملے میں) (۲) مصطفیٰ علی وکیل جالنہ۔

وسط میں استادہ:- ظفر علی خاں کے پیچھے ستون سے لگے ہوئے غلام جیلانی۔ نور المنیب اللہ کے پیچھے شرف الحق۔

نوٹ:- اس اہم تاریخی گروپ کے اصحاب کے پہچاننے میں سر عبد القادر اور مولوی نور المنیب اللہ صاحب وکیل نے سب رس کی جو مدد کی ہے اس کے لئے ادارہ شکر گزار ہے۔
یہ تصویر اگرچہ پہلے سب رس بابت جولائی ۱۹۳۸ء میں شائع ہو چکی تھی لیکن مولوی نور المنیب اللہ صاحب کی مدد اور مشورہ ہی کی وجہ سے دوبارہ بڑی بنا کر چھاپی جا رہی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ اصحاب کے نام معلوم ہو سکیں اور جو نام غلط لکھ دیئے گئے تھے ان کی تصحیح ہو سکے۔

مشاہیر اردو کا تاریخی گروپ

فہرست مضامین

(غزلیات)

مشاہیر کے غیر مطبوعہ خطوط

خوابِ شیریں

تو، خواب کے مانند گزر جاتا ہے
تو، آنکھوں میں نیند کی طرح آتا ہے
تو، پاس آتا ہے جب، میں سوجاتا ہوں
تجھ کو پاکر میں آپ کھو جاتا ہوں

رباعی

بے خود میں رہوں، تو وہ قریں آتا ہے
اس پردے میں، وہ پردہ نشیں آتا ہے
جب وہ آتا ہے، میں نہیں رہتا ہوں
میں جب رہتا ہوں، وہ نہیں آتا ہے

اے نیند عجیب طرح ڈالی تو نے
میری آنکھوں میں رہ نکالی تو نے

رباعی

کونین کی فکروں سے فراموشی ہے
خاموشی میں کیفیتِ سرگوشی ہے
آنکھیں لذت میں ڈوب کر بند ہوئیں
یہ نیند ہے، یا تری ہم آغوشی ہے

ان بند پپوٹوں نے چھپایا ہے کسے
ان نور کی پتلیوں نے پایا ہے کسے
مستی میں بھی ہوشیار ہوں، واہ رے میں
بند آنکھوں سے دیکھتا ہوں اللہ رے میں
ہے صاحبِ عرش کا مکاں آنکھوں میں
ہے نورِ زمین و آسماں، آنکھوں میں

رباعی

اصلیت اگر نہیں، تو دھوکا ہی سہی
اللہ! بہت نہیں، تو تھوڑا ہی سہی
تسکین کی آخر کوئی صورت بھی تو ہو
رُویت ممکن نہیں، تو رویا ہی سہی

سیّد احمد حسین امجد

کایا پلٹ

(میکش صاحب ورڈزورتھ کی نظموں کا منظوم ترجمہ کر رہے ہیں "کایا پلٹ" اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ شاہد)

اس کاغذی گلزار میں بو ڈھونڈنے والے! — بے جان لکیروں میں لہو ڈھونڈنے والے!
ابرو میں شکن ہے، ترے ماتھے پہ پسینہ — ساحل سے مگر دور ہے "کاغذ کا سفینہ"
غیروں کے بنائے ہوئے نغموں کو چبانا — ایسا ہی ہے جیسے کسی "گونگے کا ترانا"
انوارِ بصیرت پہ نہ چھا جائے "سیاہی" — آنکھوں کے لئے مانگ لے آزاد نگاہی

اٹھ اور نگاہوں سے کتابوں کو ہٹا دے
فطرت کے حسیں رخ سے نقابوں کو ہٹا دے

وہ دیکھ حسیں شام کی رنگین جوانی — کھیتوں کو سناتی ہے بہاروں کی کہانی
وہ دامنِ کہسار میں جھرنے کا ترنم — تتلی کے وہ چھو لینے سے کلیوں کا تبسم
جگنو میں جھلکتا ہے، مہ نو کا اشارا — لیتے ہوئے مخمور فضاؤں کا سہارا

کر دفن کتابوں میں غمِ لاتناہی — وہ دیکھ کہ لی طائرِ رنگیں نے جماہی
پیپل کی لچکتی ہوئی ٹہنی کو جھکا کر — آکاش پہ تاروں کو بلاتا ہے وہ، گا کر
سوگند مری روح کی، یہ مست ترانے — دنیا میں لٹاتے ہیں، مسرت کے خزانے
دیکھ، ان میں حیات آفریں نکہتوں کی روانی — سن، ان میں خرد بخشی فطرت کی کہانی

ان نغموں میں گم ہو کے تمنائے اثر سیکھ — تسخیرِ جہاں کے لئے اندازِ نظر سیکھ
خوابیدہ دماغوں کو جگاتے ہیں یہ نغمے — فطرت کی طرف دل کو بلاتے ہیں یہ نغمے

بکھرے ہوئے پھولوں کی بھی اک ہلکی سی جنبش — ہے بربطِ تحقیق کا اک نغمۂ دانش
انساں کی حقیقت کا کھلا راز ہے گویا — اک دور سے آئی ہوئی آواز ہے گویا

یہ عقل غریب آشنا، تخئیل کی دشمن — انساں کے لئے "محنتِ فردا" کی ہے الجھن
یہ عقل سیہ داغ ہے فطرت کی جبیں پر — بھٹکی ہوئی اک آگ ہے فردوسِ بریں پر
اس عقل کے ہاتھوں سے بگڑ جاتی ہے ہستی — زنجیرِ تعین میں جکڑ جاتی ہے ہستی
اس عقل و خرد کو رہِ فطرت میں گنوا دے — آزاد نگاہوں سے کتابوں کو ہٹا دے

اٹھ اور یہیں اپنے لئے مانگ لے "وہ دل"
ہر شے میں نظر آئے جسے "علم کا حاصل"

میکش

اداریہ

"سب رس" کی زندگی کا تیسرا سال "اُردو نمبر" سے شروع ہو رہا ہے۔ گزشتہ دو سال میں اس کی ترقی جس صحت بخش طریقے سے ہوئی ہے، اس کا اظہار یہاں بے ضرورت ہوگا اس لیے کہ "سب رس" ارباب ملک سے ہمیشہ قریب تر رہا ہے اور ملک کے دماغوں سے نکلے ہوئے علمی و ادبی سرمائے کو ملک کے دماغوں تک پہنچانے میں اُس کی پُرخلوص کوشش قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی رہی۔

یورپ کی موجودہ صورت حال صحافت کے لیے صبر آزما بن گئی ہے۔ اشیاء کی غیر معمولی گرانی نے ظاہری معیار کو پست کر دیا ہے اور ارباب صحافت کے لیے اپنی ساکھ کو قائم رکھنے کے لیے دو ہی راستے کھلے ہوئے ہیں۔ چندہ میں اضافہ یا موجودہ چندہ کا بدل۔ لیکن ہم نہیں چاہتے کہ خدمت ادب کی راہ میں کسی عذر کو خواہ وہ حقیقت سے قریب ہی کیوں نہ ہو "سنگ گراں" باور کرائیں۔ اسی احساس کے پیشِ نظر ہم نے اپنے اعلانات کے مطابق "اُردو نمبر" کو شاندار بنانے کی کوشش کی ہے اور سب رس کا روایاتی معیار باقی رکھا ہے بلکہ ہمیں یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ اس کو بلند تر کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

سرورق "اُردو نمبر" کے لیے سرورق کا انتخاب یقیناً ایک نازک کام تھا۔ اس لیے کہ ادبیات جدید دور نے "ظاہر و باطن" کی حدیں ملادی ہیں جس طرح ادب اور زندگی کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا اسی طرح اچھی کتاب نام ہے، اپنے موضوع، اندازِ بیان اور دیدہ زیبی کا۔ ایک بدنما پھول، اپنی خوش بُو کے باوجود گیسوؤں کی زینت نہیں بن سکتا۔ ہم نے جب موزوں سرورق کے متعلق غور کیا تو ہمارے تصور میں جامعۂ عثمانیہ کے کلیۂ فنون کی وہ حسین و شاندار عمارت آئی جو اپنی طرزِ تعمیر میں تہذیب و تمدن کا ایک سرمایہ رکھتی ہے۔ جامعۂ عثمانیہ نے ترقی اُردو میں جو حصہ لیا ہے وہ عہد آفریں ہے۔ کلیۂ فنون کی عمارت ہند و مسلم تہذیبوں کے امتزاج کا خوش گوار نمونہ ہے اور اس عمارت کا افتتاح اُردو کے سب سے بڑے محسن اعلیٰ حضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ نے فرمایا ہے۔ یہی وہ غیر معمولی خصوصیات ہیں جن کے باعث اُردو نمبر کے سرورق پر جامعۂ عثمانیہ کے کلیۂ فنون کی تصویر ہی موزوں ترین سمجھی گئی۔

یہ تصویر جو "اُردو نمبر" کے سرورق پر دکن کی "خدمت اُردو" کے نمایاں ثبوت میں شایع کی جا رہی ہے، اصل میں چاندی کے اس کیسکٹ کا عکس ہے جو پندرہ ہزار روپیے کے صرفے سے تیار ہوا اور بارگاہِ سلطان العلوم میں افتتاح کلیۂ فنون کے موقع پر گزرانا گیا۔ کلیۂ فنون کی عمارت چونے اور پتھر سے بنائی گئی ہے اور اس کا یہ نمونہ چاندی سے تیار کیا گیا ہے۔ لیکن ان دونوں میں عثمانیین کے دلوں کا سکون پرور اضطراب، روح کا تقدس اور علم و عمل کی پاکیزگی دکھائی دیتی ہے۔ فن کاروں کا یہ سب سے بڑا کمال ہے کہ انھوں نے حُسن کو حقیقت سے ہم آہنگ کر دیا۔

تصویریں "اُردو نمبر" کی مناسبت سے اس کی تمام تر تصویریں یا تو اُردو ادب کے شاعروں، ادیبوں اور محسنوں کی ہیں یا اُردو سے تعلق رکھتی ہیں جیسا کہ

ہم نے پہلے بھی کہا ہے، جنگ کی وجہ سے کاغذ، بلاک سازی اور طباعت میں جو گرانی پیدا ہوگئی ہے اُس کے پیش نظر ایک ہی نمبر میں تقریباً پچاس تصویروں کا شائع کرنا معمولی بات نہیں ہے۔ اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنھوں نے کبھی اس کوچہ میں قدم رکھا ہے۔ اس واقعے کا اظہار ہم محض یہ بتانے کے لیے کر رہے ہیں کہ ہمیں "سب رس" کتنا عزیز ہے اور ہم اس کو مقبول و مفید بنانے کے لیے کیا کر رہے ہیں۔

مشاہیر اُردو کے غیر مطبوعہ خطوط۔ ادبیات میں مکتوبات کی خاص اہمیت ہے۔ اس لیے کہ مکتوبات زندگی کا آئینہ ہوتے ہیں جن میں کاتب بے تکلفی کے ساتھ اپنی زندگی کے عکس پیش کرتا ہے۔ چونکہ مکتوب چھپوانے کے خیال سے نہیں لکھا جاتا اس لیے اُس میں سادگی اور بے ساختہ پن ہوتا ہے۔ اسی لیے مشاہیر کے خطوط کا ذخیرہ ہر زبان میں محفوظ کیا جاتا رہا ہے۔ اُردو میں بھی مکتوبات کے بعض مجموعے شائع کیے گئے ہیں۔ آپ کو اس نمبر میں مشاہیر اُردو کے سولہ غیر مطبوعہ خطوط ملیں گے جو پہلی دفعہ شائع ہو کر منظر عام پر آ رہے ہیں۔ شبلی، داغ، ۔۔۔۔، طیبہ بیگم، گرامی، شاد عظیم آبادی، راشد الخیری اور ممتاز علی وغیرہ کے نام اور کام سے ہر اُردو داں واقف ہے۔ یہ مکاتیب اُردو ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہیں۔ یہاں یہ کہہ دینا بے محل نہ ہوگا کہ ادارۂ ادبیات اُردو اکثر مشاہیر اُردو کی غیر مطبوعہ تحریریں جمع کر رہا ہے اور اسی ذخیرے سے چند اُردو خطوط اُردو نمبر کے لیے حاصل کیے گئے ہیں۔

اُردو پروفیسروں کے حالات اُردو ادب کی تاریخ، ان خاموش خدمت گزاروں کے تذکرے کے بغیر ناکمل رہے گی جن کی رہنمائی نوجوانوں میں اپنی زبان کی خدمت کرنے کا ذوق پیدا کرتی ہے، زبان کے ان خدمت گزاروں پر بہت کم لوگوں کی نظر گئی ہے۔ ادیبوں، انشا پردازوں اور شاعروں کو سراہنے والے ان کو کسی طرح نہیں بھلا سکتے، جن کی دماغی محنت اور ایثار سے نوخیز ادیبوں، انشا پردازوں اور شاعروں کی صحت بخش تربیت ہوتی ہے۔ اس نمبر میں ہم نے ہندوستان کی مختلف جامعات کے اساتذۂ اُردو کے حالات اور خدمات سے اہل زبان کو روشناس کرایا ہے۔ افسوس ہے کہ بعض حضرات نے اپنے حالات روانہ نہیں کیے ورنہ یہ تذکرہ مکمل ہو جاتا۔ اب اس کی تکمیل کا یہی طریقہ رہ گیا ہے کہ اس کو ایک جداگانہ کتاب کی صورت میں شائع کیا جائے "ادارۂ ادبیات اُردو" ایسی ایک کتاب شائع کر رہا ہے جس میں گزشتہ اساتذہ کے حالات و خدمات کا تذکرہ بھی شریک رہے گا۔

حصۂ نظم و نثر اُردو نمبر کا حصۂ نظم پُر تنوع اور بلند پایہ ہے۔ اس کے لیے اکثر و بیشتر مشہور شاعروں کی غیر مطبوعہ غزلیں اور نظمیں خاص طور پر حاصل کی گئی ہیں۔ جلیل، امجد، علی منظور، ماہر، ساغر، حفیظ جالندھری، صفی اورنگ آبادی، احسان دانش، جنجر، مخدوم، وجد، وغیرہ، کی غزلوں اور نظموں میں جو قدیم اور جدید طرز شاعری کے نمونے ہیں، آپ اُردو شاعری کے مختلف رجحانات دیکھیں گے۔

حصۂ نثر میں ہندوستان کے بہترین انشا پردازوں کے معلومات آفریں مضامین اور مقالے شامل ہیں، جو "سب رس" کے لیے خاص طور پر حاصل کیے گئے ہیں۔

ڈاکٹر زور۔ احسن یار جنگ۔ سید عارف الدین۔ عزیز یار جنگ۔ بہادر یار جنگ۔ سر عبدالقادر۔ محمد اکرام۔ سیف علیخان۔ ہاشمی
اقبال علی پروفیسر سروری۔ ظہیر الدین احمد۔ پروفیسر سید محمد۔ ناصر الدین احمد۔ پروفیسر فضل حق۔ ڈاکٹر امیر علیخان
عارف علی۔ کمال علی۔ پروفیسر مجید صدیقی۔ سراج الدین احمد۔ عبد الحفیظ۔ حمید الدین شاہد

مرزا فرحت اللہ بیگ، ایم اسلم، ماہر القادری، علامہ ڈاکٹر نجم الدین احمد جعفری، پروفیسر عبد القادر سروری کے علاوہ متعدد ایسے اصحاب کی قلم کاری کے نتائج آپ کو اس نمبر میں ملیں گے جنھوں نے اپنی زندگی خاص خاص موضوعوں کے لیے وقف کر رکھی ہے۔

سب رس کی معلومات

اس نمبر سے بچوں کے ضمیمہ کے علاوہ ایک اور ضمیمۂ معلومات کا اضافہ کیا جا رہا ہے۔ جس میں عام فہم طریقے سے تازہ معلومات فراہم کی جائیں گی۔ زندگی کی بڑھتی ہوئی مصروفیتوں نے ایک طرف وقت کو تنگ بنا دیا ہے اور دوسری طرف رفتار زمانہ سے واقف رہنا ناگزیر ہے۔ اس لیے کم وقت میں بہت کچھ حاصل کرنے کے مواقع فراہم کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ ضمیمہ ان طلبہ کے لیے خاص طور پر مفید ہوگا جو امتحانات مقابلہ کے لیے تیاری کرتے ہیں۔ کیونکہ اس میں سائنس اور دیگر جدید علوم کے علاوہ مقابلہ کے امتحانوں کی ضروریات اور اطلاعیں شایع ہوتی رہیں گی۔ اس ضمیمہ کی ترتیب کا کام مولوی عبد الحفیظ صاحب صدیقی بی، ایس سی کے سپرد کیا گیا ہے ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ضمیمہ ان اصحاب کے لیے جو اپنی مصروفیتوں کے باعث مطالعہ کے لیے بہت کم وقت دے سکتے ہوں، کار آمد ہوگا۔

ادارۂ ادبیات اردو

بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کے باعث اس وسیع کام کو جس کی انجام دہی مرکزی ادارے کے لئے دقت طلب ثابت ہو رہی تھی، شعبہ واری تقسیم کے ذریعے سے پھیلا دیا گیا ہے۔ اس طرح اب تک شعبۂ زبان، شعبۂ تالیف و تراجم، شعبۂ تاریخ دکن، شعبۂ شعرا و مصنفین دکن، شعبۂ تنقید، شعبۂ سائنس، شعبۂ امتحانات، شعبۂ نسواں، شعبۂ اطفال اور شعبۂ طلبہ قائم ہو چکے ہیں۔ اور ادارہ کے کام میں تنظیم کے ساتھ وسعت ہوتی جا رہی ہے۔ ملک کے علم دوست اور اہل ذوق خواتین و اصحاب کی معاونت سے ان شعبوں نے ایک انفرادی حیثیت حاصل کر لی ہے اور ہر شعبہ اپنے مفوضہ کام کو دلچسپی کے ساتھ انجام دے رہا ہے۔ یہ شعبے نہ صرف مختلف مسائل پر غور و خوض کر رہے ہیں بلکہ ان کی جانب سے خاص موضوع پر کتابیں تصنیف و تالیف کروائی جا رہی ہیں۔ ہم چاہتے تھے کہ یہاں ادارے کی شعبہ جاتی مصروفیتوں کو تفصیل کے ساتھ پیش کریں لیکن ادارہ سے ہم سفارش کر رہے ہیں کہ وہ ایک کتابچہ شایع کرے جس میں ادارے کی مکمل روداد ہو۔ خدا کا شکر ہے کہ ادارہ نے حیدر آباد میں اپنے خلوص عمل اور ذوق کار سے کافی مقبولیت حاصل کر لی ہے اور اس کی عملی کوششوں کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جا رہا ہے۔ اس لئے ایسے کتابچے کی اشاعت ارباب ملک کو یہ واقف کرانے کے لئے ضروری ہے کہ ادارے نے اب تک کیا کیا؟ اور اب وہ کیا کر رہا ہے؟

ایک وسیع کتب خانے کے قیام کی اسکیم جس میں تمام قدیم و جدید اردو کتابیں ہوں زیر غور ہے تاہم فی الحال ادارہ کے دفتر ہی میں ایک کتب خانہ قائم کیا گیا ہے۔ اس کتب خانہ میں دکنی مخطوطات کا بھی ایک قابل لحاظ ذخیرہ ہے۔ ملک کے وہ اہل ذوق اصحاب جو زبان کی خدمت کو ایک مقدس فرض سمجھتے ہیں، اس کتب خانے کے لئے قلمی و مطبوعہ کتابیں فراہم کرنے میں مدد دیں تو یقین ہے کہ اردو سے دلچسپی رکھنے والوں اور اردو ادب پر تحقیقی کام کرنے والوں کی ایک مشکل حل ہو جا سکتی ہے۔

"مرکزی ادارے" نے صرف بلدے کے اصحابِ ذوق کا تعاون حاصل کیا تھا۔ اور یہ ناممکن تھا کہ اضلاع حیدرآباد کے خدمت گزارانِ اردو اپنی اعانت سے ادارے کو محروم رکھیں۔ اردو زبان حیدرآباد کی قومی اور سرکاری زبان ہے اس لئے اس کے ہر دیہات میں بولی اور سمجھی جاتی ہے لیکن بلدہ سے زیادہ اہلِ دیہات میں اشاعتِ اردو کا کام اس لئے ہونا چاہئے کہ ...... وہ شہر سے دور ایسے گوشوں میں اپنی زندگی گزار رہے ہیں، جو شہری سہولتوں سے محروم ہے۔ ادارہ کی شاخیں اب تک اورنگ آباد، محبوب نگر، جالنہ اور عثمان آباد میں قائم ہو چکی ہیں۔ اور توقع ہے کہ حیدرآباد کے ہر گوشے میں اس کی شاخ قائم ہو جائے گی۔ ہم اضلاعی شاخوں سے بلند آہنگ توقعات وابستہ کرنے میں غلطی نہیں کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ وہ اضلاع میں رہ کر اضلاع کی ضروریات سے بہت زیادہ واقف ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان کی پُرخلوص کوشش سے حیدرآباد کے ہر گوشے میں اردو ادب عام ہو جائے۔ یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ جاہلیت کے خلاف ایک مستحکم محاذ قائم کیا جائے۔

یہ کوئی دقت طلب کام نہیں ہے اگر ارادہ میں پختگی، مزاج میں استقلال اور دل میں خلوص ہو۔ ادارہ نے شعبۂ امتحانات قائم کر کے ایک راہِ عمل کھول دی ہے۔ اس لئے شہری شاخوں کو چاہیئے کہ وہ زیادہ سے زیادہ طالب علموں کو ادارہ کے امتحانات کی تیاری کے لئے آمادہ کریں اور ترغیب و مدد سے انھیں اس قابل بنائیں کہ وہ امتحانوں میں کامیابی حاصل کر سکیں۔

<u>شاخ محبوب نگر</u>:۔ صدر۔ مولوی سید نقی صاحب بلگرامی بیرسٹر اٹلا ناظم عدالت ضلع۔ نائب صدر۔ مولوی احمد عبداللہ صاحب مسدسی بی اے ال ال بی۔ معتمد۔ مولوی حسن علی مرزا صاحب وکیل۔ شریک معتمد مولوی عمر علی صاحب فاروقی وکیل۔

اراکین:۔ پنڈت نارائن راؤ صاحب وکیل۔ ہنمنت راؤ صاحب وکیل۔ مولوی عبدالرزاق خاں صاحب صولت بی اے ال ال بی وکیل۔ تندگیری وینکٹ راؤ صاحب بی اے ال ال بی وکیل۔ ڈاکٹر افتخار الدین صاحب سیول سرجن۔ سید ساجد علی صاحب مہتمم تعلیمات۔ مولوی سالم مسدوسی صاحب۔ مولوی عبدالعزیز صاحب گتہ دار۔ مولوی عبدالرحمٰن صاحب آواز گتہ دار۔

<u>شاخ جالنہ</u>:۔ صدر۔ مولوی افضل علی صاحب وکیل ہائیکورٹ۔ معتمد۔ مولوی افضل عابدی صاحب وفا۔ مہتمم مولوی سید عمر صاحب مولوی فاضل۔ کتب خانہ دار مسٹر غازی۔

نشرگاہ حیدرآباد

موجودہ زمانے میں نشریات نے جو غیر معمولی اہمیت حاصل کر لی ہے وہ محتاجِ تشریح نہیں۔ ریڈیو تفریحی اور تعمیری دونوں حیثیتوں سے تمدنِ حاضرہ میں اپنا ممتاز مقام رکھتا ہے۔ برق کی ترسیلی قوت نے صوتی لحاظ سے ایک عالمی ارتباط پیدا کر دیا ہے۔ اور اس کی وجہ سے دنیا کے مختلف گوشے ایک دوسرے سے اتنے قریب ہو گئے ہیں جتنے کہ اس سے پہلے کبھی نہیں تھے۔ ریڈیو نے ملک و قوم کی خدمت کے نئے راستے کھول دئے ہیں۔ جس طرح فلم سے تعلیم و تہذیب کی اشاعت میں مدد لی جا سکتی ہے، اسی طرح ریڈیو کے ذریعے سے بھی زیادہ وسعت کے ساتھ تعمیری کام لیا جا سکتا ہے۔ ریڈیو سے جو خدمات ہو سکتی ہیں، ان میں خدمتِ زبان بھی ہے۔ دنیا بھر کی نشرگاہوں سے ادبی پروگرام کی نشر عوام میں " ادبی ذوق " پیدا کر رہی ہے۔ چونکہ ریڈیو کا راست تعلق عوام سے بھی ہے اس لئے ذریعۂ نشر وہی زبان ہو سکتی ہے جو عوام کی مشترکہ زبان ہو۔ بدقسمتی سے ہندوستان میں زبان کے مسئلہ کو سیاسی رنگ دیا گیا ہے اور یہ بحث ختم ہوتی نظر نہیں آتی کہ ہندوستان کی مشترکہ زبان اردو ہے یا ہندی؟

افسوس ہے کہ ادنیٰ تعصبات کی پھیلی ہوئی تاریکی میں ایک کرن بھی ایسی نہیں جو انتہا پسندوں کو ایک مقام پر لاسکے۔ لیکن جب "آل انڈیا ریڈیو" نے اپنے سننے والوں سے دریافت کیا کہ وہ کس زبان میں پروگرام سننا پسند کرتے ہیں تو زیادہ خط اردو (ہندوستانی) کی تائید میں وصول ہوئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو ہندوستان بھر میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ جس طرح ہندوستان کے فنون لطیفہ اپنے میں ہندوستانی تمدن کی روح رکھتے ہیں اسی طرح اردو بھی ہندوستان کے مشترکہ تمدن کی نشانی ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ حیدرآباد میں زبان کا مسئلہ ابھی تک خارزار سیاست میں نہیں الجھا ہے اور "سیاسی دیوانگی" کا داؤں ہمیشہ چٹ ہی پڑا ہے۔ اردو حیدرآباد کی قومی اور ملکی زبان ہے۔ اس لئے اردو کی خدمت نہ صرف ملک و قوم بلکہ اپنی حقیقی تہذیب کی خدمت ہے۔

نشرگاہ حیدرآباد کا کل ہند بنیادوں پر حال ہی میں افتتاح ہوا ہے۔ لیکن وہ اردو کی جو خدمت کر رہی ہے قابل مبارکباد ہے ہمارے ملک میں ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک اردو بولی یا سمجھی جاتی ہے، ہماری دفتری زبان اردو ہے، ہمارا ذریعۂ تعلیم اردو ہے اس لئے یہ ناممکن تھا کہ ہمارا ذریعۂ نشر بھی اردو نہ ہو۔ جہاں تک ہم سمجھ سکے ہیں نشرگاہ کی سرکاری اور غیر سرکاری تقریروں میں جو زبان استعمال کی جاتی ہے وہ اردو کے موجودہ رجحانات کا صحیح عکس ہے۔ اس کو ہندی نوازی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور نہ فارسی و عربی آمیز اردو سمجھا جا سکتا ہے۔ ہم ملک کے تمام حقیقت شناس باشندوں کی جانب سے یقین دلاتے ہیں کہ یہی زبان ہماری زبان ہے۔ ہم نشرگاہ حیدرآباد سے استدعا کریں گے کہ وہ بے جا اعتراضوں کو درمیان میں لائے بغیر زبان کے معاملہ میں موجودہ حکمت عملی ہی پر کاربند رہے تاکہ پروگرام کو زیادہ سے زیادہ۔ لوگ سنیں اور سمجھیں۔

چونکہ نشرگاہ حیدرآباد کی تقریریں عوام میں ایک علمی و ادبی بیداری پیدا کرنے میں معاون ثابت ہو رہی ہیں اس لئے ادارۂ ادبیات اردو نے ان کو مقرر صاحبان کی اجازت سے اپنے ماہنامہ سب رس میں یا کتابوں کی صورت میں شائع کرنے کا انتظام کیا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے کی پہلی کتاب "سائنس کے کرشمے" شائع ہو چکی ہے۔ جس کو ادارہ کے مخلص رفیق میر حسن صاحب نے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب میں سائنس کے کرشموں پر ملک کی قابل ہستیوں کی عام فہم تقریریں جمع کی گئی ہیں۔

سب رس کی مجلس ادارت نے تصفیہ کیا ہے کہ جولائی سنہ ۱۹۴۰ء میں "سب رس" کا ایک "فضائی ادب نمبر" شائع کیا جائے جس میں ان نشری تقریروں کا انتخاب پیش کیا جائے جو اب تک نشرگاہ حیدرآباد سے نشر ہو چکی ہیں۔ ہم آئندہ شمارے میں اس نمبر کے متعلق تفصیل کے ساتھ عرض کرنے کے قابل ہو سکیں گے، فی الحال صرف یہی کہنا کافی ہوگا کہ ایسا تنوع، شائد ہی آپ نے کسی رسالہ میں دیکھا ہوگا جیسا کہ سب رس کے فضائی ادب نمبر میں ہوگا۔

جامعہ عثمانیہ جامعہ گزشتہ چند دنوں تک غیر معمولی علمی چہل پہل کا مرکز بنا رہا۔ کلیۂ فنون کی جدید عمارت کا افتتاح اعلیٰ حضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ نے بنفس نفیس فرمایا۔ جس عمارت کی بنیاد حضور شاہانہ نے اپنے دست مبارک سے رکھی ہو اور جس کا افتتاح خود حضور شاہانہ فرمائیں، وہ یقیناً علم و عمل کی پرورش کا گہوارہ بن سکتی ہے۔ اس موقع پر اساتذۂ جامعہ اور طلبائے انجمن اتحاد کی جانب سے بارگاہ شاہانہ میں عقیدت مندانہ سپاس نامے پیش کرنے کی عزت حاصل کی گئی۔ ان سپاس ناموں کا

جو جوابِ شاہانہ ارشاد فرمایا گیا، وہ عثمانیین کی زندگیوں کے لیے نہایت ہی بصیرت افروز ہے۔ حضور اقدس و اعلیٰ کے ارشاداتِ عالیہ جامعہ عثمانیہ کے بلند تر مستقبل کی ضمانت ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ برادرانِ جامعہ نے اپنی زندگیوں کے لیے "اپنی زندگیوں کے مرکز" سے وہ سب کچھ حاصل کر لیا ہے جو انھیں از راہِ عطوفت خسروی عنایت فرمایا گیا۔ اس سرزمین پر جہاں "علم نامانوس زبانوں کی قید سے آزاد کیا گیا" اعلیٰ حضرت سلطان العلوم کی تشریف آوری ایک فالِ نیک ہے جس نے عثمانیین کے جذبۂ عمل کو تیز تر کر دیا ہے۔

کلیۂ فنون کی جدید عمارت میں افتتاح کے بعد ہی دو شاندار علمی اجتماعات ہوئے۔ ایک تو ماہرینِ فلسفہ کی کانفرنس، اور دوسرا ماہرینِ ریاضی کی کانفرنس۔ ان دونوں کانفرنسوں میں ہندوستان کی مختلف جامعات کے مندوبین جمع ہوئے تھے جنھوں نے جامعہ عثمانیہ کی سرپرستی میں اپنے فنون کے متعلق غور و خوض کیا۔ ان دونوں کانفرنسوں کے لیے اعلیٰ حضرت سلطان العلوم نے اپنے لطف و کرم سے پیاماتِ کامیابی عطا فرمائے۔ کلیۂ فنون کی جدید عمارت نے اپنی زندگی کی پہلی ہی منزل میں دو ایسے شاندار اجتماعات دیکھے جو شاید ہی کسی جامعہ کو آٹھ دن کی قلیل مدت میں نصیب ہوئے ہوں گے۔

طلبائے جامعہ کی جانب سے حسب معمول اس سال بھی "یومِ جامعہ" منایا گیا۔ لیکن اس کی ایک اہم خصوصیت ایسی ہے جو دوسری ایسی تقریبوں سے اسے ممتاز کر دیتی ہے اور وہ مشاعرہ میں والاشان حضرت معظم جاہ بہادر شجیع کی تشریف آوری ہے۔ شہزادۂ والاشان نے جامعہ کے مشاعرہ کی صدارت قبول فرما کر خانوادۂ شاہی کی ان پیہم عنایات کا ایک اور نمایاں ثبوت دیا جو جامعۂ عثمانیہ پر ہمیشہ مبذول رہی ہیں۔ فرزندانِ جامعہ کے شعری رجحانات "زندگی اور ادب" کو قریب تر کر رہے ہیں۔" ادارۂ ادبیاتِ اردو" کی کتاب "شعرائے عثمانیہ" میں اس کی جابجا جھلک دکھائی دیتی ہے۔ جو حسنِ اتفاق سے انہی دنوں میں شائع ہوئی۔ ان شعری صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں شاہزادۂ والاشان کی دلچسپی جن کا پاکیزہ ذوقِ تغزل اردو شاعری پر دکن کے روایاتی الطافِ شاہانہ کا زندہ ثبوت ہے، بلاشبہ معاون ثابت ہوگی۔

"انجمنِ طیلسانئین عثمانیہ" ملک کی واحد انجمن ہے جس میں تمام اعلیٰ تعلیم یافتہ اراکین ہیں۔ ہم یہاں اس بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتے کہ انجمنِ طلبائے قدیم اور انجمنِ طیلسانین کو ایک مرکز پر لا لینے سے کیا کوئی ایسے نقصان کا امکان ہے جو ان دونوں انجمنوں کے مفادات کو متصادم کر دے گا۔ ہم ہمیشہ سے جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل اصحاب کو ایک ہی مرکز پر دیکھنے کے متمنی ہیں۔ بہرحال جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دونوں انجمنیں اپنے اپنے حلقۂ اثر میں سرگرم عمل ہیں تو ہمیں اس کا زیادہ احساس بھی نہیں ہوتا۔ عثمانی طیلسانوں کی کانفرنس، اس سال اورنگ آباد میں منعقد ہوئی، جس کی صدارت ادارۂ ادبیاتِ اردو کے ایک موسس مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی نے کی۔ اور جس کا افتتاح حضرت بسالت جاہ بہادر نے فرمایا۔ نواب بسالت جاہ بہادر کو ملک کی تعلیمی ترقی سے جو گہری دلچسپی رہی اس کا ثبوت ان کی مصروفیتوں سے نمایاں ہوتا رہتا ہے۔

انجمن کی معاشی کمیٹی نے گزشتہ سال کی طرح، اس سال بھی باغِ عام میں ایک عظیم الشان صنعتی نمائش منعقد کی ہے۔ اس قسم کی نمائشیں نہ صرف ملکی صناعوں کی حوصلہ افزائی کا باعث ہوتی ہیں بلکہ اربابِ ملک کے دلوں میں بھی ایک احساس ترقی پیدا کرتی ہیں۔

دکن کی صنعتوں کا زوال ہماری سرد مہریوں کا نتیجہ ہے۔ اور آج جبکہ نظام زندگی کی بنیاد معاشی مسائل پر قائم ہے ہمیں محسوس کرنا چاہیے کہ پیدائش دولت کے بغیر ہماری اقتصادیات ترقی نہ کر سکے گی۔ معاشی کمیٹی قابل مبارک باد ہے کہ اس نے ملک کی صنعتوں کو ارباب حکومت کے سامنے پیش کر کے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ملکی صناع کا داغ دل، دراصل ملک کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔

فلموں کی زبان

ہندوستان کے طول و عرض میں فلموں کی زبان کے متعلق چہ می گوئیاں زمانے سے جاری ہیں۔ اور فلموں کو دیکھنے والوں نے افسوس کے ساتھ یہ محسوس کیا ہے کہ اکثر فلموں کی زبان کا پلہ اُس غیر مانوس زبان کی طرف جھکا ہوا ہے جس کو کم از کم اہل حیدرآباد سمجھنے سے قاصر ہیں۔ فلم میں بھی وہی زبان استعمال ہونی چاہیے جو ہماری مشترکہ زبان ہے۔ اس لئے کہ وہ کسی خاص طبقے کے لئے نہیں تیار کیا جاتا ہے۔ غرض یہ ایک طولانی بحث ہے جس کو ہمیشہ اٹھایا جاتا رہا ہے۔ لیکن اردو سے محبت رکھنے والوں کا کیا یہ مقدس فرض نہیں ہے کہ وہ ایسے فلموں کی حوصلہ افزائی کریں جو اردو کی اشاعت میں مدد دے رہے ہیں؟ یہ ایک سوال ہے جس کے انکاری جواب کا ہمیں گمان تک نہیں۔ ہم ہندی کی فلمی کمپنیوں کی نیتوں پر حملہ کئے بغیر اپنی زبان اور اس کے ذریعے سے اپنے تمدن کی حفاظت کے دل سے آرزومند ہیں۔ یہی وہ احساس تھا جس کے تحت مسٹر سہراب مودی کا جب وہ اردو نواز دکن میں آئے تو خندہ پیشانی کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا۔ وہ سہراب مودی کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک خدمتگزار اردو کی حیثیت سے ہمارے تحسین و ستائش کے مستحق ہیں۔ ذاتیات کی الجھنوں میں الجھ کر خدمات کو فراموش کر دینا کوئی ایسی قابل تعریف بات نہیں جس کو ہنگامہ آرائی کے لئے بہانہ بنایا جائے۔ "کون کیا ہے"؟ کا سوال "کس نے کیا کیا؟" کے درمیان کیوں لایا جائے۔ جو لوگ اردو کے سہارے جیتے ہیں وہ تعینات ظاہری میں پڑ کر اصل حقیقت کو نظرانداز نہ ہونے دیں گے۔ ہمیں اس کا دلی افسوس ہے کہ غلط فہمی یا کسی اور بنا پر اس بارے میں عوام کی رائے کو غلط راستہ پر ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ بہرحال یہ ایک وقتی چیز تھی، لیکن کام قدر حاصل کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مسٹر سہراب مودی کی حیثیت صاف ہے اور اردو کے متعلق انھوں نے جو خیالات اپنی نشری تقریر میں ظاہر کئے ہیں، ان کی وجہ سے ان کی عزت اردو دنیا میں اور بھی بڑھ گئی ہے۔

امدادی سرمایۂ جنگ

گزشتہ مہینے امدادی سرمایۂ جنگ کے لئے ٹاؤن ہال باغ عامہ میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا گیا۔ جس کی صدارت "ادارۂ ادبیات اردو" کے سرپرست اعلیٰ ہز ہائنس پرنس آف برار نے فرمائی۔ یورپ کی نازک صورت حال، ایک عالمی تشویش کا باعث بن گئی ہے اس لئے ساری دنیا کے امن و امان کو آمری قوتوں سے محفوظ رکھنے کے لئے مخالفین نبرد آزما ہیں۔ امن و امان کے تحفظ کا جذبہ یقیناً ایک مقدس جذبہ ہو اس لئے ان کی امداد ضروری ہے جو ہماری سلامتی کے لئے اپنی سلامتی کو خاطر میں لائے بغیر لڑ رہے ہیں اس جلسہ میں ہز ہائنس پرنس آف برار کے علاوہ شہزادہ والاشان نواب معظم جاہ بہادر، سرتیمن السلطنۃ، ہز ایکسلنسی سر اکبر حیدری نواز جنگ بہادر اور نواب سالار جنگ بہادر نے بھی تقریریں فرمائیں۔ یہ جلسہ حیدرآباد کی تاریخ میں پہلا جلسہ ہے جس کے اسٹیج سے ایک ہی وقت میں ملک کی بلند پایہ شخصیتوں نے اہل شہر کو مخاطب کیا۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

اس سال آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی صدارت کے لئے نواب کمال یار جنگ بہادر کو منتخب کیا گیا ہے۔ ایجوکیشنل کانفرنس ہندوستان کی علمی بیداری میں قابلِ لحاظ حصہ لیتی رہی ہے۔ اور نواب کمال یار جنگ بہادر ملک کے ان گنے چنے امراء میں سے ہیں جو ملک و قوم کا حقیقی درد رکھتے ہیں۔ خصوصاً دکن کے قحط زدہ غریبوں کے لئے انہوں نے حال ہی میں جو پُر خلوص کوششیں کی ہیں، کبھی بھلائی نہیں جا سکتیں۔ اس لئے ایجوکیشنل کانفرنس کے حالیہ اجلاس کی صدارت کے لئے ان کا انتخاب اربابِ کانفرنس کی بیدار مغزی کا ثبوت ہے۔ ہم نواب کمال یار جنگ بہادر کو پُر خلوص مبارک باد دیتے ہوئے ان سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ آئندہ بھی ملک و قوم کی تعمیری خدمت میں پیچھے نہیں رہیں گے۔ کانفرنس میں جو تحریکیں منظور ہوئیں ان میں سب سے زیادہ اہم شمالی ہند کی جامعات اور خاص طور پر جامعہ علی گڑھ میں اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے اور جہاں ابھی تک اردو کی تعلیم اختیاری مضامین کے طور پر نہیں دی جا رہی ہے، وہاں اس کا انتظام کرنے سے متعلق ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ انجمن ترقیٔ اردو اپنے تمام وسائل سے کام لے کر اس تحریک کو عملی جامہ پہنائے بغیر چین نہیں لے گی۔

انجمن ترقیٔ اردو کی مقامی شاخ

دہلی میں "انجمن ترقیٔ اردو" کی منتقلی کے بعد حیدرآباد میں اس کی ایک شاخ قائم کی گئی ہے۔ "انجمن ترقیٔ اردو" نے اردو کی ترقی و اشاعت میں ہمیشہ سرگرم حصہ لیا ہے۔ اور ایسے وقت میں جب کہ اردو ہندی کشمکش بڑھتی جا رہی ہے اردو کی حفاظت کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اس انجمن کو حکومتِ حیدرآباد کی جانب سے ایک معقول رقم سالانہ امداد کے طور پر دی جاتی ہے۔ حیدرآباد میں اس کی شاخ کے معتمد ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی پروفیسر ریاضی جامعہ عثمانیہ ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو فنِ ریاضی میں ہندوستان گیر شہرت حاصل ہے۔ اس انجمن سے ہماری خوش گوار توقعات بیجا نہیں۔

بے بنیاد افواہ

حال ہی میں ایک شگوفہ چھوڑا گیا اور وہ یہ کہ مقامی انجمن ترقیٔ اردو اور ادارۂ ادبیات اردو میں اختلاف ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ بے بنیاد افواہ کیوں پھیلائی گئی اور اس کے ذمہ دار کون ہیں؟ اردو اکاڈمی جامعۂ ملیہ دہلی، دار المصنفین اعظم گڑھ، ہندوستانی اکاڈیمی الٰہ آباد، اردو مرکز لاہور کی طرح ادارۂ ادبیات اردو بھی، انجمن ترقیٔ اردو یا کسی اور ایسی انجمن کے ساتھ تعاون عمل کرنے ہمیشہ تیار رہا جس کا مقصد اردو کی خدمت گزاری ہے۔ انجمن ترقیٔ اردو ہندوستان بھر میں اردو کے سیاسی اور ثقافتی اقتدار کو برقرار رکھنے کی جو ان تھک کوشش کر رہی ہے، وہ غالباً دوسری کسی انجمن سے ممکن نہیں۔ انجمن کے اغراض کی تکمیل کے لئے جس قدر زیادہ شاخیں قائم کی جائیں اچھا ہے، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ دوسرے ادارے جن کے نام ہم نے اوپر مثالاً دئے ہیں، وہ اپنی برسوں کی کارگزاری اور اس کے لازمی وجوبات (Obligations) کے ساتھ اپنا وجود ختم کر دیں۔

انعامی مضامین کا اعلان

سب رس ۱۹۳۹ء کے بہترین مضامین کے لئے حسبِ ذیل اصحاب نے انعامات عطا فرمائے ہیں۔ انعامات دینے کا تصفیہ ایک مجلس کے سپرد کیا گیا ہے جس کا نتیجہ فروری ۱۹۴۰ء کے سب رس میں شائع ہوگا۔

(۱) اصلاحی مضمون یا افسانہ:- محترمہ صغریٰ بیگم ہمایوں مرزا۔

(۲) ضمیمۂ سب رس "دلچسپ" کے لئے کا بہترین مضمون یا افسانہ یا نظم۔ نواب مرزا سیف علی خاں صاحب جاگیردار۔

(۳) سب رس کا بہترین علمی و ادبی مضمون:- ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور معتمد

پہلی صف ۱۔ اشک۔ ۲۔ ذکی ۳۔ قریشی ۴۔ زور ۵۔ اکبر ۶۔ رشدی
دوسری صف ۷۔ مخدوم ۸۔ وجد ۹۔ رگھونندن راج سکسینہ ۱۰۔ باقی
تیسری صف ۱۱۔ مہندر راج سکسینہ ۱۲۔ شکیب ۱۳۔ میکش

اُردو ادب کا مُطالعہ

زبان خواہ مادری ہو یا غیر مادری ادب خواہ ملکی ہو یا غیر ملکی ان سب کے مطالعہ کے اصول اور تحصیل کے طریقے تقریباً متحد ہیں۔ متمدن اقوام مادری زبان کو بغیر کسی خاص کاوش کے حاصل کر لینے کو فطری طریقہ سمجھتی ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جس کو ہم فطری طریقہ سمجھتے ہیں اس میں ہماری اکتسابی قوت کا جزو کہاں تک شریک ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی زبان خواہ وہ آغوشِ مادر میں سیکھی جائے یا استاد کے سایۂ شفقت میں بغیر تکرار اور اعادہ کے حاصل نہیں ہوتی۔ بچہ ولادت کے وقت کوئی زبان بولتا ہوا نہیں پیدا ہوتا ہے بلکہ جس ماحول میں وہ آنکھیں کھولتا ہے اور جن لوگوں سے دوچار ہوتا ہے ان کی آواز اور زبان وہ سیکڑوں بلکہ ہزاروں بار لگاتار سنتا رہتا ہے۔ جتنی آوازیں اس کے کان تک پہونچتی ہیں وہ اس کے دماغی اعصاب پر مرتسم ہو جاتی ہیں۔ جب بچہ اس قابل ہوتا ہے کہ اپنی زبان ہلا سکے تو سب سے پہلے وہ مفرد الفاظ کو استعمال کرتا ہے پھر رفتہ رفتہ الفاظ کو جملوں کے ذریعہ ادا کرتا ہے۔ اس طریقِ تحصیل کے تحت میں اگر بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو اعادہ و تکرار کا نفسیاتی پہلو سامنے آئے گا۔ جن جملوں کو بچہ بار بار سنتا ہے ان کا کچھ عرصہ بعد بلا تامل اور بلا اختیار اپنی زبان سے اعادہ کرتا ہے۔

اس طور سے اور انہیں اصول کی بنا پر جب ہم کسی غیر زبان کا مطالعہ کرتے ہیں تو مفرد الفاظ اور مکمل جملوں کو بار بار دہراتے اور انہیں کو لکھ کر مشق و مزاولت پیدا کرتے ہیں۔ مادری اور غیر مادری زبان کے استعمال میں جو فرق ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ مادری زبان کے سننے اور بولنے کے موقعے ہم لوگوں کو بہ نسبت غیر مادری زبان کے زیادہ ملتے ہیں۔ اکثر ایسا دیکھا گیا ہے کہ جو نوجوان کسی غیر ملک میں جا کر کسی خاندان میں قیام پذیر ہوتے ہیں تو وہ جلد تر وہاں کی زبان اور اس کے روزمرہ اور محاورں پر قدرت حاصل کر لیتے ہیں۔ اس تمہید کی غرض یہ ہے کہ ہم اس بیّن اصول کو پوری طرح ذہن نشین کر لیں کہ زبان اور ادب خواہ وہ کسی ملک کا ہو اکتسابی ہے نہ کہ وہبی۔ انفرادی استعداد، ذہانت اور طباعی کا اثر ادب کی تحصیل اور تخلیق میں اکثر پایا جاتا ہے۔ مگر ان فطری صلاحیتوں کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کوئی شخص محض ذکاوت اور طباعی کے بھروسے پر رہ کر بغیر محنت اور کسب کے زبان پر قدرت حاصل کر لے۔ خلاصہ یہ ہے کہ بغیر کدو کاوش اور بغیر محنت و جانفشانی کے کوئی علم یا ادب حاصل نہیں ہو سکتا۔

عرصۂ دراز تک اردو زبان کی تحصیل اور صحت کا دارومدار اہلِ زبان ہونے پر غلط فہمی سے مانا جاتا تھا۔ جو لوگ دہلی یا لکھنؤ کے رہنے والے ہوتے انہیں کو یہ طغرائے کمال حاصل تھا کہ وہ صحیح زبان لکھنے اور بولنے کے اہل سمجھے جاتے۔ اس کمزور نظریہ کی سبب سے اردو زبان کی ترقی کو بہت بڑا نقصان پہونچا۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی معمولی ذہانت اور عقل و فہم کا انسان اگر کافی توجہ اور تندہی سے کسی ادب کا عموماً اور اردو کا خصوصاً بالاستیعاب مطالعہ کرے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ کچھ عرصہ میں اس پر قابلِ رشک قدرت نہ حاصل کر لے۔ ہمارے ادیبوں میں اکثر و بیشتر جن کو لکھنؤ یا دہلی کے شہری ہونے کا فخر نہیں حاصل تھا باوجود اس امر کے وہ آسمانِ ادب کے درخشاں ستارے مانے جاتے ہیں اور ان کا نام رہتی دنیا تک قایم رہے گا۔ شبلیؔ، حالیؔ، نذیر احمدؔ، عبد الماجد دریا آبادی

سید سلیمان ندوی، عبدالسلام، مہدی حسن، وہ اہلِ قلم ہیں جن کو براہِ راست دہلی یا لکھنؤ سے کوئی واسطہ نہ تھا پھر بھی ان کے علمی کارنامے ایسے وقیع اور ٹھوس ہیں جن کی اہمیت سے کوئی ادیب انکار نہیں کرسکتا۔

اب زمانہ آگیا ہے کہ ہم کو ایسے پیش پا افتادہ اور فرسودہ نظریوں سے انحراف کرنا ہوگا۔ دہلی اور لکھنؤ کی مرکزیت کے خیالات نے اردو کی لسانی ترقی کو بہت نقصان پہونچایا ہے۔ جو الفاظ یا محاورے قدیم دہلی یا لکھنؤ کے شعراء کے کلام میں نہیں ملتے تھے، ان کو ثقہ حضرات مستند نہیں مانتے تھے۔ بدقسمتی سے ان کو اس امر کا دھندلا سا بھی خیال نہیں ہے کہ زبان انسانی جذبات اور خیالات کے ساتھ ترقی کرتی ہے۔ جیسے جیسے ہماری ضروریاتِ زندگی بڑھتی جاتی ہیں اور نئی چیزوں کا انکشاف ہوتا جاتا ہے انہیں کے ساتھ ساتھ نئے نئے الفاظ اور ترکیبیں بھی معرضِ وجود میں لائی جاتی ہیں۔ یہ ایک ایسا اصول ہے جس کو ہمارے وہ شعراء اور ادباء جن کو قدامت پرستی پر اصرار ہے پیشِ نظر نہیں رکھتے۔ وہ اس امر کو فراموش کرجاتے ہیں کہ وہ الفاظ اور محاورے جو متقدمین شعراء کے زیرِ استعمال تھے ان میں سے اکثر و بیشتر اب متروک سمجھے جاتے ہیں اسی طور سے جن محاوروں کو وہ ان دنوں اپنے استعمال میں لاتے ہیں ایک عرصے کے بعد وہ بھی پس پشت ڈال دئے جائیں گے۔ کسی زبان کا لغت دیکھو تو معلوم ہوگا کہ ہر دسویں سال اس کے الفاظ میں معتد بہ اضافہ ہوجاتا ہے۔ یوروپین زبانوں میں ہمسایہ زبانوں کے الفاظ کثرت سے ایک دوسرے کی زبان میں داخل کرلئے جاتے ہیں۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے بعد انگریزی زبان کی جو لغات شائع ہوئی ہیں ان میں غیر زبانوں کے بہت سے نئے الفاظ درج ہیں جو اس امر کا ثبوت دیتے ہیں کہ جب قومیں ایک دوسرے سے ملتی ہیں تو ان کے الفاظ سے بھی کافی متاثر ہوکر بہت سے خارجی الفاظ کو اپنا بنالیتی ہیں۔

ان اصولوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہم چند تجاویز طلبہ کی ہدایت کے لئے پیش کرتے ہیں تاکہ اس پر عمل پیرا ہوکر اردو ادب سے نہ صرف آشنا ہوں بلکہ اس پر کافی دست گاہ حاصل کرسکیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے ملکی ادب کو اسی اہمیت اور شغف کے ساتھ حاصل کریں جس طرح ہم انگریزی ادب کی تحصیل میں اب تک مصروف رہے ہیں۔ ہم کو چاہیے کہ ہم منتخب اور اعلیٰ پیمانے کے شاعروں، ادیبوں اور نثاروں کی کتابوں کو توجہ کے ساتھ مطالعہ کریں اور الفاظ اور محاورات کی تحقیق کریں اور یہ کام ہم اسی وقت انجام دے سکتے ہیں جب کہ ہم مستند لغات کو پیشِ نظر رکھیں گے۔ بار بار کے مطالعہ سے جملوں کی ساخت اور الفاظ کے استعمال ہمارے جزو دماغ ہوجائیں گے اور ہم لکھتے اور بولتے وقت بلا اختیار انہیں جملوں اور لفظوں کا اعادہ کریں گے۔ کسی بلند، غامض اور حکیمانہ خیالات کے اظہار کے لئے یہ ناگزیر ہے کہ ہم زبان کے مختلف الفاظ اور ان کے استعمال سے پوری طور پر واقف ہوں۔ ہمارے طلبہ اردو لغت کو بھولے سے بھی ہاتھ نہیں لگاتے ہیں اس لئے الفاظ کے مختلف معنی اور جو اوزان ہیں ان سے ناواقف رہتے ہیں۔ جہاں کہیں ان کو ایک تولہ وزن کے الفاظ استعمال کرنا چاہیے وہاں غلط فہمی اور ناواقفی کی وجہ سے ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جن کا وزن ایک سیر سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔

ادب کے باقاعدہ مطالعے کے لئے ضروری ہے کہ ہم چند ضمنی اور ضروری علوم سے بھی ایک گونہ واقفیت رکھیں مثلاً کوئی شخص اردو یا فارسی علم و ادب پر پوری قدرت حاصل نہیں کرسکتا اور نہ اس کے ادنیٰ نکات کو سمجھ سکتا ہے اگر وہ مذہبی تلمیحات، اعتقادات اور روایات سے ناواقف ہے۔ ہمارے شعرا متقدمین ہوں یا متوسطین مذہبی جذبات اور روایات سے اس درجہ متاثر تھے کہ ان کا کلام جگہ جگہ پر مذہبی تلمیحات سے پُر ہے۔ محسن کاکوروی کے نعتیہ قصائد یا مومن، غالب اور ذوق کے قصائد اور غزلوں کو بغیر مذہبی معلومات سے واقفیت حاصل کئے ہوئے کوئی پوری طرح نہیں سمجھ سکتا۔ ید بیضا، کوہِ طور، جنت عدن، جنت الماوا، تحت الثرا، رستخیز، شجر طوبیٰ، لن ترانی، گلزار ابراہیم، آتشِ نمرود وغیرہ وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جن کو مذہبی روایات سے بیگانہ شخص کبھی نہیں سمجھ سکتا۔ اسی طرح موٹے موٹے تاریخی واقعات سے بھی واقفیت ضروری ہے۔ شاعر یا مصنف جس زمانے میں پیدا ہوتا ہے وہ اس دور کے مذہبی، معاشرتی، سیاسی اور اخلاقی ماحول سے کافی طور پر متاثر ہوتا ہے لہٰذا اس زمانے کے اخلاقی، تاریخی واقعات سے بغیر واقف ہوئے کوئی طالب علم شاعر کے ادبی رجحانات اور اس زمانے کی تحریکوں سے واقف نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح شاعر کے مفصل سوانح حیات اور اس کے معاصرین کے خیالات اور حالات کا ایک حد تک جاننا بھی بہت ضروری ہے اس لئے کہ شاعر کبھی تو آپ بیتی اور کبھی جگ بیتی واقعات قلمبند کرتا ہے جس وقت شاعر اپنے زمانے کی بلندی یا پستیٔ اخلاق کا ذکر کرتا ہے تو اس پر غور کرنا چاہیئے کہ وہ کس تاریخی دور سے ہوکر گزرا ہے اس زمانے کے افراد یا جماعت کے اخلاق بلند یا پست تھے۔ میر حسن اپنی مثنوی کو شاہزادہ بدرِ منیر کی زبان سے ایک فرضی قصے کو نظم کرتے ہیں مگر حقیقت میں وہ لکھنؤ کے معاشرتی اور سیاسی حالات کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ مثنوی بدرِ منیر کے مطالعے سے لکھنؤ کی سوسائٹی کی پوری تصویر کھنچ جاتی ہے۔ اس لئے تاریخی واقعات سے ایک گونہ واقفیت بھی ادب کے مطالعے کے لئے ضروری ہے۔

اگر یہ کلیتہً صحیح ہے کہ ادب حیاتِ انسانی کے مختلف شعبوں کی ترجمانی کرتا ہے تو ہم اس نتیجہ پر بلا تامل پہنچ سکتے ہیں کہ بغیر حیاتِ انسانی کی گہرائیوں کو سمجھے ہوئے ہم کسی ادب پر حاوی نہیں ہوسکتے اور نہ اس کے رموز و نکات کو سمجھ سکتے ہیں۔ جو شخص انسانی جذبات کی پیچیدگیوں اور بوقلمونیوں سے ناواقف ہوگا یا ذہنی شعور کے مختلف پہلوؤں کو نہ جانتا ہوگا وہ رنج و غم، حسرت و یاس، وصل و فراق، کامیابی اور ناکامیابی، نقصان اور فائدہ، بغض و کینہ، ہمدردی اور سنگ دلی، رقابت اور دوستی کی نفسی کارفرمائیوں سے بے بہرہ رہے گا اور جب کہ شاعر اپنے وارداتِ قلب کو الفاظ کا جامہ پہنا کر صفحۂ قرطاس پر مزین کرے گا تو وہ شخص جو نفسیات انسانی کی مبادیات سے بھی ناآشنا ہو کماحقہٗ شاعر کے حقیقی مافی الضمیر کو نہیں سمجھ سکتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے جو شخص عادت کے فلسفہ کو نہ جانتا ہو اور اس کی زبردست طاقت سے ناواقف ہو وہ غالب کے اس مشہور شعر کے اصلی مفہوم کو نہیں سمجھ سکتا ہے

صد بار دامِ عشق سے آزاد ہم ہوئے
پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

یا نواب شیش محل کا یہ شعر؎

کہتا ہے کون یار کی محفل اُداس ہے
کوئی نہیں اُداس مرا دل اُداس ہے

اس شعر کا لطف وہی اٹھا سکتا ہے جس کو یہ معلوم ہو کہ ہماری دنیا ہمارے جذبات اور خیالات کا عکس ہوا کرتی ہے جس کی طبیعت مضمحل یا پژمردہ نہ ہوئی ہو وہ اس شعر سے بھلا کیا لطف اندوز ہو سکتا ہے۔

میری آخری تجویز یہ ہے کہ ادب اردو کا مطالعہ بے لاگ سچائی اور ذہنی ایمان داری کے ساتھ کرنا چاہیے۔ عام طور سے یہ دیکھا گیا ہے کہ ہمارے ادیب اور ناقد جب کسی سے خوش ظن ہوتے ہیں تو اس کے کلام کے ہر پہلو کی تعریف کرتے ہیں خواہ بلند پایہ کلام نہ ہو اسی طرح سے اگر وہ کسی سے بدظن یا ناخوش ہوتے ہیں تو اس کا کلام خواہ کتنا ہی پُرمعنی اور پُرمغز کیوں نہ ہو پڑھنا بھی گوارا نہیں کرتے یہ رویّہ اصولِ تنقید کے منافی ہے۔ کلام کو پرکھتے وقت اس کے حسن و قبح پر یکساں نظر ڈالنی چاہیے۔ قطع نظر اس کے کہ ہم شاعر سے خوش ظن ہیں یا بدظن۔ ذاتی مناقشات اور اختلاف رائے کو پس پشت ڈال کر اور اپنے رذیل جذبات پر قدرت حاصل کر کے ہم کو ادب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ تنقید کا بے لاگ اصول یہ ہے کہ جس کلام میں جتنے محاسن ہیں ان کو سراہیں اور ان کی ادبی خوبیوں اور باریکیوں کو منظرِ عام پر لاویں اور جتنے معائب ہوں ان کو بلا کم و کاست اور بغیر کسی تحقیر و تذلیل کے مہذب طریقے سے جتا دیں۔ اردو ادب کو سب سے زیادہ نقصان ہمارے ذاتی مناقشات اور غیر ضروری اختلافات پر ضرورت سے زیادہ زور دینے سے پہونچا ہے۔ جب تک ہم ایک دوسرے کے کلام کی منصفانہ قدر نہ کریں گے اور ذہنی ایمان داری کو اپنا اصولِ زندگی نہ بنائیں گے ہماری زبان اور ادب کو ترقی نہیں ہو سکتی اور نہ بغیر باہمی ہمت افزائی اور قدر دانی کے ہونہار اہلِ قلم اپنی محنت اور جاں کاہی کے ثمرہ سے ہم کو فیض یاب کر سکتے ہیں۔

م حفیظ سیّد

فنِ انشا پردازی۔ اردو زبان میں اپنی قسم کی پہلی کتاب۔ مضمون نگاری اور انشا پردازی کے راز اور فن تحریر میں کامیابی کے عملی طریقے بیان کئے گئے ہیں۔ اردو زبان میں ہر قسم کے موضوعوں پر لکھنے کی ترکیبیں اور انشا پردازی میں کامیابی حاصل کرنے کے وسائل۔ اوسط تقطیع۔ ۱۱۶ صفحات قیمت ۱۲؍

اردو کے اسالیب بیان۔ اردو نثر نگاری کی تاریخ جس میں آغاز سے عہد حاضر تک کے بلند پایہ اور معیاری اردو انشا پردازوں کی نثر اور اس کے اسلوب کی خصوصیات پر ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے موجودہ نثر نگاروں کے اسالیب پر جداگانہ اور مستقل تبصرہ جدید اردو نثر کے رجحانات اور اس کے مستقبل کے متعلق مشورے۔ طبع سوم۔ ۲۰۶ صفحات قیمت عہ ۱۲؍

میر حسن ایم اے

عکس خط شاد عظیم آبادی

محترمہ صغریٰ بیگم ہمایوں مرزا

صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش

دکنی بولی

(یہ مضمون آل انڈیا ریڈیو نشرگاہ حیدرآباد سے نشر کیا گیا تھا۔)

دکنی بولی آج اردو زبان کی ایک شاخ ہو کر رہ گئی ہے۔ لیکن اپنے آغازی دور میں اور اس کے بعد بھی کئی سو سال تک اس کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ یہی وہ زبان ہے جو گولکنڈہ، بیجا پور اور دکن کی دوسری سلطنتوں میں ایک عرصے تک تعلیم یافتوں کی معیاری تحریری اور بول چال کی زبان کی حیثیت سے رائج کرتی رہی ہے۔

دکنی زبان کی اہمیت اور اس کے نشوونما کے خاص حالات پر غور کرنے کے لئے اردو زبان کی تاریخ میں سیکڑوں سال پیچھے کی طرف جانا پڑتا ہے۔ اردو زبان جیسا کہ سب جانتے ہیں، فارسی بولنے والے مسلمانوں اور کھڑی بولی بولنے والے ہندوؤں کے پنجاب میں میل جول کا نتیجہ ہے۔ یہی وہ صوبہ ہے جہاں سلطان محمود غزنوی کی حکومت بڑے عرصے تک قائم رہی۔ اس کے بعد محمد غوری کا دور شروع ہوا۔ اس دور میں بھی اردو کے خدوخال موہوم ہی رہے۔ اور اس میں انفرادیت یا شخصیت کا کوئی رنگ پیدا نہ ہو سکا۔

خلجیوں کے دور میں اردو جس نے پنجاب میں جنم لیا تھا، علاؤالدین خلجی کے ساتھ دکن پہنچی۔ یہاں اس کی پرورش شمال سے بالکل مختلف اور دکنی طبائع کے میلانات کے مطابق جداگانہ قسم کے ماحول اور اثرات کے تحت ہوئی۔ دکن کی یہ اردو دکنی کہلانے لگی۔

دکنی زبان نے بیجا پور اور گولکنڈہ کی سلطنتوں کے عروج کے زمانے میں بڑی ترقی کی۔ اس میں سو ڈیڑھ سو سال تک ادبی کتابیں لکھی جاتی رہیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ شمال میں اردو صرف بول چال کی زبان تھی۔ علم و ادب شعر و شاعری یہاں تک کہ خط و کتابت کی زبان بھی ایرانی تھی۔ شمال میں اردو سے بے توجہی اور ایرانی کے فروغ کی کئی وجوہات ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہاں صدیوں تک ایرانی علما اور شعرا کی آمد کا تانتا بندھا رہا۔ اور سرکاری زبان بھی ایرانی ہی تھی جسے ہندوؤں کے لئے بھی ملازمت کے لئے ضروری قرار دے کر راجہ ٹوڈرمل نے ترقی کی رفتار اور تیز کر دی۔

برخلاف اس کے دکن کے حالات شمال سے مختلف رہے۔ ہندوستان کے اس حصے پر زیادہ تر یورشیں شمال ہی کی طرف سے ہو سکتی تھیں۔ لیکن اس زمانے میں بندھیا چل کو عبور کر کے دکن پہنچنا بڑی زحمت کا باعث ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دکن کی سلطنتوں میں سالہا سال تک امن رہا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں میل جول کے زیادہ سے زیادہ مواقع پیدا ہوئے اور ایک مخلوط دکنی تمدن کی بنیادیں قائم ہوئیں۔

اردو زبان اور ادب کے دکن میں فروغ پانے کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ بیجا پور اور گولکنڈہ کی سلطنتوں کی عدالتی اور سرکاری زبان دکنی تھی۔ اس کے علاوہ بیجا پور اور گولکنڈہ کے بیشتر بادشاہ نہ صرف خود عالم اور اہل قلم تھے بلکہ علم و ادب کی سرپرستی بھی بڑی فیاضی سے کرتے تھے۔

ان سازگار حالات اور شاہی سرپرستیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ بڑے بڑے عالموں نے دکنی زبان کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ ابتداً ایرانی ادب کے زیر اثر شعر و شاعری سے ہوئی۔ اور تقریباً تمام مروجہ اصنافِ شعر مثلاً قصیدہ، مثنوی، رباعی، مراثی، اور غزل میں درباری شعراء نے خوب زور دکھلایا۔

اس عہد کے مشہور شاعروں میں غواصی، ابن نشاطی، ملا قطبی، جنیدی، سعدی، نوری، شاہی، مرزا، طالب، مومن وغیرہ قابل ذکر ہیں، جن میں سے بعض کے کلام کے نمونے "اردو شہ پارے" میں شایع ہو چکے ہیں۔

مرثیہ گوئی کو اس عہد میں بہت فروغ ہوا۔ کیونکہ شعرا مرثیہ گوئی کو دین اور دنیا دونوں کی بہتری کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ مرثیے سنا سنا کر ایک طرف دربار وں میں انعام پاتے تھے اور دوسری طرف انھیں ثواب اور نجات کی بھی امید تھی۔

بیجاپور کے عادل شاہی دربار کے شاعروں میں نصرتی، ہاشم، مرزا، امین، شاہ ملک اور مومن قابل ذکر ہیں۔ دکنی دور کی نثری تصانیف میں سب سے زیادہ اہمیت ملا وجہی کی "سب رس" کو حاصل ہے۔ جو ۱۶۳۵ء میں یعنی آج سے تقریباً تین سو سال قبل لکھی گئی۔ یہ اردو زبان کی سب سے پہلی نثری تصنیف سمجھی جاتی ہے اور انجمن ترقی اردو ہند کی طرف سے چھپ کر شایع ہو چکی ہے۔

ملا وجہی سلطان عبداللہ قطب شاہ والی گولکنڈہ کا درباری شاعر تھا۔ سب رس اسی بادشاہ کے حکم سے شایع ہوئی۔ قدیم دکنی اردو نثر کے بعض نمونے اس سے پہلے کے بھی ملفوظات اور مذہبی رسائل کی شکل میں ملے ہیں۔ لیکن "سب رس" ایک مکمل اور جامع تصنیف ہے۔ اس سے پہلے کی کسی کتاب میں ایسی خوبیاں پائی نہیں جاتیں، جو گولکنڈہ کے اس مصنف کی تحریر میں نظر آتی ہیں۔ سب رس کا موضوع حسن و دل کا قصہ ہے جو تمثیلی پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کی عبارت میں ادبی شان پائی جاتی ہے۔ نثر مقفیٰ ہے اس کے باوجود زبان سادہ سلیس اور شگفتہ ہے۔ وجہی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے اپنی کتاب میں بعض مقامات پر دکنی زبانوں مثلاً تلنگی اور مرہٹی کے الفاظ اور محاورے بھی استعمال کئے ہیں۔

دکنی ادب کی ترقی کے سلسلے میں اس وقت تک جن لکھنے والوں کا ذکر ہوا تقریباً ان سب کی شہرت بیسویں صدی کے اوائل تک مقامی رہی۔ دکن کا پہلا شاعر جس کا کلام نہ صرف سارے دکن میں مقبول ہوا بلکہ جس نے بندھیاچل کو عبور کرکے شمالی ہندوستان کو بھی مسخر کر لیا ولی تھا۔ ولی اورنگ آبادی کا کلام جب شمال پہنچا تو اہلِ کمال نے اس کی دل سے قدر کی۔ یہ ولی ہی کا اثر تھا کہ شمال میں حاتم، آبرو، آرزو اور دوسرے اساتذہ نے پہلی دفعہ اردو میں شعر کہنا شروع کیا جس کا ثبوت خود ان کے کلام سے ملتا ہے۔ ولی کے اثرات سے دکنی الفاظ اور محاورے شمالی ہند کے متقدمین کے کلام میں کثرت سے داخل ہوئے اور اپنی دل آویزی اور انوکھے پن کی وجہ سے ادب میں ایسے رچ گئے کہ متوسطین کے کلام میں بھی اس کی چاشنی پائی جاتی ہے۔

شمال میں اردو نویسی کو مزید تقویت یوں بھی ہوئی جب شہنشاہ اورنگ زیب کے ساتھ گولکنڈہ کے شاہی کتب خانہ کی نادر دکنی کتابیں دلی پہنچیں۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے ادبی ذوق رکھنے والوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ اور اردو شعر و نثر کا دور شمال میں بھی شروع ہوگیا۔

سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد ہندوستان نے کچھ ایسی کروٹ بدلی کہ شمال اور جنوب کے درمیان کی رکاوٹیں روز بروز دور ہوتی گئیں۔ آمد و رفت اور رسل و رسائل کی آسانیوں نے دور افتادہ مقامات کو بھی گویا ایک دوسرے سے قریب کردیا۔ جس کی وجہ سے ہندوستان کے سارے حصوں کی انفرادیت اور مقامی خصوصیات پر کل ہند اثرات حاوی ہونے لگے۔ بہت جلد وہ زمانہ آگیا جب کہ دکنی ادبی زبان کے لئے ناموزوں ہوگئی اور ناموزوں سمجھی جانے لگی۔ اس کے برخلاف شمالی ہند اور خاص طور پر دلی اور لکھنؤ کی زبان نے معیاری زبان ہونے کا امتیاز حاصل کرلیا۔ اس انقلاب کی وجہ صاف ہے جو یہ ہے کہ جس حصۂ ملک کے اہل قلم تصنیف و تالیف میں پیش پیش رہتے ہیں وہیں کی زبان معیاری اور قابل تقلید بن جاتی ہے۔

دکن میں جس وقت تک علم و ادب کا زور تھا دکنی معیاری زبان بنی رہی گو اس کا دائرہ مختلف وجوہات کی بنا پر بہت بڑی حد تک محدود ہی رہا۔ اور جب شمال میں ایک سے ایک بڑے اور باعظمت شاعر اور نثر نگار پیدا ہونے لگے جنھوں نے اپنی تحریروں سے اردو کو غیر فانی بنا دیا تو انہیں کی زبان لازمی طور پر ادبی زبان کے رتبہ پر پہونچ گئی۔

معیاری اردو نے شمالی ہند میں جنم لیا لیکن آج وہ تمام جغرافی پابندیوں سے آزاد ہو کر سارے ہندوستان کے تعلیم یافتوں اور انشا پردازوں اور شاعروں کی زبان ہے۔ دکنی اپنی خاص دل کشیوں کے باوجود ایک مقامی بولی ہو کر رہ گئی ہے اس کے بولنے والوں میں دکن کے دیہات کے رہنے والے اور شہروں اور اضلاع کے ان پڑھ باشندے ہیں۔ تعلیم یافتوں کے اثر سے شہر کے عوام کی زبان تو آدھا تیتر آدھا بٹیر کی مصداق ہے لیکن بعض اضلاع والوں کی زبان باہر کے اثرات سے اس وقت تک اس قدر محفوظ ہے کہ ان سے باتیں کرنے میں "سب رس" پڑھنے کا لطف آجاتا ہے۔

بازاری دکنی بڑی پر لطف بولی ہے جو دکن اور خاص طور پر ریاست حیدرآباد کے شہری علاقوں میں بے تکلف رائج ہے۔

میر حسن

فاتحۂ سالانہ

آج مصروف نظر آئے نہ کیوں ریحانہ
کیسے دم ساز کا ہے فاتحۂ سالانہ

عورتیں آئی ہیں کثرت سے محلے والی
اس بڑے گھر میں جگہ رہ گئی ہے کم خالی

یہ جو پھیلا ہوا سامان ہے بریانی کا
فرض کرتی ہے ادا اس کی نگہبانی کا

اک یہی فرض نہیں، اس کے فرائض ہیں کئی
آ گئی کوئی عزیزہ تو یہ ملنے کو گئی

عورتیں خاص عزیزوں میں کم ایسی ہوں گی
جو کسی خاص سبب ہی سے نہ آئی ہوں گی

کام بھی کرتی ہے باتیں بھی کئے جاتی ہے
داد سنجیدہ خیالی کی لئے جاتی ہے

۲

حیرت انگیز ہے اس کا "عمل آرا" عالم
زعفران حل کبھی کرتی ہے کھرل میں پیہم

گوشت بنواتی ہے بیٹی کی مدد سے گاہے
جو ہو خود دار وہ اوروں سے مدد کیوں چاہے

دیگ کے نیچے کبھی آگ یہ بھڑکاتی ہے
چہرہ تپتا ہے تو دم بھر کو سرک جاتی ہے

کبھی یخنی کے مصالح کی یہ لیتی ہے خبر
غرض، آتی ہے نظر گاہ ادھر گاہ ادھر

جب کسی کام میں دیتی ہے بہو اس کا ساتھ
کام کرتی ہوئی کر لیتی ہے کچھ کام کی بات

یاں بہو، منتظرِ حکم ہے باہر بیٹا
دل کسی کام میں اس کا نہیں ہوتا بیٹا

۳

عمر چالیس کے لگ بھگ ہے مگر اس پر بھی
نظر آتی ہے یہ فی الحال جواں ہمت ہی

چلن اس غم زدہ بی بی کا شریفانہ ہے
سبق آموزِ جہاں عصمتِ ریحانہ ہے

زخم دل ہے ستمِ ہجرِ دوامِ شوہر
آہ کس طرح بھلا دیتی یہ نام شوہر

کون یاد آئے گا پھر گر نہ اسے یاد کیا
جس نے اکیس برس ہر جہتی ساتھ دیا

بست و یک سالہ رفاقت کا اثر کیا کہنا
اس کو آسان ہے اب اس کی ہی دھن میں رہنا

پختہ کارانہ تصور یہ ہیں اس کے سب ڈھنگ
ایک تصویر میں برسوں سے بھری جاتی ہے رنگ

یہ مناتی ہے جس انداز سے یوم شوہر
اس کے ہر سال ہوا کرتے ہیں چرچے گھر گھر

علی منظور

حیدر آباد تا دلّی

ایک انگریزی مثل ہے کہ "بعض واقعات قصہ کہانیوں سے بڑھ جاتے ہیں" حیدر آباد سے چلتے وقت مجھے شان گمان بھی نہ تھا کہ ایسا کوئی واقعہ خود مجھے پیش آنے والا ہے۔

چھتیس ۳۶ گھنٹے کے لگاتار سفر سے وحشت تو ضرور تھی مگر یہ کیا خبر تھی کہ راستے میں یہ وحشت دہشت کا رنگ اختیار کر لے گی۔ ۲ر نومبر کو گھر سے چلا اسٹیشن پر یار دوست چھوڑنے آئے۔ گھنٹی بجی گارڈ نے سیٹی دی۔ انجن نے چیخ ماری۔ پہیوں نے گردش کی۔ گاڑی چلی اور ہم حیدر آبادی سے دلّی والے بننے شروع ہو گئے۔ بعض دوستوں نے دور ہی سے سلام علیک کھینچ ماری۔ بعض ریل کے ساتھ ساتھ چلتے اور ہاتھ ملاتے رہے۔

مگر کہاں تک ذرا سی دیر میں "ایک میں تھا ایک خدا کی ذات تھی" معلوم نہیں مسافروں کو مجھ سے کیا دشمنی تھی کہ ایک بھلا آدمی بھی میرے درجے میں نہیں آیا۔ اور حیدر آباد سے لگا کر دہلی تک میں رہا اور چار قدم لمبا اور تین قدم چوڑا درجہ بعض مسافر ایسے بھی ہوتے ہیں جو خالی درجہ پا کر خوش ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان کو اگر وہ واقعہ پیش آئے جو مجھے پیش آیا ہے تو یقین مانیے کہ وہ خالی درجے میں بیٹھنے سے اتنا ہی ڈریں جتنا یو، پی کے زمیندار آج کل نئے قانونِ اراضی سے ڈر رہے ہیں۔

ہاں صاحب تو، خیر، گاڑی چلی ہم کھڑکی میں سے جھانکتے اور دیکھتے رہے کہ فلاں صاحب کا گھر سامنے سے گزر گیا، فلاں صاحب کا بنگلہ نکل گیا۔ خیریت آباد کا اسٹیشن آیا، حسین ساگر جنکشن آیا اور گھس گھس گھس گھس کر کے ریل سکندر آباد پہونچ ہی گئی۔ کہنے کو تو یہ گاڑی گرانڈ ٹرنک اکسپرس کی دُم ہے، مگر شاید ہی کوئی اسٹیشن ہوگا جہاں یہ سستا نہ لیتی ہو۔ شوال کی پانچویں تھی تھوڑی سی دیر میں چاندنی غائب ہو گئی۔ اس لئے ناچار کچھوے کی طرح گردن کھڑکی سے اندر کر لی جھلملیاں چڑھا دیں۔ بستر پر سے کوئلے کے ریزوں کو جھٹکا اور چادر اوڑھ سونے کی تیاری کی۔ مگر جو شخص رات کے گیارہ بارہ بجے سوتا ہو اس کو بھلا نو بجے نیند کیوں آنے لگی تھوڑی دیر لوٹے پوٹے خیال آیا کہ اوہو ابھی تک نماز تو پڑھی ہی نہیں لاؤ وہ بھی پڑھ لیں۔ غسل خانے میں جا کر وضو کیا اور نماز کو کھڑے ہو گئے مگر ریل کے جھٹکوں کی وجہ سے بیٹھ جانا پڑا۔ خیر نماز تو ہو گئی مگر کیسی ہوئی یہ اللہ بہتر جانتا ہے۔ کتاب اٹھائی کہ شاید پڑھنے ہی میں کچھ وقت کٹ جائے مگر سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ اس میں لکھا کیا ہے۔

اس وقت خیال آیا کہ یار اگر اس وقت افیون میسّر ہوتی تو مزا آ جاتا۔ میں اوپر کے درجے میں سفر کرنے والوں کو صلاح دیتا ہوں کہ وہ سفر میں اپنے ساتھ افیون کی دو چار گولیاں رکھ لیا کریں تاکہ اگر سفر دور کا ہو اور درجہ خالی ملے تو یہ گولیاں "داشتہ آید بکار" بن سکیں۔

جعفر زٹلی فرماتے ہیں "گندم اگر بہم نہ رسد بھس غنیمت است" سوچے کہ لاؤ افیون نہ سہی سگریٹ ہی سے اس کمی کو پورا کریں۔ ڈبہ پاس تھا کھولا اور سگریٹ پر سگریٹ دھونکنے شروع کئے۔ لیکن اس کے دھوئیں نے دماغ میں وہ خشکی پیدا کی کہ رہی سہی نیند اور بھی اڑ گئی۔

دس بجے قاضی پیٹھ پہونچے۔ وہاں ہماری گاڑی گرانڈ ٹرنک اکسپرس میں جڑنے والی تھی اور اس گاڑی کے آنے میں دیر تھی اس لئے پلیٹ فارم پر ٹہلنا شروع کیا مگر یہ چہل قدمی

چالیس قدم کے اندر ہی رہی۔ کیونکہ جانتے تھے کہ فدا ادہر ادہر ہوئے اور مال دوستوں کا ہوگیا۔ خدا خدا کر کے مدراس کی گاڑی آئی اور ہم مشرق کی بجائے شمال کی طرف چلنے شروع ہوئے۔ یہاں جس حصے ملک میں سے ریل گزرتی ہے اس میں انسانوں سے زیادہ جانور آباد ہیں اور چونکہ وہ مسافروں کو اتارنے چڑھانے بہت کام آتے ہیں اس لئے یہ اسٹیشن اکثر سنسان کف دشت میدان بنے رہتے ہیں ہاں اگر کبھی کوئی شیر یا چیتا ادہر آنکلتا ہے تو ذرا چہل پہل ہو جاتی ہے۔ بہرحال ریل چلتی رہی اور ہم بیچ پر لوٹ ارتے رہے۔ اسٹیشن آتا تو کھڑکی کھول کر ذرا جھانک لیتے اور اگر کوئی اللہ کا بندہ نظر آجاتا تو اسی سے پوچھ بھی لیتے کہ "بھئی یہ کونسا اسٹیشن ہے" مگر وہ ذات شریف کچھ ایسے لہجے میں جواب دیتے کہ اس کا سمجھنا ہماری عقل سے باہر ہوتا۔ خدا خدا کر کے رات کے چار بجے بلہارشاہ اسٹیشن آیا اور اس وقت ذرا طبیعت بحال ہوئی کہ چلو اب صبح قریب ہے اور کچھ نہیں تو کم سے کم آدمیوں کی شکلیں تو دکھائی دیں گی۔ کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد پو پھٹی مشرق کے کنارے سرخ ہوئے اور پھٹ سے صبح ہوگئی۔ اس روز صبح ہونے کی جس قدر خوشی مجھے ہوئی ہے وہ بیان نہیں ہوسکتی رات کی ساری کلفت دور ہوگئی۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ شاعر شب فراق اور عالم تنہائی کا رونا اس قدر روتے ہیں مگر جب دیکھو تن تازہ مونچھوں پر تاؤ دیتے نظر آتے ہیں۔ ریل میں اس رات کے گزارنے کے بعد یہ مسئلہ بآسانی حل ہوگیا اور پتہ چلا کہ واقعی شب فراق ان بیچاروں پر سخت گزرتی ہے مگر صبح کی آمد پھر ان کو جیسے کا ویسا کر دیتی ہے۔

کوئی آٹھ ساڑھے آٹھ بجے واردھے کا اسٹیشن آیا۔ آج کل اس اسٹیشن نے ریل کی آمدنی بہت بڑھادی ہے۔ ذرا کہیں کچھ گڑبڑ ہوئی اور چل مرے یار واردھے کو۔ یہاں ہم نے وہ کنکنا بادامی رنگ کا پانی پیا جس کو عرف عام میں چائے کہا جاتا ہے کوئی بیس برس کی بات ہے کہ ہمارے محلہ میں ایک شخص کافی بیچنے آتا اور بڑے سخت لہجے میں آواز لگایا کرتا تھا کہ "کافی ایٹ گرم" چنانچہ اس کا نام ہی "کافی ایٹ" پڑ گیا تھا۔ خوب بکری ہوتی تھی مگر خدا معلوم کیا بات ہوئی کہ اس نے یہ چلتا ہوا دھندا چھوڑ ہمارے ہاں نوکری کر لی۔ ایک دن سب نے اس سے فرمایش کی کہ کافی بنادو۔ اس نے پانی دیگچی میں چڑھا، خدا معلوم کیا کیا الابلا ڈال کافی بنا ہمارے سامنے لا رکھی۔ آپ یقین مانیے کہ اس کافی کے تھے تو دس بارہ اجزا مگر اس میں بُن نام کو نہ تھے۔ اسی نمونے کی وہ چائے ہوتی ہے جو اسٹیشنوں پر ملتی ہے اور زہر مار کی جاتی ہے۔

میں پالیٹکس سے ہمیشہ دور رہتا ہوں مگر خبر نہیں کہ یہ واردھے کی چائے کا زور تھا یا وہاں کی آب و ہوا کا اثر کہ ایک دفعہ ہی میرے خیالات پولیٹیکل ہوگئے اور ان خیالات کا وہ زور بندھا کہ بڑی مشکل سے یہ نشہ ساڑھے نو بجے ناگپور کے سنتروں کی ترشی سے اترا۔ میں ہر اس مسافر کو جو ناگپور پر سے گزرتا ہے آگاہ کئے دیتا ہوں کہ اسٹیشن پر سنتروں کی جو ٹوکریاں بکنے آتی ہیں ان کو ذرا دیکھ بھال کر لیا کریں ورنہ بھئی وہ جانے اور ان کا کام جانے۔ انگریزی کی ایک مثال ہے کہ "ہر وہ چیز جو چمکتی ہے سونا نہیں ہوتی" اسی طرح سمجھ لو کہ "ہر وہ چیز جو ان ٹوکریوں میں ہوتی ہے سنترہ نہیں ہوتی" ہم نے بھی

ایک ٹوکری خریدی۔ پہلے بارہ آنے مانگے گئے آخر جب ریل چلنے لگی تو دو آنے پر تصفیہ ہوا۔ چلتی گاڑی سے ہم نے دوانّی باہر پھینکی اور اس نے سنتروں کی ٹوکری اندر لڑھکا دی ٹوکری میں سے جو سنترے نکلتے ہیں وہ بس دیکھنے کے قابل تھے۔ کھانے کے کام کے تو تھے نہیں۔ ہاں خاصہ بھلا چنگا آچار تھا۔ اوپر کی تہ ذرا اچھی تھی، سوچے کہ چلو دو آنے میں چھ سنترے ہی کیا بُرے رہے۔ ایک کو چھیلا، پھانک کو صاف کیا، بیج نکال کر پھینکے پھانک منہ میں رکھی اس کے بعد کچھ نہ پوچھو کہ کیا ہوا۔ بس یہ سمجھ لو کہ کھٹاس افعل التفضیل کے صیغہ کے ساتھ منہ میں داخل ہو گئی۔ گھبراہٹ میں بغیر سوچے سمجھے کلی کی نتیجہ یہ ہوا کہ دانت بیکار ہو گئے ذوق مرحوم فرماتے ہیں ؎

دشنام ہو کے ترش وہ مجھ کو ہزار دے
یاں وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے

اگر جاڑے میں استاد مرحوم ناگپور کے سنترے کھاتے تو ہرگز یہ شعر نہ لکھتے۔ ذرا میں بھی تو دیکھوں کہ وہ کونسے عاشق ہیں جو جاڑے میں ناگپور کے سنترے کھائیں اور اس ترشی سے ان کا نشۂ عشق ہرن نہ ہو جائے۔

ناگپور سے آگے جو اسٹیشن پڑتے ہیں ان کو معناً اسی لئے تو اسٹیشن کہا جاسکتا ہے کہ وہاں گاڑی ٹھیرتی ہے ورنہ بغیر دوربین کے ان کو دیکھنا کچھ آسان کام نہیں ہے۔ ہاں سنترے ہر جگہ ملتے ہیں اور خدا کے فضل سے کھائے بھی جاتے ہیں بھلا ناگپور کے سنتروں کا مزہ چکھنے کے بعد میری کیا ہمت ہو سکتی تھی کہ ان کے خریدنے کا خیال بھی دل میں لا سکتا۔ اس لئے دور ہی سے ان کا نظارہ کرتا اور کھانے والوں کے کام و دہن کی تعریف کرتا رہا۔ وقت کسی طرح کاٹے نہ کٹتا تھا اس لئے ناول نکالا ایک آدھ صفحہ پڑھا تھا کہ پان کا خیال آیا یہ کچھ عجیب بات ہے کہ جب تک پان منہ میں نہ ہو میں نہ کچھ لکھ سکتا ہوں اور نہ پڑھ سکتا ہوں۔ دانتوں کی حالت مجھے معلوم تھی لیکن مرتا کیا نہ کرتا ڈبیا میں سے پان نکالا، ڈرتے ڈرتے منہ میں رکھا، پان منہ میں رکھنا تھا کہ دانت "کڑکڑ" کرنے لگے آخر پوپلوں کی طرح منہ چلایا۔ تھوڑی دیر میں ترشی کا اثر ذرا دور ہوا اور پڑھنے میں دل لگنے لگا کوئی بارہ ساڑھے بارہ بجے ہوں گے کہ پیٹ نے فریاد بلند کی کہ "بیارید ہر چہ دارید" کھانے کی گاڑی ریل میں لگی ہوئی تھی دوسرے ہی اسٹیشن پر کھانا منگوایا۔ یہ تو خدا ہی کو خبر ہے کہ اس میں تھیں کیا کیا چیزیں۔ مگر بھوک کا وہ زور تھا کہ "زرخوردن" کی گردان کرتے کرتے ساری رکابیاں صاف کر دیں۔ اس کے بعد اطمینان ہوا۔ پان کھایا۔ سگریٹ سلگایا اور ناول پڑھنا شروع کیا۔ پانچ بجے اٹارسی پہونچے۔ یہاں خوب ڈٹ کر چائے پی۔ ہوشنگ آباد پہونچتے پہونچتے شام ہو گئی۔ سات بجے بھوپال آیا یہاں میرے ایک عزیز اپنی عنایت سے بہت مرغن کھانا لائے کھانا اپنی رکابیوں میں الٹ ان کی پلیٹیں ان کے حوالے کیں۔ بھوپال سے نکلنے کے بعد خیال آیا کہ کھانا کھا کر اب لوٹ مارو۔ چوبیس پچیس گھنٹے کے جاگے ہوئے ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بیمار پڑ جاؤ۔ کھانا کھایا عشاء کی نماز پڑھی۔ کھڑکیاں چڑھائیں۔ دروازوں کے کھٹکے لگائے روشنی گل کی کمبل تانا اور اپنے آپ کو نیند میں ڈالا۔ نیند تو راہ دیکھ ہی رہی تھی جھٹ آنکھ لگ گئی۔

خدا معلوم وہ کونسی جگہ تھی کیا وقت تھا کہ ایک دروازہ کی کھڑکی پٹ سے گری اور اس آواز کے ساتھ ہی میری

آنکھ کھل گئی کیا دیکھتا ہوں کہ کھڑکی میں سے کالے دستانے پہنا ہوا ایک ہاتھ نکلا۔ ساتھ ہی آہستہ آہستہ دروازہ کھلا اور ایک صاحب سیاہ اوورکوٹ ڈاٹے نقاب منہ پر ڈالے ایک پستول ہاتھ میں لئے اندر تشریف لائے اندر آکر انھوں نے بجلی تو نہیں کھولی ہاں ان کے دوسرے ہاتھ میں جو چھوٹی سی بیاٹری تھی اس کو روشن کیا۔ مگر روشنی کا رُخ نیچے کی طرف رکھا اور نہایت متانت سے کہا کہ "اٹھیے" میں اُٹھ بیٹھا کہنے لگے "لاؤ تمھارے پاس کیا ہے" میں نے کہا "تین روپے چھ آنے نو پائی اور دلی کا ٹکٹ" کہنے لگے "مذاق کرتے ہو" میں نے کہا "جناب والا ایسی حالت میں کیا کوئی بھلا آدمی مذاق کرسکتا ہے" مگر نہ معلوم یہ کیا بات تھی کہ باوجود ایسا نازک موقعہ ہونے کے ان حضرت کا اثر مجھ پر کچھ زیادہ نہیں ہوا۔ یہ ضرور ہے کہ پستول ایک خطرناک چیز ہے مگر جب یہ یقین ہو جائے کہ یہ کسی پلپلے آدمی کے ہاتھ میں ہے تو پھر اس کا ڈر ودر کچھ نہیں رہتا۔ میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ انھوں نے پھر ذرا اونچی آواز میں کہا "نکالتے ہو یا نہیں" میں نے کہا "بہت اچھا نکالتا ہوں" یہ کہہ کر میں ذرا جھکا بنچ کے نیچے میرا کالا پمپ شوز پڑا تھا وہ میں نے اٹھایا اور ایک دفعہ ہی زور سے کہا کہ "ہیں' یہ دروازہ میں کون ہے" میری اس آواز پر انھوں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ میں نے پمپ شوز کے پچھلے حصے کو مٹھی میں دبا اور اس کی نوک سامنے کرکے کہا "رکھ دو پستول نہیں تو گولی مار دوں گا" اب جو وہ میری طرف مڑکر دیکھتے ہیں تو ایک زبردست پستول ان کے سینے کی طرف ہے۔ بیاٹری کی روشنی نیچے پڑ رہی تھی اس لئے وہ میرے پستول کی ماہیت کو نہ سمجھ سکے آہستہ سے اپنا پستول میرے سامنے والے بنچ پر ڈال دیا بیاٹری نیچے پھینک دی اور دونوں ہاتھ اونچے کرکے کھڑے ہو گئے میں نے بنچ پر سے ان کا پستول اٹھایا اٹھ کر بجلی کا بٹن دبایا۔ اس وقت ان کو معلوم ہوا کہ ان کے پستول سے زیادہ میرا جوتا بکار آمد ثابت ہوا۔ میں نے بہت ڈانٹ کر کہا "سامنے بنچ پر بیٹھ جاؤ" وہ حضرت یا تو اس زوروں سے آئے تھے یا تھر تھر کانپنے لگے اور بنچ پر بیٹھ گئے۔ میں نے اٹھ کر چاہا کہ خطرے کی زنجیر کھینچوں کہ انھوں نے رونا شروع کیا اور کہا کہ "خدا کے لئے زنجیر نہ کھینچئے میں گاڑی سے کود کر جان دیدوں گی" "ہیں! جان دیدوں گی" این چہ معنی دارد' میں نے کہا کہ "تم ہو کون" انھوں نے کہا "عورت" میں نے کہا "نام" کہا "راسخہ"۔ میں نے کہا "سبحان اللہ" آپ کو دیکھئے آپ کے کرتوتوں کو دیکھئے۔ اللہ کی بندی تجھے گھر میں بہو بیٹی بن کر بیٹھنا تھا یا اس طرح ڈاکے ڈالتے پھرنا" کہنے لگی "مصیبت سب کچھ کراتی ہے اور رفتار زمانہ سب کچھ سکھاتی ہے" میں نے کہا "نقاب آتارو" کہنے لگی "نہیں" میں نے کہا "نہیں؟ تو اچھا میں زنجیر کھینچتا ہوں" آخر ناچار ہو کر بچاری نے نقاب اٹھائی خاصی اچھی شکل کی جوان عورت تھی مگر آنکھوں کے نیچے کی کالی کالی لکیریں بتارہی تھیں کہ مصیبت زدہ ہے۔ بڑی دیر تک ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ میرے تیور دیکھ کر سمجھ گئی کہ میرا ارادہ اس کو پولیس کے حوالے کرنے کا نہیں ہے، کیونکہ وہ ایک دفعہ ہی کھڑی ہو گئی اور کہا کہ "خدا حافظ" میں نے پستول کا رُخ اس کی طرف کرکے کہا کہ "بیٹھ جاؤ"

اس نے ایک قہقہہ مارا اور کہا کہ "پہلے پستول کو تو دیکھ لیجئے کہ یہ چلتا بھی ہے یا نہیں آپ نے جوتے کے پستول سے لکڑی کا پستول چھین کر کوئی بڑا کمال نہیں کیا ہے۔"

اب جو میں نے غور سے پستول کو دیکھا تو واقعی لکڑی کا ٹکڑا تھا۔ گو شکل صورت میں عین مین پستول تھا میں نے کہا "کچھ ہرج نہیں پستول کام دے یا نہ دے۔ میرے ہاتھ پاؤں تو کام دیتے ہیں اب بیٹھتی ہے یا میں اٹھاؤں" یہ سن کر وہ بیٹھ گئی اور کہنے لگی "آخر اس سے آپ کا مطلب" میں نے کہا کہ "میں تمھاری داستان سننا چاہتا ہوں" پوچھا "کیوں" میں نے کہا "مضمون لکھنے کو" کہنے لگی "تو اچھا آپ مضمون نگار ہیں اور آپ کا اسم شریف" میں نے کہا "فرحت اللہ بیگ" کہنے لگی "اوہو آپ ہی مرزا صاحب ہیں آداب عرض کرتی ہوں آپ کے مضمون پڑھتی تھی۔ آپ کو دیکھنے کا شوق تھا چلو وہ بھی اللہ نے پورا کر دیا۔ اجی مرزا صاحب! میں کیا بتاؤں کہ میں کون ہوں ایک مصیبت زدہ عورت ہوں۔ ایف اے تک تعلیم پائی ہے۔ چھوٹی عمر میں شادی کر دی۔ دو ہی برس کے بعد وہ مر گئے۔ سسرال والوں نے ان کے مرنے کا سبب مجھ کو ٹھیرایا۔ الزام یہ تھا کہ میں سسرال والوں پر بھاری ہوئی کہ ایک ہی سال میں ایک چھوڑ چار کو کھا گئی۔ میکے میں آ کر رہی وہاں سوتیلے بھائیوں نے ٹکنے نہ دیا۔ آخر ایک بھلے آدمی سے نکاح کر لیا وہ اللہ کے فضل سے ڈاکو نکلے دن کو گھر میں رہتے اور رات کو خدا معلوم کہاں کہاں جا کر ڈاکہ ڈالتے۔ مجھے بچپن ہی سے ڈاکوؤں اور سراغ رسانوں کے قصے پڑھنے کا شوق تھا۔ میں ان کے سر ہو گئی کہ مجھے بھی ساتھ لے چلا کرو۔ پہلے تو وہ "نہیں نہیں" کرتے رہے لیکن بعد میں راضی ہو گئے اور اس طرح تھوڑے ہی دنوں میں مجھے گھوڑے کی سواری بھی آ گئی اور چلتی ریل میں چڑھنے اترنے کی مشق بھی ہو گئی۔ ابھی ڈیڑھ سال کی بات ہے کہ نبارک پور کے گاؤں والوں نے ان کو گھیر لیا اور گولی مار کر شہید کر دیا۔" میں نے کہا "شہید کر دیا کی بھی بہت ہوئی یہ کیوں نہیں کہتیں کہ جہنم واصل کر دیا" کہنے لگی "مرزا صاحب دیکھئے خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کیجئے میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں مگر ان کے متعلق اگر آپ نے کوئی برا لفظ زبان سے نکالا تو اچھا نہ ہوگا" میں نے کہا "تو بیگم صاحبہ آپ چاہتی ہیں کہ میں ایک ڈاکو کی تعریف کروں" کہنے لگی "ساری دنیا ڈاکو ہے کوئی اپنی عقل سے دنیا کو لوٹتا ہے۔ کوئی اپنے ہاتھ پاؤں کے زور سے۔ ایک کی آپ تعریف کرتے ہیں اور دوسرے کی مذمت ورنہ ہیں دونوں ڈاکو" میں نے کہا "اللہ رے تیری منطق، اچھا اس جھگڑے کو تو چھوڑو اور اپنا قصہ ختم کرو" کہنے لگی "اس کے بعد اب قصے میں رہ ہی کیا گیا ہے۔ ان کے مرنے کے بعد سال بھر تک تو اپنی جمع پونجی پر گزارہ کرتی رہی جب وہ ختم ہو گئی تو میں نے اکا دکا مسافروں کو لوٹنا شروع کیا۔ چنانچہ خوش قسمتی سے آج آپ سے نیاز حاصل ہو گیا۔ اچھا اب اجازت ہے" میں نے کہا "راسخہ! بڑے افسوس کی بات ہے کہ تم شریف اور تعلیم یافتہ ہو کر اپنی ڈاکہ زنی پر فخر کرتی ہو" کہنے لگی "اجی مرزا صاحب، مثل مشہور ہے کہ بھوکے شریف اور پیٹ بھرے رذیل سے ڈرنا چاہیے۔ مگر میں کہتی ہوں کہ یہ دونوں ایسے خطرناک نہیں ہوتے جتنے بگڑے ہوئے تعلیم یافتہ شریف یقین

مانیے کہ اگر ان لوگوں میں ذرا سی ہمت کا اضافہ ہو جائے تو یہ دنیا کو ہلا دیں۔

وہ تو کہو کہ خدا نے گنجے کو ناخن ہی نہیں دیئے ورنہ کھجا کھجا کر خدا معلوم اپنا کیا حال کر لیتا۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہ پیشہ چھوڑ دو۔ میں آج ہی چھوڑے دیتی ہوں مگر میرے کھانے پینے کا تو بندوبست کر دو" میں نے کہا" پھر کسی سے نکاح کر لو" کہنے لگی "کس سے" آپ سے" میں نے کہا۔ "مجھ سے نکاح کرنا کچھ آسان کام نہیں ہے۔ میری بیوی پکی مغلانی ہے میں نے تو جوتے سے پستول کا کام لیا تھا مگر وہ چپل سے ساتر ے کا کام لے گی" یہ سن کر اس نے ایک قہقہہ مارا اور کہا "مرزا صاحب' آپ کی باتوں میں آج مزا آ گیا۔ ہاں' لائیے سیدھے ہاتھ سے اب کچھ دلوایئے۔ خدا کی قسم میرے پاس کھانے کو ایک پیسہ نہیں ہے کل سے بھوکی ہوں" میں نے بٹوہ کھول اس کے سامنے کر دیا بٹوہ میں کئی نوٹ تھے مگر اس اللہ کی بندی نے صرف دو روپے نکال لئے اور کہا "شکریہ" چلو چلتے چلتے آپ پر بھی ہاتھ صاف کر ہی دیا۔ اچھا فی امان اللہ" یہ کہہ دروازہ کھول ریل سے اس طرح نیچے اتر گئی کہ کوئی گارڈ بھی کیا اترے گا۔ چلتے چلتے اپنی بیاٹری اور پستول بھی اٹھا کر لے گئی۔ میں سوچتا تھا کہ بار الٰہ' جب شریف زادیاں اس طرح ڈاکہ ڈالنے پر اتر آئی ہیں تو یہ دنیا کیا رنگ پکڑنے والی ہے۔

گھبرا کر بنچ سے اٹھا' کیا دیکھتا ہوں کہ دروازے کا کھٹکا اندر سے لگا ہوا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یا الٰہی یہ کیا معاملہ ہے بڑی دیر تک غور کرنے کے بعد سمجھ میں آیا کہ ہو نہ ہو یہ سب کچھ تیرے چوبیس [24] گھنٹے تک جاگنے' ثقیل غذا کھانے' اور سخت بنچ پر پڑے رہنے کا نتیجہ ہے۔ ورنہ شریف زادیاں تو شریف زادیاں ہی ہوتی ہیں ان کو بھلا ایسے کاموں سے کیا واسطہ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ میرے بٹوے میں سے دو روپے کیوں کم ہو گئے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ

دردناک مشاہدہ

(۱۹ نومبر کو انارکلی چوک نیلا گنبد لاہور کا ایک چشم دید واقعہ۔ احسان دانش کے پانچویں مجموعۂ کلام "نفیرِ فطرت" کا ایک ورق)

کل صبح ایک شخص پریشان و مضمحل
پامالِ روزگار، مسرت سے دور تر

بیٹھا تھا اک دوراہے پر غم میں گھرا ہوا
سانسوں میں جا رہی تھی کھنچی خاکِ رہ گزر

۱

ٹوٹی سی ٹوکری میں سنگھاڑے لئے ہوئے
چلا رہا تھا "پیسے کے لے جاؤ سیر بھر"

گاہک مگر نہ کوئی بھی آتا تھا اس کے پاس
حسرت سے اٹھ رہی تھیں نگاہیں ادھر ادھر

۲

اتنے میں ایک شخص رجسٹر لئے ہوئے
باشان و باشکوہ و باندازِ کر و فر

اس کی طرف بڑھا تو یہ سمجھا وہ نامراد
"میری نوائے گرم گئی تا دل و جگر"

لیکن یہ جب سنا "ابے محصول کر ادا"
"بیٹھا ہے صبح دوراہے کو گھیر کر"

منہ رہ گیا کھلا کا کھلا، سانس رک گئی
اٹھی نہ جھک کے سوگ میں ڈوبی ہوئی نظر

اس شش درہی کے بعد لرزتی زبان سے
کہنے لگا "ہو آپ کا رتبہ بلند تر"

"آیا ہوں جب سے ایک بھی گاہک نہیں نصیب"
"میں کیا کروں نہیں مری تقدیر ساز گر"

"محصول سے کہاں مجھے انکار کی مجال"
"مہلت ہو اس قدر کہ جب آپ آئیں لوٹ کر"

اس التجا پہ طیش محرر کو آگیا
ٹھوکر لگائی ایسی بچارے کے تان کر

نالی میں گر گئی وہ سنگھاڑوں کی ٹوکری
چپ تھا غریب ضعف سے تھامے ہو شکر

۳

یہ ہے یہاں غریب کا معیار زندگی
یہ غم زدوں کے حال پہ ہے لطف کی نظر

یہ قدر آدمی کی یہاں آدمی کو ہے
شرمائیں جس کو دیکھ کے جنگل کے جانور

یہ خستہ کامیوں کی مدارات، الاماں!
یہ نامرادیوں پہ عنایات، الحذر!!

یہ فاقہ مستیوں پہ سخاوت کی بارشیں!
ناداریوں پہ یہ ہیں کرم ہائے الحذر!!

یہ ملک میں ہے عزت باشندگانِ ملک
محصول دے سکیں تو کریں زندگی بسر

یہ زندگی پہ جور و ستم ہائے زندگی!
یہ دورِ خودنما "کہ بشر کا خدا بشر"!!

مذہب غلام، روح غلام، آبرو غلام
آزادیٔ ضمیر، نہ آزادیٔ نظر

احسان دانش

موجودہ اردو شاعری

آج کل کی اردو شاعری گرد و پیش کے اثرات کے لئے جس قدر کشادہ آغوش بن گئی ہے، ایسی کسی زمانے میں بھی نہیں تھی۔ وہ تمام قومی اور ملکی سیاست، عالمی معاشی اور سیاسی افراتفری، نظری اور حکمی علوم کی توسیع اور حسن کاری کے اگلے تخیلات کی تبدیلیاں، جن سے ہماری قومی زندگی متاثر ہو رہی ہے، ان کا تھوڑا بہت عکس ہماری موجودہ شاعری میں بھی اتر رہا ہے۔

موجودہ شاعری کے پس منظر میں دو واقعات بے حد نمایاں اور خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں پہلا اور سب سے اہم واقعہ، مغربی قوموں سے ہمارا تصادم ہے۔ جس کا انجام بالآخر ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط کی صورت میں ہوا۔ لیکن یہ انجام ہماری شاعری کے لئے چند اہم تحریکوں کا نقطۂ آغاز ثابت ہوا۔ انگریزی تسلط کے بعد ہماری شائستہ زندگی کا رخ، ایران سے انگلستان کی طرف پھر گیا۔ ہمارے خیالات، اعتقادات، رہنے بسنے کے طور طریق غرض ہر چیز میں تبدیلی ہو رہی تھی۔ اس کا اثر ہمارے ادبی تخیلات پر بھی پڑنا ناگزیر تھا۔ چنانچہ بدلی ہوئی فضا سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کرنے کے لئے ہم کو جو جد و جہد کرنی پڑی، اس کا تھوڑا بہت اثر ہماری شاعری پر بھی پڑا۔ اس زمانے میں نئی روشنی کو ہماری زندگیوں میں داخل کرنے کا باعث اس عصر کے اولین مصلح، سر سید احمد خاں بنے، اور اس تحریک کو شاعری میں، داخل کرنے کا باعث آزاد اور ان سے بڑھ کر حالی تھے۔

حالی کی تحریک کا مقصد، اردو شاعری کو اس کے مخصوص فنی تخیلات سے ہٹانا تھا۔ اس میں ان کو اس حد تک کامیابی ہوئی کہ فنِ شعر کے نظریہ میں ایک ہلچل برپا ہو گئی اور ہماری شاعری نیچرل شاعری قومی شاعری جیسی تحریکوں اور سادہ طرزِ بیان سے روشناس ہوئی۔ لیکن شعر کی صنفیں اور شکل و صورت ابھی تک معرضِ بحث میں نہیں آئی تھی۔ حالی، مروجہ شاعری کے مضامین کے ساتھ، ردیف اور قافیہ کی "اوگھٹ گھاٹیوں" سے بھی بیزار تھے۔ لیکن ان کی عملی ذہنیت اصنافِ شعر کو چھیڑنے کا مشورہ نہیں دیتی تھی۔ تاہم یہ تخم بھی بویا جا چکا تھا، اور طوفان راہیں تلاش کر رہا تھا۔ ایسے میں، دوسرا اہم واقعہ پیش آیا یہ یورپ کی جنگ عظیم تھی

اس اہم عالمی حادثہ کا اثر، ہماری شاعری پر شاید براہِ راست نہیں پڑا، اس جنگ کے بعد سے عالمی سیاست میں جو گتھم گتھا ہو گئی تھی، اس کے سبب ہم ان اثرات سے بے تعلق بھی نہیں رہ سکتے تھے۔

اس جنگ کا اثر دنیا پر کس قدر دوررس ثابت ہوا، اس کا پورا پورا اندازہ ابھی تک بھی نہ ہو سکا۔ اس کی وجہ سے جہاں بہت سا جانی اور مالی نقصان ہوا، اور دولت مند قومیں مفلس ہو گئیں، وہیں، مشرقی قوموں کے دلوں میں آزادی کی ایک لہر دوڑ گئی اور ترکی انقلاب نے راستہ اور بھی ہموار کر دیا۔ اور یورپ، اور خاص کر انگریزوں کی برتری کا طلسم ہمارے ذہنوں سے ٹوٹنے لگا۔ یہی زمانہ ہماری شاعری میں، قومی جوش اور حب وطن کے ترانوں کا زمانہ ہے۔ اس سلسلے میں اقبال نے حالی کی، اور چکبست، سرود اور نوجوان شعرا کی ایک بڑی تعداد ان کے نقشِ قدم پر چلنے لگی۔ اقبال کا مشہور ترانہ اس احساس کو جگانے میں، بلاشبہ "بانگ درا" ثابت

ہوا۔ یورپی شاعری میں، قومی جوش و خروش کا زمانہ عین
جنگ کا زمانہ تھا۔ لیکن اردو شاعری میں یہ احساس
مابعد جنگ اثرات کا پیدا کردہ ہے۔

جنگ کے بعد دنیا سمٹ کر اتنی قریب ہو گئی کہ
دنیا کی ساری قومیں ایک دوسرے کی ہمسایہ بن گئیں۔ دوران
جنگ میں، اس مصیبت کو جلد سے جلد یکسو کرنے کے لئے
علمائے سائنس کے جو ذہن تیزی سے کام کر رہے تھے۔
بعض وقت تمام حدوں کو توڑ کر آگے نکل گئے، اور یوں تو
بہت سی اچھی بری چیزوں کو وہ وجود میں لانے کا باعث
ہوئے۔ لیکن، دنیا کو قریب تر لانے میں، جن سے بہت
مدد ملی، وہ ہوائی جہازوں کی ترقی اور لاسلکی کی ایجاد ہے۔

جنگ عظیم میں جو جانی نقصانات ہوئے، ان کے
اثرات، وہیں پر ختم ہو گئے، لیکن اس کے مالی نقصانات
بہت دور رس ثابت ہوئے۔ اس حادثے نے جیتنے والے
اور ہارنے والے، سب کو یکساں مفلس بنا کر چھوڑا۔ جنگ کے
زمانے میں امن کے خوش گوار خواب دیکھنے والوں کے لئے
جنگ کے بعد کا زمانہ اور بھی حوصلہ شکن ثابت ہوا۔ معاشی
ابتری کی وجہ سے، ان کی زندگی کے سارے نظامات
درہم برہم ہو گئے تھے۔ فطرتاً ان کا سب سے بڑا نصب العین
معاشی ترتیب بن گئی۔ جنگ کی تلخیوں نے، ان کے
مذہبی جذبے کو خدا اور اس کی دنیا کے نظام کے خلاف
انتقام کے جذبے میں تبدیل کر دیا، اگلی گھریلو زندگی
کی راحتیں اب خواب و خیال ہو گئیں اور صنعتی تعلقات
میں نیکی، بدی کا کوئی سوال نہیں رہا۔ ان کی حسن کاری
کا سارا تناظر بھی چوپٹ ہو گیا، جس کا اثر، تعمیر کاری
مصوری اور شاعری غرض تمام فنونِ لطیفہ میں نمایاں ہے

غرض یورپ کی جنگ زدہ قومیں اپنے آپ کو
بدلی ہوئی فضا کے ہم آہنگ بنانے کے لئے بیٹھیں، تو
انھیں جیسی جیسی ضرورت ہوئی، حیات کے نئے نئے
نظامات ترتیب دینے پڑے، اشتراکیت، اشتمالیت،
فاسطیت، جیسی تحریکیں اسی کی پیدا کردہ ہیں۔ ان کے
علمانے بھی، اس معاملے میں ان کا ہاتھ بٹایا۔ اور حیاتیات
نفسیات، معاشیات، اور سائنس کے عالموں کی
تحقیقات نے، زندگی کے لئے بہر حال، سہارا پیدا
کر دیا۔ جو نئی معاشرہ انھوں نے ترتیب دی، اس کا
دارومدار معاشیات پر تھا۔ زیادہ سے زیادہ دولت
پیدا کرنے کے وسیلے، کلوں اور دوسری مصنوعات کی صورت
میں فراہم کئے گئے۔ اور اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ
اٹھانے کے لئے، ایسے اجتماعی نظریے وجود میں آئے
جن کی بدولت، فرد، ایک nonentity بن کر
رہ گیا۔ ہم بھی چونکہ اس عالمی کل کے جز بن گئے تھے
ان تمام تحریکوں سے بے تعلق نہیں رہ سکتے تھے۔
ان تحریکوں کو ہمارے درمیان اور بھی چلتا کرنے
میں، ہمارے ان تعلیم یافتہ نوجوانوں کا بھی بڑا ہاتھ ہے
جو اب انگریزی برتری کا ہوا دور ہونے کے سبب، یورپ
کی جامعات کو بھی علم و فن کا اسی طرح مرکز سمجھ کر جانے لگے
جس طرح وہ اس سے پہلے صرف انگریزی جامعات کو سمجھتے
تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ، وہ نہ صرف یورپ کی اہم زبانوں
اور ان کے علوم و فنون سے بہرہ ور ہوئے، بلکہ وطن لوٹتے
ہوئے ان کی نئی نئی تحریکوں کے اثرات بھی ساتھ
لیتے آئے۔ اس کا اشتراکی اور بعض وقت اشتمالی نظام حیات
ان کے لئے سب سے زیادہ جاذبِ نظر ثابت ہوا۔

ان عالمی تحریکوں کے علاوہ ہم اپنے ذاتی ملکی اور قومی مسائل سے بھی دوچار ہیں، جن میں سب سے اہم مغربی یلغاروں سے اپنے آپ کو بچانا اور اپنی قومی انفرادیت اور آزادی پر قابو پانا ہے۔

ان تمام تحریکوں کے اثرات اور ان کے ردِ عمل کا سب سے بڑا مظہر اس عصر کے شاعرِ اعظم اقبالؔ کی شاعری ہے۔ ہماری اجتماعی زندگی کا شاید ہی کوئی پہلو ایسا رہ گیا ہوگا جس کو ان کی فکر نے نہ چھیڑا ہو۔ لیکن اور نوجوان شعرا کی طرح وہ، ان تحریکوں کی نظر فریبیوں پر قانع نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کے وسیع علم اور ان کی دقیق نظر نے کسی تحریک کو چھان بین اور تنقید کی کسوٹی پر پرکھے بغیر قبول کرنے نہیں دیا۔ ان کی دوررس نگاہیں "دم کٹی لومڑی کے فلسفہ" کی تہ تک آسانی سے پہنچ گئیں۔ انھیں صاف نظر آگیا کہ یورپ کا سارا نظام کھوکھلی عمارتوں پر تعمیر ہوا ہے۔ اور جو چیزیں ضرورت زمانہ کی مجبوریوں سے وجود میں آئی ہوں، ان کا ہر حالت میں پائدار ہونا ضروری نہیں ہے۔ انھیں مغالطوں کو دور کرنے اور پائدار اہمیت کی چیزوں پر نظر جمانے کی تلقین کے لئے انھوں نے اپنی ساری شاعرانہ، ملہمانہ اور مصلحانہ قوتیں بلکہ اپنی ساری زندگی وقف کر دی۔ فرد کی حیات اور اس کی خودی کو وہ ایک اتفاقی چیز نہیں سمجھتے تھے، اور جنگ کے مابعد اثرات نے جو موقتی فضا پیدا کر دی تھی، اس کے حل کے ساز و سامان کو وہ اٹل نظامِ زندگی نہیں تصور کر سکتے تھے جمہوریت جیسی کہ عام طور پر یورپ میں رائج ہے ان کی نظر میں ایک ایسی طرزِ حکومت تھی، جس میں "بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے" قومیت کا احساس بھی، وقتی فرقہ بندی کے جوش و خروش کا نتیجہ تھا۔ اصل چیز، انسانیت ہے۔ بین قومیت، جو دراصل "قومیت" کے مفروضہ کا نتیجہ ہے، ظاہر ہے، بے بنیاد چیز ہے۔ مجلس اقوام، ایک "داشتہ پیرک افرنگ" اور "کفن چوروں" کی ایک محفل ہے۔ غرض اقبال نے تمام مسائلِ حاضرہ کی ترجمانی کی ہے۔ اور ان کی شاعری کا ایک بڑا حصہ انہیں کے الفاظ میں "ضربِ کلیم" ہے یعنی اعلانِ جنگ "دورِ حاضر کے خلاف"۔

اقبال جتنے بڑے شاعر تھے، اتنے ہی بڑے مفکر بھی تھے۔ انھوں نے انسان کے لئے جو نظامِ حیات ترتیب دیا تھا، اس کے تمام خد و خال انھوں نے واضح کر دیے ہیں۔ اس طرح ان کی شاعری اجزا سے نہیں بلکہ ان کی ترتیب سے جانچی جانی چاہیے۔

نئی تحریکوں میں، اشتراکیت کی طرف وہ اپنے مخصوص اعتقاد کے سبب مائل تھے، جس کا ثبوت ان کی کئی نظمیں ہیں، جن میں سب سے زیادہ زباں زد "پنجاب کے کسان سے" ہے۔ اور یہی نظامِ حیات، ہمارے نوجوان شعرا میں سے اکثروں کو بھی بہت پسند ہے۔

اقبال کی سی وسیع نظر، ظاہر ہے کہ عام شعرا کے بس کی چیز نہیں ہے۔ اسی لئے ان میں سے ہر ایک ان تحریکوں کا اثر اپنی اپنی بساط کے مطابق لیتا ہے۔ اور ان کی ترجمانی اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق کرنے میں بھی وہ فطرتاً مجبور ہیں۔

ایک چیز جو آج کل کی شاعری کے معیار پر برا اثر ڈال رہی ہے، وہ صحافت کی گرم بازاری اور طباعت کی آسانیاں ہیں۔ اس کی وجہ سے، پیش رس کارنامے عام ہو گئے ہیں۔ اس "کثیر پیداوار" کے دور میں، اچھے اور

پائدار دلچسپی رکھنے والے کارناموں کی پیدائش شاذ ہو گئی ہے اور ان کے لئے یہ فضا سازگار نہیں ہے۔ اسی کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ عام سطح سے ابھرنے کے لئے شاعر، بعض وقت عجیب و غریب اسالیب اور اندازِ بیان کا اختراع کرنے کی دھن میں لگے ہوئے ہیں۔ یورپ میں بھی یہ رجحان موجود ہے۔ لیکن اس بدیع اسلوبی کے اختراع کا سہرا وہاں ان شعرا کے سر ہے، جو الفاظ کی عام بے قدریوں سے جل کر، انتقام لینے کے لئے، ان کے استعمال کے عجیب عجیب انداز وضع کر رہے ہیں، اس سے یورپی شاعری کا ایک بڑا حصہ نہایت ادق اور عوام کی سمجھ بوجھ سے باہر ہو گیا ہے۔

زبان کے ابتدائی کارناموں کی تحقیقات کا بھی خاصہ اثر اس زمانے کی شاعری پر پڑ رہا ہے۔ موجودہ شعرا میں، ایک خاصہ گروہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جو شاعری کو قدیم زمانے کی سادہ اور سلیس زبان اور اندازِ بیان کی طرف لوٹانا چاہتا ہے۔ اس کی ابتدا بھی کہنے کو تو حالی سے ہوئی تھی، کیونکہ وہ میر کی سادہ زبان کو اپنا مطمح نظر سمجھتے تھے۔ لیکن اس زمانے میں یہ کوئی تحریک نہیں بنی تھی۔ اسماعیل میرٹھی اور شوق قدوائی نے اپنے ذوق کی بدولت اس اصول کی پیروی کی تھی۔ عظمت اللہ خاں مرحوم کے ہاتھوں میں یہ ایک شدید تحریک بن گئی۔ اور انتہا پسندوں کی ایک بڑی تعداد ایسی پیدا ہو گئی، جو میر اور ولی کی زبان سے بھی آگے بڑھ کر، برج بھاشا کی نقل اتارنا چاہتی ہے۔

آج سے کوئی ساٹھ ستر سال پہلے، ہمارے ایک رسم و قیود سے بیزار شاعر نے ”غزل“ کی تنگنائی کی شکایت کی تھی، اور اس میں مرثیہ اور قصیدے کے عناصر بھی شامل کر کے، وہ اپنے بیان کے لئے وسعت چاہتا تھا۔ لیکن قدامت پسندوں کی گراں گوشی کے لئے یہ صدا بے اثر ثابت ہوئی۔ ایک اور آزادہ رو شاعر نے، مقبول شاعری، من مانی صنفوں میں پیش کی وہ بھانڈ سمجھا گیا۔ حالی نے اسے محسوس کیا، لیکن وہ قدیم اصناف کی اصلاح اور توسیع کے خیال سے آگے نہ بڑھ سکے۔ لیکن موجودہ زمانے میں، اس تحریک کے برپا ہونے کی سہولت موجود تھی۔ اس میں کچھ تو زبانوں کے بولنے والوں کی عام ذہنی وسعت کا تقاضا تھا اور کچھ قدیم قیود کی سختیوں کا ردِ عمل۔ چنانچہ آج کل کی شاعری میں صورت شعر کے لحاظ سے جو نت نئی تبدیلیاں ہو رہی ہیں، ان کو حصر کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اقبال اور جوش جیسے درمیانی مسلک پر چلنے والے شعرا مسلسل، غزل، قطعہ یا مثنوی کے قافیہ کی ترتیب کو قائم رکھ کر خیال کے اٹھان کے لحاظ سے، ان کے ٹکڑے کر لینے پر اکتفا کرتے ہیں، لیکن انتہا پسند، انھیں سرے سے سامنے سے ہٹا دیتے ہیں۔ یہ تحریک دراصل ”قدیم زبان کی طرف رجعت“ کی تحریک کے دوش بدوش چلی ہے۔ چنانچہ عظمت اللہ خاں مرحوم اور ان کے دبستان کے شاعروں نے، عروض و قوافی کی قیدوں کو سرے سے توڑ دیا ہے۔ عظمت اللہ خاں، ہندی اوزان کی طرف زیادہ مائل تھے۔ اور انھوں نے ایسی نفیس نفیس نظمیں سرانجام کیں کہ، ان کی بدولت وزنوں کے اختراع کا ایک نیا باب کھل گیا۔ اور اب ہندی پنگل اردو شعر کے مسلّمہ اوزان میں داخل ہو گیا ہے۔ موجودہ عصر کے مقبول شعرا جیسے حفیظ جالندھری، اختر شیرانی، احسان بن دانش، روش صدیقی، حافظ غازی پوری

اس طرح کی نظمیں لکھنے میں بڑی دست گاہ رکھتے ہیں۔

ہندی وزن کے علاوہ، فارسی بحروں میں بھی وہ حسبِ ضرورت ترمیم کر لینے کو برا نہیں سمجھتے۔

اگلے اساتذہ کے مسلمہ اوزان استعمال کرنے والے شعرا بھی بعض وقت قافیہ کے تمام ضوابط کی پابندی ملحوظ نہیں رکھتے۔ اس سے بلاشبہ اردو شاعری کی صنفوں میں توسیع ہو گئی ہے اور اردو میں بہت سی مترنم بحریں استعمال ہونے لگی ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ چیز شاعر کے ذوق پر منحصر ہوتی ہے۔ اس کے غلط استعمال سے، بہت سی ایسی چیزیں بھی شاعری کے نام سے معرضِ وجود میں آ رہی ہیں۔ جن کا شاعری سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

ایک خاص صورت نظم کی جو مقبول ہے، وہ ایک طرح کا مستزاد ہے۔ جس میں خیال کے ٹکڑوں کے لحاظ سے چھوٹے بڑے مصرعے بن جاتے ہیں۔ اسی طرح کی نظمیں، غنائی شاعری میں بہت استعمال ہونے لگی ہیں۔ اور یہ قدیم شاعری کے یکساں لب و لہجہ کے مقابلہ میں ایک پسندیدہ جدت ہے۔

اس طرح اردو شاعری کی موجودہ پیداوار پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ حقیقت اچھی طرح ظاہر ہو جاتی ہے کہ آج کل کی شاعری میں ظاہر اور باطن ہر لحاظ سے اتنی وسیع تبدیلیاں ہو چکی ہیں کہ آج سے پچیس تیس سال پہلے کی شاعری کو بھی اس سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ جتنا انقلاب ہماری شاعری میں رونما ہو چکا ہے اتنا ہماری واقعی حالت میں شاید پچاس سال کے بعد بھی نہ ہو سکے گا۔ اور یہ ہمارے ذہنی تاثرات کی موجودہ تاریخ ہے۔

عبدالقادر سروری

غزل

ضرورتاً کافرِ محبت۔ حقیقتاً دین دار بھی ہوں
زمانہ مصلحت پرستی میں لائقِ اعتبار بھی ہوں

خموش ہوں بے قرار بھی ہوں، اسیرِ زلفِ بہار بھی ہوں
میں شاعرِ دل فگار ہی کیا، مصورِ حسن کار بھی ہوں

نظر نظر اس کی یوں جھلکتی ہے جیسے سلمائے پاک دامن
ادا ادا کہہ رہی ہے عصمت مآب و عفت شعار بھی ہوں

تری محبت، تری پرستش میں دل پہ قابو نہیں ہے مجھ کو
تری محبت تری پرستش میں صاحبِ اختیار بھی ہوں

عیاں ہے دنیا پہ میری پستی، مٹے مٹے ہیں نقوشِ ہستی
نقوشِ ہستی نظر کو حائل نہ ہوں تو اک شاہکار بھی ہوں

بہار آتے ہی "ہیرے ہونے" سے باغباں کیوں کھٹک رہا ہے
نہیں الجھتا میں دامنوں سے تو کیا قباحت کہ خار بھی ہوں

محاسنِ انتظارِ محبوب پر دلائل کی کیا ضرورت
وفائے وعدہ سے باخبر ہو کے، مائلِ انتظار بھی ہوں

مری ہی تخلیق ہے زمانہ میں خوش مذاقی و کودذوقی
میں رحمتِ روزگار بھی ہوں میں زحمتِ روزگار بھی ہوں

چمن کے پھولوں سے دل لگانے کا بزدلی سے نہیں تعلق
اگر چمن کو مری ضرورت پڑی تو میں جاں نثار بھی ہوں

یہ مجھ پہ آزادیوں کی بنیاد رکھنے والوں کو کیا ہوا ہے
انھیں تو پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ میں استوار بھی ہوں

شناورِ گنگِ شعر جتنے ہیں شاد، گر مانتے ہیں مجھ کو
تو ایک "تالاب میں فراہم" جو میں انھیں ناگوار بھی ہوں

شاد عارفی

اردو کے نظم گو شاعر

نظم کے پیش خاکے نظم ہماری زبان میں ایک مربوط اور مسلسل صنفِ سخن کا نام ہے۔ یہ ظاہری اور معنوی حیثیتوں سے غزل سے بالکل مختلف ایک مستقل صنفِ سخن ہے، جس کو جدید ادب میں روز افزوں اہمیت حاصل ہوتی جا رہی ہے۔ اردو میں اس کا خاکہ عہد قدیم ہی سے پڑ چکا تھا۔ قدیم دکنی ادب کے نمونے تمام تر مثنویوں کی شکل میں ملتے ہیں۔ خاور نامہ، یوسف زلیخا، چندر بدن مہیار، قصۂ بہرام و حسن بانو اس دور کی مشہور مثنویاں ہیں، ان مثنویوں سے متعلق تفصیلی معلومات پیش کرنا اردو مثنویوں کی تاریخ لکھنے والے کا کام ہے۔ لیکن ہمارے لئے اتنا جاننا ضروری ہے کہ ہم آج جس صنفِ سخن کو نظم کہتے ہیں، اس کا ایک دھندلا سا خاکہ ان مثنویوں کی شکل میں قدیم دکنی ادب میں تیار ہو چکا تھا۔

نظیر اکبر آبادی نظیر اکبر آبادی پہلے شاعر ہیں جنھوں نے نظم کو جدید طرز اور نئے رنگ سے پیش کیا۔ نظیر نے اپنی نظموں کے موضوعوں کے لئے ہندوستانی احول اور ہندوستانی معاشرت کا انتخاب کیا۔ الفاظ کا جتنا ذخیرہ نظیر کی نظموں میں ملتا ہے اتنا میر انیس کے علاوہ غالباً کسی اور شاعر کے کلام میں نہیں ملتا۔ نظیر کے اکثر و بیشتر الفاظ آج کل متروکات میں شمار کئے جاتے ہیں، ان کے اسلوب ان کی زبان اور ان کی نظموں کے موضوعوں پر بہت سارے اعتراضات کئے جاتے رہے ہیں۔ یہ نقاد کا کام ہے کہ ان کی تائید یا تردید کرتا رہے، لیکن ایک مورخ کی نظر میں نظیر اکبر آبادی پہلے شاعر ہیں جنھوں نے منظر کشی اور واقعہ نگاری کی طرف توجہ کی اور اس طرح اپنے لئے اور دوسروں کے لئے ایک مستقل شاہراہِ سخن تیار کر لی۔

میر انیس میر انیس نے منظر کشی اور جذبات نگاری کو درجۂ کمال تک پہنچا دیا۔ لیکن خود میر انیس نے نظم کی ایک خاص صنف کو اپنی شاعری کا محور بنا لیا تھا۔ اس لئے ان کی شاعری تاریخی حیثیت سے اردو مرثیے اور اردو کی ڈرامائی شاعری سے متعلق ہو جاتی ہے۔ بہر حال میر انیس کی منظر نگاری اور جذبات نگاری کو جدید نظم کے پیش خاکے کا اہم جزو سمجھنا چاہیے۔

عہد حالی انیس کے بعد نظم کے پیش خاکے "مختلف حیثیتوں سے مختلف شاعروں کے ہاں تیار ہوتے رہے۔ مولوی محمد حسین آزاد نے کرنل ہالرائڈ کے مشورے سے جس وقت انجمن پنجاب کے جدید مشاعروں کی بنا ڈالی ہوگی تو ان کا وجدانِ شعری غیر شعوری طور پر ان پیش خاکوں سے متاثر رہا ہوگا۔ نظیر اکبر آبادی کی نظمیں میر حسن کی مثنوی کے دلچسپ مرقعے میر انیس کے مرثیوں کے مناظر اور ان کی جذبات نگاری یہ سب ان کے پیشِ نظر رہے ہوں گے۔ اور ان کے ذہن میں ان اجزا کی مدد سے جدید نظم کی عمارت کی تعمیر ہو رہی ہوگی۔ مختصر یہ کہ آزاد کی تحریک نے جدید شاعری کے سب سے بڑے علمبردار اور اس عہد کے سب سے بڑے قومی شاعر حالی کے شعور کو بیدار کر دیا اور ہماری زبان میں ان دونوں بزرگوں کی کوششوں سے اس صنفِ سخن کی مستقل بنیاد پڑی جس کو ہم آج نظم سے تعبیر کرتے ہیں۔ حالی چونکہ سرسید کی اصلاحی تحریکوں سے بے حد متاثر تھے، یہ اصلاحی تحریکات ان کی شاعری کا ایک اہم جزو بن گئی۔ حالی کی نظمیں چونکہ ان کے دل سے نکلی تھیں وہ براہِ راست دل کے تاروں کو چھیڑتی ہیں۔

خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی

اکبر حسین اکبر الہ آبادی

شبیر حسن جوش ملیح آبادی

ابو الاثر حفیظ جالندھری

شیخ ابراہیم ذوق

خواجہ حیدر علی آتش

خواجہ میر درد

قوم پر حالی کے پیام کا کیا اثر ہوا یہ ایک علحدہ بحث ہے۔ لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری نے مسلمانوں کے اجتماعی شعور کو بیدار کر دیا۔ حالی کی شاعری مسلمانوں کے تنزل کا ایک دردناک مرثیہ ہے۔

شبلی ۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء | حالی کی نظمیں اصلاحی مقاصد کے لئے اس قدر موثر اور مقبول ثابت ہونے لگیں کہ شبلی جیسے سنجیدہ عالم اور مورخ کو بھی اس کی طرف توجہ کرنی پڑی، شبلی چونکہ فطرت سے شاعرانہ دل و دماغ لے کر آئے تھے ان کو اپنی شاعری کے لئے کسی ذہنی کاوش سے دوچار ہونا نہ پڑا۔ شبلی نے تاریخ اسلام کے بعض دلچسپ اور سبق آموز واقعات نہایت کامیابی کے ساتھ نظم کئے ہیں۔ ان کی مثنوی صبح امید تاریخی اور ادبی اعتبار سے خاص اہمیت رکھتی ہے۔

اسمٰعیل میرٹھی ۱۸۴۴ء تا ۱۹۱۷ء | اسمٰعیل میرٹھی دبستانِ حالی کے ایک ممتاز پیرو ہیں، انھوں نے بہت ہی اخلاقی اور اصلاحی نظمیں کہی ہیں، یوں کہنے کو اسمٰعیل بچوں کے شاعر تھے لیکن اسلوب کی شگفتگی اور سلاست کے اعتبار سے ان کی نظمیں ہر مذاق اور ہر طبیعت پر یکساں اثر رکھتی ہیں۔

اکبر الہ آبادی ۱۸۴۶ء تا ۱۹۲۱ء | اکبر ہماری زبان کے سب سے بڑے طنز نگار satirist تھے۔ انھوں نے جس لطیف طنز کی زبان میں بنا ڈالی اس کے آپ موجد اور آپ ہی منتہی تھے، ان کی شاعری ہماری بڑھتی ہوئی مغربیت کے خلاف ایک احتجاج تھی، اکبر اپنے دور کے واحد نمائندہ شاعر ہیں جن کے کلام میں ہم کو اس عہد کے سارے ذہنی رجحانات نظر آتے ہیں اس میں ہم کو اس عہد کی مغرب پرستی اور اس کے ردِ عمل دونوں ملتے ہیں، مغربیت کے خلاف اکبر کے یہی جذبات زیادہ قوت کے ساتھ اقبال کی نظموں میں جلوہ گر ہوئے۔ اس اعتبار سے مشرق کے شاعرِ اعظم علامہ اقبال مرحوم کی شاعری اکبر کی شاعری کی ہی صدائے بازگشت ہے۔

چکبست لکھنوی ۱۸۸۲ء تا ۱۹۲۶ء | اس عہد کے ایک اور ممتاز نظم گو شاعر چکبست لکھنوی ہیں۔

چکبست کی نظمیں مناظر نگاری اور وطن پرستی کے جذبات کے اعتبار سے اردو ادب میں ایک ممتاز اور رفیع مقام رکھتی ہیں، چکبست کی منظر کشی اور جذبات نگاری کے اسلوب پر میر انیس کا نمایاں اثر ہے۔

شوق ۱۸۵۳ء تا ۱۹۲۵ء اور نظم طباطبائی ۱۸۵۲ء تا ۱۹۳۳ء | شوق اور نظم بھی اس عہد کے نظم نگار شاعروں میں قابلِ ذکر ہیں، شوق کی جذباتی نظمیں بے حد دلچسپ ہیں، نظم طباطبائی کی شاعری قدیم اور جدید تحریکات کا سنگم ہے گرے کی مشہور نظم گورِ غریباں ان کا غیر فانی کارنامہ ہے نظم طباطبائی اور عبدالحلیم شرر مرحوم نے اردو میں قافیہ معرا (بلینک ورس) کو رواج دینے کی کوشش کی تھی لیکن یہ مساعی غیر مشکور ثابت ہوں۔

عظمت اللہ خاں ۱۸۸۷ء تا ۱۹۲۷ء | تقریباً اسی دور کے ایک اور ممتاز شاعر عظمت اللہ خاں گذرے ہیں۔ انھوں نے بڑی شاعرانہ بصیرت اور حسن کارانہ مذاق پایا تھا وہ ایک خاص طرز کے موجد اور تنہا مالک تھے، ان کی نظموں پر ہندی شاعری کا بڑا اثر تھا۔ ان کے الفاظ مترنم اور اسلوب بے حد پُر موثر ہوتا تھا۔

تسلیم | مولوی وحید الدین سلیم عظمت اللہ خاں اور جوش ملیح آبادی

سے بے حد متاثر تھے۔ سلیم نے شاعری اپنی عمر کے آخری حصے میں شروع کی ان کی نظموں میں جوش اور روانی بہت زیادہ نظر آتی ہے۔

عہدِ اقبال | اقبال (۱۸۷۷ء تا ۱۹۳۸ء) اقبال کی عظیم الشان شخصیت ان کی زندگی ہی میں بجائے خود ایک ادارہ بن گئی تھی۔ اور ان کی شاعری کا اثر شعوری یا غیر شعوری طور پر سارے ادب پر پڑ رہا تھا۔ اقبال بلاخوف تردید اردو کے بلکہ ساری ایشیائی زبانوں کے سب سے بڑے شاعر سمجھے جا سکتے ہیں۔ ان کی حیات اور ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر جتنا کچھ لکھا جا چکا ہے وہ اردو کے کسی اور شاعر کے متعلق نہیں لکھا گیا۔ اقبال کی شاعری نے اردو کے ہر چھوٹے اور بڑے شاعر کو متاثر کیا ہے اور ہر شاعر نے کسی نہ کسی طرح ان کی فکر سے اکتساب کیا ہے اور ان کی شاعری کی تقلید کی ہے۔

جوش ملیح آبادی ۱۸۹۴ء | جوش غالباً موجودہ عہد کے سب سے زیادہ مشہور و مقبول نظم گو شاعر ہیں، جوش و سرمستی ان کے کلام کی اہم خصوصیات ہیں۔ جوش ملیح آبادی اپنے مسلک اور عقائد کے اعتبار سے اقبال سے بالکل مختلف ہیں لیکن ان کی طرز فکر اور ان کے اسلوب پر اقبال کا اثر ضرور ہے۔ جس سے شاید وہ خود باخبر نہیں ہیں جوش نے نہایت آزاد اور بیباک شاعرانہ طبیعت پائی ہے، یہی وجہ ہے کہ کہیں کہیں ان کی نظموں میں ایک بے اعتدالی اور بے آہنگی سی پائی جاتی ہے لیکن اس سے ان کی شاعرانہ عظمت پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔ جوش شاعر انقلاب بھی ہیں اور شاعر شبابیات بھی، انقلاب کے لئے ان کے پاس اقبال کی طرح کوئی مستقل فلسفہ یا پیام نہیں لہٰذا جوش جس انقلاب کا خواب دیکھتے ہیں۔ اس انقلاب کی تعبیر محض خون آشامیوں اور ہنگام آرائیوں میں ہوتی نظر آتی ہے، اقبال جس انقلاب کے متمنی ہیں وہ ایک وجدانی انقلاب ہے جس کا وہ ایک مکمل نصاب اپنے فلسفے میں پیش کرتے ہیں، اقبال شاعر بھی تھے اور مفکر بھی لیکن جوش شاعر اور صرف شاعر ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی انقلابی شاعری سے زیادہ اہم ان کی جذباتی اور شبابیاتی شاعری ہے، اسی کو ان کی حیاتِ ادبی کا غیر فانی سرمایہ سمجھنا چاہیے۔

علی اختر | حیدرآباد دکن کے علی اختر عہد حاضر کے نظم گو شاعروں میں سب سے زیادہ سنجیدہ اور سب سے بلند شاعرانہ حیثیت کے مالک ہیں۔ ان کی نظمیں فکر عمیق کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ ان کا ہر شعر ایک مستقبل دعوت فکر ہوتا ہے ان کی نظمیں "میلارمے" (فرانسیسی شاعر) کی نظموں کی طرح عوام کے لئے چیستاں بن کر نہیں رہ جاتیں، ان کا کلام غیر شعوری طور پر ایک دلکش نغمہ بن کر دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔ اقبال کا صحیح اثر علی اختر سے زیادہ کسی شاعر نے قبول نہیں کیا۔ ان کی شاعری کا سب سے بڑا حسن ان کی فکر اور ان کے اسلوب کی ہمواری اور ہم آہنگی ہے، فارسی ترکیبوں کے استعمال کا سلیقۂ جمیل علی اختر سے زیادہ عہد حاضر کے کسی شاعر کو نصیب نہیں ہو سکا۔

سیماب اکبرآبادی | سیماب اکبرآبادی اس عہد کے ایک اور ممتاز صاحب طرز نظم گو شاعر ہیں، انھوں نے آگرہ اسکول کی بنیاد ڈالی ہے۔ سیماب کے دبستان کے شاعروں میں ساغر نظامی، منظر، اعجاز اور شاہد خاص طور سے
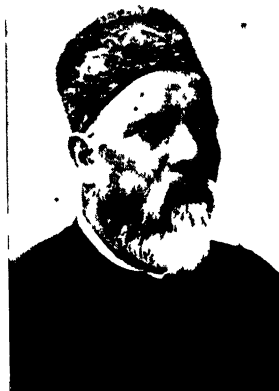
قابلِ ذکر ہیں۔

ماہر القادری | ماہر القادری بھی اس دور کے ایک ممتاز اور خوش فکر نظم گو شاعر ہیں، اصلاحی اور شبابی دونوں قسم کی نظمیں ماہر کے کلام میں موجود ہیں، یہ نظمیں حسنِ خیال اور حسنِ بیان کا نہایت دلکش اور اچھوتا نمونہ ہیں۔

احسان بن دانش | احسان بن دانش عہد حاضر کے سب سے بڑے انقلابی شاعر ہیں، ان کی انقلابی شاعری کوئی رسمی شاعری نہیں بلکہ ان کی اپنی بپتا ہے۔

ان کے علاوہ اختر شیرانی، روش صدیقی، حفیظ جالندھری، عدم، مجاز، ابوالفخر سلام، مخدوم عثمانیہ، میکش عثمانیہ، ساز عثمانیہ، علی منظور، زیبا، وجد، جان نثار اختر، الطاف مشہدی، اختر صہبائی اور فطرت واسطی ہماری زبان کے مشہور نظم گو شاعر ہیں ان کا کلام اس عہد کا بیش بہا ادبی سرمایہ ہے۔ اردو شعر و ادب کے مستقبل کی تعمیر ان ہی ہاتھوں سے ہونے والی ہے۔

عمر مہاجر

یاد

(۱)

جب چاند ستارے ہنستے ہیں رنگین نظارے ہنستے ہیں
خاموش اندھیری راتوں میں معصوم شرارے ہنستے ہیں
کیوں یاد تمھاری آتی ہے

(۲)

جب سخت اندھیرا ہوتا ہے جب سارا عالم سوتا ہے
اور پریم کی ویراں نگری میں دل چپکے چپکے روتا ہے
کیوں یاد تمھاری آتی ہے

(۳)

جب نینن گنگا بہتی ہے اور پریم کہانی کہتی ہے
جب بگلے اڑتے رہتے ہیں اور ندیا بہتی رہتی ہے
کیوں یاد تمھاری آتی ہے

(۴)

جب پریم تپسّا ہوتی ہے اور "شاما" گا کر روتی ہے
تاروں کی سندر چھاؤں میں جب پریم کی دنیا سوتی ہے
کیوں یاد تمھاری آتی ہے

(۵)

جب بادل شور مچاتا ہے الفت کے ترانے گاتا ہے
جب ساون بھادوں ملتے ہیں شہنائی سنکھ بجاتا ہے
کیوں یاد تمھاری آتی ہے

(۶)

اک نور کا گھیرا ہوتا ہے رنگین سویرا ہوتا ہے
جب دیپک بجھنے لگتا ہے معدوم اندھیرا ہوتا ہے
کیوں یاد تمھاری آتی ہے

(۷)

جب صبح پہ تارے ہوتے ہیں خاموش اشارے ہوتے ہیں
جب کلیاں ہنستی رہتی ہیں معصوم نظارے ہوتے ہیں
کیوں یاد تمھاری آتی ہے

انسب کلیانوی
(عمر گزشتہ)

میرا سنگِ مزار

سنہ ۱۹۲۱ء میں ایک مضمون میں نے لکھا تھا جس کا عنوان "ہماری آخیر خواب گاہ" تھا۔ جو رسالہ النساء میں چھپا اس میں یہ بتایا تھا کہ ہم اپنے رہنے کے لئے تو عالی شان عمارتیں بناتے ہیں۔ اور ہمارے بعد ہمارے مزار پر جانور لوٹا کرتے ہیں ہندوؤں اور مسلمانوں کے قبرستان نہایت بری حالت میں رہتے ہیں ہم کو چاہیے اپنی زندگی میں اپنی آخیر خواب گاہ بنالیں وہاں چمن و باغ ہو جس کی جو حیثیت ہو اسی طرح کا انتظام پہلے سے کرنا چاہیے۔ اٹلی کا قبرستان نمائش گاہ بنا ہوا ہے۔ اور پانڈیچری کا بھی قبرستان قابل دید ہے ہم کو بھی چاہیے کہ ہم بھی اپنی آخیر خواب گاہ خوبصورت بنائیں وغیرہ وغیرہ۔

مضمون تو لکھا تھا مگر میں نے خود اس پر عمل نہیں کیا۔ البتہ جہاں ہمارا مزار بنایا جائے گا وہ زمین سوچ لی تھی مگر مقبرہ وغیرہ نہیں بنایا تھا۔ اب سید ہمایوں مرزا صاحب مرحوم کے انتقال کے بعد ان کے لئے نہایت خوبصورت مقبرہ بنایا ہے اور مقبرے کے اندر تاریخیں جو ان کے انتقال پر لوگوں نے لکھی ہیں وہ آئینے کے چوکھٹوں میں لگوا کر آویزاں کر دی ہیں، سرہانے مزار کے سنگِ مزار پر حضرت اقدس و اعلیٰ دام اقبالہ کی فرمودہ تاریخ "در جنت ہمایوں ہم رفت" کندہ کروا دی ہے اس کے نیچے خان بہادر احمد علی خان صاحب کی لکھی ہوئی سنہ ۱۳۴۷ف ہجری تاریخ کندہ کی ہے۔

مرحوم کے مزار کے بازو میں میں نے اپنا مزار بھی کھدوا کر تیار رکھا ہے میں نے اپنا سنگِ مزار بھی کندہ کرنے اسی شخص کو دیدیا جس نے تمام مقبرے میں سنگِ مرمر کا فرش کیا ہے۔ میرے سنگِ مزار کی عبارت یہ ہے۔

یا رحیم

نصر من اللہ و فتح قریب

"مزار صغرا ہمایوں مرزا بنتِ حاجی کپتان ڈاکٹر صفدر علی مرزا صاحب مرحوم سنہ پیدائش سنہ وفات"

ہر کس وسیلہ دارد و ما بے وسیلہ ایم
ما را وسیلہ نیست بجز ذات پاک تو

اس کے نیچے جگہ چھوڑ دی ہے مرے بعد جو کوئی تاریخ لکھے وہ اسی جگہ کندہ کی جائے گی۔

جب میں نے سنگِ مزار لکھنے دیا تو دوکان دار صاحب نے ہمدردی سے کہا ابھی جلدی کیا ہے خدا نکرے آپ کیوں اپنا سنگِ مزار کندہ کرواتی ہیں" میں نے کہا آپ کو اس سے کیا آپ کندہ کر دیجئے انھوں نے چار روز میں کندہ کر کے دینے کا وعدہ کیا اور آج پانچ ماہ ہوتے ہیں نہ دیا۔

دوکان دار صاحب جن کا نام صفدر علی صاحب ہے مجھے کہہ رہے ہیں آپ کا سنگِ مزار لوگ دیکھا کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ہم بھی اپنی زندگی میں سنگِ مزار بنالیں"۔ آپ کے سنگِ مزار کی وجہ میرے بہت سے پتھر فروخت ہو رہے ہیں اس لئے میں ابھی تو آپ کا سنگِ مزار نہیں دوں گا"۔ یہ سن کر مجھے ہنسی آئی کہ لو میرا سنگِ مزار اشتہار کا کام کر رہا ہے دوسروں کو فائدہ پہنچا رہا ہے۔ میرا خیال آج سے نہیں ایک زمانے سے بھی ہے۔ میں نے مکہ معظمہ سے

دو کفنی سنہ ۱۹۰۶ء میں منگائے تھے۔ مری پھوپی صاحبہ مرحومہ اور خالہ صاحبہ مرحومہ جب مکہ معظمہ جا رہی تھیں۔ ان کے ذریعہ منگائے تھے جو زمزم کے پانی سے دھوئے گئے تھے ایک تو مرحوم کے کام آیا ایک میرے انتظار میں رکھا ہے۔

مسز صغرا ہمایوں مرزا

حسرت

مہتاب کے جلووں سے منور ہیں فضائیں
بے خود کئے دیتی ہیں سکوں ریز ہوائیں

جھرمٹ میں ستاروں کے قمر جھوم رہا ہے
فطرت کی جبیں خواب سحر چوم رہا ہے

چھایا ہوا ہر ذرۂ عالم پہ سکوں ہے
بگڑا ہوا لیکن مرا اندازِ جنوں ہے

تڑپاتا ہے یہ درد میں ڈوبا ہوا منظر
بے حال ہوا جاتا ہے حالِ دلِ مضطر

سہما ہوا دل رونگھٹے تھرائے ہوئے ہیں
احساس پہ طوفانِ الم چھائے ہوئے ہیں

ہنستا ہوا نظروں میں مری آتا ہے کوئی
جذبات کے شانوں کو ہلا جاتا ہے کوئی

اشکوں میں تڑپتے ہوئے بیتاب شرارے
ہر سانس نکلتا ہوا آہوں کے سہارے

کروٹ ہی بدلتا رہا میں نیند نہ آئی
دشمن کو بھی اللہ نہ دے دردِ جدائی

اک جانِ حزیں اور یہ سختی ارے توبہ
لٹتی ہوئی ارمانوں کی بستی ارے توبہ

بجھتی ہوئی یہ شمعِ جوانی کوئی دیکھے
دل چیر کے حسرت کی کہانی کوئی دیکھے

سوگند تمھیں سوزِ محبت کے اثر کی
سوگند تمھیں بڑھتے ہوئے دردِ جگر کی

آہوں کی قسم اشک کے طوفاں کی قسم ہے
قسموں پہ مچلتے ہوئے پیماں کی قسم ہے

آؤ بھی کہ اب صبر کا یارا نہیں مجھ کو
تم بِن کوئی جینے کا سہارا نہیں مجھ کو

رشید احمد رشید (عثمانیہ)

خواتینِ دکن کی ادبی خدمات

ہر قوم کے تمدن میں "زبان" کا خاص درجہ ہوتا ہے، زبان کی ترقی اس وقت تک نہیں ہو سکتی، جب تک کہ اس میں ادبی ذخیرہ کثرت سے فراہم نہ ہو، ادبیات کی ترقی کے ساتھ ساتھ زبان کی وسعت اور زبان کی ترقی ہوتی ہے، وہ قوم اور وہ ملک سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور مہذب کہلاتا ہے جس میں ادبیات کا کافی ذخیرہ ہو، یہ تصور کرنا چاہیے کہ "ادب" ایک کسوٹی ہے جس پر ہر زبان کو پرکھا جاتا ہے۔

"لٹریچر" یا ادبیات میں کئی چیزیں شامل ہیں، مثلاً "شاعری" "مضمون نگاری، افسانے، ناول، ڈرامے اور خطوط وغیرہ، ان ہی عنوانوں کے تحت ہم یہاں کچھ صراحت کریں گے۔

شاعری

ادب کی ایک اہم شاخ شعر گوئی ہے، نظم انسان کو بالطبع مرغوب ہے، بہ نسبت نثر کے نظم زیادہ موثر ہوتی ہے۔

نظم کا احاطہ نہایت وسیع ہے، اگر نظم میں مذہب اور اخلاق کو بیان کیا جا سکتا ہے تو پھر اسی نظم کے قالب میں تاریخ اور سوانح بھی بیان کی جا سکتی ہے، نظم کے جامے میں فلسفہ اور تصوف کے نکات پیش کئے جا سکتے ہیں تو پند و نصیحت بھی بیان کی جا سکتی ہے، نظم میں رزم و بزم کی تصویر کھینچی جا سکتی ہے، مناظرِ قدرت کی نیرنگی اور خوش نمائی، فطرتی اشیاء کی ترجمانی نظم کی صورت میں بہتر سے بہتر طریقے سے ہوتی ہے، قوم اور ملک کو بیدار کرنے، جوش و ہمت دلانے، شاہراہِ ترقی پر قدم بڑھانے کے لئے نظم ہی موزوں خیال کی جاتی ہے، میدانِ جنگ میں بہادری و دلاوری کے جوہر دکھانے کی ترغیب نظم ہی سے وابستہ ہوتی ہے، اگر نظم کے ذریعہ ہنسایا جاتا ہے تو اسی میں مرثیہ اور نوحہ کہہ کر رلایا جاتا ہے، اگر کسی کی مدح اور ستایش کر کے آسمان پر چڑھایا جا سکتا ہے، تو کسی کی ہجو کہہ کر اس کو تحت ثریٰ پر پہونچایا جا سکتا ہے، غرض کہ شاعری یا نظم نگاری سے بیسیوں کام لئے جا سکتے ہیں۔

اردو شعر گوئی میں خواتینِ دکن نے جو حصہ لیا ہے اس کی تفصیلی وضاحت اس مختصر مضمون میں دشوار ہے، البتہ اجمالاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ عصرِ حاضر میں ایک سو سے زیادہ خواتین شعر گوئی کی حیثیت سے پیش ہو سکتی ہیں، جن میں سے کئی خواتین شعر گوئی کے لحاظ سے بلند مرتبہ رکھتی ہیں، ان کا کلام پسندیدہ اور شایستگی کا اعلیٰ نمونہ ہوتا ہے، ان کی شاعری اکثر ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔

ہماری شاعر خواتین کا کلام قدیم طرز کی شاعری تک محدود نہیں ہے، بلکہ جدید خیالات اور جدید طرز کی شاعری میں بھی وہ خاصہ حصہ لیا کرتی ہیں، اگر ان کے کلام میں قدیم طرز کی عشق و عاشقی، گل و بلبل، شاہد و ساقی، کی داستانیں اپنی رنگین و شیریں بیانی، جدت آفرینی اور زبان کی لطافت کے لحاظ سے قابلِ ستایش ہوتی ہے، تو جدید طرز کی شاعری جو ملک اور قوم کو بیدار کرتی، مناظرِ قدرت اور نیچر کی

ترجمانی کرتی ہے، خیالات کی بلند پروازی اور جدت، زبان کی صفائی اور سادگی، اسلوب بیان کی ندرت اور نزاکت کے لحاظ سے قابل داد ہوتی ہے۔

عہدِ حاضر میں جن خواتینِ دکن نے شاعری کی حیثیت سے نام و نمود پیدا کیا ہے اور جن کے کلام نے کافی شہرت حاصل کر لی ہے، ان میں سے بعض کا مختصر تعارف اس موقع پر بے محل نہیں ہو سکتا۔

اس خصوص میں سب سے پہلے ملکۂ دکن حضرت دلہن بادشاہ بیگم کا اسم گرامی پیش ہوگا جو اعجاز تخلص کے ساتھ شعر کہتی ہیں، آپ دکن کی پہلی ملکہ ہیں جو اردو میں طبع آزمائی فرماتی ہیں۔

اس کے بعد بشیر النساء بیگم بشیر، رابعہ بیگم رابعہ منظور فاطمہ بیگم سردار، رحمت بیگم اسیر، نوشابہ خاتون نوشابہ، لطیف النساء بیگم لطیف، وغیرہ کا نام لینا چاہیئے جو اپنے ہمعصروں میں ممتاز حیثیت رکھتی ہیں،

بشیر کو نظم نگاری اور غزل گوئی کا بہت اچھا ملکہ ہے، ان کے کلام کا مجموعہ عنقریب شایع ہونے والا ہے، رابعہ بیگم کو فطرتی اشیا کی ترجمانی کا خاصا سلیقہ ہے، ان کی نظمیں قابلِ قدر ہوتی ہیں، اسیر اور سردار کو غزل گوئی وغیرہ میں اچھی مہارت ہے، ان کے کلام میں زبان کی لطافت اور رنگینی کے جوہر پائے جاتے ہیں، نوشابہ خاتون جامعہ عثمانیہ کی پہلی بی اے خاتون ہیں۔ ان کے کلام کا مجموعہ "موجِ تخیل" کے نام سے شایع ہو چکا ہے، نوشابہ خاتون کا کلام سوز و گداز کے لحاظ سے قابلِ ستایش ہوتا ہے، لطیف النساء بیگم نے بچوں کے لئے نظم لکھنے کی اچھی مشق کر لی ہے۔

ان کے علاوہ بیسیوں خواتین ہیں جن کی شاعری قابلِ داد اور لایق ستایش ہوتی ہے، ان کے نام بھی طوالت کا موجب ہوں گے۔

مضمون نگاری

ادب کا ایک شعبہ مضمون نگاری ہے، جو ساری ادبی کوششوں کا نچوڑ ہوتا ہے، نثر کے ذریعہ سنجیدہ اور متین مسائل سمجھائے جا سکتے ہیں، تحقیقات اور انکشافات کو واضح طور پر ذہن نشین کرایا جا سکتا ہے۔

مضمون نگاری کے بیسیوں اقسام اور بیسیوں موضوع ہیں، ادب کی جو گراں بہا اور بیش قیمت خدمت مضمون نگاری کے ذریعہ ہو سکتی ہے وہ ایک حقیقتِ نفس الامر ہے۔

خواتین دکن نے نثر نگاری کے ذریعہ اردو ادب کی جو خدمت انجام دی اور دے رہی ہیں اس کی صراحت طویل صفحات کی خواہاں ہے، اس موقع پر ہم صرف نثر نگار خواتین کے نام بھی پیش نہیں کر سکتے چہ جائے کہ ان کے کارناموں کی تفصیل کی جائے، البتہ بعض ممتاز نثر نگار خواتین کا نام لیا جا سکتا ہے جن کی ادبی خدمتیں فروگذاشت نہیں کی جا سکتیں۔

اس خصوص میں سب پہلے طیبہ بیگم مرحومہ کا نام لینا چاہیئے اگرچہ وہ آج زندہ نہیں ہیں مگر انھوں نے جو داغ بیل ڈالی تھی، جو بنیاد قائم کی تھی، وہ آج مستحکم ہو چکی ہے، اور بارآور ہو کر پھول پھل رہی ہے، خوشی کی بات ہے کہ اب ادارۂ ادبیاتِ اردو کے شعبہ نسواں کی جانب سے ان کے اعلیٰ اور بلند پایہ

مضامین کتابی صورت میں شایع ہونے والے ہیں۔

اس تفصیل میں صغرا بیگم ہمایوں مرزا کا نام لینا ضروری ہے جن کی اب تک چودہ پندرہ کتابیں مختلف عنوان کے تحت شایع ہو چکی ہیں' اور مضامین جو مختلف رسالوں میں شایع ہوا کرتے ہیں ان کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے' ان کی ادبی دلچسپی اور انہماک ہر آئینہ مستحق تقلید ہے۔

اس کے بعد جہاں بانو بیگم نقوی لطیفۃ النسا بیگم اور سکینہ بیگم کے ناموں کی صراحت بھی ضروری ہے' جہاں بانو بیگم کے ادبی دلچسپ اور پر از معلومات مضامین دکن اور ہندوستان کے رسالوں میں تعریف کے ساتھ شایع ہوتے ہیں' رسالہ شہاب کے حصۂ نسوان کی اڈیٹر کی حیثیت سے آپ جو ادبی خدمت انجام دے رہی ہیں وہ مستحق ستایش ہے' اسی طرح سکینہ بیگم مدیرۂ "سب رس" اور ادارۂ ادبیات اردو کے شعبۂ نسوان کے داعی کی حیثیت سے جو ادبی کام کر رہی ہیں وہ ہر طرح تعریف و توصیف کے قابل ہے۔

حیدرآباد اور ہندوستان کے زنانہ اور مردانہ رسالوں اور اخبارات میں بیسیوں خواتین دکن کے مضامین جو مختلف موضوع پر ہوتے ہیں تعریف و ستایش کے ساتھ شایع ہوتے ہیں' ان مضامین کی زبان صاف' اسلوب بیان پسندیدہ اور طرز نگارش دلچسپ ہوتا ہے' دختران جامعہ عثمانیہ اور غیر عثمانی خواتین جو نام و نمود مضمون نگاری کی حیثیت سے پیدا کر رہی ہیں وہ ایک درخشاں مستقبل کا پیش خیمہ ہے۔

ناول اور افسانے

نظم سے جس طرح انسانی دل پر اثر ہوتا ہے اسی طرح دلچسپ قصے کے پیرایے میں کسی تاریخی' اخلاقی یا معاشرتی پہلو کو بیان کرنا خاص طور پر موثر ہوتا ہے' خشک فلسفیانہ مضامین سے بڑھ کر افسانے زود اثر ہوتے ہیں' انسانی فطرت اس امر کی مقتضی ہے کہ ان کے دماغ کے لئے عمدہ عمدہ غذا میسر ہو' اور ان کی دلبستگی کے لئے ایسی کہانیوں کی ضرورت ہے جن میں زیادہ تر ان کے ابنائے جنس کے واقعات اور حالات اس طرح بیان کئے گئے ہوں جو یا تو سچ معلوم ہوتے ہوں یا ایسے ہونے کی قابلیت رکھتے ہوں۔

ناول ایک فوٹو یا آئینہ ہے جس سے زمانۂ گزشتہ کے حالات اور موجودہ زمانے کے واقعات اصلی رنگ و روغن میں نظر آتے ہیں' واقعات کے انتخاب اور ان کی مناسب ترتیب سے پلاٹ بنتا ہے' اس میں حرکت' روانی اور جوش پایا جانا چاہیئے۔

پلاٹ کی طرح کردار نگاری ہے' جن اشخاص کا اس میں ذکر ہوتا ہے' ان کی پوری تفصیل اس طرح ہونی چاہیے کہ وہ انسان کی طرح چلتے پھرتے' کام کرتے' بولتے زندہ معلوم ہوں' قصے کے اشخاص کا تعلق جس زمانے اور جس مقام سے ہوتا ہے' اس زمانے اور مقام کی تمام خصوصیات سے ناول نگار کو واقف ہونا چاہیے تاکہ اس وقت کے رسم و رواج تمدن اور تہذیب کا پورا پورا حال اس ناول سے معلوم ہو سکے' غرض جو قصہ ناول یا افسانے میں بیان کیا جائے وہ ہر طرح اصلی معلوم ہو' اس کا کوئی پہلو عقل کے خلاف نہ ہو۔

ان تمام امور کو پیش نظر رکھ کر جب ہم دکن کی

خواتین کے کارناموں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ناکامی نہیں ہوتی، اور ہم بہ مسرت کہہ سکتے ہیں کہ خواتینِ دکن نے اس قسم کی ادبی خدمت بھی انجام دی ہے۔

"انوری بیگم" اور "حشمت آرا" کے نام سے دو ناول ایسے پیش کئے جا سکتے ہیں جو اصلاحِ معاشرت کے لئے لکھی گئی ہیں، ان میں حیدرآباد کے تمدن، تہذیب کی سچی اور اصلی تصویر کھینچی گئی ہے، حقوقِ نسواں، تعلیمِ نسواں، پرانے توہمات اور تعصبات، رسم و رواج، روزمرہ کے کام کاج، بیکار اور فرصت کے مشاغل وغیرہ امور بہت دلچسپ طریقے سے بیان کئے گئے ہیں۔

ان دونوں ناولوں کی مصنفہ مرحومہ طیبہ بیگم ہیں جن کا تذکرہ اس کے پہلے ہو چکا ہے، صغرا بیگم ہمایوں مرزا کے ناول سرگذشتِ ہاجرہ اور موہنی کا تذکرہ بھی یہاں ضروری ہے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے دلچسپ اور مفید ہیں۔

مختصر افسانے

موجودہ زمانہ میں مختصر افسانوں نے بڑی اہمیت حاصل کر لی ہے، اس قسم کا بڑا ذخیرہ ہر زبان کے ادبیات میں فراہم ہو گیا ہے۔ طول طویل ناول کے بجائے مختصر افسانے جو چند اوراق میں ختم ہو جاتے ہیں زیادہ پسند کئے جاتے ہیں۔

ناول اور افسانے کے لئے جو امور ضروری ہیں وہی مختصر افسانوں کے لئے درکار ہیں۔ مختصر افسانے سیکڑوں عنوان اور موضوع پر لکھے جاتے ہیں، اردو زبان میں اب اس قسم کا ادبی ذخیرہ کافی حد تک فراہم ہو گیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی اس امر کی صراحت ناگزیر ہے کہ بہترین افسانوں کی تعداد (جو ہر حیثیت سے قابلِ ستایش اور لایق داد ہوں) کم ہے، اور چند ہی افسانہ نگار کامیاب افسانہ نگار کی حیثیت سے پیش کئے جا سکتے ہیں۔

مختصر افسانہ نگار کی حیثیت سے ہندوستان کی کئی خواتین متعارف کی جا سکتی ہیں جن میں مسز حجاب امتیاز علی کا نام اس عنوان میں سرِ فہرست ہونا چاہئے، جو دنیائے اردو میں اپنے خزینۂ افسانہ نگاری کے باعث امتیاز رکھتی ہیں، مسز حجاب کی پیدایش اور ابتدائی پرورش حیدرآباد میں ہوئی اور پھر مدراس کی سرزمین میں انھوں نے افسانہ نگاری میں امتیاز حاصل کیا ہے۔

موجودہ زمانے میں کئی خواتین مختصر افسانے قلمبند کرتی ہیں، ان کے ترجمے اور طبع زاد دونوں افسانے ہوتے ہیں، یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ خواتینِ دکن کے افسانے بہر طور قابلِ ستایش ہیں اور ان میں کوئی خامی نہیں ہوتی، اس قسم کا دعویٰ کرنا ابھی قبل از وقت ہے، البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کامیاب افسانے لکھنے کی ضرور کوشش کی جا رہی ہے، اور توقع ہے کہ آئندہ بہترین نتائج رونما ہو سکیں۔

دختران جامعہ عثمانیہ اور غیر عثمانی خواتین کے کئی نام اس عنوان میں بیان کئے جا سکتے ہیں، خصوصاً جہاں بانو بیگم کا نام فراموش نہیں کیا جا سکتا، جن کے افسانوں کا مجموعہ "رفتار خیال" کے نام سے شایع ہو کر منظرِ عام پر آ چکا ہے۔

ڈرامے

ادبیات کی ایک اہم شاخ ڈرامہ نگاری ہے، اس خصوص میں اردو زبان میں ایسا ذخیرہ بہت کم ہے جس پر فخر کیا جا سکے، اچھے ڈراموں کی شدید ضرورت ہے، خوشی کی بات ہے کہ اب پنجاب، دہلی اور حیدرآباد میں اس کی جانب توجہ کی گئی ہے۔

پنجاب اور دہلی کے قطع نظر حیدرآباد میں اس کی طرف خاص توجہ ہوچکی ہے، اب تک کئی ڈرامے لکھے گئے ہیں اور اسٹیج پر کامیاب طور پر ان کو بتایا گیا ہے، ان ڈراموں میں مولوی فضل الرحمن صاحب بی اے ڈپٹی کنٹرولر لاسلکی کے دو ڈرامے خصوصیت سے قابل تذکرہ ہیں جو اپنی خوبیوں کے باعث عام مقبولیت حاصل کرچکے ہیں۔

بعض حیدرآبادی خواتین نے بھی اس کی جانب توجہ کی ہے، اور دو چار مختصر ڈرامے لکھے ہیں، مگر یہ ڈرامے ایسے نہیں کہ ان کا تذکرہ کیا جائے، البتہ مس عیسی نندی کا نام ضرور لیا جا سکتا ہے، انھوں نے اپنے والد ڈاکٹر جارج نندی کے ایک انگریزی ڈرامہ کو اردو کا لباس پہنایا ہے، اور بمبئی ٹاکیز نے کسی قدر ترمیم کے بعد "عزت" کے نام سے اس کو فلم میں پیش کیا ہے، مس عیسی نے اس کے علاوہ بھی چند ڈرامے طبع بند کئے ہیں مگر ہنوز ان کو شایع نہیں کیا ہے۔

خطوط

ادب کا ایک جزو خطوط بھی ہے، ہر زبان کے ادبیات میں اس کا بھی ذخیرہ ہوتا ہے اگرچہ آج تک عورتوں کے خطوط کا کوئی مجموعہ اردو زبان میں شایع نہیں ہوا ہے مگر بعض رسالوں میں ایسے خطوط شایع ہوئے ہیں جو ہمارے ادب کا بہترین نمونہ کہلا سکتے ہیں۔

جہاں بانو بیگم نقوی کا تعارف اس عنوان میں ضروری ہے، ان کے خطوط جو رسالہ شہاب میں اکثر شایع ہوئے ہیں ہمارے ادبیات میں گراں قدر اضافہ کا موجب ہوتے ہیں۔

آخر پر "ادارۂ ادبیات اردو" کے شعبۂ نسوان کا تذکرہ بھی نہایت ضروری ہے، جس کی صدر رابعہ بیگم، اور معتمد سکینہ بیگم، اور ارکان جہاں بانو بیگم، سارہ بیگم اور لطیف النساء بیگم ہیں، توقع ہے کہ آگے چل کر یہ ادبی ادارہ اپنے پرجوش اور مستعد کارکنوں کی دلچسپی کے باعث خواتینِ دکن میں نئے خیالات نئی امنگیں پیدا کرنے میں اپنی آپ نظیر ہوگا۔

ہمارے اس مضمون سے اس امر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خواتینِ دکن بھی اردو ادب کی خدمت گزاری میں کسی اور ملک سے پیچھے نہیں ہیں، ان کے خدمات قابلِ قدر اور لایقِ تحسین ہیں، اور امید ہے کہ آنے والی نسل کے لئے اپنا اچھا نمونہ اور شاندار نقش چھوڑ جائیں۔

نصیرالدین ہاشمی

نذرِ دکن (باتصویر) دکن کے متعلق خواتینِ دکن کے رشحاتِ قلم کو محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ نے خاص ذوق اور سلیقہ سے مرتب کیا ہے۔ یہ مجموعہ ایک ایسا بیش بہا تحفہ ہے جس کے مطالعہ سے عورتیں اور مرد دونوں مستفید ہو سکتے اور سرزمین دکن کے متعلق ضروری معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ اس میں صنفِ نازک کے مذاق کی نفیس تصویریں بھی ہیں صفحات ۹۰، قیمت مجلد عہ

من کی بتیا محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ ام اے نے اس کتاب میں متوسط طبقہ کی خواتین کی معاشرتی اور اخلاقی کمزوریوں کو بے نقاب کرکے زندگی کی تلخیوں سے کامیاب مقابلہ کرنے کے طریقے پیش کئے ہیں۔ یہ کتاب بہت ہی دلچسپ پیرایہ میں لکھی گئی ہے۔ خواتین اور خصوصاً موجودہ تعلیم یافتہ خواتین کے لئے اس کا مطالعہ بیحد ضروری ہے۔ اس کو ہر گھر میں ہر وقت موجود رہنا چاہیے۔
صفحات ۸۰، قیمت مجلد ۸/

دکن کے چند کایستھ شعراء

جب انقلاباتِ روزگار نے شمال میں اردو کے لئے کوئی آسرا نہ رکھا، تو پھر یہ بچاری اسی آغوش میں چلی گئی جہاں اس سے بہت زمانہ قبل اس کی خوب آؤ بھگت ہوئی تھی۔ سرزمین دکن ہمیشہ سے اردو کے لئے ساز گار رہی اور یہیں اس نے اپنے عہد کے خوبصورت ترین گل بوٹے نکالے چنانچہ یہ صحت بخش آب و ہوا اس کی خلط کے عین موافق تھی پھر اس کو سرسبز کرنے لگی۔

اس میں شک نہیں کہ اب یہاں سے قطب شاہوں کا وہ شفیق سایہ اٹھ چکا تھا، جس نے ایک عرصۂ دراز تک اس کو نظرِ بد سے بچائے رکھا۔ اس کی داشت و پرداخت جان سے زیادہ کی، اور صحیح معنوں میں پروان چڑھایا لیکن ان کی بجائے اسے یہاں ایک ایسے خانوادۂ علم دوست کی بارگاہ ملی جو اردو نوازی میں قطب شاہوں سے کم نہ تھا۔ انہوں نے اس نازوں کی پلی کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اپنی سرپرستی میں جگہ دی۔ اور اپنے مضبوط ہاتھوں میں اس کی حفاظت کا بیڑا اٹھایا۔ یہی تو ہوئی کہ تقریباً ایک صدی تک حیدرآباد کی محلیں عاشقانِ اردو کا جمگھٹ بنی رہیں۔ اور اس عرصے میں وہ محفلیں گرم ہوئیں جن کی یاد اودھ اور لال قلعہ کی صحبتوں سے پہلو زنی کرتی ہے۔

مولٰنا شبلی نعمانی۔ رتن ناتھ سرشار۔ نذیر احمد دہلوی۔ عبدالحلیم شرر۔ نواب محسن الملک۔ امیر مینائی۔ مرزا داغ اس شمع کی ضیا پاشیوں پر دور دور سے شیدا ہو کر آئے۔ دکن کی مہماں نواز زمین نے ان احباب کی یہاں بڑی قدر کی۔ دربار آصفی نے ان کی توقیر بڑھائی۔ اور زبردست اعزاز عطا کئے۔

اسی زمانہ میں خود اس مردم خیز ملک نے اپنے یہاں ایسے ایسے جید عالم اور بڑے بزرگ پیدا کئے جن کے فیض سے دکن فن و ادب کا مرجع بن گیا۔ شیر محمد خاں ایمان۔ مہاراجہ چندو لال شاداں۔ حافظ میر شمس الدین فیض۔ راجہ محبوب نواز ونت باقی۔ ڈاکٹر احمد حسین مائل۔ میر احمد علیخاں عصر۔ حفیظ الدین پاک۔ تراب علی زور۔ بہاری لال رمز۔ مہاراجہ کشن پرشاد شاد و بچو لال تمکین، اس دور کی چند ممتاز شخصیتیں ہیں۔

یہ زمانہ سچ پوچھئے تو دکن کے ادبی مذاق کا اصل محرک ہے۔ اس لئے کہ اس عہد میں یہ بزرگ ہستیاں مذہب اور قوم کی ظاہری کسوٹی پر نہیں جانچی گئیں۔ بلکہ ملک نے انہیں اپنے ذاتی جوہر کی بنا پر پرکھا۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے دوش بدوش ہندوؤں نے بھی اس زبان کے سنوارنے میں برابر کا حصہ لیا اور کبھی تنگ نظری یا مذہبی کدورت کو اپنے سینوں میں جگہ نہ دی۔

ان لوگوں میں طبقۂ کایستھ بہت نمایاں تھا۔ اور یہ اس کے لئے کوئی نئی بات بھی نہ تھی۔ اس لئے کہ اگر حقیقت کا اظہار بے جا تعلی نہیں ہے۔ تو نہایت وثوق کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ تمدن کے ہر دور میں اور ہر زمانہ میں جب امن آشتی نے ملکوں میں فن و ادب کو تازہ کیا یہ قوم اپنی فطری قابلیت سے پیش پیش رہی۔ اور اپنی طبیعت کے جواہر خفتہ کو چمکایا۔

راجگان و سلاطین سلف کی طرح شاہان آصفیہ نے بھی اس فرقہ کی قابلیتوں کو پہچانا۔ اور ان کی خاص سرپرستی فرمائی۔ انہیں کسب معیشت سے جو ایک فن کار کے لئے دنیا میں سب سے زیادہ مانع ترقی ہوتا ہے تقریباً آزاد کر دیا اور موقع بموقع ان کی قدر و منزلت میں کوتاہی نہ کی۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ اس قلیل عرصے میں اس گروہ میں بعض

ایسے ادیب بلیغ اور شاعر نکتہ رس پیدا ہوئے جو دکنی ادب میں ایک خاص پایہ رکھتے ہیں اور جنہیں اپنے زمانہ کے اساتذوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

چنانچہ اردو گو شعرائے قدیم راجہ محبوب نواز ونت باقی۔ رائے جوالا پرشاد فاضل۔ راجہ سری پرشاد احقر۔ رائے انبا پرشاد ہنر۔ رائے ٹھاکر پرشاد نظم۔ رائے شنکر پرشاد افضل اور شعرائے جدید میں رائے گرسرن لال آزاد۔ راجہ شنگھ راج بہادر عالی۔ رائے محبوب راج محبوب۔ رائے ستگرو پرشاد رہبر۔ رائے رگھوبیر پرشاد شوق۔ فارسی گو شعرا میں بچو لال تمکین۔ رائے جی باقی۔ راجہ لچھمن لال ساقی۔ رائے جوالا پرشاد فاضل۔ انبا پرشاد حکم وغیرہ وغیرہ قابل تذکرہ ہیں۔

ان اصحاب بزرگ کے علاوہ اور بھی ایسے بلند حیثیت شاعر گزرے ہیں جنہیں ایک تو میں اپنی کوتاہ واقفیت دوسرے عدیم الفرصتی کی وجہ سے یہاں چھوڑ رہا ہوں۔ اگر مصروفیتوں نے دم لینے دیا' تو خیال ہے کہ ایک علٰحدہ تذکرہ کی صورت میں اس یاد رفتہ گاں کو تازہ کیا جائے انشاءاللہ

(۱) **باقی**۔ راجہ محبوب نواز ونت گردھاری پرشاد باقی

راجہ باقی جو اپنے زمانے کے نہایت بلند پایہ شاعر اور انشا پرداز گزرے ہیں، حضرت شمس الدین فیض کے حلقہ تلامذہ میں سے تھے۔ باقی کا خاندان دکن کے ان قدیم خاندانوں میں سے ہے جو حضرت آصفجاہ نظام الملک کے ساتھ دہلی سے اورنگ آباد آیا۔ ایک عرصہ تک اورنگ آباد میں مقیم رہنے کے بعد جب رائے راجا رام ابن رائے دولت رائے کو دربار آصفی سے چھتیس ۳۶ کارخانوں کی تنقیح و نگرانی کا کام عطا ہوا' تو ۱۱۹۸ھ میں انہوں نے محلہ چندر کا پور عرف حسینی علم میں ایک مکان خریدا اور مستقل ڈیوڑھی کی بنیاد ڈالی۔ چنانچہ وہ خود اپنی کتاب "کلام متفرقات" میں اس کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں۔

"۔۔۔۔۔ از دہلی وارد دکن گردیدند چندے در شہر اورنگ آباد بود و باش ورزیدہ پس ازاں اقامت پذیر بلدہ حیدرآباد شدند رائے راجا رام بن رائے دولت رائے جد اعلیٰ راقم آثم بخدمت استفتائے تحاویل خانسامانی کہ کار تنقیح سی و شش کارخانجات سرکار آصفی میباشد در عہد نظام الملک بعز امتیاز میداشتند و در سنہ یک ہزار و یکصد و نود و ہشت ہجری در محلہ حسینی علم عرف چندر کا پور یک قطعہ حویلی بجہت برائے اقامت خود خرید نمودہ مقیم شدند"

اسی ڈیوڑھی میں وہ بتاریخ یکم رجب ۱۲۴۴ھ پیدا ہوئے اس خاندان کے اکثر اراکین صاحب مناصب و خطابات ہوئے ہیں۔ چنانچہ پیشگاہ نواب سکندر جاہ بہادر۔ نواب ناصر الدولہ بہادر۔ نواب افضل الدولہ بہادر سے اس خاندان کی مسلسل عزت افزائی ہوتی رہی خود راجہ باقی تادم مرگ خدمات جلیلہ اور مناصب اعلیٰ پر سرفراز رہے۔ باقی نے حضرت محمد علی صاحب عاشق سے فارسی پڑھی اردو فن شعر میں انہیں حضرت شمس الدین فیض سے تلمذ حاصل تھا۔ جن خدمات پر باقی فائز رہے اور اپنے فرائض جس خوش اسلوبی سے بجا لاتے رہے انہیں سامنے رکھ کر یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ کس قدر مصروف انسان تھے۔ چنانچہ ان کی کثیر التعداد تصانیف اور کلام کو دیکھ کر سخت حیرت ہوتی ہے اور تعجب ہوتا ہے کہ ایسے ہی حالات میں کیا ہم سے اس کا عشر عشیر بھی ہو سکتا ہے؟

ان کی تصانیف تیس ۳۰ سے زیادہ ہیں اور یہ فارسی اردو۔ ہندی۔ تین زبانوں میں پھیلی ہوئی ہیں جب ان کتابوں کے عنوان اور مضامین پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ باقی کو علاوہ فن شاعری کے کس قدر علوم و فنون میں دخل تھا۔

فن شاعری۔ عروض و قافیہ۔ انشار۔ حساب۔ حکمت۔ لغت۔ خواص الاشیاء۔ فلکیات۔ سفرنامے۔ مذہبیات۔ بھجن۔ پوتی پران۔ یہ چند عنوان ہیں جن پر باقی نے خامہ فرسائی کی ہے

اس کے علاوہ انہوں نے رباعیات خواجہ میر درد کو اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ اردو میں خواجہ صاحب کی رباعیوں کا ترجمہ کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس لئے کہ ان رباعیات کو جو تصوف اور فلسفہ کے گراں بہا جواہر سے مالامال ہیں۔ ایک ایسی زبان میں منتقل کرنا تھا جو فارسی کے مقابل میں ابھی بچہ ہی تھی۔ پھر بھی اس ترجمہ کو دیکھ کر یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ باقی اس باب میں کس قدر کامیاب رہے ہیں۔ مثلاً مشتے نمونہ از خروارے۔

درد

برجرم گر اعتراف خواہی کردن + دل را اے درد صاف خواہی کردن
یارب تو کریم و من گنہگار توام + دانم آخر معاف خواہی کردن

باقی

مجرم ہوں اعتراف کرتا ہوں صاف + کیا منہ ہے جو چاہوں میں اپنا انصاف
یارب تو کریم ہے گنہگار ہوں میں + تقصیر معاف ہوگی تقصیر معاف

درد

آسے جلوہ بدید یار خواہد گردید + رازش ہمہ آشکار خواہد گردید
ما آئینہ ایم خود پرست است نگار + ناچار دوچار خواہد گردید

باقی

اک دن دیدار یار ہو جائے گا + راز اس کا خود آشکار ہو جائیگا
میں آئینہ ہوں نگار حسن پرست + ناچار کبھی دوچار ہو جائیگا

درد

ہر لحظہ دریں خانہ کہ من می آیم + گم کردہ رہ شناختن می آیم
چوں شعلہ کجا رسیدنم منظور است + پیوستہ برون خویشتن می آیم

باقی

معلوم نہیں گھر سے کہاں جاتا ہوں + بھولا ہوا راستے سے گھبراتا ہوں
شعلہ کی طرح کہیں یہ پہنچا ہوگا + یوں آپ سے باہر جو نکل جاتا ہوں

باقی کا کلام نہایت سلیس و سادہ ہے گو بعض وقت مناسبات و رعایات لفظی پر جو اس عہد کے مذاق کا ایک نمایاں پہلو تھا۔ زیادہ زور دیتے ہیں۔ شعر میں ایک کے لئے چار چار مناسبتیں کھپانا، دور دور کی بندشیں، ایہام و صنعت لفظی کی بھرمار اس زمانہ کی خصوصیت تھی۔ باقی بھی اس رو سے بچ نہ سکے۔

چشم بلبل ہے بجا و مرے مرقد کا غلاف + جس میں سب جانیں کہ عاشق تھا کسی گل رو کا
لفظ بسمل ہے بجائے بسم اللہ تھا تیرا سبق + تو نے مکتب ہی میں پہلے خوں کیا استاد کا
اس کی مژگاں کا تصور نہ کر اے دل نہار + کیوں تو بوتا ہے یہ اپنے لئے ناداں کانٹے
کسی کے ہے لب شیریں کی ہمسری کی سزا + جو نیشکر کے جدا بند بند کرتے ہیں

بعض وقت اسی گورکھ دھندے میں بھی وہ ایسے در بہائے مضمون نکال لاتے ہیں کہ ان کی قادر الکلامی پر یقین ہو جاتا ہے

نیم جاں خنجر قاتل سے میں تڑپا جبھی + بولی شمشیر نہ گھبرا ترے سر پر میں ہوں

لیکن ان کے سرمایہ سخن پر اجمالاً نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ وہ اس دھارے میں ہمعصر شعرا کی طرح بہہ نہیں جاتے بلکہ سلاست و شستگی کا دامن برابر تھامے رہتے ہیں۔

ملاحظہ ہو کس قدر صاف زبان ہے۔

کہہ رہا ہے دل شیدائے شراب + ہائے خم ہائے سبو ہائے شراب
میرے زخموں سے جو بہا ہا اُترا + بن گیا شیشۂ مینائے شراب

دریا سے موج موج سے دریا نہیں الگ + ہم سے جدا نہیں ہے خدا اور خدا سے ہم
عارض یار نہیں عکس فگن پانی میں + گل شاداب کا ہے پھولا چمن پانی میں

یہ شعر ملاحظہ ہو۔

آپ نے لطف سے آنسو جو نہ پونچھے ہوتے + دیکھتے پھر یہ مرا دیدۂ تر کیا کرتا
پھر ہے میرے قتل کو ترچھی نظر + دیکھئے اے بندہ پرور دیکھئے

سلامت زبان دیکھئے۔

دل میں تو لگی ہے آگ اس کو + کیوں پانی سے گھر بہا رہے ہو

سنتا ہے تمہاری کون باقی + دیوانے ہو غل مچا رہے ہو

ماہ نو جھکتا ہے مجرے کے لئے + مہرباں نیچے سے اوپر دیکھئے

باقی نے ماہ صفر ۱۳۱۴ھ بعارضہ وجع مفاصل بلدہ میں انتقال کیا۔

(۲) رائے جوالا پرشاد فاضل

رائے جوالا پرشاد فاضل سررشتہ داران سکھان راجہ موہن لال جاگیردار و خزانچی کے صاحبزادے ہیں۔ محلہ حسینی علم دیوڑھی راجہ موہن لال میں ۱۲۶۲ھ کے قریب پیدا ہوئے فارسی اور عربی کی تعلیم مولوی محمد علی عاشق سے حاصل کی باوجود تحقیق کے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ شعر میں انہیں کس سے تلمذ تھا

رائے جوالا پرشاد فاضل کا خاندان دکن کے نہایت قدیم اور ممتاز گھرانوں میں سے شمار ہوتا ہے ان کے والد رائے موہن لال خزانچی بڑے باسطوت رئیس ہوئے ہیں۔ ان کے نانا راجہ سری پرشاد نواب ناصرالدولہ کے اتالیق اور معتمد تھے اس کے علاوہ سررشتہ سکھان بھی انہیں کے تفویض تھا۔

فاضل بچپن سے ہی نہایت طباع و ذہین تھے۔ فارسی بہت کہتے تھے۔ اور لب ولہجہ میں عجمیوں سے ٹکر لیتے تھے سنا ہے کہ عربی میں بھی شعر کہتے تھے اور انہوں نے عربی میں حضرت غفران مکان کی مدح میں ایک قصیدہ بھی لکھا تھا لیکن ان کا کوئی شعر اس زبان میں میری نظروں سے اس لئے نہیں گزرا کہ ان کا تمام سرمایہ سخن استداد زمانہ اور دیمک کے نذر ہو چکا ہے۔ اور جو کچھ دو تین فارسی غزلیات۔ چند قصائد اور دو ایک اردو شعر اس بربادی سے بچ بچا کر مجھ تک پہنچ سکے ہیں وہ میرے یہاں محفوظ ہیں۔

فاضل کی عربی و فارسی کی قابلیت کا اس سے پتہ چلیگا کہ حیدرآباد کی کایستھ برادری میں وہ ضرب المثل ہو چکی ہے اور اب بھی والدین اپنے لڑکوں کو ان کی مثال دیتے ہیں۔

یہ چند شعر ملاحظہ میں پیش کرتا ہوں لیکن ناظرین یہ جان لیں کہ یہ شعر منتخب نہیں ہیں بلکہ ان کے خرمن سخن کے وہ چند ریزے ہیں جو زمانہ کی تباہی سے بچ رہے۔ علاوہ ازیں جہاں تک میں نے سنا ہے فاضل فارسی زیادہ کہنے کے عادی رہیں۔

مدام جلتا ہوں کوئی خبر نہیں لیتا + کسی غریب کی شمع سر مزار ہوں میں
مٹا دیئے مرے جوہر مری کدورت نے + چھپا ہوں گرد میں اپنی وہ شہسوار ہوں میں

جگہ کوئی در جاناں سے بہتر میں نہ سمجھا تھا + وہاں اٹھنے نہ دیگا یہ مقدر میں نہ سمجھا تھا
دن جوانی کے گئے بجھ گیا اب دل فاضل + پھر کرشمہ کو ہم ہی تھے ہنسانے والے

فاضل نے ۱۳۳۴ف میں بعارضہ بخار بمقام جاگیر گھٹا ویلی انتقال کیا

(۳) راجہ ایسری پرشاد ۔ احقر

راجہ ایسری پرشاد احقر راجہ باقی کے برادرزادے اور راجہ نرسنگھ راج بہادر عالی کے عم زاد بھائی ہیں۔ احقر بہت کم سن ہی تھے کہ ان کے والد رائے خوب چند کا انتقال ہو گیا۔ اس لیے ان کی تعلیم و تربیت ان کے شفیق چچا راجہ باقی کی زیر سرپرستی ہوئی۔

شعر و سخن کا مذاق اس خاندان میں ایک عرصے سے موجود تھا۔ ان کے جد رائے مکھن لال ایک زبردست انشا پرداز تھے۔ جنہوں نے فن انشا پر مبسوط کتاب لکھی ہے راجہ مکھن لال ساقی ایک بڑے مورخ اور شاعر گزرے ہیں انہوں نے شائد سب سے پہلے رباعیات عمر خیام کا اردو میں ترجمہ کیا۔ مزید براں تاریخ مکھن لال کے بھی یہی مصنف ہیں۔

احقر شاعری میں لچھمی لال تائب لکھنوی سے تلمذ رکھتے تھے۔ لیکن راجہ باقی کی فیض صحبت کا ان کے کلام پر اثر پڑا۔

راجہ گردھاری پرشاد محبوب نواز ونت نے انہیں دفتر فوج باقاعدہ کی تنظیم پر مامور کیا تھا۔ نیز ان کے انتقال کے بعد ایک عرصہ تک احقر اسٹیٹ کا کاروبار دیکھتے رہے۔ بدقسمتی سے جوانی میں ہی احقر کو ایک پیچیدہ مرض لاحق ہو گیا۔ چنانچہ اسی مرض موت کی تشخیص کے لئے مدراس گئے تھے کہ سنہ ۱۳۱۸ھ میں انہوں نے وہیں داعی اجل کو لبیک کہا۔

نمونتاً چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جوشش دیدۂ گریاں کو نہیں جانتے کیا + نوح کے صدّ طوفان کو نہیں جانتے کیا
کوئی کہتا ہے فلک اسکو کوئی ابر سیاہ + دودِ آہ دل سوزاں کو نہیں جانتے کیا
ابرو و عارض دلدار کا مفتون نہیں کون + ماہ نو مہر درخشاں کو نہیں جانتے کیا
میں بھی اک بندۂ احقر ہوں نمک خوار انکا + میر محبوب علی خاں کو نہیں جانتے کیا

افسوس کہ باوجود تلاش کے ان کا کلام بھی دستیاب نہ ہو سکا۔

(۴) ہنرؔ رائے انبا پرشاد ہنرؔ

انبا پرشاد ہنرؔ بمقام بلدہ حیدرآباد سنہ ۱۲۷۵ف میں پیدا ہوئے۔ اس زمانہ کے حسب قاعدہ ان کی ابتدائی تعلیم خانگی مکتب میں ہوئی۔ لیکن نوعمر انبا پرشاد نے بہت جلد ہی اپنے ہم سبقوں میں امتیاز پیدا کر لیا۔ عربی و فارسی میں کافی دستگاہ حاصل کی۔ اور خطاطی میں جو قدما کے یہاں ایک مستقل فن شمار ہوتا تھا اچھی مہارت پیدا کر لی۔ چنانچہ ہنر کا دیوان جو خود انہوں نے اپنے قلم سے نہایت خوبصورت نستعلیق میں لکھا تھا حال حال تک محفوظ تھا۔ مگر افسوس کہ وہ کسی حادثہ کی وجہ سے برباد ہو گیا۔ اس لئے ان کے دو چار شعر حاصل کرنے کے لئے بھی بڑی دقت اٹھانی پڑی۔

کیوں نہ ہو اس بت پہ حال روئے انور آئینہ + صاف کہہ دیتا ہے جو کہنا ہو منہ پر آئینہ
تھی ہی رخ کی صفائی جب کہ آ آنکھ لگ رہو جاتا ہے پیدا کر کے جوہر آئینہ
دید رہی ہے تمہارے روئے روشن کی نصیب + بن گیا ہے اپنے طالع کا سکندر آئینہ

ہنر پائیگاہ آسماں جاہی میں سررشتہ دار افواج تھے نیز انہیں صرف خاص مبارک سے منصب بھی ملتا تھا۔ سنا ہے شاعری میں انہیں نواب خیرات علیخاں تجلیؔ سے تلمذ تھا۔

ہنر نے ۶۲ سال کی عمر پائی اور ۱۳۳۵ف میں بعارضہ وجع مفاصل انتقال کیا۔

نظمؔ۔ رائے ٹھاکر پرشاد نظمؔ سنہ ۱۲۷۴ف میں بمقام بلدہ حیدرآباد پیدا ہوئے۔ ان کے آبا و اجداد بسلسلۂ ملازمت شمالی ہند سے مدراس آئے اور یہیں خاندان والاجاہی کی سلسلہ ملازمت میں منسلک ہو گئے۔ چنانچہ ان کے جد رائے سندلال مہتمم شادی خانہ نواب والاجاہ اور رئیس شہر تھے۔

جب اس خاندان کا ستارا ڈوب گیا۔ تو ان کے صاحبزادے رائے بنسی دھر حیدرآباد آئے۔ جہاں انہیں بارگاہ آصفیہ سے منصب عطا ہوا۔ نظمؔ پیشکاری سرکار عالی میں خدمت مددگاری پر مامور تھے اور یہاں ارباب اقتدار کی نظروں میں انہوں نے بحیثیت ایک متدین و منتظم عہدہ دار کے بہت جلد اپنا مقام پیدا کر لیا۔ چنانچہ بزمانہ مدارالمہامی مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر یمین السلطنت جب صیغہ اصلاح مصارف قائم ہوا تو اس اہم صیغہ پر بطور خاص نظمؔ کا انتخاب عمل میں آیا۔

نظمؔ ایک نہایت ہی خوش اخلاق اور ہمدرد انسان تھے چنانچہ وہ ان معدودے چند افراد میں تھے جنہوں نے اپنی جوانی میں اصلاح قوم کا بیڑا اٹھایا اور مرتے دم تک اس پر اڑے رہے۔ ایک عرصہ تک وہ بزم تہذیب کے معتمد کی حیثیت سے علمی و ادبی خدمات انجام دیتے رہے۔ پھر آل انڈیا میرین لیگ

کے رکن کی حیثیت سے انہوں نے حیدرآباد کے کالیستوں کی بہت کچھ خدمت کی۔

نہ صرف نظم میں ان کا مذاق بلند تھا بلکہ نثر پر بھی انہیں خاص قدرت حاصل تھی۔ اس عہد کا مشہور ادبی پرچہ "دبدبۂ آصفی" جو حضرت صوفی شاد کی زیر نگرانی اور ایک عرصہ تک پنڈت رتن ناتھ سرشار کے زیر ادارات نکلا کرتا تھا، انہیں کے زیر اہتمام شائع ہوتا تھا۔ اور وہ خود اس رسالہ کے لئے برابر مضامین لکھا کرتے۔ نظم کا کلام شمالی ہند کے اکثر رسالوں مثلاً مذاقِ سخن۔ بہار اودھ وغیرہ میں شائع ہوتا رہا۔ شاعری میں انہیں حضرت لکھنو لال تائب سے تلمذ حاصل تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حافظ شمس الدین فیض سے بھی غائبانہ عقیدت تھی اس لئے کہ ان کے یادگاری مشاعروں میں بڑی پابندی سے شریک ہوتے اور ان کی مدح میں اکثر کچھ نہ کچھ لکھا کرتے تھے

لامکاں ہے اگر مکانِ فیض عرش اعظم ہے آستانِ فیض
وہی دیکھا جو کہہ گئے حضرت لب اعجاز تھی زبانِ فیض
اب بھی ہیں فیض یاب اہل دکن ایسی بافیض تھی زبانِ فیض
کیوں نہ ان کی غزل ہو سلک گہر کہ تھا گنج گہر دہانِ فیض
اٹھ گیا لطفِ شاعری اے نظم رہ گئی لب پہ داستانِ فیض

نمونۂ کلام یہ ہے

دل لگا کر سب سے کہتے پھرتے ہو ہم لٹ گئے + نظم یہ بھی ہیں بھلا کوئی طریقے پیار کے
درد و غم رنج والم نالہ و فریاد و فغاں + رات دن ان سے رہا کرتی ہے صحبت میری
خیر اتنا تو کیا جذبۂ الفت نے اثر + کہ مقر تو ہیں وہ سب سے مرے مر جانے کے

آزاد و رائے گردھن بلی آزاد۔

آزاد کے آبا و اجداد غدر کے بعد بلدہ حیدرآباد آئے اور دیگر خاندانوں کی طرح یہیں کے ہو رہے ان کے والد رائے راج بلی اوج بڑے اچھے شاعر اور صاحب اخلاق گزرے ہیں۔ انہوں نے آزاد کی تربیت کا خاص خیال رکھا اردو فارسی کی تعلیم قابل اساتذہ سے دلوائی۔ آزاد کے جد کا تخلص توکل تھا۔ اور ان کے چچا مہابلی انور ایک بڑے بلند مرتبہ شاعر گزرے ہیں۔ اس لئے شعر سخن کا مذاق انہیں ورثہ میں ملا۔ یہ سنہ ۱۳۰۱ھ میں بمقام بلدہ دیوڑھی راجہ راجان شیوراج دھرم ونت پیدا ہوئے اور اب بھی یہیں مقیم ہیں۔

آزاد بڑے خوش اخلاق۔ بذلہ سنج اور مرنجاں مرنج آدمی ہیں۔ رباعی خوب کہتے ہیں۔ چنانچہ عمر خیام کی رباعیوں کا ایک سلیس ترجمہ الخیام عنوان سے شائع کیا ہے۔ فارسی اور اردو دونوں میں شعر کہتے ہیں۔ اور مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد کے مشاعروں میں برابر پابندی سے شریک رہتے ہیں۔ ان کی ایک مثنوی الشمس بھی جو زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہے قابل دید ہے۔ عمر خیام کی ایک رباعی کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

آغاز رواں گشتن ایں زریں طاس انجام روانی مہ و خور کیا ہے
وانجام خرابی جنس نیک اساس بربادی کائنات کا گر کیا ہے
دانستہ نمی شود بمعیار عقول آتی نہیں کچھ عقل میں اپنے یہ بات
سنجیدہ نمی شود بمقیاس قیاس جمتا نہیں ساز جو یہ سر کیا ہے

نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

حشر میں حشر بپا ہوگا نیا اک آزاد + بے نقاب آج وہ محشر میں چلے آتے ہیں
واعظا الجھ نہ مجھ سے کدھر کو خیال ہے + زندوں کی بات تجھ کو سمجھنی محال ہے
فریب نظر یہ مکان و زماں ہے + طلسمات ہے کارخانہ ہمارا

مثنوی الشمس جو ابھی ابھی چھپی ہے اپنی سلاست بیان کی وجہ سے قابل دید ہے۔ اس میں آزاد نے ایک سائنٹفک یا نیم سائنٹفک مضمون کو نظم میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔

عالیؔ راجہ نرسنگھ راج بہادر عالیؔ

راجہ نرسنگھ راج بہادر عالیؔ راجہ گردھاری پرشاد محبوب نواز ونت باقیؔ کے فرزند اکبر ہیں۔ وہ بمقام بلدہ سنہ ۱۳۰۴ھ میں پیدا ہوئے اور اپنے برگزیدہ والد کی طرح سلسلۂ خدامانِ بارگاہِ آصفی میں منسلک ہیں۔ راجہ باقیؔ کو ہمیشہ اپنی اولاد کا غم رہا۔ چنانچہ وہ اپنی زندگی بھر صدموں سے متاثر رہے۔ حسن اتفاق کہ بنارس کے ایک خدا رسیدہ بزرگ سوامی بھاسکر آنند سرسوتی نے عالیؔ کے لئے دعا کی اور باقیؔ کو یہ ہدایت فرمائی کہ اس لڑکے کی رسم بسم اللہ اور شادی بنارس میں ہی ان کے پاس کی جائے۔ چنانچہ یہ دونوں رسمیں وہیں ادا ہوئیں۔

جب والد کا سایہ سر سے اٹھا تو عالی نہایت کم سن تھے اور ان نوعمر کاندھوں پر بڑی ذمہ داریاں تھیں چھوٹے بھائی محبوب راج کا ابھی بچپن تھا۔ اسٹیٹ نااہل کارکنوں کے ہاتھ میں چلا گیا تھا۔ اس لئے اس افراتفری میں عالیؔ نے جو کچھ بھی تعلیم حاصل کی اور اپنے برادر صغیر کی تربیت کا جس قدر بھی خیال رکھا وہ انھیں کی ہمت اور حوصلہ کا کام تھا۔
بحیثیتِ شاعر عالیؔ صاحبِ مذاق خوش فکر ہیں شاعری انہیں ورثہ میں ملی ہے۔ زبان سادہ اور سلیس ہے جو بات کہتے ہیں سیدھی اور صاف، کلام میں لگاوٹ بناوٹ کو دخل نہیں دیتے۔

رندِ بہوش ہیں مگر کیسی ❊ کر رہے ہیں شعور کی باتیں
بت خدا بن گئے معاذ اللہ ❊ نہیں اچھی غرور کی باتیں

میں نہا دھو کے ہوا پاک ہر اک عصیاں سے
اشکِ خجلت جو مرے دیدۂ تر سے نکلا

کون کہتا ہے کہ تو خوگرِ بیداد نہیں
مجھ میں پہلی سی مگر طاقتِ فریاد نہیں

رفتہ رفتہ باعثِ تسکیں ہوئیں بیتابیاں
دردِ دل اتنا بڑھا بڑھ کر مداوا ہوگیا

رباعی ملاحظہ ہو۔

پوشیدہ ہے گر جلوہ عیاں تیرا ہے
کثرت ہو کہ وحدت ہو نشاں تیرا ہے

کس کے دل میں نہیں ہے تیرا مسکن
کس کے لب پر نہیں بیاں تیرا ہے۔

کلام میں تصوف کا نقش زیادہ واضح ہے اور اس کو مہاراجہ سرکشن پرشاد شادؔ جیسے صوفی کی فیض صحبت اور استاد جلیلؔ کے ذاتی اثر نے اور بھی گہرا کر دیا ہے۔ اصناف سخن میں زیادہ تر غزل اور رباعی ہیں لیکن سب میں ان کا مخصوص رنگ برابر قائم ہے۔

محبوبؔ ۔ رائے محبوب راج محبوبؔ

رائے محبوب راج محبوبؔ راجہ محبوب نواز ونت باقیؔ کے چھوٹے فرزند اور راجہ نرسنگھ راج عالی کے برادر خورد ہیں۔ وہ ایک نہایت جامہ زیب اور وجیہہ انسان تھے طبیعت نہایت شگفتہ پائی تھی۔ چنانچہ حلقۂ احباب میں اپنی بذلہ سنجی اور خوش طبعی کی وجہ سے وہ بہت ہر دل عزیز تھے۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر شادؔ انہیں انتہا سے زیادہ دوست رکھتے اور ایک منٹ کے لئے جدا نہ ہونے دیتے تھے۔

محبوب سنہ ۱۳۱۲ھ میں بمقام بلدہ حیدرآباد پیدا ہوئے۔ پدر بزرگوار راجہ باقیؔ نے اپنے مالک مجازی کے حسب ارشاد

ومنشار ان کا نام محبوب راج رکھا۔ وہ بچپن سے نہایت طباع وذہین تھے۔ اس لئے انہوں نے بہت جلد مکتبی تعلیم سے فراغت پالی۔ اس کے بعد ان کو مدرسہ عالیہ میں داخل کیا گیا۔ جہاں انہیں گوناگوں حالات کی وجہ سے میٹرک کے بعد ہی تعلیم ختم کر دینی پڑی۔

محبوب کے کلام کی خصوصیت ان کی زبان ہے وہ نہایت سلیس وشستہ لکھتے ہیں۔ بحریں چھوٹی چھوٹی اور بندشیں چست ہوتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کوئی اچھا داستان گو عشق ومحبت کی کہانی نہایت موثر اور چبھتی ہوئی زبان میں سنا رہا ہے۔

آفت ہیں بلائیں فتنہ گر کی ؛ کچھ خیر نہیں دل و جگر کی
تھا عشق کا مرحلہ نہ آساں ؛ سر دے کے ہم نے یہ مہم سر کی
اللہ رے درازیٔ شبِ ہجر ؛ ملتی ہی نہیں خبر سحر کی

سنبھالو مے کشو اب شیشہ و جام ؛ گھٹا چھائی ہے ساون کی جھڑی ہے
گلے مل لو کہ سوزِ غم کے ہاتھوں ؛ چراغِ زندگی بس دو گھڑی ہے
قدم کیوں کر اٹھیں کوچے سے تیرے ؛ یہاں تو حسن کی مٹی گڑی ہے

مضامین اور ندرت بیان دیکھئے۔
جاں بلب شوقِ شہادت میں تھے ہم ؛ تیغ قاتل کی مسیحا ہو گئی
خواب میں آتے ہو پھر ہو لگاوِ شوق میں کیا پردہ ہے ؛ کہ چھپتے ہو نکل کر سامنے

ستم کا دیکھ کر انداز ہوتی ہے خوشی ہم کو
کہ ہم بھی چاہنے والوں میں شامل ہوتے جاتے ہیں

انہیں استاد فصاحت جنگ بہادر جلیل سے تلمذ حاصل تھا۔ افسوس کہ نوجوان شاعر کی عمر نے وفا نہ کی اور وہ سنہ ۱۳۵۰ھ میں بعارضہ نمونیہ عین ہنگام شباب میں اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے۔

رہبرؔ حکیم رائے ست گرو پرشاد رہبر

حکیم ست گرو پرشاد رہبرؔ رائے بنکٹ پرشاد صاحب مرحوم منصبدار و سررشتہ دار افواج نظم جمیعت سرکار عالی کے فرزند ہیں آپ بتاریخ ۶ر صفر سنہ ۱۳۱۷ف بروز جمعہ بلدہ حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ رہبرؔ بچپن ہی سے شاعری کی جانب مائل تھے طبیعت رسا اور فطرت رنگین پائی تھی اور چونکہ نہایت تیز ہوش طباع واقع ہوئے تھے۔ اس لئے ان کا جوہر بہت نوعمری ہی میں چمک گیا۔

حسن اتفاق کہ ان کی تعلیم علامہ عبدالرزاق نیشاپوری جیسے جید عالم کے یہاں ہوئی جو فارسی اور عربی میں اپنے عصر کی ممتاز شخصیتوں میں شمار ہوتے تھے۔ اردو ان کی مادری زبان تھی۔ اور شعر وسخن ان کے خاندان کا خاص مذاق تھا۔ اس لئے نوعمری سے ہی اس ماحول نے شاعرانہ مزاج کے لئے سونے پہ سہاگہ کا کام کیا۔

اسنہ اور ادب سے ایک گونہ فراغت ملی تو انہیں مفید الانام ہائی اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ جہاں انہوں نے انٹرنس تک اپنی تعلیم ختم کی اور چونکہ حکمت سے بھی طبعی لگاؤ تھا۔ اس لئے مدرسہ طبیہ سرکار عالی میں شریک ہو کر اس فن کی تکمیل کر لی۔ فن شاعری میں انہوں نے استاد عصر حضرت سید علی احمد زیرک سے تلمذ حاصل کیا۔

رہبرؔ کایستھوں کے ایک قدیم اور معزز گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے آباد اجداد والا جاہانِ مدراس کے عہد میں خدماتِ جلیلہ پر فائز اور صاحب خطابات ومناصب

ہوئے ہیں۔ حیدرآباد آنے کے بعد بھی یہاں ان لوگوں کو سرفرازیوں اور اعزاز خاص سے نوازا گیا۔ یہی گزشتہ خاندانی تمکنت کی بو باس جو رہبر کے دماغ میں اب تک بسی ہوئی ہے انھیں اہل دولت و امارت کی بے جا خوشامد اور چاپلوسی سے دور رکھتی ہے اور یہی احساس خودداری ہے جو انھیں کسی کے آگے بے محل جھکنے سے روکتا ہے۔

طبیعت نہایت غیور اور تنہائی پسند ہے۔ علاوہ منصبدار ہونے کے انھیں میز خانۂ مبارک میں منسلک خدمت ہونے کا بھی شرف حاصل ہے غزل زیادہ کہتے ہیں گو دیگر اصناف کی بھی ان کے سرمایۂ سخن میں کمی نہیں۔

اس امر کی ضرورت ہے کہ اس نوجوان شاعر نکتہ رس کے کلام کا تفصیلی تجزیہ کیا جائے۔ دیکھئے اگر موقع ملے تو اس فرض کو بجا لاؤں گا۔ رہبر کی زبان اس قدر صاف اور سلیس ہے کہ بے اختیار منہ سے واہ نکل جاتی ہے۔

کب خوف ہجر یار نہ تھا وصل یار میں ٭ کس دن خزاں کی یاد نہ آئی بہار میں

پرہیز میکشی ہے ہو فصل بہار میں ٭ یہ احتمال رحمت پروردگار میں

کانٹوں میں ہے خلش پھولوں میں ہے رنگ بو ٭ کیسی ہوا چلی چمن روزگار میں

دم گھٹ نہ جائے ضعف جنوں کچھ تو رحم کر ٭ ثابت ابھی ہے اپنا گریباں بہار میں

حرم تیرا گھر بتکدہ تیرا مسکن ٭ ہے تفریق شیخ و برہمن میں کیسی

زحمت اٹھاؤ کیوں نظر قہر ڈال کے ٭ رکھ دوں میں آپ اپنا کلیجہ نکال کے

اے شوق فروشی عشاق مژدہ باد ٭ بیٹھے ہیں وہ تنے ہوئے خنجر نکال کے

مضمون آفرینی ملاحظہ ہو

توڑ دیتے ہیں وقت آزادی میرا قفس ٭ روح کو اس قید سے آزاد کر لیتا ہوں میں

کھینچ کے آجاتے ہیں وہ جذب تصور کے نثار ٭ ایک نیا ئے خیال آباد کر لیتا ہوں میں

یاس اور امیدوں کا کھلونا ہے یہ دل ٭ شاد کر لیتا ہوں میں ناشاد کر لیتا ہوں میں

رباعی میں ان کا اپنا رنگ مخصوص ہے۔

دنیا میں بری رہ نہ برا در چلنا ٭ ہشیار خبردار سنبھل کر چلنا

رہنا ہے اگر بزم طرب میں رہبر ٭ شیشہ کی طرح سر کو جھکا کر چلنا

شوق۔ رائے گھمبیر پرشاد شوق

رگھوبیر پرشاد شوق۔ بی۔ اے عثمانیہ بتاریخ ۱۱ ربیع الاول ۱۳۲۱ھ میں بلدہ حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ اپنے برادر بزرگوار رائے ست گرو پرشاد رہبر کی طرح فارسی اور عربی کی تعلیم اپنے خاندانی استاد علامہ عبدالرزاق نیشاپوری سے حاصل کی۔

۱۳۴۸ف میں انہوں نے جامعہ عثمانیہ سے بی۔ اے کا امتحان فلسفہ لے کر کامیاب کیا۔ اور دفتر پولیس بلدہ میں ملازم ہوگئے۔ انھیں عروض اور فن شعر کی تعلیم اپنے بڑے بھائی حکیم ست گرو پرشاد رہبر سے ملی۔ اور شعر و سخن کا مذاق بھی انہی کی فیض صحبت سے چمکا۔

کرشمے بھی تیرے سوز الفت کیا نرالے ہیں

کسی جا شمع بننا اور کہیں پروانہ ہو جانا

ظاہر ہیں گو نہاں میں عیاں ہر نہاں میں آپ

مسکن گزیں بتائیے ہیں کس مکاں میں آپ

آنکھیں ہوں گر تو گھر میں ہے ملیلے حجاب قیس

کیا ڈھونڈتے ہیں نجد کی ریگ رواں میں آپ

یوں جو ہر ایک سے الجھتی ہے ٭ کس کے دامن کا خار ہے دنیا

بدقسمتی سے عرصہ ۷ سال ہوا کہ بعارضہ خلل دماغ علیل ہیں۔ ورنہ نہ جانے دکن کے اس نوجوان شاعر سے فن شعر کی کس قدر خدمت ہو سکتی۔ مہندر راج سکسینہ

اُردُو اَدَب اور قومی شاعری

غدر کے بعد اردو شاعروں میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہوا جس نے سوچا کہ اب "حسن و عشق" کی منزلیں حد سے گذر چکی ہیں۔ مغربی سیلاب اور زمانے کا انقلاب اب اس کا مقتضی نہیں کہ وہی پرانا راگ الاپا جائے لہذا شاعری کو قوم اور وطن کی بیداری کا ایک ذریعہ بنانا چاہیئے چنانچہ حذف اور اضافے کئے گئے اور اس شاعری کو جدید شاعری سے تعبیر کیا جانے لگا۔ اس جدید شاعری کا آغاز قومی شاعری سے ہوا۔ یقینی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی ابتدا کس زمانے سے ہوی مگر یہ کہنا بیجا نہیں کہ اس کا سنگ بنیاد حالی کے ہاتھوں رکھا گیا۔ حالی پہلے پہلے تو اُسی ڈگر چلے جس پر شیفتہ، مجروح وغیرہ چل چکے تھے لیکن انہیں تو ایک جدید اسکول کا بانی ہونا تھا اس وقت اردو شاعری نے ایک نئی کروٹ لی اور یہیں سے اس کا RENAISSANCE یعنی دَورِ نہضت شروع ہوا۔ اسلامی سلطنت کی دیا خاموش ہو چکی تھی۔ مسلمانوں کی زندگی اور سیاسیات میں ایک انقلاب کی ضرورت تھی۔ حالی نے مسدس لکھی اور اپنے قوم کی زندگی میں حیات کی گرمی اور حرکت پیدا کی۔ شمع سے شمع جلتی ہے۔ حالی کی 'برکھارُت' اور 'حُبِ وطن' نے اکبر، اور چکبست، اقبال اور جوش جیسے شاعر پیدا کئے۔

اکبر نے اپنے بے شمار مزاحیہ قطعوں اور نظموں سے مغربی تہذیب کی برائیوں اور خرابیوں سے آگاہ کیا۔
چکبست نے ہندوستان کی بہار رفتہ اور عظمتِ قدیم کا ذکر کرکے عوام کے دلوں میں حس اور قوت پیکار پیدا کی۔

یہ وہ وقت تھا جب کہ ہندوستان پستی و گمراہی کی ضلالت میں گھرا ہوا تھا اور ایک ایسے بڑے قومی شاعر کی ضرورت محسوس کر رہا تھا جو صحیح جادۂ اعتدال کی طرف رہنمائی کرے۔ چنانچہ قدرت نے اس کے لئے اقبال کا انتخاب کیا جس نے ہم کو نئی تہذیب کے اثراتِ بد سے آگاہ کرکے ایک شاندار مستقبل کے لئے آمادہ کیا۔ ہمارے دلوں میں ہماری ذمہ داریوں کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اسلاف کے کارنامے سنا کر ہمارے سرد اور منجمد خون میں روانی پیدا کی۔

اقبال کی قومی شاعری کو تین عنوانات کے تحت رکھا جا سکتا ہے۔

۱۔ وطنی ۲۔ اسلامی ۳۔ بین قومی

اقبال اور وطنیت:۔ اقبال نے جب آنکھ کھولی اس وقت ہندوستان مغربی طرزِ تمدن اور مغربی افکار و آرا سے آشنا ہوتا جا رہا تھا۔ بہتیرے نا عاقبت اندیش ہیں رو میں بہہ گئے اور مغرب کی اندھی تقلید میں اپنا مشرقی ناموس کھو دیا۔ یہ ماحول تھا جو اقبال کی شاعری پر اثر انداز ہوا اور اقبال کو وطنیت کی رَو میں بہا لے گیا۔ بانگِ درا کا صفحہ صفحہ اسی ماحول کا پرتو ہے "بانگِ درا" کھولتے ہی پہلی نظم جس پر نظر پڑتی ہے ہمالیہ ہے۔ ہندوستان کا بچہ بچہ اسے جانتا اور فخر کرتا ہے۔ یہ نظم قطع نظر بلندیٔ تخیل اور جدتِ تشبیہات کے ایک اچھوتا پیغام دلوں تک پہنچاتی ہے اور اس کے لفظ لفظ سے 'حُبِ وطن' کی بُو آتی ہے پھر جوں جوں ہم آگے بڑھتے ہیں اس کی مہک بڑھتی جاتی ہے۔ چند صفحوں کے بعد "صدائے درد" کے عنوان سے ایک چھوٹی نظم ہے۔ شاعر شدت دردِ دل سے چیخ اٹھتا ہے اور اپنے ملک کی بدنصیبی پر آنسو بہاتا ہے۔

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے

ہاں ڈبو دے اے محیطِ آبِ گنگا تو مجھے
سرزمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے

لذتِ قربِ حقیقی پر مٹا جاتا ہوں
اختلاطِ موجہ و ساحل سے گھبراتا ہوں

پھر ایک اور نظم تصویرِ درد ہے جس میں شاعر نے دل کھول کر اپنے وطن کا مرثیہ پڑھا ہے۔

رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا
لکھا کلکِ ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

چند ہی ورق الٹنے کے بعد ترانۂ ہندی آتا ہے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

اس نظم کو وہ مقبولیت حاصل ہے جو شاید ہی کسی دوسری نظم کو ہوئی ہو اور قومی گیت کی حیثیت سے چھوٹے بڑے خاص و عام سب کی زبان پر جاری ہے۔ اس کا ایک ایک شعر حُبِّ وطن میں رنگا ہوا ہے۔ اس کے ختم ہوتے ہی "نیا شوالہ" ہے

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

اس کے ہر شعر میں حبِ وطن کی آگ بھری ہوئی ہے۔ اس میں ایک ایسے نئے شوالے کی تعمیر کی طرف اشارہ ہے جہاں پرستارانِ وطن کا سر جھک جائے۔

سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں

اور پھر یہیں سے عالمگیر محبت اور اتحاد کی بنیاد قائم ہو۔ نئے شوالے کے ساتھ ہی اقبال کی وطنی شاعری ختم ہو گئی۔ بعد میں یہ ہندی نغمہ روز بروز دھیما پڑتا گیا اور آخر میں عجمی خم اور حجازی بادہ ہی رہ گئی۔

اقبال اور اسلامیات:- قوموں میں ایک نہ ایک ایسا وقت آتا ہے جب اس کے افراد اپنے آپ کو منصبِ انسانیت سے گرا کر ضلالت و گمراہی میں ڈال دیتے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں پر بھی ایک ایسا دور آیا کہ ان کی انسانیت اپنے مرکز اصلی سے ہٹ کر اوہام و خرافات کی اندھیری اور پیچ در پیچ وادیوں میں ادھر ادھر بھٹکنے لگی۔ اقبال نے اسے محسوس کیا اور اپنی شاعری کا رخ جس کا آغاز وطنیت سے ہوا تھا اسلام کی طرف پھیر دیا۔ مسلمانوں میں ایک نئی روح ڈال دی اور ایک ایسا صور پھونکا کہ اکثر اٹھ بیٹھے اور جو نہ اٹھے وہ کم از کم چونک تو ضرور پڑے جس کا احساس اسے خود بھی ہوا اور وہ پکار اٹھا۔

عجم از نغمہ ام آتش بجان است ٭ صدائے من درائے کاروان است

اقبال کے کلام کا بڑا ذخیرہ اسلامیات کے متعلق ہے۔ اقبال نے اسلامی شاعر کی حیثیت سے مذہب و ملت کی بڑی خدمات انجام دیں۔ اس صنف کی ابتدائی نظمیں بیحد پرجوش اور ولولہ انگیز ہیں۔ "شکوہ" اور "جواب شکوہ" اسی رنگ کی مخصوص نظمیں ہیں۔

یورپی اقوام نے قومیت کی ساری بنیاد وطن پر رکھی جس کا

نتیجہ یہ ہوا کہ خود غرضی اور جنگ و جدال نے انسانوں سے
سکھ اور شانتی کو چھین لیا۔ اقبال نے بتایا کہ افراد قوم اور انسانی
سیرت کی صحیح تحدید صرف اُسی وقت ہو سکتی ہے جب انسان
جغرافی حدود سے پرے نکل جائے یعنی انھوں نے بتا دیا کہ
ملتِ اسلامیہ کی بنیاد وطن پر رکھنا درست نہیں۔

آں چناں قطع اخوت کردہ اند ؛ بر وطن تعمیر ملت کردہ اند

مردمے اندر جہاں افسانہ شد ؛ آدمی از آدمی بیگانہ شد
روح از تن رفت و ہفت اندام ماند ؛ آدمیت گم شد و اقوام شد

کوئی قوم جب تنزل اور انحطاط کی طرف مائل ہوتی ہے
تو اُس کے عملی قویٰ شل ہو جاتے ہیں اور وہ ساتھ ہی ساتھ اپنی
تمام خصوصیتوں اور روایتوں کو ذلیل سمجھنے لگتی ہے۔ اقبال نے
اسلام کی بلندی و برتری کی ایسی تشریح کی کہ غیر تو غیر خود اپنے
بھی حیران رہ گئے کہ واقعی ہمارا اسلام اتنا ارفع و اعلیٰ ہے
اور ہمارا یہ رتبہ ہے۔

ترا جوہر ہے نوری پاک ہے تو ؛ فروغ دیدۂ افلاک ہے تو
ترے صید زبوں افرشتہ و حور ؛ کہ شاہین شہ لولاک ہے تو

بعض وقت اقبال کے اندر ایک ایسے سخت قسم کا
فرقہ وارانہ رجحان (Communalistic Tendency)
پیدا ہو جاتا ہے جو بڑھتے بڑھتے جہاد
فی سبیل اللہ تک پہنچ جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں بانگ درا
کی نظمیں "بلال" "ایک حاجی مدینے کے راستے میں" اور ضرب
کلیم کی "جہاد" "اسلام" "مسلمانوں کا زوال" اور "ہندی اسلام"
پیش کی جا سکتی ہیں۔

نظم "اذان" کے دو شعر ملاحظہ ہوں کتنے اثر آفریں
ہیں۔ یہ نظم اقبال نے قرطبہ (اسپین) میں لکھی تھی۔

سنی نہ مصر و فلسطین میں وہ اذاں میں نے
دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشۂ سیماب
ہوائے قرطبہ شاید یہ ہے اثر تیرا
مری نوا میں ہے سوز و سرورِ عہدِ شباب

اقبال اور بین قومی تاثرات:۔ اقبال نے ان
مسائل پر بھی روشنی ڈالی ہے جن کا تعلق نہ تو ان کے وطن سے
ہے اور نہ ان کے مذہب اسلام سے۔ اس سلسلہ میں
انھوں نے جو نظمیں کہی ہیں وہ زیادہ تر "ضرب کلیم" میں پائی
جاتی ہیں مثلاً "نپولین کے مزار پر" اور "مسولینی" وغیرہ ہیں۔
بین قومی سیاسیات پر اقبال نے جن افکار کا اظہار کیا ہے
ان میں شاعرانہ تخیل کے ساتھ انسانیت کا شرف بھی بدرجۂ اتم
موجود ہے "بالشویک روس" "ابی سینا" "مسولینی"
"سیاساتِ فرنگ" "جمعیت اقوام" اور "مشرق" قابل ذکر ہیں۔
مسولینی پر اقبال کی نظم بالِ جبریل میں بھی ہے اور
ضرب کلیم میں بھی۔ موخر الذکر نظم "مسولینی" میں انھوں نے
مسولینی کی تعریف تو نہیں کی لیکن معترضین یورپ پر ایک
زبردست اعتراض ضرور کیا ہے۔

کیا زمانے سے نرالا ہے مسولینی کا جرم
بے محل بگڑا ہے معصومانِ یورپ کا مزاج
میرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم
تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے زجاج
پردۂ تہذیب میں غارتگری، آدم کشی
کل روا رکھی تھی تم نے میں روا رکھتا ہوں آج

اقبال نے دول یورپ کی پکار اور چیخ کی حقیقت خوب
سمجھی تھی وہ نفسیات یورپ کے ماہر تھے۔ خونریزی اور بدامنی
کو روکنے کی خاطر جمعیت اقوام قائم کی گئی اور دنیا نے یہ یقین کے

طور پر سمجھ لیا کہ اب امن ہی امن رہے گا۔ لیکن اقبال سیاست
افرنگ کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھے انہوں نے
اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دوزے چند
بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

زمانہ جانتا ہے کہ اقبال کی پیشین گوئی حرف
بہ حرف کتنی درست ثابت ہوئی۔ واقعات نے بتا دیا کہ
ارباب سیاست کی عیاریوں کے سامنے اس کی کچھ نہیں
چل سکتی ۔ آج ہماری یہ "امن کی دیوی" کس کس مپرسی
کی حالت میں دم توڑ رہی ہے ۔

بے چاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے
ڈر ہے خبر بد نہ مرے منہ سے نکل جائے

اقبال کی شاعری کا چراغ گل ہوتے ہوتے یہ قومی
شاعری عوام میں بھی آ چکی تھی۔ لہذا اس میں نئی شاخوں اور
نئی راہوں کا اضافہ ہوا۔ مفلس اور بے روزگاروں کی
زندگی پر تنقید اور تبصرے ہونے لگے۔ نظموں کے ذریعہ
مزدور کسان اور سرمایہ داروں کی کشاکش کا معمہ سلجھانے
اور بیان کرنے کی کوشش کی جانے لگی ۔ طبقۂ کسان اپنی
جہالت، بے مائگی کے سبب سوسائٹی میں خواہ کتنا ہی ذلیل
کیوں نہ ہو پھر بھی اس حقیقت سے گریز نہیں کہ اسی کی ذات پر
ہماری ساری طمانیت اور شادمانی حیات کا دار و مدار ہے
اقبال نے اس مقدس طبقہ کی طرف ہندوستان کی توجہ
منعطف کرائی تھی۔

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

جوش، سیماب، احسان، دانش نے بھی اپنے قدم
بڑھائے ۔ محل سے نکل کر جھونپڑوں میں چراغ جلائے ۔
مفلسوں کی زندگی پر روشنی ڈالی ۔ کسان کی بدحالی پر دنیا کو
ہمدردی کے لئے مائل کرنا شروع کیا ۔ اس سلسلہ میں
جوش کا قدم سب سے آگے ہے ۔ جوش کی ایک نظم
کسان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

جھٹ پٹے کا زم رود دریا، شفق کا اضطراب
کھیتیاں، میدان، خاموشی، غروب آفتاب

یہ سماں اور اک قوی انسان یعنی کاشتکار
ارتقا کا پیشوا، تہذیب کا پروردگار
خون ہے جس کی جوانی کا بہار روزگار
جس کے اشکوں پر فراغت کے تبسم کا مدار

دوڑتی ہے رات کو جس کی نظر افلاک پر
دن کو جس کی انگلیاں رہتی ہیں نبض خاک پر

دھوپ کے جھلسے ہوئے رخ پر مشقت کے نشاں
کھیت سے پھیرے ہوئے منہ گھر کی جانب ہے رواں
ٹوکرا سر پر بغل میں پھاوڑا، تیوری پہ بل
سامنے بیلوں کی جوڑی دوش پر مضبوط ہل

قطع ہوتی ہی نہیں تاریکیِ حرماں سے راہ
فاقہ کش بچوں کے دھندلے آنسوؤں پہ ہے نگاہ
پھر رہا ہے خونچکاں آنکھوں کے نیچے بار بار

گھر کی ناامید دیوی کا شباب سوگوار
سیم وزر، نان ونمک، آب وغذا کچھ بھی نہیں
گھر میں ایک خاموش ماتم کے سوا کچھ بھی نہیں
ایک دل اور یہ ہجوم سوگواری ہائے ہائے
یہ ستم اے سنگدل سرمایہ داری ہائے ہائے

اسی عنوان پر سیماب اکبرآبادی کے بھی چند اشعار دیکھئے۔ مزدور کی حالت کا نقشہ کس فطری انداز میں کھینچا گیا ہے

گرد چہرے پر پسینہ میں جبیں ڈوبی ہوئی۔
آنسوؤں میں کہنیوں تک آستیں ڈوبی ہوئی
پیٹھ پر ناقابلِ برداشت اک بارگراں۔
ضعف سے لرزی ہوئی سارے بدن کی جھریاں
ہڈیوں میں تیز چلنے سے چٹخنے کی صدا
درد میں ڈوبی ہوئی مجروح ٹخنے کی صدا

جا رہا ہے جانور کی طرح گھبراتا ہوا۔
ہانپتا، گرتا، لرزتا ٹھوکریں کھاتا ہوا
مضمحل درماندگی سے اور فاقوں سے نڈھال
چار پیسے کی توقع سارے کنبے کا خیال
ایک لمحہ بھی نہیں فکر معیشت سے نجات
صبح ہو یا شام، ہے تاریک اس کی کائنات
دیکھ اے قارونِ اعظم دیکھ اے سرمایہ دار
نامرادی کا مرقع بے کسی کا شاہکار
گو ہے تیرے ہی طرح انسان پر مجبور ہے۔
دیکھ اے دولت کے اندھے سانپ یہ مزدور ہے

صرف کسان اور مزدور ہی نہیں بلکہ غریبوں کے وہ طبقے بھی جو باوجود بے انتہا کارآمد ہونے کے اب بے توجہی کے شکار تھے اور کسمپرسی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کو ہمارے وطن پرست شعراء نے نہایت دل کش پیرائے میں ملک کے سامنے پیش کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں بعض شعراء مثلاً احسان دانش کو اتنا انہماک ہو گیا ہے کہ انہوں نے ایسے ہی طبقے کو اپنا موضوع شاعری بنا لیا ہے۔ انکی ایک نظم "خانہ بدوش" کے کچھ اشعار دیکھئے۔

میداں کے صاف سینے پہ آبادیوں سے دور
ٹھہرا ہوا ہے خانہ بدوشوں کا کارواں
ان کا کسی کو شہر میں رہنا نہیں پسند، دشمن ہے گر زمیں تو مخالف ہے آسماں
تاریخ ہند کے یہ پریشان سے ورق، یہ بیماری ضعیف تمدن کی داستاں
برباد میں ذلیل ہیں سوا ہیں خراب ہیں، اللہ جنگلوں میں بھی ملتی نہیں اماں
جن کے مکاں پہ فتح کے پرچم تھے موج ریز
وہ پھر رہے ہیں سر پہ اٹھائے ہوئے مکاں

الطاف مشہدی کی ایک انقلابی نظم "قربانی" کے بھی چند اشعار ملاحظہ ہوں

جونہی مدد کو پکارے گا میرا پیارا وطن۔
سرور و کیف میں ڈوبی ہوئی ملاقاتیں
فسوں نواز جوانی کی رازداں راتیں
گلے کو چومنے والی حسیں تریں باہیں
دیارِ دوست کی مخمور و دلنشیں راہیں
کسی کی ہوشربا و جنوں فروش نگاہ
ہماری پاک محبت کا اولین گناہ
وطن کے نام پہ سب کچھ نثار کرتا ہوا
دیارِ ہند کو وقفِ بہار کرتا ہوا
خوشی سے جھومتا، گاتا، گرجتا، آؤں گا
مثالِ ابر زمانے پہ گھر کے چھاؤں گا
جونہی مدد کو پکارے گا میرا پیارا وطن۔

علی احمد (عثمانیہ)

مشاہدے

کئی سال بعد راقم کو شمالی ہندوستان میں سفر کرنے کا موقع ملا اُس چندروزہ سفر کی بعض باتیں یاد رہ گئیں اور اس امید میں میں ان کو قلم بند کر رہا ہوں کہ وہ شاید بعض لوگوں کی تفریحی مطالعہ کی مستحق ہوں، یا ان لوگوں کے لئے کام کی باتیں ثابت ہوں جنہیں ادبیات اور تمدن سے دلچسپی ہے۔

سب سے زیادہ جس چیز سے مجھے ناگوار حیرت ہوئی وہ شمالی ہند کی مغرب زدگی اور انگریزیت پسندی ہے چنانچہ خاص دوآبے میں جو نہ صرف ہندستانی تہذیب و تمدن کا گہوارہ بلکہ اردو کا وطن ہے اور کئی ہندستانی زبانوں اور تمدنی تحریکوں کا سرچشمہ ہے معمولی معمولی لوگ بلاوجہ انگریزی لفظوں کا استعمال کر کے اپنی مغرب زدگی کا ثبوت دیتے ہیں۔ خیال تھا کہ ادھر دس بارہ برس سے ہندستانی زبانوں کا عروج ہو رہا ہے کئی صوبوں میں کانگریسی حکومت قائم ہوگئی ہے ممکن ہے کہ حالات کچھ بہتر ہو گئے ہوں، لوگوں کی معاشی اور مالی حالت کے ساتھ (خیال ہوا کہ) شائد زبان بھی سنبھل گئی ہو۔ مگر یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوا کہ تمدنی اور زبانی نقطۂ نظر سے ہم میں احساسِ کمتری کے متعدد آثار پائے جاتے ہیں، اور ہم اس ضبط کی وجہ سے اپنی ذاتی تذلیل کر رہے ہیں۔ آپ مانیں یا نہ مانیں میں تو اپنی آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی باتیں لکھ رہا ہوں اور میرا مقصد اظہار حقیقت اور دعوتِ اصلاح ہے نہ کہ دل آزاری یا وعظ پسندی

تاج محل کے ایک موروثی خادم کو میں نے کسی دوسرے شخص کو کہتے ہوئے سنا کہ:۔

"وہ اس ٹری کے پرے ہے!"

ٹری؟؟؟ عجب!! یہ کیا؟؟........ درختا!

جس ملک کے چھوٹے بڑے سب اسی خبط میں مبتلا ہوں کہ بے وجہ انگریزی لفظوں کا استعمال کر کے اپنی ادھوری تعلیم کا رعب گانٹھیں تو پھر اُن کم سمجھ اَن پڑھوں کا کیا قصور اگر انہوں نے بھی اپنی قابلیت جتانے کے لئے دو چار انگریزی لفظ سیکھ رکھے ہوں۔؟

ایک "خان بہادر" کے ہاں مہمان تھا۔ ان کے ایک ملاقاتی سوٹ پوش، گلوری چباتے ہوئے۔ موٹر سے اترے، رسمی طور پر میرا بھی تعارف کرایا گیا۔ ان میں باتیں ہونے لگیں۔ میں ایک خاموش سننے والے کی حیثیت سے مجبوراً بیٹھا رہا۔ گھر کی بیماری اور عدم فرصت کا ذکر ہوا ایک نے کہا:۔

"میری وائف کو اِن دنوں بہت کام تھا اور وہ آپ کے ہاں ملنے نہ آسکیں۔"

جواب ملا:۔

میری وائف کو بھی ملنے کا بہت اشتیاق ہے۔

نہ جانے.... میں سمجھتا تھا کہ یہ صرف دکن کے مغرب زدہ خبطیوں کا شیوہ ہے کہ بیوی کو بیوی کہتے انہیں شرم آتی ہے..... وائف کہتے شرم نہیں آتی مگر اب معلوم ہوا کہ دوآبے کے پرے بھی مغربیت کا اندھا جنون روزمرہ کی گفتگو کو غارت کر رہا ہے۔

لاہور میں غضب کی سردی تھی مگر پنجابیوں کے

حسنِ سلوک اور ان کی مہمان نوازیوں نے دل میں اتنی گرمی اور جان میں اتنی تازگی پیدا کی کہ بیرونی سردی زیادہ اثر نہ کرسکی۔ مختلف طبقوں کے لوگوں سے ملنے کا موقع ملا وہاں والوں کے حسن سیرت کو دیکھ کر اپنوں کے متعلق جو مغالطہ تھا وہ دور ہوگیا۔ پنجاب کے وزیر اعظم سر سکندر حیات خاں اور وزیر داخلہ خضر حیات دولتانہ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ کھدر پوش راجہ صاحب محمود آباد کے درشن نصیب ہوئے۔ پنجابیوں کی پگڑیاں بڑی بانکی ہوتی ہیں۔ ان لوگوں کی جسمانی صحت اور سڈول بدن پر یہ طرے اور بھی زیادہ بانکے معلوم ہوتے ہیں۔ حسن صحت، حسن صورت اور حسن سیرت کے اعتبار سے پنجابیوں میں متعدد خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ اردو نوازی، اچھی طباعت، خوشنویسی، اعلیٰ کتابت اور عمدہ جلد سازی میں لاہور سے بڑھنا تو بڑی بات ہے کوئی اس سے ہم سری بھی نہیں کرسکتا۔ غالب کے دیوان کے جیسے عمدہ مصوّر اور خوش نما اڈیشن پنجاب نے شائع کئے ہیں، وہ نہ صرف اردو بلکہ سارے ہندستان کے لئے قابل فخر ہے۔

حیدرآبادی "تانگا" اور جھٹکا متوسط طبقے کی عام سواریاں ہیں جو آگرہ اور اودھ کے تانگوں اور اکوں سے زیادہ تکلیف دہ اور بدنما ہیں۔ قاضی پیٹھ سے ورنگل تک خاصہ ۳ میل کا فاصلہ ہے۔ مجبوراً اسی جھٹکے میں بیٹھا جا رہا تھا۔ مجھے جلدی تھی، جھٹکا خراب تھا، راستہ بدتر تھا۔ ٹٹو کمزور تھا مگر انعام کی توقع اور پیسہ کی لالچ کسی طرح چابک کو تھمنے نہیں دے رہی تھی اور جھٹکا مقابلۃً تیز رفتار سے جا رہا تھا۔ چابک کی آواز، پتھریلی سڑک پر پہیوں کی گڑگڑاہٹ اور جھٹکے بان کی صدائیں خاصہ لطف دے رہی تھیں شہر کے قریب ایک دیسی صاحب بہادر سوٹ بوٹ پہنے چلے جا رہے تھے۔ جھٹکے والے نے ملائم لہجے میں کہا

"چلئے صاحب! ہٹئے جناب!"

تھوڑی دیر بعد ایک سفید پوش صاحب کاندھے پر رومال ڈالے راستہ سے گزر رہے تھے۔ جھٹکے والے نے صاف آواز میں کہا۔

"چلو صاحب! ہٹو میاں!"

چوراہے کے قریب ایک شخص ننگے پیر، معمولی لباس پہنے، دکھائی دیا۔ جھٹکا گزرنے سے پہلے ہی وہ جاسکتا تھا مگر جھٹکے والے نے زور سے کہا۔

"سرکو جی! دیکھتے نہیں ہو؟"

ذرا آگے بڑھتے ہی ایک غریب کمبل پوش نظر آیا وہ بھی راستے سے گزرنا چاہتا تھا۔ اسے دیکھ کر جھٹکے والا آپے سے باہر ہوگیا اور اس نے للکار کر کہا۔

"ہٹ بے! اندھے!!"

وہ بیچارہ سہم کر خاموش ہوگیا اور اس طرح آنکھ بچا کر نکل گیا گویا اس نے کوئی جرم کیا تھا اور سزا سے بچ گیا! ان کی مرعوبیت ان کی سب سے بڑی کمزوری ہے اسی ایک مثال سے ہم اندازہ کرسکتے ہیں کہ ہماری معاشرت کس طرح مختلف طبقوں میں منقسم ہے اور ان مختلف طبقوں کے افراد کے ساتھ جھٹکے والے بھی کس طرح سلوک کیا کرتے ہیں۔

ہسیم پریجاں

ہندوستان کی زبان

نوا را تلخ تری زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی !

ہندوستان جو گئے ایام میں جنت نشان کہلاتا تھا اب اس کو اگر غلامستان کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا۔ غلامستان محض اس لئے نہیں کہ اس ملک پر ایک مدت سے بدیسی لوگ حکمران ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ ہندوستانی کہلانے والوں کی ذہنیت کچھ اس قدر پست ہوگئی ہے کہ یہاں سوائے ذلت اور ادبار کے اب اور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ ایک جھگڑا ختم نہیں ہونے پاتا کہ محبانِ وطن اور قوم پرست بزرگ دوسرا کھڑا کر دیتے ہیں۔

اس ملک کی سب سے بڑی بدقسمتی تو یہ ہے کہ یہاں چپہ چپہ پر مختلف مذہب و ملت کے لوگ آباد ہیں۔ کوئی آج سے نہیں بلکہ روزِ ازل سے غلامی، فرقہ بندی، اور قومی بغض و عناد نے اس ملک والوں کو یار و اغیار کی نگاہوں میں رسوا کر دیا ہے۔ اور رہی سہی کسر اس زبان کے سوال نے پوری کر دی ہے۔ خدا بخشے! شاعرِ مشرق نے کیا خوب کہا ہے کہ ؎

اُجاڑا ہے تمیزِ ملت و آئیں نے قوموں کو

مرے اہلِ وطن کے دل میں کچھ فکرِ وطن بھی ہے

بہت ممکن تھا کہ ہندوستان کے رہنے والوں میں نہ کہیں اخوت نظر آتی نہ ہمدردی پائی جاتی نہ لوگوں میں میل ملاپ ہوتا ایک کی ٹاکر دوسرے سے علیحدہ ہی رہتی۔ لیکن قدرت کو چونکہ کچھ بھلے دن بھی دکھانے تھے اس لئے اس نے ہندوستان والوں کو آپس میں شیر و شکر کرنے کے لئے ایک ایسی زبان پیدا کر دی جس کی طفیل یہاں کچھ یک رنگی سی نظر آنے لگی۔ اس کے ساتھ کچھ روزمرہ کی ضروریات بھی اس امر کی متقاضی تھیں کہ کوئی ایسا طریق اختیار کیا جائے جو سب کے لئے آسان اور قابلِ قبول ہو۔ تو جناب! یہ مشکل اردو زبان نے حل کر دی۔ اردو زبان کی نشو و نما ہندو اور مسلمان دونوں کے ہاتھ سے ہوئی، اور دونوں نے مل کر اسے عروج پر پہنچایا اور آج بلادِ مشرق میں اردو کو وہی حیثیت حاصل ہے جو مغربی ممالک میں فرانسیسی زبان کو۔ اردو زبان کی افادیت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ہر دور میں ہندو اور مسلمان ادبا اور شعرا اس کی ترقی کے لئے کوشاں رہے ہیں اور آج بھی جب کہ زبان کا جھگڑا ہندو قوم کے رہنماؤں کی تنگ نظری کی بدولت ایک ناگوار کشیدگی کی صورت اختیار کر رہا ہے اردو زبان کے ہندو ادبا اور شعرا اس کی خدمت سے غافل نہیں۔

خیال تو کیجئے کہ ایک ایسے ملک میں جہاں مختلف الخیال لوگ آباد ہوں، جہاں فرقے فرقے کا مذہب علیحدہ ہو، رسم و رواج بھی الگ الگ ہوں، جن کی تہذیب اور تمدن میں زمین اور آسمان کا فرق ہو، جو اپنے قومی اور سیاسی مفاد کے لئے علیحدہ علیحدہ اکھاڑے بنا رہے ہوں، لیکن جہاں تک زبان کا تعلق ہے ملک کی اکثریت ایک زبان بولنے یا سمجھنے والی ہو تو اس سے زیادہ اس زبان کی ہمہ گیری کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ اس گئے گزرے زمانے میں لے دے کر ایک زبان ہی تو ایسی چیز ہمارے پاس ہے جس سے ہمارا آپس میں کچھ میل جول نظر آ رہا ہے۔ ورنہ خود غرضی اور قوم پرستی کا جو خوفناک حربہ یارانِ وطن استعمال

کر رہے ہیں اس نے تو کبھی کے اس نازک رشتے کو بھی مٹا دیا ہوتا۔ اور لطف یہ ہے کہ اردو زبان کو مٹانے والے وہی محترم ہستیاں ہیں جو ہندوستان کی آزادی کی علم بردار بنی پھرتی ہیں۔ اور ہندو مسلم اتحاد کی خواہاں ہیں۔ علامہ اقبال علیہ الرحمہ کیا خوب فرما گئے ہیں ؎

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤگے اے ہندوستاں والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

مجھے اس وقت یہ بتلانا مقصود نہیں کہ اردو زبان بنی کیسے۔ مجھے تو کچھ اس کے متعلق عرض کرنا ہے کہ اُردو زبان پر اعتراض کرنے والے کون بزرگ ہیں اور اس کی تہہ میں کونسا جذبہ کار فرما ہے۔

اُردو زبان پر اعتراض کرنے والے صرف ہمارے ہندو دوست ہیں۔ ان میں سے کچھ تو مذہب کی آڑ لے کر اردو پر برس رہے ہیں اور کچھ وہ لوگ ہیں جو ہندوستان میں رام راجیہ قائم کرنے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ ان دونوں قسم کے لوگوں کی تنگ نظری اور فرقہ پرستی اب اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ انہی کے اکثر بھائی بند ان کی اس قسم کی تفرقہ انگیز چالوں سے ان سے متنفر نظر آنے لگے ہیں۔ ہندوؤں کے سوا ہندوستان کی کسی دوسری قوم نے اُردو کے خلاف آواز نہیں اٹھائی۔ بنگالی زبان کا اُردو کے بعد ہندوستان میں دوسرا درجہ ہے۔ بنگالی میں علم و ادب کا بھی ایک گراں قدر ذخیرہ موجود ہے بنگال والوں نے بڑے نامور ادیب، شاعر اور باکمال آدمی پیدا کئے ہیں لیکن اردو کے خلاف آج تک اس قوم نے کبھی کسی قسم کی ناپاک کوشش نہیں کی بلکہ اکثر بزرگ اس کوشش میں ہیں کہ بنگال میں بھی اردو زبان کا رواج عام ہو جائے۔ جس طرح اردو کئی ایک زبانوں کے ملاپ سے بنی ہے اسی طرح بنگالی زبان میں فارسی اور عربی کے بہت الفاظ ملتے ہیں جنھیں بنگالیوں نے اپنا لیا ہے۔ جیسے روز کی بجائے "روج"۔ کباب کی بجائے "کاباب"۔ جانور کی بجائے "جنور"۔ یا کاریگر کا "کاری گور" یا مزدور کا "موجور" یا ہفتہ کی بجائے "ہوپتا"۔ اسی طرح عربی کے الفاظ دیکھ لیجئے کس طرح بنگالی بن گئے ہیں۔ ناقص کا "ناکس"۔ غسل کا "گسل" توقع کا "توکو" ضبط کا "جبت" "مضبوط" "مجبوت" حضور کا "ہجور" وغیرہ وغیرہ۔

اسی طرح مرہٹی، گجراتی یا تلنگی بولنے والوں کی طرف سے بھی کبھی اس قسم کا مطالبہ یا خواہش نہیں کی گئی۔ یہ سودا صرف ہمارے ہندو دوستوں کے سر میں سمایا ہے گو اس فرقے کے اکثر سمجھ دار بزرگ اس تحریک کے خلاف ہیں اور آواز محض گاندھی صاحب کے تقدس کی خاطر اس کے خلاف بلند نہیں کرتے۔

اردو کے خلاف کٹر خیال کے ہندو تو ایک مدت سے اونگی بونگی بول رہے تھے لیکن جب سے کانگرس برسر اقتدار آئی ہے اس روز سے ہندی کو ملک کی قومی زبان بنانے کا مرض بہت ترقی کر گیا ہے۔ یہ سب کانگرس کے اقتدار کی برکات ہیں جو آج اس ملک میں وارِدھا اور ودیا مندر ایسی ناپاک اسکیمیں تیار ہو رہی ہیں۔ ان اسکیموں کا صرف ایک مطلب ہے یعنی مسلمانوں کی تہذیب اور تمدن کو ملیا میٹ کیا جائے۔ ہم تو یہ دعائیں مانگ رہے تھے کہ

ناخن خدا نہ دے تجھے اے پنجۂ جنوں !

لیکن قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اس نے پنجۂ جنوں کو آخر ناخن عطا کر ہی دیئے۔ اور اسی وحشت نے کہیں سرسوتی کی پوجا کہیں بندے ماترم کا گیت کہیں کچھ اور کہیں کچھ فتنے برپا کر دیئے۔ کانگرس نے حکومت سنبھالتے ہی جو پر پرزے نکالے تھے انہیں دیکھ دیکھ کر زبان پر بار بار یہ آتا تھا کہ　ع

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

توجناب! یہ ان لوگوں کے لیئے ایک سبق ہے جنھیں ملک کی بہتری کانگرس کے اقتدار میں نظر آرہی ہے۔ اور پھر لطف تو یہ ہے کہ اردو ہندی کا سوال پیدا کرنے والے وہی محترم لوگ ہیں جو کانگرس کے کرتا دھرتا کہلاتے ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو ہندوستان کی آزادی کے خواب دیکھ رہے ہیں وہی اردو ایسی عالمگیر زبان کے خلاف محض اس لیئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں کہ ایک تو بقول جناب گاندھی یہ مسلمانوں کی زبان ہے اور قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے۔ دوسرے پنڈت مالویہ صاحب کو یہ خوف دامنگیر ہو رہا ہے کہ اردو زبان پڑھنے لکھنے سے ہندو دھرم کا ناش ہو جائیگا۔ چنانچہ انھوں نے مذہب کی آڑ لے کر اپنی قوم میں اردو کی مخالفت کا بیج بو دیا۔ افسوس ؎

اور ہے تیرا شعار آئینِ ملت اور ہے
زشت روئی سے تری آئینہ ہے رسوا ترا

"ہندی" کو راشٹر بھاشا کا درجہ دینے والے ذرا گریبان میں منہ ڈال کر تو دیکھیں کہ "ہندی" کی ملک میں حیثیت کیا ہے۔ اردو کے مشہور رسالہ ساقی (دہلی) میں "سوجھ بوجھ کے ڈھائی انچھر" کے عنوان سے جناب سید ابوالقاسم صاحب سرور کے نام سے گذشتہ دو تین مہینوں سے ایک بہت دلچسپ اور پُر از معلومات مضمون شایع ہو رہا ہے۔ ساقی بابت نومبر میں سرور صاحب نے ہندوستان کی تمام زبانوں کے جو اعداد شمار (جو غالباً کسی مغربی محقق کے ممنونِ منت ہیں) دیئے ہیں اس سے "ہندی" کی زبوں حالی صاف ظاہر ہو رہی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

نام زبان	بولنے والوں کی تعداد
۱۔ اردو	آٹھ کروڑ پچاس لاکھ (یہ اندازہ بالکل غلط ہے)
۲۔ بنگالی	تین کروڑ نوے لاکھ
۳۔ مرہٹی	ایک کروڑ ستر لاکھ
۴۔ تلنگی	ایک کروڑ ستر لاکھ
۵۔ پنجابی	ایک کروڑ ساٹھ لاکھ } یہ غلط ہے پنجاب میں کم و بیش پونے دو کروڑ آدمی اردو بولتے اور سمجھتے ہیں۔
۶۔ ٹامل	ایک کروڑ تیس لاکھ
۷۔ گجراتی	پچانوے لاکھ
۸۔ اوڑیا	ستر لاکھ
۹۔ کنڑی	پچاس لاکھ
۱۰۔ ملیالم	پچاس لاکھ
۱۱۔ سندھی	چالیس لاکھ
۱۲۔ ہندی	تیس لاکھ

لیکن بُرا ہو اس مذہبی تعصب کا جس کے ہوتے ہوئے کوئی دلیل کارگر نہیں ہوتی ؎

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

کانگرس کی اپنی چھان بین سے بھی اردو کی مقبولیت آشکارا ہوتی ہے۔ کانگرسی نقطۂ نظر سے ہندوستان میں اردو بولنے والے اٹھارہ کروڑ کے لگ بھگ ہیں۔ حالانکہ یہ اسی طرح غلط ہے جس طرح کانگرسی اور مہا سبھائی پروپگنڈا کی وجہ سے ہندوستان میں اسلامی آبادی صرف آٹھ کروڑ بتلائی جارہی ہے۔ کوئی آج سے نہیں بلکہ نصف صدی سے یہ دروغ بیانی جاری ہے۔ حالانکہ اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی گیارہ کروڑ کے لگ بھگ ہے۔

ہندوستان کی کل آبادی کم و بیش اٹھتیس[۳۸] کروڑ ہے اور آج اس ملک میں ۳۴ اور ۳۵ کروڑ آدمی اردو بولنے اور سمجھنے والے موجود ہیں۔

اور سنئے! اس ملک میں ۱،۲۹ اخبارات اور رسائل شایع ہوتے ہیں۔ ان میں سے ۴۱۰ ہندی کے ہیں اور ۱۳۱۸ اردو زبان میں نکلتے ہیں۔ یہ تو رہی ہندوستان کی حالت اب ذرا بیرونِ ہند بھی اردو کی مقبولیت کا اندازہ کیجئے۔

افغانستان، ایران } ۱۰ لاکھ آدمی اردو بولتے اور سمجھتے ہیں۔

گلگت، بلخ اور ختن } پچاس لاکھ اردو بولنے اور سمجھنے والے موجود ہیں۔

عرب اور عدن	پچانوے لاکھ
یورپ اور امریکہ	بیس لاکھ
جاپان اور سنگاپور	پانچ لاکھ
دیگر اسلامی علاقے	پندرہ لاکھ

اب ان اعداد و شمار کو سامنے رکھ کر ذرا "ہندی" کے علم برداروں سے کوئی اتنا تو پوچھے کہ کیوں بھیا! ہندی کا ڈھونگ رچانے کے کیا معنی! خیر! یہ تو رہیں دور کی باتیں۔ ابھی تھوڑے روز ہوئے آل انڈیا بمبئی ریڈیو اسٹیشن کی طرف سے ریڈیو سننے والوں سے یہ پوچھا گیا تھا کہ وہ کس زبان میں پروگرام پسند کریں گے۔ اس کا نتیجہ جو سرکاری طور پر شایع کیا گیا ہے ملاحظہ فرمائیے۔

بمبئی :- اردو یعنی ہندوستانی ۲،۵۶ - انگریزی ۲۵۳۲ - گجراتی ۱،۴۲ - مرہٹی ۱۵۳۹ - ہندی ×

اس کے بعد دوسرا سوال یہ تھا کہ اگر صرف ایک ہی زبان میں ریڈیو پروگرام تیار کیا جائے تو آپ کس زبان میں ریڈیو سننا پسند کریں گے۔ اس کا جواب سنئے!

اردو (ہندوستانی) ۳۶۵۰ - انگریزی ۱،۴۴ - گجراتی ۹۲۰ - مرہٹی ۸۳۵ - ہندی ×

پھر کلکتہ، دہلی اور مدراس کے ریڈیو سننے والوں سے بھی یہی پوچھا گیا ان صوبوں سے زبان کے متعلق جو جواب ملا

اس سے اردو کی مقبولیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

کلکتہ:۔ اردو ۳۵۵۹۔ انگریزی ۱۷۵۴۔ بنگال ۲۹۹۔ ہندی ×
دہلی:۔ اردو ۳۸۴۸۔ انگریزی ۱۷۳۶۔ ہندی ×
مدراس:۔ اردو ۳۵۲۵۔ انگریزی ۱۸۷۱۔ تامل ۳۹۴۔ تلنگی ۲۱۹۔ ہندی ×

ان اعداد و شمار سے یہ روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ اردو زبان کو ملیا میٹ کرنے کا جنون صرف ہندوؤں میں پایا جاتا ہے۔ دوسری اقوام ہندوؤں کی ہم نوا نہیں اردو زبان کے خلاف صوبۂ متحدہ میں جس کاوش سے کوشش ہو رہی ہے اس کی مثال دوسری جگہ شاید نہ ملے۔ کانگریس والوں سے کچھ شکوہ ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ یہ خالص ہندو قوم کی نمائندہ ہے۔ لیکن افسوس تو مسلمانوں پر ہے جو یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی ٹس سے مس نہیں ہوتے ؎

عاقبت منزل ما وادیٔ خاموشان است
حالیا غلغلہ در گنبد افلاک انداز

ابھی پچھلے دنوں ریڈیو اسٹیشن دہلی والوں نے جو اردو کی گت بنائی ہے اور جس جس طرح اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کی وہ کسی سے کچھ چھپی ہوئی نہیں سنتے تو یہ تھے براڈ کاسٹنگ کا محکمہ بھی سرکاری محکمہ ہے۔ لیکن دہلی ریڈیو اسٹیشن کے ڈائرکٹر نے تو قولاً اور فعلاً یہ ثابت کر دکھایا کہ یہ خالص کانگریسی محکمہ ہے۔ آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن سے جو خبریں نشر ہوتی ہیں۔ اس میں ہندی کے اور ایسے ایسے من گھڑت الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں جنھیں سُن کر یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ ہندوستان کے قدیم باشندے بات چیت کر رہے ہیں۔ خیال تو فرمائیے کہ

"ایکا" (اتفاق) "ہتھیار بند جہاز"۔ "ڈہراودہر"۔ "پناؤ"۔ "پچھمی فرنٹ"۔ "سندیسہ"۔ "راج دہانی"۔ پورب، پچھم۔ اتر۔ دکن۔ "اڑان" (پرواز) "مناہی والا مال"۔ "مترع چھانٹنا"۔ "ڈبکنی کشتی"۔ "صلح کے بیان کی سواگت"۔ "ڈپلومیٹک حلقوں کی بات چیت"۔ "مانگیں" (مطالبہ) "لیکھت"۔ "لکھت پڑہت"۔ "میرٹھ میں شانتی ہوگئی"۔ "پرکھت کا وقت"۔ "لڑائی بند کرنے کی مانگ"۔ "بہتری ثابت کرنے والے"۔ وغیرہ وغیرہ الفاظ اگر رام راجیہ کے دور میں ہندو جاتی کی حکومت استعمال کرتی تو کچھ مضائقہ نہ تھا۔ لیکن ابھی تو دہلی دور والا معاملہ ہے۔ ہندو دوستوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ مسلمان اور اردو کے بہی خواہ اس قسم کی "غیر مہذب زبان" کبھی قبول نہیں کر سکتے۔ اگر اسی کا نام "ہندوستانی" ہے تو پھر یہ ہندوؤں کو ہی مبارک ہو۔ لطف تو یہ ہے کہ گاندھی صاحب کو "اردو" نام بھی ناپسند ہے اور ہونا بھی چاہیے کیونکہ اگر صلح اور اہنسا کے دیوتا کو ہمسایہ قوم سے بغض نہ ہو تو اور کس کو ہو۔ آپ نے زبان کا نام "ہندوستانی" تجویز فرمایا ہے۔ لیکن جناب گاندھی کو کوئی اتنا تو بتلادے کہ "ہندوستانی" تو انگریزوں کا دیا ہوا نام ہے۔ آپ تو انگریز کی ہر چیز سے متنفر ہیں یہ نام کیوں پسند آگیا آپ کو۔

اردو زبان کے خلاف جو یہ نفرت انگیز اور اختلاف پرور تحریک جاری ہے اس کی تہہ میں صرف سیاسی جذبہ کارفرما ہے۔ انگریزوں نے کسی مصلحت کو مدنظر رکھتے ہوئے کانگرس کو ذرا ڈھیل دے دی تھی جس سے اس کی رسی اور بھی دراز ہوگئی۔ اور گھر بیٹھے یہ لوگ رام راجیہ کے خواب دیکھنے لگے۔ اور جناب آج ہندوستان میں رام راج قائم ہونے دیجئے پھر دیکھئے کہ اسلامی تہذیب اور تمدن پر کس کس طرح کلہاڑا چلایا جاتا ہے۔

اردو ایسی عالمگیر اور شگفتہ زبان جس میں ہر پڑھے لکھے آدمی کو اپنا مطلب ادا کرنے کے لئے لفظی نزاکت، لطافت، رنگینی اور دلکشی حاصل ہو سکے، اس کے خلاف پروپگنڈا کرنا اپنی ذہنیت کی پستی کا پروپگنڈا کرنا ہے۔ یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ فارسی ایک بے حد دلاویز اور دلکش زبان ہے لیکن اردو کی شگفتگی اور دلکشی اسے بھی مات کر گئی ہے۔ ہندوؤں کا یہ کہنا کہ اردو محض مسلمانوں کی زبان ہے ایسا ہی لغو اور بے معنی ہے جیسے بنارس کے ایک پنڈت نے ایک بار یہ کہہ دیا تھا۔

"مہاراجہ بکرماجیت اور بابر بادشاہ میں کئی معرکے ہوئے لیکن جیت ہمیشہ مہاراجہ بکرماجیت کی ہی رہی"

پنڈت مدن موہن مالویہ کی کوششوں سے تو صرف ہندو ریاستوں سے اردو زبان اور اردو رسم الخط کو دیس نکالا ملا تھا۔ لیکن ہندو مسلم اتحاد کے حامی جناب گاندھی کے تقدس نے یہ آگ اب ہر جگہ لگا دی ہے اور آپ اپنے دامن کی ہوا سے اسے تیز سے تیز تر کیئے جا رہے ہیں۔ رہی سہی کسر تھی وہ گاندھی صاحب نے ناگپور میں یہ کہہ کر پوری کر دی کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے اور قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے۔

میرے خیال میں وہ سب لوگ جو اردو ہندی کی آویزش کے ذمہ دار ہیں مصلح قوم اور محب وطن کہلانے کے مستحق نہیں۔ زبان سے ملک و ملت کی شان نظر آتی ہے۔ آپس میں اخوت اور اتحاد کا رشتہ استوار ہوتا ہے۔ اس لئے جو قوم یا جو فرقہ یا جو شخص اس مقدس رشتہ کی جڑ کاٹنے والا ہو ہرگز قابل اعتبار نہیں۔ کسی ملک کی آزادی کے لئے اس کی زبان کا ایک ہونا بھی ضروری ہے۔ اور زبان کا اختلاف غلامی کی دلیل۔

اردو زبان پر یارانِ وطن کو سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ اس میں عربی فارسی الفاظ بکثرت پائے جاتے ہیں۔ لیکن ان "عقل کے پتلوں" نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ عام بول چال کی زبان اور ہوتی ہے اور ادبی زبان اور عام بول چال میں کوئی احمق ہی ہوگا جو خواہ مخواہ عربی اور فارسی کے غیر ضروری الفاظ استعمال کرے۔ لیکن جہاں ادبی شگفتگی مدنظر ہو وہاں ان الفاظ کا استعمال کرنا بھی ضروری ہوگا۔ پھر ہر لکھنے والے کی اپنی اپنی طرز ہوتی ہے۔ کوئی سادہ الفاظ استعمال کر کے زبان میں چاشنی اور لطافت پیدا کرتا ہے کوئی عربی فارسی اور ہندی کے الفاظ سے اپنی تحریر کو مزین کرتا ہے۔

لیکن ہندی کو تو یہ بات بھی حاصل نہیں۔ اور حاصل ہو بھی کیسے سکتی ہے کیونکہ بقول جناب گاندھی ہندی وہ زبان ہے جو کتابوں میں ملتی ہے۔ پھر اس پر یہ دعویٰ کہ ہندی ہی ہندوستان کی راشٹر بھاشا کہلا سکتی ہے جس قدر مضحکہ خیز ہے سب پر عیاں ہے۔

ہندوستان کی زبان کو ہم "ہندوستانی" تب کہہ سکتے تھے جب کہ تمام ملک میں ایک ہی قوم و ملت کے لوگ آباد ہوتے۔ پھر آج تک یہ بھی تو معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ "ہندوستانی" کیا ہوگی کیسی ہوگی۔ ڈاکٹر تارا چند۔ بابو راجندر پرشاد اور علامہ کیفی نے ہندوستانی کے موضوع پر آل انڈیا ریڈیو دہلی سے جو تقریریں نشر کی تھیں۔ اس میں بھی اسی بات پر زور دیا گیا تھا کہ جدید "ہندوستانی" "اردو اور ہندی کے بیچ کا راستہ" لے گی۔ لیکن ان تینوں بزرگوں نے اس بیچ کا راستہ لینے والی زبان کی مثال تو ایک بھی نہ دی۔ جس سے اس جدید ہندوستانی کا کچھ اندازہ ہو سکتا۔ ہاں! ہندو قوم جو زبان چاہتی ہے اس کی مثال میں مسٹر سمپورنانند کی وہ تقریر پیش کی جا سکتی ہے جو انھوں نے صوبۂ متحدہ کی کونسل میں کی تھی اور جسے مسلمان تو رہے درکنار اسی فیصدی ہندو بھی نہ سمجھ سکے تھے۔

یارانِ وطن کی اردو زبان کے خلاف سرگرمیاں تو اب شاید حشر تک بھی ختم نہ ہوں لیکن سوال یہ ہے کہ اردو زبان کے بہی خواہ کب تک خاموش رہیں گے۔ اردو کی حمایت اور ترویج کے لئے انجمنوں کا قیام ہے تو ایک نیک فال، لیکن کچھ کام بھی تو ہونا چاہیے۔ اردو زبان کے حامیوں کا یہ اخلاقی فرض ہے کہ اردو کے خلاف ہر تحریک کو کچلنے کے لئے سینہ سپر رہیں۔ خواہ یہ تحریک جناب گاندھی کی طرف سے ہو یا کسی کانگرسی جماعت کی طرف سے۔ افراد کا جمود قوم کی تباہی کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ اور آج اردو زبان کے ہواخواہوں کا یہی جمود اردو زبان کے حق میں زہر قاتل ثابت ہو رہا ہے۔ یہ مصلحتوں کا وقت نہیں بلکہ اب اردو زبان کی لاج اور آبرو کا سوال ہے۔ اور اس لاج اور آبرو کو برقرار رکھنے کے لئے کچھ عمل کی ضرورت ہے۔ باتوں کا وقت ہو چکا۔ آپ نے اردو کی ترویج کے لئے انجمنیں تو قائم کریں۔ لیکن یہ تو فرمائیے کہ آپ کی انجمنوں نے عملی کام بھی کچھ کیا۔ ع

حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی!

ایم اسلم

مدراس میں اردو (مجلد) اس کتاب میں مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی منشی فاضل نے مدراس میں اردو کے نشو و نما اور اس کے ارتقا کی تاریخ پیش کی ہے۔ کتاب کو نو ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے ہر دور کے شاعروں اور نثر نگاروں کے سوانح حیات اور نمونۂ کلام کو پیش کیا ہے۔ تاریخ ادب اردو سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کے لئے اس کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔

صفحات (۲۰۰) قیمت مجلد (عہ مر)

کیفِ جاوید

حجاب آلودہ جلوے تھے شباب انگیز رومان تھا
مری نظروں کی دولت تھی کہ حسن کار نیرداں تھا

چمن کا ذرہ ذرہ لے رہا تھا ایک انگڑائی
ترے جلوے کی رعنائی میں گم سارا گلستاں تھا

نگاہِ درد پرور کی خلش کیا خاک کم ہوتی
تری رنگینیاں تھیں اور مرا معصوم ایماں تھا

میں ہر قیمت پہ لے سکتا ہوں وہ جاں آفریں لمحے
کہ جب پہلے پہل مل کر کوئی مجھ سے پشیماں تھا

چمن کا پتہ پتہ بن گیا تصویر ناکامی
ترے جانے سے پژمردہ گلستاں کا گلستاں تھا

روپہلی چاندنی میں وہ مرے پہلو میں بیٹھی تھیں
مرے اس چاند سے لیکن فلک کا چاند لرزاں تھا

وہ اپنے حسن سے بڑھ کر مری چاہت پہ نازاں تھیں
مری نظریں اور انکی کامراں میں خود بھی حیراں تھا

صنوبر کے حسیں سائے لبِ جو گود میں کوئی
مگر اب یاد کرتا ہوں تو اک خوابِ پریشاں تھا

کوئی خوابیدہ تھا قصری مری آغوشِ رنگیں میں
فلک بھر چاندنی تھی یا گلستاں کا گلستاں تھا

قصری (رام پوری)

"ورڈز ورتھ اور اس کی شاعری" ادارہ ادبیاتِ اردو کی اولین کتاب ہے جو آج سے پانچ سال پہلے شایع ہوئی۔ یہ کتاب مولنا سلیمان ندوی کی رائے میں جدید قسم کی بہترین سوانح عمری ہے۔ اصغر گونڈوی مرحوم اس کو ۱۹۳۴ء کی بہترین اردو کتاب سمجھتے تھے۔ مولوی عبدالحق صاحب فرماتے ہیں کہ اردو کے ہر شاعر کو یہ کتاب پڑھنی چاہیے اور حضرت نیاز فتح پوری کا ارشاد ہے کہ مشرق اور مغرب کی ادبیات کا تقابلی مطالعہ کرنے والوں کے لئے یہ ایک خاص چیز ہے۔

اس دوران میں اردو شعر پر ورڈسورتھ کے اثرات ایک حد تک نمایاں ہو گئے۔ موضوع، اسلوب اور زبان کی سادگی کا جو رنگ مغربی شاعری اور خاص طور پر ورڈز ورتھ سے متاثر ہو کر مولنا حالی نے الاپنا شروع کیا تھا اس کے اثرات میں اضافہ ہو جا رہا ہے۔

عنقریب ورڈسورتھ اور اس کی شاعری کا دوسرا ایڈیشن بعض اضافوں کے ساتھ شایع ہونے والا ہے۔ اس میں سکیشس صاحب کی بعض نظمیں بھی شامل ہوں گی۔ ان نظموں کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اردو شعر کی ساری خوبیوں کو برقرار رکھ کر ورڈسورتھ کی ترجمانی کی گئی ہے

ادب اور ذوق

(ایک مغربی صاحبِ ذوق کی مفید تصنیف کا پہلا باب ترجمے کی صورت میں پیش ہے۔ اس کے پڑھنے سے
ادب والوں اور "بے ادبوں" دونوں کے دل پر شاید کچھ اثر ہو)

سب سے پہلے ضرورت اس امر کی ہے کہ راستے سے ایک غلط فہمی دور کر دی جائے۔ اگر عموماً نہیں تو اکثر حضرات ادبی ذوق کو ایک نفیس تحصیل اور اکتساب سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ اسے حاصل کرنے سے وہ اپنے آپ کو مکمل کر لیں گے اور ایک صحیح سوسائٹی کے رکن بننے کے اہل ہو جائیں گے۔ وہ دراصل ادب سے ناواقفیت رکھتے ہیں اور اپنی ناواقفیت سے اس طرح شرمندہ بھی ہیں جس طرح وہ کسی اعلیٰ اور مہذب تقریب میں آدابِ مجلس سے اپنی لاعلمی کی بناء پر محجوب رہتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اس طرح ناقابل اور مشوش پاتے ہیں جس طرح کسی سواری نہ جاننے والے شخص کو یکایک گھوڑے پر سوار ہونے کے لئے کہا جائے۔ ان کا خیال ہے کہ انسان کے لئے دنیا میں بعض چیزوں کو جاننا یا ان کے متعلق معلومات رکھنا ضروری ہے اور ان میں سے ایک ادب ہے۔ انھوں نے شائستگی کے ساتھ لباس پہننا سیکھ لیا ہے، وہ ہر موقع پر شائستگی اور تہذیب کا اظہار بھی کر سکتے ہیں۔ وہ زندگی کے روزآنہ اور ضروری مسائل سے کماحقہ واقف ہیں۔ محنت اور کوشش سے وہ اپنے اوقات فرصت میں کچھ تحصیل و اکتساب بھی کر لیتے ہیں۔ اس لئے، یہ امر بھی اُن کے لئے حق بجانب معلوم ہوتا ہے کہ وہ ادب سے واقفیت کو ہر باعزت اور خوددار انسان کا ذاتی سرمایہ اور لازمہ قرار دیں۔ مصوری ضروری نہیں۔ موسیقی ضروری نہیں۔ لیکن ادب سے تعلق رکھنا ہر شخص کے لئے ضروری ہے۔ اس طرح معلوم ہوا کہ ادب ایک دلفریب ترغیب اور دل بہلائی ہے۔ گویا ادبی ذوق کے دو مقاصد ہوئے۔ ایک صحیح تہذیب کا صداقت نامہ بننا، دوسرے ایک خانگی مشغلہ ثابت ہونا۔ ریاضیات کے ایک نوجوان پروفیسر نے، جو ریاضیات اور کھیل کا ماہر، شطرنج میں خطرناک، وایولین بجانے میں مشاق تھا، ایک دفعہ کتاب سے متعلق میری گفتگو سن کے کہا "جی ہاں، مجھے بھی ادب کی تحصیل کرنی چاہیے۔" گویا وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ "میں اسے حاصل کرنا بھول گیا تھا۔ میں نے دوسری چیزوں پر تو چھاپہ مارا ہے، اب ادب کی طرف بھی کچھ توجہ کروں گا۔"

یہ رجحان یا وہ خیال جو اس کے مماثل ہو، سراسر غلط ہے۔ اس شخص کے لئے جو واقعی ادب کو سمجھ سکتا ہے، اور یہ جان سکتا ہے کہ ادب کا مقصد اور عمل کیا ہے، اس قسم کے رجحانات محض مضحکہ خیز ہیں۔ علاوہ ازیں ادبی ذوق کی تکمیل میں ان سے نقصان بھی پہنچتا ہے۔ جو لوگ ادبی ذوق کو صرف ایک تحصیل و اکتساب سمجھتے، اور ادب کو ایک تفریح اور ترغیب قرار دیتے ہیں، وہ نہ اکتساب میں کامیاب ہوں گے اور نہ اس نیم اکتسابیت سے کوئی تفریح کا کام لے سکیں گے۔ یہ ایک اور بات ہے کہ یہ ترغیب دوسری ترغیبات سے زیادہ مکمل ہے اور یہ تحصیل و اکتساب مہذب انسانیت کی عام دیوانگی کو موثر بنانے میں دوسرے قسم کی تحصیلات سے بہت زیادہ قوی اور دلکش ہے۔ ادب، ایک اضافہ، یا ایک ضروری لاحقہ نہیں بلکہ حیاتِ کامل کی اصل اور روح ہے۔ میں اس موقع پر فصیح و بلیغ اور جذبات انگیز جملے قطعاً استعمال نہیں کرنا چاہتا اور نہ کسی خطبے اور مبالغے سے کام لینا چاہتا ہوں۔ تاہم، میں حق بجانب ہوں گا، اگر میں کہوں کہ جس انسان کا ادب کی آزادی کا سامنا نہ ہو، وہ درحقیقت اپنے خوابِ غفلت سے جاگا ہی نہیں ہے۔ وہ ابھی پیدا ہی نہیں

ہوا ہے۔ وہ پوری طور پر دیکھ نہیں سکتا، سن نہیں سکتا، محسوس نہیں کر سکتا۔ وہ صرف کھانا کھا سکتا ہے۔ ان لوگوں کو جو ادب کے صحیح عمل اور منشا سے واقف ہیں، اور انھوں نے اس سے استفادہ بھی کیا ہے، اس سے زیادہ اور کوئی امر تکلیف نہیں دے سکتا کہ وہ ہزاروں افراد کو اس ترغیب میں مبتلا دیکھیں کہ وہ زندہ ہیں، حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ وہ زندگی سے صرف اتنا قریب ہیں جتنا موسم سرما میں ایک ریچھ ہوتا ہے۔

اب میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ادب کیا چیز ہے؟۔ نہیں، کاش میں ایسا کر سکتا مگر میں نہیں کر سکتا، نہ کوئی اور کر سکتا ہے۔ اس راز پر صرف ہلکی سی روشنی ڈالی جا سکتی ہے، یا کچھ اشارے کئے جا سکتے ہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں میں بھی صرف اس کی طرف اشارہ کروںگا۔ اس کے لئے میں آپ کو آپ کی زندگی کے کسی واقعے کی طرف واپس لے جاؤں گا یا مستقبل کی طرف بڑھا دوں گا۔

آپ کو وہ شام یاد ہے جب کہ آپ اپنے ایک بے تکلف اور جانی دوست کے ساتھ تفریح کر رہے تھے۔ آپ کا وہ دوست آپ کا رازدار تھا۔ آپ اُس سے کوئی بات چھپا نہ سکتے تھے۔ اس شام کو آپ اس سے ایک ایسی بات چھپانا چاہتے تھے جو آپکے دل و دماغ پر پورا قبضہ کئے ہوئے تھی۔ لیکن خدا جانے کونسی قوت تھی جو آپ کو اس کی طرف کھینچے جا رہی تھی۔ آپ پر ایک والہانہ جوش سوار تھا۔ چونکہ آپ کا دوست ہمدرد بھی تھا اور فرزانہ بھی، وہ ایک باعزت خواہش اور ذوقِ جستجو کے ساتھ آپ کی خوشامد بھی کر رہا تھا اس لئے آپ اس واقعے کی طرف آہستہ آہستہ بڑھتے گئے۔ جیسے جیسے زیادہ اعتماد اور راز داری کا جذبہ پیدا ہوتا گیا، آپ اصل واقعہ کے قریب ہوتے گئے، حتیٰ کہ آپ نے ایک تہلکہ آمیز سرگوشی کے ساتھ کہہ ہی دیا "میرے دوست، وہ لڑکی حسن کا معجزہ ہے"! اس لمحے اور ساعت میں آپ ادب کی سلطنت میں موجود تھے۔

مجھے اس کی تشریح کرنے دیجئے۔ یہ سچ ہے کہ لفظ "معجزہ" کے عام مفہوم کے اعتبار سے وہ لڑکی حسن کا معجزہ تو نہ تھی۔ آپ کے وفادار دوست نے کبھی اسے اتنا حسین نہیں سمجھا اور نہ ان چالیس ہزار نظارہ بازوں نے سمجھا تھا جو اسے دیکھا کرتے تھے۔ وہ صرف ایک لڑکی تھی۔ اس کے لئے شہر ٹرائے جلایا نہیں گیا تھا۔ ایک لڑکی کو معجزہ نہیں کہا جا سکتا۔ اگر آپ ایک لڑکی کو معجزہ کہیں گے تو دنیا کی ہر معمولی چیز کو بھی اسی نام سے یاد کیا جا سکے گا۔ لیکن ٹھیک ہے، آپ ایسا کر سکتے ہیں۔ آپ کو ایسا کرنا چاہیے۔ کائنات کے بے انتہا معجزات میں سے آپ کو صرف ایک کا احساس ہوا تھا۔ اس وقت آپ اپنی ایجاد اور انکشاف سے مسرور تھے اس انکشاف کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے آپ میں ایک قدرتی ولولہ موجود تھا۔ آپ کو کسی چیز کے زبردست حسن کا قوی احساس ہو گیا تھا اور آپ اس جذبے کو اپنا بنانے پر مجبور تھے۔ آپ کسی چیز کے متعلق جذبات اور خواہشات سے بھرے ہوئے تھے۔ آپ سارے بنی نوع انسان سے ہٹ کر اس ایک ہستی کی طرف کھنچ آئے تھے۔ اب آپ اپنے جذبے اور اظہار کا وہ اثر ملاحظہ فرمائیں جو آپ کے دوست پر ہوا۔ معلوم تھا کہ لڑکی ایک معجزہ نہیں ہے۔ کوئی اور شخص اسے مجبور کر سکتا تھا کہ اس معجزے پر ایمان لائے۔ لیکن آپ نے اپنے نظارے کی طاقت اور ایمان داری سے اور اپنے دوست کو اپنے نظارے میں شریک کرنے کے جوش اور ولولے سے، بہت دیر تک اس غریب

یہ محسوس کرنے اور سمجھنے پر مجبور کیا کہ لڑکی میں کوئی غیر معمولی بات ہے اور وہ اب تک اس کے اعجازِ حسن کی طرف سے آنکھیں بند کیئے ہوئے تھا۔

اس منزل پر آپ ادب پیدا کر رہے تھے۔ آپ زندہ تھے۔ دنیا کے تھوڑے سے حسن اور اعجوبیت کی طرف آپ کی آنکھوں پر پٹی نہیں تھی، آپ کے کان بہرے نہ تھے۔ آپ کے اندر ایک ایسی قوت تھی جو آپ کو اپنے جذبے کے اظہار پر مجبور کر رہی تھی۔ یہ آپ کے لئے کافی نہ تھا کہ آپ اسے دیکھیں یا سنیں۔ آپ کے لئے ضروری تھا کہ دوسرے بھی اسے دیکھیں اور سنیں۔ دوسروں کو جگانا لازم تھا' اور آپ نے جگایا۔ یہ ممکن ہے ــ گو مجھے یقین کامل نہیں ہے ــ کہ دوسرے ہی روز یا دوسرے ہفتے آپ کا وفادار دوست کسی اور لڑکی کو دیکھے اور فوراً محسوس کرے کہ وہ بھی معجزۂ حسن ہے۔ یہ ادب کا اثر ہے!

ادب کے بنانے والے دراصل وہ لوگ ہیں جنھوں نے کائنات کے اعجاز نیرنگ و حیرت کو دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ اور ان میں سب سے بڑے معمار وہ ہیں جن کا مطمح نظر بہت زیادہ وسیع اور جن کا احساس بہت زیادہ شدید ہے۔ آپ کی تیز نگاہی کا ایک ٹکڑا ممکن ہے اتفاقی ہو اور عارضی بھی، لیکن ان کی زندگی ایک طویل ترنگ' ایک مسلسل حسرت ہے جو ہمیشہ اس امر سے انکار کرتی رہی کہ دنیا ایک اُداس جگہ ہے۔ اگر آپ بھی یہ سمجھنے اور معلوم کرنے کے قابل ہوں کہ دنیا ایک اُداس جگہ نہیں ہے تو کیا آپ کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہ ہوگی؟ اگر آپ کو بھنواروں اور غاروں سے نکال کر پہاڑوں کی چوٹیوں پر کھڑا کر دیا جائے تاکہ آپ زندگی کے صحیح لذت اور کیف سے لطف اندوز ہوں' اور آپ کی اس خوبصورت شیروانی کے نیچے ایک سچا دھڑکنے والا دل پیدا ہو تو کیا آپ اسے کوئی بات نہ سمجھیں گے؟ ادب کے معمار آپ کو ان چیزوں کا حریف اور مدِ مقابل بنا دیتے ہیں!

ادبی مطالعے کا مقصد یہ نہیں کہ اوقاتِ فرصت بہلائے جائیں۔ اس کا مقصد اپنے آپ کو جگانا' زندہ کرنا' ہمدردی' مسرت اور فہم و ادراک' اخذ و جذب کی صلاحیتوں کو زیادہ قوی بنانا ہے۔ اس کا منشا صرف ایک گھنٹے کو متاثر کرنا نہیں بلکہ چوبیس گھنٹوں کو متاثر کرنا ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ دنیا کے ساتھ ہمارے تعلقات کا رخ اور نوعیت ہی بدل دے۔ ادب کا سمجھنا اور اسے پسند کرنا دنیا کو سمجھنے اور پسند کرنے کے مرادف ہے۔ اس کی سوا اس میں کوئی اور معنی نہیں ہیں۔ اس میں زندگی کے بے جوڑ اور علٰحدہ ٹکڑوں کو جوڑنا نہیں بلکہ پوری زندگی کو ایک مربوط اور جامع نقشے میں دیکھنا ہے ادب کی روح ربط اور اتحاد ہے۔ ادب قندیل اور ستاروں کو ملاتا ہے اور تصور اور عکس کے جادو سے یہ ثابت کرتا ہے کہ ایک بڑی چیز کا حسن درحقیقت ایک چھوٹی چیز میں ہے۔ وہ اس امر پر اکتفا نہیں کرتا کہ حسن کا انکشاف کیا جائے یا ساری چیزوں کو ایک ہی مرکزِ خیال پر لایا جائے' بلکہ وہ علت و معلول، سبب اور نتیجہ کے قانون کا پتہ چلا کر ایک قسم کی اخلاقی فہم و ادراک پیدا کرتا اور اسے ہم پر مسلط کرتا ہے۔ اس کی تشفی اور تسکین دو قسم کی ہوتی ہے۔ وہ ایک غیر مشکوک دلکشی کو بے نقاب کرتا ہے' دوسرے وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ ہماری قسمت بھی کائنات کے ساتھ ہے۔ یہ ایک انکشاف کرنے والے شخص کی زبردست پکار ہے جو ہمدردیاں بانٹتی اور ایک ہی اشارے میں ہمدردیاں حاصل بھی کرنا چاہتی ہے۔

کسی شاعر کے دیوانوں کے قدیم نسخے ٹٹولنے' کسی ڈرامہ نگار کے مضمون کے ماخذ معلوم کرنے' یا علم عروض کی تاریخ لکھنے' یا ان

امور کے انکار و اقرار کے دلائل ڈھونڈنے میں کہ نظام الملک طوسی یا حسن بن صباح عالی فکر اور بدمعاش انسان تھے، اس امر کا امکان ہے کہ لوگ اصل ادب اور اس کی روح کو بھول جائیں اور یہ نہ معلوم کر سکیں کہ اس کا مقصد کیا ہے، اور یہ کس کے لئے ہے؟ مجھے پھر یہ یاد دلانا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ادب درحقیقت صحیح زندگی کا ذریعہ ہے، اور ادبی ذوق کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس ذریعے کو اپنی اعلیٰ تر زندگی کے لئے کتنی خوبی سے استعمال کر سکتے ہیں؟ جو لوگ زندہ نہیں رہنا چاہتے، جن کو محسوس کرنے سے زیادہ دل بہلائی کی خواہش ہے، وہ براہ کرم ادب کو خیرباد کہہ دیں۔ یہی ان کی عقلمندی ہو گی۔ بقول ایک عمدہ شاعر کے پاکیزہ مصرعے کے "بیٹھے ہوئے سند ہولے کھایا کریں"۔ "ایک معمولی جھاڑی کا نظارہ" جو جلال ایزدی سے معمور ہو" شاید ان کو حواس باختہ بنا دے گا!

محمد عبدالقیوم خان باقی

دُعا

آپ بھی بے حجاب ہو مجھ کو بھی بے حجاب کر
جامِ مئے حیات کو چشمۂ آفتاب کر

ڈوب رہی ہے نبضِ دل، سانس کہیں الٹ نہ جائے
سینۂ آب و خاک کو عرصۂ انقلاب کر

میری دعائے نیم شب اور یہ سوز و تاب و تب
میرے چمن میں جلوۂ سلسلۂ سحاب کر

عشق ہے محوِ آب و رنگ عقل ہے محوِ خار و سنگ
حسنِ ازل کا واسطہ حسن کو بے نقاب کر

منزلِ بے خودی میں یہ مرحلہ خبر کہاں!
حسن، جوابِ حسن ہے عشق کو لاجواب کر

تشنہ ہے روحِ زندگی گل ہے چراغِ بندگی
مجھ کو پیامِ تازہ دے مجھ کو عطا کتاب کر

درد ہے رازِ کائنات، یہ جو نہیں تو کچھ نہیں
عشرتِ رنگ پر نہ جا، درد کا انتخاب کر

میری حیات کا جمال، تیرے شباب کا خیال
ہستیٔ ناتمام کو نقش گرِ شباب کر

کاوشِ خستہ دل ہوں میں، منبعِ رنگ و بو ہے تو
غنچۂ ناشگفتہ کو پھول بنا، گلاب کر!

کاوش

گُل بُوٹے

کسی کے ہر اپریل اور مئی کے گرم تقاضوں سے تنگ آکر پورے ایک عمر کے بعد پچھلی گرمیوں میں بنگلور کے لئے ہم نے رخت سفر باندھا! اس تقریب میں ہماری بیچاری پانچ سال کی نئی "فورڈ" پر بھی آفت آئی وہ بھی ہمارے ساتھ چلنے پر مجبور ہوئی۔ اپریل کے آخری ہفتہ میں ہمارا "کاروان" کچھ موٹر میں اور کچھ ریل میں صبح سویرے بنگلور چل پڑا، شہر سے کوئی چونسٹھ میل موٹر میں چلنے کے بعد ہم محبوب نگر پہنچے یہاں ہم سب نے اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں ناشتہ کیا اور چلے اسٹیشن ماسٹر سے ملنے۔ کرنول کے قریب جو ندیاں آڑے آتی ہیں ان کو پار کرنے کے لئے ہم نے چار روز پہلے ہی ریلوے ٹرک اپنی موٹر کے لئے محفوظ کرالیا تھا، اسٹیشن ماسٹر سے مل کر ہم نے اپنی موٹر کو ٹرک میں بٹھادیا، سب کے ٹکٹ کرنول تک کے خرید لئے اور پلیٹ فارم پر ٹرین کے انتظار میں ٹہلنے لگے

ساڑھے نو بجکر کچھ منٹ پر ٹرین آئی، ہم سب اپنے اپنے ڈبوں میں سوار ہو گئے، اور دس بجے کی گاڑی ہمیں اڑاتی ہوئی کرنول چلی، ہمارے ڈبے میں ہمارے سوا دو اور مسافر تھے، ایک صاحب اوپر کی برتھ پر لیٹے ہوئے کوئی موٹی سی کتاب بہت غور سے پڑھ رہے تھے اور کچھ گنگنا بھی رہے تھے، دوسرے صاحب نیچے کی سیٹ پر ٹائمز آف انڈیا دیکھ رہے تھے، ہم اپنی تنہائی کو بری طرح محسوس کر رہے تھے، اتنے میں اوپر والے صاحب "وہ ہم سے نیچے کو دے" "السلام علیکم" کہہ کر ہمارے بازو بیٹھ گئے۔ اب جو ہماری نظر انکی کتاب پر پڑی تو اس پر سنہری حرفوں میں "دیوانِ حافظ" لکھا دیکھا، اس دیوان کو ان کے ہاتھ میں دیکھ کر ان کی وقعت ہماری نظروں میں بہت بڑھ گئی، ہم نے موصوف سے سوال کیا۔

پوچھا حافظ سے آپ کو خاص لگاؤ معلوم ہوتا ہے؟

فرمایا "جی ہاں! میں ان کے دیوان کا ترجمہ منظوم انگریزی میں کر رہا ہوں"!!

انگریزی میں دیوان حافظ کا "منظوم" ترجمہ سنکر ہماری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور موصوف کی لیاقت کی دھاک ہم پر خوب بیٹھ گئی، ہم یہ چاہتے ہی تھے کہ اس منظوم ترجمے کے سننے کی سعادت ہمیں نصیب ہو کہ اتنے میں موصوف نے ہم سے پوچھا۔

"کیا کوئی غزل کا فی البدیہ منظوم ترجمہ سناؤں؟"

ہم نے عرض کیا "چشم ما روشن دلِ ما شاد! نیکی اور پوچھ پوچھ!! ضرور ارشاد ہو"!!!

فرمایا "حافظ کی غزل کا انگریزی میں منظوم ترجمہ کرنا بچوں کا کھیل نہیں! بہت مشکل کام ہے!! اس کے لئے بڑی قابلیت کی ضرورت ہے"!

ہم نے کہا "اہیں کیا شک! پہلے تو ترجمہ کرنا ہی کچھ آسان کام نہیں ہے اور پھر حافظ کا انگریزی میں اور پھر منظوم ترجمہ!! واقعی یہ کار سے دارد این...... از تو آید و مردان چنیں کنند"!!!

مسکرا کر جواب دیا "کوئی پچیس برس کی مشق کے بعد یہ کام مجھ کو اب آسان معلوم ہوتا ہے، پہلے میں نے اردو غزلوں کا ترجمہ منظوم انگریزی میں کرنا شروع کیا،

اس پر کافی عبور حاصل کرنے کے بعد اب فارسی کا شروع کیا ہے، یہ ترجمہ اگر کسی انگریزی داں ایرانی کو سناؤں تو واللہ پھڑک اٹھے، دیکھئے حافظ مرحوم کی روح کو ایک الحمد اور قل ہو اللہ پڑھ کر بخشتا ہوں اور پھر "شاخ نبات" کی قسم دیکر کتاب کھولتا ہوں اور جو غزل نکلے اوس کا ترجمہ فی البدیہ سناتا ہوں۔"

چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا اور بسم اللہ کہکر کتاب کھولی، غزل نکلی۔

یوسف گم گشتہ باز آید بکنعاں غم مخور،
کلبۂ احزان شود روزے گلستاں غم مخور

اس شعر کا آپ نے انگریزی میں جو منظوم ترجمہ کیا ہے وہ سچ مچ ایک "شاہکار" ہے، ملاحظہ ہو!

The last yousuf will come back to Kan-an swallow-not sorrow.

The cottage of sorrow will become a flower garden one day swallow not sorrow

اس "فی البدیہ" ترجمہ کو سن کر ہم نے اپنے پر قابو رکھنے کی جو کوشش کی تو ہمارے جسم میں کچھ عجیب "ارتعاش" پیدا ہوا ہم نے اپنے پیٹ کو اچھی طرح پکڑ لیا کہ کہیں جوش مسرت سے ٹانکے نہ ٹوٹ پڑیں۔ معلوم نہیں "کنار آب رکن آباد" گلگشت کرنیوالے حضرت حافظ کی روح پر کیا گزرتی اگر وہ انگریزی داں ہوتی! ہم نے پلٹ کر ٹائمز آف انڈیا پڑھنے والے ہمسفر کی طرف جو دیکھا تو ان کے چہرہ کو اخبار کے ورقوں سے ملا ہوا اور ان کے بھاری بھر کم جسم کو کچھ عجیب وضع سے ہلتا ہوا پایا۔ اس اثنا میں موصوف نے دوسرے شعر کا ترجمہ بھی کر ڈالا، ارشاد ہوا۔

"این دل غم دیدہ حالش بہ شود دل بد مکن
وین سر شوریدہ باز آید بسامان غم مخور"

The condition of this sorrow seen heart will become better, dont make the heart bad. This noisy head will come back with luggage, swallow not sorrow

اس ترجمہ میں "گیج" کی ہم دل ہی دل میں داد دے رہے تھے کہ تیسرا شعر ارشاد ہوا۔

در بیاباں گر بہ شوق کعبہ خواہی زد قدم
سرزنش ہا گر کند خار مغیلاں غم مخور"

If you wish to strike foot in jangle in fondness for Kaba. If Babool thorns take you to task swallow not sorrow

ارشاد ہوا "اس منظوم ترجمہ کو قافیہ سے بے نیاز رکھا گیا ہے اس کی ردیف Swallow not Sorrow ہے، قافیہ لگانے کی کوشش کی گئی تھی مگر یہ دیکھکر کہ شعر وزن سے گر جاتا ہے صرف ردیف ہی پر قناعت کی گئی۔"

غرضکہ موصوف نے پوری غزل کا ترجمہ چند منٹوں میں اسی طرح "بڑی روانی" سے کر ڈالا اور ہماری رائے پوچھی! ہم ششدر رہ گئے اور "لسان الغیب" ہماری زبان سے بے ساختہ بول اٹھے "جزاک اللہ فی الدارین خیرا" سچ تو یہ ہے

کہ آپ نے انگریزی اور فارسی شاعری دونوں پر بڑا احسان کیا ہے۔ اس ترجمہ کا نسخہ انشاءاللہ کسی دن لندن کے عجائب خانہ میں پہنچ جائیگا" !

تو آپ کی رائے ہے کہ اس ترجمہ کی کاپیاں چھپوائی جائیں"؟ ہم نے کہا "بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے" اس ترجمہ کی تو کم سے کم دس ہزار کاپیاں چھپوا لینی چاہیے"۔

اس وقت ٹائمز آف انڈیا والے ہمارے ساتھی نے اپنا چہرہ اخبار کے ورقوں سے جو باہر نکالا تو ہم نے دیکھا کہ ان کی آنکھیں کچھ سرخ ہوگئی ہیں اور ان میں پانی اکھیل رہا ہے! غالباً وہ اپنی بے بضاعتی پر آنسو بہا رہے تھے کہ ان میں ایسا منظوم ترجمہ کرنے کی لیاقت نہیں تھی ! یہ معلوم کرکے ہمیں بڑی مسرت ہوئی کہ "قابل مترجم صاحب بھی گرمیاں گزارنے بنگلور جارہے ہیں، بنگلور میں آپ نے اور ترجمہ سنانے کا وعدہ کرتے ہوئے اپنا بنگلور کا پتہ ہمیں دیا اور ہم سے وعدہ لیا کہ کسی دن ان کا ترجمہ سننے ضرور آئیں، چنانچہ بنگلور میں کئی مرتبہ ہم نے ان کا ترجمہ بڑے مزے لیکر سنا، انشاءاللہ کبھی ناظرین سب رس کے ملاحظہ میں اس ترجمے کے چند نمونے پیش کرینگے۔ سب رس زندہ صحبت باقی

آج ہم ان وقتوں کا ذکر کرتے ہیں جبکہ ایک بزرگوار اپنے "آخری" امتحان میں رونق افروز تھے، اردو کا پرچہ بڑی پھرتی سے لکھ رہے تھے کیونکہ "پدری زبان جو ٹھہری" !! ایک گھنٹہ پہلے ہی آپ نے پرچے گارڈ کے حوالہ کردئے اور امتحان کے ہال سے نکل کر ادھر ادھر گلگشت کرنے لگے آخر بڑے انتظار کے بعد ایک ساتھی باہر آئے، دونوں میں پرچہ کے متعلق گفتگو شروع ہوئی، آپ نے کہا۔

آج کا پرچہ بھی کچھ تھا! مجھ کو تو سو میں سو نمبروں کی امید ہے"!! ساتھی نے اپنا پرچہ دیکھکر کہا "مجھ کو پچاس نمبروں سے زیادہ کی امید نہیں ہے کیونکہ بعض اشعار میری سمجھ میں نہیں آئے، کہئے آپ نے اس شعر کا مطلب کیا لکھا ؟ ؎

غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ؛ لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں"

ارشاد ہوا "تم بھی عجب احمق ہو! ارے اتنے آسان شعر کا مطلب تمھاری سمجھ میں نہ آیا!! سنو! شاعر کہتا ہے، لوگ مضامین کی ایسی فاش غلطیاں کرتے ہیں کہ گویا ندی نالوں کو رسّوں سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں" !!!

ایک صاحب نے اپنی سنہ ۱۹۲۰ء کی بڑی سیڈان "ڈاج" "موٹرکار برائے فروخت ہوتی ہے" کا ایک چھوٹا سا بورڈ سامنے کے آئینہ پر لٹکایا ہے اور موٹر کو صحن میں ایک درخت کے نیچے بڑی حفاظت کے ساتھ رکھ چھوڑا ہے۔

ہمارے ایک دوست کو "سکنڈ ہینڈ" کار کی ضرورت تھی، ایک واقف کار کی حیثیت سے ہم ان کی ہمرکابی کی عزت حاصل کرنے پر مجبور کئے گئے اور چلے موٹر دیکھنے کوئی تین بجے ہوں گے کہ ہم دونو درِ دولت پر پہنچے۔ وہاں ایک "مرد معقول" سے آمنا سامنا ہوا۔ بوٹا سا قد، گندمی دھوپ چھاؤں رنگ، چمڑا ہڈیوں پر مڑا ہوا، گال سے زیادہ کن پٹیاں پچکی ہوئیں، چھوٹی چھوٹی آنکھیں بڑے بڑے کان، پیچ دار ناک، چکی ڈاڑھی، موٹا ہفت پیوند پاجامہ، باریک ململ کا نسبتاً اجلا ڈھیلا ڈھالا کرتہ، اس پر پرانا چمڑے کا چوڑا بازاری بلٹ، سر پر ایک لچھے دار پرانی جو کسی زمانے میں غالباً سالو کے رنگ کی ہوگی بہت ڈھیلی شاگرد پیشہ کی پگڑی۔ ان حضرت سے معلوم ہوا کہ سرکار خاصہ پر ہیں" !

ہم نے موٹر دیکھنے کی اجازت چاہی، جواب ملا
"ٹھہرو! سرکار آتیں"!!
اتنے میں آواز آئی "کیا ہے مدار صاب کون ہے"؟
"مدار صاب گویا ہوئے "سرکار دو جنے موٹر دیکھنے بولتیں!
ارشاد ہوا "اچھا دیکھو بولو"!

ہماری پریشانی کی کوئی حد نہ تھی جب ہم نے یہ محسوس کیا کہ "مدار صاب" کے سرکار بغیر دکھائی دے وہیں کہیں سے بول رہے ہیں حسب الحکم ہم موٹر کے پاس لائے گئے، موٹر کیا تھی بہادر شاہ ظفر کی سرد وگرم روزگار چشیدہ، گویا اپنے وقت کی "مدار صاب" تھی اندر جو نظر پڑی تو دیکھتے کیا ہیں، ایک گل موچھ، ڈاڑھی چٹ "دو گوشتہ" "سرکار برآمد ہیں۔ لٹھے کا نکمہ دار کرتہ پہنے ہوئے ہیں، سر بال صفا ہے اور ہاتھوں میں بواسیر و نواسیر کے کئی چھلے ہیں۔

اب یہ عقدہ کھلا کہ سرکار ہی "سروش غیب" تھے۔ "مدار صاب" نے بالکل سچ کہا تھا کہ "سرکار خاصہ پر ہیں"! موٹر میں ایک تپائی تھی۔ کچھ تپائی پر اور کچھ گدے پر رکابیاں، کٹورے بکھرے پڑے تھے۔ باریک چانول ابلے ہوئے مشقاب بھر، خمیری روٹیوں کا اونٹڑ، تلا ہوا چرب مسالہ دار تقریباً سیر بھر گوشت، دو چار لال بھبو کے سالن، بالائی، شکر۔ یہ تھا وہ "لیٹ لنچ" جو سرکار اڑا رہے تھے اور خوب پسینہ پسینہ ہو رہے تھے۔ قریب میں پاندان تھا۔ ناس کی ڈبیہ تھی، ہاتھ کا تیلیا رومال تھا اور کچھ ہٹ کر ایک پست قد، جسیم، آتش بسر پیچوان سرکار کی جنبش لب پر بولنے تیار رکھڑا تھا۔

جوں ہی سرکار نے ہمیں دیکھا ارشاد ہوا "سلام والیکم" اور اس طرح کہ "والیکم" کا "کم" باہر نہ نکل سکا، اس وجہ سے کہ سرکار کے "لقمہ" نے اس کو بیچوں بیچ دھر لیا۔

ہم نے وعلیکم السلام عرض کرتے ہوئے موٹر کو چلا کر دیکھنے کی اجازت چاہی، کسی قدر بگڑتے ہوئے فرمایا "کیا میری موٹر چلتی نہیں سمجھ رین؟ ذرا ٹھہرو! ڈرائیور بمبئی کو گیا ہے، آنے دیو چلا کر بتاتوں"!!

اس "ذرا ٹھہرو" کی تکلیف ہمارے لئے ناقابل برداشت تھی، اس لئے ہم نے لب چباتے ہوئے عرض کیا "اجازت ہو تو ہم خود چلا کر دیکھ لیتے ہیں"

بپھرتے ہوئے فرمایا "نئیں جی او سیکنڈ ہانڈ پو ابھی چلتی ہے" یہ سنکر ہم لاجواب ہو گئے اور اس ملاقات کو جلد ختم کرنے کی نیت سے کھلکھلاتے ہوئے قیمت دریافت کی۔

ارشاد ہوا "بیچوں گا تو نئیں، پن کیا قیمت کو بیچوں گا سو ابی نئیں بول سکتا"

ہم نے پھر حاضر ہونے کی اجازت چاہتے ہوئے آداب عرض کیا اور لوٹنے لگے۔ "مدار صاب" چند قدم ہمارے ساتھ آئے اور احتیاطاً ادھر ادھر دیکھکر آہستہ سے کہا۔

"بڑی بیگم صاب کی کندی کر کو آئیں۔ ابی گرم ہیں، پھر کو آؤ"!

"باغبان"

سلطان محمود غزنوی کی بزم ادب۔ ۱۷۱ صفحات قیمت (عہ)، غزنین کی فارسی شاعروں اور وہاں کی ادبی وعلمی چہل پہل کا مبسوط تذکرہ۔

سلطان محمود کی ادبی سرپرستیاں اور اس کے دربار کے شعرا کے حالات اور کلام پر تبصرہ فارسی زبان پر ان شعرا کی کاوشوں کا اثر وغیرہ

جون آف آرک کی زندگی کے چار دور

جون آف آرک

(فرانس کی اس مشہور دوشیزہ کے حالاتِ زندگی پر ادارہ کی طرف سے ایک دلچسپ کتاب لکھی جا رہی ہے جس کے تعارف کے طور پر یہ مضمون درج ہے۔)

مشرق اپنی مردہ پرستی کی وجہ سے بدنام ہے اور یہ واقعہ بھی ہے کہ بہت کم خوش نصیب صاحبِ کمال ایسے گذرے ہیں جن کی قدر ان کی زندگی میں کی گئی۔ لیکن یہ کمزوری صرف ایشیائی ممالک تک محدود نہیں۔ یورپ میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں گو ان کی تعداد نسبتاً کم ہے۔ ذیل میں فرانس کی ایک باعصمت دوشیزہ کی کہانی لکھی جاتی ہے جو بہ قول "راسکوپ تھیسیز" اپنی زندگی میں ایک بدکار سفلی روح اور انسانیت کے لئے باعثِ ننگ سمجھی جاتی تھی لیکن مرنے کے بعد صاحبِ کشف و کمال اور مقدس ہستی سمجھی گئی اور اس کی پوجا کی جانے لگی۔

آج سے تقریباً پانسو سال پہلے متعدد لڑائیوں کے بعد فرانس پر انگلستان کی سیادت قائم ہو گئی۔ تخت کا جائز وارث فرار ہو کر پائٹیرز چلا گیا اور اس کی ماں نے سفارش کر کے تخت و تاج انگریزوں کے ہاتھ بیچ ڈالا۔

فرانس کی ابتری اور بربادی انتہا کو پہنچ چکی تھی لیکن ایک گڈریے کی لڑکی نے جس کا نام جون تھا چند ہی سال میں فرانس کو پھر آزادی دلا دی۔

فاتحِ اعظم نپولین کے وطن کی خاک سے یوں تو بہت سی بڑی ہستیاں اٹھیں اور فرانسیسی ناول نویس افسانہ نگاروں نے بہتیرے مکمل اور نصب العینی تخیلی کردار پیدا کئے۔ لیکن کوئی تاریخی یا افسانوی شخصیت جون کی بلندی پر نہیں پہنچ سکی۔

جون آف آرک کے واقعات شروع سے آخر تک کچھ اس نوعیت کے ہیں کہ آج مادیت کے چرچے کی وجہ سے بہت کم لوگ ان پر یقین کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جون آف آرک ایک روز اپنے گاؤں میں گلہ بانی کر رہی تھی کہ ایک غیبی آواز اس کے کان تک پہنچی جو یہ تھی "جا، فرانس کو آزاد کرا اور روئن میں شہزادہ ڈافن کو تاج پہنا"

اس آسمانی حکم کے سنتے ہی یہ لڑکی اپنے باپ کے پاس پہنچی اور اس کو سارا واقعہ سنایا۔ باپ نے مسکرا کر کہا "پاگل ہو گئی ہے"۔ وہ خاموش ہو گئی۔ لیکن خدائی آواز روزانہ سوتے جاگتے اس کے کانوں میں پڑتی رہی یہاں تک کہ لوگ مذاق اڑانے اور اسے پاگل بناتے ہی رہے لیکن وہ ایک درباری رئیس کے توسط سے ڈافن تک پہنچ گئی۔ ڈافن کو جون آف آرک کے دعوؤں کی اطلاع پہلے ہی مل چکی تھی۔ اس نے پہلا امتحان اس طرح لیا کہ اپنی جگہ ایک اور شخص کو دے کر خود درباریوں میں جا بیٹھا۔ لیکن شہزادہ اور اہلِ دربار کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انھوں نے دیکھا کہ جون جس نے کبھی شہزادے کو نہیں دیکھا تھا سیدھا اسی کے پاس پہنچ گئی اور اس کا نام لے کر اسے مخاطب کیا۔ اور بھی آزمائشیں ہوئیں جس کے بعد فوج کی کمان جون کے حوالے کی گئی۔

جون نے چاند سلطانہ کی طرح مردانہ اور سپاہیانہ لباس پہن لیا۔ ہتھیار لگائے اور شہزادے کے دئے ہوئے سفید گھوڑے پر سوار ہو کر نکلی۔ دشمنوں سے جہاں جہاں مقابلہ ہوا اس نے انہیں شکست دی۔ ایک لڑائی میں تیر سے زخمی

ہو کر دیوار پر سے نیچے گری لیکن اس حالت میں بھی فوج کو برابر بڑھاوے دیتی اور سپاہیوں کے دل بڑھاتی رہی۔ دوست دشمن سب حیران تھے۔ خود جون کے ساتھی اسے ساحرہ سمجھ کر ڈرنے لگے تھے۔ مقابلے جاری رہے اور کامیابیاں ہوتی رہیں یہاں تک کہ انگریزوں کے پیر اکھڑ گئے۔

غدائی احکام کی تعمیل کے یہ اہم مدارج طے ہو چکے۔ اب صرف تخت نشینی باقی تھی۔ جون نے شہزادے سے کہا کہ وہ "روئن" چل کر تاج و تخت سنبھالے لیکن شہزادہ ڈرا ہوا تھا۔ بہ قول شخصے اس کا باپ پاگل اور ماں دغاباز تھی۔ جون کے بارے میں دنیا بھر کے شبہات اس کے دل میں تھے۔

بالآخر شہزادہ راضی ہو گیا اور اس کو ساتھ لے کر جون آف آرک "روئن" پہونچی۔ تاج ڈافن کے سر پر رکھا اور یہ کہہ کر کہ آسمانی احکام کے مطابق اس کے فرائض پورے ہو چکے ہیں، اپنے گاؤں کو واپس جانے کی اجازت چاہی۔ کاش اس کی اجازت جون کو مل جاتی مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہوا۔ ڈافن نے جون کے عزیزوں کو جاگیر اور منصب سے سرفراز اور جون کو اپنے ساتھ ہی رکھا۔

جون کے بارے میں لوگوں کے شبہات بڑھتے گئے انھوں نے علی الاعلان کہنا شروع کیا کہ جون ساحرہ ہے اور اس نے سفلی ارواح کی مدد سے فوق الانسان مہمیں سر کی ہیں۔ صداقت کے آفتاب پر کذب اور افترا کے کالے کالے بادل چھانے لگے یہاں تک کہ تاریکی پھیل گئی۔ علما اور رہادیان مذہب نے بھی عوام کی ہاں میں ہاں ملائی یہاں تک کہ فرانس نے ـــــ جون کے وطن نے... اس سرزمین نے جس کے لئے جون نے اپنی جان کو خطرات میں ڈال دیا تھا اور جس کی محبت کلون کلون کی رگ رگ میں دوڑ رہا تھا ـــــ اپنے اس محسن کو سولہ ہزار پاؤنڈ قیمت لے کر انگریزوں کے ہاتھ بیچ ڈالا۔

جون کی زندگی کے ڈرامے کا تیسرا ایکٹ سنگین حزنیوں سے بھی کہیں زیادہ دردناک ہے کہا جاتا ہے کہ عدالت اندھی ہوتی ہے اس قول کا اطلاق سب سے زیادہ اس عدالت پر ہوتا ہے جس میں جون پر مقدمہ چلایا گیا۔ بڑے بڑے ماہرین قانون اور انسان دشمنوں نے قسم قسم کے سوالات کر کے اور جرح کے ذریعہ جون کو پھانسنا چاہا لیکن حقیقت ہمالیہ پہاڑ کی طرح اپنی جگہ جمی رہی۔ توہم پرست اور کمزور اعتقاد کے لوگوں نے اس کو سحر سامری سمجھا۔ آخر کار خود عدالت کے منشی کا بیان ہے کہ جون کے بیانات میں مجرمانہ تحریف کی گئی۔ دنیا کی اس عظیم الشان ہستی کے لئے موت کی سزا تجویز ہوئی۔

بڑے آدمیوں کی موت بھی بڑی ہی ہوتی ہے جون کو سولی نہیں دی گئی۔ اسے زہر نہیں کھلایا گیا۔ اس کا سر نہیں کاٹا۔ اس لئے کہ جو گناہ فرانس کو آزاد کر کے اس نے کئے تھے ان کی سزا دینے کے لئے یہ سارے عام طریقے غیر مناسب سمجھے گئے۔

شہر روئین کے ایک پبلک مقام پر جون کے لئے چتا تیار ہوئی۔ اور آن کی آن میں فرانس کی یہ موہنی مورت بھڑکتے ہوئے شعلوں میں چھپ گئی۔ ہزاروں آدمی کھڑے دیکھ رہے تھے اور دیکھتے رہے یہاں تک کہ گھٹتے گھٹتے

شعلے بیٹھ گئے اور آگ راکھ بن کر چاروں طرف اڑنے لگی۔ لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا اور خوشی خوشی گھر لوٹے کہ ایک بدکار کاہنہ کا خاتمہ ہوگیا۔

لیکن یہ لوگ غلطی پر تھے۔ ان شعلوں نے جون کا خاتمہ نہیں کیا بلکہ اس کی عظمت اور تقدس میں ہمیشہ کے لئے چار چاند لگا دیئے۔ حقیقت کے چہرے سے کذب و افترا اور توہمات کے پردے جلد جلد اٹھنے لگے اور جون کی عظمت کی کرنیں سارے فرانس میں پھیلنے لگیں۔ جون آف آرک سینٹ جون کہلانے لگی۔ فرانسیسی اس کے نام پر جان دیتے ہیں۔ جون آف آرک فرانس کے غیر فانی ادیبوں، مصوروں اور مورت سازوں کا موضوع بن گئی۔ آج بھی پیرس کی شاہراہ پر جون آف آرک کا مجسمہ فرانسیسیوں کو یاد دلاتا ہے کہ آزادی پانی اور ہوا کی طرح تمام قوموں کا فطری حق ہے۔

میر حسن

اردو

اے جمالِ پیکرِ ہندوستان　　تیرا عالم میں رہے اونچا نشاں

اے کہ پالا ہے بزرگوں نے تجھے　　آفتیں سہہ کر اٹھا کر سختیاں

مر گئے پر تجھ کو زندہ کر گئے!　　داستاں تیری ہے کتنی خونچکاں

پھر یہ کیسے ہم سے دیکھا جائیگا　　کوندتی ہوں تیرے سر پر بجلیاں

لوحِ ہستی سے مٹانے کی تری　　دشمنوں میں ہوتی ہیں سرگوشیاں

کوئی یہ پیغام پہنچا دے انہیں　　کوششیں بے سود، محنت رائگاں

تجھ کو حاصل ہوگئی اقبال سے　　سربلندی، اور عمرِ جاوداں!

تو نہ ڈر مطلق کہ حق ہے تیرے ساتھ　　ہیں ترے فرزند بھی لاکھوں جواں

جن کا دل سیماب، جن میں جوش ہے　　بازوؤں میں زور جیسے پہلواں

اختروں کی طرح تابندہ تمام!　　جن سے روشن ہیں زمین و آسماں

آنچ آئے تجھ پہ یہ ممکن نہیں　　تیرے دم کے ساتھ ہے ہم سب کی جاں

شور عابدی (گلبرگہ)

اردو کی نئی کتابیں

ادارۂ ادبیات اردو کے شعبۂ تنقید و تبصرہ کے پہلے
جلسہ کی قرارداد مورخہ ۶ ربہمن ۱۳۴۸ف کے مطابق کہ ہندستان
کی جدید اردو مطبوعات کی فن وار فہرست ہر مہینہ رسالہ
"سب رس" میں درج ہوا کرے" ماہ جنوری ۱۹۳۹ء سے
اس فہرست کی اشاعت پابندی سے ہو رہی ہے "سب رس"
کی صرف دو تین اشاعتوں میں جگہ کی تنگی کی وجہ سے یہ
فہرست درج نہ ہو سکی۔

اس فہرست کی اشاعت کا مقصد یہ ہے کہ ناظرین
سب رس کو مختلف مضامین کی مطبوعات میں سے اپنے
ذوق کی کتابیں انتخاب کرنے کا پہلا موقع ملے' اس کے
علاوہ مصنفین' مولفین اور ناشرین کو بھی اس فہرست کی اشاعت
سے استفادہ کا موقع ملتا ہے' وہ اس طرح کہ ان کی تصنیف
تالیف اور مطبوعات کی نشر و اشاعت ہندوستان کے
طول و عرض میں جہاں جہاں "سب رس" کی رسائی ہوتی ہے
بلا کسی معاوضہ کے ہوا کرتی ہے۔

زیر نظر فہرست میں کوشش کی گئی ہے کہ آخر ستمبر
۱۹۳۹ء تک کی جملہ اردو کتابوں کی تعداد فن وار درج ہو'
چونکہ آخر سہ ماہی ۱۹۳۹ء کی مطبوعات کی فہرست اس وجہ
سے لکھی نہ جا سکی کہ اس نمبر کی کتابت ماہ نومبر ہی میں شروع
کر دی گئی۔ اس لئے آخر سہ ماہی ۱۹۳۸ء کی مطبوعات بھی
اس فہرست میں شریک کر لی گئی ہیں تاکہ پورے ایک
سال کے اعداد و شمار سے ناظرین کو واقفیت ہو' اس
فہرست کی ترتیب میں ہندوستان بھر کے اردو رسالوں'
مختلف کتب خانوں اور چھاپے خانوں کی فہرستوں اور
مقامی کتب فروشوں سے مواد حاصل کیا گیا ہے۔

آخر سہ ماہی ۱۹۳۸ء سے آخر نو ماہی ۱۹۳۹ء تک
سوانح' افسانہ' ڈراما' شاعری' فلسفہ' تاریخ' ادب'
طب' سیاست' قانون' مذہب' اخلاقیات' ریاضیات'
نفسیات' نسوانی ادب و خانہ داری وغیرہ پر جو کتابیں
شائع ہوئی ہیں ان کی تعداد فن وار ذیل میں درج کی جاتی ہے
سوانح ۷۳' افسانہ ۱۰۲' ڈراما ۱۵' شاعری ۱۲۶'
فلسفہ ۳' تاریخ ۸۶' ادب ۱۹۰' طب ۴۸' سیاست
۲۵' قانون ۲۴' مذہب ۱۵۷' اخلاقیات ۱۴' ریاضیات
۶۹' سفرنامہ ۳' نفسیات ۱۴' نسوانی ادب و خانہ داری
۲۵' لغات ۱۴' صنعت و حرفت ۴' معاشیات ۴' تعلیم
۲' متفرق ۹۳'

اس طرح ایک سال میں جملہ ۱۰۶۷ اردو کی
کتابیں شائع ہوئیں' ادب' مذہب اور شاعری پر
سب سے زیادہ کتابیں طبع ہوئیں ان کے بعد افسانہ
تاریخ اور سوانح کا نمبر رہا۔ ریاضیات پر بھی کافی کتابیں
نکلیں' ان میں سے جو اہم کتابیں شایع ہوئی ہیں ان کی
تفصیل فن وار ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

سوانح

(۱) حیات عثمانی (سلطان العلوم اعلیٰ حضرت آصف جاہ
ہفتم کے حالات) از شیخ یعقوب علی صاحب عرفانی
۴۰۰ صفحات قیمت عہ

(۲) ہٹلر اعظم (ہر ہٹلر کی سوانح عمری) از پروفیسر چندر شیکھر
شاستری ۴۰۰ صفحات قیمت مجلد ے

(۳) اشرف السوانح (اشرف علی صاحب تھانوی کی سوانح
عمری) ۲۹۸ صفحات

(۴) تذکرہ وقار (نواب وقار الملک مرحوم کی سوانح) ۳۸۸ صفحات قیمت عا/

(۵) محمد علی جناح (جناح کے حالات) از عبدالعزیز صاحب (۲۵۶) صفحات۔

(۶) سخنوران دکن (عہد عثمانی کے شعرا کا تذکرہ) از سید تسکین صاحب عابدی ۴۸۴ صفحات قیمت ۳/

(۷) اتاترک۔ باتصویر (مصطفٰے کمال مرحوم کی سوانحعمری) از محمد مرزا صاحب آزاد ۳۰۰ صفحات قیمت عا/

(۸) روح غالب۔ باتصویر (غالب کی سوانحعمری) از ڈاکٹر سید محی الدین صاحب زور ۲۴۰ صفحات قیمت عا/

(۹) مشاہیر ہند (چند مشہور لوگوں کے حالات) از سید بادشاہ حسین صاحب ۱۳۱ صفحات قیمت ۱۲/

(۱۰) حیات وکلیات اسمٰعیل باتصویر (محمد اسمٰعیل صاحب کی سوانح عمری معہ مجموعہ کلام) دوسرا ایڈیشن مرتبہ محمد اسلم صاحب سیفی ۶۷۸ صفحات قیمت للعہ

(۱۱) سر سید (سوانحعمری) مرتبہ انصار الحق صاحب ۴۶ صفحات قیمت ۵/

(۱۲) عہد حاضر کے بڑے لوگ حصہ اول و دوم باتصویر (مشہور سیاسی رہنماؤں کے حالات) ۲۵۶ صفحات قیمت ۱۲/

(۱۳) سیرت سید احمد شہید (سید احمد صاحب بریلوی کی سوانح عمری) از سید ابوالحسن علی صاحب ۴۶۴ صفحات قیمت عا/

(۱۴) آب حیات کے لطیفے (آزاد مرحوم کے حالات) از آغا محمد اشرف صاحب ۱۴۴ صفحات قیمت ۴/

(۱۵) رحمۃ اللعٰلمین جلد اول (آنحضرت کے حالات) از قاضی محمد سلیمان صاحب۔ ۴۶۴ صفحات قیمت عا/

(۱۶) مشاہیر پولیس (پنجاب پولیس کے چند افسروں کے کارنامے) از مرزا فرید الدین بیگ صاحب ۲۹۱ صفحات

(۱۷) رئیس قادیان حصۂ اول (مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کے حالات) ۲۱۴ صفحات

(۱۸) شہید کمسوینی (آئرش محب وطن کی سوانحعمری) ۱۴۴ صفحات

(۱۹) سیرت اقبال از محمد طاہر صاحب فاروقی ۳۴۹ صفحات قیمت ۲/

(۲۰) حیات اقبال (مرتبہ تاج کمپنی لاہور) ۱۵۲ صفحات قیمت ۱۲/

(۲۱) میری جد و جہد (ہٹلر کی خود نوشت سوانح عمری کا ترجمہ) ۲۶۵ صفحات قیمت عا/

(۲۲) حضرت امام حسینؓ کی مختصر سوانح عمری) از ظفر حسن صاحب ۲۳۲ صفحات

(۲۳) کمال اتاترک (محمد توفیق کی ترکی کتاب کا ترجمہ) ۲۸۸ صفحات قیمت عا/

(۲۴) واقعات اظفری (مترجمہ محمد حسین صاحب محوی لکچرار اردو مدراس یونیورسٹی۔ قیمت عا/

(۲۵) رسول پاک (از عبدالواحد صاحب سندھی) ۱۹۵ صفحات قیمت ۸/

(۲۶) میری کہانی میری زبانی (سید ہمایوں مرزا صاحب مرحوم بیرسٹر کی خود نوشت سوانح) مرتبہ محترمہ صغرا ہمایوں مرزا صاحبہ ۳۲۸ صفحات قیمت ۳/

(۲۷) شاہ نعمت اللہ ولی از یم۔ اے حفیظ ۸۰ صفحات - ۱۴/

(۲۸) خود نوشت سرگذشت (مسولینی کے حالات) ۲۸۶ صفحات قیمت ۱۲/

(۲۹) تذکرہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف (از مولوی فضل اللہ صاحب ۲۴۰ صفحات - قیمت عا/

(۳۰) محمد علی جناح (از احسان اللہ صاحب کرمانی) ۱۲۸ صفحات قیمت ۱۰/

(۳۱) لینن (مترجمہ ڈاکٹر محمد اشرف صاحب قیمت مجلد عہ
(۳۲) غالب با تصویر (غالب کی خودنوشت سوانح عمری)
مرتبہ چودہری غلام رسول صاحب مہر ...۴صفحات قیمت ہے
(۳۳) شعرائے پنجاب (پنجاب کے موجودہ شعرا کے حالات
معہ نمونہ کلام) مرتبہ ملک محمد باقر صاحب رضوانی ۷۰۰ صفحات
قیمت عہ
(۳۴) ہلال بمقابلہ صلیب (سلطان صلاح الدین کی سوانح) از ایم
اسلم صاحب ۲۵۰ صفحات قیمت عاں
(۳۵) گلبدن بیگم (شہزادی گلبدن کی سوانح عمری) از سید
ابن حسن صاحب شارق ۱۰۰ صفحات قیمت ۱۲ر
(۳۶) مشاہیر عالم (سولہ مشاہیر کے حالات) از کے ۔ ۔ ۔
حمید بیرسٹر ۲۳۶ صفحات قیمت عہ
(۳۷) وداع راشد (حیات راشد کا آخری باب) رزاق الخیری
۹۰ صفحات قیمت ۸ر

افسانے

۱۔ محبت کا فسانہ (از لطیف الدین احمد صاحب اکبر آبادی
۲۴۴ صفحات قیمت عاں
۲۔ ربیعہ (از خالدہ ادیب خانم مترجمہ عبدالرحیم صاحب
شبلی ۱۴۴ صفحات قیمت عہ۔
۳۔ پس پردہ (سات مختصر افسانے) از چندر بھوشن سنگھ
صاحب۔ ۱۲۸ صفحات قیمت عہ
۴۔ گئودان (ناول) از منشی پریم چند صاحب ۶۵۰
صفحات قیمت عاں۔ مکتبہ جامعہ دہلی۔
۵۔ میری کہانی! سنئے گا؟ از سید علی صاحب شاکر ۱۲۵
صفحات قیمت عہ

۶۔ انسپکٹر کی لڑکی (ناول) از ایم جیکب صاحب
۱۶۰ صفحات
۷۔ ماتا ہری۔ از خلیل احمد صاحب ۲۰۰ صفحات قیمت عہ
۸۔ لالہ رخ با تصویر۔ جدید اڈیشن مترجمہ لطیف الدین احمد
صاحب۔ قیمت مجلد عاں
۹۔ ساز ہستی (افسانہ) از عبدالاحد صاحب فہر ولن ۱۹۰
صفحات
۱۰۔ خدائی راج اور دوسرے افسانے۔ از علامہ
راشد الخیری صاحب مرحوم قیمت عہ
۱۱۔ افسانہ بابل از سردار محمد اقبال صاحب سیف ۱۶۰
صفحات قیمت ۱۲ر
۱۲۔ شب غم از میاں ایم۔ اسلم صاحب قیمت عہ
۱۳۔ پریت افسانے حصہ دوم از گربخش سنگھ صاحب
۲۵۵ صفحات۔
۱۴۔ ہاشمی دوشیزہ حصہ اوّل و دوم (عہد عباسی کا
تاریخی ناول) از محمد صادق حسین صاحب ۴۰۸ صفحات
۱۵۔ خودکشی کی انجمن (اسٹونس کے ناول سوئی سائڈ
کلب کا ترجمہ) از عبدالمجید خاں سالک ۲۰۴ صفحات
۱۶۔ زندگی کے کھیل (مختصر افسانے) از لطیف الدین
احمد صاحب ۱۶۰ صفحات قیمت عہ
۱۷۔ تسخیر استنبول (تاریخی ناول) از محمد مائل صاحب
۲۵۶ صفحات۔
۱۸۔ جنت اور جہنم (ناول) از کرشن چندر صاحب قیمت عاں
۱۹۔ باسی پھول۔ (افسانے) از سید علی عباس صاحب حسینی
۳۰۰ صفحات۔ قیمت عہ
۲۰۔ طلسم خیال۔ (افسانے) از کرشن چند صاحب ۲۵۰

صفحات قیمت عہر

۲۱۔ قطرات شبنم (افسانے اور ادبی مضامین) از لالہ گوردھن داس صاحب ۱۴۰ صفحات قیمت عہر

۲۲۔ خون ملت (تاریخی ناول) از محمد مائل صاحب ۳۷۶ صفحات قیمت عہر

۲۳۔ بیسویں صدی کی سیاہکاریاں (عبرت خیز افسانے) از یس۔ یس منور صاحب ۱۰۲ صفحات قیمت عمر

۲۴۔ سعی ناکام اور دیگر افسانے از امتہ الرفیق صاحبہ ۱۲۰ صفحات

۲۵۔ منزل۔ از علی سردار صاحب جعفری قیمت ۱۲ر

۲۶۔ انوکھے افسانے (جاسوسی افسانے) از شیخ بدرالاسلام صاحب فضلی ۲۰۰ صفحات

۲۷۔ کاشانہ نادر (ناول) از عطاء الرحمن صاحب عطا ۲۴۸ صفحات قیمت عہر

۲۸۔ اندھی دنیا۔ (کہانیاں) از اختر انصاری صاحب ۱۵۸ صفحات قیمت عمر

۲۹۔ لندن کی ایک رات (افسانہ) از سید سجاد ظہیر صاحب ۱۵۲ صفحات قیمت عمر

۳۰۔ خواب فراموش (انگریزی ناول کا ترجمہ) ۲۵۰ صفحات قیمت عمر

۳۱۔ ماہ درخشاں (ناول) از بیگم مرزا احمد علی صاحب ۵۵۰ صفحات قیمت مجلد عا؎

۳۲۔ قاتل (مختصر افسانے) از میاں محمد اسلم صاحب ۲۵۶ صفحات

۳۳۔ طلسم حیات (کہانیاں) از منظور حسین صاحب ماہر القادری ۲۰۴ صفحات قیمت مجلد عاہر

۳۴۔ جواہرات (اخلاقی افسانے) از چودھری افضل حق صاحب ۲۲۴ صفحات

۳۵۔ پری اور دیگر افسانے) از راحت آرا بیگم صاحبہ ۱۲۸ صفحات

۳۶۔ آئی۔ سی۔ یس۔ (اخلاقی افسانے) از سید عباس علی صاحب حسینی قیمت عہر

۳۷۔ دغا کا پتلا ("دی ریڈن آف آرسین لوپن" کا ترجمہ) از تیرتھ رام صاحب فیروز پوری ۲۷۴ صفحات قیمت عا؎

۳۸۔ خاموش حسن (ٹیگور کے افسانوں کا ترجمہ) ۲۳۲ صفحات قیمت عہر

۳۹۔ فریبی ڈاکو (جاسوسی ناول) از راجہ رام صاحب ۱۲۸ صفحات قیمت ۱۲ر

۴۰۔ لعل مقدس (دی اکیوزڈ پرنسس کا ترجمہ) از تیرتھ رام صاحب فیروزپوری ۳۲۴ صفحات قیمت عاہر

۴۱۔ من کی دنیا (جدید طرز کے افسانے) از رشید صاحب قریشی ۱۶۰ صفحات قیمت مجلد عمر

۴۲۔ بحری طوفان (ناول) از نعیم اللہ صاحب کوثر ۳۰۰ صفحات

۴۳۔ مسلمان مجاہد (ناول) از خواجہ نذیر احمد صاحب ۲۰۸ صفحات

۴۴ معیار محبت اور دیگر افسانے) از سیاح سنائی صاحب جزنلسٹ ۱۷۲ صفحات قیمت عمر

۴۵۔ سحر فرانس (مولیبان کے افسانوں کا ترجمہ) از طاہر قریشی صاحب ۳۲۵ صفحات قیمت عہر

۴۶۔ انمول کہانیاں (بارہ انقلابی افسانے) از شوکت عثمانی صاحب ۱۳۱ صفحات قیمت ۱۲ر

۴۷۔ کیلے کا چھلکا اور دیگر مضامین (مزاحیہ افسانے و مضامین) از سند باد جہازی صاحب ۱۷۶ صفحات قیمت عمر

۴۸۔ ایک کہانی۔ چہار درویشوں کی زبانی) از نیاز۔ ل۔ احمد علی عباس وغیرہ

۲۰۷ صفحات قیمت ۸/

۴۹- چوپال (دیہاتی افسانے) از احمد ندیم صاحب قاسمی ۲۰۴ صفحات قیمت عہ

۵۰- محبت کی چھاؤں (افسانے) از مرزا ظفر الحسن بی۔اے ۱۳۲ صفحات قیمت عہ

۵۱- ڈاچی (افسانے) از اپندر ناتھ اشک ۲۰۰ صفحات قیمت عمہ

۵۲- صدائے جرس (افسانے) از والدہ سراج الدین ظفر ۳۰۰ صفحات قیمت عہ

۵۳- افسانۂ پدمنی (از رانی پدمنی کے فسانہ کی مورخانہ تحقیق) از احتشام الدین ایم۔اے ۱۵۰ صفحات قیمت عمہ

ڈرامے

۱- ریڈیو ڈرامے (۸ ڈراموں کا مجموعہ) از فضل حق صاحب قریشی ۱۹۲ صفحات قیمت عمہ

۲- انار کلی (تیسرا ایڈیشن) از سید امتیاز علی صاحب تاج بی۔اے ۱۹۸ صفحات قیمت عہ

۳- تسلیم (المیہ ڈراما) از سید مظہر علی صاحب گیلانی ۱۹۰ صفحات قیمت ۸/

۴- پہلا شراب کار (ٹالسٹائی کے ڈرامہ کا ترجمہ) از محمد یونس صاحب سلیم ۴۰ صفحات قیمت ۴/

۵- بے انصافی کا انصاف (عدالتوں کی بے انصافیاں) از پنڈت دیودت صاحب شرما ۳۱۰ صفحات قیمت عمہ

شاعری

۱- باغی (باغیانہ نظمیں) از جاذ قریشی صاحب ۱۲۵ صفحات قیمت عمہ

۲- گلستان شرف (اردو و فارسی کلام کا مجموعہ) از سید ابو الفتح شرف الدین الحسینی صاحب شرف ۱۲۰ صفحات قیمت عمہ

۳- نور مشرق (نظمیں) از مہر لال صاحب ضیا فتح آبادی۔ ۱۳۶ صفحات قیمت عمہ

۴- نیرنگ فطرت (نظموں اور غزلوں کا مجموعہ) از پنڈت اندرجیت صاحب شرما ۲۰۱ صفحات قیمت عہ

۵- افکار سلیم (وحید الدین صاحب سلیم کی نظمیں) مرتبہ محمد اسمٰعیل صاحب پانی پتی ۳۱۸ صفحات قیمت عا/

۶- دیوان بیدار (میر محمدی صاحب بیدار کا مجموعۂ کلام) مرتبہ محمد حسین صاحب محوی صدیقی لکچرار اردو مدراس یونیورسٹی قیمت عا/

۷- جنون و حکمت (رباعیات کا مجموعہ) از جناب جوش ملیح آبادی قیمت ہے

۸- آہنگ (نظمیں) از اسرار الحق صاحب مجاز ۱۰۴ صفحات قیمت عمہ

۹- الخیام (عمر خیام کی رباعیوں کا اردو ترجمہ) از رائے گورسرن بی صاحب آزاد قیمت ۱۲/

۱۰- میخانۂ الہام (مجموعۂ کلام) از جناب شاد عظیم آبادی قیمت عہ

۱۱- ارمغان حجاز (علامہ اقبال کا آخری کلام) قیمت ہے

۱۲- نغمۂ حرم (نظمیں) از اختر صاحب شیرانی قیمت عہ

۱۳- آہ کے سو شعر از ڈاکٹر سید محمد صفدر صاحب آہ قیمت ۸/

۱۴- ترجمان الغیب (حافظ کی چھ سو غزلوں کا منظوم ترجمہ) از محمد احتشام الدین ایم اے ۳۲۲ صفحات قیمت عہ

۱۵- آہنگ رزم (رزمیہ نظمیں) از جناب وفا رانبالوی ۶۴ صفحات قیمت ۸/

۱۶- تصویر کشمیر (نظمیں) از جناب حفیظ جالندھری۔ قیمت ۸/

۱۷- خمخانۂ ازل (نعتیہ کلام) از محمد یونس صاحب جلیل ۹۶ صفحات قیمت عمہ

۱۸ - نغمۂ نور (غزلیں اور نظمیں) از جناب بہزاد لکھنوی ۲۰۰ صفحات قیمت عمر

۱۹ - بادۂ فطرت (مجموعۂ کلام) از میر زیدی صاحب ۲۸۸ صفحات قیمت ۱۲ر

۲۰ - حدیثِ حسن (نظمیں) از شمیم احمد صاحب فطرت قیمت عمر

۲۱ - اربعہ عناصر (رباعیات) از حکیم محمود علی خاں صاحب ماہر ۸۰ ۲ صفحات قیمت عمر

۲۲ - حرف و حکایات (نظمیں) از جناب جوش ملیح آبادی ۲۴۸ صفحات قیمت عار

۲۳ - قندیل نور (مرثیوں کا مجموعہ) از جناب نور لدھیانوی ۱۸۴ صفحات

۲۴ - دیوانِ ثاقب (از مرزا ذاکر حسین صاحب ثاقب لکھنوی ۵۵۰ صفحات قیمت عار

۲۵ - تصویر احساس (مجموعہ کلام) از الطاف مشہدی صاحب قیمت عار

۲۶ - ارمغان جذب حصہ دوم (رباعیات) از راگھو ندر راؤ صاحب جذب ۱۲۰ صفحات قیمت ۱۲ر

۲۷ - کلیات بحری (قدیم دکھنی شاعر) مرتبہ ڈاکٹر محمد حفیظ سید صاحب ۱۲۱۴ صفحات قیمت سے

۲۸ - ریاض حیدر (مرثیوں کا مجموعہ) از حیدر عباس صاحب رضوی ۲۰۰ صفحات

۲۹ - نغمۂ نانک (مجموعۂ کلام) از نانک چند صاحب نانک لکھنوی ۲۵۲ صفحات

۳۰ - تمثیلی مشاعرہ (مشہور قدیم شعرا کا کلام ڈرامائی طرز میں) از پنڈت کیفی صاحب ۱۰۰ صفحات قیمت عمر

۳۱ - سرودِ جاوید (مثنوی سحر البیان پر تبصرہ) از شمس الحسن صاحب شمس ۲۰۴ صفحات

۳۲ - جوہر تخلیق (شاہنامہ کی ایک جنگ کا منظوم ترجمہ) از سید محمد علی صاحب چشم ۸۹ صفحات قیمت ۸ر

۳۳ - شہنشاہ نامۂ اسلام (آنحضرتؐ او خلفا کے غزوات) ۲۱۵ صفحات

۳۴ - تنقیدی مضامین (شعرا کے کلام پر تنقید) از ایم - ایم - ہاشمی صاحب و فیاض حسین صاحب زیدی -

۳۵ - سرلی بانسری (مجموعہ کلام) از سید انور حسین صاحب آرزو ۲۰۰ صفحات قیمت عار

۳۶ - چراغاں (مجموعہ کلام) از جناب احسان دانش ۲۳۲ صفحات قیمت عہ

۳۷ - آتش خاموش (مجموعہ کلام) " " ۲۰۰ صفحات قیمت عمر

۳۸ - نفیر فطرت " " " ۲۰۰ صفحات قیمت عمر

۳۹ - جادۂ نو (قطعات) " " قیمت ۸ر

۴۰ - نوائے کارگر (مجموعہ کلام) " " ۲۶۸ صفحات قیمت عار

۴۱ - تفصیل غالب (دیوانِ غالب کی شرح) از جناب احسان دانش قیمت عمر

۴۲ - خضر عروض (علم عروض کی الجھنوں کا حل) از جناب احسان دانش قیمت ۸ر

۴۳ - فرحت دل (منتخب اشعار) از خان بہادر عبداللہ خاں ۱۷۲ صفحات قیمت عہ

۴۴ - معارف جمیل (مجموعہ کلام) از حکیم آزاد انصاری ۲۵۶ صفحات قیمت عہ

۴۵ - گل نغمہ (نظموں کا مجموعہ) از ڈاکٹر علیم الدین احمد علیم قیمت عار

۴۶ - جذبات بسمل با تصویر (مجموعہ کلام) از منشی سکھ دیو پرشاد

مجلد قیمت ۱۲؎

۴۷ - پیام روح باتصویر (مجموعہ کلام) از حامد اللہ افسر قیمت ۱؎

۴۸ - شعرائے عثمانیہ (مرقع سخن کی چوتھی جلد) مرتبہ سید معین الدین قریشی و عبدالقیوم خاں باقی ۲۳۱ صفحات قیمت ۱؎/۱۲

۴۹ - عرفانیات فانی (کلیات) از شوکت علی خاں فانی قیمت ۸؎

۵۰ - خونابۂ دل (مجموعہ کلام) از شعیب احمد ندرت میرٹھی قیمت ۱؎

۵۱ - خمخانہ (مجموعہ کلام) از گورسرن بی آزاد ۲۱۲ صفحات قیمت ۸؎/

۵۲ - متاع اقبال (اقبال کی شاعری پر تبصرہ) از ابو ظفر عبدالواحد قیمت ۱؎۴

۵۳ - تقلقہ (غزلوں اور نظموں کا مجموعہ) از حاجی لق لق قیمت ۱؎۴

۵۴ - برق و باراں (انقلابی نظمیں) از شمیم کرمانی قیمت ۱؎۴

۵۵ - کائنات دل (نظمیں) از منور لکھنوی ۳۵۰ صفحات

۵۶ - اقبال اور اس کا پیام (شاعری پر تبصرہ) از ڈاکٹر تصدق حسین خالد قیمت ۸/

۵۷ - یاد حکمت (حکمت اور ان کی شاعری پر مضامین) از پنڈت آنند نرائن ملا ۱۷۱ صفحات

فلسفہ

۱) فہم انسانی (ہیوم کی مشہور کتاب کا ترجمہ) ۴۱۹ صفحات

۲ - خواب کی دنیا (خواب کی ماہیت اور اس کا فلسفہ) از عبدالمالک صاحب ۱۹۰ صفحات قیمت ۸؎

۳ - فلسفۂ حسن از مست رام صاحب ۱۹۶ صفحات

۴ - حیات کیا ہے (حیات کی ابتدا، اور اس کے ارتقا پر تبصرہ) قیمت ۸؎

تاریخ

۱ - (دہلی کی دو سو برس کی تاریخ) از سید حسن صاحب برنی ۱۵۴ صفحات

۲ - تاریخ مدینہ منورہ از غلام دستگیر صاحب نامی ۱۸۴ صفحات

۳ - نور المبین (فرقہ اسماعیلیہ کے ائمہ کے تاریخی حالات) از علی محمد خان صاحب ۸۰۰ صفحات قیمت ۱؎

۴ - دنیا کی کہانی (تاریخی تقاریر کا مجموعہ) از پروفیسر محمد مجیب صاحب ۲۲۷ صفحات قیمت ۱؎

۵ - مسلمانوں کا روشن مستقبل (تین سو برس کی تاریخ) از سید طفیل احمد صاحب علیگ ۶۰۸ صفحات قیمت ۱؎

۶ - تاریخ گولکنڈہ باتصویر (مشہور تاریخی قلعہ گولکنڈہ کے حالات) از پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی ۱۴۲ صفحات قیمت ۸؎/

۷ - شجرۂ آصفیہ (شجرۂ خاندان آصفی) از حکیم سید شمس اللہ صاحب قادری ۹۵ صفحات معہ متعدد شجرے قیمت ۸؎

۸ - مسلمانوں کا ایثار اور آزادی کی جنگ (اسلامی سیاسیات کی تاریخ) از عبدالوحید خانصاحب ۴۵۲ صفحات

۹ - تاریخ نظم و نثر از آغا محمد باقر صاحب ۳۱۶ صفحات

۱۰ - مرقع ملتان از سید محمد اولاد علی صاحب گیلانی ۱۴۶ صفحات

۱۱ - مدراس میں اردو۔ از نصیر الدین صاحب ہاشمی ۲۰۰ صفحات قیمت مجلد ۸؎

۱۲ - تاریخ ائمہ (انبیا رکرام و ائمہ طاہرین کے حالات) از سید علی حیدر صاحب ۴۰۵ صفحات قیمت ۱؎

۱۳ - تاریخ اسلامی ہند از جناب نیاز فتحپوری ۲۴۲ صفحات قیمت ۱؎/۴

۱۴ - تاریخ ملت (ایام جاہلیت سے خلافت راشدہ تک کی تاریخ) از مسلم صاحب دہلوی ۳۲۸ صفحات

۱۵۔ برطانوی ہند کی تاریخ اور اس کے مورخین۔ از ڈاکٹر سر شفاعت احمد خانصاحب ۱۰۴ صفحات

۱۶۔ انقلاب حبش (حبش پر اطالیہ کے مظالم) از محمد اشرف خانصاحب ۔عطا قیمت ۱۲؍

ادب

۱۔ پیام اقبال (علامہ اقبال کے پیام پر مضامین) ۳۰۰ صفحات قیمت عاؔ

۲۔ صحرا نورد کے خطوط از مرزا ادیب صاحب ۵۰۰ صفحات قیمت عہ

۳۔ مضامین فراق از خواجہ سید ناصر نذیر صاحب فراق ۱۶۰ صفحات قیمت عصہ

۴۔ مضامین رشید (مزاحیہ) از رشید احمد صاحب صدیقی ۳۲۲ صفحات قیمت عاؔ

۵۔ مضامین فلک پیما از خان بہادر میاں عبدالعزیز صاحب ۳۰۸ صفحات قیمت عاہ

۶۔ فلکش (مزاحیہ مضامین) از سید ابوطاہر داؤد صاحب ۲۵۶ صفحات قیمت عہ

۷۔ مطائبات (فکاہی مضامین) از چراغ حسن صاحب حسرت ۱۱۶ صفحات عصہ

۸۔ جوہر اقبال (مجموعہ مضامین) از ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب وغیرہ قیمت عہ

۹۔ بکھری ہوئی پتیاں (مجموعہ مضامین) از علامہ راشد الخیری صاحب مرحوم قیمت عصہ

۱۰۔ مقالات شبلی جلد ہشتم از مولانا شبلی نعمانی مرحوم ۲۰۲ صفحات

۱۱۔ مکاتیب مہدی (مہدی حسن صاحب کے خطوط) مرتبہ مہدی بیگم صاحبہ ۲۰۳ صفحات قیمت ؎

۱۲۔ قطرات شبنم (مجموعہ مضامین) از گوردھن داس صاحب بی۔اے ۱۴۴ صفحات

۱۳۔ تاریخ و تنقید (مضامین کا مجموعہ) از پروفیسر عابد حسن صاحب ۲۲۴ صفحات قیمت عہ

۱۴۔ شمع راہ (خطبات) از پروفیسر محمد سجاد مرزا بیگ صاحب ۱۱۵ صفحات قیمت ۱۰؍

۱۵۔ نوجوان اور مفلسی (اصلاحی مضامین) از سید صابر حسین صاحب قیمت ۱۰؍

۱۶۔ ہندوستانی (ریڈیو تقاریر) از ڈاکٹر تارا چند صاحب وغیرہ قیمت ۱۲؍

۱۷۔ راز و نیاز۔ از سلطان احمد صاحب۔ جودی قیمت عصہ

۱۸۔ موتی (اقوال کا مجموعہ) از سید یوسف صاحب بخاری ۱۷۰ صفحات قیمت ۱۲؍

۱۹۔ محاورات اردو۔ از حافظ عبدالکریم صاحب مفتون ۱۴۴ صفحات قیمت ۸؍

۲۰۔ اصلاح ادب (اردو زبان کی غلطیاں) از غلام حیدر صاحب

۲۱۔ نقوش سلیمانی (مضامین و تقاریر کا مجموعہ) از مولانا سلیمان صاحب ندوی ۴۷۶ صفحات قیمت عاہ

۲۲۔ مقالات ہاشمی۔ از نصیرالدین صاحب ہاشمی ۴۴۴ صفحات قیمت عللہ

۲۳۔ مجنوں کے خطوط از عطاء الرحمن صاحب عطا علیگ ۳۰۰ صفحات قیمت عاؔ

۲۴۔ سنہرا حلقہ (ایک خاتون کے خطوط) از ناظر صاحب کاکوری ۸۰ صفحات

طب

۱۔ کلیات ادویہ از حکیم کبیر الدین صاحب ۵۹۰ صفحات قیمت مجلد صہ

۲۔ تحفۂ نایاب (مجرب نسخے) از محمد عبدالرحیم صاحب جمیل ۵۴۴ صفحات قیمت

۳۔ شاہراہ تندرستی (صحت و امراض کا ترجمہ) از لالہ رنگ بہاری لال صاحب ۱۲۰ صفحات

۴۔ بچوں کی بیماریاں از ڈاکٹر سید ممتاز حسین صاحب ۲۰۰ صفحات قیمت عصہ

۵۔ طبیب نسواں معہ رہنمائے دایاں از حاجی اصغر علی صاحب ۱۹۲ صفحات

۶۔ اسرار جیلانی از حکیم غلام جیلانی صاحب ۴۰۰ صفحات

۷۔ پاکٹ ڈاکٹر (دوسرا ایڈیشن) از محمد عبدالرحمن صاحب ۲۱۰ صفحات

۸۔ کفیل صحت از محمد خلیل شاہ صاحب ۷۹ صفحات

۹۔ نیا علم شفا بخشی (نواں ایڈیشن) از لوئیس کوھینی ۵۲۶ صفحات

۱۰۔ گنجینۂ طبیب حصہ چہارم از حاجی اصغر علی صاحب ۹۶ صفحات

۱۱۔ گلزار رحمت از حکیم وزیر چند صاحب ۱۱۸ صفحات

۱۲۔ مشیر الصحت عرف دیہاتی چٹکلے (چند مجرب نسخے) از میر مصطفےٰ علی صاحب دوم تعلقدار نلگنڈہ

۱۳۔ گربہ شاستر (ضبط تولید اور زچہ و بچہ کی حفاظت) ۲۰۵ صفحات

۱۴۔ مرقع جمیل از محمد عبدالرحیم صاحب جمیل ۲۲۸ صفحات

۱۵۔ تہذیبی نسخے۔ (تہذیب نسواں کے نسخوں کا مجموعہ) ۲۴۸ صفحات

۱۶۔ ہومیو علاج (ہومیوپیتھی علاج کے متعلق) ۹۲۳ صفحات

۱۷۔ ضبط تولید و اصلاح نسل مرتبہ حکیم عبدالحمید صاحب دہلوی ۳۰۰ صفحات قیمت ۱۲ر

۱۸۔ خوراک صحت (مہاتما گاندھی کے تجربات) ۱۷۶ صفحات قیمت ۱۲ر

سیاسیات

۱۔ حکومت خود اختیاری اور ہند کے مسلم مسئلہ کا حل از طفیل احمد صاحب ۲۵۲ صفحات

۲۔ ترکی جمہوریہ (ترکی کی سیاست) از ضمیر احمد صاحب ہاشمی ۳۶۴ صفحات

۳۔ کمیٹی دستوری اصلاحات کی رپورٹ (حیدرآباد کے دستوری اصلاحات) مرتبہ سید یوسف علی صاحب معتمد کمیٹی ۱۶۴ صفحات قیمت عہر

۴۔ تحریک ترقی مملکت آصفیہ از خواجہ حمید احمد صاحب ایم اے عثمانیہ ۱۳۳ صفحات قیمت سے

۵۔ سیاسیات کی پہلی کتاب از محمد عاقل صاحب ایم اے ۶۰ صفحات ۵ر

۶۔ مسلمانان ہند کی سیاست وطنی از محمد امین صاحب زبیری ۲۱۹ صفحات قیمت ۱۰ر

۷۔ شیطان کا انتقام (دور حاضر کے سیاسی حالات) از محمد جلال الدین صاحب اشک ۹۰ صفحات قیمت عصہ

۸۔ جمعیۃ الاقوام پر ایک نظر (جمعیۃ الاقوام کے مقاصد اور عمل کا جائزہ) ۸۰ صفحات

۹۔ متاع حق (اسلامی سیاست) از سید امیر احمد صاحب ۱۵۸ صفحات قیمت ۸ر

۱۰۔ جدید جغرافیہ پنجاب (پنجاب کی سیاست پر مزاحیہ تبصرہ) ازسند باد جہازی قیمت عمہ

قانون

۱۔ قانون اسٹامپ حصہ اول از گردھاری صاحب ساگر ۲۴۴ صفحات

۲۔ آئین حکومت ہند (دوسرا ایڈیشن) از عبدالمجید خاں صاحب سالک بی۔ اے۔ ۲۰۴ صفحات

۳۔ تحفہ نمبر ۳ (قانون وراثت) از رلیا رام صاحب ۱۹۲ صفحات۔

۴۔ میڈیکل جورس پروڈنس از محمد سلیمان صاحب قریشی ۱۱۰ صفحات۔

۵۔ معاشدار (عطیہ معاش کی وضاحت) از کاشی ناتھ راؤ صاحب وکیل نظام آباد قیمت عہ

دینیات

۱۔ مذاہب اور انسانیت (بارہ مختلف مذاہب کے اصول) از لالہ ہردیال صاحب ۲۰۸ صفحات قیمت عہ

۲۔ اظہار حقیقت از مجبور صاحب چشتی ۱۰۴ صفحات

۳۔ بچوں کے لئے رامائن از پروفیسر رام سروپ صاحب ۲۲۸ صفحات

۴۔ عرفان نانک (سکھوں کی دعا کا ترجمہ) از برج لال سنگھ صاحب بیدی ۲۲۲ صفحات

۵۔ جیون چرتر (مذہبی ہدایات) از سوامی بھگوان سنگھ صاحب ۳۰۷ صفحات

۶۔ ید بیضا (اسلام اور مسلم سوسائٹی پر مضامین) از ڈاکٹر سید نجم الدین احمد صاحب جعفری ۱۴۰ صفحات

۷۔ تاثیرات قادیان از ملک فضل حسین صاحب ۲۴۴ صفحات

۸۔ گیتا امرت (ماخوذ از بھگوت گیتا) از چودھری روشن لال صاحب ۲۳۸ صفحات قیمت ۶ر

۹۔ فن تفسیر از مرزا عزیز صاحب قیصانی ۲۰۰ صفحات

۱۰۔ ہندوستانی اسلام (دو خاص مذاہب کی تاریخی حیثیت) از قاضی اظہار الدین صاحب ۵۰ صفحات قیمت ۶ر

۱۱۔ مدح صحابہ اور تبرا (اقتباسات اخبار مدینہ) ۹۶ صفحات قیمت ۴ر

۱۲۔ اسلامی نظام تعلیم از ریاست علی صاحب ندوی ۵۶ صفحات

۱۳۔ نغمۂ توحید از سری سچدانند سدگرو یوگی راج ۲۰۰ صفحات قیمت عہ

۱۴۔ پیام امین (کلام اللہ کی تدوین اور اس کی تعلیم) دوسرا ایڈیشن از محمد عبداللہ صاحب منہاس ۲۰۴ صفحات قیمت عہ

۱۵۔ اسلام میں غلامی کی حقیقت از سعید احمد ایم۔ اے ۲۶۲ صفحات قیمت عالہ

۱۶۔ مقدس قانون۔ از ناصر الدین رشید ترابی قیمت ۱۰ر

۱۷۔ تنقیحات (اسلام اور مغربی تہذیب پر تبصرہ) از سید ابوالاعلیٰ مودودی ۲۴۴ صفحات قیمت ۱۲ر

اخلاقیات

۱۔ انسان (انسان اور انسانیت کے متعلق) از کاشی ناتھ رام صاحب چاؤلہ ۳۰۰ صفحات قیمت ۸ر

۲۔ مخزن اخلاق (پانچواں ایڈیشن) از رحمت اللہ صاحب سبحانی

۴۸۰ صفحات

ریاضیات

۱۔ فہمید حساب حصہ دوم از ایم اے نذیر صاحب ۱۸۶ صفحات
۲۔ کرشنا میکنیکل گائیڈ از پنڈت کشن چند صاحب سردار ۳۳۰ صفحات

سفرنامہ

۱۔ سفرنامہ حکیم ناصر خسرو۔ مرتبہ صرمتہ اللہ صاحب کہانی ۱۵۰ صفحات
۲۔ سیر کشمیر۔ از کوبراج بلونت سنگھ صاحب ۲۳۶ صفحات قیمت عہ
۳۔ اندرون ہند خالدہ ادیب خانم کی انگریزی کتاب ان سائڈ انڈیا کا اردو ترجمہ از سید ہاشمی قیمت سے

نفسیات

۱۔ مظاہر ذہنیات از ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب ۱۸۴ صفحات قیمت عا

نسوانی ادب و خانہ داری

۱۔ نذر دکن۔ (سب رس کے دکن نمبر کا ضمیمہ نسواں) مرتبہ محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ ۴۰ صفحات قیمت عہ
۲۔ بڑھاپے کی برکتیں اور عورت از خواجہ عبدالحمید صاحب دہلوی ۹۶ صفحات قیمت عمر
۳۔ علم خانہ داری از محترمہ ممتاز شاہنواز صاحبہ ۷۰ صفحات قیمت عمر
۴۔ گلزار درخشاں (دستکاری کے متعلق) از آر۔ کے درخشاں صاحبہ قیمت عمر
۵۔ ہندوستانی کشیدہ کاری۔ از مس امتہ اللہ قیمت عمر

۶۔ مراۃ العروس (جدید ایڈیشن) از مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم ۲۳۲ صفحات قیمت ۱۲
۷۔ نبات النعش (جدید ایڈیشن) از مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم ۲۳۰ صفحات قیمت ۱۲
۸۔ توبۃ النصوح (جدید ایڈیشن) از مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم ۲۲۷ صفحات قیمت ۱۲
۹۔ مسلمان عورت کے حقوق از علامہ راشد الخیری صاحب مرحوم قیمت ۱۲
۱۰۔ ساجن موہنی (تسخیر شوہر کے طریقے) از علامہ راشد الخیری صاحب مرحوم قیمت ۴
۱۱۔ من کی بیتا (اصلاح معاشرت) از محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ۔ ایم۔ اے ۸۸ صفحات قیمت ۸
۱۲۔ محکومیت نسواں (حقوق نسواں) از معین الدین صاحب انصاری قیمت عمر
۱۳۔ مکمل باورچی خانہ از فہمیدہ خاتون صاحبہ۔ فرحت ۲۰۰ صفحات قیمت ۱۲
۱۴۔ سوتیلی ماں۔ از رابعہ بیگم صاحبہ۔ شعبہ نسوان ادارہ ادبیات اردو۔ ۵۶ صفحات قیمت ۴

لغت

۱۔ فرہنگ عامرہ۔ (عربی۔ فارسی اور ترکی کی لغات کا فرہنگ) از محمد عبداللہ خاں صاحب قریشی ۵۸۲ صفحات قیمت عا
۲۔ مبادی اللغات (اردو لغت) از فیض محمد صاحب ۱۹ صفحات

صنعت و حرفت

۱۔ روپیے بنانے کی مشین (صابن سازی فوٹوگرافی وغیرہ)

ازیم۔آر انند ۱۱۲ صفحات

۲۔انڈین ماسٹرآف کڑبا تصویر (لباس کی کتربیونت) قیمت ۲/۱ عہ

۳۔ وصلی کی دستکاری از سید رضا احمد صاحب جعفری ۵۶ صفحات قیمت ۸/

۴۔ لکڑی کا باریک کام از سید رضا احمد صاحب جعفری ۵۸ صفحات قیمت ۸/

۵۔ صنعت وحرفت کے قیمتی راز از مہانندجی قیمت عہ

۶۔ ہندوستان کی صنعت وتجارت ازمنت اللہ صاحب رحانی ۲۱۳ صفحات

معاشیات

۱۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت کے بعض معاشی اور مالی پہلو۔ ازڈاکٹر زین الدین احمد صاحب ۱۵ صفحات قیمت ۸/

۲۔ اجتماعی زندگی کی ابتدار از محمد عاقل صاحب ۱۱۲ صفحات

تعلیم

۱۔ رہنمائے اساتذہ ازلیارام صاحب ۲۵۶ صفحات

۲۔ بنیادی قومی تعلیم کا نصاب از ذاکر حسین صاحب ۲۴۰ صفحات قیمت عہ

۳۔ اردو مضمون نویسی از پروفیسر نانک پرشاد صاحب بی۔ اے قیمت ۸/

متفرق

۱۔ کرشمۂ روحانی از محمد شریف صاحب ۹۶ صفحات

۲۔ تلوار (متعلق شمشیرزنی) از کپتن اعجاز علی صاحب شہرت قیمت ۶/

۳۔ لذت شادی۔ از بی چندر صاحب بکل ۱۶۰ صفحات

۴۔ کالاعلم۔ (طلسمات پر ایک مصری کتاب کا ترجمہ) ۲۱۶ صفحات۔

۵۔ ترکاری۔ از جی۔ ایم ملک صاحب ۲۰۸ صفحات

۶۔ معلم پٹوار از آغا نثار احمد صاحب ۲۴۴ صفحات

۷۔ چوپائے اور انسان از موہن لال صاحب ۱۷۶ صفحات

۸۔ انسداد گداگری از سلطان محمد صاحب قیمت ۸/

۹۔ اسلامی سپہ گری از عبدالکریم صاحب قیمت عمر

۱۰۔ سکھی کسان از عبدالحمید صاحب تحصیلدار آرمور نظام آباد ۱۹۳۱ صفحات ۱/

۱۱۔ بوہیریہ (مہاتما گاندھی کے تجربات) ۹۶ صفحات قیمت ۹/

۱۲۔ گرہست جیون (") ۵۰۱ صفحات قیمت ۱۲/

۱۳۔ یورپ کے تاثرات (انگلستانی اہل قلم کے تاثرات) مرتبہ بدر شکیب بی۔ اے ۱۹۰ صفحات قیمت عمر

۱۴۔ مغربی تصانیف کے اردو تراجم از میرحسن ایم اے ۱۴۳ صفحات قیمت عہ

۱۵۔ نئے مسائل (فکروعمل کی نئی راہیں) از محمد مرغوب الدین بی۔ اے قیمت ۸/

مرزا سیف علی خاں

ضلع

(یہ مضمون حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن سے نشر کیا گیا تھا)

ضلع سے میری مراد ضلع عثمان آباد، ضلع بیڑ یا ہندوستان کے کسی خاص ضلع سے نہیں ہے بلکہ ضلع سے میرا مقصد اس صنعت سے ہے جسے گھٹیا درجہ کے شعراء اپنے شعروں میں اور بڑھیا درجہ کے خوش مذاق اصحاب ظرافت پیدا کرنے کے لئے عام طور پر اپنی گفتگو میں استعمال کرتے ہیں۔

اس صنعت کا دوسرا نام رعایتِ لفظی ہے اور عام طور پر اس میں ایسے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں جن کو دوسرے الفاظ کے ساتھ محض ایک لفظی تعلق ہوتا ہے مگر ان کے معنوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مثلاً کسی کا شعر ہے کہ

سن کے چرچا غیر نے جاکے چھچھوندر چھوڑ دی گھر جلا عاشق کا ان لوگوں کا کیا ٹوٹا ہوا

یہاں چھچھوندر چھوڑنے کے معنی شگوفہ چھوڑنے کے ہیں اور ٹوٹے کے معنی نقصان کے ہیں مگر چھچھوندر اور ٹوٹا آتش بازی کے نام بھی ہیں اس لئے، گھر جلا، چھچھوندر اور ٹوٹا ضلع کے الفاظ ہیں اور ان میں ایک دوسرے سے مناسبت ہے

اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ جس چیز کا نام لیا جائے، وہ ایک سالم لفظ سے ظاہر ہو جائے جیسے کہ یہ ایک مشہور لطیفہ ہے کہ

جج بھی کانا تھا اور ملزم بھی کانا تھا۔ ملزم نے جج کی طرف دیکھا اور ہاتھ جوڑ کر عرض کی کہ حضور! ہم چشموں پر چشم عنایت چاہیے۔ جج نے کہا کہ ہم سب کو ایک آنکھ دیکھتے ہیں۔ ملزم نے کہا کہ یہ تو حضور کی عین منصفی ہے

اس کی دوسری قسم میں الفاظ اس قدر کھینچ تان کر بٹھائے جاتے ہیں کہ ان کی ہڈیاں پسلیاں ٹوٹ جاتی ہیں مثلاً امانت کا یہ مشہور شعر ہے کہ

ہم کو ہو زہر غیر کو مصری کی ڈلی ہو ایسی نہ بات آپ زباں سے نکالئے

یہاں دوسرے مصرع میں نہ بات کا لفظ، زبان سے نکالتے وقت نبات ہو جاتا ہے۔ جس کے معنی مصری کے ہیں اور زہر، مصری، نبات، یہ سب ضلع کے لفظ ہیں۔

آپ نے وہ شعر تو سن لیا جس میں زبردستی کھینچ تان کر ضلع باندھا گیا تھا اب ایک چھوٹی سی اسی نمونے کی گفتگو بھی سن لیجئے۔

ایک صاحب استرہ خریدنے گئے۔ دوکاندار نے قیمت زیادہ بتائی۔ خریدار نے کہا کہ میاں تم تو مونڈھتے ہو (یعنی دوکاندار کو حجام بنایا) دکاندار نے تڑ سے جواب دیا کہ حضور ہم اس طرح سے مونڈھتے ہیں اور آپ اُس طرح سے مونڈھتے ہیں (یہاں "اُس طرح" سے تلفظ کرتے وقت اُسترے سے ہو جاتا ہے)

ابتداء میں شعراء نے اس دل لبھانے والی صنعت کو اس خوبی سے پیش کیا کہ ہر شخص اس پر لٹو ہو گیا

چند روز کے بعد بازار میں چل نکلی اور ایسی چلی کہ ہر شخص اس کا سودائی بن گیا۔ اس لئے بعض شعرا نے تو اس قدر گریز کی کہ اس کو حدود شاعری سے ہی خارج کر دیا اور بعض نے اس قدر وسعت دی کہ کشور شعر سخن کا رکن اعظم بنالیا۔

غالب کی مشہور و معروف غزل کا مصرع ہے کہ "ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پاؤں" اکثر ضلع بازوں کا خیال ہے کہ یہاں ہیہات، پانو کی مناسبت سے ضلع کے طور پر بٹھایا گیا ہے۔

مگر ان کے بعض واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں ضلع جگت کا زیادہ شوق نہیں تھا۔ چنانچہ یہ ایک مشہور واقعہ ہے کہ ایک روز کوئی صاحب ان سے ملنے آئے۔ کلام کی بہت تعریف کی اور کہا کہ آپ کا یہ شعر مجھے دور دراز سے کھینچ کر لایا ہے پھر یہ شعر پڑھا۔

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی میرے شیر شاباش رحمت خدا کی

چونکہ یہ شعر غالب کا نہیں تھا اور اسد کی رعایت سے شیر کو کہاں خاطر میں لاتے تھے اس لئے استاد مسکرائے اور کہا کہ جناب جس بزرگ کا یہ شعر ہے ان پر بقول ان کے رحمت خدا کی اور یہ میرا شعر ہے تو مجھ پر لعنت خدا کی۔

غالب سے پیشتر بھی اکثر شعرا نے ضلع بولنے والوں پر چوٹیں کیں ہیں۔ چنانچہ سودا فرماتے ہیں۔ کہ

پکڑی جو شور سے نے کہیں کھیتی سے چڑیا سمجھا کہ نہیں باز کوئی مجھ سا کلاں گیر
استاد کی ان کے ہے انھوں کو یہ نصیحت لفظی نہ تناسب ہو تو کچھ مت کرو تحریر
اتنا تو تلازم رکھو الفاظ کا ملحوظ بے پنجہ و ناخن نہ لکھو دودھ کو تم شیر
جب تک کہ نہ منظوم ہو پاسنگ ترازو باندھو نہ کبھی شعر میں تم لفظ شکم سیر

یہاں پنجہ، ناخن، شیر، پاسنگ، ترازو، اور شکم سیر یہ سب ضلع کے الفاظ جنہیں اعتراض کے پردے میں لکھ کر استاد نے خود اپنا ذوق سلیم بھی بتا دیا ہے۔

بہرحال اس لے دے کے باوجود اس وقت ہزاروں غزلیں، ہزاروں قصیدے اور ہزاروں مثنویاں اس صنعت میں بھری پڑی ہیں اور پھر ضلع بازوں نے تو وہ وہ دریا بہائے ہیں کہ شعرا کے کارناموں پر بھی پانی پھیر دیا ہے۔

جس طرح اکثر لوگ بیت بازی اور دوسرے مشاغل میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں اسی طرح بعض اصحاب ضلع بازی میں اپنا وقت گزارتے رہتے ہیں جہاں دو آدمی مل کر بیٹھے اور ضلع شروع ہوگیا۔ مثلاً کسی صاحب نے حقہ پیتے پیتے سرکایا اور یار لوگوں نے حقہ پر ضلع شروع کر دیا۔ اب حقہ سے متعلق جتنی چیزیں ہیں دماغ سے اترنی شروع ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ حقہ سے مناسبت رکھنے والے الفاظ یہ ہیں۔

اپنا کوئی ہمدم ہے نہ دمساز دمڑے میں دم نہیں اب خیر مانگو جان کی۔ این گل دیگر شگفت بندہ ہر دم تازہ

رہتا ہے۔ دل کی کلی کھلی رہتی ہے۔ گرما گرمی اور شکر شکر ہی ہے۔ اگر کوئی میرے منہ کو آئے تو منہ نالی میں دے دوں۔ ہمارا خدا ضامن ہے۔ وہ عالی دودمان ہے۔ چلمن سے لگے بیٹھے رہو۔ وہ منہ نیچا کئے ہوئے باہر نکل گئے جس کو پیا چاہے وہ سہاگن ہے۔ سانچ کو کیا آنچ ہے۔ سخن تازہ فرمائیے۔ جواب تلخ۔ سوختہ جاں۔ زنجیر پا۔ خشک و تر ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر درآید۔ بے کلی سر پہ توا باندھ کر آؤ۔ دھواں لیگ۔ اللہ سے تو لگائے رہو۔ فقیر کا کمبل وغیرہ وغیرہ۔

بظاہر ان الفاظ میں نہ تو کوئی ظرافت معلوم ہوتی ہے اور نہ اس قدر دم کہ ظرافت کا عنصر اور تفنن طبع کا ذریعہ بن سکیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اگر برمحل اور برموقع کسی گفتگو کے سلسلہ میں ضلع کے الفاظ بٹھا دئے جائیں تو پھر اٹھائے نہیں اٹھتے بلکہ تلازمہ کی آڑ میں جو چاہو کہہ جاؤ بقول شخصے سات خون معاف ہیں۔

نمونے کے طور پر ہم آپ کو چند قصے سناتے ہیں، جن میں ضلع کا چٹخارہ دے کر ظرافت پیدا کی گئی ہے وہ آپ بھی سنئے اور لطف اٹھائیے۔

ایک صاحب کسی چرب زبان جوتے والے کی دکان پر پہنچے۔ دکاندار نے کہا کہ کیا حکم ہوتا ہے خریدار نے کہا کہ ایک جوڑے کی ضرورت ہے۔ دکاندار نے کہا کہ حضور تو نری کا چاہتے ہونگے۔ خریدار نے کہا کہ مجھے وصلی کا درکار ہے۔ ذرا خوش رنگ اور مضبوط تلے کا ہو۔ دکاندار نے کہا کہ آپ اس کی فکر نہ کیجئے۔ پھر چند جوتوں کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ دیکھئے وہ جوتے جو آپ کے سامنے پڑے ہیں، خوش رنگ بھی ہیں مضبوط بھی ہیں اور بڑی بات یہ ہے کہ آپ کو بہت سستے پڑیں گے۔ خریدار نے قیمت دریافت کی تو کچھ زیادہ بتائی۔ اس پر خریدار نے کہا کہ آج کل تو آپ لوگ بے حساب کھانے لگے ہیں۔ اول تو صرف چار آنے جوتا کھاتے تھے مگر اب تو یہ کیفیت کہ آپ ایک ایک روپیہ جوتا کھاتے ہیں اور پھر بھی آپ کا پیٹ نہیں بھرتا۔

دکاندار نے کہا حضور! ہم اپنے جوتے زبردستی کسی کے سر تھوڑی مارتے ہیں۔ یہ تو خوشی کا سودا ہے۔ اگر پسند ہو تو یہ حاضر ہیں ورنہ جہاں آپ کو سستے پڑیں وہاں جا کر آپ بخوشی لے سکتے ہیں۔

اسی قسم کی ایک اور گفتگو ملاحظہ فرمائیے۔

ایک حجام کا لڑکا کسی بڑے عہدہ پر پہنچ گیا۔ ایک روز خفا ہو کر اس نے منتظم دفتر پر جرمانہ ٹھوک دیا۔ منتظم صاحب جوش میں بھرے ہوئے ان کے گھر پہنچے اور کہا کہ سرکار نے تو الٹے استرے سے میرا سر مونڈھ دیا۔ افسر صاحب نے کہا کہ ذرا سوچ سمجھ کر بات کرو۔ منتظم صاحب نے کہا کہ اب اور کیا سوچوں، صاف صاف کہتا ہوں پوست کندہ کہتا ہوں اگر بال برابر بھی فرق ہو تو آپ میری ڈاڑھی مونچھیں حقے کے پانی سے مونڈھ دیجئے گا۔

اس طرح ایک عرب کا قصہ مشہور ہے کہ وہ بارش کے موسم میں کسی ظریف کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ رستے میں ظریف نے پوچھا کہ تمہارا کیا نام ہے۔ جواب دیا کہ مطر پوچھا کنیت، اس نے کہا کہ ابو الفیض پھر ظریف نے پوچھا کہ

تمہارے باپ کا کیا نام ہے اس نے جواب دیا کہ ابوالغیث پھر پوچھا کہ تمہاری ماں کا کیا نام ہے۔ اس نے جواب دیا کہ سحاب پوچھا کنیت۔ جواب دیا کہ ام آبحر ظریف یہ سن کر رک گیا اور کہا کہ ذرا ٹھیر جا۔ میں ابھی ایک کشتی لے آتا ہوں۔ ورنہ تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے ڈوبے گا۔ ظریف کے منہ سے یہ فقرہ سن کر وہ ترنم سے پانی پانی ہوگیا

کسی ظریف کا قصہ مشہور ہے کہ وہ کسی درویش کے ہاں مہمان ٹھیرا۔ درویش کا مکان بہت پرانا تھا اور چھت میں سے چٹ چٹ کی آوازیں آتی تھیں۔ ظریف نے گھبرا کر پوچھا کہ خیر تو ہے، قبلہ یہ کیا ماجرا ہے؟ درویش نے کہا کہ ڈرو مت۔ میرے گھر کی کڑیاں ذکر و تسبیح کرتی رہتی ہیں ظریف نے کہا کہ مجھے ڈر ہے کہ اسی ذکر و اذکار میں کہیں ان کو حالتِ وجد نہ پیدا ہو جائے اور وہ رقص کرکے سجدے میں نہ آپڑیں تو پھر اس وقت اس گنہگار کا کیا حشر ہوگا۔

ایک صاحب نے اپنے بچے کا ختنہ کیا اور احباب کو دعوت دی مکان چھوٹا تھا اس لئے دعوت کا انتظام ایک خواجہ سرا کے مکان میں کیا۔ استاد ذوق بھی مدعو تھے کھانا کھا کر صحن میں آ بیٹھے۔ اتنے میں میزبان پان لئے ہوئے آئے۔ حکیم آغا جان عیش نے کہا کہ آج تو دست مبارک سے گلوری کھلانا واجب ہے۔ ذوق نے کہا کہ ضیافت تو سنت ہی تھی۔ حکیم صاحب نے فرمایا کہ ان کی ظرافت کے نکتے کو کہاں تک پائیے۔ ختنے کی ضیافت اور خواجہ سرا کے مکان میں کھانا کھلایا۔ ذوق نے کہا کہ ظرافت پہ ظرافت یہ کہ کھلایا بھی تو خصی پلاؤ

شاہ نصیر کا ایک مشہور واقعہ ہے کہ انہوں نے لکھنو کے کسی شعر کے مشاعرے میں ایک غزل پڑھی جس کا مطلع یہ تھا

خال پشتِ لب شیریں ہے عسل کی مکھی روح فرہاد پہ بیٹھ بن کے جبل کی مکھی

کسی صاحب نے ایک شعر پر کہا کہ سبحان اللہ، استاد کیا مکھی بیٹھی ہے۔ کسی نے دوسرے شعر پر کہا کہ حضور یہ مکھی تو ٹھیک نہیں بیٹھی۔ غزل ختم ہونے کے بعد ایک صاحب نے کہا کہ قبلہ غزل تو خوب ہے مگر ردیف سے جی متلانے لگا۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ جنھیں چاشنی سخن کا مذاق ہے وہ تو لطف ہی اٹھائیں گے ہاں جنھیں حسد کے صفرے کا زور ہے ان کا جی بھی متلائے گا اور ردیں بھی ہوں گی۔

مرزا عصمت اللہ بیگ

تاریخ گولکنڈہ حیدرآباد کے مشہور مورخ اور جامعہ عثمانیہ کے معلم تاریخ پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی ایم۔ اے ایل ایل بی نے سلاطین قطب شاہیہ کی نہایت مستند اور مبسوط تاریخ قلمبند کی ہے۔ اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے جو اس اہتمام اور محنت سے لکھی گئی ہے۔ اس کے مولف نے تاریخ دکن کے متعلق خاص تحقیقات کی ہیں اور ان کی ایک اور کتاب "بہمنی تمدن" بھی عنقریب شائع ہوکر منظر عام پر آجائے گی۔

تاریخ گولگنڈہ باتصویر ہے اور اس کی تصویریں بھی اس کے مواد کی طرح قدیم تاریخی ماخذوں سے حاصل کی گئی ہیں۔

بڑی سائز ڈھائی سو سے زیادہ صفحات قیمت [illegible]

ہماری زبان

جنم اس نے ہندوستاں میں لیا اسی ملکِ جنت نشاں میں لیا
اسی کی ہواؤں میں پھولی پھلی مگر تھی ازل سے بڑی منچلی

نگاہوں کی بے باک دل کی جواں
نزاکت کی پتلی لطافت کی کاں

امیروں کی آنکھوں کا تارا بنی غریبوں کے دل کا سہارا بنی
رہی امتیازات سے بے نیاز ہراک دل ہراک بزم میں سرفراز
ہوا اس کی شہرت کا پرچم بلند نگاہوں میں سب کی ہوئی ارجمند
عرب سے فصاحت کا آیا خراج اور اس میں لطافت کا تھا امتزاج

جو فارس سے آئی رباب اور چنگ
تو ہندی نے بھی نذر کی جلترنگ

تبسم پہ اس کے ستاروں کو ناز ترنم پہ اس کے ہزاروں کو ناز
یہ پاکیزگی۔ یہ توازن۔ یہ شان یہ اس کا سنورنا یہ اس کی اٹھان
ہراک کی نگاہوں میں کھبتی گئی دلوں میں لہو بن کے رچتی گئی
اٹھی تھی جو اس محترم خاک سے لگی چشمکیں کرنے افلاک سے
لئے رنگ قوسِ قزح سے کبھی کبھی بن کے کہکشاں تک گئی
ستاروں سے ان کی چمک چھین لی قمر سے غمِ دل کی تسکین لی

فلک سے ملی وسعتِ بے کنار
ہوا حسنِ خورشید از خود نثار

ہراک جلوہ پیشِ نظر ہے یہاں ہراک دلفریبی کا گھر ہے یہاں
ہراک حسن اس بزم میں بار یاب ہراک ذرہ اس بزم میں آفتاب

زمیں زاد ہے آسماں جاہ ہے
وطن کی ترقی کی شاہ راہ ہے

ہراک اہلِ علم کو اس کا ہے اعتراف کہ اردو کا دامن ہے کانٹوں سے صاف
نہ الجھن نہ مشکل نہ بے مائیگی یہ وسعت۔ یہ ایجاز یہ سادگی
نہ مشرق نہ مغرب کی ہے کوئی قید کہ دونوں ہیں اس کی نگاہوں کے صید

زمانے کی ہر خوبصورت زباں　　اسے پیش کرتی ہے کچھ ارمغاں
ہر اک حلقہ میں سب کو آئی پسند　　ہر اک دور میں یہ رہی سربلند
ہر اک ملک میں اس کا سکہ رواں　　کہ دنیا سمجھتی ہے اردو زباں

میسر ہوا اس کو رنگِ قبول
کہ ہیں اس میں ہر ایک گلشن کے پھول

ہمیں کیوں نہ اردو سے ہو اتنا پیار　　سماعت نے پایا اسے خوشگوار
رتن ناتھ سرشار اس کے اسیر　　پرستار اس کے انیسؔ و دبیرؔ
امیر اور حکمت کی ترجماں　　نسیم اور غالب کی پیاری زباں

ہمارے تمدن کی بانی ہے یہ
حقیقت میں ہندوستانی ہے یہ

یہی آشتی کی ہے آئینہ دار　　اسی پر ترقی کا ہے انحصار
اسے ہاتھ سے جانے دینگے نہ ہم　　اسے کوئی غم کھانے دینگے نہ ہم

بزرگوں کا پیارا نشاں ہے یہی
ہماری مقدس زباں ہے یہی

عبدالعزیز فطرت
(راولپنڈی)

گریہ و تبسم۔ صاحبزادہ میکش مدیر سب رس کی نظموں اور غزلوں کا بہترین مجموعہ ہے۔
جناب میکش حیدرآباد کے نوجوان شعراء میں ایک امتیاز کے مالک ہیں اور ان کا کلام بہت مقبول ہے۔
عالیجناب ڈاکٹر زور صاحب کا دیباچہ، عمومی اور جناب پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری کا مقدمہ بھی اس کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔

میکش کے کلام کا مجموعہ ہے اور رنگ و بو کا ایک خوش منظر گلدستہ
کتاب کی تقسیم کئی حصوں پر ہے مثلاً حرکت و حیات، سکون و اضطراب
ماضی و حال، حال و قال عقیدت و یقین، شباب و شعر وغیرہ بعض بعض
نظموں پر بے اختیار کلام اقبال کا دھوکا ہو جاتا ہے۔

"صدق" لکھنو بابت یکم جنوری ۱۹۳۹ء صفحات (۱۹۲) طباعت و کتابت نفیس، کاغذ اعلیٰ قسم کا جلد پر سنہری نام

(قیمت عہ)

پرانی اور نئی باتیں

(تمدن اور شعر و ادب پر ایک نگاہ)

سنسار کی ریت اور دنیا کا دستور ہے کہ پرانی باتوں کو لوگ بھول جاتے ہیں اور وہی بھولی باتیں جب دہرائی جاتی ہیں تو لوگ سمجھتے ہیں کہ بالکل نئی اور اچھوتی باتیں کہی جا رہی ہیں۔ دنیا کا حافظہ بہت کمزور ہے۔ تاریخ اپنے کو ہمیشہ دہراتی رہتی ہے۔ لیکن ہم اس کے دہرانے کو محسوس نہیں کرتے۔ دنیا کے انقلابات اور واقعات کا حال، سینما کے پردے سے ملتا جلتا ہے، دیکھی ہوئی تصویریں تھوڑے الٹ پھیر کے ساتھ نمودار ہوتی رہتی ہیں، اور فریب خوردہ نگاہیں سمجھتی ہیں کہ کوئی جدید فلم دکھایا جا رہا ہے۔ حوادث و انقلابات کے ان مناظر کو دیکھ کر، ایک مشہور فلسفی بے اختیار پکار اٹھا کہ:۔

"دنیا میں کوئی چیز نئی نہیں۔!"

تمدن و تہذیب کو لئے ہوئے نقوش جب ابھرتے ہیں، تو لوگ سمجھنے لگتے ہیں کہ کسی جدید تہذیب کی داغ بیل پڑ رہی ہے۔ دنیا پرانے ملبہ سے نئی عمارتیں بنا کر اکڑنے لگتی ہے۔ آج دنیا تہذیب و علم کی جن "جدید شاہراہوں" پر ناز کر رہی ہے، وہ سب گزشتہ تہذیبوں کے روندے ہوئے راستے ہیں۔ آج ہم محکمۂ آبرسانی کے حسنِ انتظام پر فخر کرتے ہیں، مگر آج سے کئی ہزار سال قبل، یونان کے مشہور مورخ ہیروڈٹس نے بابل کے شہر میں ابلتے ہوئے فوارے اور ڈھلکتے ہوئے آبشار دیکھے تھے۔ جن لوگوں نے بیدر (دکن) کے قلعہ کو دیکھا ہے وہ اس زمانے کے "واٹر ورکس" کے حسن انتظام کا ضرور اعتراف کرینگے۔

سینما کو دورِ جدید کی ایجاد بتایا جاتا ہے مگر ڈریپر کی مشہور کتاب (Conflict between Religion & Science) "معرکۂ مذہب و سائنس" کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر میں متحرک تصویروں کا رواج تھا، اور حسین و جمیل رقاصاؤں کے نغمہ و رقص کے ساتھ ساتھ، متحرک تصویریں ذوقِ نظارہ کو تسکین بخشتی تھیں۔ محکمۂ اکتشافاتِ اثری کی کوششوں کی بدولت، قدیم نوادر منظرِ عام پر آکر، تہذیب و تمدن کی کڑیوں کو ملا رہے ہیں۔ اور دنیا کو اپنے حافظہ کی کمزوری کا احساس ہوتا جا رہا ہے۔ اگر آپ کسی چیز کو بھول جاتے ہیں تو اس کے یہ معنی نہیں، کہ وہ چیز کبھی تھی ہی نہیں آپ کی بھول چوک سے "ہوئی بات"، "انہوئی" نہیں ہوسکتی۔ عدمِ علمِ شئے سے وجودِ شئے کی نفی نہیں ہوتی۔

فکر و خیال کی یکسانی

تمدن و تہذیب اور علم و ادب کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ تمدن و تہذیب کی طرح علم و ادب کے نقوش بھی مٹتے اور ابھرتے رہتے ہیں۔ قدیم افکار نئے سانچوں میں ڈھلتے جاتے ہیں اور وہی نغمے جو فضا میں گونج چکے ہیں، مختلف دھنوں اور سروں میں اس انداز میں گائے جاتے ہیں، جیسے یہ پہلے پہل سامعہ نواز ہوئے ہیں۔ فکر و خیال کی جو شراب روم و یونان کے میکدوں میں کھنچی تھی، وہی شراب بھارت ورش کی بھٹیوں پر جوش کھاتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ایک دو آنچ کی البتہ کسر رہ گئی ہے، مگر اس سے

شراب کی اصلیت پر تو کوئی حرف نہیں آتا۔ روم کی رزمیہ شاعری فردوسی کے شاہنامے سے ٹکراتی ہے، اور ہومر اور ورجل کے نغموں کی گونج ایران میں سنائی دیتی ہے۔ اگر دنیا کے قدیم لٹریچر کا تاریخ وار تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بہت پہلے کہی ہوئی باتیں، کس کس انداز میں دہرائی گئی ہیں، اور یہ "توارد" اپنے اندر کس قدر عمومیت رکھتا ہے۔ بات یہ ہے کہ دنیا کے تمام انسان قوم و نسل کے امتیاز و اختلاف کے باوجود، فکر و تصور کے مرکز پر آکر ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔ گرد و پیش اور ماحول سے متاثر ہو کر محسوسات کے اظہار میں ضرور فرق ہوتا ہے، مگر فکر و خیال کی تان ایک ہی حقیقت پر آکر ٹوٹتی ہے۔ عرب کی لیلیٰ، ایران کی شیریں، ہندوستان کی شکنتلا اور مصر کی قلوبطرہ پر شاعروں اور ادیبوں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں اصطلاحات کے فرق کے سوا، بہت سی چیزیں ملتی جلتی ہیں۔ ایک ہی نغمہ مختلف دھنوں میں زبانوں سے نکلا ہے، اور ایک ہی شراب مختلف پیمانوں میں ڈھلی ہے۔

پرانے چراغ ہماری موجودہ "اردو غزل" جو ہمارا سرمایۂ ناز و افتخار ہے۔ اس کی داغ بیل بھی بہت پہلے پڑ چکی ہے۔ اور نہ صرف فکر و خیال بلکہ الفاظ اور ترکیب کے اعتبار سے بھی ہمارے پیش رو غزل گو شعراء، شعر و ادب کی وادیوں کو ہموار کر کے، فکر و خیال کے چراغ جلا گئے ہیں۔ ہم ان ہی چراغوں کی روشنی میں منزل طے کر رہے ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ ہم کو اس اجالے کا پورے طور پر احساس نہیں ہوتا، مگر اجالا تو اپنی جگہ پر ہمیشہ قائم و ثابت ہے۔ ان ہی پرانے چراغوں کے آس پاس ہم بھی کچھ شمعیں روشن کر رہے ہیں، اور آنے والی نسلیں اپنے کو ہم سے زیادہ روشنی میں پائینگی۔

"ولی دکنی کو لوگ بھولتے جا رہے ہیں، حالانکہ آج سے دو سو سال قبل اس نے کہا تھا"

معشوق کو ضرر نہیں عاشق کی آہ سے
بجھتا نہیں ہے بادِ صبا سے چراغِ گل

خیال و فکر کی قدرت کے علاوہ، الفاظ کے استعمال سے دھوکا ہوتا ہے کہ یہ شعر ہمارے ہی دور کے کسی شاعر کا کہا ہوا ہے۔ میر محمد تقی میرؔ کے اس شعر کا جواب

اس نے دیکھا جو اٹھ کے سوتے سے
اڑ گئے آئینہ کے توتے سے

مشکل ہی سے پیش کیا جا سکے گا۔ ہم کو آج اپنی نظموں پر بہت ناز ہے، مگر میرؔ کے اس شعر کے لطف کو کوئی نظم پیدا نہیں کر سکتی۔ اگر یہ صحیح ہے کہ روح القدس، شاعروں کی تائید کرتا ہے، تو میرؔ کا یہ شعر اس تائید کا سب سے بڑا مظہر ہے۔

خواجہ میر دردؔ کے اس شعر کو پڑھ کر

جوشِ جنوں کے ہاتھ سے فصلِ بہار میں
گل سے بھی ہو سکی نہ گریباں کی احتیاط

موجودہ زمانہ کی بیسیوں غزلوں کو اگر چاک کر دیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔
مصحفی نے اب سے بہت پہلے جو کہا تھا :-

چلے بھی جا جرس غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلۂ نوبہار ٹھیرے گا

بہت سے بہاریہ شعروں کو اسی کی صدائے بازگشت سمجھنا چاہیے۔
داغ کا یہ شعر :-

لذتِ سیرِ دگر چشم تماشائے گی
ایک بار اور بھی دنیا ابھی پلٹائے گی

انقلابی شاعروں کے لئے آج بھی دلیلِ راہ بن سکتا ہے اور "انقلاب زندہ باد" کے فلک شگاف نعروں سے بہت زیادہ قوت اس شعر میں پائی جاتی ہے۔
امیر مینائی کے اس شعر پر :-

لچک ہے شاخوں میں جنبش ہوا سے پھولوں میں
بہار جھول رہی ہے خوشی کے جھولوں میں

آج بھی روح جھومنے لگتی ہے۔ اس دور کے بہترین مصور کا قلم باغ و بہار کو تو دکھا سکتا ہے۔ مگر بہار کو خوشی کے جھولوں میں کس طرح جھلائے گا۔!

میں نے غالب کے اشعار کو قصداً پیش نہیں کیا' اور وہ اس لئے کہ اس کے فکر و خیال کی روح تو ہماری شاعری کے پیکر میں دوڑ رہی ہے' اور کوئی شاعر محسوس یا غیر محسوس طور پر غالب کی شاعری کے تاثرات سے نہیں بچ سکتا۔

ماہر القادری

من کی دنیا حیدرآباد کے نوجوان افسانہ نگار رشید قریشی کے افسانوں کا نفیس مجموعہ ہے۔ عالیجناب ڈاکٹر زور صاحب کا دیباچہ عمومی اور جناب پروفیسر سروری صاحب کا مقدمہ بھی اس کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ افسانوی ادب سے دلچسپی رکھنے والے ضرور اس کا مطالعہ کریں۔ کتاب بہت دلچسپ اور انداز بیان نہایت شگفتہ ہے۔

ہر افسانہ رعنائی اور رنگینی بیان کا بہترین نمونہ ہے۔ اردو کے نئے ادب سے دلچسپی رکھنے والے اور ترقی پسند نظریوں کے پرستاران افسانوں کے مطالعہ سے ضرور محظوظ ہونگے۔ جو اصحاب اردو کے جدید ترین افسانوں کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں وہ اس نوجوان مصنف کے ان پرکیف افسانوں سے ضرور لطف اندوز ہونگے۔ صفحات (۱۶۰) قیمت مجلد (عہ)

اردو شاعری

ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ شاعری ہے کیا چیز۔ مختلف لوگوں نے مختلف طور پر شاعری کی تعریف کی ہے۔ یہاں پر ان تمام تعریفوں کے اعادہ کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ شاعری کی تعریف سادے لفظوں میں یہ ہو سکتی ہے، کہ نثر تو ذہنی اور جذباتی تصورات کے سیدھے سادے اظہار کا نام ہے اور شاعری ایسے اظہار کا ایک طریقہ ہے جو کلام موزوں بن جاوے۔ مگر پھر بھی شاعری کا اصلی نقشہ اس تصویر میں نہیں ملتا۔ یہ خوب سمجھ لیجئے کہ شاعری کا میدانِ عمل وہی ہے جو ایک نثار کا ہے رزم ہو یا بزم، جذبۂ قومیت ہو یا جوشِ مذہبی، ذہنی تخیلات ہوں یا مشاہداتِ کائنات ہر چیز میں جس حد تک نثر کا دخل ہے اسی حد تک شاعری کا بھی ہے سوال یہ ہے کہ پھر اظہار کے یہ دو مختلف انداز و بیان کیوں وجود میں آئے۔ اس لئے اور صرف اس لئے کہ جہاں صنف نثر موثر نہ ہو وہاں دوسری صنف یعنی شاعری سے کام لیا جائے دیکھئے شیکسپیر۔ ہومر۔ ورجل اور گوئٹے کے ہم عصر صدہا نثار رہتے تھے مگر ان کی قوم کے تمدن میں جس انقلاب کی ضرورت تھی وہ ان سے نہ ہو سکا۔ اس کام کو ان شعراء نے انجام دیا۔ انصاف اور رحم کے نقشے یا انسانی کیرکٹر اور تاثرات کے خاکے جس طرح شیکسپیر نے اپنے ڈراموں میں کھینچے ہیں یا قومی جذبے کے متعلق اسکاٹ نے جو نظمیں لکھی ہیں، یا قدرتی مناظر کا ورڈسورتھ نے جو نقشہ کھینچا ہے، ان کا بیان ایک نثار کتنی ہی خوش اسلوبی سے نثر میں کیوں نہ کرے ان شعراء کی طرح اثر پیدا نہیں کر سکتا۔ جس طرح موسیقی شعر کی خوبیوں پر سونے پر سہاگہ کا کام کرتی ہے اسی طرح نثر شعر کے سانچے میں ڈھل کر خیالات کے اثرات کو دوبالا کر دیتی ہے۔

یہ نہ سمجھئے کہ نظم و نثر کا یہ فرق قافیہ اور ردیف کی وجہ سے ہوتا ہے خدا جانے کتنے اثرات کا مجموعہ ہے جن سے مل کر شاعری نثر سے بالکل جدا اور اس سے بہت بلند تر اور ایک اچھوتی چیز بن جاتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ شاعری ایک ایسی قوت ہے جس کا اظہار جذبات کے ہر شعبے پر اثر پذیر ہے خواہ وہ ارتقائے ذہنی ہو خواہ مصوری جذباتِ جمالیت خواہ جوشِ ملی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان شعبوں پر شاعری کا نثر کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ اثر ہے۔

مذکورۂ بالا معیار کی روشنی میں ہمیں دیکھنا چاہیے کہ آیا ہم شاعری کے اس مفہوم کو سمجھتے ہیں یا نہیں۔ آیا ہم اردو شاعری سے یہ کام لے رہے ہیں یا نہیں۔ اور آیا ہماری شاعری ہمارے انسانی اور قومی ارتقاء کی ترجمان ہے یا نہیں۔ گزشتہ صدی کے دورِ شاعری پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو ظاہر ہو جائے گا کہ ہم نے شاعری کے اعجاز سے کہاں تک کام لیا ہے۔ تعمیری جذبے سے بے نیاز، روح پرور نغموں سے خالی، مفروضی نقطۂ نظر سے ناکارہ، اور موضوعی حیثیت سے بھی مصنوعی اور دقیانوسی۔ یہ ہے پرانی داستان ہماری شاعری کی بدقسمتی سے ہمارے شعراء کا میلانِ طبع صرف تغزل کی طرف رہا۔ اور جو نظری مجسمہ حسن، اظہارِ جذبات کا مرکز بنا رہا۔

اس میں ایک طرف تو سوقیت غالب رہی اور دوسرے جانب جو مجسمہ اظہار تغزل کو تیار کیا گیا وہ ایک عجیب الخلقت
ابوالہول سے کم نہیں یعنی نہ وہ مرد ہے نہ عورت نہ فی الحقیقت کوئی ایسی چیز ہے جو صحیح تصویر بن سکے۔ اس کے
سر کے بال کمر تک لمبے، مانگ سیندور بھری ہوئی جس کو خط آرہ کشی سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ موباف سرخ و زرد
کھنکھور اپیشانی پر افشاں، رخسار پر خال گویا پھول کی پتی پر مگس یا ایمان کے خرمن میں کفر کا ایک دانہ، پاؤں میں
پازیب و خلخال کا جنجال جن کی جھنکار محشر خیز، ہاتھوں میں مہندی گویا عاشق کے خون کا رنگ، لب و دندان پر مسّی
کی دھڑی اور پاؤں کی سرخی قدیم سنگار کے تصور کو بھی شرماتی ہیں۔ انگیا۔ چولی۔ محرم۔ نقاب۔ سیب ذقن۔
انار پستان یہ تو نسوانی علامات ہیں مگر ساتھ ہی معشوق سبزۂ خط سے ریشائیل بھی ہوتا ہے۔ ظلم و جور۔ اغیار کے
ساتھ سر بازار آوارہ گردی، تیغ آزمائی تیر افگنی، قتل و غارت گری وغیرہ اس کی صنف قوی سے ہونے کا
ثبوت ہے۔ حلیہ اس معشوق عجیب کا یہ ہے کہ صراحی کی طرح لمبی گردن، لکھنو کی ککڑیوں سے نازک کلائیاں،
کمر بالکل معدوم یا بال کی طرح باریک، لب کوزۂ قند و نبات، دنداں سلک مروارید، ناک شمع کافوری، آنکھیں نرگس
بیمار، پلکیں تیر و نشتر، بھویں شمشیر و خنجر، رخسار آفتاب، جبین ماہتاب، زلف بل کھائی ہوئی ناگن، گیسو مار سیاہ، موئے خط
سبزہ زار غرض کہ ایشیائی شاعری کے اس خیالی معشوق کو مثالی جامہ پہنا کر کسی بزم مشاعرہ میں پیش کر دیا جائے
تو ہمارے عشق زدہ کمزور دل شعراء چیخ مار کر بیہوش ہو جائیں اور جری و بہادر لوگ زندہ دل ہنستے ہنستے لوٹ
جائیں، اور معشوق صاحب کی وہ گت بنائیں کہ پھر وہ اپنے عاشق شعراء کے خواب و خیال میں بھی آنے کی
جرأت نہ کر سکیں۔

تعجب ہوتا ہے کہ دنیا اس قدر ترقی کر چکی ہے کہ آج ہر چیز کے لئے عین الیقین کی ضرورت ہے
مگر ہمارے شعراء اپنے حسن و عشق کے تخیل میں واقعیت اور حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتے۔ تمام
تشبیہات و تلمیحات اور حسن و عشق کے فرضی لوازمات ایسے پیش کئے جاتے ہیں جن سے ہمارے ماحول اور
محسوسات کو مطلقاً تعلق نہیں۔ اگر کہیں مناظر کی جھلک بھی نظر آتی ہے تو ایسی جن سے ہماری نگاہیں آج تک
محروم ہیں اور ناآشنا۔ غیر ملکی مناظر کے لئے جن سے ہمیں مسرت حاصل نہیں ہو سکتی اپنے ملکی و ماحولی مناظر کی
طرف اب تک آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔

سمند ناز پر ایک اور تازیانہ ہوا۔ اردو غزل میں اس کی ہمیشہ سے اجازت دی گئی ہے کہ ایک ہی
غزل میں متفرق خیالات ہوں لیکن اب یہ مرض بڑھتا جا رہا ہے کہ ایک ہی غزل میں متضاد خیالات بھرے
جاتے ہیں۔ پھر کیا تعجب ہے جو ہماری غزلیں غیر فطری سمجھی جاتی ہیں۔ ایک ہی سانس میں دو متضاد جذبے
کیسے ہو سکتے ہیں۔ میرا مطلب تغزل کی اہمیت کو کم کرنا نہیں ہے اور اصلی تغزل انسان کے صحیح جذبات کا
صحیح آئینہ ہوتا ہے اور جہاں اور اصناف سخن ایک ہنگامی حیثیت رکھتے ہیں اس کی استقامت اور استقلال

پر زلزلہ لانا دشوار ہے لیکن ہمارے شعراء افراط تفریط کے شکار ہوئے اور محض تغزل اور وہ بھی غیر فطری تغزل کو انہوں نے اپنا نصب العین بنا رکھا اور دوسرے اصنافِ سخن سے بالکل غافل رہے۔

ابتدا میں تو کچھ توجہ قصیدوں اور مثنویوں کی طرف رہی لیکن ان اصناف سے جو اصلی کام لینا چاہیے تھا وہ نہیں لیا گیا۔ اور نظموں کی طرف تو کسی نے خیال ہی نہیں کیا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ تو مناظر قدرت کی تصویر کشی سے مستفید ہوئے نہ جذباتِ ملی و ملکی قوم میں یہ پیدا کر سکے۔ میں جانتا ہوں کہ زبان کے ابتدائی دور میں اس کی صفائی و روانی پر توجہ غالب رہتی ہے۔ اسی طرح ہماری زبان میں بھی ہوا۔ گر تخیل کا معیار بلند نہ ہوا۔ لیکن اس دور کے بعد دنیائے شاعری کے افق پر ایک روشن ستارہ نجم الدولہ دبیر الملک غالب دہلوی کی صورت میں طلوع ہوا جس نے اپنی شاعری کی بنیاد فلسفۂ حیات اور رموز زندگی کی مستحکم زمین پر قائم کی۔ خیالات کی بلندی جذبات کی لطافت اور پاکیزگی کے ساتھ اس نے ان حقائق کی تصویر کھینچی جو انسانیت کا مرکز نگاہ بننے کے قابل تھے

دو اور شعراء انیس و دبیر اصلی معنوں میں شاعر کہلانے کے مستحق ہو سکتے تھے مگر افسوس کہ انہوں نے اپنی فکر طبع کو محدود رکھا۔ منظر کشی، واقعہ نگاری اور جذبات کی تصویریں اتارنے میں یہ دونوں شعراء نے دادِ سخن دی لیکن ان کے یہاں بھی فطرت سے وہ ہم آہنگی اور قرب عنقا ہے جو ورڈسورتھ (Wordsworth) شیلی (Shelley) یا بائرن (Byron) کے یہاں بدرجۂ اتم موجود ہے۔

غالب کی روش پر چلنے کی بہت کم لوگوں کو توفیق ہوئی لیکن وہ ایک ایسی شاہراہ پیدا کر گئے تھے جو معدوم نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اس ترقی یافتہ دور میں سنجیدہ طبقے نے اس شاہ راہ پر گامزنی کی کوشش فرمائی اور اس نے اب خاصی کامیابی حاصل کر لی ہے۔ اس طبقے کے شعراء نے جذبات، حسن و عشق اور فلسفۂ حیات کی حقیقت آگیں تصویر دکھلانے میں جو سعی فرمائی اس نے تغزل میں ایک انقلابی کیفیت پیدا کر دی ہے ان میں سے خاص طور پر فانی۔ جگر اور حسرت ہیں۔ بے معنی تغزل سے ہٹانے میں پہلی سعی جس شاعر نے کی وہ مولانا حالی ہیں۔ قومی ادبار کی تصویر ان کے سامنے تھی قومی درد ان میں کوٹ کوٹ کے بھرا ہوا تھا۔ وہ ابل پڑا اور اس نے ان سے مسدس ایسی نایاب چیز لکھائی۔ نیز اسی طرح کی اور نظمیں جن کو پڑھ کر قومی جذبہ پیدا ہوتا ہے، اور عمل کا احساس ہوتا ہے پھر چکبست نے ایسے دلچسپ پیرایے میں قومی ترانے گائے کہ اس نے قومیت ملکیت، اور وطنیت کا جوشِ جنوں پیدا کر دیا۔ فلسفۂ زندگی کو طنزیات کے تحت میں لا کر بیان کرنے میں اکبر الہ آبادی نے جو کمال دکھایا ہے، اس کی نظیر نہیں ملتی۔ لیکن ان کا مسلک "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز" نہ تھا اس لئے قوم کی ذہنی ارتقاء میں ان کی شاعری ایک سنگِ گراں ثابت ہوئی۔

حالی کو زیادہ زمانہ نہ گزرا تھا کہ آسمانِ شاعری پر علامہ اقبال نمودار ہوئے اور انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ سے ایک ایسا پیغام ہم کو پہنچایا جس سے ہماری نظر حقیقتِ انسانی پر پڑی اور ہم سب

ایک خاص جذبے سے متاثر ہو گئے۔ اور اب شعراء کا رجحان تکمیل تغزل کی طرف ہوا اور اسی کے ساتھ ہی ساتھ مذہبی۔ اخلاقی۔ قومی سیاسی نظموں اور نیچرل شاعری کی طرف خاص طور سے توجہ بڑھی جس کا ثبوت ادبی جرائد متواتر پیش کر رہے ہیں۔ ان میں خاص طور پر قابل ذکر حضرت جوش ملیح آبادی۔ پنڈت انند نرائن ملا۔ نادی مچھلی شہری۔ حفیظ جالندھری۔ احسان دانش۔ اختر شیرانی وغیرہ وغیرہ ہیں۔ ان حالات سے امید ہوتی ہے کہ اردو شاعری ایک ہمہ گیر اور مکمل شاعری کی حیثیت حاصل کرے گی۔

شاعروں اور شاعری کے بڑے بڑے کارنامے صفحات تاریخ پر موجود نہیں۔ دنیا کے بہت سے عظیم انقلاب شاعری کے رہین منت ہیں اور ہماری خوش قسمتی ہے کہ ابھی ہمارا ذہن شعریت سے خالی نہیں ہے اور ہم اس صنف سخن سے بہت کچھ کام لے سکتے ہیں۔ آج تو ان ممالک میں جہاں صنعتی اور حرفتی ارتقا حاوی ہو گئے ہیں، وہاں شعراء رفتہ رفتہ عنقا ہوتے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس وقت یورپ میں یہ صورت ہے کہ بلند پایہ ادیب۔ محقق۔ سیاست داں اور صحیفہ نگار تو وافر تعداد میں موجود ہیں مگر شکسپیر۔ ملٹن۔ ورجل۔ ہومر اور ڈانٹے نیا تمدن نہیں پیدا کر سکا۔ اس لئے ہمارے شعراء کو اس حقیقت سے آشنا ہو جانا چاہئے۔ ضرورت ہے کہ اس وقت کو غنیمت سمجھیں اور حقیقی شاعری کا جذبہ ملک میں پیدا کریں۔ جوش جوانی اور عیش پرستی کا ذکر اس قوم کے لئے زیبا ہے جس کو عیش و راحت کی زندگی میسر ہو۔ لیکن جو قوم ایسی ہو کہ اس کے بیشتر افراد کو ایک وقت شکم سیری میسر نہیں اور مصائب و آفات کے ہجوم سے محروم و مغموم ہیں اس کے شعراء کو یہ کیونکر زیب دے سکتا ہے، کہ خیالی تعشق اور رندی اور بدمستی کے راگ الاپتے رہیں۔

ملک و ملت زبانِ حال سے فریادی ہیں کہ ہم کو زندگی کے اصلی مقصد کی تلاش ہے اقتصادی، معاشی مذہبی، اخلاقی، اور تمدنی و معاشرتی آزادی کی ضرورت ہے لہذا ان امور کے حصول کے لئے تمام قومی طبقات کے ساتھ طبقۂ شعراء کو بھی میدانِ جد و جہد میں آکر اپنا فرض ادا کرنا چاہئے۔

نجم الدین احمد جعفری
(الہ آباد)

عہد ابراہیم عادل شاہ ثانی کے متولیان ریاست اس کتاب کو مجلس علمیہ طیلسانین عثمانیہ نے شائع کیا ہے۔ یہ کتاب اصل میں ایک تحقیقی مقالہ ہے۔ جس کو مولوی علی محسن صاحب نے اپنے ام اے کے امتحان کے لئے لکھا تھا۔ اپنے موضوع کے اعتبار سے اس کتاب کا مطالعہ اہل اردو کی معلومات میں اضافہ کا باعث ہوگا۔

تعداد صفحات ۲۰۴، قیمت عہ

اظہارِ مسرّت

دکن کی شاہزادیوں کی خیر و عافیت کے ساتھ واپسی پر دکن کی مختلف انجمنوں کی طرف سے جو مبارک باد کا جلسہ بتاریخ ۱۴ دسمبر ۱۹۳۹ء منعقد ہوا تھا اس میں ادارۂ ادبیات اردو کے شعبۂ نسواں کی طرف سے بھی اس کی صدر محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ نے پھول پہنائے اور اس شعبہ کی اراکین نے جو نظمیں پڑھیں وہ یہاں درج کی جاتی ہیں۔

بہارِ تازہ ز مغرب بہ ایں دیار آمد — نبیرۂ شہِ عثمان کامگار آمد

مغنّیے کہ فخامت ز زرّتے او پیداست — بہ پرنسس دُرِّ شاہوار آمد

زما پیام رساند کسے بہ شاہِ دکن

برار بہ تازہ بہ شہزادۂ برار آمد

۲

تعالیٰ اللہ! دعائیں اپنی یہ تاثیر لائی ہیں — بخیر و عافیت شہزادیاں یورپ سے آئی ہیں

نہ تھی تشویش تک بھی جنگِ موجودہ تباہی کی — ہمیں تو فکر رہتی تھی فقط ارکانِ شاہی کی

مساجد، خانقاہوں، شاہراہوں اور مکانوں سے — نکلتی تھی دعائے واپسی لاکھوں زبانوں سے

مقامِ جنگ سے جب تار وحشت ناک آتے تھے — ستارے آسمانِ سلطنت کے جھلملاتے تھے

کسی اخبار میں گر "واپسی" عنوان نظر آتا — گماں فی الفور اپنا شاہزادوں کی طرف جاتا

کبھی جب نشر گہ سے تازہ کچھ اعلان ہوتا تھا — دلوں میں جاں نثاروں کے بپا طوفان ہوتا تھا

دعائیں مانگنے کو اجتماعِ عام ہوتا تھا — ہر اک فرطِ خضوع سے لرزہ براندام ہوتا تھا

نکلنے بھی نہ پاتی خاکِ سجدہ تک جبینوں سے — کہ اٹھ کر پوچھتے تھے کیفیت اخبار بینوں سے

امید و بیم کی یہ کشمکش ہر دم ستاتی تھی — نہ دن کو چین ملتا تھا، نہ شب کو نیند آتی تھی

سفینہ اپنی تقدیروں کا گردابِ بلا میں تھا — قبیلہ آصفِ سابع کا اک جو کھم فضا میں تھا

بفضلِ رحمتِ پروردگار آخر وہ دن آیا — رعایائے دکن نے "مژدۂ آمد" ابھی سن پایا

خدا کا شکر ہے جاتی رہیں بے تابیاں اپنی — ہجومِ شوق سے لبریز ہے اب داستاں اپنی

ریاضِ آصفی میں شادمانی کے ثمر آئے — بخیر و عافیت سرکار کے لختِ جگر آئے

کرم پویاں پویاں و مفخم در کنار آمد — دُرِ شہوار با شہزادۂ ملکِ برار آمد

جلالِ ترکمانی از معظم جاہ پیدا شد
فرِ نیلوفری بنگر برنگِ تو ہویدا شد

بشیر النسا بیگم بشیر

اظہارِ جذبات

تھیں نظر سے جو نہاں اپنی شاہ زادیاں
منہ پہ تھیں ہر ایک کے اڑ رہی ہوائیاں
دل تھے صرفِ رنج و غم ہاتھ سوئے آسماں
تھی دعا ہر ایک کی اے خدائے انس و جاں

—— ۲ ——

خیریت سے آئیں وہ خیریت سے آئیں وہ
دل کی اُجڑی بستیاں آ کے پھر بسائیں وہ
اپنے دم سے ملک کو گلستاں بنائیں وہ
کیف اور سرور کی ندیاں بہائیں وہ

—— ۳ ——

بدلیاں دعاؤں کی جب فلک پہ چھا گئیں
جوشش رحیم کی رحمتیں بھی آ گئیں
کام حق کی بخششیں اس طرح بنا گئیں
شکر ربّ العالمین شکر ربّ العالمین

—— ۴ ——

پھر دکن کی سرزمیں نازشِ ارم بنی
خیریت سے آئے وہ لو تھی جن کی لگ رہی
لب پہ جن کا نام تھا دل میں جن کی یاد تھی
جو دکن کے ناز ہیں شان اپنی جنس کی

—— ۵ ——

برکتِ ورود نے کر دیا ہے غم غلط
ہر دکن کے فرد سے یادِ درد وہم غلط
لوحِ دل سے ہو گئے معنیٔ الم غلط
گردشِ جہان کی فکرِ بیش و کم غلط

—— ۶ ——

پھر وہی پہ چہل پہل پھر وہی ہے چہچہے
پھر وہی ہنسی خوشی پھر وہی ہیں قہقہے
جوشش یہ سرور کا کم نہ ہو خدا کرے
دورِ انبساط یہ یا خدا سدا رہے

لطیف النساء بیگم

ریلوں کی اردو

ہماری بدترین کمزوریوں میں ہماری غفلت، لاپروائی، پست ذہنیت اور احساسِ کمتری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم غیروں کے ہاتھوں اپنی تہذیب اور زبان کی بربادی گوارا کر رہے ہیں۔ اس بربادی کے اتنے ثبوت دیکھتے ہوئے یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ تباہی کی یہ نشانیاں دوآبے میں نظر آرہی ہیں اور اس تباہ کاری کو وہی اہل زبان گوارا کر رہے ہیں جن کی زبان شستہ اور مستند سمجھی جاتی ہے۔

اگرچہ مجھے بھی علم ہے کہ ریلوں پر ہمارا زور نہیں، آئینی اعتبار سے ریلوے کے کاروبار میں ہمارا عمل دخل نہیں، مگر یہ بھی میں جانتا ہوں کہ ریلوے بورڈوں میں جتنے ہندوستانی افراد ہیں (چاہے وہ حکومت کے نمائندہ ہوں یا تجارتی اداروں کی طرف سے نمائندگی کر رہے ہوں) اگر وہ متحدہ طور پر ہندوستانی زبانوں کی تحقیر کی مخالفت کریں تو اس خرابی کا بہت جلد خاتمہ ہو جائے۔

مجھے خیال تھا کہ کانگریسی راج قایم ہونے کے بعد تحریری زبان سنبھل جائے گی، سرکاری محکمے زبان کی فصاحت اور پاکیزگی نہ سہی کم از کم صحت کا خیال ضرور کریں گے مگر نہیں وہی پرانا ڈھرا قایم تھا، پرانی بدتمیزیاں موجود تھیں، پرانی زبان کشی جاری تھی بعض گاڑیوں کے نئے نئے ڈبوں میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا تھا، ہر چیز کی ظاہرہ حالت سے پتہ چلتا تھا کہ ابھی ابھی یہ ڈبے بنے ہیں، ہر چیز نئی تھی، جابجا ضروری اعلانوں کی تحریریں بھی نئی تھیں صرف —— زبان پرانی تھی! وہی زبان جو صاحب بہادر استعمال کرتے ہیں، چنانچہ ایک اعلان تھا کہ۔

" مسافروں کو ہوشیار کر دیا جاتا ہے کہ جب گاڑی چلتی رہے تب گاڑی کے دروازے کو نہ کھول رکھیں یا اپنے جسم کے کسی حصے کو کھڑکی یا دروازے کے باہر نہ رکھیں کیونکہ یہ دونوں عادتیں خطرناک ہیں"

خط کشیدہ لفظوں پر غور کیجیے۔ اس سے زیادہ مہمل عبارت اور کیا ہو سکتی ہے؟ وہ بھی اس ریلوے کی جو اردو اور ہندی کے گہواروں میں ڈولتی ہے، اردو کے سرچشموں سے سیراب ہو رہی ہے، دوآبے کی دولت سے مالامال ہو رہی ہے اور بیچ بیچ دہلی کی زبانی ٹکسال لال قلعہ میں سے گذرتی ہے۔

شاید آپ کو معلوم نہ ہو یا معلوم بھی رہا ہو تو بھول گئے ہوں کہ دہلی سے غازی آباد کو جو ریل جاتی ہے وہ شاہانِ دہلی کی قیام گاہ، اکبر کے بنائے ہوئے قلعے اور بہادر شاہ ظفر کی آماج گاہ میں سے گزرتی ہوئی جاتی ہے اور اس ریل کی تعمیر کے وقت محض سہولت اور —— کفایت کی خاطر لال قلعے کی دیواروں کو توڑ تاڑ کر برابر کیا گیا اور رہتی دنیا کے سامنے اپنی بربریت اور غارت پسندی کا ثبوت دیا گیا! غرض، لال قلعہ ٹوٹا، اس میں سے ریل گزری، انگریزی مطلق العنانی کا بھی خاتمہ ہوا مگر ریلوں کی زبان نہ سنبھلنا تھی نہ سنبھلی! کیا کوئی ان سے پوچھنے والا نہیں کہ اس قسم کے مہمل جملے کا کہ

" اپنے جسم کے کسی حصے کو باہر نہ رکھیں"!

کیا مطلب ہے؟ اس قسم کے بے معنی اور لغو اعلانوں کا کیا فائدہ؟ کیا اردو کے شیدائی، ہندی کے پریمی، ہندستانی کے دلدادہ

باقی نہیں کہ ریلوے کی زبان کشی کے خلاف جہاد کریں اور ان کے دماغ کو ٹھکانے لگائیں ؟ ؟ اگر خود حکومت کو صحیح زبان کا احساس نہیں تو ریلوے کے ممبر، ریلوے بورڈوں کے ارکان، مجلسِ مقننہ کے اردو نواز اصحاب کیا کر رہے ہیں ؟

یہ ایک ہی اعلان نہیں جسے نظر انداز کیا جاتا۔ اس قسم کے ہزاروں اعلان انگریزی ٹپہ خانوں، تار گھروں، سرکاری دفتروں اور ریل کے ڈبوں میں نظر آتے ہیں۔ تعجب ہے کہ اردو کی سنیاناسی اسی صوبے میں کی جائے جو اردو کا وطن ہو اور ــــ اہلِ زبان خاموش بیٹھے رہیں ؟! الہ آباد میں "ہندوستانی اکیڈمی" اعظم گڑھ میں "دار المصنفین" قرول باغ میں "اردو اکاڈمی" ہو،

"ہندی پرچارنی سبھا" کا مسکن بنارس ہو اور انجمن ترقی اردو کا صدر مرکز دہلی میں ہو، پھر بھی اس صوبے میں زبان کی توہین آمیز اور حقارت انگیز عبارتیں گوارا کی جائیں !؟۔ ایک طرف تو سرکاری اور قومی یونیورسیٹیوں اور کالجوں، مدرسوں اور پاٹھ شالاؤں، مکتبوں اور درس گاہوں میں صحیح زبان سکھائی جارہی ہے، اردو کے استادوں اور اردو کے پروفیسروں پر ملک و قوم کا ہزار ہا روپیہ صرف ہو رہا ہے اور دوسری طرف سرکار کے محکموں میں، سرکاری ریلوں میں اردو کی ناقدری ہی نہیں اردو کا سنیاناس اور غارت گری ہو رہی ہے اور ہم آپ خاموش بیٹھے فلسفہ بگھار رہے ہیں !!

جعفر حسن

نغمۂ اردو

اظہارِ مطالب کی جو تو جان ہے اردو
ہر ایک ترا دل سے ثنا خوان ہے اردو

جس بزم میں کرتی نہیں تو نغمہ سرائی
کچھ شک نہیں وہ بزم بھی سنسان ہے اردو

رکتی ہے ترقی تری؟ ہوں لاکھ مخالف
دشمن بھی ترا تجھ سے پریشان ہے اردو

کب شستہ و صاف ایسی کوئی اور زبان ہے
کہنے میں سمجھنے میں بھی آسان ہے اردو

کیا تجھ پہ کوئی اور زباں کی ہو حکومت
تو مشترکہ قوم کی پہچان ہے اردو

بن جائے گی کچھ روز میں شیرازۂ اقوام
وسعت میں تری اس کا بھی امکان ہے اردو

سرمایہ کیوں علم و ادب کا ہو۔ کہ تیرا
سلطانِ علوم آج نگہبان ہے اردو

اک روز تو ہو جائے زباں سارے جہاں کی
بس دل میں متین کے یہی ارمان ہے اردو

میر حسن علیخاں متین

اُردو کے خاموش خدمت گذار

موجودہ زمانے میں "روشناسِ خلق" وہی ہستیاں ہیں جن کو سیاست یا کسی دوسری معرکتہ الآرا تحریک سے قریبی تعلق ہو شعراء اور بعض سربرآوردہ مصنفین بھی رسالوں، تذکروں اور سوانح کے طفیل سے اپنی زندگی اور کام کو عوام تک پہنچا دیتے ہیں اولیاء اللہ اور بزرگانِ دین کے تذکروں کو بھی شوق اور تعظیم سے پڑھا جاتا ہے۔ اور ان کی زندگی لوگوں کے لئے شمعِ ہدایت ثابت ہوتی رہی ہے۔ لیکن زمانے کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ وہ ان قابلِ قدر ہستیوں کا بھول کر بھی خیال نہیں کرتا جن کو قوموں کی تعمیر میں بہت بڑا دخل ہے۔ جن کی مخلصانہ کوشش ہماری نسلوں کے ذوقِ عمل و تحصیلِ علم کو اکساتی ہیں۔ اور ایسے افرادِ قوم کی ذہنی نشوونما ان سے ذمہ ہوتی ہے جن سے قوموں کی قسمتیں وابستہ ہوتی ہیں دنیا کا کوئی شخص استاد کی گرانمایہ خدمت سے انکار نہیں کر سکتا۔ یہی وہ سرچشمہ ہے جہاں سے ایسے سوتے ابلتے ہیں جن سے انسانیت کی کھیتی ہری ہوتی ہے۔ یہی وہ انسان نما خضر ہیں جو ہزاروں بھٹکے ہوؤں کو راہِ راست پر لگاتے ہیں اور نئی نئی شاہراہیں کھولتے ہیں افسوس ہے کہ یہی لوگ زمانے کی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ محمد علی جناح اور گاندھی جی کے استاد کون تھے؟ کہاں کے رہنے والے تھے اور انھوں نے ان کی زندگی اور طبیعت و اخلاق کے بنانے میں کیا حصہ لیا تھا؟ ہاں ایکٹرسوں اور ایکٹروں کی زندگیوں کے ایک چھوڑ کئی ایڈیشن نکل سکتے ہیں ان کی حیات کے ہر دور سے لوگ واقف رہیں گے کب فلاں نے فلاں سے ملاقات کی۔ فلاں کی زندگی میں تبدیلی کب پیدا ہوئی۔ غرض کہ ممکنہ معلومات سے ہر شخص واقف ہونا چاہتا ہے۔

میتھو آرنلڈ نے سچے ہیرو کے لقب کو صرف استاد کے لئے مختص قرار دیا ہے اس کے نزدیک اساتذہ صرف اکیلے ہی ترقی کی راہ پر گامزن نہیں رہتے بلکہ ایک کاروان کی بھی رہنمائی کرتے ہیں اور تا وقتیکہ ان سب اہلِ کاروان کو منزلِ مقصود پر پہنچا نہیں دیتے ان کی محنت ٹھکانے نہیں لگتی۔ اساتذۂ اُردو جس گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں وہ خود ہماری پستی اور ناقدرشناسی کی دلیل ہے۔ ان اساتذہ کی صحیح عظمت کا اندازہ اس حقیقت سے ہوسکتا ہے کہ ان ہی کی کوششوں اور تربیت سے ہر قسم کی علمی و ادبی صلاحیت کے جوہر کھلتے ہیں۔ استاد ہی کی صحیح تربیت کسی کو شاعر، کسی کو افسانہ نگار اور کسی کو خادمِ قوم بننے کا موقع دیتی ہے۔ اس مضمون کے شائع کرنے سے یہ مقصد نہیں کہ صرف اساتذۂ اُردو ہی کے سر ساری عظمتوں کا سہرا ہے بلکہ اس کا یہ مقصد ہے کہ ان خاموش خدمت گذاروں کی طرف بھی لوگوں کو متوجہ کیا جائے یہ میری پہلی کوشش ہے اگر اس میں مجھے کامیابی ہو جائے، اور اُردو کے موجودہ استادوں سے میں اُردو دنیا کو متعارف کرا سکا تو میں کوشش کروں گا کہ ایسے اصحاب کے حالات بھی جمع کروں جو اُردو کی تعلیم دیتے ہوئے اپنی زندگیاں ختم کر چکے ہیں

اُردو زبان کی مقبولیت اور وسعت روز افزوں ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام سے اس زبان کو بہت بڑی سرپرستی حاصل ہوگئی ہے اس جامعہ میں ذریعۂ تعلیم اُردو ہے۔ اور وہ تمام مغربی علوم وفنون جو غیر زبانوں میں مقید تھے اب آزاد ہیں اس لئے اُردو کے استاد بھی اِس دور میں پہلے سے زیادہ توجہ، روشناسی اور قدر و منزلت کے مستحق ہیں۔

اُردو کے ان بہی خواہوں اور سرپرستوں کی گنتی انگلیوں پر کی جا سکتی ہے اور ان میں سے اکثر کسی نہ کسی ادارۂ

درس و تدریس سے متعلق ہیں میں نے اسے اپنا سب سے مقدس اور پہلا فریضہ سمجھا کہ ان قابل احترام ہستیوں سے قارئین سب رس کو متعارف کراؤں۔ اس خیال کا ذکر میں نے محترمی و استادی ڈاکٹر زور صاحب سے کیا جنھوں نے اس کو بہت پسند کیا اور ممکنہ امداد کے بہم پہنچانے کا وعدہ کیا میں نے ہندستان کی مختلف جامعات کے اردو کے اساتذہ صاحبان سے خط و کتابت شروع کردی اور ان کے حالات زندگی، کام اور دیگر معلومات کا ایک تفصیلی خاکہ مانگا۔ عالیجناب ڈاکٹر زور صاحب نے ہر خط پر میری استدعا پر توجہ کرنے کے لئے شخصی اثر اور تعلق سے کام لیتے ہوئے سفارش کی لیکن اکثر اساتذہ صاحبان نے روایتی "عدم توجہی" اور "لاجوابی" سے کام لیا۔ بعض نے نہایت ہی مختصر حالات زندگی کے روانہ کرنے پر اکتفا کی۔ بعض نے تصویر بھیجنے سے معذوری ظاہر کی۔ اور اکثروں نے "میرے حالات زندگی کچھ قابل ذکر نہیں"۔ "ایک زمانے سے تصویر نہیں کھنچوائی اس لئے معذور ہوں" "میں ایک خاموش کارکن ہوں" لکھ کر مجھے مایوس کردیا۔ دوبارہ اس سلسلے میں یاددہانی کی گئی تو کچھ زیادہ توجہ سے کام لیا گیا۔ اور اس کے لئے میں سب سے پہلے ڈاکٹر زور کا اور پھر جملہ اساتذہ صاحبین کا تہہ دل سے مشکور ہوں۔ دوسروں کے نزدیک "خاموش کارگزاری" اور "عزلت گزینی" چاہے جس نظر سے بھی دیکھی جائے بحیثیت اردو ادب کے ایک مخلص طالب علم، و سوانح نگار کے میں اس کو ایک ادبی "رجعت پسندی" سے تعبیر کروں گا۔ اس مضمون میں اگر یہ مکمل ہوجائے تو آپ دیکھیں گے کہ ایسی ایسی گمنام ہستیاں آپ کے پیش نظر رہیں گی جن کی زندگی کا ایک ایک باب ہدایت اور رہنمائی کا دفتر لئے ہوئے ہے۔

ان ہی خواہان اردو کی زندگیاں جن منزلوں سے گزریں، جو جو مراحل ان مستقل مزاج اصحاب کو برداشت کرنے پڑے، اور جس کس مپرسی اور عزلت گزینی کی حالت میں انھوں نے اپنی زبان اور ادب کی خدمت کی ان سب کو نظروں میں رکھتے ہوئے کون ہے جو خاموش خدمت گذاری اور مستقل مزاجی کا درس نہیں لے گا۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ مضمون جملہ اساتذہ صاحبان اردو کی زندگیوں پر روشنی نہ ڈال سکے گا۔ بہرحال اسے ایک ابتدائی کوشش سمجھئے۔ موقع ملے تو ایک مستقل تذکرہ اس موضوع پر ترتیب دیا جاسکے گا۔ اس وقت جن اصحاب کے حالات مہیا ہوسکے ہیں ان کے نام حسب ذیل ہیں:-

۱- مولوی سید مسعود حسن صاحب رضوی ایم اے ایل ٹی۔ (لکھنو)
۲- سید ضامن علی صاحب ایم اے (الہ آباد)
۳- ڈاکٹر ایم حفیظ سید صاحب ایم اے۔ پی ایچ۔ ڈی۔ ڈی لٹ۔ ایل ٹی (الہ آباد)
۴- مولوی سید نجیب اشرف صاحب ندوی ایم۔ اے (اسمٰعیل کالج جوگیشوری۔ بمبئی)
۵- مولنا محمد طاہر صاحب فاروقی ایم۔ اے۔ مولوی فاضل۔ ادیب فاضل۔ دبیر کامل (آگرہ یونیورسٹی)
۶- پروفیسر حامد حسن صاحب قادری (آگرہ یونیورسٹی)
۷- مولوی عبدالقادر صاحب سروری ایم اے۔ ال ال بی (کلیہ فنون جامعہ عثمانیہ)
۸- مولوی سید محمد صاحب ایم اے (کلیہ بلدہ۔ جامعہ عثمانیہ)

(۱) مولوی سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب۔ ایم اے۔ ایل ٹی۔ (لکھنو یونیورسٹی)

آپ نے جس گھر میں آنکھیں کھولیں، اس میں تمول نہ تھا تو پریشان حالی بھی نہ تھی۔ قسمت نے آپ کو ایسے زمانے میں پیدا کیا

پروفیسر سید محمد اشرف ندوی

پروفیسر سید مسعود حسن رضوی

اسمٰعیل میرٹھی - اکبرالہ آبادی
نظم طباطبائی ـ شوق قدوائی

پروفیسر ڈاکٹر حفیظ سید

جب کہ عزت و وقار کا کاروان آپ کے برگزیدہ اور اولوالعزم بزرگوں کے ساتھ کوچ کر چکا تھا۔ آپ گردِ کارواں سے کاروان کی عظمتوں کا اندازہ کرنے کے لئے پیدا ہوئے۔ میراث میں وہ خاندانی ثروت و دولت نہ ملی البتہ چند سرکاری کاغذ زمانے کی دست برد سے محفوظ تھے یہی اس خاندان کی گزشتہ ترقی اور عروج کی یادگار تھے۔ وہ لوگ بھی نہ رہے جنھوں نے اپنی آنکھوں سے اس خاندان کو ترقی کی منزلیں طے کرتے دیکھا۔ ان کاغذات میں آپ کے دادا کے دادا سید عزیز علی ولد سید عبدالمطلب کی ایک جاگیر کی تفصیل درج ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ سید عزیز علی کے دادا سید سیف اللہ ولد سید محمود "بندہائے چوکی خاص" میں سے تھے۔ اور دوصدی ذات کے منصب پر فایز تھے۔ سید عزیز علی کی ایک بڑی جاگیر نواح گورکھپور میں تھی۔

آپ کے والد سید مرتضیٰ حسن مرحوم ایک عالم بزرگ اور حاذق طبیب تھے۔ اُن کا وطن اودھ کے ضلع اُناؤ میں قصبۂ نیوتنی تھا۔ حصولِ علم کے لئے کشاں کشاں لکھنو گئے۔ جہاں سے بہرائچ پہنچے۔ مسعود حسن صاحب رضوی کا مقام پیدائش بہرائچ اور تاریخ ۱۵ محرم ۱۳۱۱ھ ہے آپ کے والد کا خیال تھا کہ آپ عربی ادب اور علوم اسلامی میں دستگاہ حاصل کریں۔ لیکن اُردو نے آپ کو اپنی خدمت کے لئے منتخب کر لیا تھا۔ آپ کی عمر ابھی چند ہی برس کی تھی کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ مایوسیوں اور مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا سرپرست کی موت نے سارے حوصلے پست کر دئے۔ عزیز اقارب ایسے ہمدرد نہ تھے کہ آپ کی آئندہ فلاح و بہبود کا خیال ان کے دل میں پیدا ہوتا اور وہ آپ کے تعلیمی مصارف کے کفیل ہوتے۔ ایک بیوہ ماں کی اشک شوئیوں اور تسلیوں نے علم کے شوق کو آنسوؤں کی زد میں بہہ جانے سے روکا اور حصولِ علم کی آگ کو افسردگی کی راکھ میں بجھنے نہ دیا۔ اور برابر آپ کی ہمت بندھاتی رہیں۔ آپ کی تعلیمی زندگی اصل میں آپ کی والدہ محترمہ کی بدولت پروان چڑھی۔

آپ کی ذاتی استعداد اور دماغی صلاحیت کو بھی آپ کی تعلیمی ترقی میں بہت بڑا دخل ہے۔ اسکول کے ہر امتحان میں اول آتے اور سال بہ سال ترقی پاتے۔ آٹھویں درجے میں پہنچے تو دردِ سر کا عارضہ لاحق ہو گیا اور اب تک یہ دردِ سر پیچھا نہیں چھوڑتا۔ سال میں ایک آدھ دفعہ ضرور سر اٹھاتا ہے سر کے درد کے ساتھ تبخیر معدہ کی شکایت بھی پیدا ہو گئی۔ تو آپ کو سلسلۂ تعلیم جاری رکھنے میں سخت زحمت کا سامنا کرنا پڑا، بعض بہی خواہوں نے مشورہ بھی دیا کہ جان ہے تو تعلیم بھی ہے۔ مگر جو قدم تعلیم کی راہ میں آگے بڑھے وہ رکے اور نہ پیچھے ہٹے۔ آپ نے اس بیماری کی حالت میں بھی تعلیم جاری رکھی اور ۱۹۱۶ء میں کیننگ کالج لکھنو سے بی اے کا امتحان کامیاب کر لیا۔ بی اے کے بعد ام اے کا داخلہ لیا۔ ایک سال ادبیات انگریزی کی تحصیل میں صرف کیا۔ لیکن امتحان میں شریک نہ ہو سکے۔ اسی سال آپ پر ہیضے کے مہلک حملے ہوئے۔ زندگی تھی بچ گئے۔ اور اس دفعہ آپ کے شوقِ تعلیمی کو بیماری کے آگے سرد ہونا پڑا۔

اسی اثناء میں صوبۂ متحدہ کے سررشتۂ تعلیم میں ایک جگہ نکالی گئی۔ کام یہ تھا کہ صوبہ میں جتنی کتابیں بھی شائع ہوں ان کی فہرست تمام ضروری تفصیلوں کے ساتھ ہر سہ ماہی میں صوبے کے سرکاری اخبار (یو۔ پی۔ گورنمنٹ گزٹ) میں شائع کی جائے۔ اور عوام کے رجحان کا اندازہ کرنے کے لئے تبصرے لکھے جائیں۔ جس سے رپورٹ کے لئے مواد فراہم ہو سکے۔ اپریل ۱۹۱۸ء میں آپ کا تقرر اس خدمت پر ہو گیا، اور آپ لکھنو چھوڑ کر الہ آباد چلے گئے۔ اس ملازمت کی بدولت آپ کی نظر سے ہر تازہ کتاب گزرتی، اور مطالعہ کا جو شوق آپ کی فطرت میں تھا اس کی پوری بھڑاس نکلتی۔ ڈیڑھ دو سال کے قلیل عرصے میں آپ کی

نظر سے تقریباً دس ہزار کتابیں گزریں۔ اسی ملازمت نے آپ کی معلومات کو وسیع اور تصنیف و تالیف کے جذبہ کو بیدار کر دیا۔ ۱۹۲۲ء میں ٹیچرس ٹریننگ کالج الہ آباد سے آپ نے ایل ٹی کی ڈگری حاصل کی۔ اسی سال لکھنؤ یونیورسٹی کے جونیر لکچرار کی حیثیت سے آپ کا تقرر بہ یافت ۲۲۵ تا ۲۵۰ ہوا۔

اگست ۱۹۲۷ء میں اردو کے لکچرار کی حیثیت سے آپ کارگزار ہو گئے۔ ۱۹۲۵ء میں فارسی ام اے کا امتحان اس امتیاز کے ساتھ کامیاب کیا کہ آپ کو یونیورسٹی نے ایک طلائی تمغہ عطا کیا۔ آپ کی فارسی قابلیت بھی مسلم ہے۔ ۱۹۳۳ء میں آپ نے ایرانی زبان کی تحصیل و تکمیل کے ارادے سے ایران کا سفر بھی کیا۔

۱۹۳۰ء سے برابر ان دونوں اہم زبانوں کے پروفیسر ہیں اور دونوں شعبوں کی صدارت آپ ہی کے تفویض ہے۔ آپ کی موجودہ تنخواہ ساڑھے آٹھ سو ماہوار ہے۔ آپ کو قدیم اور نادر کتب کے جمع کرنے کا بے حد شوق ہے۔ اس صفت سے جو گہرا لگاؤ آپ کی طبیعت کو ہے وہ اردو کی توسیع و اضافہ کا ضامن ہے۔ لکھنؤ کی گلیوں کی خاک چھان چھان کر اور بڑی محنت ریزی کے بعد آپ نے اپنے کتب خانے میں نادر کتابوں کا کافی ذخیرہ فراہم کر لیا۔ قدیم تذکرے اور خطوط، کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ اور ایک قابل ذکر چیز یہ ہے کہ واجد علی شاہ کی تصانیف جتنی آپ کے ذخیرۂ کتب میں محفوظ ہیں دوسری جگہ نہیں ملتیں۔ ان کی تعداد چالیس بیالیس کے قریب ہے۔

شاعری آپ کے لئے اگرچہ "ذریعہ عزت" نہیں، پھر بھی جذبات کے اظہار کی خاطر اس کو بھی کام میں لاتے ہیں۔ آپ کے اشعار جذباتی اور بالکل فطری ہوتے ہیں۔ خاص کر بچوں کے لئے آپ جو نظمیں لکھتے ہیں وہ بہت مفید ہیں اور اردو ادب کی کمی کو پورا کرتے ہیں۔ خرابی صحت نے آپ کے علمی انہماک میں بہت کچھ رخنہ ڈالا۔ پھر بھی آپ کی قلمی کاوشیں کافی تعداد میں منظر عام پر آ چکی ہیں۔

آپ کی ایک تصنیف "ہماری شاعری" کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ کتاب کئی یونیورسٹیوں کے نصاب میں بھی داخل ہے۔ دوسری ادبی کوششیں یہ ہیں جو اردو کے لئے ایک قابل قدر اضافہ ہیں "امتحان وفا، فرہنگ امثال، فیض میر، مجالس رنگین، دبستان اردو، روح انیس، نظام اردو، جواہر سخن جلد دوم۔ ان کے علاوہ کئی ایک تنقیدی مضامین مختلف جرائد میں شائع ہو چکے ہیں آپ کے زیر تصنیف "تاریخ مرثیہ" ہے۔ یہ کتاب اپنی اہمیت اور نوعیت کے اعتبار سے اپنی آپ نظیر ہوگی۔ آپ نے اس کتاب کی تکمیل کے لئے بڑی کاوش سے مرثیوں اور مرثیہ نگاروں کے حالات جمع کئے ہیں۔ ان میں تقریباً تین سو مرثیہ نگاروں کے کہے ہوئے مرثیے شامل ہیں آپ کی دیگر علمی و ادبی مصروفیتیں بھی قابل ذکر ہیں آپ "ہندوستانی اکیڈیمی" کے ممبر ہیں اور اکیڈیمی کے سہ ماہی رسالہ "ہندوستانی" کے ایڈیٹوریل بورڈ کے رکن بھی۔ کئی سال تک انجمن اردو کے سکریٹری رہے اور انجمن کی طرف سے ۱۹۲۵ء میں ایک ادبی جلسہ اور ایک ادبی نمائش کی آپ نے جن مختلف علمی و ادبی انجمنوں میں مقالے پڑھے ان کے نام یہ ہیں۔ آل انڈیا اورینٹل کانفرنس، آل انڈیا شاعر کانفرنس، مسلم اکیڈیمی وغیرہ۔ مسلم اکیڈیمی لکھنؤ کے سکریٹری، نائب صدر اور صدر بھی رہ چکے ہیں۔

جناب مسعود حسن صاحب رضوی اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے مسلمہ ماہر اور ادیب ہیں آپ کی ذات سے اردو کو بالخصوص ایک بیش بہا امداد و ترقی کی توقع ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ صاحب موصوف کی بیشتر مصروفیتیں اسی کے لئے وقف ہیں۔ ہندوستان کی وہ تمام انجمنیں جنھیں اردو کی ترویج و توسیع سے دلچسپی ہے آپ کی خدمات کو حاصل کرنا اپنے مقصد کی کامیابی کے لئے لازمی سمجھتی ہیں۔ آپ کی ہر دلعزیزی، علمی تبحر، اخلاق کی برگزیدگی۔ ایسی خصوصیات ہیں جو آپ کو ایک ایسے درجے پر پہنچا دیتی ہیں جہاں پہنچنا ہر بہی خواہ اردو کا مقصد ہوتا ہے۔

(۲) کیپٹن سید ضامن علی صاحب ایم اے (الہ آباد یونیورسٹی)

سید ضامن علی صاحب ۱۸۹۷ء میں قصبہ مصطفیٰ آباد ضلع رائے بریلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق خاندان گرویز سے ہے یہ خاندان اپنی عزت و وقار کے لحاظ سے کافی شہرت رکھتا ہے اس کے اکثر افراد ممتاز عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں اس خاندان نے علم و ادب کے بہی خواہ بھی پیدا کئے۔ آپ کے جد امجد سید نوروز علی صاحب فارسی کے اسکالر اور ہندی کے زبردست شاعر تھے اور شاہان اودھ کے عہد میں ناظم سلطنت جیسے جلیل القدر عہدے پر فائز تھے۔ ضامن علی صاحب کا ننھیال اور ددھیال علم و فضل اور جاہ و منصب دونوں حیثیتوں سے قابل ذکر ہے۔ آپ کے ماموں میر علی عباد صاحب بیتاؔن ایک اچھے اور قادر الکلام شاعر تھے آپ کے والد سید واجد علی صاحب بھی اُردو کے بہت اچھے شاعر تھے۔

سید ضامن علی صاحب کی آنکھیں ایسے ماحول میں کھلیں، جس میں علم و ادب کے تذکروں کے سوا کچھ نہ تھا۔ آپ کا مکتب آپ کا گھر ہی تھا۔ بچپن کا بیشتر حصہ لکھنؤ میں گزرا۔ علامہ سید جواد صاحب اور مولانا شیخ فدا حسین سے شرف تلمذ رہا۔ علوم شرقیہ کی تعلیم لکھنؤ ہی میں ہوئی۔ البتہ انگریزی تعلیم کے آغاز کے بعد سے آپ کو مختلف مقامات سے امتحانات پاس کرنے پڑے آپ نے آگرہ سے انٹرمیڈیٹ اور الہ آباد سے بی اے اور ام اے کی اسناد حاصل کیں ۱۹۱۶ء میں گریجویٹ ہونے کے بعد ہی الہ آباد ہائی کورٹ میں مترجم کی حیثیت سے امور ہوئے اور کچھ دنوں بعد ڈپٹی کلکٹری کے لئے بھی نامزد کئے گئے لیکن علم و ادب کی خدمت کے شوق نے آپ کو اس کام سے بیزار کر دیا اور آپ نے ایونگ کرسچن کالج میں فارسی کا پروفیسر بننا پسند کیا۔ اور کم و بیش چھ سال تک اس کالج میں اپنا فرض منصبی نہایت خوش اسلوبی سے ادا کرتے رہے۔ الہ آباد یونیورسٹی کے فارسی پروفیسر جناب ناصری مرحوم جب بجنور ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہو کر چلے گئے تو یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد کی نظر انتخاب آپ ہی پر پڑی۔ اور جب اس یونیورسٹی میں پہلے پہل شعبۂ اُردو کھولا گیا تو آپ ہی اس کے صدر مقرر کئے گئے آپ کی علمی قابلیت، طریقۂ تعلیم اور حسن خلق کا ہر شخص معترف ہے اور آپ نہایت کامیابی کے ساتھ اپنے اہم فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہیں

آپ کی دماغی صلاحیتوں کو شاعرانہ ماحول ملا۔ علم و ادب آپ کی گھٹی میں پڑا تھا آپ بچپن ہی سے اس آب حیات کے پیاسے تھے اور اپنی تمام کوششوں کو حصول اور خدمت علم کے لئے وقف کر چکے تھے۔ آپ کا شمار ہندوستان کے اچھے شاعروں اور ادیبوں میں ہوتا ہے آپ کی شاعری حضرت منیاؔس کے فیض صحبت کی مرہون منت ہے۔ یونیورسٹی کے لکچروں کے علاوہ آپ اُردو کی خدمت کے لئے کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں اُردو زبان اور ادب پر آپ نے ایک زبردست اور عالمانہ مقالہ سپرد قلم کیا ہے۔ جو ہندوستانی اکیڈمی اور سپرو کمیٹی کی رپورٹ پر پیش کیا گیا۔ تاریخ زبان اور اُردو ادب پر اس مقالے کے پڑھنے سے کافی عبور حاصل ہو سکتا ہے

قصائد، سلام، رباعی، مرثیے بھی آپ کی طبع موزوں اور فکر رسا کا نتیجہ ہیں۔ جو وقتاً فوقتاً ہندوستان کے مقتدر رسائل میں شائع ہوا کرتے ہیں۔ آپ نے ایک تاریخی مقالہ "واقعات کربلا" پر اورنٹیل کانفرنس میں پڑھا۔ علم تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ مقالہ قابل قدر چیز ہے۔ اور وہی لوگ آپ کی کاوش اور محنت کی داد دے سکیں گے۔ اس مقالہ کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اب تک کئی بار طبع ہو چکا ہے۔

مرثیہ نگاری آپ کا مرغوب موضوع ہے۔ آپ نے اس کی تحقیق و تاریخ کی ترتیب کا کام شروع کر دیا ہے۔ بہت جلد اس صنف پر سیر حاصل مواد منظر عام پر آجائے گا۔ آپ کی دوسری تصانیف "سیر کشمیر اور گوہر سیلون" ہیں۔ ان کتابوں میں سیر کشمیر اور سیلون کے حالات درج ہیں۔

آپ اُردو ادب سے تعلق رکھنے والی کئی انجمنوں کے صدر اور ممبر ہیں۔ آپ اکثر تعلیمی بورڈوں اور یونیورسٹیوں کے ممتحن بھی ہوتے رہے ہیں اور کئی سال تک انڈین سیول سروس کے بھی ممتحن رہ چکے ہیں۔ آپ کو فوجی تعلیم سے بھی کافی دلچسپی ہے۔ ایک ادب کے پروفیسر کے لئے یہ دلچسپی یقیناً شاذ کا حکم رکھتی ہے۔ آپ الہ آباد یونیورسٹی کی یو۔ ٹی۔ سی کے کمانڈنگ افسر کی حیثیت سے اپنا کچھ وقت دیتے ہیں اور گورنمنٹ نے آپ کو کپتان کا عہدہ دیا ہے۔

آپ کی گرانمایہ خدمات اُردو کے لئے ایک بیش بہا اضافے کی ضامن ہیں خدا کرے کہ آپ کی غیر مطبوعہ کتابیں جلد شائع ہو کر منظر عام پر آسکیں۔

(۳) ڈاکٹر ایم حفیظ سیّد صاحب۔ ام اے۔ پی اچ۔ ڈی۔ ڈی لٹ۔ ال ٹی۔ (الہ آباد یونیورسٹی)

میرے پہلے عریضے کے جواب میں صاحب موصوف نے لکھا "مجھے افسوس ہے کہ میرے یہاں اپنی کوئی تصویر موجود نہیں اور نہ فی الحال تصویر کھینچوانے کا ارادہ ہے۔ میرے حالات نہایت مختصر ہیں۔ میں چودہ برس سے الہ آباد یونیورسٹی میں اُردو بی اے اور ام اے کی جماعتوں کو پڑھاتا ہوں۔ اس اختصار نے مجھے مایوس سا کر دیا اس صورت میں آپ کے مفصل حالات زندگی اور کام سے اُردو دنیا کو متعارف کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ جانتا تھا کہ صاحب موصوف "گم نامی کی زندگی کو شہرت اور ناموری پر ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن دوسری دفعہ پھر اسی سلسلے میں یاد دہانی کی۔ بارے جواب خط کے ساتھ تصویر بھی وصول ہوئی۔ حالات اور کام "کافی" کے بجائے صرف "مختصر" رہ گئے۔ جس کے لئے میں آپ کا مشکور ہوں۔

آپ کے والد کا نام نظر حسن اور وطن ضلع غازی پور ہے۔ ضلع کے زمینداروں میں ان کا شمار تھا۔ شعر و سخن کا اچھا ذوق رکھتے تھے خود بھی ایک "خوب کہنے والے" شاعر تھے۔ نظرؔ تخلص کرتے تھے۔ ایک مثنوی "جلوۂ طور" انھوں نے اپنی یادگار چھوڑی ہے۔

آپ کی ابتدائی تعلیم مکتب میں ہوئی۔ انگریزی تعلیم دیر میں شروع کی۔ لکھنو اور الہ آباد کے اسکول اور کالجوں میں بی اے کی تعلیم پائی بی اے کی ڈگری لینے کے بعد آپ نے الہ آباد ٹرینگ کالج سے ال ٹی کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد آپ نے ملازمت اختیار کر لی۔ دس سال تک مختلف مدارس اور کالجوں میں ہیڈ ماسٹر اور پرنسپل رہے۔ ۱۹۲۵ء سے الہ آباد یونیورسٹی میں اُردو کی لکچراری پر مامور ہیں۔ ۱۹۳۲ء میں آپ نے لندن یونیورسٹی سے پی اچ۔ ڈی اور ۱۹۳۳ء میں ڈی لٹ کی ڈگری جامعۂ ماپل ئے سے حاصل کی۔

آپ نے حصولِ علم اور تحقیقاتی کام کے لئے بہت دور دراز سفر کئے۔ ڈی لٹ کی ڈگری فرانس کی ایک قدیم یونیورسٹی "ماپل ئے" سے حاصل کی۔ آپ کو فلسفہ و تصوف سے بھی گہری دلچسپی ہے۔ درس و تدریس میں آپ کا تجربہ بہت بڑھا ہوا ہے۔ لندن سے ٹیچرس ڈپلوما حاصل کیا۔ الہ آباد کے ال ٹی ہیں۔ اور عمر کا بیشتر حصہ محکمہ تعلیمات کی خدمت میں صرف کر چکے ہیں۔

آپ کی ادبی کاوشیں، مقالوں، مضمونوں اور کتابوں کی صورت میں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ آپ نے صرف اُردو ہی میں نہیں بلکہ انگریزی میں بھی اپنے علمی شغف اور تبحر کا ثبوت دیا ہے۔ آپ کی حسب ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

سکھ سہیلا، از برہان الدین شاہ جانم۔

منفعت الایمان۔ از برہان الدین شاہ جانم۔

قاضی محمود بحری یہ کتاب (A mystic poet of 12 th century) کے عنوان سے مستقل طور پر انگریزی میں بھی لکھی گئی ہے

کلیات قاضی محمود بحری ۔ مع مقدمہ تشریح اور فرہنگ ۔ یہ ڈاکٹر صاحب کا نہایت معرکتہ آلارا اور اہم کارنامہ ہے جس میں دکنی سلطنتوں کے آخری دور کے شاعر بحری کے کلام کو بڑی تحقیق کے ساتھ شایع کیا گیا ہے ۔ یہ کام ہر شخص نہیں کر سکتا ۔ کیونکہ قدیم اُردو کے قلمی نسخوں کو پڑھنا اور متروک الفاظ کو سمجھنا بڑے بڑے عالموں کے لئے بھی مشکل ہے ۔ اس کلیات کی اشاعت نے ڈاکٹر سید صاحب کو اُردو کے بلند پایہ محققوں کی صف میں ممتاز جگہ دے دی ہے ۔

"دکن کی اُردو شاعری" ۔ (یہ مضمون نگار میں چھپا تھا) "بنگالی شعرائے اُردو" ۔ "یورپین شعرائے اُردو" (زمانہ کانپور)
"غالب کے کلام کا مطالعہ" (الہ آباد یونیورسٹی میگزین)

اسی طرح حالی، شبلی، محمد حسین آزاد، دیوان جہاں وغیرہ پر آپ کے مضامین شایع ہوئے ۔ فرانسیسی میں آپ نے ایک کتاب "آپٹی میزم ان انڈین تھاٹ" (ہندوستانی تخیل میں رجائیت) شائع کی ہے ۔

آپ کئی انجمنوں کے معتمد اور ممبر ہیں ۔ کئی کمیٹیوں کے سرگرم کارکن اور مختلف "Boards" مجالس کے ممبر بھی ہیں ۔ الہ آباد آگرہ اور یوپی کی اکثر تعلیماتی کمیٹیوں کے مشیر اور ممبر ہیں ۔ اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر آپ کا شمار شمالی ہند کے برآوردہ ماہرین تعلیم میں ہو سکتا ہے آپ نے ہندوستان اور دیگر مقامات کا سفر کیا ۔ صوبجات بمبئی، متوسط اور یوپی کے مختلف مدارس کا معائنہ کیا اور وہاں کے اصول تعلیم کے متعلق معلومات حاصل کیں اُردو زبان اور ادب کے علاوہ فلسفہ اور فن تعلیم پر بھی آپ کے پچاسوں مضامین اکثر انگریزی اُردو رسائل میں شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں ۔ آپ کی ذات اُردو اور سررشتہ تعلیم کے لئے بے حد غنیمت ہے ۔

صاحب موصوف کی تصنیفات اور مضامین اُردو زبان کی اہم ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں ۔ مشاہیر اُردو ادب، جن کے جواہر پاروں کو صرف سطحی نظروں سے جانچا جاتا تھا، آپ نے ایک ایسے انداز میں روشناس کرایا ہے جس سے ان کی عظمتوں پر ہر پہلو سے روشنی پڑتی ہے ۔ اور وہ منور گوشے جن پر کور ذوقی نے پردے ڈال رکھے تھے روشن نظر آتے ہیں ۔ آپ نے شاہ برہان الدین جانم، قاضی محمود بحری محمد حسین آزاد، شبلی، حالی، غالب اور دوسرے شعرا اور مصنفین کا جس غائر نظری سے مطالعہ کیا ہے، اور اس کے بعد جس انداز سے ان پر اپنے خیالات اور ان کے محاسن کو پیش کیا ہے، اس سے آپ کی تنقیدی صلاحیتوں اور قوت اخذ و تحقیق کا اندازہ ہو سکتا ہے ۔ دکن سے بھی آپ کو خاص دلچسپی ہے ۔ شمالی ہند میں دکن کے قدیم شاعروں کو روشناس کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے قدیم زبان کو سمجھنا اور اس پر کام کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے ۔

(۱۸) مولوی سید نجیب اشرف صاحب ندوی ام اے ۔ (اسمٰعیل کالج جوگیشوری بمبئی)

ولادت ۶؍ جون ۱۹۰۱ء ۔ مقام ولادت ارموری ۔ ضلع چاندہ ۔ آپ کے والد ڈاکٹر سید محمد یسین صاحب ارموری کے سرکاری ڈاکٹر تھے ۔ آپ زیدی واسطی سید ہیں اور سادات بارہا سے خاندانی تعلق رکھتے ہیں جو فرخ سیر کے زمانے سے دیسنہ ضلع پٹنہ صوبہ بہار میں سکونت پذیر رہے ۔

آپ کی ابتدائی تعلیم مرہٹی سے ہوئی چنانچہ اس زبان میں ورناکلر فائنل کے امتحان میں کامیاب ہوئے ۔ اس کے بعد قرآن شریف، اُردو اور فارسی زبان کی تعلیم پائی ۔ ۱۹۰۹ء میں آپ کو دارالعلوم ندوہ بھیج دیا گیا ۔ آپ ندوہ میں چار سال تک رہے ۔ اس دوران میں آپ اپنی جماعت میں ہر سال اول آتے رہے ۔ اور ایک ممتاز حیثیت کے مالک رہے ۔ آپ مولانا شبلی کے شاگرد رہ چکے ہیں

مولانا نے آپ کی ادبی وعلمی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں خاص توجہ سے کام لیا۔ مولانا جس وقت سیرۃ لکھ رہے تھے آپ ان سے "بلاغ المرام" کا درس لیا کرتے تھے۔

آپ کی انگریزی تعلیم ۱۹۱۳ء سے شروع ہوئی ہے۔ میٹرک اور ایف اے کے امتحانات درجۂ اول میں کامیاب کئے اور وظائف سرکاری کے مستحق قرار پائے۔ بی اے میں زیر تعلیم تھے کہ ترک موالات کی وبا اٹھی اور آپ کو سلسلۂ تعلیم قطع کرنا پڑا آپ ۱۹۲۰ء میں دار المصنفین اعظم گڑھ چلے گئے۔ وہاں آپ کی مصروفیتیں زیادہ تر علمی و تحقیقی رہیں۔ اس دوران میں ترک موالات کا ہنگامہ کچھ کم ہوا۔ آپ نے پھر تعلیم کی طرف توجہ کی اور بی اے میں شرکت کی۔ ۱۹۲۴ء میں بی اے کا امتحان آنرز کے ساتھ کامیاب کیا۔ اور یونیورسٹی کے جملہ طلبا میں اول رہے۔ یونیورسٹی نے وظیفہ عطا کیا۔ اس کے بعد ۱۹۲۶ء میں ام اے فارسی وعربی بھی درجۂ اول میں پاس کیا اور سب میں اول رہے۔ اس صلے میں یونیورسٹی نے طلائی تمغہ اور دو سو روپے کی کتابیں دیں۔

سلسلۂ تعلیم کو ختم کرنے کے بعد آپ علمی خدمت میں منہمک ہوگئے اور دار المصنفین کا کام کرتے رہے۔ اور اپنی بیش بہا خدمات سے اردو اور دار المصنفین کو مستفیض کیا۔ ساتھ ہی مختلف رسائل کو مضامین بھی روانہ کرنے لگے۔ آپ ۱۹۳۰ء میں گجرات کالج احمد آباد میں فارسی کے استاد مقرر ہوئے۔ آپ اردو کے سچے بہی خواہ اور خدمت گذار ہیں۔ صوبہ کی انجمن ترقی اردو کے سکریٹری ہیں۔ آج کل آپ ایک نہایت ہی گرانمایہ اور اہم کتاب کے لکھنے میں مصروف ہیں۔ اس کتاب کی اہمیت نام ہی سے ظاہر ہے یعنی "گجرات میں اردو" اور یہ صاحب موصوف کی دس سالہ تحقیق وکاوش کا نتیجہ ہوگی۔ ۱۹۳۱ء سے آپ اسمٰعیل کالج جوگیشوری کے اردو کے استاد ہیں۔ رقعات عالمگیری کی دوسری جلدوں کی ترتیب کا کام بھی آپ کے پیش نظر ہے دوسری علمی مصروفیتوں کے ذکر میں آپ یونیورسٹی کے اردو بورڈ کے رکن اور اردو ٹکسٹ بک کمیٹی کے ممبر ہیں۔

نجیب اشرف صاحب ندوی کا نام اردو کی دنیا میں محتاجِ تعارف نہیں۔ آپ کی کتابیں اور مضامین اہمیت اور معلومات کے اعتبار سے بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ اور آپ ہندستان کے اچھے محققین اور ادیبوں کی صف میں اپنے لئے جگہ پاتے ہیں۔ آپ کا سب سے اہم کارنامہ جو منظر عام پر آچکا ہے رقعات عالمگیر اور ان کا معرکتہ الآرا مقدمہ ہے جس کی ترتیب وتالیف نے آپ کو ایک بلند پایہ محقق ثابت کردیا۔

(۵) مولانا محمد طاہر صاحب فاروقی ام اے۔ مولوی فاضل، ادیب فاضل، دبیر کامل (آگرہ یونیورسٹی)

مولانا السنہ اربعہ (عربی، فارسی، اردو، انگریزی) کے مستند اور متبحر عالم ہیں۔ اور ساتھ ہی ہومیوپیتھک کے امتحان۔ ایچ ایل، ایم، ایس کے سند یافتہ اور گولڈ میڈلسٹ ہیں۔ ہندوستان کی مختلف جامعات سے آپ نے امتیازی کامیابی حاصل کی لکھنؤ سے دبیر کامل، الہ آباد سے منشی کامل، اور مولوی فاضل پنجاب سے مولوی عالم اور ادیب فاضل کی اسناد حاصل کیں اور تقریباً پندرہ سال سے اردو اور فارسی زبان کی تعلیم دیتے ہیں۔ پانچ چھے سال سے آگرہ کالج میں صدر شعبۂ اردو فارسی ہیں۔

آپ کے اکثر مضامین رسائل میں طبع ہوا کرتے ہیں۔ آپ نے طلبہ کے لئے متعدد نصابی کتب لکھیں۔ ان کے علاوہ چند قابل ذکر تصانیف یہ ہیں:۔

(۱) سیرت مولانا محمد علی۔ مولانا کی وفات کے بعد ۱۹۳۱ء میں سب سے پہلے فاروقی صاحب ہی نے یہ مختصر لیکن جامع سیرت لکھی

اس کتاب میں مصنف نے بعض ایسے حالات بھی لکھے ہیں جو خاندانی ذرائع سے حاصل کئے گئے۔ فاروقی صاحب کو مولانا سے ایک خاص تعلق، اپنے والد کی طرف سے تھا۔ مولانا اور فاروقی صاحب کے والد محمد محسن مرحوم بڑے گہرے دوست تھے۔ اور اسی دوستانہ کی وجہ سے فاروقی صاحب کو بعض ایسی معلومات بہم پہونچیں جو دوسروں کی دسترس سے باہر ہیں۔ اسلوب بیان نہایت عمدہ اور محققانہ شان لئے ہوئے ہے۔ مولانا کی سیرت پر ایک تشفی بخش اور کامل ریویو کیا گیا ہے۔ ہندستان میں اس کتاب کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔

سرکار دو عالم ۔ حضور سرور کائنات صلعم کی مختصر سیرت پاک ہے جامعہ ملیہ دہلی نے بھی اپنی کتاب کے لئے یہی نام انتخاب کیا ہے لیکن فاروقی صاحب کی کتاب بہت پہلے طبع ہو چکی ہے۔ اس کتاب میں آنحضرتؐ کی زندگی کو مختلف پہلوؤں سے پیش کیا گیا ہے طرز بیان نہایت موزوں اور موضوع کے شایانِ شان ہے۔

ادبیات ایران نو ۔ ایران کی جدید شاعری کو ہندستان میں روشناس کرنے کے لئے پروفیسر فاروقی نے شعرائے ایران کے نظم و نثر کے مختلف نمونے جمع کر کے پیش کئے ہیں اور موجودہ ایران کی ذہنی کش مکش اور رجحان کو ایک مبسوط مقدمہ میں ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب پر مختلف جامعات کے پروفیسر صاحبان نے بڑی اچھی تنقیدیں کی ہیں۔

سیرت اقبال یہ کتاب فاروقی صاحب کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ ہے اقبال پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بہت کچھ لکھا جائے گا۔ لیکن فاروقی صاحب نے اقبال کے کلام کو صحیح معنوں میں سمجھا ہے۔ اور آپ کی کتاب کو "اقبالیات" میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔

مولانا فاروقی بزم اقبال آگرہ کے بانی بھی ہیں۔ اسی بزم کی سرپرستی میں دو شاندار جلسے "یوم اقبال" اور "یوم اردو" کے ترتیب دئے گئے۔ اس بزم کے پیش نظر دو مقاصد ہیں، ایک تو یہ کہ زبان اُردو کی خدمت اور دوسرا پیغام اقبال کی اشاعت۔

جامعۂ اُردو ۔ مولانا فاروقی کی تحریک سے بزم اقبال کی سرپرستی میں آگرہ میں ایک اُردو یونیورسٹی کا انعقاد عمل میں لایا گیا ہے جس کو سر محمد یعقوب ممبر کونسل ڈاکٹر سر شفاعت احمد خاں، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں۔ خواجہ غلام السیدین کی سرپرستی حاصل ہے۔ فاروقی صاحب اس کے رجسٹرار ہیں۔ جامعہ مذکورہ کی نگرانی میں تین امتحانوں کا انتظام کیا گیا ہے۔ ادیب، ادیب ماہر، ادیب کامل۔ اس تحریک کا اولین مقصد ترویج و خدمت اُردو ہے۔ فاروقی صاحب کی مساعیٔ جمیلہ کو مشکور اور کامیاب دیکھنے کی آرزو ہر بہی خواہ اُردو کے دل میں ہونی چاہئے۔

(۶) پروفیسر حامد حسن صاحب قادری ۔ (آگرہ)

میرے خط کے جواب میں، جس میں میں نے صاحب موصوف سے تصویر، حالات زندگی اور کام کا خاکہ روانہ کرنے کی درخواست کی تھی آپ نے تحریر فرمایا ہے "آپ مجھ سے مری تصویر اور حالات مانگتے ہیں۔ میں تصویر کے جواب میں نہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ

"مجھ کو دیکھو میری تصویر میں کیا رکھا ہے" نہ یہ کہ

"ہر کہ دارد میل دیدن در سخن بیند مرا"

تصویر کھینچوانے سے مجھے پرہیز نہیں۔ لیکن دوا کے طور پر گوارا کر لیتا ہوں اب کئی سال سے کوئی تصویر نہیں کھینچی۔ اس لئے بھیجنے سے معذور ہوں مجھے نہ صرف تصویر کی عدم وصولی کا بلکہ آپ نے حالات زندگی بیان کرنے میں جس اختصار سے کام لیا ہے اس کا بھی ذکر کر دینا چاہئے۔ میں

قارئین سب رس کو صرف اسی حد تک متعارف کرواسکتا ہوں کہ آپ کی زندگی نہایت پر سکون گزری ہے اور آپ ایک مقدس خاندان کے نام لیوا ہیں۔ آپ کا سلسلۂ نسب بابا فرید گنج شکر سے ملتا ہے۔ تقریباً چالیس سال سے شعر و سخن اور مضمون نگاری کا شغل ہے۔ درس و تدریس کا سلسلہ کوئی بارہ سال سے جاری ہے۔ سینٹ جانس کالج آگرہ کی اُردو اور فارسی تعلیم آپ ہی کے تفویض ہے۔

آپ کی علم دوستی اور لیاقت کا ہر اُردو داں معترف ہے۔ ہندستان کے اکثر و بیشتر رسائل آپ کے مضامین، نظموں اور غزلوں سے مزین رہتے ہیں۔ تالیف و تصنیف کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ جب ساتویں جماعت میں تعلیم پا رہے تھے، ایک انگریزی ناول کا خلاصہ مرتب کیا۔ جسے اخبار پھول نے چھپوایا۔ اور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک تین چھوٹی کتابیں گلدستۂ اخلاق، رفیق تنہائی اور حسنین لکھیں ۱۹۰۶ء سے آپ نے میدانِ صحافت میں باقاعدہ قدم رکھا۔ آپ کی نظمیں اور مضامین زمانہ، مخزن، علی گڑھ منتلی وغیرہ جیسے مقتدر رسائل میں طبع ہونا شروع ہوئے اور علمی طبقہ میں آپ ایک اچھے شاعر اور کامیاب انشا پرداز سمجھے جانے لگے۔

آپ نے ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۴ء تک بچوں کا ایک پرچہ "اخبار سعید" نکالا اور اسی اخبار کے سلسلہ میں "بچوں کا کتب خانہ" جاری کیا اور بچوں کے لئے متعدد اخلاقی کتابیں لکھیں۔ آپ کی مختلف چھوٹی اور بڑی تصنیفات ایک کثیر تعداد میں ہیں۔ جن میں سے اکثر مختلف صوبوں اور محکموں کے نصاب میں جاری اور رائج ہیں۔ بالخصوص شعبۂ تعلیم سے متعلق اور طلبہ کی ضرورتوں کا لحاظ کرتے ہوئے آپ نے بعض بہت قیمتی اور کارآمد کتابیں لکھی ہیں یہاں میں آپ کی چند مشہور تصانیف و تراجم کا نام دے دینا ضروری سمجھتا ہوں (۱) باغبان۔ یہ کتاب ڈاکٹر ٹیگور کی مشہور تصنیف "گارڈنر" کا ترجمہ ہے جو کملن کمپنی کی فرمائش پر کیا گیا، ترجمہ رفتہ و شستہ اُردو میں ہے (۲) الکہل اور زندگی۔ یہ کتاب بھی مکملن کمپنی کی فرمائش پر لکھی گئی۔ (۳) فطرت اطفال۔ ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے جسے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ نے طبع کیا۔ (۴) کمال داغ۔ داغ دہلوی کے چاروں دیوانوں کا انتخاب ایک مبسوط ناقدانہ اور بصیرت افروز مقدمہ کے ساتھ ہے۔ (۵) تاریخ مرثیہ گوئی۔ اپنی کتاب میں مختصراً مرثیہ کی ابتدا اور عروج کے حالات بیان کئے ہیں اور مرثیہ سے متعلق جملہ معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ (۶) تاریخ و تنقید ادبیات اُردو۔ شعر و ادب اُردو کے متعلق تاریخی و تنقیدی مضامین اس کتاب میں جمع کئے گئے ہیں۔ مزید براں ایک مقدمہ بھی شامل ہے جس میں "اردو، ہندی، ہندستانی" کے مسئلہ پر فاضلانہ بحث کی گئی ہے۔ ایک اور کتاب "داستان تاریخ اُردو" کے نام سے زیر طبع ہے۔ اس کتاب میں اردو کی مکمل تاریخ مل سکتی ہے اور بعض گم نام ہستیاں جنھیں دوسرے تذکروں میں نظر انداز کر دیا گیا ہے منظر عام پر آجاتی ہیں۔ اور مصنف کو بعض ذرائع سے ایسے نایاب نسخے بھی ملے ہیں جنھیں اُردو سے بہت گہرا تعلق ہے۔ مثلاً فضلی کی "کربل کتھا"

آپ کی مرتبہ دوسری اور بہت سی کتابیں ہیں۔ جو ابھی زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئی ہیں۔ ان کتابوں میں اکثر آپ کے علمی و ادبی مضامین کے مجموعے۔ ناول اور تنقیدی و تاریخی تحریریں شامل ہیں۔ ان مرتبہ کتابوں میں سے چند کے نام یہ ہیں (۱) مرأت سخن۔ (۲) دفتر تواریخ (۳) صید و صیاد (۴) تذکرہ ہمایوں وغیرہ۔

صاحب موصوف کی تصنیفات اُردو کے لئے ایک اضافہ ہیں تقریباً ہر موضوع پر آپ نے قلم اٹھایا ہے اور جو کچھ بھی لکھا ہے بڑی کاوش اور تحقیق کے ساتھ لکھا ہے اور یہی خصوصیات آپ کو اپنے دوسرے ہمسروں سے ممتاز بناتی ہیں، زمانہ ایسے باہمت اور لایق اصحاب کے لئے مواقع مہیا کرے تو اردو ادب کی کم مایگی کا بہت کچھ ازالہ ہو سکتا ہے۔ آپ کی پوری زندگی علمی انہماک میں بسر ہوئی

پروفیسر سید محمدؐ

پروفیسر عبدالقادر سروری

نواب مرزا سیف علی خاں
ناظم اعزازی کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو

خواجہ حمید الدین شاہد
مہتمم مدیر سب رس و ادارۂ ادبیات اردو

بچپن ہی سے تالیف و تصنیف کا سلسلہ شروع ہوا اور اب تک کئی قابل قدر کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

(۷) عبدالقادر صاحب سروری ام اے۔ال ال بی (عثمانیہ)

حیدرآباد کی علمی بیداری، جامعہ عثمانیہ کے چند ہونہار فرزندوں کی مساعیٔ جمیلہ کی مرہونِ منت ہے۔ انھیں ادیبوں اور انشا پردازوں کی کوششوں نے دکن کو علم و ادب کا مرکز اور ایک خاص اہمیت کا مالک بنا دیا ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری کا شمار بھی انہیں ادیبوں میں ہوتا ہے جنھوں نے حیدرآباد کی علمی دنیا میں انقلاب کی روح پھونکی جن کی تالیفات اور تصانیف نے ایک ایسے دور کی ابتدا کی جو بجا طور پر اُردو کا "دورِ نشاط" کہلایا جا سکتا ہے۔ صاحب موصوف نے تنقید، ترتیب، اور انشا پردازی کے لئے نئے اصولوں اور انوکھے اسلوب اختیار کئے اور تشنگانِ علم و ادب کے لئے نئے نئے راستے کھول دئے۔ حیدرآباد کے اکثر ادیب اور انشا پرداز کسی نہ کسی طرح آپ کی تحریروں سے متاثر نظر آتے ہیں۔

سروری صاحب کی شہرت حیدرآباد تک ہی محدود نہیں بلکہ سارے ہندوستان میں آپ کی تصانیف قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔ گزشتہ سال مجھے علی گڑھ جانے کا موقع ملا۔ وہاں میرے ایک دوست زیر تعلیم تھے۔ ان کے توسط سے مجھے وہاں کی علمی فضا میں کچھ دن گزارنے کا موقع ملا۔ پروفیسر صاحب موصوف کے شاگرد ہونے کی سعادت نے مجھے جس "لطفِ خاص" کا مستحق قرار دیا، اس سے میں آپ کی عظمتوں کا اور بھی معترف ہوا۔ سروری صاحب کی گرانمایہ تصنیف "جدید اردو شاعری" نے آپ کو اکثر یونیورسٹیوں میں ایک فاضل ادیب کی حیثیت سے روشناس کیا ہے۔ علی گڑھ میں اسی کتاب کو "نصابی کتب" کا درجہ حاصل ہے۔ وہیں مجھے اس حقیقت کا بھی احساس ہوا کہ حیدرآباد علمی حیثیت سے چاہے کتنا ہی آگے ہو۔ محسن شناسی اور قدردانی کے میدان میں اس نے قدم نہیں اٹھائے۔ سروری صاحب علم و ادب کی خدمت میں اپنی پوری صلاحیتوں کو وقف کئے ہوئے ہیں اور صلہ و تحسین کا خیال کئے بغیر خدمتِ علم و ادب میں مصروف ہیں۔

آپ کی ولادت ۱۳۲۴ھ میں حیدرآباد دکن کے محلہ سلطان شاہی میں ہوئی۔ یہ مشہور قطب شاہی محلہ حیدرآباد کے اکثر علماء و فضلا کا مسکن رہ چکا ہے۔ یہیں کے ادبی ماحول میں آپ کی ذہنی صلاحیتوں نے ایک خاص رنگ اختیار کرنا شروع کیا۔ آپ کے والد ماجد حاجی محمد سرور قادری، معاشدار اور بڑے پابند اوقات بزرگ ہیں۔

آپ کے جد امجد حضرت سرور سلطان کشمیر سے تشریف لائے تھے انہیں بزرگ کی نسبت سے آپ سروری کہلاتے ہیں۔ حضرت سرور سلطان ایک باخدا بزرگ تھے۔ حیدرآباد آکر نوبت پہاڑ پر چلہ نشین ہوئے اور ارادتمندوں اور اہل غرض کو اپنی روحانی برکات سے مالامال کرتے رہے۔ آپ کی رحلت کے بعد آپ کا مزار اسی پہاڑ پر بنایا گیا اور آج تک آپ کا عرس بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ انھیں بزرگوں کے سائے میں پروان چڑھتے ہوئے سروری صاحب نے میدانِ علم میں قدم رکھا۔ آپ کے والد انگریزی تعلیم کے مخالف تھے وہ آپ کو مشرقی علوم و فنون کی تعلیم دلانا چاہتے تھے۔ لیکن قسمت نے آپ کو اُردو کی خدمت کے لئے منتخب کر لیا تھا۔ آپ نے ہر قسم کی قربانی قبول کی۔ اور ایک ایسی منزل میں قدم رکھا جہاں دشواریاں سد راہ تھیں۔ اور سب سے بڑی مصیبت سرپرستوں کی توجہ سے محرومی تھی۔ اس پر بھی آپ نے جدید علوم کی تحصیل کو اپنا مقصد بنالیا۔ ایک ادیب کی زندگی کو جن "روایتی" مصائب سے دوچار ہونا پڑتا ہے آپ کی قسمت میں بھی تھیں۔

آپ کی ابتدائی تعلیم مکتب سے شروع ہوتی ہے "زماں خاں شہید" کے گنبد میں ایک "مولوی صاحب" درس دیا کرتے تھے۔ آپ نے ان کے آگے زانوئے شاگردی تہہ کیا۔ پھر آپ "مدرسہ منصبداران" میں اور یہاں سے نکل کر "دھرم ونت ونیکو لرہائی اسکول" میں شریک ہوئے۔ ان مدارس میں آپ کا شمار ذہین اور محنتی طلبہ میں ہوتا تھا ادبی سرگرمی کا آغاز انہیں ابتدائی منزلوں میں ہوچکا تھا اور جس قلیل عرصے میں آپ نے منزلِ مقصود تک رسائی حاصل کی وہ انہیں ابتدائی کوششوں کا نتیجہ ہے سٹی کالج حیدرآباد کا قدیم اور مشہور کالج ہے حیدرآباد کا کوئی ادیب ایسا نہیں جسے اس کالج کی فیض رسانیوں نے ممنون نہ کیا ہو "مفید الانام" کے بعد آپ مدرسہ فوقانیہ بلدہ میں شریک ہوگئے۔ میٹرک کامیاب کرنے کے بعد جامعہ عثمانیہ میں داخلہ حاصل کیا۔ اُردو، فارسی آپ کے اختیاری مضامین رہے۔ مولانا وحید الدین سلیم کی شاگردی میں آپ کے علمی جوہر اجاگر ہونے لگے۔ آپ مولانا کے چہیتے شاگرد تھے۔ مولانا کی جوہر شناسی نے آپ کی ہر قسم کی رہنمائی کی اور جب رخصت پر تشریف لے جارہے تھے تو مولانا نے اُردو کی مددگار پروفیسری کے لئے آپ ہی کی سفارش کی۔ اسی سفارش اور ذاتی قابلیت کی بناء پر آپ موجودہ عہدے پر مامور ہوگئے۔

سروری صاحب ام اے۔ ایل ایل بی ہیں۔ ان دونوں امتحانوں میں امتیازی درجہ سے کامیابی حاصل کی۔ ام اے میں ساری یونیورسٹی میں دوم اور ال ال بی میں درجہ اول اور بعض مضامین میں اول رہے۔ قانون کے امتحان کی کامیابی کا اثر آپ کی ادبی مصروفیتوں میں نمایاں نظر آتا ہے۔ اکثر جدید مطبوعات کے "مقدمے" آپ نے لکھے ہیں "مقدمے" لکھنے میں سروری صاحب کو خاص کمال حاصل ہوگیا ہے۔ آپ کی علمی مصروفیت قابل تقلید ہے۔ اپنے فرائض منصبی کو ادا کرنے کے بعد آپ کا بیشتر وقت مطالعہ اور تالیف و تصنیف میں گزرتا ہے۔ کالج میں بھی آپ اسی طرح مصروف رہتے ہیں۔ آپ جو کچھ لکھتے ہیں احتیاط اور کاوش سے لکھتے ہیں اس کے باوجود آپ کی تحریر میں روانی بے ساختگی اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔ جو قابل تعریف ہے۔ سروری صاحب کی کتابیں مختلف موضوع پر مشتمل ہے۔ آپ کے مرغوب موضوع، تنقید، افسانہ نگاری تاریخ اور مثنوی ہیں۔

"جدید اردو شاعری" کا ذکر اوپر آچکا ہے یہ کتاب آپ کی سب سے بڑی تصنیف ہے۔ اس کتاب پر ہندستان کے مختلف مقتدر جرائد نے بلند پایہ تنقیدیں کی ہیں اور یہ اکثر یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہے۔ جدید اُردو شاعری کے متعلق یہ سب سے پہلی اور مستند تنقیدی کتاب ہے۔ اس کے پڑھنے سے موجودہ زمانے کے شاعرانہ رجحانات کا عمدگی سے پتہ چلتا ہے۔ اور اردو شاعری کی مکمل تاریخ سے واقف ہوسکتے ہیں۔ اس کے لکھنے میں بڑی کاوش اور تحقیق سے کام لیا گیا ہے۔ اب تک اس کے دو ایڈیشن شایع ہوچکے ہیں۔

سروری صاحب ہندستان کے بہترین افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں آپ کے افسانے سنجیدہ ظرافت کے نمونے ہوتے ہیں اکثر رسائل آپ کے افسانوں کو چھاپنا اپنی کامیابی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ نفسیاتی جز و بھی آپ کے افسانوں میں شریک رہتا ہے، اور جس خوبی سے آپ ان مسائل کو سلجھاتے اور پیش کرتے ہیں وہ آپ ہی کا حصہ ہے آپ کے افسانوں کا مجموعہ زیر طبع ہے۔ اور اسی فن سے متعلق آپ کی دو کتابیں "دنیائے افسانہ" اور "کردار اور افسانہ" شایع ہوچکی ہیں۔ نیز آپ نے ایک سلسلہ "دنیا کے شاہکار افسانے" کے نام سے جاری کیا تھا۔ آپ رسالہ "مکتبہ مجلہ" کے ایڈیٹر بھی کئی سال تک رہ چکے ہیں۔ دوسری ادبی کوششیں یہ ہیں:۔ "حیدرآباد کی تعلیمی ترقی" یہ کتاب اس موضوع پر سب سے پہلی کتاب ہے۔ آپ نے کئی مشہور قدیم کتابوں کو مرتب بھی کیا ہے

جن میں قابل ذکر، مثنوی پھول بن، از ابن نشاطی۔ کلیات سراج اورنگ آبادی۔ مثنوی قصۂ بے نظیر، از صنعتی بیجاپوری۔
ان کتابوں کے سلسلے میں آپ نے خاص تحقیقی کام کیا ہے۔ اور ہر ایک پر مبسوط اور مفصل مقدمہ مع تشریح کے سپرد قلم کیا ہے۔

آپ ادارۂ ادبیات اُردو کے سرگرم ارباب کار میں سے ہیں اور عالی جناب ڈاکٹر زور کے دست راست ہیں۔ ادارہ کے شعبۂ امتحانات و تنقید کے معتمد بھی ہیں۔

آپ کی ذات سے اُردو کو بڑی بڑی امیدیں ہیں اور بالخصوص حیدرآباد کا ادبی ماحول آپ کے وجود کو بہت غنیمت سمجھتا ہے۔
آپ کا سب سے بڑا کارنامہ تو یہ ہے کہ آپ نوجوان انشاپردازوں اور بالخصوص افسانہ نگاروں کی صحیح تربیت دماغی کرتے ہیں اور ان کے رجحان کے مطابق ان کو ایک راستے پر ڈال دیتے ہیں۔ اب تک کئی افراد آپ کی ان کوششوں سے متمتع ہوکر "افسانوی دنیا" میں شہرت حاصل کر چکے ہیں۔

(۸) سیّد محمد صاحب ام اے (عثمانیہ)

سید محمد صاحب ۱۹۰۶ء میں شہر حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ابتداً مدرسہ مفید الانام میں شریک ہوئے۔ اس مدرسے سے مڈل کا امتحان بدرجہ اول کامیاب کیا اور سٹی ہائی اسکول میں شرکت کی ۱۹۲۲ء میں ہائی اسکول لیونگ سرٹیفکٹ کا امتحان کامیاب کیا۔ اور جامعہ عثمانیہ میں داخلہ لیا ۱۹۲۴ء میں انٹرمیڈیٹ بدرجۂ اعلیٰ کامیاب کیا اور اُردو میں صد فی صد نمبر لئے۔ ۱۹۲۶ء میں بی اے اور ۱۹۲۸ء میں ام اے کی ڈگری حاصل کی مولانا سلیم کے زمرۂ تلامذہ میں آپ کو خاص امتیاز حاصل رہا۔ اور اپنی جماعت میں ہمیشہ اُردو میں اول آتے رہے۔

آپ کا تعلیمی دور بے حد شاندار رہا خصوصاً اُردو میں جو امتیازات آپ کو شروع ہی سے حاصل رہے وہ شاہد ہیں کہ آپ کو اُردو سے خاص اور فطری لگاؤ ہے۔ زمانۂ طالب علمی ہی سے آپ کو تحریر و تقریر کے مقابلوں میں حصہ لینے کا شوق تھا اور ہر مقابلہ میں آپ اول آتے۔

سٹی کالج کے ادبی ماحول کو آپ ہی کی ذات سے زندگی حاصل ہے۔ کئی نوجوان آپ کی تربیت کے زیر اثر ادبی دنیا میں روشناس ہیں۔ حیدرآباد کے نوجوان ادیبوں میں سید محمد صاحب کا درجہ بہت بلند ہے۔ آپ نے اپنی گرانمایہ تصانیف کے ذریعہ ایک مقتدر ادیب اور محقق کی شہرت حاصل کرلی ہے۔ آپ کی سب سے پہلی تصنیف "ارباب نثر اردو" ہے یہ کتاب فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے اُردو نویسوں کا تحقیقی و تنقیدی تذکرہ ہے۔ ہر مصنف کے متعلق نہایت تحقیق کے ساتھ مواد جمع کرکے سیر حاصل بحث و تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب کو علمی حلقے میں خاص مقبولیت حاصل ہوئی اور یہ کئی جامعات کے اُردو کے اعلیٰ امتحانات میں شریک نصاب کی گئی ہے اس کے دو ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

سید محمد صاحب ۱۹۲۸ء سے سٹی کالج کے اُردو کے لکچرار ہیں۔ اس دوران میں آپ نے طلبہ میں ادب کا صحیح ذوق پیدا کرنے اور پھر ان کی ادبی رہنمائی کرنے میں خاص محنت اور دلچسپی سے کام لیا ہے اور اسی دلچسپی کا نتیجہ ہے کہ سٹی کالج اب بھی اپنی "مردم خیزی" کی شہرت کو برقرار رکھ سکا۔ صاحب موصوف کا بیشتر وقت علمی خدمت اور تالیف و تصنیف میں گزرتا ہے آپ کئی انجمنوں کے سرگرم کارکن ہیں۔ مجلہ طیلسانین کے رکن ادارت اور معتمد ہیں اور آپ کے اکثر مضامین مقتدر رسائل میں شایع ہوا کرتے ہیں

ترجمہ کرنے میں بھی آپ کو خاص مہارت حاصل ہے، آپ کئی کتابوں کے مولف ہیں ۔

گلشن گفتار ۔ خواجہ خاں حمید کا تذکرہ جو اُردو کا اولین تذکرہ ہے ۔

مثنویات میر ۔ (میر تقی میر کی مثنویات جواب تک متفرق اور غلط سلط طور پر ملتی تھیں)

ایمان سخن ۔ شیر محمد خاں ایمان کے کلام کا انتخاب ۔

یادگار دلی ۔ بابائے ریختہ کے جشن یادگار کا مجموعہ

قواعد فارسی ۔ راست اصول تعلیم پر فارسی کی ابتدائی قواعد ۔

مرقع اُردو ۔ اردوئے جدید کے نظم و نثر کا انتخاب

ان کتابوں کو بڑے سلیقہ کے ساتھ ترتیب دیا گیا ہے ۔ اور ہر ایک کے ساتھ ایک تنقیدی مبسوط مقدمہ بھی شامل ہے ۔ جس سے کتاب کی اہمیت میں بہت کچھ اضافہ ہو جاتا ہے ۔

مثنویات میر جامعہ عثمانیہ کے نصاب اردو میں داخل ہے ۔ قواعد فارسی اور دوسری کتابیں اکثر مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں ۔
سید صاحب کو قدیم اردو سے بھی گہری دلچسپی ہے ۔ مجلس اشاعت دکنی مخطوطات کے آپ معتمد ہیں ۔ حال ہی میں آپ کی مرتبہ دو نایاب کتابیں شائع ہوئی ہیں ۔ ملک الشعرا نصرتی کی مثنوی گلشن عشق اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کا نایاب دیوان ۔

سید صاحب کی تحریر میں تنقیدی شان ہوتی ہے ۔ طرز نگارش سادہ اور سلیس ہوتی ہے اور آپ کے قدرت بیان کی شاہد ۔
حیدرآباد کے موجودہ دور میں اُردو ادب کے سچے خدمت گذار اور بہی خواہ ڈھونڈے جائیں تو جناب ڈاکٹر زورؔ ۔ عبدالقادر سروری اور جناب سید محمد صاحب پر ہی نظریں اٹھتی ہیں ۔ اور دکن میں یہی "ارباب نثر اُردو" کہلانے کے مستحق ہیں ۔

رشید قریشی

نصرتی کا سنہ وفات

بیجا پور کے قدیم اردو شاعروں ملا نصرتی کو غزل، قصیدہ، اور مثنوی وغیرہ تمام اصنافِ سخن میں یکساں کمال حاصل تھا اور وہ اپنے تمام ہم عصر شاعروں میں اپنی دل پذیر طرزِ نگارش اور بلند فکری کی وجہ سے سب سے زیادہ شہرت اور مقبولیت رکھتا ہے۔ اس کی رزمیہ مثنوی علی نامہ خصوصیت کے ساتھ مشہور ہے اور اردو ادب میں اپنی طرز کی ایک لاجواب شاہکار ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ جو شخصیتیں بہت زیادہ مشہور ہوتی ہیں، ان کے حالات و واقعات زندگی کے متعلق طرح طرح کے اختلافات مورخوں اور تذکرہ نویسوں میں نظر آتے ہیں اور عجیب بے سروپا باتیں مشہور ہو جاتی ہیں۔ نصرتی کا بھی یہی حال ہے۔ کسی نے اس کو برہمن بتایا ہے اور کسی نے بیجا پور کی بجائے کرناٹک کو اس کا وطن قرار دیا ہے۔ اس کی تصانیف اور ان کی تاریخوں نیز اس کے سنہ وفات کے بارے میں بھی کئی اختلاف موجود ہیں۔

غزلوں اور متفرق کلام کے علاوہ اس کی تین مثنویاں مستقل ہیں۔ ایک گلشنِ عشق[1]، دوسری علی نامہ اور تیسری تاریخ اسکندری ان میں سے پہلی مثنوی گلشنِ عشق کا سنہ تصنیف ۱۰۶۸ھ ہے اور اس کے متعلق کسی کو اختلاف نہیں۔

علی نامے کی تاریخ تصنیف مولف اردوئے قدیم نے ۱۰۷۲ھ بتائی ہے اور وہ اس بنا پر ہے کہ اس مثنوی میں پنالے کے قلعہ کی فتح کا ذکر ہے اور خود نصرتی نے اس فتح کا جو مادۂ تاریخ نکالا ہے اس سے ۱۰۷۲ھ برآمد ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف تذکرۂ شعرائے دکن کے مولف نے اس کا سنہ تصنیف ۱۰۷۶ھ بتایا ہے۔ مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب نے اپنی کتاب "یورپ میں دکنی مخطوطات" میں علی نامے کے نسخے کو دیکھنے کے بعد آخر الذکر تاریخ سے اتفاق کیا ہے اور اپنے رائے کی تائید میں عجائب خانہ برطانیہ کے قدیم اور معتبر نسخے میں جو شعر تاریخی درج ہے وہ بھی نقل کر دیا ہے۔

لکھا شہ میں جس جو یو گرانس ہزار یک ہو ستر پہ تھے چھ برس

تاریخ اسکندری کا سنہ تصنیف مولوی عبدالحق صاحب کے مملوکہ نسخے کے بموجب ۱۰۸۳ھ ہے۔ بظاہر یہ نصرتی کی آخری مستقل تصنیف ہے۔ اسی سنہ کے اوائل میں اس کے مربی علی عادل شاہ ثانی کا انتقال ہوا اور اس کا کمسن بیٹا سکندر عادل شاہ تخت نشین ہوا جو ۱۰۹۷ھ میں فتح بیجا پور کے بعد عالمگیر کے حکم سے قید کر دیا گیا۔

مولوی عبدالحق صاحب اپنی کتاب نصرتی میں لکھتے ہیں۔

"نصرتی نے تین بادشاہوں یعنی محمد عادل شاہ، علی عادل شاہ ثانی اور سکندر عادل شاہ کا زمانہ دیکھا۔ فتوت نے اپنے تذکرۂ ریاض حسنی میں لکھا ہے کہ جب شاہ اورنگ زیب عالمگیر نے دکن فتح کیا تو وہاں کے شعرا کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ ان میں

---

[1] مجلس اشاعتِ دکنی مخطوطات کی طرف سے گلشنِ عشق اور علی نامہ دونوں کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ اول الذکر کو راقم نے اور موخر الذکر کو مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی پروفیسر جامعہ عثمانیہ نے ترتیب دیا ہے۔

نصرتی بھی تھے اور ان کے کلام کو سب سے افضل تسلیم کیا اور خطاب ملک الشعرائے ہند سے سرفراز فرمایا۔ مولوی عبدالجبار مرحوم نے تذکرۂ شعرائے دکن میں ان کا سنہ وفات ۱۰۹۵ھ لکھا ہے لیکن یہ معلوم نہیں ہوا کہ یہ اطلاع انھیں کہاں سے حاصل ہوئی۔ اگر یہ سنہ وفات صحیح ہے تو فتوت کا بیان صحیح نہیں ہو سکتا۔ عالمگیر نے بیجاپور کو ۱۰۹۷ھ میں فتح کیا تھا۔

یہ سچ ہے کہ تذکرہ شعرائے دکن کے مولف نے ۱۰۹۵ھ کو سنہ وفات قرار دینے کی نسبت اپنے ماخذ کا ذکر نہیں کیا لیکن خطاب ملک الشعرا پانے کے بارے میں ان کا بیان فتوت سے بالکل ایک ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ :-

"علی نامہ ختم کرنے کے بعد نصرتی کو علی عادل شاہ نے خلعت اور ملک الشعرائی کا خطاب عطا فرمایا تھا" عام طور پر اردو تذکرے نصرتی کے ذکر سے خالی ہیں اور فتوت کے سوا کسی اور روایت سے یہ امر ثابت نہیں ہوتا کہ اورنگ زیب نے دکن کی مفتوحہ سرزمین کے دکنی گو شاعر کی اس طرح قدر افزائی کی ہوگی۔ اورنگ زیب کی افتاد طبیعت، فاتحانہ شان اور ادب و دیگر فنون لطیفہ کے ساتھ اس کی طبعی بے پروائی کو دیکھتے ہوئے فتوت کا یہ بیان مشتبہ معلوم ہوتا ہے۔ اور اس کے مقابلے میں یہ زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ علی نامہ جیسی بلند پایہ رزمیہ مثنوی لکھنے پر جس میں رزم و بزم کے بے نظیر مرقعوں کے علاوہ علی عادل شاہ ثانی کی مدح میں ایسے بلیغ قصیدے بھی ہیں جو فارسی کے اعلیٰ درجے کے قصائد کے مقابلے میں پیش کئے جا سکتے ہیں، بہادر اور ادب پرور بادشاہ نے نصرتی کو ملک الشعرا کا خطاب عطا کیا ہو۔

نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانے میں گلشن عشق کے ایک قلمی نسخے پر نصرتی کی وفات کے متعلق یہ قطعہ تاریخ درج ہے۔

ضرب شمشیر سوں یہ دنیا چھوڑ	جا کے جنت کے گھر میں خوش ہو رہے
سال تاریخ آ ملائک نے	یوں کہے نصرتی شہید اہے

"نصرتی شہید اہے" سے ۱۰۸۵ برآمد ہوتے ہیں۔ اس نسخے کا سنہ کتابت ۱۰۹۳ھ ہے اور یہ بہت ہی قدیم نسخہ معلوم ہوتا ہے۔ جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے نصرتی کی آخری مثنوی ۱۰۸۳ھ کی لکھی ہوئی ہے اور فتوت کا روایت بھی غور طلب معلوم ہوتی ہے۔ نصرتی کے متفرق کلام مثلاً رباعیات وغیرہ سے بھی اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ وہ انقراض دولت بیجاپور کے بعد زندہ رہا ہوگا اس سے بحالات موجودہ اس قطعے کی بنا پر اس کا سنہ وفات ۱۰۸۵ھ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس قطعے سے اس امر پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ نصرتی پر کسی نے تلوار سے حملہ کیا تھا اور وہ اس صدمے سے شہید ہوا۔

سید محمد

ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور

ڈاکٹر زورؔ

"میں نے اپنے مضمون میں ڈاکٹر زورؔ کی کسی برائی کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ محض اس لئے کہ مجھے ان میں بُرائی کا کوئی پہلو نظر نہیں آیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں ناقدین اسے عقیدت سے تعبیر نہ کریں اور میں یہ سوچتا رہا کہ کوئی بات ایسی مل جائے جس کے ذریعے سے ان کی کسی برائی کو ظاہر کرنے کا موقع ملے۔ مضمون مکمل ہوگیا لیکن "عیب جوئی" کی ناکام کوشش نکتہ چینوں کا منہ بند کرنے کے لئے اس "گناہ بے لذت" کے ارتکاب سے قاصر رہی۔ جب مضمون "سب رس" میں چھپنے کے لئے "نگرانی" کی زد میں آیا تو انھوں نے "اپنی نگرانی" سے "جائز" فائدہ اٹھا کر اسے چھاپنے کی اجازت دینے سے انکار کردیا۔ لیکن مادرِ جامعہ جانتی ہے کہ میں ایک "گستاخ شاگرد" رہا ہوں۔

میری گستاخی بعض اوقات، حدِ تعینات کی پروا نہیں کرتی۔ اُن کی "خو" اور میری "وضع" میں ایک تصادم ہوا اور جس کا نتیجہ ظاہر ہے یعنی "نگران کار" "سیکریٹری" "مدیر" کا یہ مضمون "سب رس" کے صفحات پر ایک کی نیکی اور دوسرے کا جرم بن کر نمایاں ہوگیا۔ ناقدین خوش ہوں کہ میں نے ڈاکٹر زورؔ کی ایک برائی ظاہر کردی اور ڈاکٹر زورؔ معاف فرمائیں کہ میں نے اپنی گستاخی کا اظہار کردیا۔"

میکش

ایک زمانے سے خیال تھا کہ ڈاکٹر زورؔ پر مضمون لکھوں۔ اس لئے کہ اس غلط نواز اور ظاہر پرست ملک میں جب تک اپنے محسنوں کو پہچاننے کی صلاحیت پیدا نہ ہوگی ہم صحت بخش مستقبل کی تعمیر نہ کرسکیں گے۔ کورانہ "شخصیت پرستی" بلاشبہ ایک کمزوری ہے۔ لیکن کسی نصب العینی انسان کی زندگی کو سامنے رکھ کر اس سے اپنی زندگی کی تعمیر کرنا بہرحال ضروری ہے۔ کھیت نہر سے پانی لے کر پانی نہیں اگاتا بلکہ اس پانی سے ایک لہلہاتی ہوئی فصل تیار کرتا ہے۔ "انفرادیت" کو کھوئے بغیر بھی انفرادیت میں بلندی پیدا کی جاسکتی ہے۔ دنیا کی بڑی بڑی ہستیاں ہمیشہ بڑی ہستیوں ہی سے عظمت کا سبق لیتی رہی ہیں۔ میری نظر میں ڈاکٹر زورؔ کے نام سے دکنی مستقبل کے لئے بھی ایک "نصب العینی ہستی" ملی ہے۔ جس کی روح میں لطافت اور دل میں جذبۂ عمل ہے۔ جو ماضی سے کچھ حاصل کر رہی ہے اور مستقبل کو کچھ دے رہی ہے۔ جس نے مشکلات پر قابو حاصل کر کے ایک ماحول پیدا کیا، اور جو آگے بڑھتے ہوئے ایک وسیع تر ماحول تیار کر رہا ہے۔ ہماری جدید نسلیں، اگر ان میں زندہ رہنے کی تڑپ ہے تو، اس نصب العینی ہستی کو ضرور سامنے رکھیں گی۔

میں ڈاکٹر زورؔ کو صرف نثر نگار کی حیثیت سے دیکھوں تو میرا یہ زاویۂ نگاہ سطحی ہوگا۔ بالکل اسی طرح جس طرح اقبالؔ کو کوئی صرف شاعر کہہ دے، اقبالؔ کو خراجِ تحسین ادا کرنے والا صرف اس کے شعروں پر جھوم کر نہیں رہ جاتا بلکہ اپنی روح میں، اپنی فکر میں، اور اپنی زندگی میں ایک انقلاب محسوس کرتا ہے۔ شعر نہیں بلکہ شعر کے ذریعے سے جو انقلاب پیدا ہوا وہی اقبالؔ کی شاعری کی پیغمبرانہ کامیابی ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر زورؔ کی نثر نگاری نہیں بلکہ ان کی وہ تحریر جس نے دائرۂ عمل پیدا کیا، ان کی وہ گفتگو جو ہمیشہ پیامِ عمل دیتی رہی ہے، اور ان کی بے پناہ مصروفیتیں، اور دوسروں کو مصروف رکھنے کی کوششیں اصل میں ایک مضمون کا عنوان بننے کے قابل ہیں اس لئے کہ دکن کے نوجوان ادیبوں میں خود اعتمادی اور ذوقِ عمل پیدا کرنے میں انہی کا حصہ رہا ہے۔

۲

ڈاکٹر زور پر ایک لکھنے والا یوں بھی لکھ سکتا ہے کہ " آپ حضرت حسن عالم شہید کے پوتے قاری حافظ مولوی سید غلام محمد شاہ قادری صاحب کے فرزند اور خانوادہ حضرت سید علی سانگڑے سلطان مشکل آسان رفاعی کے چشم و چراغ ہیں۔ ۱۸ رمضان المبارک سنہ ۱۳۲۳ھ کو پیدا ہوئے۔ تعلیم عربی و فارسی سے دار العلوم میں شروع ہوئی۔ اور بعد کو سٹی کالج میں شریک ہوئے۔ اکیس سال کی عمر میں (سنہ ۱۹۲۵ء) میں بی اے کی ڈگری حاصل کی اور اپنے مضامین فارسی اور اردو میں اول آئے۔ سنہ ۱۹۲۷ء میں جامعہ عثمانیہ سے ام اے کی ڈگری لی اور اس دفعہ بھی اول آئے۔ ان امتیازی کامیابیوں کے پیش نظر حکومت نے یورپی وظیفہ دیا۔ چنانچہ اگسٹ سنہ ۱۹۲۷ء میں یورپ روانہ ہوئے۔ وہاں آریائی زبانوں کی لسانی تحقیقات کی۔ سنہ ۱۹۲۹ء میں پی ایچ ڈی ہوئے۔ اردو کے آغاز اور ارتقا پر ایک مقالہ لکھا۔ اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز اور یونیورسٹی کالج (لندن) میں صوتیات کی تعلیم حاصل کی۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں تجرباتی صوتیات کا تحقیقاتی کام پیرس کے مشہور ادارہ صوتیات "انسٹی ٹیوٹ دی فونیٹک" میں ختم کیا۔ جو پیرس ہی سے انگریزی میں "ہندوستانی صوتیات" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔ اس زمانہ میں ہند آریائی لسانیات اور خاص کر پہلوی اور جیسی زبانوں کے درس "سوربون یونیورسٹی پیرس" میں حاصل کئے۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں یورپ سے واپس ہوئے اور جامعہ عثمانیہ میں زبان اردو کے پروفیسر مقرر کئے گئے۔ اور اب تک یہی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

۳

ایک مضمون یوں بھی لکھا جا سکتا ہے کہ " ڈاکٹر زور نے سب سے پہلی کتاب سنہ ۱۹۲۵ء میں "روح تنقید" لکھی جب کہ وہ بی اے میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ "روح تنقید" فن تنقید پر اردو میں سب سے پہلی کتاب ہے۔ اس کے بعد ان کی کئی کتابیں شایع ہوئیں۔ مثلاً

(۱) تنقیدی مقالات۔ اس کتاب میں اصول تنقید نگاری کی وضاحت کے لئے اردو کے بہترین ادیبوں اور کارناموں کی بلند پایہ تنقیدیں درج ہیں۔ یہ کتاب کئی جامعات کے نصاب میں شامل ہے۔

(۲) اردو کے اسالیب بیان۔ یہ اصل میں اردو نثر نگاری کی تاریخ ہے جس میں آغاز سے عہد حاضر تک کے بلند پایہ اور معیاری انشا پردازوں کی نثر اور اس کے اسلوب کی خصوصیات پر ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے۔

(۳) اردو شہ پارے۔ اردو کے آغاز سے ولی اورنگ آبادی تک کے اردو ادب کے متعلق جدید ترین تحقیقات اور ادبی کارناموں کے اعلیٰ پایہ اور دلچسپ نمونے شامل ہیں جو یورپ اور ہندوستان کے متعدد کتب خانوں کے کم یاب قلمی نسخوں سے منتخب کئے گئے ہیں۔

(۴) عہد عثمانی میں اردو کی ترقی۔ گزشتہ تیس سال سے اردو ادب میں جو ترقیاں ہوئی ہیں ان کا مفید و مکمل تذکرہ۔

(۵) سلطان محمود غزنوی کی بزم ادب۔ غزنین کے فارسی شاعروں اور وہاں کی ادبی و علمی چہل پہل کا دلچسپ تذکرہ ہے جو [illegible]

(۶) ہندوستانی صوتیات (انگریزی) اردو زبان کا صوتی تجزیہ و تشریح جس کا تذکرہ گزر چکا ہے۔

(۷) ہندوستانی لسانیات۔ اردو زبان کا لسانی تجزیہ و تشریح جس کے پہلے حصے میں علم لسان کے مقاصد، فوائد، تاریخ اور زبان کی ماہیت، ارتقا اور تشکیل سے متعلق اصولی معلومات ہیں اور دوسرے حصے میں اردو کے آغاز، ارتقا، ادبی بولیوں اور اردو کی ہمہ گیری پر جدید ترین تحقیقات پیش کر کے اردو ہندی کے جھگڑے اور اردو کے جدید رجحانوں اور ضروریات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

(۸) فنِ انشا پردازی۔ مضمون نگاری اور انشا پردازی کے اصول اور فنِ تحریر میں تکمیل کے عملی طریقے بتائے گئے ہیں۔

(۹) طلسم تقدیر۔ زوال گولکنڈہ کے وقت کا ایک نیم تاریخی افسانہ ہے جو اتنا مقبول ہوا کہ دوسرا ایڈیشن بھی قریب الختم ہے۔

(۱۰) سیر گولکنڈہ۔ گولکنڈہ کی زندگی کے مختلف پہلو دلچسپ افسانوں کی شکل میں پیش کئے گئے ہیں۔

(۱۱) گولکنڈے کے ہیرے۔ سیر گولکنڈہ کا دوسرا حصہ ہے۔

(۱۲) روح غالب۔ غالبؔ کے خطوط کے ادبی حصے ایک عالمانہ مقدمہ کے ساتھ شائع کئے گئے ہیں۔

(۱۳) سرگزشتِ غالب۔ غالبؔ کی دلچسپ اور مستند و مجمل سوانح عمری جو اصل میں روحِ غالب کا ابتدائی حصہ ہے۔

(۱۴) گلزار ابراہیم۔ اردو کے مشہور تذکروں گلشنِ ہند اور گلزار ابراہیم کا مجموعہ۔ (مطبوعہ انجمن ترقی اردو)

(۱۵) گارساں دتاسی مشہور محسن اردو کے حالات اور تصنیفات پر تبصرہ (مطبوعہ ہندوستانی اکاڈمی)

(۱۶) دیوان زادۂ حاتم۔ دہلی کے مشہور شاعر کا کلام اور حیات۔ (۱۷) متاعِ سخن۔ کلام عزیز کا انتخاب مع حالات۔

(۱۸) بادۂ سخن۔ کلام مائل کا انتخاب مع حالات۔ (۱۹) کیفِ سخن۔ کلام کیفی کا انتخاب مع حالات۔

(۲۰) فیضِ سخن۔ کلام فیض کا انتخاب مع حالات۔ (۲۱) مرقع سخن دو جلدیں۔ دکن کے بہترین شاعروں کا تذکرہ جس کی ترتیب نہایت اعلیٰ پایہ ہے اور جس میں مختلف اصحاب سے تحقیقی و تنقیدی مضامین لکھوا کر شامل کئے گئے ہیں۔

(۲۱) مکتوبات شاد عظیم آبادی۔ بہار کے استاد سخن کے مکتوبات مع مقدمہ۔

ان کتابوں کے علاوہ کئی کتابیں زیر ترتیب یا زیر طبع ہیں اور سیکڑوں مضامین جو بجائے خود مستقل تصانیف کی حیثیت رکھتے ہیں یورپ اور ہندوستان کے معیاری رسائل میں شایع ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر زورؔ کی نثر عام فہم اور سادہ ہوتی ہے جس میں روانی اور بے ساختہ پن ہوتا ہے۔ ان کی کتابیں ہندوستان بھر میں مشہور ہیں، جامعات کے نصابوں میں شریک ہیں، قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں، اس لئے ان کے نثری نمونے پیش کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ البتہ میں ان کے مکتوبات سے جو میرے نام ہیں بعض عبارتیں نقل کرتا ہوں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ خط لکھتے وقت اس کو چھپوانے کا خیال پیش نظر نہیں رہتا اور اسی لئے خط میں کسی کے اصلی اسلوب کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے:۔

"اردو شاعری میں ہندستانی عنصر" اچھا موضوع ہے۔ اس پر مواد جمع کرتے رہیے۔ جتنا زیادہ مواد جمع ہو کتاب اتنی ہی شاندار ہو گی اور آپ کا مطالعہ بھی وسیع ہوتا جائے گا۔ کوشش کیجئے کہ دن کے بعض خاص اوقات روزانہ"

" محض مطالعہ کے لئے وقف رہیں۔ یہ عمر آپ کی استفادہ کی ہے۔ جتنا بھی ہو حاصل کیجئے۔ دینے کا وقت بعد میں آئے گا "
" اور ماشاء اللہ سے اب تک آپ نے جو کچھ لکھا ہے قابلِ فخر ہے اور خوش قسمت ہیں آپ کہ اس قدر جلد قدر دان بھی "
" پیدا ہو گئے ورنہ کتنے ایسے پھول ہوں گے جن کی بہار بے کسی اور ناقدر دانی کی وجہ سے بہت جلد ختم ہو گئی اور آج دنیا "
" انھیں جانتی بھی نہیں۔ انسان ہمیشہ اپنے سے خراب حالت والوں کا مقابلہ کر کے اپنی حالت کو دیکھے تو کبھی مایوسی اور "
" ناکامی کا شکار نہ ہو اور جو لوگ آج آپ کو کامیاب اور سرخرو نظر آ رہے ہیں، آپ نہیں جانتے کہ ان میں کتنے ایسے "
" ہیں جن کو ابتداء میں بڑی بڑی سختیاں جھیلنی پڑی ہیں! اور رشک و حسد اور مخالفتیں اور سختیاں اور فضا کی "
" ناموافقتیں سب آہستہ آہستہ غائب ہونے لگتی ہیں اگر انسان ذرا ہمت و استقلال اور صبر و شکر سے کام لے۔ "
" اور مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ آپ میں یہ سب صفات موجود ہیں۔ آپ ضرور ایک روز "
" اردو ادب کے جگمگاتے ستارے بنیں گے اگر یہی ہمت و استقلال اور محنت و مطالعہ جاری رکھیں اور کبھی برخود "
" غلط نہ ہوں بلکہ خواہش مند رہیں کہ ع اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے "

" ہم سب کی اور ہماری کیا تمام ملک کی عرصۂ دراز کی خواہش، سب رس کی شکل میں پوری ہوئی ہے اور ہم اگر فدا "
" اور توجہ اور محنت سے کام کریں تو یقین ہے کہ یہ کامیاب رہے گا۔ ہم کو ابھی سے نا امید ہونے کی ضرورت نہیں ہے "
" بلکہ موجودہ حالات سے سبق لے کر آئندہ کے لئے استحکام اور قوت پیدا کر لینی چاہیے۔ خاص کر آپ کے لئے یہ بڑی "
" آزمائش کا وقت ہے۔ اگر اس میں آپ کے قدم ڈگمگا جائیں تو یاد رکھئے آئندہ کے لئے بڑا خراب اثر پڑے گا اور "
" کوئی نیا اور اچھا کام شروع کرنے کی خواہش نہ ہو گی "

" آپ کی ذات سے ملک کی اور ہماری بڑی توقعات وابستہ ہیں اور ہم سب کی یہی کوشش ہے کہ آپ سرخرو رہیں۔
" میں نے جو مشکلات اور موانعات پیش کئے ہیں وہ اس لئے پیش نہیں کئے کہ ان کو سن کر آپ پست ہمت ہو جائیں "
" اور ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں بلکہ اس لئے کہ آپ میں شدائد کے مقابلہ کی قوت پیدا ہو اور آپ موجودہ سے زیادہ سرگرمی "
" دکھائیں۔ ناامیدی اور پست ہمتی ان لوگوں سے ہمیشہ دور رہتی ہے جن کے سینے خلوص اور جذبۂ خدمت گزاری سے "
" معمور ہوں اور جن کے کام محض اپنے ملک کی بہبودی اور زبان کی فلاح پر مشتمل ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کے دل میں "
" خلوص اور بے غرضی کا سمندر موجیں مارتا رہتا ہے۔ آپ ہر اس کام میں اپنی پوری قوتوں کے ساتھ ہاتھ بٹانے کے لئے "
" شریک ہو جاتے ہیں، جو ملک کے کسی پہلو سیاسی، علمی، ادبی کی تقویت کا باعث ہوتا ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ آپ کا "
" جذبۂ عمل آپ کو مایوس ہونے دے؟ کام کرنے والوں اور مخلص خدمت گزاروں کو قدم قدم پر دشواریاں پیش آتی "
" ہیں۔ ان کا راستہ اتنا صاف نہیں ہوتا، جتنا ان غرضی بندوں کا ہوتا ہے جو محض نام و نمود یا ذاتی اغراض کی خاطر سرگرمی "
" دکھاتے ہیں اور دوسروں کو دھوکہ دیتے ہیں لیکن یہ بھی یاد رہے کہ اس قسم کے لوگوں کی شہرت یا قدر و منزلت وقتیہ "

"ہوتی ہے جب تک عروج ہے یا ان کا دہو کہ چل سکتا ہے وہ سرخرو رہتے ہیں۔ ایک زمانہ جلد یا دیر سے ایسا آتا ہے جب"
"اُن کی قلعی کھل جاتی ہے۔"

"ہمارا کام محض خلوص کی وجہ سے اور خدمتِ ملک کی خاطر اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ ہم"
"بالکل مجبور نہ کردئے جائیں۔ ورنہ ہماری ساری قوتیں اس کام کو جاری رکھنے کے لئے وقف رہیں گی۔ ہمارے"
"اہل ملک ابھی پوری طرح سے بیدار نہیں ہوئے ہیں۔ اسی لئے ہم کو زیادہ توجہ اور محنت اور ایثار کی ضرورت ہے"
"میری دلی خواہش ہے کہ آپ ایک کامیاب مدیر، انشا پرداز اور شاعر بنیں اور ملک کے جمود اور غفلت کو دور کرنے"
"میں کامیاب ہوسکیں۔ میری بہترین توقعات آپ کے ساتھ ہیں۔"

"خط وصول ہوا۔ میری ہمشیرہ عزیزہ کی علالت اور وفات کا مجھ پر بے حد اثر ہے۔ میری عمر میں یہ پہلا موقع ہے کہ"
"اس قدر قریبی عزیز مجھ سے جدا ہوا ہے۔ بہر حال مرضیٔ مولا از ہمہ اولیٰ۔"
"آپ اپنی صحت کا ضرور خیال رکھئے۔ صحت سب سے اہم ہے اور اسی صحت اور مشغولیت کی خاطر رسالہ بھی نکالا"
"گیا ہے۔ آپ بے فکر رہیں۔ آپ کی غیر موجودگی میں آپ کے رسالہ کا سب کام آپ کے حسب منشار انجام پا رہا ہے۔"
"آپ کی تقریر [illegible] چھپی تھی۔ بہت اچھی اور پختہ اور شائستہ ہے۔ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی"

کیا اس اسلوب تحریر میں ایک اردو ادب کو ترقی دینے والے اور اردو دانوں میں ادبی ذوق کو عام کرنے والے سرگرم عمل انسان کی روح نہیں بول رہی ہے؟

۴

ایک مضمون یوں بھی لکھا جا سکتا ہے کہ "ڈاکٹر زور کی کتابوں اور ان کے ذوق عمل کے بارے میں ملک کے مشہور انشاء پردازوں نے ان کے طالب علمی کے زمانے ہی سے اچھی رائیں دیں۔ چنانچہ پروفیسر وحید الدین سلیم نے لکھا تھا کہ:-
"اگرچہ وہ بظاہر چپ چاپ دکھائی دیتے ہیں مگر درحقیقت وہ اور ان کا دماغ علمی خیالات میں ہر وقت مصروف ہے"
"اردو و فارسی کے ادب سے ان کو خاص دلچسپی ہے۔ عجب نہیں کہ اگر ان کی یہی مشغولیت اور دماغی مستعدی رہی تو وہ"
"اردو انشا پردازوں کے دائرے میں خاص طور سے ممتاز خیال کئے جائیں اور دکن کو ان کی ذات پر ناز کرنے کا موقع"
"حاصل ہو۔
عبد الحلیم شرر لکھنوی نے لکھا تھا کہ:-
"روح تنقید آپ نے بڑی محنت اور قابلیت سے لکھی ہے۔ میں آپ کی اس کوشش کو بہت ہی قابلِ قدر تسلیم کرتا ہوں"
"اور اردو لٹریچر کی جانب سے آپ کا شکر گزار ہوں۔"

غلام بھیک صاحب نیرنگ نے لکھا تھا کہ :-

"میں بڑے وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ آپ کی یہ کتاب ادبیات میں ایک نہایت ضروری اور مفید اضافہ ہے۔"

پروفیسر سید اشرف شمسی مرحوم نے لکھا تھا کہ :-

"ان کی اس عمدہ قابلیت کی ملک قدر کرے اور ان کو ممتاز افتخار حاصل ہو۔"

نیاز فتحپوری نے لکھا تھا کہ :-

"جناب زورؔ کا اردو پر احسانِ عظیم ہے کہ انھوں نے اس فن کے متعلق ایسی بیش بہا تصنیف پیش کی۔"

مولانا عمادی نے لکھا تھا کہ :-

"اپنے موضوع پر اس صدی کی سب سے نمایاں کتاب کہی جا سکتی ہے۔"

مولوی عبدالحق نے لکھا ہے۔

"یہ بہت دلچسپ کتاب ہے اور دلچسپ طرز میں لکھی گئی ہے۔"

غرض کہاں تک لکھیے۔ یورپ کے چند مشہور مستشرقین کی بھی ان کے بارے میں رائے دیکھیے کیونکہ بعض لوگ اپنوں سے زیادہ غیروں کی رائے کو مستند سمجھتے ہیں۔

پروفیسر لائیڈ جیمس صدر شعبۂ صوتیات نے لکھا کہ :-

"مسٹر ایس جی ام قادری نے اس مدرسہ میں دو سال تک تعلیم حاصل کی۔ پہلے سال انھوں نے عام صوتیات پر میرے
درسوں میں شرکت کی۔ انگریزی صوتیات کی عملی جماعتوں میں یہ حاضر رہے اور میری ذاتی نگرانی میں انھوں نے
اردو کی صوتیات پر کام کیا جس میں دکنی صوتیات پر خاص توجہ دی گئی ہے۔
اس عرصہ میں یونیورسٹی کالج کی انگریزی صوتیات کی بعض جماعتوں میں بھی وہ شریک رہے اور میری
نگرانی میں انھوں نے اپنی زبان کا تجزیہ کیا۔ یہ کام جب تکمیل کو پہونچے گا تو علم زبان میں ایک گرانقدر اضافہ
ثابت ہوگا۔"

ڈاکٹر ٹی گراہم بیلی ام اے۔ ڈی لٹ صدر شعبۂ اردو و ہندی اور پروفیسر ڈکنسن ناظم شعبۂ مشرقی برٹش میوزیم نے لکھا کہ :-

"مسٹر قادری کا مقالہ ایک گرانقدر کارنامہ ہے۔ یہ بڑی حد تک اپج ہے۔ یہ برٹش میوزیم، دفتر وزیر ہند، اڈنبرا یونیورسٹی
قومی کتب خانہ پیرس کے کتب خانوں کے تحقیقاتی مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ اس میں بہت سے ایسے ادیبوں کا تذکرہ
ہے جن سے آج تک دنیا واقف نہ تھی۔

نظم و نثر کے بہت سے ایسے کارناموں کا ذکر اس میں موجود ہے جو کسی اور ایسے تذکرے میں موجود نہ تھے
جو اس وقت تک شایع ہوا ہو موجودہ تذکروں کی غلطیاں اس میں درست کر دی گئی ہیں۔ مسٹر قادری اردو کے
مختلف پہلوؤں پر کئی کتابیں لکھ چکے ہیں۔ انھوں نے اردو لسانیات انڈو آرین فیلالوجی پر جو تحقیقی کام کیا ہے اس سے"

" انھیں بڑی بصیرت حاصل ہوئی ہے ۔ ان کے مقالے کے وہ حصے بہت دلچسپ ہیں جن میں اردو کی ابتدائی"
" شکلوں پر بحث کی گئی ہے ۔ یہ مقالہ علم میں ایک حقیقی اضافہ ہے خصوصاً اس کے وہ حصے جن میں دکنی اور شمالی "
" ہند کی زبان کے تعلق پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔ جو دکنی صوتیات ابتدائی دکنی ادب پنجابی سے اردو کے تعلق"
" اور شمال میں اردو کے ابتدائی کارناموں سے متعلق ہیں ۔ ہمیں توقع ہے کہ مصنف کئی اور گرانقدر تصنیفیں شایع کریں گے"

پروفیسر آر، ایل ٹرنر ناظم اسکول آف اورنٹیل اسٹڈیز نے لکھا کہ :-

" انڈو آرین زبانوں کی تقابلی گرامر پر میں نے جو لکچر دیے تھے ان میں سید محی الدین قادری شریک رہے ۔ میں نے "
" دیکھا کہ وہ ایک ذہین طالب علم ہیں اور انھیں اس موضوع سے بہت دلچسپی ہے ۔ مجھے اس کا اندازہ خاص طور پر"
" اُس وقت ہوا جب میں نے ان سے پی ایچ ڈی کے مقالہ کے اس حصہ کی نسبت تبادلۂ خیال کیا جو انھوں نے "
" لسانیاتی پہلوؤں پر لکھا ہے ۔ اس مطالعہ کی تیاری کے لئے ابتدائی سنسکرت کے درس کی جماعتوں میں بھی "
" شریک رہے اپنے پچھلے مطالعہ اور اس مطالعہ سے جو انھوں نے یہاں آنے کے بعد کیا اردو کی تقابلی تاریخی"
" تحقیقات کی بنیاد رکھ دی ہے جس کی بہت ضرورت تھی ۔"

پروفیسر سیمپٹن سابق پرنسپل نظام کالج و نگران کار طلبہ حیدرآباد نے لکھا کہ :-

" وہ ہمارے انتہائی ذہین طالب علموں میں سے ہیں اور ان کا کیرکٹر ایسا ہے کہ کوئی شخص اس پر حرف نہیں رکھ سکتا ۔"

۵

ایک مضمون اس طرح بھی لکھ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر زور نے اپنے زمانۂ طالب علمی سے اب تک ملک کے مختلف اداروں کی تخلیق، تعمیر اور تکمیل میں گرمجوشانہ حصہ لیا ہے ۔ مجلۂ عثمانیہ، مجلۂ مکتبہ، ارتقا، اور مجلۂ طیلسانین کی اجرائی میں ان کی کوششوں کو نہیں بھلایا جاسکتا ۔ مختلف چھوٹی بڑی انجمنوں کی سرپرستی اور صدارت کے علاوہ ان کا سب سے بڑا کارنامہ " ادارۂ ادبیات اردو " کی تشکیل ہے ۔ یہ ادارہ جیسا کہ اردو داں طبقہ جانتا ہے روز افزوں ترقی پذیر ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر زور نے اس ادارہ کے لئے اپنی حیات عمل وقف کردی ہے ۔ ان کی مسلسل دلچسپیوں اور مستقل سرگرمیوں کے باعث اس نے اب تک کئی معیاری کتابیں شایع کی ہیں اور اپنے اطراف اہل ملک کا ایک وسیع طبقہ پیدا کر دیا ہے جو ترقیٔ اردو کے لئے بے غرض خدمات انجام دے رہا ہے " سب رس " اسی ادارہ کا ترجمان ہے ۔ دکنی مخطوطات کی اشاعت کے لئے سٹی کالج کے یوم ولی کے بعد ایک مجلس مقرر کی گئی اس مجلس کے روح رواں بھی ڈاکٹر زور رہی ہیں ۔ اس مجلس نے بھی بعض نایاب کتابیں شایع کردی ہیں اور کئی کتابیں زیر ترتیب اور زیر طبع ہیں ۔ وہ انٹرنیشنل فونیٹک اسوسی ایشن کے واحد مسلمان رکن ہے جو ہندستان کی نمایندگی کرتے ہیں ۔ ان کا یہی شغف اور ذوق ہے جس کے باعث وہ ہندوستان بھر میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں ۔ چنانچہ حیدرآباد کے باہر بھی کئی اداروں نے ان کے علم و عمل سے فائدہ اٹھایا، کئی عظیم الشان جلسوں کی انھوں نے صدارت کی انجمن ترقی اردو سے متعلق کئی مسائل کے حل میں مدد دینے کے لئے ان کو مدعو کیا گیا اور ان کی تصنیفات کئی ہندستانی جامعات کے نصاب میں داخل ہیں ۔ الغرض حیدرآباد میں اور حیدرآباد کے باہر ان کی شہرت ان کی قوت عمل نے پیدا کی اور جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھتا جا رہا ہے وہ ترقی اردو میں زیادہ قوت کے ساتھ اپنی عملی صلاحیتوں کو صرف کر رہی ہیں ۔

۶

یہ چند پہلو تھے ڈاکٹر زور کی زندگی کے جن میں سے ہر ایک پر ایک طویل مضمون لکھا جا سکتا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے اپنے اس مضمون کے ابتدائی حصہ میں لکھا ہے، ان کی زندگی کا صرف یہی ایک پہلو ایسا ہے جو ان کی خدمات کو زندۂ جاوید بنانے کے لئے کافی ہے۔ میں یہاں یہ بھی نہیں کہنا چاہتا کہ انھوں نے دکن کے اس صحت بخش تمدن کو جو جدید زمانے کے تیز رو دھارے پر بہا جا رہا ہے بچانے کی کوشش کی۔ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ انھوں نے دکن کی قدیم ادبیات کو دنیا کے سامنے پیش کر کے یہ بتا دیا کہ دکن ترقی اردو میں کئی سو برس پہلے سے مصروف ہے۔ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ انھوں نے اپنی تصنیفات اور تالیفات سے اردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ کیا بلکہ میں صرف ان کے ذوقِ عمل اور خلوص خدمت پر یہاں زور دوں گا جس کی وجہ سے حیدرآباد میں مخلص خدمت گزارانِ اردو کی ایک قابل لحاظ جماعت پیدا ہو گئی ہے۔

ڈاکٹر زور حیدرآباد کی ان چند ہستیوں میں سے ہیں جنھوں نے بے حسوں کے ریگستان میں ایک چشمہ پیدا کیا۔ ایسا چشمہ جس کا پرسکون پانی سارے ریگستان کو ایک نخلستان میں بدل دیتا ہے۔ ان ایام کی یاد ابھی دلوں سے نہیں نکلی ہے جب دکن کے "بے زبانوں" کی راہ میں فلک بوس پہاڑ تھے۔ ان کی آواز سانس بن کر نکلتی تھی اور سانس بن کر سینے میں دفن ہو جاتی تھی۔ یہ حقیقت بھلا دی گئی تھی کہ دکن اور صرف دکن ہی وہ مقام ہے جس نے اردو کی مستقل سرپرستی کو اپنے ذمہ لیا ہے۔ اس وقت بھی جب کہ قطب شاہی زمانۂ حکومت میں اردو نثر و نظم کے زندہ جاوید کارنامے ظہور پذیر ہوئے اور آج بھی جب کہ جامعۂ عثمانیہ کی حیات آفریں سرگرمیوں نے اردو کے قافلہ کو بہت آگے بڑھا دیا ہے، کوئی شخص مجرمانہ انداز میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ دکن اردو سے غافل رہا۔

ڈاکٹر زور ملک کے ان گنتی کے فرزندوں میں ہیں جنھوں نے مرعوب ہوئے بغیر اپنی کتابیں شائع کیں۔ لکھتے وقت ان کے ہاتھ کانپے نہ قلم تھرایا بلکہ وہ ایک جرأت رندانہ کے ساتھ آگے بڑھے اور راہبوں اور بیگانوں کو بتا دیا کہ اہلِ دکن "بے زبان" نہیں ہیں۔ خود اعتمادی کا یہی مستحکم احساس ہے جس سے ڈاکٹر زور نے جدید حیدرآباد کی خدمت زبان و ادب میں روحِ عمل پھونک دی اور اب جب کہ وہ دلوں سے مرعوبیت دور کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ ترقی اردو کے لئے ان کی جد و جہد تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ حیدرآباد میں یوں تو بہت سے ایسے اصحاب ملیں گے جو انفرادی طور پر اردو کی پرخلوص خدمت کر رہے ہیں لیکن اس کی اشاعت اور ترقی کی منظم کوشش کا مرکز صرف ڈاکٹر زور کی ذات ہے۔

میکش

پیارے وطن کی پیاری

اُردو ہے سب کی پیاری، اُردو ہے سب کی پیاری
پیارے وطن کی پیاری، یعنی زباں ہماری

قومی یگانگت کا پیغام دینے والی
اک خوشگوار خدمت انجام دینے والی

اک یادگار ہے یہ بیتے ہوئے دنوں کی
الفت بھرے دنوں کی بھولے ہوئے دلوں کی

بچھڑے ہوئے دلوں کو آپس میں ہے ملاتی
پردے کو غیریت کے بالکل ہے یہ اٹھاتی

پھر رشتۂ اخوت اُردو ہی جوڑتی ہے
بھائی بنا کے "ہم"[1] کو اُردو ہی چھوڑتی ہے

ملکی زباں یہی ہے، قومی زباں یہی ہے
اپنا جہاں یہی ہے، ہندوستاں یہی ہے

اُردو میں کیا نہیں ہے کیا کیا نہ ہوگا اس میں
جلوہ نما نہیں کیا دنیا کی سب زبانیں؟

اُردو میں ہے نزاکت، اُردو میں ہے لطافت
اُردو میں ہے فصاحت، اُردو میں ہے بلاغت

اردو میں ہے روانی، اُردو میں ہے سلاست
اُردو میں ہے ملاحت، اُردو میں ہے حلاوت

اُردو میں ہے متانت، اُردو میں ہے طلاقت
اُردو میں ہے تقدس، اُردو میں ہے صداقت

اُردو میں وسعتیں ہیں ہندوستاں سے زیادہ
اُردو کی شہرتیں ہیں ہندوستان سے زیادہ

اُردو کی رفعتوں پر ہے سرنگوں فلک بھی
وہ خوبیاں ہیں اس کی ہوں تر زباں ملک بھی

اس پر بھی تم کو اُردو بھاتی نہیں ہے، حیرت!
شاید نہیں وطن کی دل میں تمھارے چاہت

پیارے وطن کی ہر شئے جاں سے عزیز تر ہے
اُردو کے مٹنے کو پھر کیوں یہ شور و شر ہے؟

سُلیمان اریب

[1] ہندو و مسلمان۔

ذکرِ میر

اُردو کا ذکر ہو اور دنیا میر تقی میر کو بھول جائے۔
ایسا تو نہیں ہوسکتا۔ میر پر بہت سے مقالے نکل چکے
ہیں۔ یونہیں سہی۔ مگر آج ہم میر کا ہی ذکر کرینگے۔ خواہ
موجِ خوں سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے۔ شیلے کہتا ہے
"ہمارے شیریں ترین نغمات وہ ہیں جو غم آگین حسیات
کا اظہار کریں"۔ کتنا سچ کہتا ہے۔ واقعی ؎

تو اے کبوتر بام حرم چہ میدانی
طپیدن دل مرغان رشتہ بر پارا

اسی جاذبیت وکشش نے آج میر کو قلمروئے سخن
کی صدارت پر متمکن کر دیا ہے۔ فرماں روایانِ ادب نے
میر کو اُردو غزل گویوں کا سرتاج تسلیم کر لیا ہے۔ وہ ایک
عاشق کی زبان سے اس کی روداد قلب کا اظہار کرتے
ہیں۔ میر کے اندوہناک جذبات میں شدتِ غم، دل تنگی
اور مایوسی کا پیچ و تاب شامل ہے۔ اس کے کلام کو پڑھ کر
یہ احساس ہوتا ہے کہ "خاموش انسانوں کے قلب میں
غموں کی کتنی پُر اسرار گہرائیاں پوشیدہ ہیں"۔ ابونواس
نے سچ کہا تھا "قدرتِ خداوندی سے کیا بعید ہے کہ وہ ایک
عالم ایک ہی شخص میں پیدا کر دے"۔

یونان کی ایک بہت پرانی کہاوت ہے "مصوری
شاعریٔ صامت ہے اور شاعری مصوریٔ ناطق"، اگر شاعری
فی الحقیقت "مصوریٔ ناطق" کو کہتے ہیں تو ہم میر کو
بھی ایک بہت بڑا شاعر ماننے پر مجبور ہیں۔ اور یوں بھی
شاعر مصورِ فطرت تو ہے ہی۔

بیکن کا نظریہ ہے "شاعری دماغ کو بلند کرتی
ہے"۔ ڈاکٹر گریہم بیلی کی نظر میں اُردو زبان کے بہترین
شعرا انیس، غالب اور میر ہیں۔

انسانی جذبات و احساسات ہی شاعری کی اصل
روحِ رواں ہیں اور اگر مل صاحب کی رائے سے اتفاق
کیا جائے تو صرف اسی چیز کا نام شاعری ہے۔

میر شرفائے اکبرآباد سے تھے۔ لیکن ان کے رشتے
ناتے سے اس وقت ہم کو بحث نہیں۔ ہم ایک طائرانہ نگاہ
ان کے زندگی کے انوکھے حالات پر ڈالتے ہیں۔ اب اس
نگاہ میں آئیں جو کچھ بھی مل جائے اس کو قلم بند کر دیا جائیگا۔
ان کے میر تخلص کرنے پر ان کے والد بزرگوار نے انھیں
منع کیا کہ ایسا نہ کرو۔ ایک دن خواہ مخواہ سید ہو جاؤ گے
لیکن ان کے سید ہونے میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ ان کی
مسکینی و غربت، صبر و قناعت، تقویٰ و طہارت ایک
محضر پیش کرتے ہیں اور یہ اوصاف خود ایک شہادت ہیں
میر کی سیادت کے۔ رہا زمانے کا۔ اس نے کس کو چھوڑا
ہے کس کس کو کیا نہیں کہتا۔ اگر وہ سید نہ ہوتے تو خود
کیوں کہتے ؎

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

آزاد کہتے ہیں "ہر چند کہ تخلص ان کا میر تھا۔ مگر
گنجفۂ سخن کی بازی میں آفتاب بن کر چمکے۔ قدر دانی نے
ان کے کلام کو جواہر اور موتیوں کی نگاہوں سے دیکھا۔

اورنام کو پھولوں کی مہک بنا کر اُڑا یا۔ ہندوستان میں یہ بات انھیں کو نصیب ہوئی ہے کہ مسافر غزلوں کو تحفہ کے طور پر شہر سے شہر لے جاتے تھے۔"

میرؔ اپنی نازک مزاجی اور بد دماغی میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ باوجود فلاکت و نحوست کے جو اہلِ کمال کا سرمایۂ زندگی ہے ان کے دماغ ہی نہ ملتے۔ وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتے۔ وضعداری کو نباہنے کا فن انھیں خوب یاد تھا۔

دلی میں شاہ عالم کا دربار اور امراء و شرفا کی محفلوں میں ادب ان کی جگہ خالی رکھتا تھا مگر بقول آزاد "خالی آدابوں سے خاندان تو نہیں پل سکتے۔" ناقدری نے ان کا دل توڑ دیا اور اسی اجڑے ہوئے دل کو لیے ہوئے یہ دلّی کو خیرباد کہتے ہیں۔ وہی دلّی جس پر انھوں نے کبھی اس طرح سر دھنا ہے :-

؎ دلی کے جو تھے کوچے اوراقِ مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

اسی دلّی کے کھنڈر ہو جانے پر یوں کفِ افسوس ملتے ہیں ؎

اب خرابہ ہوا جہان آباد
ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا

اب یہاں سے میرؔ لکھنو چلے ہیں۔ ذرا اس لطیفہ کو آزادؔ سے سنیے :-

"جب لکھنو چلے تو ساری گاڑی کا کرایہ بھی پاس نہ تھا۔ ناچار ایک شخص کے ساتھ شریک ہو گئے اور دلی کو خدا حافظ کہا۔ تھوڑی دور آگے چل کر اس شخص نے بات کی۔ یہ اس کی طرف سے منہ پھیر کر ہو بیٹھے۔ کچھ دیر کے بعد پھر اس نے بات کی۔ میر صاحب چیں بجبیں ہو کر بولے کہ صاحب قبلہ آپ نے کرایہ دیا ہے۔ بیشک، گاڑی میں بیٹھیے۔ مگر باتوں سے کیا تعلق! اس نے کہا۔ حضرت کیا مضائقہ ہے۔ راہ کا شغل ہے۔ باتوں میں ذرا جی بہلتا ہے۔ میر صاحب بگڑ کر بولے کہ خیر آپ کا شغل ہے۔ میری زبان خراب ہوتی ہے۔"

لکھنو پہنچ کر ایک سرا میں اُترے۔ معلوم ہوا یہاں ایک جگہ مشاعرہ ہے۔ صبر نہ آیا۔ جی مچل گیا۔ اسی وقت ایک غزل لکھی اور مشاعرہ میں جا پہنچے۔ اپنی وضع و قطع سے ایک قدیم مُلّا سے آدمی دکھائی پڑتے تھے۔ ان کے عجیب وغریب سج دھج دیکھ کر حاضرینِ محفل میں ہنسی کے ساغر چلنے لگے۔ لوگ سرگوشیوں میں اپنے قہقہے چھپانے لگے۔ میرؔ صاحب ایک تو غریب الوطنی کا الم لیے ہوئے تھے۔ دوسرے ناقدرئی زمانہ کے ہاتھوں دلگیر و دل گرفتہ۔ ایک طرف بیٹھ گئے۔ جب شمع ان کے سامنے آئی تو پھر سب نے ان کی طرف ٹکٹکی لگا دی۔ کسی نے وطن پوچھا۔ میرؔ تو بھرے ہی بیٹھے تھے۔ فی البدیہہ یہ مشہور قطعہ سنا دیا۔ ؎

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

سارے ہنسنے والے اس درد بھرے موثر کلام کو سن کر کھسیانے ہو گئے۔ صبح ہوتے ہوتے سارے شہر میں

یہ خبر پھیل گئی کہ میر صاحب تشریف لائے ہیں۔ نواب آصف الدولہ مرحوم نے سنا اور دو سو روپیہ مہینہ مقرر کر دیا۔ میر کی نازک مزاجی کے تو بہت سے قصے مشہور ہیں جن میں سے بعض تو بہت دلچسپ ہیں۔ مثلاً یہ کہ ایک دن نواب صاحب موصوف نے ان سے ایک غزل کی فرمائش کی۔ دوسرے تیسرے دن جو گئے تو پوچھا کہ میر صاحب! ہماری غزل لائے؟ میر نے تیوری بدل کر کہا۔ جناب عالی! مضمون غلام کی جیب میں تو بھرے ہی نہیں کہ کل آپ نے فرمائش کی اور آج حاضر کر دے۔ اس فرشتہ خصال نے کہا۔ خیر میر صاحب جب طبیعت حاضر ہوگی کہہ دیجئے گا۔

ایک دن نواب صاحب نے بلا بھیجا۔ جب پہنچے تو انھیں حوض کے کنارے رنگین مچھلیوں سے کھیلتا دیکھ کر ناک، بھوں سکیڑ لیا۔ نواب حسب معمول انھیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ کہا میر صاحب کچھ فرمائیے۔ انھوں نے غزل پڑھنی شروع کی۔ نواب کھیلتے بھی جاتے تھے۔ سنتے بھی جاتے تھے۔ میر صاحب چیں بہ جبیں ہوتے اور ہر شعر پر ٹھہر جاتے۔ وہ کہتے کہ ہاں پڑھیے۔ آخر چار شعر سنا کر میر خاموش ہو گئے اور بولے پڑھوں کیا آپ تو مچھلیوں میں مشغول ہیں۔ متوجہ ہوں تو پڑھوں۔ نواب نے کہا جو شعر ہوگا آپ متوجہ کر لیگا۔ میر صاحب بھلا کہاں تاب لا سکتے تھے۔ ان کے دکھی من کے لیے یہ فقرہ ایک تازیانہ تھا۔ غزل جیب میں ڈال گھر کا راستہ لیا اور پھر جانا چھوڑ دیا۔ کچھ دنوں بعد بازار میں نظر آئے۔ نواب کی سواری سامنے سے آگئی۔ دیکھتے ہی محبت نے کہلوا دیا۔ "میر صاحب آپنے بالکل ہمیں چھوڑ دیا۔ کبھی تشریف بھی نہیں لاتے۔" میر صاحب نے ٹوک دیا۔ بازار میں باتیں کرنا آداب شرفاء نہیں۔ یہ کیا گفتگو کا موقع ہے۔ غرض بدستور گھر بیٹھے رہے اور فقر و فاقہ میں عمر بسر کی۔ سو برس کی عمر پائی۔ امراء کی تعریف توصیف میں قصیدہ نہ کہنے کا یہ بھی ایک سبب تھا کہ توکل و قناعت انھیں بندہ کی خوشامد کی اجازت نہ دیتے تھے۔ یا پھر شاید خود بینی و خود پسندی جو انھیں لیے دیے رہتی تھی، وہ زبان سے کسی کی تعریف نکلنے نہ دیتی تھی۔

میر کے دیوان میں یوں نام کو سو دو بہتر نشتر ہیں۔ لیکن بقول آزاد "یہ بہتر کی رقم فرضی ہے کیونکہ جب کوئی تڑپتا ہوا شعر پڑھا جاتا ہے تو ہر سخن شناس یہ کہہ اٹھتا ہے کہ دیکھیے یہ انھیں بہتر نشتروں میں سے ہے۔"[1]

غزل گوئی میں میر جس مقام پر پہنچے ہیں وہاں تک اب کسی کی رسائی ناممکن ہے۔ ان کا صاف اور سلجھا ہوا کلام اپنی سادگی میں ایک عجیب انداز دکھاتا ہے۔ آزاد کہتے ہیں "حقیقت میں یہ انداز انھوں نے میر سوز سے لیا۔ مگر ان کے ہاں فقط باتیں ہی باتیں تھیں۔ انھوں نے اس میں مضمون داخل کیا اور گھریلو زبان کو متانت کا رنگ دے کر محفل کے قابل کیا۔"

یہاں پر ان کے کلام کا ایک مختصر سا نمونہ دیا جاتا ہے:۔

عشق کا گھر ہے میر سے آباد　　　ایسے پھر خانماں خراب کہاں

دیر و حرم سے تو تو ٹک گرم ناز نکلا

ہنگامہ ہو رہا ہے اب شیخ و برہمن میں

---

[1] آب حیات ۲۱۳

کیسے جانے سے نہیں کچھ مجھ کو اتنا شوق ہے
چال وہ بتلا کہ میں دل میں کسو کے جا کروں

مثل عنقا مجھے تم دور سے سن لو ورنہ
ننگ ہستی ہوں مری جائے بجز نام نہیں

اس بتکدے میں معنی کا کس سے کریں سوال
آدم نہیں ہے صورت آدم بہت ہیں یاں

مجھ دیوانے کی مت ہلا زنجیر — کہیں ایسا نہ ہو کہ پھر غل ہو

لاگ اگر دل کو نہیں لطف نہیں جینے کا
اُلجھے سلجھے کسی کاکل کے گرفتار رہو

کہتا ہے کون میرؔ کو بے اختیار رُو
ایسا تو رو کہ رونے پہ تیرے ہنسی نہ ہو

اثر ہوتا ہماری گر دعا میں
لگ اٹھتی آگ سب ارض و سما میں

ان اجڑی ہوئی بستیوں میں دل نہیں لگتا
ہے جی میں وہیں جا بسیں ویرانہ جہاں ہو

رات مجلس میں تری ہم بھی کھڑے تھے چپکے
جیسے تصویر لگا دے کوئی دیوار کے ساتھ

کچھ نہ دیکھا تھا ہم نے پرتو بھی
آنکھ میں آئی ہے نہ دنیا کچھ

الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنھیں ہے بندگی خواہش
ہمیں تو شرم دامنگیر ہوتی ہے خدا ہوتے

رشکِ یوسف ہے آہ وقتِ عزیز
عمر اک بار کاروانی ہے

تنو ملک پھرا لیکن پائی نہ وفا اک جا
جی کھا گئی ہے میرا اس جنس کی نایابی

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آئے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آئے

کٹے ہے دیکھیے یوں عمر کب تلک اپنی
کہ سنیے نام ترا اور چشم تر کریے

یاقوت کوئی ان کو کہے ہے کوئی گلبرگ
ٹک ہونٹ ہلا تو بھی کہ اک بات ٹھہر جائے

ترا ہے وہم کہ میں اپنے پیرہن میں ہوں
نگاہ غور سے کر مجھ میں کچھ رہا بھی ہے

ہوگئی شہر شہر رسوائی — اے مری موت تو بھلی آئی
مصائب اور تھے پر دل کا جانا — عجب اک سانحہ سا ہوگیا ہے
ہر کسو سے فرو نہیں ہوتا — حیف بندے ہوئے خدا نہ ہوئے

دنیا کی قدر کیا جو طلبگار ہو کوئی
کچھ چیز مال ہو تو خریدار ہو کوئی

فرصت کم ہے یاں رہنے کی بات نہیں کچھ کہنے کی
آنکھیں کھول کے کان جو کھولو بزم جہاں افسانہ ہے

میں چراغ صبح گاہی ہوں نسیم
مجھ سے اک دم کے لیے کیا دشمنی

نہ وے لوگ ہیں اب نہ اجماع وہ
جہاں وہ نہیں یہ جہاں اور ہے

کہاں تک لکھوں۔ ایسے بیسیوں نشتر ہیں۔ اب انھیں کے ایک شعر پر یہ داستان ختم کردی جاتی ہے۔ ؎

کھول کر دیوان میرا دیکھ قدرت مدعی
گرچہ ہوں میں نوجواں پر شاعروں کا پیر ہوں

جہاں بانو بیگم

غزل

ہوا معلوم جب سے۔ میرے دل میں آپ کا گھر ہے
یہ دل اُس دن سے اب تک دل نہیں ہے مجھ کو دلبر ہے

بس اب راضی خوشی سے اُس پہ مرنا ہی بہتر ہے
یہ دنیا جس میں دنیا جی رہی ہے موت کا گھر ہے

ہوا کرتے ہیں ظلم و جور بھی دلکش حسینوں کے
جو سب کے واسطے ہے عیب اِن کے حق میں زیور ہے

میں بے دل اور وہ دل دار۔ میں بے آس وہ آسا
نبھے کیا خاک یاری۔ ایک مفلس، اک تونگر ہے

گل اندا موں سے مل کر دل پہ وہ چوٹیں اُٹھائی ہیں
کہ باغِ دہر کا ہر پھول میرے حق میں پتھر ہے

عدو نے بھی اُڑا لیں ہیں ادائیں دل دکھانے کی
ستمگر جو تری صحبت میں میٹھا ہے ستمگر ہے

نہیں کوئی کسی کا دوست بازی گاہِ دنیا میں
یہاں ہر ایک اپنے داؤ پر ہے اپنے ڈھب پر ہے

بُرا کہتا ہے جب اس سے بُرا دیکھا نہیں جاتا
نصیحت گر اگر دشمن سے بُرا ہے تو وہ بہتر ہے

وہ دینے میں نہیں رُکتا ہے لیکن اور کیا مانگوں
ضرورت سے زیادہ ہے مجھے جو کچھ میسّر ہے

وہ مُردے جن کو اُس کے حکم پر جینا نہیں آتا
وہی کہتے ہیں ایسی زندگی سے موت بہتر ہے

نہیں بڑھتے ہیں اپنی حد سے زندے ہوں کہ مُردے ہوں
سب اُتنے پانو پھیلاتے ہیں جتنی اُن کی چادر ہے

یہ دو باتیں ہیں بس اے چارہ گر آگے تری مرضی
جو غم نکلے تو اچھا ہے جو دم نکلے تو بہتر ہے

وہ چاہے سننے والوں کے لیے بے جوڑ باتیں ہوں
پڑھانے والے نے جو کچھ پڑھایا مجھ کو ازبر ہے

نہیں کی میں نے مال و جان و ایماں کے لیے کوشش
تو اِن کے بدلے وہ مل جائے جو اِن سب سے بڑھ کر ہے

پلا ساقی کہ باقی عمر بے ہوشی میں کٹ جائے
یہ میرے سر کا چکّر اب مری قسمت کا چکّر ہے

طلسمِ شارعِ عامِ محبت کھُل نہیں سکتا
کہ ایسا صاف رستہ اور پھر ٹھوکر پہ ٹھوکر ہے

ہر اک چھالا ہے شاہد گرمئ سوزِ محبت کا
کہ جو کچھ میرے دل میں ہے وہی میری زباں پر ہے

میں اُس کو دیکھتا ہوں آئینہ کیا ہے سکندر کیا
جو آئینہ کا آئینہ سکندر کا سکندر ہے

نہ پوچھو ہائے بیمارانِ غم کی زندہ در گوری
اِسی پر جی رہے ہیں موت کا اک دن مقرر ہے

ہیں کم سے کم زیادہ سے زیادہ عشق کے معنی
سمجھنے والوں کو اک لفظ بے سمجھوں کو دفتر ہے

شہیدانِ محبت زندۂ جاوید ہوتے ہیں
جو سب کے واسطے ہے گور اِن کے واسطے گھر ہے

صفی کو طفلِ مکتب جانتے ہیں اس لیے شاعر
کہ ہر اک شعر اس کا بچے بچے کی زباں پر ہے

صفی (اورنگ آبادی)

صاحبزادہ میکش کی کتابیں

گریہ و تبسم

"گریہ و تبسم" کے نوجوان مصنف صاحبزادہ میکش کی شاعرانہ صلاحیتوں اور پاکیزہ ادبی ذوق سے اہلِ ملک بخوبی واقف ہیں۔ "گریہ و تبسم" کے متعلق چند رائیں جو یہاں نقل کی جا رہی ہیں، یہ واضح کرنے کے لیے کافی ہیں کہ وہ اُردو ادب کی دنیا میں اپنا ایک شاندار مستقبل رکھتے ہیں۔

"ادبی خدمت گزاروں کی شستہ و منتخب جماعت کے ایک رُکن میکش صاحب بھی ہیں جو مدت سے اپنے میخانہ سے شعر و ادب کے جام بھر بھر کر تقسیم کر رہے ہیں گریہ و تبسم انھیں کے کلام کا مجموعہ ہے اور رنگ و بو کا ایک خوش منظر گلدستہ۔ بعض بعض نظموں پر بے اختیار کلام اقبال کا دھوکا ہو جاتا ہے۔" (مولٰنا عبدالماجد دریابادی)

"صاحبزادہ میکش کا شمار ان نوجوان شعراء میں ہے جو اپنے شاعرانہ وجدان کو محض ادبیات تک محدود نہیں رکھتے بلکہ جنہوں نے اپنے لیے خیال و بیان کے کچھ نئے میدان بھی پیدا کر لیے ہیں۔ نوجوان حیدرآباد کی شاعری میں جو ذوقِ جدید پیدا ہو رہا ہے، اسی کا نقیب گریہ و تبسم ہے۔"
(قاضی عبدالغفار)

"آپ کے اشعار غیر معمولی صداقت اور جذبۂ محبت سے مملو ہیں۔ ملک و مالک کے ساتھ سچی اور بے غرض وفاداری ان سے عیاں ہے۔ جب تک دل میں کسی چیز کی محبت نہ ہو زبان اور قلم سے ایسے احساسات کی ترجمانی نہیں ہو سکتی جیسی کہ آپ کے کلام سے ظاہر ہے۔"
(محمد عبدالرحمٰن خاں سابق صدر جامعہ عثمانیہ)

"شاگردوں کے ادبی انہماک اور ادبی خدمات سے خوشی ہوتی ہے اپنے کلام پر مبارکباد قبول کیجیے۔"
(مرزا حسین علی خاں وائس پرنسپل جامعہ عثمانیہ)

"میکش کی شاعری کے پیچھے اُردو شاعری کی وہ تمام تحریکات کام کر رہی ہیں جو میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ اور جوشؔ کے کلام میں مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوئی ہیں، ان کے کلام کی سادگی اس بات کی شاہد ہے کہ وہ دماغ سے نہیں بلکہ دل سے شاعری کرتے ہیں۔ موضوع اور نقطۂ نگاہ عصر حاضر سے ہم آہنگ رہا ہے۔ قدیم اساتذۂ سخن سے مشابہ، یہی ہے خاص انداز جس کو میکش ترقی دے رہے ہیں۔" (عبدالقادر سروری)

"گریہ و تبسم جدید اُردو شاعری میں ایک اضافہ ہے اور ظاہر کرتا ہے کہ اگر اس نوجوان شاعر کی کما حقہٗ قدر کی گئی تو اُردو زبان مستقبلِ قریب میں ایک اچھے شاعر سے بہرہ مند ہو گی۔" (ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ)

کاغذ کی ناؤ

صاحبزادہ میکش خاموشی کے ساتھ زبان و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ چنانچہ اُن کے حزنیہ ڈراموں کا مجموعہ "کاغذ کی ناؤ" ثابت کرتا ہے کہ وہ ادب کے ترقی پسند عنصر پر بھی اپنی قوت نگارش صرف کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

کھوئے ہوؤں کی جستجو

ان کی تیسری کتاب "کھوئے ہوؤں کی جستجو" عنقریب شائع ہو گی اس کتاب میں قطب شاہی حیدرآباد کے متعلق نیم تاریخی نظمیں ہونگی جن میں سے بعض "سب رس" کے دکن نمبر میں شایع ہو چکی ہیں۔ علامہ اقبال نے

فرمایا تھا:— ”میری تمام زندگی کھوئے ہوؤں کی جستجو“
صاحبزادہ میکش کھوئے ہوؤں کی جستجو کو شاندار مستقبل کی تعمیر کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ ماضی کا ہر لمحہ حال کی رو میں بہا دینے کے قابل نہیں ہے۔ بیتے ہوئے دنوں سے، آنے والے دنوں کے لیے بھی کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ شاندار ماضی کبھی دفن نہیں ہو سکتا بلکہ وہ عظیم تر مستقبل کی بنیاد بنتا ہے۔

زیر طبع

اُلٹی گنگا

صاحبزادہ میکش کی چوتھی کتاب ان کے مزاحیہ ڈراموں کا مجموعہ ہوگی۔ اس مجموعہ میں بھوت، بدگمانی اور اُلٹی گنگا جیسے ڈرامے شریک ہیں۔ ان ڈراموں میں مزاح کو زندگی سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

”آواز کی دنیا“ نے آواز میں زندگی کو سمٹا دیا ہے۔ موصولی آلے ابھی ”صورت نمائی“ کے قابل نہیں ہوئے ہیں آواز کے ذریعے سے منظر کی تصویر پیش کرنا نثر نگار کا سب سے بڑا کمال ہے۔ صاحبزادہ میکش کے غنائیوں (Musical Features) نے جو نشرگاہ حیدر آباد سے نشر ہو چکے ہیں، ہندوستان کے ہر خطے سے خراج تحسین حاصل کیا ہے۔ ”نغموں کی وادی“ ان کے نشر شدہ غنائیوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ اس مجموعہ میں طوفان کی رات، اندھی بھکارن، پھولوں کی خواب گاہ، نغموں کی وادی اور دوسرے غنائیے شامل رہیں گے۔ (زیر طبع)

کنول

آخر میں ہم صاحبزادہ میکش کی غزلوں، نظموں، رباعیوں اور گیتوں کے دوسرے مجموعے کا تذکرہ کریں گے جو زیر ترتیب ہے۔ اس مجموعے کی ”دنیائے شباب و شعر“ کا اندازہ ان مثالوں سے ہو سکتا ہے۔

نظم ہندوستان کے دو بند:—

دھوپ سے جھلسے ہوئے بچے پناقوں کے ستم　　جس کی ننھی سی زباں سوکھی ہوئی اور آنکھ نم
جیسے کچی نیند سے نازک سے پودوں پہ ورم　　جیسے مینائے تہی کے بزم میں کیف و کم

جیسے بے رس پھول، جیسے بند مٹھی کا بھرم
کیا اسی کو پالتی ہے، مادرِ ہندوستان

اک سسکتا سانس، اک ٹوٹا ہوا تارِ رباب　　جیسے گہری فکر میں بچھلے پہر کا ماہتاب
جیسے باسی پھول کی بو، جیسے پت جھڑ کا گلاب　　جیسے دن میں چاند تارے، جیسے دریا میں حباب
جیسے دیوانے کی جنت، جیسے مفلس کا شباب
کیا اسی کو زندگی کہتے ہیں، اے ہندوستان

نظم ”اقبال کے شعر“ سے چند شعر:—

ایمان کی تفسیر قلندر کا ترانہ　　سمجھے تو پلٹ آئے بلندی پہ زمانہ
بے تابیٔ فطرت کی سکون بخش کہانی　　شعلوں سے بنائی ہوئی شبنم کی روانی
الہام میں تکمیلِ حقیقت کی ادائیں　　شاہین کی پرواز، مجاہد کی نوائیں
سوئی ہوئی قسمت کو جگاتا ہوا نغمہ　　ہر سانس کو ہنگامہ بناتا ہوا نغمہ
پت جھڑ کی طرف دیکھ کے ہنستا ہوا بادل　　سوکھی ہوئی کھیتی پہ برستا ہوا بادل

اک روح جو انسان کو انسان بنا دے
اک درد جو جذبات کو ایمان بنا دے

نظم ”پرچھائیاں“ (تین بند)

کس وقت سے ہوا ہے احساس زندگانی
لو، میں تمھیں سنا دوں اس وقت کی کہانی
ہلکی سی چاندنی میں لہرا کے رات رانی　　تاروں سے کہہ رہی تھی جب عشق کی کہانی
لے کر نئی امنگیں آئی نئی جوانی
نزدیک پا کے مجھ کو جب دور ہو رہی تھیں　　مہندی کی باڑ میں تم مستور ہو رہی تھیں
بچپن بنی ہوئی تھی معصوم نوجوانی
پرچھائیوں سے اپنی گھبرا کے آ گئیں تم　　سینے پہ ہاتھ رکھ کر دل میں سما گئیں تم
شرما رہی تھی مجھ سے سہمی ہوئی جوانی
اس رات سے ہوا ہے احساس زندگانی
اب یاد آ گئی نا! بھولی ہوئی کہانی

مہتمم ”سب رس“

غزلیات

فکر و نظر

مشاہداتِ جمال اور کم نگر کے لئے
یہ انکشاف ہیں مخصوص دیدہ ور کے لئے

نہ پوچھ کب سے ہوں بیتاب اس نظر کے لئے
جو ہو سکے نہ جدا دل کے عمر بھر کے لئے

بڑھا نہ بانگِ فغاں، ضبطِ سوز کر، جل جا
نمود و رقص کا موقع نہیں شرر کے لئے

تری لطیف تجلی نظر میں بھر بھر کر
بنا رہا ہوں نئے آئینے نظر کے لئے

فضا خموش، ستارے اداس، پھیکا چاند
یہ اہتمام شبِ عیشِ مختصر کے لئے

یہ چھپ چھپا کے نظر بازیاں تو سہی ہیں
روش نئی کوئی ایجاد کر نظر کے لئے

وہ نالہ کر جو دلِ حسن پر فغاں بن جائے
وہ آہ کیا جو بھٹکتی پھرے اثر کے لئے

ہے شوقِ دید، کسی ڈھب سے دیکھ ہی لوں گا
لگا نہ قید کوئی میری چشمِ تر کے لئے

نمودِ لالہ، ضیائے قمر، فروغِ شفق
یہ جتنے رنگ ہیں دھوکے ہیں سب نظر کے لئے

مطالباتِ وفا میں شریک ہوں دونوں
کروں میں نالہ، دعا تم کرو اثر کے لئے

ترے خیال میں بت، ذہن میں بتخانے
یہ سجدے بار نہ ہو جائیں سنگِ در کے لئے

شباب کا تو نہیں ہوش، ہاں خیال یہ ہے
کہ ایک نیند سی آئی تھی رات بھر کے لئے

پھر آئے عالمِ ہستی میں انقلاب اعجاز
کہ منتظر ہے نظر عالمِ دگر کے لئے

اعجاز صدیقی
مدیر "شاعر" آگرہ

غزل

کرم مجھ پہ کیا کیا وہ فرما رہے ہیں
ستم کر رہے ہیں، ستم ڈھا رہے ہیں

تبسم تھا اس رنگ سے انکے لب پر
میں سمجھا کوئی جام چھلکا رہے ہیں

تمہیں کو جو بیتابیٔ دردِ دل ہو
تمہاری ہی جانب کھنچے جا رہے ہیں

خوشی کا سماں ہے، ہنسی گلفشاں ہے
خبر آرہی ہے کہ وہ آرہے ہیں

بہار ایک دم کی ہے کھلتا نہیں کچھ
یہ گل کھل رہے ہیں کہ مرجھا رہے ہیں

ہے آباد میرے تصور کی دنیا
حسیں آرہے ہیں، حسیں جا رہے ہیں

جلیل اُن کے صدقے جو صہبائے رنگیں
پلا کر مجھے ہوش میں لا رہے ہیں

نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل

رضوانیات

حیا رخصت ہوئی شوخی اٹھاتی ہے نقاب اُن کا
الٰہی خیر رخصت ہو رہا ہے اب حجاب ان کا

کشش ہے یہ محبت کی کہ ہے یہ بھی حجاب اُن کا
جو مجھ سے روز بڑھتا جا رہا ہے اجتناب اُن کا

دلِ مرحوم کی کیا اب وفائیں یاد آئی ہیں
ہوا جاتا ہے کیوں محبوبِ حسن کامیاب اُن کا

جفائیں ہو رہی ہیں پردۂ صبر آزمائی میں
کرم بھی ہوتا ہے مجھ پر باندازِ عتاب اُن کا

سوالِ وصل پر پہلو سے اٹھ کر روٹھے جاتے ہیں
شکیب و صبر کا دشمن ہے یہ رنگِ عتاب اُن کا

ہمیں سے ہو رہی ہیں چھیڑ کی باتیں بھی محفل میں
ہمیں دشمن بھی ہیں اور پھر ہمیں سے ہے حجاب ان کا

نگاہِ واپسیں بس رحم کر دیکھا نہیں جاتا
یہ منھ کو پھیر کر رونا یہ حالِ اضطراب ان کا

لکھی ہیں خط میں وہ باتیں نہیں جو میری قسمت میں
مری تقدیر کا لکھا ہوا آیا جواب ان کا

اٹھائی جا رہی ہے اس طرح تمہیدِ محشر کی
قیامت کا نمونہ بن کے آتا ہے شباب ان کا

نگاہِ قہر بیں شوخی ذرا آواز میں تیزی
لئے ہے ساتھ میں لاکھوں ادائیں یک عتاب ان کا

علامہ سر شیخ محمد اقبال مرحوم

نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل

مزے کے آئے دن امید ابن عشق کی راہیں
کہ ہم آغوش ہوتا ہے لڑکپن سے شباب ان کا

امید رضوی بریلوی

غزل

اور دل توڑ کے جانے والے۔ دل کی بات بتاتا جا — اب میں دل کو کیا سمجھاؤں مجھکو بھی سمجھاتا جا

میری چپ رہنے کی عادت جس کارن بدنام ہوئی — اب وہ حکایت عام ہوئی ہے سنتا جا شرماتا جا

تجھکو ابر آلود دنوں سے کام نہ چاندنی راتوں سے — بہلاتا ہے باتوں سے بہلاتا جا۔ بہلاتا جا

یہ دکھ درد کی برکھا بندے دین ہے تیرے داتا کی — شکر نعمت بھی کرتا جا۔ دامن بھی پھیلاتا جا

دونوں سنگ راہ طلب ہیں راہنما بھی منزل بھی — ذوق طلب۔ ہر ایک قدم پر دونوں کو ٹھکراتا جا!

نغمے سے جب پھول کھلینگے چننے والے چن لینگے
سننے والے سن لینگے۔ تو اپنی دھن میں گاتا جا

حفیظ جالندھری

غزل

نہیں بہار ہی کچھ زمزمہ سرائے بہار — کلی کلی کا چٹخنا بھی ہے صدائے بہار

ریاض دہر میں ہوں میں مثال نکہت گل — مجھے اڑائے لئے پھرتی ہے ہوائے بہار

دبی نہ آگ جدائی کی سیر باغ سے بھی — غضب ہے اور بھی بھڑکا گئی ہوائے بہار

لگا دے لکھ کے یہ کوئی مزار بلبل پر — شہید غمزۂ گل کشتۂ ادائے بہار

ہزاروں حسن برستے ہیں غنچۂ گل پر — نہ جانے کون ہے صورت گر ادائے بہار

بڑے مزے میں ہیں وہ لوگ باغ عالم میں — جو آشنائے خزاں ہیں نہ آشنائے بہار

چمن میں جوشش نمو سے نکھر کے رنگ گلاب — ہوا ہے روکش رنگینی حنائے بہار

زوال ایک کا ہے دوسرے کو وجہ عروج — جو ابتدائے خزاں ہے وہ انتہائے بہار

چمن میں آکے ذرا جامہ زیباں دیکھو — گلوں کے جسم پہ پھبتی ہے کیا قبائے بہار

ہنسا دے باد صبا گدگدا کے غنچوں کو — اٹھا دے آج ذرا پردۂ حیائے بہار

ابھی تو ان کا شباب اور گل کھلائیگا — ابھی تو نام خدا ہے یہ ابتدائے بہار

قفس میں گزرے نہ معلوم کیا عنادل پر
جب آشیانے ہی میں رات دن رلائے بہار

بہار تھی تو نہ کی ہم نے کچھ بہار کی قدر
گئی بہار تو اب پیٹتے ہیں ہائے بہار

نہیں ہے کام کسی سے قفس نصیبوں کو
چمن سے جائے خزاں یا چمن میں آئے بہار

ہنسی ہے پھولوں کے لب پر خموش ہیں غنچے
بقدر فہم جو سمجھے ہیں مدعائے بہار

جو مجھ سے کوئی سنے تو سناؤں اے خنجر
عجیب قصۂ دلکش ہے ماجرائے بہار

میر یاور علی خنجر

بہاراں

بادِ صبا یہ جھومتی آئی ہے کس دیار سے
جیسے شمیم پھٹ پڑے سینۂ لالہ زار سے

گاہ چمن میں جھومنا، گاہ چمن کو روندنا
کیف اڑا کے لائی ہے موج خرام یار سے

پھر ہو نمودِ زندگی موج خرام یار سے
حشر یہیں بپا کریں کون اٹھے مزار سے

برق سی کوندنے لگی اٹھنے لگے شرار سے
میری نگاہ لڑ گئی جب بھی نگاہِ یار سے

[illegible] کرشمہ کار سے
بڑھ کے نقاب الٹ دیا رُوئے حسینِ یار سے

منزلِ رنگ و نور سے مرحلۂ بہار سے
مثلِ نظر گذر رہی جا عالمِ اعتبار سے

[illegible] لالہ زار سے
جنس جنوں بھی ہو تو میں بھیک نہ لوں بہار سے

موڑ کے منہ بہار سے پھیر کے رخ ہزار سے
کھیل رہی ہیں نکہتیں، اُن کے گلے کے ہار سے

زلف میں یاسمن کے پھول، موسم گل کے وہ رسول
توڑے ہوئے بہار کے چھینے ہوئے بہار سے

روح نہ تھی نسیم میں، جان نہ تھی بہار میں
کچھ بھی نہ تھا کنار میں، وہ جو اٹھے کنار سے

جوشِ نمو کو گل بہ گل لالہ بہ لالہ دیکھ کر
روحِ جنوں ابل پڑی خم کدۂ بہار سے

فطرتِ حسن و عشق کی ہائے رے بیقراریاں
میں جو ہوں ناشکیب سا وہ بھی ہیں بیقرار سے

آج یہ ڈوبتے ہوئے نجم سحر نے کیا کہا
خون سا کچھ ٹپک پڑا دیدۂ انتظار سے

حسن ہی کو نہیں گلہ عشق بھی تنگ آ گیا
ان کو رلا رلا دیا شکوۂ بار بار سے

دل سے کسی کی یاد بھی کرتی ہے یوں ہی شوخیاں
جیسے صبا الجھ پڑے گل کدۂ بہار سے

خود وہ الجھ کے رہ گئی میرے جنوں کے دام میں
میرا جنوں نہ دب سکا گردشِ روزگار سے

ساغرِ خام کار پی، بادۂ مشکبار پی
بادہ نہیں بہار پی میکدۂ بہار سے

ساغر نظامی

غزل

مآلِ زندگانی ہے محبت کیش ہو جانا
دلیلِ کامرانی آفتیں درپیش ہو جانا

ہمارا حاصلِ ہستی یہی ہے حضرتِ ناصح
جگر مجروح - سر آشفتہ اور دل ریش ہو جانا

ہمیں مطلب نہیں ہے نیک و بد سے کیشِ الفت میں
رقیبوں کو مبارک ہو مآل اندیش ہو جانا

کسی کو دیجئے دل ہمنے اگر سیکھا تو یہ سیکھا
جفا سہنا۔ وفا کرنا۔ محبت کیش ہو جانا

جنہیں ہو عشقِ صادق روک سکتا ہی نہیں انکو
مصیبت ہائے گوناگوں کا گردو پیش ہو جانا

محبت اوّل و آخر ہے دنیا ہو کہ عقبیٰ ہو
مبارک عاشقوں کو عاقبت اندیش ہو جانا

رہو دنیا میں دنیا سے الگ اے حضرتِ عابد
وگرنہ کونسا دشوار ہے درویش ہو جانا

قاضی محمد زین العابدین عابد

غزل

ہنس رہا ہوں لبِ مجبور پہ فریاد نہیں
کوئی کیا جانے کہ خوں گشتہ ہے دل شاد نہیں

کیا کہوں کس لئے رہ رہ کے تڑپ اٹھتا ہوں
دل میں اک تیر ہے پیوست تری یاد نہیں

کیا کروں آہ بھلایا نہیں جاتا مجھ سے
وہی پیمانِ محبت جو تمہیں یاد نہیں

کیا مرے خواب میں آنے کا بھی قدغن ہے تمہیں
قید ہے جسم میں تو کیا روح بھی آزاد نہیں

چاندنی، کاہکشاں، پھول، گھٹائیں، نغمے
کیا یہ سب میری تمنا کی ہیں روداد نہیں

یاد ہے وہ شبِ مہتاب میں آہنگِ رباب
اور وہ نکہتِ صحرا جو چمن زاد نہیں

یاد ہے عکسِ شفق سے وہ دلِ دریا میں
منظرِ حسن کہ "منت کشِ" بہزاد نہیں

یاد ہے چھاؤں میں تاروں کی وہ سیرِ کہسار
اور وہ شکوۂ قدرت کہ ہم آزاد نہیں

وجاہت حسین عندلیب شادانی
(ڈھاکہ)

نغمہ و فریاد

میں باغ میں گر نغمۂ دلگیر سنا دوں
بلبل کو بھی فریاد کے آداب سکھا دوں

کیا تجھ سے کہوں کیا ہیں مری آہ کے جھونکے
چاہوں تو ستاروں کے چراغوں کو بجھا دوں

اچھا ہے کہ سجدے مرے بیکار نہ جائیں
تقدیر کی پیچیدہ لکیروں کو مٹا دوں

ڈرتا ہوں کہیں پھول کی پتی نہ لچک جائے
شبنم کو جو کرنوں کی کشاکش سے چھڑا دوں

ہیں حسن کے ہر ظلم کو، ہر جور کو سہہ کر
اوروں کے لئے عشق کو آسان بنا دوں

ہنس ہنس کے وہ کہتے ہیں کہ ہم بھول گئے تھے
مطلب یہ ہے گزری ہوی باتوں کو بھلا دوں

ساغر کی کھنک، قلقل مینا میں سمو کر
دنیا کیلئے ایک نیا ساز بنا دوں

گلشن جسے کہتے ہیں وہ آتشکدہ بن جائے
میں آتشِ گل کو جو نگاہوں سے ہوا دوں

جس نظم پہ ماہر کو بہت داد ملی تھی
کہئے تو وہی نظم، ترنم سے سنا دوں

ماہر القادری

غزل

ہمارے اشک خونیں کی روانی دیکھتے جاؤ
لہو کا ہے لہو پانی کا پانی دیکھتے جاؤ

ہوئی ہے شادئ مرگ آج تم سے ملکے دشمن کو
تماشائے وفور شادمانی دیکھتے جاؤ

تمھاری رہگزر میں قتل ہو کر سیکڑوں چپ ہیں
ادھر آؤ تم ان کی بے زبانی دیکھتے جاؤ

تمہارے دیکھنے والوں کا دم اب تو لبوں پر ہے
اثر لایا ہے کیا سوز نہانی دیکھتے جاؤ

نہ دیکھو آئینہ جاتے ہوئے دشمن کی محفل میں
تم اپنا حسن اپنی نوجوانی دیکھتے جاؤ

نہیں ہے بے سبب طوفان آشنا دیدۂ تر کا
مری حالت کی ہے یہ ترجمانی دیکھتے جاؤ

معین کے شعر سن کر بندہ پرور تم بھی خوش ہو
ذرا اس کی طبیعت کی روانی دیکھتے جاؤ

معین

جناب ماہر القادری صاحب

جناب رگھونندر راؤ صاحب جذب

غزل

اے پیکرِ خیال لگا ہوں پہ چھا کے دیکھ
میرا عیارِ ذوقِ نظر آزما کے دیکھ

جنت نظر ہے، منظرِ رنگینیٔ جہاں
آنکھوں سے امتیاز کا پردہ ہٹا کے دیکھ

کتنی جنوں نواز ہے دنیائے رنگ و بو
اک بار دل میں شمعِ محبت جلا کے دیکھ

نازِ نظر ہو تارِ رگِ جاں بنا ہوا !
لایا ہوں نذرِ عمر، ادھر مسکرا کے دیکھ

ہمدم لگاہِ نازِ عجب کام کر گئی
تیور بدل گئے، دلِ بے مدعا کے دیکھ

طغیانِ عشق سیلِ حوادث پہ چھا گیا
اے حسن تو بھی زحمتِ طوفاں اٹھا کے دیکھ

سکندر علی وجد

"کچھ نہیں" کے دو پہلو

جنہیں عشق سے واسطہ کچھ نہیں
انہیں حسن سے کیا ملا ؟ کچھ نہیں

جہاں زُہدِ خشک آ گیا، اس جگہ
محبت، مروت، وفا کچھ نہیں

خدا جانے کس دل سے کہتے ہیں لوگ
حسیں اور ان کی ادا کچھ نہیں

نہیں دل کی طلعت، جو یہ ماہوش
شبِ ماہ میں بھی مزا کچھ نہیں

شرر ہیں یہ ہنس مکھ ستارے اگر
تو ہر خندۂ خوش نما کچھ نہیں

نظر کے ہیں دھوکے مناظر اگر
تو پھر یہ چمن یہ فضا کچھ نہیں

حکیموں پہ حیرت نہ ہو کیوں مجھے
بڑھا علم تو کہہ دیا کچھ نہیں

نہ ساقی نہ ساغر نہ شاہد نہ باغ
مآلِ ان کی تحقیق کا کچھ نہیں

۲

وجود ان کا میری نظر میں بھی کیا
عدم ہے، عدم کے سوا کچھ نہیں

کہوں کیسے ہستی کے گلزار میں
فنا ہی فنا ہے بقا کچھ نہیں

میں خوش ہوں حسن سے ہوں، سوا حسن کے
مری زیست کا مدعا کچھ نہیں

اگر میری نظروں سے دیکھے کوئی
بقا ہی بقا ہے فنا کچھ نہیں

یہ معمورۂ حسن ہے تو یہاں
خوشی ہے خوشی کے سوا کچھ نہیں

نگاہِ حقیقت رسِ حسن سے
تعلق غم و رنج کا کچھ نہیں

مزے اہلِ دل کے لئے ہیں بہت
کہا میں نے کب؟ یاں مزا کچھ نہیں

یہ ساقی یہ ساغر یہ شاہد یہ باغ
حلاوت ہے دل میں کیا کچھ نہیں

علی منظور

میری ہمسائی

حسین نغموں سے پُر نگاہیں
دریچہ میں مسکرا رہی تھیں
شباب انگڑائی لے رہا تھا
جبین نوریں چمک رہی تھی

و نوجوانی کی داستانیں
پیامِ عشرت سنا رہی تھیں
گلاب کی بھینی بھینی خوشبو
فضا میں ساری مہک رہی تھی

ندیم! ہمسائی آج میری دریچہ میں گنگنا رہی تھی!
فضا میں مستی سی چھا رہی تھی نسیم بربط بجا رہی تھی

عجیب منظر عجب سماں تھا
مری نگاہوں کے عین آگے
لطیف ہونٹوں پہ تھا تبسم
جمال افروز خواب آسا

بہار کی چاندنی میں جیسے
دکھائی پڑتے ہیں چاند تارے
نظر سے مستی ٹپک رہی تھی
شراب آسا، شباب آسا

ندیم، ہمسائی آج میری دریچہ میں گنگنا رہی تھی
فضا میں مستی سی چھا رہی تھی نسیم بربط بجا رہی تھی

نگاہِ بد سے خدا بچائے
بہارِ تصویر سامنے تھی
ملاحتوں میں صباحتوں میں
رخِ حسیں جگمگا رہا تھا

جمیل خوابوں کی گویا میرے
حسین تعبیر سامنے تھی
ادائے دوشیزگی کے صدقے
شباب بھی گنگنا رہا تھا

ندیم، ہمسائی آج میری دریچہ میں گنگنا رہی تھی
فضا میں مستی سی چھا رہی تھی نسیم بربط بجا رہی تھی

محبوب حسن جگر (عثمانیہ)

مشاہیر کے غیر مطبوعہ خطوط

ادارۂ ادبیات اُردو نے مشاہیر اُردو کے غیر مطبوعہ خطوط اور تحریروں کے جمع کرنے کا خاص طور پر اہتمام کیا ہے ۔ اس وقت تک متعدد کرم فرماؤں نے اُردو ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ دیگر مشاہیر کے بھی بیسیوں خطوط اور تحریریں عنایت کی ہیں جن میں سے صرف چند خطوط اس اُردو نمبر میں شایع کیے جا رہے ہیں ۔ ان خطوط میں نمبر (۱) معصومہ بیگم مرزا حسین علی خاں صاحب نمبر ۲، ۴، ۵، ۸ اور ۹ سکینہ بیگم سید رحمت اللہ صاحب کے ۳، ۱۰ تا ۱۶ صغریٰ بیگم سید ہمایوں مرزا کے اور ۶، ۷ ..... ڈاکٹر زور کے عطیہ ہیں ۔

شبلی نعمانی کے خطوط

بنام طیبہ بیگم صاحبہ بلگرامی بنت عماد الملک

مکرمہ من ۔ تسلیم

کل میں نواب عماد الملک بہادر سے ملا اور اتفاق سے کل ہی میرے نام ایک خط خواجہ صاحب کا ولایت سے آیا ۔ نواب صاحب نے فرمایا کہ ریاست سے تو امداد ممکن نہیں لیکن خواجہ صاحب کو لکھ دو کہ بہت جلد (یعنے دس پندرہ دن کے بعد) ہم لوگ ان کے مشن کے لیے ایک معقول ماہوار رقم مہیا کردیں گے ۔ جناب نواب صاحب موصوف اور مولوی انوار اللہ صاحب مل کر اس کام کو کریں گے ۔ لکچر کے لیے میں حاضر ہوں ۔

خواجہ صاحب کا خط مع اپنی تائید کے کسی اخبار میں شایع کروںگا ۔

شبلی   شہریور ۱۳ف

(کاچی گوڑہ)

بنام طیبہ بیگم (بنت عماد الملک)

بھوپال

مکرمہ من

تسلیم ۔ خواجہ کمال الدین کے لیے جو کچھ یہاں کرسکا اس کی اطلاع دے چکا ہوں ۔

اس وقت یہ تحریر ہے کہ "ظل السلطان" خاص خواتین کا پرچہ ہے اور حضور سرکار عالیہ کی سرپرستی میں نکلتا ہے ۔ اس لیے آپ کبھی کبھی اس میں کچھ لکھا کریں تو بہت منت ہوگی ۔

شبلی   ۱۷ دسمبر ۱۹۱۳ء

بنام سید ہمایوں مرزا بیرسٹر ایٹ لا

مکرمی

ہم لوگ نیلام جا رہے ہیں ۔ اگر آپ کے سونے یا کسی اور کام کا وقت نہ ہو تو چلیے ۔

شبلی   ۱۹ اکٹوبر ۱۸۹۸ء

طیبہ بیگم کے خطوط

بنام لیڈی سر آسمان جاہ

جناب بیگم صاحبہ معظمہ و محتشمہ دام عنایتہا

بعد تسلیم عرض خدمت گرامی ہے کہ آج ۱۵ ماہ محرم

کے لیے صرف وہ دربار ہال جو آپنے مس اِنس کو انعام کے جلسہ کے لیے عنایت فرمایا تھا مجھے بھی عنایت ہو تو میں نہایت ممنون ہوں گی صرف ہال اور اس کے اندر کا باسیج باقی سب کمرے بند رکھے جائیں۔ اگر چہ وہ تاریخ سے اجازت ہو جائے تو پردہ کا انتظام کروا دیا جائے۔ مولوی شبلی صاحب جو ایک مشہور و معروف لکچر دینے والے ہیں اشاعت اسلام پر لکچر دینگے۔ سامنے کے اسٹیج پر پردہ رہینگے اور اس کے مقابل کے دروں پر پردہ باندھ دیا جائے گا۔

اگر ہال کی اجازت دلوادی جائے تو میں نہایت ممنون ہونگی۔ ۱۵ محرم کو اتوار کا روز بھی رہے گا۔ دفتر بھی بند رہیگا۔

طیبہ بیگم

بنام عزیز فاطمہ بیگم شمس العلما نواب عزیز جنگ ولاؔ

جناب ہمشیرہ صاحبہ

آپ کا مضمون ماشاءاللہ نہایت عمدہ ہے اُردو تو آپ ہمیشہ سے پُرزور لکھتی ہیں مگر جہاں خدا کا ذکر ہو پھر وہاں کا کیا کہنا ہے۔ اُبلا ہوا دل چھلک پڑتا ہے۔ آپ تو عشق اللہ میں صوفیوں کا درجہ رکھتی ہیں۔ آپ کے مضمون میں صرف جو بات کانوں کو ناگوار گذرتی ہے وہ میرا ذکر ہے۔ میں اس کے خلاف ہوں۔ بہت سی وجوہ ہیں۔ صرف اس کو انکسار نہ سمجھئے۔ عندالملاقات کہونگی۔ خدا ہم کو آپ کی دعوت میں شریک ہونا نصیب کرے فقط

طیبہ بیگم

فصیح الملک مرزا داغ دہلوی کے خطوط

بنام نواب ڈاکٹر لقمان الدولہ دلؔ

مہربان من

آپ کی غزل بہت اچھی ہے۔ آپکے اُستاد شاگرد فیض صاحب نے بہت خوب بنائی ہے۔ غزل کی تعریف، آپ کی طبیعت کے ... رسا کی اور ان کی اصلاح کی داد دیتا ہوں اس میں کہیں گنجائش اصلاح نہیں ہے۔ نسخہ جو ممکن ہے اس کو آپ خوب دیکھ سکتے ہیں۔

ہیچمداں فصیح الملک داغ دہلوی

بنام نواب ڈاکٹر لقمان الدولہ دلؔ

الحمدللہ کہ خیریت سے ہوں۔ روزہ رکھ رہا ہوں۔ کمشنر صاحب صفائی چادر گھاٹ سے جھگڑا ہے۔ مثانہ کے درد کے واسطے دوا بھجوادو پہلی دوا مفید ہوی۔ فقط

گرامیؔ کے خطوط

بنام نواب قادر نواز جنگ بہادر

ہوشیارپور۔ پنجاب

عالی جناب نواب قادر نواز جنگ بہادر

تسلیم۔ آپ کی صورت دل نواز، آپ کی سیرت وفاطراز، آپ کا مکان دلفریب، آپ کا وہ

خلق گرامی نواز، گرامی کی آنکھوں میں پھر رہا ہے۔
حضرت قاضی صاحب کو کہہ دیجئے کہ گرامی کو صوبہ صاحب بہادر کا جذبۂ اخلاص حیدرآباد میں کھینچ رہا ہے۔ بفضلِ خدا فروری کے مہینے میں گرامی نواب قادر نواز جنگ بہادر کی مجلس سماع میں حاضر ہو جاوے گا۔
گرامی حضرت قاضی صاحب کی محبت کا دلدادہ ہے۔ اور صوبہ صاحب بہادر کا رہین منت۔ سالخوردہ گرامی چند رباعیاں بھیجتا ہے۔ مجھے امید ہے نواب قادر نواز جنگ بہادر پسند فرماویں گے۔

راقم۔ گرامی

بنام مولوی سید احمد

حضرت سید صاحب

رطب و یابس لکھ دیا گیا ہے۔ طول بے معنی ہوتا ہے۔ ہر چہ گیرید مختصر گیرید۔ دو شعر نکال دئے گئے۔ خط کھینچ دیا گیا ہے۔ خوشخط لکھوا لیجئے۔

راقم۔ گرامی

راشد الخیری کا خط

بنام صغریٰ بیگم ہمایوں مرزا

عزیزہ محترمہ۔ سلام مسنون

میں خود آپ سے اسوقت ٹیلیفون پر گفتگو کرتا کہ آپ کا پرچہ پہنچا۔ کھانا یہاں بھی آپ کا ہے اور وہاں بھی۔ اصلی چیز آپ کی محبت، خلوص اور قدردانی ہے جس کا میں ممنون ہوں، بیگم راشد الخیری آج دہلی جارہی ہیں اور ان کا جانا نہایت ضروری ہے کیونکہ یکم اکتوبر سے نیا سیشن شروع ہوتا ہے اور روپیہ کی تعداد دیکھ کر فیصلہ ہوتا ہے وہ آپ کے ہاں چاء پی چکی ہیں۔ میں دو دفعہ چاء پی چکا ہوں اگر آپ کی رائے میں کھانا نہایت ضروری چیز ہے تو میں حاضر ہوں اور آپ کے گھر کو اپنا گھر سمجھتا ہوں کسی روز آکر بغیر اطلاع جو موجود ہو گا کھا پی لوں گا۔
نواب معین الدولہ بہادر سے اس وقت ملنے جارہا ہوں امید ہے روپیہ مل جائیگا۔
بیگم مرزا یار جنگ صاحبہ گھر پر موجود نہ تھیں شاید آج کل میں آجائیں۔
میں ابھی ایک ہفتہ اور ٹھیرونگا روانگی سے قبل یہاں کا حساب پریس میں بھیجکر آپ سے انشاءاللہ ملتا ہوا جاؤنگا۔
سید ہمایوں مرزا صاحب کی خدمت میں سلام علیک فرما دیجئے۔

دعاگو
راشد الخیری

نواب امداد امام اثر کے خطوط

بنام سید ہمایوں مرزا بیرسٹر

کیمپ بڑکا ڈانڈی مورخہ ۲۴ مارچ سنہ ۱۹۱۳ء

مجمع فضائل و جود و خیال خلاصۂ خاندان مصطفوی و مرتضوی امجد مکرم

بعد گزارش آداب و تسلیم عرض ہے کہ محبت نامہ وارد ہوا۔ دریافت خیریت سے مسرت قلبی حاصل ہوئی۔ خدائے تعالیٰ آپ کو ترقی اقبال کے ساتھ حی و قایم رکھے۔

میری سرگزشت یہ ہے کہ آپ کی لقائے صوری کے
بعد جب سے میں وطن کو کلکتہ سے واپس آیا انواع
اقسام کی تکلیفات روحی و جسمانی میں مبتلا رہا اور
اس وقت تک بلاؤں سے نجات نہیں ملی ہے۔
دو مہینے سے ہز ہائنس نواب صاحب فرمانروائے
رامپور کا مہمان ہوں۔ یہاں تقریب شکار سے
ہمرکاب آیا ہوں۔ نہیں معلوم کہ کب تک وطن کو
معاودت کر سکوں گا۔ وطن کی یہ حالت ہے کہ
دس مہینے سے نیورہ نہیں گیا ہوں۔ میں اپنی
پریشانیوں کو کیا عرض کروں۔ آپ کی تصنیف شریف
گیا میں ہے ساتھ نہیں ہے۔ اس پر ریویو لکھنے کا
مجھے کوئی موقع حاصل نہیں ہے۔ البتہ گیا جا کر
تعمیل حکم کر سکونگا۔ اس وقت امیدوار معافی
ہوں۔ فقط زیادہ حد ادب　　دعاگو

امداد امام عفی عنہ

بنام سید ہمایوں مرزا بیرسٹر
بنگلہ۔ گیا۔ صوبہ بہار　　مورخہ ۳ر فروری ۱۹۲۸ء

قبلہ و کعبہ جناب عمو ی صاحب مدظلہ العالی۔

بعد بجا آوری مراتب تسلیم و کورنش عرض ہے کہ
بخیریت ہوں اور خیریت بندگان حضرت کا درگاہ
الٰہی سے طالب۔ ورود سرفراز نامہ نے افتخار دارین
بخشا۔ امور ضروری ذیل میں گزارش ہوتے ہیں۔
میری شومی بخت کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ
بندگان حضرت پٹنہ تشریف لاویں اور میں شرف
قدمبوسی سے محروم رہ جاؤں۔ اگر تشریف آوری کے
قصد سے اطلاع ہوتی تو میں ضرور پٹنہ میں حاضر
رہتا۔ حق یہ ہے کہ کوتاہی بخت کا کیا جواب ہے۔
اب پایانِ عمر کو پہنچ چکا ہوں۔ ایسی حالت میں
کیا امید ہو سکتی ہے کہ پھر شرف اندوزِ ملازمت
ہو سکونگا۔

میری چند تصنیفات تو ضرور شایع ہو چکی ہیں
مگر میں نہیں جانتا کہ کہاں سے دستیاب ہو سکتی ہیں
میرے پاس میری تصنیفات کے نہ کوئی قلمی نسخے
موجود ہیں اور نہ کوئی چھپے ہوئے۔ تعمیل ارشاد میں
مطلق دیر نہ ہوتی مگر کیا کروں مجبور ہوں۔

بحضور جناب چچی صاحبہ مدظلہا۔ آداب و
تسلیم عرض ہے اور میری اہلیہ بھی آداب و تسلیم
عرض کرتی ہیں۔ بچوں کی طرف سے آداب و تسلیم
قبول ہو۔

مجھے حصول ملازمت کی بیحد تمنا ہے۔ مگر
کیا کروں مجبور ہوں۔ پیرانہ سالی مانع نقل و حرکت
ہے، تعجب یہی ہے کہ اب تک کیونکر زندہ ہوں،
خاص کر حسین امام مرحوم کی رحلت کے بعد فقط

فدوی امداد امام عفی عنہ

بنام سید ہمایوں مرزا بیرسٹر
آبگلہ۔ گیا۔　　مورخہ ۲۹ر اپریل ۱۹۳۲ء

جناب عمو ی صاحب قبلہ و کعبہ دام ظلہ العالی۔

بعد گزارش آداب و تسلیم عرض ہے کہ ورود سرفراز نامہ
نے سرفراز و ممتاز فرمایا۔ دریافت خیریت مزاج عالی
سے اطمینان قلبی نصیب ہوا۔ ذرہ نوازی کا شکریہ

قبول ہو۔ شرف قدم بوسی کی تمنا احاطۂ بیان سے
باہر ہے۔ کیا کروں کوئی امر اپنے اختیار کا نہیں
ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمنا پوری نہ ہو سکے گی۔
اس لیے کہ پایان عمر کو پہونچ چکا ہوں۔ صرف فرمان
خداوندی کی دیر ہے۔ علاوہ اس کے زمانہ نے
ایسی کروٹ لی ہے کہ اکثر افراد کو اپنی جگہ سے
جنبش کرنی دشوار ہو رہی ہے۔ یہ زمانہ امرا گردی
کا آیا ہے۔ مگر ہم غرباء بھی اُن کے شریکِ حال
ہو رہے ہیں۔ اب اس دیار کی حالت قابلِ
عرض نہیں رہی ہے اور روز بروز بدتر ہوتی جاتی
ہے۔ اہل غیرت خودکشی سے اپنی آبرو کو بچا سکیں تو
بچا سکیں، ورنہ اور کوئی ذریعہ حفظان آبرو کا
نظر نہیں آتا ہے۔ خیر۔ مرگ انبوہ جشنے دارد۔
بالیقین میں نے اپنی عمر طویل میں کسی زمانے کا ایسا
رنگ نہیں دیکھا تھا جیسا کہ اس وقت دیکھ رہا ہوں۔
اہلیہ آداب و تسلیم عرض کرتی ہیں اور بحضور
جناب حضرت چچی اماں صاحبہ مدظلہا آداب و تسلیم
کے پہونچا دینے کی مستدعی ہوتی ہیں۔ نحیف کی
استدعا بھی یہ ہے۔ دنیا میں جس قدر خیریت ممکن
ہے میرے جمیع متعلقان کو بفضلہ تعالیٰ نصیب ہے
پریشانی عام کی اور بات ہے فقط زیادہ حدِ ادب

فدوی امداد امام عفی عنہ

بنام سید ہمایوں مرزا بیرسٹر

آنجگہ۔ گیا۔　　مورخہ ۲۱ ستمبر سنہ ۱۹۳۲ء

حضرت عم قبلہ و کعبہ مدظلہ العالی۔ بعد گزارش آداب و
تسلیم عرض ہے کہ شرف بخشی کا شکریہ تہ دل سے
ادا کرتا ہوں، قرین پذیرائی ہو۔ یہاں یا صوبۂ
بہار میں علیٰ امام سلمہٗ کی خدمت حیدر آباد کا مذکور
ابھی تک سننے میں نہیں آیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ
یہ خبر تمامتر بے بنیاد ہے۔ ایک مہینے کا عرصہ
ہوتا ہے کہ موصوف یہاں آئے تھے مگر حیدرآباد کا
کوئی ذکر درمیان میں نہیں آیا۔ مجھے حاضری کی
بڑی تمنا ہے خاص کر ایسی حالت میں کہ پایان عمر
کو پہونچ گیا ہوں۔ مگر بہت موانع درمیان میں
حائل دکھائی دیتے ہیں۔ کاش ایسا ہوتا کہ سفر
آخرت کے پہلے شرف قدم بوسی حاصل کر لیتا۔
بیگم صاحبہ آداب و تسلیم عرض کرتی ہیں۔
ہم لوگوں کی طرف سے بحضور جناب چچی اماں صاحبہ
مدظلہا آداب و تسلیم فرما دیجیگا، سایۂ عاطفت
ممدود زیاد فقط زیادہ حدِ ادب

فدوی امداد امام عفی عنہ

ممتاز علی ایڈیٹر تہذیب نسواں کا خط

بنام صغریٰ بیگم سیّد ہمایوں مرزا

لاہور۔ جمعرات۔　　۲۹ دسمبر سنہ ۲۸ء

پیاری بیٹی صغریٰ۔ بعد دعاہائے فراوان
واضح ہو کہ تمہارا محبت نامہ ملکر بے انتہا خوشی
ہوئی۔ چونکہ تم نے مجھے یہ لکھا ہے کہ آپ مجھے اپنی
بیٹی سمجھیں۔ اس لیے میں یہ خط بیٹی ہی کی طرح
لکھ رہا ہوں۔ میں پہلے بھی تم کے لفظ سے خط و کتابت

کیا کرتا تھا۔ لیکن اُس وقت تم میرے ذہن میں کم عمر متصور ہوئی تھیں۔ پھر جب موقع ملاقات کا ہوا تو عمر زیادہ پاکر میں آپ کے لفظ سے مخاطب ہوا۔ اب اپنی بیٹی جان کر پھر اُسی طرح خطاب کر رہا ہوں جس طرح اپنی پیاری وحیدہ کو خط لکھا کرتا تھا۔

اللہ تعالیٰ تمھیں مع اپنے شوہر محترم کے خوش اور خیریت سے رکھے اور حکیم نابینا صاحب کا علاج راس لائے کہ آپ پورے تندرست ہو کر وطن کو جائیں۔

میں ضرور آتا مگر ڈیرہ اسمٰعیلخاں سے اطلاع آئی کہ سید نذر الباقر صاحب والد مسز سجاد حیدر کا یک بیک حرکت قلب کے بند ہوجانے سے انتقال ہوگیا۔ میں وہاں جانے والا ہوں۔ مگر تمھاری موجودگی ہی میں مجھے سخت قبض ہوگیا تھا جو بعد جاری رہا۔ اس سے میں بہت ڈرتا ہوں اور بہ سفر میں زیادہ ہوجاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ جلاّب لینے کے بعد جاؤ۔ مگر جلاّب سے میرے امعا میں بہت گڑبڑ ہوجاتی ہے۔ میں غذا سے درستی کی کوشش کر رہا ہوں۔ ساگ پر زیادہ زور دے رکھا ہے اور موٹے آٹے کا حریرہ گڑ کا کھاتا ہوں۔ اس میں گھی ڈال کر قبض دُور ہوجائے تو میں ڈیرہ اسمٰعیل خاں جاؤں۔

تمھارے جانے کے بعد ہمارا گھر بہت سُونا سُونا معلوم ہونے لگا۔ بالکل سُنسان، خاموش اور بے رونق۔ مگر رفتہ رفتہ اپنی قدیمی بے رونقی کا عادی ہو جاؤں گا۔

تمہارا بار بار ہنسنا اور ہنستے وقت شرم سے ہاتھ مُنہ پر رکھ لینا، بہت یاد آتا ہے۔ مُنیا بار بار یاد کرتی اور کہتی ہے کہ اُنھیں پھر بُلالو۔

اللہ پھر خوشی سے ملائے اور دونوں جانب خیریت رکھے۔

مسز شاہ نواز نے اب تک کوئی فارم نہیں بھیجا حالانکہ میاں حمید نے انھیں خط بھی لکھا۔ مہربانی کر کے تم انھیں تاکیدی خط لکھ دو اور یہ لکھو کہ "میں سید ممتاز علی صاحب اور مسز حمید سے وعدہ کرچکی ہوں کہ مسز شاہ نواز بچی کو ضرور داخل کروادینگی۔ پس آپ مجھے ان کے آگے شرمندہ نہ کرائیں اور جلد انتظام داخلہ کے کرکے بچی کو خود ساتھ لے جائیں۔ میں بے انتہا شکر گزار ہوں گی۔"

اس طرح کا خط اپنے دوسرے حالات کے ساتھ جلد لکھ دیجیے۔

سید صاحب محترم کے اشعار اور لکچر نما تقریریں بہت یاد آتی ہیں۔ کاش میرا حافظہ ہوتا اور ان جواہر ریزوں کو محفوظ رکھ سکتا۔ ان سے مل کر دل بہت ہی خوش ہوا۔ اس نمونے کا بیرسٹر پنجاب میں تو ایک بھی نہیں۔ یہاں کے بیرسٹروں میں تو بوٹ سوٹ کے سوا اور کچھ بھی نہیں نہایت بدمذاق، ناسخن شناس، بے علم ہیں۔ ان میں صاحب لوگیت کے سوا کچھ نہیں۔ اللہ آپ کے شوہر محترم کو تا دیر سلامت باکرامت رکھے۔

کاش حیدرآباد نزدیک ہوتا اور میں آسانی سے

مل سکتا ۔ یا تم دس بارہ برس پہلے میری بیٹی بنی ہوئیں تو پیاری بیٹی اب ختم کرتا ہوں ۔ قلم سے بوجہ رعشہ لکھ نہیں سکتا ۔ پنسل سے بہت آہستہ آہستہ بمشکل سے لکھا جاتا ہے ۔ اتنا لکھنے میں ایک گھنٹے سے کم نہیں لگا ۔ بُیا تم دونوں کو آداب کہتی ہے اور سب عزیز سلام کہتے ہیں ۔ حمید بیرسٹر صاحب کو بہت یاد کرتے ہیں ۔ عزیزی حیدر صاحب کو بھی میرا اسلام شوق پہنچا دیجئے ۔ اب بالکل رخصت محبت کے ساتھ

ممتاز علی

مکرر آنکہ ۔ اس وقت بارش ہو رہی ہے ۔ چائے کا وقت ہو گیا تھا ۔ میرا کوئی آدمی چائے بنانے والا نہ تھا ۔ دلہن نے اُوپر سے چائے بھیجی ہے اور ساتھ کچھ پکوان ۔ میں خط بند کرنے نہ پایا تھا کہ چائے آگئی ۔ میں نے یہ بھی خط میں درج کر دیا ۔ لو اب تو سچ مچ ختم ۔ والدعا ۔

ممتاز علی

شاد عظیم آبادی کا خط

بنام سید ہمایوں مرزا

دوم جولائی ۱۹۰۹ء عظیم آباد

حبیب محتشم عزیز مکرم دام لطفکم بعد سلام شوق و اشتیاق دیدار کے واضح خدمت ہو یہ خط میرا عزیز از جان مسٹر محمد سلیمان صاحب اور برادر شفیق سید ہمایون میرزا صاحب دونوں حضرات کے نام نامی سے ہے ۔ کیفیت یہ ہے کہ بعد تشریف بری آپ کے مولوی سید نور الدین احمد صاحب وکیل میری ملاقات کو تشریف لائے اور از راہِ عنایت مجھ سے فرمایا کہ آپ حیدر آباد کا ضرور قصد کیجئے اور وہاں اگر میرے گھر میں چندے قیام کیجئے میں اپنے گھر میں ایک مجلس سید الشہدا برپا کر کے فخر الملک وغیرہ اُمرا سے آپ سے ملوا دُنگا (چونکہ اِدھر میں نے بہت سے مرثیے نظم کئے اور مجالس میں خود پڑھے اور ان کی رونق اور تعریف بے حد و حساب ہوئی چنانچہ ایک مجلس عظیم الشان میں اکثر حضرات بیرسٹر بھی شریک تھے اور یک زبان ہو کر بے حساب داد دی اسلئے ہمارے نوِدمیاں کو بہت جوش پیدا ہوا اور یہ صلاح دی)

اوسکے جواب میں اپنے عزیز مسٹر سلیمان صاحب کی رائے ظاہر کی کہ بغیر خط سفارشی مسٹر پلوڈن صاحب کے آنا اچھا نہیں معلوم ہوتا باایں ہمہ آج میں صاحب کمشنر بہادر سے ملنے گیا تھا چونکہ چند روز بعد لفٹنٹ گورنر آنے والے ہیں ایک قطعہ اُن کے ورود کے لئے حسبِ معمول نظم کر کے کمشنر صاحب کو دکھانے گیا تھا مجھ سے بے اختیار خود کہنے لگے کہ آپ کے لئے ہم حیدر آباد جانا بہت پسند کرتے ہیں اگر آپ کہئے تو ہم مسٹر پلوڈن صاحب کو چھٹی لکھ دیں بشرطیکہ آپ جانے پر مستعد ہو جئے میں نے کہا کہ میرے دو عزیز بیرسٹر بالفعل حیدر آباد میں پرکٹس کرتے ہیں ، میں اُن سے صلاح کر کے آپ کی خدمت میں عرض کرونگا ۔

اس وقت یہ خط اس لئے آپ کی خدمت میں

بھیج رہا ہوں ذیل کی باتوں کا جواب دیجئے اور خوب سوچ کر میرے حق میں جو مناسب ہو وہ لکھئے

(۱) خط صاحب کمشنر پٹنہ بنام رزیڈنٹ کافی ہوگا یا اور کچھ بندوبست کریں یعنی کلکتہ جاکر اور اور انگریزوں سے بھی کہیں۔

(۲) اگر کمشنر صاحب سے خط لکھوائیں تو اُس کا کیا مضمون ہو۔

(۳) اپنے لڑکے کو ساتھ لائیں یا نہیں مشکل یہ ہے کہ بغیر لڑکے کے زیادہ قیام میرا ناممکن ہوگا۔

(۴) ایسی حالت میں میرے خرچ آمد و رفت کو پانچ سو روپے کافی ہونگے یا نہیں۔

(۵) لباس کس قسم کا وہاں درکار ہے مطلب یہ ہے کہ جو لباس کی قطع ہے وہ بدلنا ناممکن گر قسم پارچہ کیا ہو۔

(۶) مولوی خدا بخش خاں صاحب سے امید نہیں، شاید حافظ صاحب بھی کچھ معین ہوں تو اپنے وہاں آنے کی خبر اُن کو خواہ مولوی سید حسن صاحب کو دینا چاہئے یا نہیں۔

(۷) رزیڈنٹ کے ذریعے سے مکان قیام مجھے مل سکتا ہے یا نہیں۔

امید ہے کہ آپ لوگ خوب سوچ بچار کر اس کا جواب تحریر فرما کر مجھ کو مشکور احسان فرمائیے تاکہ اگر میرے ہزار پانچ سو خرچ ہوں تو بیکار نہ جائیں۔

یہاں گرمی کی شدت ہے ایک دو پانی برسا ہے مگر کافی نہیں ہے۔

باقی سب خیریت ہے فقط

آپ کا دعاگو

سید علی محمد شاد غفرلہٗ

رباعیات

گر گل کی ہوس ہے تو کچھ خاروں سے
لے درس حقیقت کا تو افسانوں سے
احساس غم و درد مٹا دے یاں تک
کے نغمہ کی پیدا ہو ترے نالوں سے

(۲)

یوں ہمدموا مشکل کو تم آساں کر لو
بجلی کو نشیمن کا نگہباں کر لو
چھوڑو کوئی اچھی سی نشانی اپنی
مرنا ہے یہاں جینے کا ساماں کر لو

(۳)

اے دوست بتا دے مجھے کچھ رازِ حیات
قبل اس سے کہ اڑ جائے یہ شہبازِ حیات
کس نے چھیڑا ہے اور کیونکر چھیڑا؟
دلچسپ ہے بسکہ نغمۂ سازِ حیات

(۴)

سننے کو نصیحت تجھے خود گوش نہیں
غفلت میں تو مدہوش ہے کچھ ہوش نہیں
دیتے ہیں خبر خزاں کی گل گلشن میں
گویا ہے زبانِ غنچہ خاموش نہیں

منشی محمد عطا اللہ عطا کلیانوی

سب رس معلومات

(ضمیمہ سب رس)

کمال اتاترک

غازی مصطفیٰ کمال پاشا جو ۱۸۸۱ء میں سیلونیکا میں پیدا ہوئے، بیسویں صدی کے ایک بہت بڑے آدمی ہیں۔ انھوں نے ایک غریب گھرانے میں جنم لیا تھا، اور ان کے والد علی رضا کروڑگیری کے ایک معمولی عہدہ دار تھے جو ان کے بچپن ہی میں انتقال کر گئے، مگر اس ہونہار بچے کے سر پر اس کی والدہ زبیدہ کا سایہ تھا جو مصطفیٰ کے لئے بڑی نعمت تھی۔ زبیدہ نے سب سے پہلے ایک قدیم مکتب میں مصطفیٰ کی تعلیم کا انتظام کیا تاکہ اس کو مذہبی باتوں سے پوری واقفیت ہو جائے۔ اس کے ایک سال بعد مصطفیٰ ایک ثانوی مدرسے میں منتقل کئے گئے۔ جہاں ان کی ذاتی قابلیت اور پوشیدہ جوہر نے ان کو تعلیمی وظیفے اور "کمال" کے لقب سے سرفراز کیا۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصطفیٰ کمال کو تعلیم کی نسبت درج سے زیادہ دلچسپی تھی، چنانچہ وہ مدرسہ چھوڑ کر بھاگ نکلے اور سیلونیکا کے ایک فوجی مدرسے میں شریک ہو گئے۔ یہاں انھوں نے زیادہ دلچسپی اور انہماک سے کام کیا، اور بہت سے امتیاز حاصل کئے۔

جس زمانے میں مصطفیٰ سنِ شعور کو پہنچے وہ ایک پُر آشوب زمانہ تھا۔ ترکی کی فضا پر ظلم و جور، ذلت اور بے بسی چھائی ہوئی تھی۔ سلطان عبدالحمید خاں کے عہد میں عثمانی ترکوں کی حکومت آخری سانسیں لے رہی تھی۔ ایک وہ زمانہ بھی تھا کہ سلطان سلیم اور سلیمان کا مقابلہ دُنیا کی کوئی طاقت نہ کر سکتی تھی۔ سات سرزمینیں اور سات سمندر ان کے قبضے میں تھے۔ مگر زمانے نے ایسا پلٹا کھایا کہ علم و تدبر کے مالک تعیشات کے غلام بن گئے۔ سلاطین عیاشی میں پڑ گئے، فوج بے سری رہ گئی اور حکومت نااہلوں کے ہاتھوں میں آگئی جن کا شعار ظلم و جبر اور کمزور عوام کو کچلنا تھا۔ رعایا تباہ تھی۔ کوئی غیرت مند نوجوان جاسوسوں کے ہاتھ سے محفوظ نہ تھا۔ ملک کی ابتری سے فائدہ اُٹھا کر یورپی حکومتوں نے سلطنت کے حصے بخرے کرنے شروع کئے۔ برطانیہ نے مصر دبا لیا، اور فرانس نے تیونس۔ بلقان کی ریاستیں ایک ایک کر کے آزاد ہو گئیں۔ روس کی یہ حالت تھی کہ جب کبھی موقع ملتا قسطنطنیہ پر چڑھ دوڑتا۔ خود سلطنت میں عیسائی اقلیتیں یورپی حکومتوں کے بل بوتے پر آئے دن آمادۂ فساد رہتیں۔ نیز سلطنت دیوالیہ ہو چکی تھی اور قرضوں پر حکومت کا کام چلتا تھا۔ ہر نئے قرض دینے والے کو ملک کا کوئی نہ کوئی انتظامی شعبہ سپرد کر دیا جاتا۔ اس کے علاوہ بڑی مصیبت یہ تھی کہ سلطنت میں جو غیر ملکی آباد تھے وہ ترکی قوانین سے بالاتر تھے اور یہ ذلت و استبداد کی انتہا تھی۔ پھر ۱۸۸۶ء کی جنگ میں جو روس اور ترکی کے درمیان ہوئی تھی، ترکی کے ماتھے پر "بیمار یورپ" کا دل خراش دھبہ لگ چکا تھا۔ اس ابتری کی تمام تر ذمہ داری سلطان عبدالحمید پر تھی۔ مگر اس کے باوجود وہ ظلِ اللہ کے نام سے پوجے جاتے تھے اور مذہبی طبقے اس کے مظالم کی تائید میں تھے۔ لیکن ملک کے نوجوان جن پر ملک کو تباہی سے بچانے کی بڑی ذمہ داری تھی،

اپنے کو منظم اور مستحکم کرنے لگے۔ چنانچہ نوجوان ترکوں کی بہت سی انجمنیں قائم ہوگئیں اور ان کی یہ کوشش ہونے لگی کہ موجودہ حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے۔ نوجوان مصطفےٰ کمال پر نئے خیالات اور نئی تحریکوں کا جنھیں بڑی حد تک بیرونی انتداب اور انقلاب فرانس کا ردّ عمل سمجھنا چاہیے، بہت زیادہ اثر پڑا اور کمال نے "ترقی پذیر جماعت" میں شرکت کرلی جو ایک بہت بڑی خفیہ جماعت تھی۔ اسی خفیہ جماعت سے کمال کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔ اس وقت تک کمال نے فوجی مدرسوں سے فراغت حاصل کرلی تھی اور اب بائیس سال کی عمر میں قسطنطنیہ کی جنگی اکاڈیمی میں لفٹنٹ ہوگئے تھے اس زمانے میں کمال کے خیالات پر سب سے زیادہ اثر جس چیز کا پڑا وہ ایک ممنوعہ کتاب "وطن" تھی۔ کمال نے اس کتاب کا پرچار کیا، اور اس پر تقریریں کیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنی ادارت میں ایک اخبار بھی جاری کیا جو بہ بانگ دہل حکومت کی مخالفت کرتا تھا۔ مگر نوجوانوں کی سرگرمیاں زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکیں۔ چنانچہ ۱۹۰۵ء میں مصطفےٰ کمال اور ان کے ساتھی پکڑلئے گئے۔ کمال کو فوج میں لفٹنٹ بناکر وطن سے دُور دمشق بھیج دیا گیا، مگر یہاں ان کو اپنی جد وجہد کے لئے زیادہ آزادی ملی۔ چنانچہ "وطن" کے نام سے ایک انجمن بنی اور فوج کے نوجوان افسر اس میں شریک ہوئے۔ اسی سلسلے میں کمال سیلونیکا پہنچے، مگر چونکہ حکومت کے جاسوسوں کو اس کی خبر ہوگئی تھی اس لئے وہ بھاگ نکلے۔ چند دنوں بعد فوجی وزارت میں تبدیلیاں ہوئیں اور کمال سیلونیکا کی فوج میں آگئے جو انقلابی جماعتوں کا مرکز تھا۔ اب انھوں نے اپنی پوری قوت کے ساتھ کام کرنا شروع کیا، اور موجودہ دو بڑی خفیہ انجمنوں یعنے "آزاد جماعت" اور "ترقی پذیر جماعت" کو متحد کردیا۔ کمال اس نئی "انجمن اتحاد و ترقی" کے سرگرم رکن بن گئے اور انور و جمال کے ساتھ کام کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ "انجمن اتحاد و ترقی" اتنی طاقتور ہوگئی کہ ۱۹۰۸ء میں سلطان دستوری حکومت قائم کرنے پر مجبور ہوا، اور ایک پارلیمنٹ بنادی گئی۔ بعد میں سلطان نے اپنے اقتدار کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کی تو انھیں معزول کردیا گیا، اور وہ نظربند ہوگئے۔ اب مُلک کے نوجوانوں نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی اور نااہل لوگ برطرف ہوگئے۔

مگر اس نئے دَور کو شروع ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا کہ مُلک پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ اس نازک وقت میں جبکہ ترکی فوج منظم نہ ہوسکی تھی اور ترکوں کے پاس سمندری بیڑا بھی نہ تھا، اٹلی نے طرابلس پر حملہ کردیا۔ جوں توں کرکے انور اور مصطفےٰ کمال طرابلس پہنچے اور عربوں کی مدد سے دشمنوں کو روکنا چاہا۔ وہ اس طرف متوجہ ہی تھے کہ بلقان کی مملکتوں نے قسطنطنیہ پر چڑھائی کردی۔ ترکوں نے تو دونوں جگہ مقابلہ کیا مگر ان کو ہر محاذ پر شکست ہوئی، اور ترکوں نے جن لوگوں پر برسوں حکومت کی تھی ان کے ہاتھوں ذلتیں اٹھانی پڑیں۔ انور اور کمال طرابلس سے وطن واپس آئے تو کمال کو اور زیادہ مزاحمتوں کا مقابلہ کرنا پڑا کیونکہ اب سلطنت کے سیاہ و سپید کے مالک انور، طلعت اور جمال ہوگئے تھے اور پارلیمنٹ صرف نام کو باقی تھی۔ ان تینوں نے کمال کو نظرانداز کردیا

اور اپنے معاملات سے بے دخل کرنے کے لئے انھیں صوفیا کی ترکی سفارت میں بھجوا دیا۔ پھر جب ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم شروع ہوئی اور ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا تو انور نے جو اب وزیر جنگ تھے کمال کو صوفیا ہی میں رہنے دیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ ۱۹۱۵ء میں کمال سخت بیمار ہو گئے اِس بنا پر وہ قسطنطنیہ پہنچے اور چند دنوں بعد صحت ہوئی تو ان کو درہ دانیال کی حفاظت پر متعین کیا گیا۔ برطانوی فوجیں پوری طاقت سے درہ دانیال پر حملہ کر رہی تھیں، مگر مصطفےٰ کمال کی حیرت انگیز شجاعت اور جنگی مہارت نے معجزہ دکھایا اور بے بس ترکوں نے دُنیا کی زبردست سلطنت کو شکست دی چنانچہ انگریز درہ دانیال سے بُری طرح پسپا ہوئے اِس کا اثر یہ ہوا کہ ترکی میں مصطفےٰ کمال کا نام خوب چمکا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ کمال کے حریف انھیں آگے بڑھنے نہیں دیتے تھے۔ مگر دوسری طرف جنگ طول کھینچی تو جرمنوں کے ساتھ ترک بھی ہر محاذ پر شکست کھانے لگے۔ عربوں نے بغاوت کردی اور عراق و فلسطین کی طرف سے انگریزوں نے پیش قدمی شروع کی اِس نازک وقت میں سلطان کی طرف سے کمال کو ہدایت ہوئی کہ فلسطین کے محاذ جنگ پر روانہ ہو جائیں مگر فلسطین میں دشمن کا روکنا آسان نہ تھا۔ کمال پیچھے ہٹتے گئے اور فلسطین، دمشق اور حلب سب ہاتھ سے نکل گئے مگر مسلسل شکستوں کے بعد جب وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے موجودہ ترکی سرحد پر پہنچے تو انھوں نے کہا کہ اب ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹ سکتا اور وطن کی سرزمین پر دشمنوں کے ناپاک قدم نہیں آسکیں گے مگر اس وقت تک عارضی صلح کا اعلان ہو چکا تھا چنانچہ جنگ رُک گئی اور کمال قسطنطنیہ آ گئے۔

مصطفےٰ کمال کی غیر معمولی قابلیت اور ان کے پوشیدہ جوہر کے ساتھ ساتھ انھیں کچھ غیبی امداد بھی تھی۔ چنانچہ ایک موقع پر جب ان کے دشمن کی گولی لگی تو انھیں کوئی ضرر نہیں پہنچا اور انھوں نے نہایت اطمینان کے ساتھ اپنی جیب سے ایک گھڑی نکال ڈالی جو گولی کی زد سے ٹوٹ گئی تھی۔ یہی نہیں بلکہ بہت سے موقعوں پر یہ خطرے سے بال بال بچ گئے! اس کے معنے صاف طور پر یہ تھے کہ قدرت کو کمال کے ہاتھوں ترکی کی خدمت کروانی منظور تھی۔ مگر مشکل یہ تھی کہ جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد مصطفےٰ کمال کے لئے بہت سی گتھیاں تھیں۔ سلطان وحیدالدین نے برطانیہ کے ساتھ سازش کر لی تھی۔ دشمنوں کی فوجیں قسطنطنیہ پر قابض تھیں اور ان کے جہاز آبنائے باسفورس پر جمے ہوئے تھے۔ یہ ایسا نازک موقع تھا کہ مُلک میں ہر طرف مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ انور پاشا وغیرہ ترکی سے بھاگ گئے تھے اور اب پُرانے عافیت پسندوں کا راج دوبارہ قائم ہو گیا تھا جو ترکی کے اقتدار کو کھو کر انگریزوں کی غلامی اختیار کرنا پسند کرتے تھے اِس کٹھن گھڑی میں مصطفےٰ کمال اُٹھے اور مُلک کے نوجوانوں کو جن کی رگوں میں زندگی اور حمیت کا خون دوڑ رہا تھا، ایک جگہ جمع کیا۔ یہ نوجوان جن پر ایک بھاری ذمہ داری تھی اپنی قوم کو موت سے بچانے کی فکر کرنے لگے۔ اسی اثناء میں مصطفےٰ کمال مشرقی مقبوضات کے قائد اعلیٰ بنے اور انگورہ کی طرف بھجوائے گئے تاکہ وہ عارضی صلح کی شرائط کے بموجب فوج کو برخاست کر کے ہتھیار جمع کر لیں! اس موقع کو مصطفےٰ کمال نے

بہت غنیمت جانا اور انھوں نے فوج کی تنظیم شروع کردی اور اپنے ہم وطنوں کو آنے والے غلامی کے عذاب سے ڈرایا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ "مرد بیمار" نے پھر سے کروٹ لی اور اپنا علاج آپ کرنے پر تیار ہوگیا چنانچہ سلطنت کے ہر طبقے اور سمت کے لوگ مصطفیٰ کی طرف کھنچے چلے آئے۔ زندگی کی اس نئی روح سے سلطان وحیدالدین اور اتحادی گھبرائے مگر کمال ان کے قابو سے باہر ہو چکے تھے۔ مجبور سلطان نے اتحادیوں کی شہ پر کمال اور ان کے ساتھیوں کو باغی قرار دیا اور شیخ الاسلام نے ان پر کفر کا فتویٰ صادر کیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ خلیفہ کے ہمدرد ان لوگوں کی سرکوبی کے لئے قسطنطنیہ سے روانہ ہوئے، مگر اسے اتفاق ہی کہنا چاہیے کہ عین اس وقت عہدنامہ سیورے کا اعلان ہوا۔ اس کی رو سے ترکی کے سب مقبوضات اس سے چھین لئے گئے، قسطنطنیہ پر اتحادیوں کا قبضہ مانا گیا، سمرنا یونانیوں کو بخشا گیا اور انگورہ کی مختصر سرزمین ترکی کے حصے میں رہی۔ ان زیادتیوں کا ایک مفید نتیجہ یہ نکلا کہ ترک قوم اب اپنے زندگی اور موت کے سوال کو حل کرنے کھڑی ہوگئی اور تمام ترکوں نے کمال کا ساتھ دیا۔ سواک کے مقام پر اسمبلی کی بنیاد رکھی گئی اور خلیفہ عبدالمجید خاں کے احکام کو ماننے سے انھوں نے انکار کر دیا۔

ادھر یونانیوں نے سمرنا پر قبضہ کرنے کے بعد آگے بڑھنا شروع کیا، اور ترکوں کو پیچھے ہٹاتے ہوئے پایۂ تخت انگورہ کے قریب تک پہنچ گئے۔ اس پر ترکوں کے خون نے جوش کھایا اور سقاریہ کے میدان میں دونوں کا مقابلہ ہوا۔ اکیس دن کی معرکہ آرائی کے بعد ترکوں نے فتح حاصل کی اور انھوں نے سمرنا تک کا علاقہ یونانیوں سے دوبارہ حاصل کر لیا۔ اس کے بعد ترک قسطنطنیہ کی طرف بڑھے اور انگریزوں کو مقابلہ کی دعوت دی مگر انگریز جو ابھی جنگ عظیم کے بعد سستانے نہ پائے تھے، ترکوں سے نہ لڑ سکے اور انھوں نے صلح کی بنیاد ڈالی چنانچہ معاہدہ لوزان میں ترکوں کے تمام مطالبات مان لئے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قسطنطنیہ پر پھر سے پرچم ہلال لہرانے لگا اور باسفورس سے انگریزوں کے جہاز نکال دئے گئے۔ یورپی علاقے کو بھی انھوں نے حاصل کر لیا اور تمام اجنبی مراعات ختم کردیں ترکی کے حدود معین کئے اور ایک جمہوری دستور سے ملک کو سرفراز کرکے پارلیمنٹی حکومت قائم کردی جس کا صدر مقام انقرہ (انگورہ) قرار پایا۔ مصطفیٰ کمال ترکی کے پہلے صدر ہوئے اور انھوں نے صحیح معنوں میں ملک کی قیادت کی۔

اسے مصطفیٰ کمال کی اولوالعزمی ہی کہنا چاہیے کہ دو سال کے اندر ترک قوم پھر سے زندہ ہوگئی اور اپنے پیر پر آپ کھڑے ہونے کے قابل ہوگئی۔ کمال سب سے پہلے آدمی ہیں جنھوں نے اتحادیوں کے بنائے ہوئے معاہدے کو ٹھکرایا اور دوسری مظلوم قوموں کو زندگی کا سبق دیا۔ دو سال کی قلیل مدت میں یورپ کے "مرد بیمار" کو جس کے ہاتھ پیر بالکل شل ہو چکے تھے، طاقتور قوموں کی صف میں اس طرح لا کر کھڑا کر دینا کہ اچھے سے اچھے مرد تندرست اور ہر بڑی طاقت کا مقابلہ کر سکے، کوئی معمولی بات نہ تھی۔ یہ کمال کا معجزہ تھا۔ ترکی کی زندگی اور موت کا سوال

دنیائے اسلام کی زندگی اور موت کا سوال تھا کیونکہ دنیائے اسلام ترکی کو اپنا نمائندہ سمجھتی ہے۔ چنانچہ جب ترکی پر مصیبت آئی اور ایک طرف سے انگریزوں اور باغی عربوں، اور دوسری طرف سے یونانیوں نے ترکی کو کچلنا چاہا تو ساری اسلامی دنیا میں سخت پریشانی سی پھیل گئی اور پوری دنیا کے مسلمان ہر طرح ترکی کی مدد کرنے کے لئے تیار ہو گئے تھے، مگر جب کمال نے فوق العادت ہمت سے کام لیا اور ترکوں کو زندہ کر دیا تو وہ دنیائے اسلام کی آنکھوں کا تارا بن گئے اور سب مسلمان کمال کو اپنا رہنما سمجھنے لگے۔ صرف یہی نہیں بلکہ کمال اتاترک نے دنیا کی دوسری قوموں کو بھی زندہ رہنے کا طریقہ بتایا اور یہ ان کا بہت بڑا احسان ہے۔ مسولینی نے انہی سے بصیرت حاصل کی اور ہٹلر نے انہی کے نقش قدم پر چل کر معاہدۂ ورسائے کے پرخچے اڑا دیئے اور اپنی قوم کو اس قابل بنا دیا کہ ورسائے میں زیادتیاں کرنے والوں سے پورا بدلہ لے سکے۔

کمال کی کامیابی کا بڑا راز ان کی سیاسی حکمت عملی اور خارجی مسلک میں ہے۔ ملک کی اندرونی اصلاح کے لئے باہر سے اطمینان حاصل کرنا ضروری تھا اور اسے کمال اچھی طرح سمجھ گئے تھے۔ اس کے لئے انھوں نے دشمنوں اور دوستوں سبھی کو اپنا ہموار بنانے کی کوشش کی۔ روس سے، جس کے ساتھ ترکوں کی بہت پرانی اور قومی دشمنی تھی، دوستی کی۔ مگر قابل تعریف بات یہ ہے کہ اس دوستی کے باوجود اشتمالیت کی مسموم ہوائیں ترکی کا رُخ نہ کر سکیں۔ یونان جس نے ترکوں کو پریشان کیا تھا اور جو بعد میں ترکوں سے پٹ چکا تھا، اس سے بھی صلح، صفائی کی اور راہ و رسم پیدا کیا۔ برطانیہ اور فرانس سے جو ترکی کے سخت دشمن تھے اور جنھوں نے ترکی کو پریشان کر کے اس کے بہت سے علاقے دبا لئے تھے، اب کمال نے دوستی کر لی بلکہ موقع سے فائدہ اٹھا کر فرانس سے اپنے بہت سے مطالبات بھی منظور کرا لئے۔ پھر جرمنی سے بھی دوستی قائم رکھی، اور روس و برطانیہ کی دوستی کے باوجود جرمنی کے ساتھ اچھے تعلقات برابر قائم رکھنا ترکوں کی بڑی حکمتِ عملی سمجھی جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ اس انوکھے مسلک کی وجہ سے کمال کو ترکی کی اندرونی اصلاح کا بہت اچھا موقع ہاتھ آیا۔ اگرچہ کمال نے ترکی کے کندھے سے استبداد کا جوا اُتار پھینکا تھا اور ترکوں میں زندگی کی ایک نئی روح پھونک دی تھی مگر اب نئی زندگی کے ساتھ ترکی کو ایک نئے جسم کی بھی ضرورت تھی۔ ترکوں کا جسم قومی انحطاط سے کمزور پڑ گیا تھا۔ سالہا سال کی مسلسل جنگوں سے ملک کا بُرا حال ہو گیا تھا۔ غیر ملکی تجارت اور صنعت پر قبضہ جمائے ہوئے تھے۔ زراعت پیشہ اب سپاہی بن گئے تھے اور ملک کی زراعت ختم ہو رہی تھی۔ سرمایہ دار طبقے عیش پسند زندگی کے سبب زمین کی پیٹھ کا غیر ضروری بوجھ ہو گئے تھے۔ ملک میں تعلیم نہ تھی۔ علماء ہر نئی چیز کے دشمن اور اپنے مفاد کی خاطر ہر طرح کی قربانی کرنے آمادہ تھے۔ ظاہر ہے کہ ترکی کے ایسے جسم کو بدلنا کمال کے لئے ضروری تھا، چنانچہ انھوں نے ترکی قوم کو نئی زندگی اور نئی روح کے ساتھ ایک نیا قالب بھی دیا جو نئی زندگی

برسوں کی انتھک کوششوں، خونریزیوں، سازشوں، بغاوتوں اور جنگوں کے بعد نوجوان کمال کو ملی تھی اس زندگی کی بقا کے لئے اس نے وہ سب کچھ کیا جو وہ کرسکتا تھا جس جذبے نے طرابلس اور بلقان کی جنگیں سر کیں، اور جس روح نے درہ دانیال سے برطانیہ کو ہٹایا اور سقاریہ میں یونانیوں کو شکست دی، وہی جذبہ اور وہی روح اب ترکی کے نئے جسم کی تعمیر میں کارفرما ہوگئی۔ کمال نے دشمنوں کے خون میں نہا کر اپنی قوم کی رہنمائی کی تھی اور اسی کا نتیجہ ہے کہ وطن کی خاطر انھوں نے اپنے دشمنوں اور دوستوں دونوں کو کچلا، اور اگر یہ سنگدلی اور سختی تھی تو نئے جسم کی تعمیر کے لئے یہ ضروری تھی۔ کمال نے خلیفہ اور سلطان کے ڈھونگ کو ختم کیا، علما کا زور توڑا جو قوم کی زندگی کے لئے وبال بن چکے تھے جو لوگ مذہب کی آڑ میں ہر نئی چیز کی مخالفت کرتے تھے، وہ گولی کا نشانہ بنے، پیر، مجاور، صوفی اور بھک منگے فقیر جو قوم کا خون چوس رہے تھے، سب ختم ہوئے۔ بے حس عوام میں وطنیت کا جذبہ مفقود ہوچکا تھا، کمال نے ان میں حب وطن پیدا کیا جو ایمان کا جزو ہے۔ عوام جاہل تھے، ان کو علم سے سرفراز کیا۔ عیسائی مشنیریوں کا سدباب کیا جو قوم کو سخت نقصان پہنچا رہے تھے۔ ترکوں میں زراعت کا شوق پیدا کیا اور زرعی تعلیم کا بڑا انتظام کیا۔ لوگوں کو قانون کے ذریعہ صنعت و حرفت کے قابل بنایا۔ بچوں اور بڑوں میں قومی کاموں کا احساس پیدا کیا۔ عورتوں کو جو پردے میں بیٹھ کر عمریں ضائع کرتی تھیں کاروبار میں لگایا۔ پرانی چیزوں کو بہت مقدس سمجھا جاتا تھا، کمال نے ان کے خلاف بغاوت کی اور سب پرانی چیزیں ختم ہوئیں۔ ترکی ٹوپی اور پردہ سب رخصت ہوئے۔ حتیٰ کہ ترکوں کو پیام سلام کے نئے طریقے بتائے گئے اور پرانے عاجزی کے سلام بدل گئے، اور موسیقی جو صرف رونے دھونے کے جذبات پیدا کرسکتی تھی اب ختم ہوئی اور اس میں نئی زندگی آگئی۔

کمال اتاترک کے تمام کارنامے ترکی کی شاندار تاریخ کے زرین ورق ہیں۔ ان کی عجیب و غریب اور حیرت انگیز شخصیت ہر قدم پر اپنا لوہا منواتی تھی۔ ان کے کام بڑے تھے جس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ انھوں نے اس جمود کو جو صدیوں سے اسلام کی روح کو مسخ کر رہا تھا، توڑ دیا اور نئی نسل پر بہت بڑا احسان کیا۔ ان کی بڑائی کا ایک بڑا ثبوت یہ بھی ہے کہ جوان کے دشمن تھے وہ دوست بن گئے اور جو انھیں کافر کہتے تھے وہ "مرد مومن" کہنے لگے۔ وہ صحیح معنوں میں مرد مومن تھے اور مسلمانوں اور خصوصاً ترکوں کے بہت بڑے محسن۔ ۲۱ نومبر ۱۹۳۸ء کو وہ دنیا سے رخصت ہوگئے، مگر ان کی روح ترکوں کے زندہ قالب میں ہمیشہ زندہ رہے گی اور ان کی ذات جس نے خود جل کر افق اسلام کو روشن کیا، نوجوانوں کے دلوں میں نئی نئی امنگیں اور آرزوئیں پیدا کرتی رہے گی جو ان کی بقا کے لئے ضروری ہے۔

(عبدالحفیظ صدیقی)

ہماری غذا

یہ سوال کہ ہمارے کھانے پینے کی چیزیں کن اشیا سے مرکب ہیں اپنے اندر بہت سی دلچسپیاں رکھتا ہے کیونکہ ہماری غذا جن عناصر اور مرکبات پر مشتمل ہے وہ بظاہر بہت حقیر معلوم ہوتے ہیں اور ایک عام انسان کا خیال اس طرف جا بھی نہیں سکتا کہ یہ چیزیں ہماری غذا کے اجزا ہوں گی لیکن ایک سائنس داں کی نظر جو ہر وقت کسی نہ کسی شے کے تجزیہ اور ترکیب کی تلاش میں رہتی ہے، ہر چیز کو اپنے خاص انداز سے دیکھتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اکثر و بیشتر بال کی کھال بھی نکال لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہماری غذا کا سوال ہماری اولین توجہ کا محتاج ہے۔ اگر ہم کو یہ نہ معلوم ہو کہ ہماری غذا کی ترکیب کیا ہے اور غذا کا ہر جز و ہماری زندگی پر کیا اثر رکھتا ہے تو یہ بہت بڑی ستم ظریفی ہوگی اور اپنے آپ پر ایک بڑا ظلم۔ بات یہ ہے کہ جو اجزا ہماری غذا کو بناتے ہیں ان میں سے ہر ایک کا ایک خاص فعل ہوتا ہے اور ہر جز و ہمارے جسم کے کسی نہ کسی عضو کی خدمت کرتا ہے۔ اگر ہماری غذا میں کسی جز و کی کمی ہو جائے تو اس کے نتائج کسی نہ کسی بیماری یا کسی عضو کی کمزوری کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اس لئے ایک محتاط اور حکمی زندگی کے لئے یہ ضروری ہے کہ غذا کی ترکیب معلوم کی جائے اور اس کے مفید اجزا سے فائدہ اٹھایا جائے۔
ہماری غذا حسب ذیل اشیا پر مشتمل ہوتی ہے:۔

(۱) پروٹین:۔ یہ ان مرکبات کا نام ہے جن کے اجزا کاربن، ہیڈروجن، آکسیجن، نائٹروجن اور گندک جیسے عناصر ہیں اور ان کو نائٹروجنی مرکبات کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ پروٹین کا فعل یہ ہوتا ہے کہ جسم کی بافتوں کو قوی بنائے اور اگر ان میں کسی قسم کی خرابی پیدا ہو جائے تو اسے دور کرے۔ پروٹینی غذا میں انڈا (البیومن) گوشت، گیہوں، دودھ، مٹر، بنس اور دالیں ہیں۔

(۲) کاربوہیڈریٹ:۔ یہ ایسے مرکبات کا نام ہے جو صرف کاربن، ہیڈروجن اور آکسیجن پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اس کے ماخذ سبزی اور ترکاریاں ہیں، اور اس کا فعل یہ ہے کہ یہ توانائی پیدا کرتا ہے اور حرارت غریزی اور چربیاں بھی اسی سے پیدا ہوتی ہیں۔
مثالیں:۔ نشاستہ خواہ کسی اناج سے ہو شکر۔ دودھ کی شکر اور جگر سے حاصل کیا ہوا نشاستہ۔

(۳) چربیاں:۔ ایسے مرکبات جو کاربن، ہیڈروجن اور آکسیجن پر مشتمل ہوتے ہیں۔ یہ حرارت اور توانائی پیدا کرتے ہیں۔
مثالیں:۔ مسکہ، گھی، اور دوسرے نباتی تیل۔

پروفسر ہارون خان صاحب شروانی
صدر شعبہ تاریخ جامعہ عثمانیہ

(۴) معدنی نمک :- ان میں معمولی نمک یا سوڈیم کلورائیڈ سب سے اہم ہے اِس کی بدولت ہیڈروکلورک ترشہ پیدا ہوتا ہے جو ہضمی رس کے لئے ضروری ہے۔ چونے کے فاسفیٹ بھی جو غذا کے اہم ٹکڑوں سے ہے، ہڈیوں کو مضبوط بنانے کے لئے ضروری ہے اور لوہے کے نمک بھی کافی اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ انہی سے خون کا سرخ مادّہ یعنے ہیموگلوبن پیدا ہوتا ہے۔

(۵) پانی :- غذا ہضم ہو جانے کے بعد پانی اس ہضم شدہ غذا کو حل کرتا ہے اور غذا کی تحلیل میں مدد دیتا ہے۔ اس کے علاوہ پانی کا بڑا فعل یہ ہے کہ خون کو سیّال حالت میں رکھتا ہے اور اخراج میں مدد کرتا ہے۔

(۶) ویٹامن :- یہ ان اشیا کا گروہ ہے جو ہماری غذا کے سب سے اہم اجزا ہیں اور جو ہماری صحت اور نشو ونما کے لئے بیحد ضروری ہیں۔ ویٹامن کی ترکیب ابھی تک اچھی طرح سمجھ میں نہ آسکی بگران میں بہت سے ایسے ہیں جن کو کیمیائی اور فعلیاتی لحاظ سے اچھی طرح سمجھا گیا ہے۔ اب تک کوئی چھ ویٹامن دریافت ہوئے ہیں۔ اے، بی (یا بی، بی ۲ یا جی) سی، ڈی اور ای۔ ان میں کے چار یعنے ویٹامن بی، بی، سی اور ڈی اب کیمیاوی طور پر الگ کرلئے گئے ہیں۔ تمام ویٹامن فعلیاتی لحاظ سے اہمیت رکھتے ہیں اور ہر ایک کے جداگانہ افعال ہیں۔ یہ سب تازہ غذا میں موجود ہوتے ہیں۔ (ع۔ ح۔ ص) (نوٹ:- ویٹامن پر ایک تفصیلی مضمون آئندہ اشاعت میں آئے گا)

آئندہ امتحانات

امتحان مقابلہ برائے انڈین ملٹری اکاڈیمی اور رائل انڈین نیوی:-

انڈین ملٹری اکاڈیمی ڈیرہ دون اور رائل انڈین نیوی میں شرکت کے لئے فیڈرل پبلک سرویس کمیشن کی طرف سے ایک امتحان لیا جائے گا جو ۲۷ ر مارچ ۱۹۴۰ء سے دہلی میں ہوگا۔ ملٹری اکاڈیمی کے لئے امیدواروں کی عمر ۱۸ سال سے کم اور ۲۰ سال سے زائد نہ ہونی چاہیے، اور انڈین نیوی کے لیے ۱۷ سال سے کم اور ۱۹ سال سے زائد نہ ہونی چاہیے۔ شرکت کے لئے درخواستیں ۹ ر جنوری ۱۹۴۰ء تک فیڈرل پبلک سرویس کمیشن کے دفتر میں وصول ہو جانی چاہئیں۔ درخواستوں کے ساتھ ساڑھے سات روپیے فیس بھی بھجوانی ضروری ہے۔ انتخابات کے بعد پچاس روپیے داخل کرنے ہوں گے۔ اس امتحان کی شرائط یہ ہیں کہ امیدوار شادی شدہ نہ ہوں۔ منتخب امیدواروں کے ضامنوں کو ہر طرح کی ذمہ داری لینی چاہیے کہ امیدوار کے والدین یا سرپرست ٹریننگ سے متعلق امیدوار کی تمام مالی ضروریات پوری کریں گے، اور اگر کسی وجہ سے امیدوار ملازمت کو قبول نہ کرے تو وہ اس پوری رقم کی پابجائی کریں گے جو امیدوار پر خرچ کی گئی ہے۔

شرکت کی درخواستیں اور قواعد امتحان مقامی حکومتوں سے حاصل کئے جا سکتے ہیں اور حیدرآباد کی حد تک حسب ذیل پتوں سے :-

سکریٹری صاحب، رزیڈنٹ بہادر، رزیڈنسی حیدرآباد
معتمد صاحب، محکمۂ سیاسیات سرکار عالی و ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سکندرآباد
جوڈیشل افسر اورنگ آباد

کھیل

کھیلوں کے امتیازات :-

ڈیوس کپ کے نتائج :-

سنہ ۱۹۳۲ء میں .... فرانس نے امریکہ کو شکست دی ——— ۳-۲
سنہ ۱۹۳۳ء میں .... انگلستان نے فرانس کو شکست دی ——— ۳-۲
سنہ ۱۹۳۴ء میں .... انگلستان نے ممالک متحدہ امریکہ کو شکست دی ——— ۴-۱
سنہ ۱۹۳۵ء میں .... " " " " " ——— ۵-۰
سنہ ۱۹۳۶ء میں .... انگلستان نے امریکہ کو شکست دی ——— ۳-۲
سنہ ۱۹۳۷ء میں .... ممالک متحدہ امریکہ نے انگلستان کو شکست دی ——— ۴-۱

حسب ذیل ومبل ڈن ٹینس میں ممتاز رہے :-

سال	سنگلز (مرد)	سنگلز (عورتوں کا)
سنہ ۱۹۳۳ء	جے کرافورڈ (آسٹریلیا)	مسز ولز موڈی (ممالک متحدہ امریکہ)
سنہ ۱۹۳۴ء	ایف پیری (انگلستان)	مسز ڈروتھی راؤنڈ (انگلستان)
سنہ ۱۹۳۵ء	" " "	مسز ولز موڈی (ممالک متحدہ)
سنہ ۱۹۳۶ء	" " "	مس ایچ جیکبس (ممالک متحدہ)
سنہ ۱۹۳۷ء	ڈونال بج (ممالک متحدہ)	مس ڈی۔ راونڈ (برطانیہ)
سنہ ۱۹۳۸ء	" " (")	مسز ولز موڈی (ممالک متحدہ)

حسب ذیل باکسنگ میں ممتاز ہیں :-

فلائی ویٹ (۱۱۲ پونڈ) ——— پیٹر کین (انگلستان)

بنٹم ویٹ (۱۱۸ پونڈ) سکسٹو اسکوبارل ۔ فدر ویٹ (۱۲۶ پونڈ) ہنری آرم اسٹرانگ (ممالک متحدہ)۔ لائٹ ویٹ (۱۳۵ پونڈ) ہنری آرم اسٹرانگ (ممالک متحدہ)۔ ولٹر ویٹ (۱۴۷ پونڈ) ہنری آرم اسٹرانگ (ممالک متحدہ)۔ مڈل ویٹ (۱۶۰ پونڈ) فریڈ اپاشلی (ممالک متحدہ)۔ لائٹ ہیوی ویٹ (۱۷۵ پونڈ) ایف۔ ایچ۔ لوئیس (ممالک متحدہ)۔ ہیوی ویٹ (زائد از ۱۷۵ پونڈ) جو لوئی (متحدہ)

ڈربی :۔ ۱۹۳۲ء۔ اپریل دی ففتھ (مالک مسٹر ٹی۔ وال)۔ ۱۹۳۳ء۔ ہائی پیرین (مالک لارڈ ڈربی)۔ ۱۹۳۴ء ونڈسر لیڈ (مالک مہاراجہ راج پیپلا)۔ ۱۹۳۵ء۔ بہرام (مالک ہز ہائنس آغا خان)۔ ۱۹۳۶ء۔ محمود (" ہز ہائنس آغا خان)۔ ۱۹۳۷ء۔ مڈ ڈے سن (" مسز جی۔ بلر)۔ ۱۹۳۸ء۔ بوئی روسل ۔ ۱۹۳۹ء۔ بلیو پیٹر (مالک لارڈ روز بیری)۔

مہدی جنگ ٹینس :۔ حیدر آباد میں ۱۳؍ دسمبر سے مہدی جنگ ٹینس چمپین شپ ٹورنمنٹ کے کھیل شروع ہوئے ہندوستان کے مشہور کھلاڑی نمبر (۱) غوث محمد اور نمبر (۲) افتخار، اور ان کے علاوہ نارائن راؤ اور راما راؤ وغیرہ بھی اس میں شریک تھے۔ ۱۶؍ دسمبر کو غوث محمد (ہندوستان نمبر ۱) اور افتخار احمد (ہندوستان نمبر ۲) کے درمیان سنگلز کا فائنل ہوا۔ غوث نے افتخار کے مقابلے میں کامیابی حاصل کی۔ ۱۷؍ دسمبر کو سولہ سال سے کم عمر کے بچوں کا کھیل ہوا جس میں سجاد نے مقصود علی خاں کو شکست دی۔ اس کے بعد ڈبلز کا مقابلہ ہوا جس میں غوث، افتخار اور نارائن راؤ و راما راؤ نے حصہ لیا۔ غوث اور افتخار نے پہلا سٹ ۶۔۴ پر دوسرا ۶۔۲ پر لیا۔ تیسرا سٹ نارائن راؤ اور راما راؤ نے ۷۔۵ پر لیا، اور چوتھے سٹ میں غوث اور افتخار نے ۶۔۴ سے کامیابی حاصل کی اور اس طرح فائنل جیت گئے۔

(بقیہ مضمون "حالات حاضرہ") روس کے حصے میں یہ علاقے آئے :۔ یوکرین، وہ علاقے جہاں سفید روسی آباد ہیں اور رومانیہ و ہنگری کی سرحدوں کے قریب کا وہ ضلع جہاں پولستانی تیل کا مخزن ہے۔ اور اس کے علاوہ پولستان کے باقی حصے جرمنی کو ملے۔ اس تقسیم کا اثر یورپی سیاست پر :۔ (۱) اتحادی روس کے مخالف ہوگئے (۲) جرمنی کے حصے میں پولستان کا زیادہ علاقہ آیا مگر پٹرول کے قیمتی ذخائر روس کی ملکیت میں آگئے (۳) روس کی سرحدیں ہنگری اور رومانیہ سے مل گئیں اور یہ صورت حال بلقان کے لئے بہت خطرناک تھی لیکن ترکی کے اتحادیوں کے ساتھ مل جانے کی وجہ سے بلقان میں روس کی سرگرمیاں ابھی شروع نہ ہوسکیں اور اس نے بالٹک کی مملکتوں کی طرف توجہ کی۔

بالٹک کی مملکتیں :۔ موجودہ جنگ سے روس نے بہت زیادہ فائدہ اٹھایا۔ بحر بالٹک روس کے لئے بہت اہمیت رکھتا ہے اور اسی وجہ سے روس کی نظریں بالٹک کی مملکتوں پر ایک عرصے سے لگی ہوئی تھیں۔ اب بین قومی صورت حال کی نزاکت سے روس کو اچھا موقع ہاتھ آگیا اور اس کا ارادہ یہ ہے کہ یکے بعد دیگرے بالٹک کی تمام مملکتوں کو ہضم کیا جائے۔ سب سے پہلے روس نے اسٹونیا، لٹویا اور لتھونیا کے ساتھ باہمی تعاون کے معاہدے طے کئے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ روس کو اپنی قلعہ بندیوں اور ہوائی و بحری مرکزوں کی تعمیر کے لئے ان مملکتوں میں جگہ مل گئی۔ جرمنی کی قلت کو جو لٹویا میں ...... ہ کی تعداد پر مشتمل تھی ہٹلر کے حکم کی بنا پر ۴۸ گھنٹوں کے اندر ان مملکتوں سے چلے جانا پڑا۔ ان لوگوں کو ہٹلر نے پولستان میں بسانا چاہا، اور جرمنی کی اقلیتیں جو بلقان میں آباد تھیں ان کو بھی پولستان میں آکر بس جانے کا حکم ملا۔

حالاتِ حاضرہ

ڈانزگ اور پولستان:۔

۱۹۳۹ء کا سب سے بڑا واقعہ جنگ یورپ کی ابتدا ہے۔ اب اس جنگ کو شروع ہوئے صرف چار مہینے ہوئے ہیں اور ڈانزگ کے سوال سے اس کی ابتدا ہوئی تھی۔ واقعہ یہ تھا کہ جرمنوں نے ڈانزگ میں اپنی قلعہ بندی کرنی شروع کی جو اگست کے مہینے میں مکمل ہوگئی اور ۲۳ اگست کو ڈانزگ کے نازی لیڈر ہر فورسٹر "آزاد شہر ڈانزگ" کے صدر بھی بنا دئے گئے۔ چونکہ یہ پولستان کی بندرگاہ تھی اس لئے یہ ایک دست درازی کے مترادف تھا۔ نازیوں کی اس نقل وحرکت کے صاف معنے یہ تھے کہ ہٹلر جمہوری مملکتوں کو دعوتِ مقابلہ دے رہا تھا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ پولستان، برطانیہ اور فرانس جنگ کے لئے تیار ہوگئے۔ جمہوری مملکتیں پولستان کو بچانا اس وجہ سے اپنا فرض سمجھتی تھیں کہ از روئے معاہدہ وہ اس کے ساتھ تھیں، اور پولستان کی شکست ایک طرح سے جمہوری مملکتوں کی شکست تھی۔

پہلی ستمبر کو تو ایک نیا شگوفہ کھلا۔ ہر فورسٹر نے مجلس اقوام کے عطا کردہ دستور کو منسوخ کر دیا اور اس اعلان کے بعد کہ اب ڈانزگ جرمنی سے ملحق ہو چکا ہے، ڈانزگ میں نازی دستور کا نفاذ کر دیا۔ اس کے جواب میں ہٹلر نے اس الحاق کی توثیق کر دی اور فورسٹر کو ڈانزگ کا صدر اعلیٰ بنا کر اس کے تمام نظم ونسق کا اسے ذمہ دار قرار دیا۔ ڈانزگ کے الحاق کے بعد اسی روز نازی فوجیں پولستانی "گذرگاہ" میں داخل ہوگئیں اور اس کے بعد طیاروں نے وارسا پر بم باری شروع کر دی۔ ۴۸ گھنٹوں کے اندر پولستان پر کوئی ۴۹ ہوائی حملے ہوئے اور پولستانی شہر اور دیہات پر خوب بم برسائے گئے۔ پولستانیوں کے دل ناتواں نے بھی مقابلہ کیا اور بجائے اس کے کہ ہٹلر کی شرطوں کو مان لیں اور غلامی کی زندگی اختیار کریں، بہادروں کی طرح لڑ کر مرنے کو ترجیح دی۔ مگر یہ ناتواں اور زبردست کا مقابلہ تھا انگریز اور فرانسیسی راست پولستان کی مدد نہیں کر سکے۔ چنانچہ اس دلیری کے باوجود پولستانی بہادر جرمنوں کے مقابلے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پولستان ختم ہوگیا اور جرمنی و روس نے، جو بعد میں جرمنی کے ساتھ اتحاد کر کے مشرق کی طرف سے پولستان میں گھس آیا تھا اس ملک کے حصے بخرے کر لئے۔

اتحادی:۔

پولستان پر حملہ ہوتے ہی انگریز اور فرانسیسیوں نے بھی جرمنی کے ساتھ لڑائی کے لئے کمر باندھی برلن کے

انگریز سفیر مسٹر ہنڈرسن نے ستمبر کی پہلی تاریخ سے چوتھی تک جرمنی اور برطانیہ کے مابین سمجھوتہ کرانے کی پوری کوشش کی مگر ان کی تمام کوششیں ناکام ہوئیں۔ اس بنا پر ۴ ستمبر کو دن کے سوا گیارہ بجے برطانیہ نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ان جدید حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے برطانیہ کی وزارت میں بعض ضروری تبدیلیاں بھی ہوئیں اور ایک جدید کابینہ کی تشکیل عمل میں آئی جس کے حسب ذیل عہدہ دار مقرر ہوئے :-

مسٹر چیمبرلین، صدر اعظم۔ سر جان سائمن، چانسلر آف دی اکس چیکر، وزیر مالیات۔ لارڈ ہیلی فاکس، وزیر خارجہ۔ لارڈ چیٹ فیلڈ، وزیر مدافعت۔ مسٹر چرچل، امیر البحر۔ مسٹر ہور بلیشا، وزیر جنگ۔ سر جانس کنگس لی وڈ، وزیر ہوائیہ۔ سر سیمول ہور، لارڈ پریوی سیل۔ سر جان اینڈرسن، نائب لارڈ پریوی سیل۔

ان کے علاوہ مسٹر ایڈن وزیر مقبوضات بنائے گئے جن کو کابینہ میں بیٹھنے کا خاص دیا گیا، اور لارڈ ہینکی وزیر بلا قلمدان مقرر ہوئے۔

برطانیہ کے ساتھ فرانس نے بھی ۴ ستمبر کو اعلان جنگ کر دیا اور جرمنی کے خلاف بحری، بری اور ہوائی جنگ کا آغاز ہو گیا۔ فرانسیسی فوجیں زیگفریڈ لائن کی طرف پیش قدمی کرنے لگیں اور آہستہ آہستہ آگے قدم بڑھانے لگیں۔ عربی علاقے جو فرانس کے زیر انتداب تھے، ہٹلر کی مخالفت پر آمادہ ہو گئے اور جمہوری مملکتوں کے ساتھ اپنی ہمدردی ظاہر کر دی۔ جو عربی ملک برطانیہ کے زیر اقتدار تھے انھوں نے بھی اتحادیوں کا ساتھ دینے پر رضامندی ظاہر کی چنانچہ شام، ٹیونس، ماورائے زوردان، عراق، مصر اور فلسطین سب اتحادیوں کے ساتھ ہو گئے۔ سلطنت برطانیہ کے قلمروؤں نے بھی اس اڑے وقت میں ساتھ دیا۔ چنانچہ آسٹریلیا، کناڈا اور نیوزی لینڈ نے سب سے پہلے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ جنوبی افریقہ میں جنرل ہرٹزاگ کو جو اس لڑائی میں غیر جانبدار رہنا چاہتے تھے ناکامیابی ہوئی چنانچہ اس قلمرو نے بھی جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا، اور برطانوی ہند کی طرف سے وائسرائے بہادر نے بھی اس بات کا اظہار کیا کہ ہندوستان برطانیہ کی تائید کے لئے تیار ہے۔ چند دنوں بعد ترک بھی انگریزوں سے متحد ہو گئے۔ لیکن ان کے علاوہ بعض مملکتیں غیر جانبدار بھی ہیں اور وہ یہ ہیں :-

سیام، جاپان، اطالیہ، اسپین، ممالک متحدہ امریکہ، مکسیکو، آئرستان اور بلقان، اسکان ڈی نیویا اور بالٹک کی مملکتیں۔

جرمنی کی آب دوزیں :-

جنگ کے پہلے دو ہفتوں میں جرمنی کی آب دوز کشتیاں بہت سرگرم عمل تھیں۔ چنانچہ ۴ ستمبر کو برطانیہ کا بڑا جہاز "اتھی نیا" ڈبو یا گیا۔ جہاز کے (۱۴۰۰) آدمیوں میں نصف سے زائد ڈوب گئے اور باقی لوگوں کی جان

بہ مشکل بچائی گئی۔ ایک اور جہاز جس کا نام "کرے جیس" ہے دو آب دوزوں کے حملے کا شکار ہوا۔ مسٹر چرچل کے بیان کے مطابق یہ بہت بڑا نقصان تھا۔ مگر انگریزوں نے جن کو اپنی بحری قوت پر پورا بھروسہ ہے، ایک طویل جنگ کے لئے تیاری کرلی اور جرمنی کے مقابلے میں ڈٹ گئے۔ مسٹر چمبرلین نے اعلان کیا کہ ہم کو کم از کم تین سال کی جنگ کے لئے تیار ہونا چاہیے۔ دوسری طرف سے ہٹلر نے جواب دیا کہ جرمنی آٹھ سال کے بعد بھی شکست نہیں کھا سکتا اور "جرمن قوم پھر کبھی ایسے معاہدہ کے لئے تیار نہیں ہوگی جیسے پچھلی جنگ کے بعد معاہدۂ ورسائے ہوا تھا"

جرمنی :-

جرمنی کی کابینۂ جنگ جس کی تشکیل ۳۱ر اگست کو ہوئی حسب ذیل افراد پر مشتمل تھی :-

فیلڈ مارشل گوئرنگ، صدر۔ ہرہس، ہٹلر کے نائب۔ ہر فرک، مختار کل (نازی نظم ونسق کے)
ڈاکٹر فنک، مختار امور معاشی۔ ڈاکٹر لیامنس، وزیر مملکت اور صدر رائش چانسلری جنرل کیٹال، سپہ سالار

جرمنی میں گرفتاریاں :-

۸ر نومبر کی رات میں جب ہٹلر میونچ کے ہال سے جرمنوں کے ایک بڑے مجمع کو مخاطب کر کے واپس ہوا تو اس کے ۔امنٹ بعد ایک بم کا حادثہ ہوا جس میں ہٹلر تو بچ گیا لیکن چھ آدمی مرے اور ۶۰ کے قریب زخمی ہوئے۔ ہٹلر نے خود تحقیقات کی اور بہت سے آدمی گرفتار ہوئے۔ جرمنی میں بہت سے آدمیوں نے جنگ کے خلاف پروپگنڈا کرنا شروع کیا تھا اس لئے ہٹلر اس قسم کا پروپگنڈا کرنے والوں کو گرفتار کرنے لگا چنانچہ تقریباً (۱۸۰۰) آدمی قید کر لئے گئے۔ سابق قیصر جرمنی کے چوتھے لڑکے شہزادہ اگسٹ ولہلم کو بھی شبہہ کی بنا پر گرفتار کیا گیا۔ جرمنی کے سابق سپہ سالار فیلڈ مارشل فان بلومبرگ اور دوسرے پرانے فوجی عہدہ دار بھی گرفتار ہوئے بلکہ ایک غیر مصدقہ خبر کی رو سے بلومبرگ کو گولی سے مار دیا گیا اور اس کی وجہ اب تک معلوم نہیں ہو سکی۔

پراگ کے ہنگامے :-

پراگ بھی سیاسی آشوب سے خالی نہیں ہے چنانچہ یہاں سیاسی شورش کی بنا پر چند طالب علم گرفتار ہوئے تھے جب اس کے خلاف دوسرے طلبا نے احتجاج کیا تو تقریباً ۱۲۰۰ طالب علم گرفتار کر لئے گئے اور فوجی قانون نافذ کر دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ پراگ میں ایک دن کے اندر ۱۲۴ چک قید کئے گئے۔ ۸۰۰۰ طلبا کو گرفتار کیا گیا اور ۲۰۰۰۰ مسلح آدمی زیر حراست ہیں۔

اطالوی کابینہ :-

اطالوی کابینہ میں بھی بعض اہم تبدیلیاں عمل میں آئی ہیں، کیونکہ معلوم ہوتا ہے کہ کابینہ کے وزیروں نے استعفےٰ دے دیا۔ سینیر اسٹیریس جو فاشسٹی جماعت کے معتمد ہیں مستعفی ہو گئے اور ان کو فاشسٹی فوج کا چیف آف دی اسٹاف

بنا دیا گیا ہے۔ مارشل گریزیانی چیف آف دی آرمی اسٹاف، سینیر الفیری سفیر، جنرل ٹرونزی وزیر اطالوی افریقہ مقرر ہوئے اور سینیر اریس سانڈرو، پا پولر کلچر کے وزیر بنائے گئے۔

روس کا مسلک:۔

جس وقت ڈانزگ کا سوال پیدا ہوا تھا اور جرمنوں نے ڈانزگ کو بغیر لڑائی کے ہضم کرنا چاہا تو برطانیہ اور فرانس کو روس کے آئندہ مسلک کے متعلق تشویش ہوگئی۔ انھوں نے روس کو اپنی "امن پسند برادری" میں شامل کرنا چاہا تھا اور اس سلسلے میں ان جمہوری مملکتوں کے نمائندے ایک عرصے سے روس کے ساتھ گفت و شنید میں مصروف تھے لیکن بدقسمتی سے حالات نے ایک نازک صورت اختیار کر لی اور اتحادیوں کی کوششیں بے کار ثابت ہوئیں، کیونکہ اچانک یہ معلوم ہوا کہ روس نے جرمنی کے ساتھ ایک معاہدہ عدم اقدام پر دستخط کر دئے ہیں اور برطانیہ، فرانس کو جرمنی سے لڑنے کے لئے تنہا چھوڑ دیا۔ اگرچہ جمہوری مملکتوں نے اس عدم اتحاد کی ذمہ داری روس پر عائد کی مگر روسی وزیر خارجہ مولوٹوف نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ برطانیہ اور فرانس اس ناکامی کے ذمہ دار ہیں کیونکہ انھوں نے بات چیت میں بہت سا وقت لے لیا۔ روس اس شرط پر جرمنی کے خلاف معاہدہ میں شریک ہونا چاہتا تھا کہ اس میں بالٹک کی مملکتیں یعنے لیتھونیا، لٹویا، اسٹونیا اور فن لینڈ بھی شریک ہوں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ان مملکتوں کو حفاظت کی ضمانت دی جائے مگر چونکہ وہ آزاد مملکتیں تھیں اس لئے وہ اس قسم کی ضمانت کے لئے راضی نہ ہوئیں اور اتحادیوں کی بات چیت کے ناکام رہنے کا سبب بن گئیں۔ روس نے اتحادیوں کے سامنے جو دوسری شرط پیش کی وہ یہ تھی کہ روسی فوجوں کو ڈانزگ تک جانے کے لئے پولستان میں سے حق راہ دیا جائے تاکہ روس جرمنی کے خلاف عملی طور پر پولستان کی مدد کر سکے، مگر پولستان اس شرط پر تیار نہیں ہوا اور اسی بنا پر روس نے پولستان کی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نازک صورت حال سے ہٹلر نے فائدہ اٹھایا اور روس سے معاہدۂ عدم اقدام پر دستخط کرا لئے۔

روس اور جرمنی کا معاہدۂ عدم اقدام:۔

روس اور جرمنی کے معاہدۂ عدم اقدام سے پہلے برلن میں ان دونوں مملکتوں کے درمیان ایک تجارتی معاہدہ بھی طے پایا تھا جس پر ۲۰ر اگست کو دستخط ہوگئے۔ اس معاہدے کی رو سے جرمنی نے سات سال کے لئے روس کو بیس کروڑ مارک پانچ فی صد شرح سود سے قرض دے دئے تاکہ روس دو سال کے اندر جرمنی سے سامان خریدے۔ اس کے علاوہ یہ بھی طے پایا کہ جرمنی دو سال کے اندر روس سے اٹھارہ کروڑ مارک کی پیداوار خام خریدے، اور معاہدۂ عدم اقدام ماسکو میں ۲۳ر اگست کو طے پایا جس پر مولوٹوف اور فان ربن ٹراپ نے اسٹالن اور جرمن سفیر فان شولن برگ کے سامنے دستخط کئے۔ یہ معاہدہ سات دفعات پر

مشتمل ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:۔ اس مدعا کے لئے کہ جرمنی اور روس کے درمیان امن قائم رہے اور اس قدیم رشتے کی بنا پر جو اپریل ۱۹۲۶ء کے معاہدۂ غیر جانبداری کے وقت قائم ہوا تھا، جرمنی اور روس کی حکومتوں کے مابین ذیل کا معاہدہ طے پایا:۔(۱) فریقین معاہدہ ایک دوسرے پر کسی قسم کا دباؤ ڈالیں گے اور نہ ایک دوسرے پر یا کسی ملحقہ یا حلیف ملک پر حملہ کرسکیں گے۔(۲) اگر فریقین معاہدہ میں سے کوئی فریق کسی تیسری طاقت کے ساتھ حالت جنگ میں ہو تو دوسرا فریق اس تیسری طاقت کی کسی طرح مدد نہیں کرے گا۔ (۳) فریقین کی حکومتیں آئندہ ایک دوسرے سے مشورہ کرتی رہیں گی تاکہ جن معاملات میں دونوں کا مفاد وابستہ ہے ان سے پوری واقفیت رہے۔(۴) فریقین میں سے کوئی فریق دوسری طاقتوں کے کسی ایسے متحدہ گروہ سے نہیں مل سکے گا جو بالواسطہ یا بلا واسطہ کسی ایک فریق کا مخالف ہو۔(۵) اگر دونوں کے درمیان کسی قسم کا اختلاف یا کوئی نزاعی مسئلہ پیدا ہو تو دونوں مل کر ان جھگڑوں کو دوستانہ طریق پر طے کریں گے اور اگر ضرورت ہو تو ایک کمیشن کے ذریعہ ان مسائل کو حل کیا جاسکے گا۔(۶) اس معاہدے کی مدت دس سال ہوگی، اگر اختتام مدت سے ایک سال پہلے کوئی فریق اس معاہدہ کو ختم کرنا چاہے تو وہ دوسرے فریق کو اس کی اطلاع دے۔ ورنہ مدت معاہدہ میں خود بخود پانچ سال کی توسیع ہو جائے گی۔(۷) اس معاہدے کی برلن میں بہت جلد توثیق کی جائے گی اور توثیق سے متعلق دستاویزات کا تبادلہ بھی وہیں ہوگا۔

اس معاہدے کے اثرات:۔ روس اور جرمنی کے اس معاہدے کا سب سے بڑا اثر یہ ہوا کہ یورپی طاقتوں کا توازن بگڑ گیا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ترازو کا پلڑا کچھ جرمنی کی طرف جھک گیا۔ فاشسٹی حلقوں میں بھی اس معاہدے کا اثر محسوس ہوتا ہے۔ چنانچہ اس معاہدے کی بنا پر اطالیہ اور جرمنی کی دوستی تقریباً ختم ہوگئی اور جاپان، جرمنی سے برہم ہوگیا۔ ادھر اسپین سے جنرل فرانکو نے اس معاہدے سے ناراضگی ظاہر کی اور ہٹلر کی دوستی چھوڑ دی۔ روس کو یورپی سیاست میں عمل دخل کا اچھا موقعہ مل گیا۔ روس کو دوست بنانے کی وجہ سے جرمنی کو پولستان کے حملے میں بڑی مدد ملی۔

پولستان کی تقسیم:۔ جب پولستان جرمنی کے مقابلے میں برسرپیکار تھا تو مشرق سے سرخ فوجیں پولستان میں داخل ہوگئیں۔ روس کے پولستان میں گھس آنے کی وجہ یہ بتائی گئی کہ اس کو یوکرین وغیرہ کی قلتوں کی حفاظت کرنی ضروری تھی۔ جب روسی پولستان میں داخل ہوئے تو ان کی کسی نے مزاحمت نہیں کی چنانچہ ان لوگوں نے پولستان کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کرلیا۔ سرمایہ دار اور زمیں دار گرفتار کرلئے گئے اور پولستانی عہدہ داروں کو گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ جرمنی اور روس دونوں حکومتوں نے مل کر پولستان کو آپس میں بانٹ لیا۔ (بقیہ مضمون صفحہ الہ پر)

عہد آفریں مشین پریس میں چھپ کر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا۔ اڈیٹر عبدالحفیظ صدیقی بی ایس سی (عثمانیہ)

مولوی محمد عزیز مرزا مرحوم

مستقبل

چلا آ رہا ہے   چلا آ رہا ہے
چلا آ رہا ہے   چلا آ رہا ہے

دھڑکتے دلوں کی صدا آ رہی ہے
اندھیرے میں آوازِ پا آ رہی ہے
بلاتا ہے کوئی ندا آ رہی ہے

چلا آ رہا ہے   چلا آ رہا ہے
چلا آ رہا ہے   چلا آ رہا ہے

نہ سلطانئ تیرگی ہے نہ زاری
نہ تختِ سلیماں نہ سرمایہ داری
غریبوں کی چیخیں نہ شاہی سواری

چلا آ رہا ہے   چلا آ رہا ہے
چلا آ رہا ہے   چلا آ رہا ہے

اڑاتا ہوا پرچمِ زندگانی
سناتا ہوا عہدِ نو کی کہانی
جلو میں ظفرمندیاں شادمانی

چلا آ رہا ہے   چلا آ رہا ہے
چلا آ رہا ہے   چلا آ رہا ہے

سفینہ مساوات کا کھے رہا ہے
جوانوں سے قربانیاں لے رہا ہے
غلاموں کو آزادیاں دے رہا ہے

چلا آ رہا ہے   چلا آ رہا ہے

مخدوم محی الدین

نیا سال مبارک!!

سب بچوں کا اردو نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ہم نے بڑی محنت سے اسے شائع کیا ہے اس میں زیادہ تر مضامین اردو ہی سے متعلق ہیں تاکہ آپ انہیں پڑھیں اور اپنی زبان کی ترقی کے لیے کوشش کریں۔ اردو دنیا کی جدید زبانوں میں سے ہے اس نے بہت کم مدت میں کافی ترقی کی ہے۔ اس میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ایک مشترکہ زبان ہے جسے ہر شخص بول سکتا اور سمجھ سکتا ہے اردو سے متعلق تفصیلی حالات آپ کو سب کے پڑھنے سے معلوم ہوں گے اردو میں ایسی خوبیاں موجود ہیں جو کسی اور زبان میں نہیں پائی جاتیں ہم کو کوشش کرنی چاہیے کہ اسے ترقی دیں اسی مقصد کے لیے ۲۵ ڈسمبر ۱۹۳۹ء شام میں ۵ بجے ادارہ کے ایک نئے شعبہ کا قیام عمل میں آیا جس میں طبقۂ فوقانیہ تک کے طلبہ شریک تھے۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور معتمد ادارہ نے اس جلسہ کی صدارت فرمائی ایک ننھے طالب علم نے "بچے کی دعا" سے جلسہ کا آغاز کیا پھر صدر نشین نے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی اس کے بعد انتخابات عمل میں آئے۔ رحیم الدین صاحب ظہیرآبادی نائب صدر، معین الدین احمد انصاری معتمد، مجید احمد صاحب فاروقی نائب معتمد، اراکین کابینہ، شعیب اللہ خاں صاحب، حبیب احمد صاحب، محمد علی صاحب عادل۔ خدا بخش صاحب سلیم، عارف علی صاحب انصاری، عبدالرزاق صاحب۔ محی الدین علی صاحب معتمد کے شکریہ کے بعد جلسہ برخاست ہوا اور اس کے بعد مجلس انتظامی کا اجلاس منعقد ہوا جس میں آئندہ تقریر کے لیے یہ عنوان مقرر کیا گیا "ہندوستانی طلبہ کو فوجی تعلیم لازمی ہے"۔ جلسہ ۱۶ اسفندار ۱۳۴۹ف م ۱۹ جنوری ۱۹۴۰ء بوقت ۴ ساعت شام منعقد ہوگا۔ فوقانی جماعتوں تک کے طلبہ اس جلسے میں شریک ہو سکتے ہیں۔

نومبر کے پرچے میں جو معمہ دیا گیا تھا اس کے حل بہت سے وصول ہوئے۔ مگر ایک بھی صحیح نہ تھا اسی وجہ سے انعام کسی کو نہیں دیا گیا۔

معمہ کا صحیح حل

اردو نمبر کو آپ نے کیسے پایا ہمیں معلوم کیجیے

نوٹ: جن خریدار اصحاب کے چندے ختم ہو گئے ہیں۔ براہ کرم وہ جلد از جلد نئے سال کا چندہ روانہ کردیں۔ معین الدین احمد انصاری

پیدائش ۱۸۶۸ء مصورِ غم علامہ راشد الخیری وفات ۱۹۳۶ء

اردو کے بڑے نثر نگار تھے طرزِ تحریر درد انگیز اور تاثیر سے بھرا ہوا ہے عورتوں کی اصلاح اور ترقی ان کے پیش نظر تھی۔

پیدائش ۱۸۴۶ء لسان العصر سید اکبر حسین اکبر آبادی وفات ۱۹۲۱ء

ان کا کلام طنزیہ ہوتا ہے جس کی کامیاب ابتدا اردو میں انھیں کے ہاتھوں ہوئی۔ سماج کو انھوں نے اس طرح ہنسایا کہ دل رونے لگا۔

پیدائش ۱۸۳۷ء شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی وفات ۱۹۱۴ء

سرسید کے گہرے دوست تھے اور انہیں کے کہنے پر مسدس لکھا جس نے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے چونکایا۔ جدید اردو شاعری کی بنیاد ڈالی۔

پیدائش ۱۸۱۷ء محسنِ قوم سرسید احمد خاں وفات ۱۸۹۸ء

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی بنیاد ڈالی ان کی زندگی قومی کاموں کے لئے وقف تھی قوم کو غدر کے سیلاب میں بہہ جانے سے بچایا۔

پیدائش ۱۸۷۳ء۔ وفات ۱۹۳۸ء

سر شیخ محمد اقبال

ہندوستان کے بہت بڑے شاعر تھے۔ قومی اصلاح سے شاعری شروع کی جو آگے چل کر انسانیت کی اصلاح کے لئے مستقل پیام بنی۔ زمانہ صدیوں بعد ہی ایسا شاعر پیدا کر سکے گا۔

پیدائش ۱۸۳۶ء وفات ۱۹۱۲ء

شمس العلماء حافظ نذیر احمد

اردو ناول نگاری میں زندگی کو جھنا جاگتا پیش کیا۔ قرآن شریف اور کئی انگریزی کتابوں کا اردو میں بامحاورہ ترجمہ کیا اچھے ادیب۔ اچھے مقرر تھے۔

پیدائش ۱۸۴۴ء مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی وفات ۱۹۱۷ء

بچوں کے شاعر تھے۔ ان کی نظمیں اردو ادب میں ایک غیر فانی اضافہ ہے مناظر فطرت اور قدرت کی کاریگریوں کو اردو ادب میں سب سے پہلے پیش کیا۔

اُردو

کچھ تمہیں سناؤں اُردو کی میں کہانی — دلچسپ داستاں ہے سن لو مری زبانی
کہتے تھے اس کو لشکر، پھر یہ زباں ہوئی ہے — یہ مادری زبانِ ہندوستاں ہوئی ہے
ہندوستاں نے اس کو اپنی زباں بنایا — شاہوں نے اس کا رتبہ دنیا میں ہے بڑھایا
آغوشِ مغلیہ میں برسوں پلی ہے اردو — شمشیر بن کے ان کے منہ سے چلی ہے اردو
شاہانِ ہند نے بھی جینے کا گُر سکھایا — پستی میں یہ پڑی تھی بامِ فلک پہ لایا
"جنت نشانیوں کی" ہے مادری زباں یہ — مشرق کے کارواں کی واحد ہے ساربان یہ
غالب نے اس کی عظمت غالب جہاں پہ کر دی — شعر و ادب میں جس نے اک روحِ تازہ بھر دی
مومن، انیس، سودا اردو کے پاسباں تھے — یہ ان کی ہم زباں تھی وہ اس کے ہم زباں تھے
شبلی[1]، نذیر[2]، سید[3]، آزاد[4]، میر، حالی — اردو کے گلستاں میں ان سب نے جان ڈالی
انشا، تراب، آتش، ناسخ، ظفر سبھوں نے — امکان کے موافق خدمات کیں زباں کی
اقبال نے بھی اپنا خونِ جگر دیا تھا — اردو کا جس نے گلشن سرسبز کر دیا تھا
ندوی[5]، نیاز[6] و حق[7] سے پھولی بہارِ اردو — اور "شیخ چاند"[8] بھی تھے خدمت گزارِ اردو
احسان[9]، جوش[10]، اختر[11]، مرزا ادیب، شبلی[12] — کرتے ہیں نگہبانی اردو کی سرزمیں کی
ماہر[13] و ساز، امجد[14] ماہر ہیں اپنے فن کے — سرسبز کرنے والے اردو ترے چمن کے
مخدوم، وجد، بیکس اردو کے نغمہ خواں ہیں — زور[15] اور سروری[16] اس گلشن کے باغباں ہیں
ڈر ہے کہ ہوں نہ عریاں تیرے زبان گیسو — ہندی[17] سے ہو رہی ہے مٹ بھیڑ تیری اردو

پر ہے یقین زاہد عالم میں یہ رہے گی
بن کر زبانِ عالم پھولے گی اور پھلے گی

باقر علی زاہد

---

[1] شبلی نعمانی، [2] نذیر احمد، [3] سرسید، [4] ابوالکلام آزاد، [5] سلیمان ندوی، [6] نیاز فتحپوری، [7] عبدالحق، [8] شیخ چاند، [9] احسان دانش، [10] جوش، [11] اختر شیرانی، [12] شبلی (بی کام)، [13] ماہر، [14] امجد، [15] ڈاکٹر زور، [16] عبدالقادر سروری، [17] موجودہ ہندی اردو نزع کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

ہمیں اردو سے کیوں محبت ہونی چاہیئے؟

پیارے بچو! تمھیں اپنے اماں باپ سے اپنے بھائی بہن سے اپنے دوستوں سے محبت ہے تم ان سے بات چیت کر کے ہنس بول کے خوش ہوتے ہو۔ یہی بات چیت تمھاری ان کی محبت کو بڑھاتی ہے۔ جو تمھارے دل میں ہوتا ہے تم ان سے کہتے ہو اور وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں، تم سے کہہ کر خوش ہوتے ہیں۔ ذرا سی دیر کے لیئے سوچو کہ تمھارے ماں باپ، تمھارے بہن بھائی، تمھارے دوست تم سے بولنا چھوڑ دیں تو تمھیں کتنی تکلیف ہو؟ زندگی کا لطف آدھا رہ جائے۔ تم یہ محسوس کرو گے کہ تمھاری کوئی بہت قیمتی چیز کھو گئی ہے۔ تمھاری محبت اور دوستی کا رشتہ تمھاری بات چیت ہے۔ جب سے تم نے ہوش سنبھالا بلکہ اس سے بھی بہت پہلے سے جب تم بالکل بچے تھے تم نے اپنی پیاری اماں سے اپنے پیارے ابا سے اپنے چھوٹے بڑے بہن بھائیوں سے اردو میں بات چیت کی۔ پھر تم ہی بتاؤ کہ اردو سے تمھیں محبت کرنی چاہیے یا نہیں؟ اگر تم اردو نہ جانتے ہوتے تو محبت کے جتنے رشتے اب تک تم نے ایک دوسرے سے باندھے ہیں، ان میں سے ایک بھی نہ ہوتا۔

اب ذرا ایک بات اور سوچو تم اپنی اماں سے کھانے پینے کی چیزیں مانگتے ہو اپنے ابا سے بازار سے اچھے اچھے کھلونے اور کپڑے منگاتے ہو۔ بازار جا کر طرح طرح کی چیزیں خریدتے ہو۔ اپنے دوستوں کے ساتھ مل جل کر بیٹھتے ہو۔ ان کی باتیں سمجھتے ہو اور انھیں اپنی باتیں سمجھاتے ہو۔ تمھاری زندگی کی ساری ضرورتیں ایک دوسرے سے بول کر ہی پوری ہوتی ہیں۔ اگر تم بول نہ سکتے تو تمھیں کتنی دقت ہوتی تمھیں کھانے پینے کی چیزیں، پہننے کے کپڑے کھیلنے کے کھلونے اور اسی طرح کی اچھی اچھی چیزیں ملنے میں کتنی دقت ہوتی۔ تم گونگوں کی طرح اشارے کرتے۔ کبھی کوئی تمھارے اشارے سمجھتا اور کبھی نہ سمجھتا۔ تمھیں الجھن اور تکلیف ہوتی کہ جو کہہ رہے ہو اسے دوسرا سمجھ نہیں سکتا یا جو کچھ تم سے کہا جا رہا ہے وہ تمھاری سمجھ میں نہیں آتا۔ محبت اور ضرورت کے یہ سارے رشتے اس زبان کی وجہ سے قایم ہیں جو تم دن رات ایک دوسرے سے بولتے ہو، جسے تم پیدا ہونے کے بعد سے اب تک اپنی ماں کی گود میں اپنے باپ کے پاس بیٹھ کر اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ کھیل کر سیکھا۔ اس لئے تمھیں چاہیے کہ اس زبان سے محبت کریں۔ اردو ہی کی بدولت تمھیں زندگی کی یہ ساری خوشیاں اور نعمتیں ملی ہیں۔ اس لیے تمھیں چاہیے کہ تم اس کو دل وجان سے زیادہ پیاری سمجھو۔

تم میں سے ہر ایک نے مدرسے میں پڑھا ہے۔ کورس کی کتابیں مثلاً تاریخ جغرافیہ اور حساب کے علاوہ تم نے طرح طرح کی کام کی باتیں پڑھی ہیں۔ اور روز بروز نئی باتیں سیکھیں۔ بتاؤ اگر تم اردو نہ جانتے ہوتے تو تمھیں یہ پیاری پیاری باتیں کیسے معلوم ہوتیں۔ تم "بچوں کی دنیا" اور "سب رس" پڑھتے ہو۔ اچھی اچھی نظمیں اچھے اچھے قصے۔ اچھے اچھے لوگوں کے حالات دنیا کی نئی نئی باتیں تمھیں معلوم ہوتی ہیں اور تمھارا وقت کتنی دلچسپی سے کٹتا ہے۔ تم واقعی کتنے خوش قسمت ہو۔

ذرا سوچو کہ وہ بچے جو اردو سبق نہیں پڑھ سکتے۔ کتنے بدنصیب ہیں کہ انھیں یہ اچھی اچھی باتیں نہیں معلوم ہوتیں۔ انھیں نصیحت کی باتیں نہیں معلوم ہوتیں وہ اچھی باتیں سوچنے اور اچھی باتیں کرنے کے فائدے نہیں جان سکتے۔ اور اس لیے ان کی زندگی بُری کٹتی ہے۔ لوگ ان سے نفرت کرتے ہیں۔ انھیں اچھا نہیں سمجھتے۔ تمھیں سب پیار کرتے ہیں۔ تم سے سب محبت کرتے ہیں۔ تمھیں اچھا سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ تم اردو جانتے ہو۔ اور اردو کی کتابیں پڑھ کر تم نے اچھی اچھی باتیں سیکھی ہیں۔ اب بتاؤ تمھیں اردو سے محبت کرنی چاہیے یا نہیں؟

اردو میں ہزاروں کتابیں ہیں۔ کچھ آج کل کی لکھی ہوئی ہیں اور کچھ اب سے چند سال پہلے لکھی گئی تھیں اور کچھ اب سے سیکڑوں برس پہلے ہر زمانہ میں اچھے اچھے لکھنے والے پیدا ہوئے انھوں نے اردو میں ایک سے زیادہ عمدہ کتابیں لکھیں۔ یہ سب لکھنے والے اب مر گئے مگر انھوں نے جو اچھی باتیں کہی تھیں وہ ان کتابوں کے ذریعہ سے اب تک تمھارے پاس موجود ہیں۔ تمھارے ان بزرگوں نے پرانے زمانہ میں تمھارے ملک میں کیا کیا ترقیاں کیں۔ اسے کس کس طرح اچھا بنایا۔ انھوں نے کیا کیا کہ دنیا آج تک ان کا نام عزت سے لیتی ہے۔ یہ سب باتیں تمھیں ان پُرانی کتابوں میں لکھی ہوئی ملتی ہیں۔ تم اگر انھیں پڑھوگے تو تمھیں اپنے پیارے ملک کی ترقی کا حال معلوم ہوگا تم ان باتوں کو پڑھ کر اپنے ملک پر فخر کروگے۔ تمھیں خوشی ہوگی تم دوسرے لوگوں کے آگے عزت اور فخر کے ساتھ سر اٹھا کر کہہ سکوگے۔ تمھارے دل میں اپنے ملک کی سچی محبت پیدا ہوگی۔ بتاؤ کہ جو کتابیں پڑھ کر تمھارے دل میں اتنی اچھی اچھی باتیں پیدا ہوں ان سے تمھیں محبت ہونی چاہیے یا نہیں؟ تم کہوگے کہ ہاں ضرور ہونی چاہیے۔ اگر تمھارے دل میں یہ خیال اچھی طرح جم جائے گا تو تم خود اردو سے محبت کرنے لگوگے۔

پیارے بچو! اردو سے محبت کئے بغیر نہ تمھاری زندگی اچھی بن سکتی ہے نہ تم ملک کی سچی خدمت کے قابل بن سکتے ہو۔ اس لئے اگر تم چاہتے ہو کہ دنیا کے لوگ اقبال، اکبر، مہاتما گاندھی، جواہر لال اور ابوالکلام آزاد کی طرح تمھارے نام پر فخر کریں تو تم پہلے اپنی پیاری اردو سے محبت کرو کہ اس کی مدد سے دنیا کے بہت بڑے آدمی بن جاؤ۔

ماخوذ از "بچوں کی دنیا"

زبان اردو کی ترقی

رمن راج سکسینہ
(سٹی کالج)

اردو زبان میں علوم و فنون کی کمی ہے لیکن پھر بھی دوسری زبانوں کے خیالات سے اردو کے دامن کو لبریز کرنا چاہیے۔ اگر ہم وطن کی محبت اپنے دلوں میں رکھتے ہیں اور اس کی ترقی اور بہبودی کے خواہاں ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ اُس کی زبان سے بھی محبت کریں اور ہر ممکن طریقے سے اسے ترقی دینے کی کوشش کریں۔ اردو زبان میں ادب کے بیش بہا ذخیرے ملیں گے۔ اور اس دریا میں بھی بہت سے موتی دستیاب ہوں گے۔ اگر ہماری زبان میں کسی چیز کی کمی ہے تو اس کو پورا کرنا چاہیے اور اسے دوسری زبانوں کی طرح ترقی یافتہ بنانا چاہیے۔ اردو زبان کو اگر ہم ترقی دینا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ خیالی مضامین سے پرہیز کریں اور اس کے دامن کو اپنی تیزیٔ طبع سے رنگ برنگ کے پھولوں سے بھر دیں۔ جن کی خوشبوؤں سے لوگوں کے

دماغ معطر ہو جائیں۔ ہمیں ان کا شکریہ ادا کرنا چاہیے جو انگریزی علوم فنون کے خزانوں سے مالا مال ہیں۔ اور ہماری زبان کو اس سے معمور کر رہے ہیں دراصل ہماری زبان کی ترقی ایسے ہی لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ جو دونوں خزانوں پر قابض ہیں۔ ایسے لوگوں سے ہماری التجا ہے کہ وہ اس طرف توجہ کریں اور اپنی زبان کو ترقی دینے کی کوشش کریں۔ اس پر عمل کرنے سے امید ہے کہ اس میں علوم فنون کے دریا ابل پڑیں گے۔

محمد عین الدین جنیدی
(گلبرگہ)

لکھیں تو کیسے لکھیں

خیال تو ہوتا ہے کہ مضمون لکھیں مگر لکھیں تو کیسے لکھیں۔ پہلے تو عنوان کا سوچنا ہی مشکل ہے۔ اور جب عنوان مل گیا تو اب یہ فکر دامنگیر ہے کہ آغاز کیسے ہو۔ خیر جوں توں کر کے جب مضمون شروع کیا مشکل سے چند سطریں ہی لکھی گئی تھیں کہ اندر سے آواز آئی جمیل میاں، خالہ جان آئی ہیں۔ پردے لیجاؤ۔ خالہ جان کو آتار نے کے بعد جب میں اپنے کمرے میں آیا۔ دیکھا کہ قلم کی پتی ٹوٹی ہوئی ہے۔ معلوم ہوا کہ میرا چھوٹا بھائی خلیل کمرہ میں آیا تھا۔ میں نے تاڑ لیا کہ یہ ان ہی کی کارگزاری ہوگی۔ میں امی کے پاس گیا اور کہا کہ خلیل نے میرے قلم کی پتی توڑ دی ہے۔ مجھے دوسری پتی منگا دیجئے۔ امی کہنے لگیں۔ پرسوں ہی تو پیسے دیے تھے۔ تجھے کسی چیز کے رکھنے کا سلیقہ کہاں نہیں۔ ہمیشہ یہی رونا ہے آج پتی غائب — کل قلم غائب اور پرسوں کاپی غائب ادہر سے آتے ہو پیسے دیجیے' ادہر سے آتے ہو پیسے دیجیے پڑوسن کے لڑکے سردار میاں کو دیکھو کتنا اچھا لڑکا ہے ہمیشہ اپنی ہر چیز سلیقے سے رکھتا ہے۔ اور ایک تم ہو کہ ہمیشہ یہ غائب وہ غائب۔ اتنے میں خالہ جان بھی آگئیں اور کہنے لگیں۔ جمیل تو بہت اچھا لڑکا ہے ہمارے ہاں کا شیطان نعیم تو ان سے بدتر ہے۔ کل ہی کا ذکر ہے کہ وہ دفتر جانیکی تیاری میں تھے اور آپ سیکل لے کر اسکول چل دیے۔ آخر ان کو پیدل ہی جانا پڑا۔ بڑی دیر بعد چپ آگئی میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ خدا جانے امی اور خالہ جان میں کیا کیا باتیں ہوتی رہیں: امی میری شکایتیں کرتیں اور خالہ جان اپنے لڑکے نعیم کی۔

میں اپنے کمرے میں بیٹھا سوچ رہا تھا۔ تمام خیالات منتشر ہو چکے تھے آخر بڑی مشکل سے آدھا صفحہ بھی نہ ہوا تھا کہ خالہ جان آئیں اور کہنے لگیں۔ کونسے اسکول میں پڑھتے ہو بیٹا' اور کس کلاس میں' اتنے میں امی بھی آگئیں اور کہنے لگیں کہ چار بج چکے ہیں اب تک رامو کا پتہ نہیں۔ ابا کی سیکل ہے دوڑ کر سودا تو لا دو۔ سچ کہتا ہوں۔ سودے کا نام سنتے ہی میرا جسم سرد پڑ گیا مجبور تھا سیکل لے کر (معظم جاہی) مارکٹ پہنچا۔ سودا لے کر واپس ہو رہا تھا مگر تمام خیالات مکان میں تھے کہ اب کہ مضمون لکھنے کا موقع ملتا ہے کہ نہیں۔

یکایک مجھے ایک جھٹکا سا محسوس ہوا۔ اب جو آنکھ کھولتا ہوں تو معلوم ہوا کہ دواخانہ میں ہوں۔ اور ہاتھ ٹوٹ گیا ہے۔ شاید موٹر سے ٹکر ہو گئی ہوگی — جو مضمون لکھنے کا نتیجہ ہے۔ اب آپ ہی کہیے کہ مضمون لکھیں تو کیسے لکھیں۔

سید سجاد محسن (دارالعلوم بلدی گلبرگہ)

ہماری زبان

زبانِ اردو ہے مجموعۂ علومِ جہاں　　　جو اس زبان میں خط ہے کسی زباں میں نہیں

ہمارا ملک دکن ہندوستان کا ایک حصہ ہے۔ ہندوستان ایک بڑا ملک ہے جس میں بہت سی قومیں رہتی ہیں۔ ان قوموں کی زبانیں بھی الگ الگ ہیں۔ مثلاً بنگالی، تلنگی، مرہٹی، تامل وغیرہ یہ سب زبانیں اچھی ہیں۔ لیکن ان کے بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ان میں سے کوئی زبان ایسی نہیں جس کو ہندوستان کے ہر حصے کے لوگ سمجھ سکیں۔

ہم جو زبان بولتے ہیں یعنی اردو ہندوستان کی عام زبان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو انگریزوں نے "ہندوستانی" کا نام دیا، جو آج بھی استعمال کیا جا رہا ہے۔ "ہندوستانی" کا نام اردو کو اس وجہ سے دیا گیا ہے کہ وہ ہندوستان کی عام زبان ہے۔ جس طرح ایران کی زبان کو ایرانی، عرب کی زبان کو عربی، چین کی زبان کو چینی اور جاپان کی زبان کو جاپانی کہتے ہیں۔

اردو ایک مخلوط زبان ہے۔ یوں تو ہر زبان میں دوسری زبانوں کے کچھ نہ کچھ الفاظ ضرور ہوتے ہیں۔ لیکن مخلوط کا لفظ ایسی زبان کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جو دو یا دو سے زیادہ زبانوں سے مل کر بنے۔ لیکن جن زبانوں سے مل کر بنی ہو ان میں سے کسی میں ضم نہ ہو جائے۔ بلکہ ایک تیسرے نام سے علحدہ اور آزاد حیثیت اختیار کرے۔ اردو شمالی ہندوستان کی پرانی زبان پراکرت اور فارسی سے مل کر بنی ہے۔ لیکن اُس کا نام نہ تو پراکرت ہے اور فارسی۔ بلکہ وہ ایک تیسرے ہی نام سے مشہور ہو گئی یعنی اردو کہلانے لگی۔ مخلوط زبانیں دو قوموں کے میل ملاپ سے بنتی ہیں۔ ہندوستان کی حد تک یہ دو قومیں — ہندو اور مسلمان ہیں۔ اور دونوں اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ ہندوستان کی مشترک قومی زبان، اردو یا ہندوستانی ہی ہونا چاہیے۔ کیونکہ یہی زبان ہندوستان میں ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اردو کی ترقی میں ہندو، اور مسلمان برابر کے شریک ہیں۔ یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ اردو کے سوائے کسی اور زبان میں ہندوستان کی مشترک قومی زبان بننے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔

اردو یا ہندوستانی میں۔ فارسی، عربی، سنسکرت، پراکرت، ہندی، پنجابی، مرہٹی، گجراتی، بنگالی، مارواڑی، تامل، ترکی، عبرانی، یونانی، پرتگالی، انگریزی وغیرہ کے بھی الفاظ ہیں اور ان زبانوں کے الفاظ کو اردو نے اپنا لیا ہے۔

سنسکرت۔ درشن، روپ۔ **پراکرت**۔ راؤ، رانا۔ **ہندی**۔ سونا، سنا۔ **گجراتی**۔ ننھا۔ **مارواڑی**۔ بتل۔ **ترکی**۔ انا۔
انگریزی۔ گلاس، جنگل، کوٹ، کاروان۔

سر تیج بہادر سپرو نے کیا خوب کہا ہے۔ "اردو زبان ہندو اور مسلمان دونوں کو اپنے آبا و اجداد سے ایک مشترکہ مقدس ترکے کی حیثیت سے ملی ہے جو قطعاً ناقابل تقسیم ہے"۔ راقم الحروف کا ذاتی خیال ہے کہ اردو میں ہندوستان کی مشترک قومی زبان بننے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ہر ہندوستانی کا فرض ہے کہ وہ اردو کی ترقی اور اشاعت میں حتی المقدور کوشش کرے۔ تاکہ اردو کو زیادہ سے زیادہ مقبولیت حاصل ہو۔

اشرف عابدی

جناب سید ہمایوں مرزا صاحب مرحوم اور محترمہ صغرا ہمایوں مرزا صاحبہ
بمقام یورپ ۱۹۲۴ء

اردو ادب کی ابتدا و ارتقاء

ادب اور زندگی دو ایسے لازم و ملزوم عناصر ہیں جن میں ایک کا وجود دوسرے کے لئے ناگزیر ہے۔ زندگی گویا ایک آئینہ ہے اور ادب اس کا عکس۔ ادب زندگی کی لطافتوں، رنگینیوں اور انقلابات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ہر انقلاب انگیز واقعہ جو کسی قوم کی تاریخ پر اثر انداز ہوتا ہے وہ اس قوم کے ادب پر بھی اپنے نقوش ثبت کرتا ہے۔ چنانچہ ادبیات اردو کی تاریخ بھی ہمیشہ ہندوستان کے انقلابات، کشمکشوں اور عروج و زوال کے واقعات سے ہمیشہ متاثر ہوتی رہی۔ چنانچہ اس نے جس ماحول اور فضا میں پرورش پائی ہے اور ترقی کی ہے اس کی تاریخ بڑی دلچسپ ہے۔

قدرت کا یہ ایک اٹل قانون ہے کہ ایک بچہ ہمیشہ بچہ نہیں رہ سکتا۔ اس قانون فطرت کا اطلاق کائنات کے ذرے ذرے پر ہوتا ہے اس لئے کسی ملک کی زبان اور ادب بھی اس قانون کی عملداری سے باہر نہیں ہو سکتے۔ اردو زبان نے بتدریج ارتقائی منازل طے کرنے شروع کر دیے۔ لیکن یہ کچھ عجیب بات ہے کہ شمالی ہند جہاں سب سے پہلے اردو کی تخلیق عمل میں آئی وہاں اس کی رفتار ترقی کچھوے کی رفتار سے زیادہ سست رہی۔ البتہ جنوبی ہند میں یہ زبان بہت پھلی پھولی۔ چنانچہ اسی اعتبار سے دکن کو اردو کا وطن کہا جاتا ہے۔

دکن میں شمالی ہند سے بہت پہلے تصنیفی اور تالیفی دور شروع ہو چکا تھا۔ لوگ ادب کتابی کی طرف جوق جوق رجوع ہونے لگے تھے۔ کچھ تو بادشاہوں کی سرپرستی اور کچھ اس زمانے کی علمی فضا ان دونوں نے مل کر سرزمین دکن پر اردو ادب کے بہت سے عالم پیدا کر دیے تھے۔ چنانچہ حضرت سید محمد حسینی گیسو دراز خواجہ بندہ نواز سرآمد اقران و امثال ہیں۔ آپ کی معرکۃ الآرا تصنیف "معراج العاشقین" ادبیات اردو کے اولین کارناموں میں سے ہے۔ یہ کتاب ۱۳۹۸ء میں لکھی گئی اور اس کتاب کا طرز انشا ابتدائی اردو کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ "پیر منع کیے سوں پرہیز کرنا۔ ہرا تپے کی گولی شاہدے کے کانسے میں میکائیل کی مدد کے پانی سوں جلی کا کاڑا کر پیالا سکن کا کاڑا دینا۔ نرگن ہوا تو شفا پادے گا۔ طبیب فرمائے تیوں پرہیز کرنا تو آتے بھی طبیب ہو جائے گا۔ ہور ماٹی میں ماٹی، ماٹی میں پانی، ماٹی میں آگ، ماٹی میں بارا، ماٹی میں خالی۔ ان پانچ عناصراں کا واجب الوجود ہو جائے تو معرفت تمام ہوا۔"

بعض محققین نے امیر خسرو کی لغت "خالق باری" کو اردو کی پہلی تصنیف قرار دیا ہے لیکن امیر خسرو کی اس تصنیف میں بھاشا اور فارسی اس تناسب سے لائی گئی ہے کہ یہ تصنیف اردو کہلانے کی مستحق نہیں۔ گو یہ ضرور ہے کہ امیر خسرو ہی نے پہلے پہل بھاشا اور فارسی کو ملانا شروع کر دیا تھا لیکن ان کے اشعار، پہیلیاں اور کہہ مکرنیوں سے پتہ چلتا ہے کہ بھاشا فارسی پر اس قدر بھاری تھی کہ اس نئی زبان کو ہندی کہا جاتا تھا جیسا کہ خود حضرت امیر خسرو کو اس کا اعتراف ہے۔

ز "ہندی زبان" خانہ ہم بیت گھر ہے
چو خوف و خطر بیم ہم ترس ڈر ہے

بہرحال اس لحاظ سے "معراج العاشقین" ہی ادبیات اردو کی پہلی کتاب ہے۔ "معراج العاشقین" کے بعد حضرت خواجہ بندہ نوازؒ نے علم تصوف پر تیس سے زائد کتابیں لکھیں۔ اسی زمانے میں حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کے ایک عزیز سید محمد عبداللہ حسینی نے عبدالقادر جیلانی کے رسالے "نشاط العشق" کا دکھنی اردو میں کامیاب ترجمہ کیا۔ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کے شغلِ تصنیف و تالیف نے اس زمانے پر گہرا اثر ڈالا چنانچہ ان کی تصانیف نے دوسرے علما اور شعرا کے ذوقِ تصنیف و تالیف کو ابھارا اور اس طرح اکثر علما اور صوفیائے کرام نے اپنی توجہات تصنیف و تالیف کی طرف منعطف کیں۔ چنانچہ حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق نے ۱۴۹۵ء میں "مرغوب القلوب" شاہ برہان الدین نے ۱۵۸۲ء میں "کلمۃ الحقایق" اور شاہ امین الدین بیجاپوری نے ۱۶۰۱ء میں گنجِ مخفی جیسی مشہور و معروف ادبی تصانیف سے اردو ادب کو مالا مال کیا۔ انہی بزرگوں کی مساعی کا یہ نتیجہ نکلا کہ اردو رفتہ رفتہ دکن کے ہر باشندے کے دل میں اپنا گھر کرتی رہی۔ بہادر شاہ کے طوطے کا قصہ بہت مشہور ہے۔ ایک مرتبہ سلطان نصیر الدین ہمایوں نے بہادر شاہ حاکمِ گجرات و دکن پر چڑھائی کی۔ بہادر شاہ کا ایک نمک حرام سردار رومی خاں ہمایوں سے جا ملا۔ بہادر شاہ کی شکست کے بعد مالِ غنیمت کے ساتھ بہادر شاہ کا چہیتا طوطا بھی لایا گیا جونہی طوطے نے رومی خاں کی صورت دیکھی چیخ اٹھا۔

"پھٹ پاپی رومی خاں نمک حرام"

اس قصے سے صرف اتنا اظہار مقصود ہے کہ اردو نے دکن میں کتنی ترقی حاصل کی تھی نہ صرف کتابی ادب بلکہ بول چال میں بھی دکن شمالی ہند سے بہت آگے تھا۔ شمالی ہند چونکہ ہر دور میں بیرونی حملہ آوروں کا آماجگاہ بنا رہا اس لئے وہاں کی تہذیب و تمدن ادب اور زبان کو ترقی کا موقع کم ملا۔ البتہ دکن دور ہونے کی وجہ سے ہمیشہ حملہ آوروں کی دست برد سے محفوظ رہا۔ اس پر ہمیشہ امن کا دیوتا حکمران رہا۔ اس لئے تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ ادب اور زبان نے بھی ترقی حاصل کرنی شروع کی نیز دکن میں اردو کو ہمیشہ شاہی سرپرستی حاصل رہی۔ چنانچہ عادل شاہی اور قطب شاہی فرمانرواؤں نے زبان اور ادب کی ترقی میں اپنی ساری توجہات صرف کردیں۔ ان کی سرپرستی نے نصف اردو کو اپنے بل بوتے پر کھڑا رہنا سکھایا بلکہ بہت سے شاعر مصنفین اور مولفین بھی پیدا کئے۔ بادشاہ اور سلاطین خود شاعر اور عالم ہوتے تھے۔ چنانچہ عادل شاہی خاندان اور قطب شاہی مملکت کا تقریباً ہر فرمانروا عالم فاضل اور شاعر گذرا ہے۔ ان کے دربار علما و فضلا شعرا اور ادیبوں کا مرجع بنے رہتے تھے۔ چنانچہ نصرتی، وجہی، غواصی، شاہ ملک، ابن نشاطی، رستمی، امین، سیوا، مومن اور ہاشمی دربار گولکنڈہ اور بیجاپور کے "نورتن" کہلاتے ہیں۔ ان شعرا اور انشا پردازوں نے اپنے آپ کو صرف درباری شاعری تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ قلمی کاوشوں سے بھی اردو ادب کے خزانے میں اضافہ کرتے رہے چنانچہ نصرتی کا "علی نامہ" وجہی کی "سب رس" اور قطب مشتری" ابن نشاطی کی "پھول بن" فائز کا منظوم قصہ "رضواں شاہ" امین بیجاپوری کی "جوہر الاسرار" کے نام آج تک ادبیات اردو میں بڑی فخر کے ساتھ لئے جاتے ہیں۔ انہی عادل شاہی فرمانرواؤں کے عہد میں اردو سرکاری اور دفتری زبان بنائی گئی اس کے بعد پھر کیا تھا اس زبان نے

خوب ہاتھ پاؤں نکالے۔

سلاطین بیجاپور کی طرح سلاطین گولکنڈہ نے بھی اردو ادب کی بے لوث خدمت کی خصوصاً محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں اردو مملکت گولکنڈہ کی مقبول عام زبان تھی۔ بادشاہ خود اردو کا ایک قادر الکلام شاعر اور بلند پایہ ادیب تھا۔ اس نے اردو شاعری میں حسن و عشق، تصوف و معرفت کے علاوہ انسانی معاشرت پر بھی نظر دوڑائی شادی بیاہ، ہولی بسنت، صراحی و پیالہ کا مکالمہ، کالی گوری کا مکالمہ وغیرہ۔ قلی قطب شاہ معانی تخلص کرتا تھا۔ اس نے اردو ادب میں اپنی ایک یادگار کلیات کی شکل میں چھوڑی ہے۔ اکبر کے دربار کے نورتنوں کی طرح اس کے دربار کے بھی "رتن" بہت مشہور و معروف ہیں۔ ملا وجہی ان سب میں ممتاز و نمایاں ہے۔ اس نے دو معرکۃ الآرا تصانیف "سب رس" اور "قطب مشتری" تصنیف کیں "سب رس" اردو نثر کی شاہکار تصنیف ہے اور قطب مشتری ایک نہایت اعلیٰ مثنوی ہے۔ سب رس صرف ایک علمی کاوش ہی نہیں بلکہ اس زمانے کی اردو کی صرف و نحو کا ایک شفاف آئینہ ہے۔ اس دور کے بعد ولی، جعفر، سالک، فضلی، لطفی، احمد، اشرف، اتقی وغیرہ پیدا ہوئے شعر و سخن کا سیلاب آیا ان کا بچا کچا مال و متاع دیوان اور کلیات کی شکل میں اردو ادب کو ملا۔ ولی ان تمام شعرا میں ممتاز اور نمایاں شخصیت کا حامل تھا۔

محمد شاہ کے عہد میں شمالی ہند میں اردو نے ترقی کے منازل طے کرنے شروع کر دیے تھے۔ چنانچہ اس زمانے کے بہت سے شعرا آج تک اردو ادب کے مربی و محسن سمجھے جاتے ہیں۔ شیخ ظہور الدین حاتم، نجم الدین آبرو، شرف الدین علی خان فغاں، محمد شاکر ناجی، مرزا رفیع سودا قابل ذکر ہیں۔ ان سب میں بہتر شیخ ظہور الدین حاتم تھے۔ مرزا رفیع سودا انہی کے شاگرد تھے۔ ان ارباب اردو نے شاہ جہاں آباد (دہلی) میں اردو کو اتنی ترقی دی کہ شاہ جہاں آباد (دہلی) کو "اردو کا شیراز" کہا جانے لگا۔ چنانچہ سرسید لکھتے ہیں۔

"یہ زبان اب اتنی منجھ گئی ہے کہ قیامت تک اس سے بہتر ہونی ممکن نہیں اور اس زبان کو شاہ جہاں آباد سے ایسی ہی نسبت ہے جیسے فارسی کو شیراز سے"۔

یہ کچھ عجیب بات ہے کہ جس نے شاہ جہاں آباد کو بسایا۔ اس کے عہد تک اردو صرف بول چال کی زبان تھی۔ کتابی ادب سے لوگ بے بہرہ تھے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ سنہ ۱۱۴۵ھ سے قبل کسی کتاب کا نام نہیں سنا گیا۔ البتہ ۱۷۳۲ء میں شاہ فضل اللہ فضلی نے "دہ مجلس" یا "کربل کتھا" کے نام سے اردو نثر کی پہلی کتاب لکھی جس میں واقعات شہادت کربلا مندرج ہیں۔ شمالی ہند میں فضلی کی اس کتاب کو اردو نثر کی اولین تصنیف اور فضلی کو اردو نثر کا باوا آدم تسلیم کیا گیا ہے۔ فضلی کی اس تصنیف میں ہمیں پاکیزہ اردو نظر آتی ہے جو حال حال کے زمانے تک بھی ہندوستان میں رائج تھی۔

اس تصنیف کے بعد سے شمالی ہند میں تصنیفی و تالیفی شغل دھڑلے سے شروع ہو گیا۔ سنہ ۱۷۶۶ء میں مرزا رفیع سودا نے "دیباچۂ دیوان مرثیہ" لکھا۔ مرزا رفیع سودا کا طرز فضلی کی طرز انشا سے بالکل مختلف ہے۔ رفیع اس قسم کی عبارت آرائی کرتے تھے۔

"مضمون سینے میں مثل از مرغ نہیں کہ ہو پیچ قفس کے جس وقت زبان پر آیا فریاد بلبل ہے واسطے گوش وا ورس کے"
رفیع سودا نے مثنوی "شعلۂ عشق" بھی اسی عبارت میں لکھی ہے۔ نیز شعری تاریخ گوئی کے موجد بھی رفیع سودا ہیں
یہ وہ زمانہ تھا جب مغلیہ سلطنت موت کی ہچکیاں لے رہی تھی جب وہ آخری ہچکی لے کر ختم ہوگئی تو اردو کا کوئی سرپرست
نہ رہا اس لئے ایسٹ انڈیا کمپنی نے اردو کی انگلی پکڑی۔ اور اس کی اپنے بچے کی طرح پرورش کی۔ ۴ مئی سنہ ۱۸۰۰ء میں
اردو کی ترویج و اشاعت کے لئے فورٹ ولیم کالج قائم کیا گیا۔ اس کے بعد ایک اور کالج اس غرض کے تحت دہلی میں
قایم کیا گیا۔ فورٹ ولیم کالج سیاسی ضروریات کے مدنظر قایم کیا گیا۔ یعنی اس کے قیام کا مدعا یہ تھا کہ انگریزوں کو ہندوستان
ہندوستانی زبان اور ہندوستانی معاشرت سے روشناس کرایا جائے۔ بمقصد خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو مگر یہ ضرور کہا جا سکتا
ہے کہ اردو نے اس کے دامن عاطفت میں پرورش پائی اور خوب ترقی کی بلکہ فورٹ ولیم کالج ہی دراصل حقیقی معنوں میں
اردو کا سرپرست رہ چکا ہے۔ اس کالج کی بنا ایک ایسی قوم نے ڈالی جس کے لٹریچر کی وسعت اظہر من الشمس ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ
اپنے لٹریچر کو اردو میں منتقل کرے لیکن چونکہ ہندوستانی انگریزی ادب سے بے بہرہ اور ناواقف محض تھے اس لئے
یہ ارادہ خواب بن کر رہ گیا۔ البتہ اس قوم کی کوششوں سے اس دور کے مصنفین نے فارسی اور عربی تراجم شروع کئے۔
میر شیر علی افسوس نے "گلستان" کا ترجمہ "باغ اردو" کے نام سے شایع کروایا۔ مولوی شاہ عبدالقادر نے قرآن شریف کا
ترجمہ۔ "آرایش محفل" کے نام سے پیش کیا۔ اسی طرح ڈاکٹر گلکرائسٹ پرنسپل فورٹ ولیم کالج نے جو اردو کا محسن اعظم
سمجھا جاتا ہے اردو صرف و نحو پر ایک کتاب لکھی جو ادبیات اردو میں "رسالہ گلکرائسٹ" کے نام سے مشہور ہے۔ غرض
ڈاکٹر گلکرائسٹ کی مسیحا نفسی سے اردو کے قالب میں نئی روح پھونکی گئی۔

پہلے پہل تو فورٹ ولیم کی اردو کا رجحان زیادہ تر قصوں اور افسانوں کی طرف تھا چنانچہ ابتداءً جتنی تصانیف
پیش کی گئیں وہ سب حسن و عشق اور گل و بلبل کے رومانوی قصے تھے۔ لیکن بعد میں گلکرائسٹ کی کوششوں سے
فورٹ ولیم تاریخ اور تذکرہ نویسی میں بھی کبھی پیچھے نہ رہا۔ شیر علی افسوس کی "آرائش محفل" حیدری کی "تاریخ نادری"
مظہر علی خاں ولا کی "تاریخ شیر شاہی" اور حسینی کی "تاریخ آسام" اس دور کی نہایت معتبر اور مستند تاریخیں ہیں۔
اس کالج کے عہد میں سب سے پہلی مرتبہ پتھر کے چھاپے خانے قایم کئے گئے جن کی وجہ سے تصنیف و تالیف میں غیر معمولی
سرعت پیدا ہوگئی۔ اگرچیکہ فورٹ ولیم کالج کے ارباب حل و عقد نے اردو کی ترویج و اشاعت کا بیڑا اٹھایا تھا لیکن
انھوں نے اردو ادب کے لازمی عنصر نظم کو فراموش کردیا۔ اسے اردو نظم کی خوش قسمتی سمجھئے کہ قدرت نے اس کی
بقا کے لئے ولی، میر، مصحفی، انشا، آتش، ذوق، غالب اور نظیر کو پیدا کیا۔ انھوں نے اردو نظم کی گرتی ہوئی دیوار
کو سنبھالا اور اس کو کبھی نثر سے پیچھے نہ رہنے دیا۔ پہلے پہل اردو میں جتنی بھی کتابیں لکھی گئیں ان میں فارسیت کا بہت
زیادہ غلبہ تھا۔ شاعر اور ادیب عموماً اپنی قابلیت کے مظاہرے کے لئے فارسی کے الفاظ زبردستی اردو میں ٹھونستے تھے۔

سر سید اور محمد حسین آزاد ہی وہ اشخاص ہیں جنھوں نے اردو کو سلیس اور عام فہم بنانے کی کوشش کی۔ سر سید اور محمد حسین آزاد کا نذیر احمد حالی اور شبلی نے بھی ساتھ دیا چنانچہ تاریخ ادبیاتِ اردو میں انھیں "اردو کے عناصرِ خمسہ" کہا گیا ہے۔ ان تمام کی تحریریں اتنی آسان اور دلکش عبارت میں لکھی ہوئی ہیں کہ ایک معمولی اردو داں بھی بخوبی پڑھ سکتا اور سمجھ سکتا ہے۔
شروع شروع میں یہ طرزِ انشاء مقبول نہ ہو سکی چنانچہ رجب علی سرور جیسے ادیب نے اس سلاست اور سادگی کا مذاق اڑایا۔ لیکن ان عناصرِ خمسہ کی سعی پیہم سے یہ بیل جلد جلد منڈھے چڑھنے لگی۔ سر سید، نذیر احمد اور شبلی نے اگر نثر میں انقلاب پیدا کیا تو آزاد اور حالی نے پرانی اور گنجلک شاعری کا خاتمہ کیا اور جدید شاعری کی بنیاد ڈالی۔ چنانچہ آزاد اور حالی نے حسن و عشق اور گل و بلبل کے قصوں سے اپنے قلم کو ناآشنا رکھا۔ ان کی شاعری کی ہر تان فطرت پرستی، حقایق اور حیاتِ انسانی کے واقعات پر ٹوٹتی تھی۔ چنانچہ محمد حسین آزاد نے جدید طرز کی پہلی نظم "شبِ قدر"، ۸ مئی ۱۸۷۴ء انجمن پنجاب کے جلسہ میں پڑھی جو کرنل ہالرائیڈ کی زیرِ صدارت منعقد ہوا تھا۔ اس کے بعد سے اردو میں اسی قسم کی شاعری کا آغاز ہوا حالی اور دوسرے ہم عصر شعراء نے آزاد کا تتبع شروع کیا۔ نیز اس جدید رنگ کی شاعری کی آبیاری کرنے والوں میں اکبر، اقبال، سرور جہان آبادی، چکبست، ٹلوک چند محروم اور جوش ملیح آبادی بھی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک جب کسی موضوع پر قلم اٹھاتا تو وہ اس کی قوم نیز اس کے ماحول (.......... ......) سے متعلق ہوتا۔ نظم کی طرح نثر میں بھی سر سید، نذیر احمد، شبلی اور غالب کی وجہ سے انقلاب ہوا خصوصاً غالب نے اردو زبان کو آسان بنانے میں طرح، ، ، دی۔ ان کی عبارت میں سادگی، بے تکلفی، بے ساختگی اور لطف پایا جاتا ہے۔ ان کے مکاتب اردو ادب میں "اردوئے معلیٰ" کے نام سے معروف ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ "خطوط نویسی" دراصل مرزا غالب کی ایجاد ہے۔

یہ سب کچھ انہی اربابِ نثر کی کوششوں و مساعی کا نتیجہ ہے کہ ادبیاتِ اردو آج اس قدر مالا مال نظر آتی ہے موجودہ دور کو اگرچہ اردو کے انتہائی عروج کا دور نہیں کہا جا سکتا مگر پھر بھی یہ دور اردو کے شاندار مستقبل کا ضامن ہے ادبیاتِ اردو کے بازار میں آج ہمیں سیکڑوں یوسفِ افکار بکتے نظر آتے ہیں چنانچہ اردو شاعری میں جگر، جوش، حفیظ اور امجد کا نام رہتی دنیا تک قایم رہے گا۔

اعلیٰ پایہ کے علمی، ادبی مضامین اور تحقیقی مقالے لکھنا گویا مولوی عبدالحق، نیاز فتح پوری، قاضی عبدالغفار، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور اور مولوی عبدالقادر صاحب سروری کا حصہ ہے۔

جدید افسانہ نگاری کے متعلق ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ جدید افسانے سارے انگریزی ادب کی پیداوار ہیں اور اردو کے انشاء پرداز مغربی افسانوں کو اردو کا جامہ پہنا کر پیش کر رہے ہیں۔ چنانچہ نیاز فتح پوری نے ٹیگور کے اثر کو اردو میں رائج کیا۔ سجاد حیدر یلدرم نے ترکی افسانوں کے متعدد ترجمے شائع کئے۔ عنایت اللہ دہلوی مستقل طور پر انگریزی تصانیف کو اردو میں منتقل کر رہے ہیں۔ اس طرح جلیل قدوائی، مجنون گورکھپوری، امتیاز علی تاج،

صادق الخیری، حجاب امتیاز علی، اختر حسین رائے پوری اور علیگڈھ و جامعہ عثمانیہ کے اکثر اصحاب قلم انگریزی، فرانسیسی اور روسی افسانوں کو رائج کر رہے ہیں۔

طبعزاد افسانہ نگاروں میں منشی پریم چند مرحوم، اعظم کریوی، ام اسلم، آغا حیدر حسن اور خواجہ حسن نظامی قابلِ ذکر ہیں۔

اردو کا مزاحیہ لٹریچر اکبر الہ آبادی، پطرس، فرحت اللہ بیگ اور رشید احمد صدیقی کا ممنونِ احسان ہے۔

اس تمام بحث کے بعد اگر ہم اردو ادب کا دوسری زبانوں کے ادب سے تقابل کریں تو معلوم ہوگا کہ اردو ادب ابھی عالم طفلیت سے گزر رہا ہے۔ جامعہ عثمانیہ، انجمن ترقی اردو، دار المصنفین اعظم گڈھ، ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد نیز ہندوستان کے اکثر رسائل و اخبارات اردو ادب کے تمول و ارتقا کی ممکنہ کوششیں کر رہے ہیں۔ ان کی یہ قابلِ قدر مساعی یقین دلاتی ہیں کہ اردو ادب کا مستقبل نہایت شاندار اور درخشاں ہے۔

ابراہیم حسین جلیس
(از گلبرگہ)

کاغذی دوات

اک بچے نے بنائی جو اک کاغذی دوات — خوش ہو گیا کہ سب سے ہے اچھی مری دوات

ماں سامنے ہی بیٹھی تھی، بولا کہ اماں جان — یہ دیکھیے دوات کی میری انوکھی شان

کیا خوب یہ دوات ہے کیا بات ہے مری — ہوتی ہے دیکھ دیکھ کر اس کو بڑی خوشی

اس میں سیاہی بھر کے میں لکھوں گا اب سبق — معنی لکھوں گا اُن کے جو الفاظ ہیں ادق

ماں نے کہا یہ سن کے کہ اچھی ہے یہ دوات — لیکن میں تم سے کہتی ہوں بیٹا اب ایک بات

یہ کاغذی دوات فقط دیکھنے کی ہے — جو کام دینے والی ہو وہ تو نہیں یہ شئے

لکھو پڑھو تمھارے یہی کام آئے گا — لکھ پڑھ چکو تو اس کا ہے پھر پوچھنا ہی کیا

لکھ پڑھ کے تم جو سونے کی بنواؤ گے دوات — اس وقت پھر کچھ اور ہی ہوگی تمھاری بات

اب کاغذی بنا کے دوات اس قدر ہو شاد — جب علم سیکھ لوگے تو بر آئے گی مراد

صنعت بھی اچھی چیز ہے تم یہ بھی سیکھ لو — چھوڑو نہ کاہلی سے ہنر اور علم کو

علم و ہنر کو سیکھ کے جو طاق ہو گئے — بیٹا! وہ لوگ شہرۂ آفاق ہو گئے

محنت اٹھا کے سیکھا ہے جن لوگوں نے کمال — ہے وہ کمال ان کے لئے دولت اور مال

میں خوش ہوں تم کو علم کا صنعت کا شوق ہے — اس کا اٹھاؤ لطف کہ اچھا یہ ذوق ہے

علم و ہنر سے عزت انساں جہاں میں ہے
فیاض اس سے بڑھ کے نہیں اور کوئی شئے

ابوالفیض فیاض
(دیورکنڈہ)

بوڑھا سادھو

شام ہو رہی تھی۔

بوڑھا سادھو چلا جا رہا تھا۔

بائیں ہاتھ کی جھولی میں دو چار سڑے گلے آم تھے۔ کندھے پر پوٹلی، دائیں ہاتھ سے کندھے پر سنبھالا ہوا ایک لکڑی کا ــــ موٹا کالا سا ــــ ڈنڈا!

داڑھی الجھی ہوئی۔ ذرا سفید مگر مٹیالے بال۔ بالوں میں دھول۔ گڑھے میں دھنسی ہوئی آنکھیں اور ......اور ہاں، تکان سے لڑکھڑاتے ہوئے پیر! جھکے ہوئے کندھوں پر گویا وہ مصیبت کا بوجھ لادے چلا جا رہا تھا۔

جھکی ہوئی آنکھیں اٹھا کر اس نے دیکھا، سامنے ہی دو نوجوان چلے آ رہے تھے۔ سفید ڈھیلے پاجامے، لمبے انگریزی وضع کے بال اور منہ میں سگار!

"بابوجی کا بھلا ہو......" بھکاری نے نہایت عاجزانہ انداز میں کہا۔

نوجوانوں کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ غصہ سے ایک نے کہا "سر پر چڑھا آتا ہے اندھے؟ منہ سے مانگتے مانگتے نیت نہیں بھری؟"

"ارے یار، یہ تو بدمعاش معلوم ہوتا ہے!" دوسرے نے سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے کہا۔

بوڑھا سادھو اپنی جگہ دنگ کھڑا رہ گیا، دونوں کو جاتے دیکھتے ہوئے!

لمبی سانس لے کر پھر چل دیا۔ حالانکہ اس کے پیروں میں وہ طاقت باقی نہ تھی۔ کندھے کا بوجھ بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ بے عزتی کے مارے کلیجہ منہ کو آ رہا تھا!

سامنے دیکھا، ایک ادھیڑ عورت ایک بوڑھے کے ساتھ چلی آ رہی ہے۔

بھکاری نے سوچا، عورت کا دل مرد کی طرح لوہے کا نہیں ہوا کرتا۔ وہ رحم دل ہوتی ہے۔ شاید۔ وہ ٹھٹھک گیا۔

عورت نے دیکھا اور دیکھ کر بھی نہ دیکھنے کی کوشش کی۔

"مائی......!" سادھو نے کہا۔

بھوں چڑھا کر عورت نے کہا، "اتنی بڑی لونڈیا تو بھی ہے، اس سے بھی تیرے [illegible]"

بوڑھے نے ہاتھ بتا کر کہا "ارے باپ رے ڈنڈا دیکھو اس کا!"

سادھو نے دیکھا، بوڑھی کے ہاتھ میں سونے کی چمکدار چوڑیاں، کڑے نہ معلوم اور کیا کیا ہیں!

سادھو کی آنکھیں دھندلی ہو گئیں۔ شاید اس میں کندھے کے بوجھ کو سنبھالنے کی طاقت ہی نہ تھی۔ مجبوراً وہ چلتا ہی رہا۔ چلنا تو تھا ہی۔ شام قریب تھی۔ اور رات سے قبل اس کو ندی کے کنارے پہنچنا تھا۔ ورنہ......؟

اور ندی؟ کتنی دور پر تھی وہ! دو...... تین...... یا......اور زیادہ میل؟ سادھو نے ہمت کر کے اپنی رفتار تیز کی۔

تھکے ماندے لڑکھڑاتے پیروں میں ٹھوکریں لگتی تھیں مگر وہ چلتا ہی جاتا تھا!

کسی بچی کی سریلی آواز اس کے کان میں پڑی۔ دیکھا کہ حسین معصوم لڑکی اپنی ہمجولیوں سے کھیل رہی ہے۔

سادھو رک گیا۔

اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ ندی کا کنارا کتنا دور تھا!

پھر بھی بوڑھا سادھو سب کچھ بھول کر اس حسین لڑکی کو
دیکھ رہا تھا، ہنستے ہوئے!

اتفاقاً بچی کی نظر اپنی جانب گھورنے والے
بوڑھے سادھو پر پڑی۔ وہ گھبرا کر خاموش ہوگئی۔

سادھو نے مسکرا دیا، اس کا ڈر مٹانے کے لئے!

بچی پیچھے ہٹ گئی۔ اور مارے خوف کے اس کے
منہ سے چیخ نکل گئی "ارے ڈنڈے والا!" اور وہ بھاگ گئی۔

رات ہوگئی تھی۔ سادھو آہستہ آہستہ قدم بڑھائے
چلا جا رہا تھا، سایہ کی طرح، بے ہوش سا!

زندگی کے لمبے لمبے پچاس سال..... تب ہاں،
وہ بھی بچہ ——— ایسا ہی بچہ ——— تھا!..... ہوگا۔ مگر اب؟

تین دن کا بھوکا بدن کام کرنے سے انکار کر رہا تھا!
اتنی تھکان اور اس درجہ کمزوری کا اس کو احساس
ہو رہا تھا کہ شاید وہ پچاس سال سے چل ہی رہا ہے!

آج...... وہ "ڈنڈے والا".... بچوں کا چھپا..... اُف!
اس کا سر چکرانے لگا۔

کانوں میں سنسناہٹ....... آنکھوں میں اندھیرا
..... رات شاید آگے بڑھ کر اس کا گلا دبا رہی تھی!

ہائے! ندی کا کنارا کتنا دور تھا! "ڈنڈے والا.... اُف... بدمعاش!"

سادھو اک بار لڑکھڑایا۔ آنکھوں پر ہاتھ پھیر کر سنبھلنے کی
کوشش کی۔ اور ایک قدم بڑھایا!
مگر ٹھوکر لگی، اور....... گر پڑا۔

صبح لوگوں نے معلوم کیا کہ سادھو ——— ایک بوڑھا
سادھو ——— مرا پڑا ہے! اس کی پھٹی پوٹلی سے کچھ
چیزیں اِدھر اُدھر جھانک رہی ہیں۔ اور وہ ڈنڈا پکڑے
ہوئے ہے مضبوطی سے!

ین ین کٹی
(رنگ گری)

اردو

ہر اک زباں سے اچھی اردو زباں ہماری	کہتے ہیں اس زباں کو پیر و جواں ہماری
بے خود بنا ہی دے گی نغمے سنا سنا کر	جذبات کے وہ اے دل پیاری زباں ہماری
مٹنا ترا ہے مشکل جب تک کہ دم میں دم ہے	پیاری زباں ہی اردو جانِ جہاں ہماری
اغیار گو ہوں دشمن مطلق نہ خوف کھا تو	کیا جانے تیری عظمت کیا جانے شاں ہماری
اقبال اور حالی گویا تھے یوں ولی بھی	پیاری ہی جاں سے ہم کو اردو زباں ہماری

اردو کی شان و شوکت دیکھی ہے جب سے اے درد
کہتا ہے ہو کے قرباں ہندوستاں ہماری

حسین شریف درد
(سٹی کالج)

مطبع مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس

میر حسن ایم اے کی کتابیں

ورڈز ورتھ اور اس کی شاعری۔ میر حسن صاحب ایم اے ملک کے ان لائق فرزندوں میں سے ہیں جنھوں نے اردو زبان و ادب کی خدمت کو اپنا نصب العین بنا رکھا ہے۔ ان کی علمی و ادبی خدمات محتاج تعارف نہیں ہیں۔ انھوں نے سب سے پہلی کتاب "ورڈز ورتھ اور اس کی شاعری" لکھی اور اسی کتاب سے "ادارۂ ادبیات اردو" کے اشاعت کتب کا سرگرم دور شروع ہوتا ہے۔ ورڈز ورتھ کے متعلق ملک کے جرائد و مشاہیر کی رائیں اس کے مصنف کی پہلی کوشش کی غیر معمولی کامیابی کا ثبوت ہیں۔

"ورڈس ورتھ انگریزی ادب کا معیاری شاعر ہے جناب میر حسن نے اس کو اردو داں طبقے سے روشناس کیا ہے
"مولف نے یہ ایک اچھا طریق سوانح نگاری اختیار کیا ہے۔ اگر اسی رنگ پر وہ دوسرے باکمال شعرائے یورپ کو"
"روشناس کرنے میں کامیاب ہو جائیں جیسا کہ ان کا مقصد ہے تو اردو کی ایک مفید خدمت انجام دیں گے۔ (مولانا سلیمان ندوی)

"مولوی میر حسن صاحب نے اس کتاب میں نہایت خوبی و جامعیت کے ساتھ انگلستان کے اس مشہور شاعر"
"کی حیات اور کلام اور اس کے معاصرین اور عہد حاضر کے انگریزی اور اردو شاعروں پر اس کے اثرات تنقیدی"
"نقطۂ نظر سے بیان کئے ہیں۔ اسلوب بیان اس قدر دلکش اور دلاویز ہے کہ بے اختیار مصنف کے حق میں"
".....دل سے دعا نکلتی ہے ع اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔" (مشیر دکن)

"سوانح نگاری کا یہ طرز عام روش سے علٰحدہ ہے اور چونکہ فطری اصول کے مطابق ہے اس لئے نہایت پسندیدہ ہے۔"
"بہ حیثیت مجموعی ہمارے جدید مطبوعات میں یہ ایک مفید و دلچسپ اضافہ ہے۔ (ہندوستانی الٰہ آباد)

"جامعۂ عثمانیہ کی بدولت حیدرآباد اور اس کے متعلقات میں خوش فکر اور نوجوان انشا پردازوں کی ایک ایسی"
"اولو العزم جماعت پیدا ہو گئی ہے جو ہر وقت اردو ادب کی توسیع و ترقی کی فکر میں منہمک ہے۔ اسی جماعت میں"
".....میر حسن صاحب بھی ہیں۔ قابل مصنف نے نہایت محنت اور دماغ سوزی سے کام لے کر یہ کتاب مرتب"
"کی ہے۔ اردو داں پبلک خصوصاً شعرا کو اس کی قدر کرنی چاہیے۔ (دیا نرائن نگم بی اے)

"موضوع نام سے ظاہر ہے اور افادیت اس کے موضوع سے مترشح۔ وہ لوگ جو خالص ادبی ذوق رکھتے ہیں اور"
"مشرق و مغرب دونوں جگہ کی شاعری پر متقابلاً نگاہ ڈالنا چاہتے ہیں، ان کے لئے یہ کتاب خصوصیت"
"کے ساتھ قابلِ قدر ہے۔ (نیاز فتح پوری)

"میر حسن صاحب نے یہ بہت قابل قدر کام کیا ہے۔ میر حسن صاحب کی محنت قابلِ شکر اور لائق قدر ہے۔ نظم کا"
"ترجمہ بہت دشوار کام ہے لیکن مولف نے عموماً اس دشوار کام کو بھی خوبی سے انجام دیا ہے۔ اردو شعرا کو یہ"
"کتاب ضرور پڑھنی چاہیے۔ (پروفیسر اسیٹ)

"کتاب اچھی ہے اور بہت اچھی ہے اور بہت سلیقہ سے مرتب کی گئی ہے۔ ورڈس ورتھ کی شاعری کے اثرات اردو شاعری پر بھی

" نئے دور پر آپ نے کامیابی کے ساتھ دکھائے ہیں۔ ہوشمند طبیعتیں ضرور ورڈسورتھ کے کلام کا مطالعہ اب اس نقطۂ نظر سے "
" کریں گی جس کی طرف آپ کی کتاب اشارہ کر رہی ہے۔ (ڈاکٹر عبدالستار صدیقی)
" ورڈس ورتھ اور اس کی شاعری پر انھوں نے قابلِ قدر کام کیا ہے اور اس موضوع پر اردو میں ایک دلچسپ "
" کتاب لکھی ہے۔ (عبدالرحمن خاں سابق صدر جامعۂ عثمانیہ)
" یہ بیش قیمت رائیں " ورڈز ورتھ اور اس کی شاعری " کے اس قابل مصنف کے متعلق ہیں جو پروفیسر قاضی محمد حسین "
" صاحب نائب معین امیر جامعہ عثمانیہ کی نظر میں " کردار اور عمل کے ایک بلند معیار کا مالک " ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جامعۂ عثمانیہ
کے سانچے میں جو آزادی فکر و عمل ڈھلتی ہے اس کی تعمیر ایسے ہی طلباء کی تعمیری جد و جہد سے ممکن ہے "۔
" ورڈز ورتھ اور اس کی شاعری کی دوسری اشاعت، سات سال بعد نظرِ ثانی اور اضافوں کے بعد عمل "
" میں لائی جا رہی ہے۔ اس میں ورڈز ورتھ کی نظموں کا منظوم ترجمہ بھی شریک رہے گا جو صاحبزادہ میکش نے "
" کیا ہے "

مغربی تصانیف کے اردو تراجم۔ میر حسن صاحب کی دوسری کتاب جو حال میں شائع ہوئی ہے مغربی تصانیف کے اردو تراجم سے متعلق ہے۔ پروفیسر سروری نے سچ فرمایا ہے کہ " نقد ادب اور تاریخی طریقۂ تنقید کے علاوہ ماخذوں کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں ایسی کتابوں کی خاص اہمیت ہوتی ہے۔ اس کتاب میں مغربی زبانوں کی تصانیف اور تالیفات کو اردو زبان میں منتقل کرنے کی تمام انفرادی اور اجتماعی کوششوں کا مبسوط تذکرہ کیا گیا ہے ۱۸۰۱ء سے ۱۹۱۷ء تک کے اردو ادب کا یہ پہلو ہر اس شخص کے لئے باعثِ دلچسپی ہوگا جو ترقیٔ اردو کے متمنی ہیں۔

سائنس کے کرشمے۔ " سائنس کے کرشمے " ان نشری تقاریر کا مجموعہ ہے جو نشرگاہ حیدرآباد سے علمی موضوعوں پر نشر ہو چکی ہیں۔ میر حسن صاحب نے ان کو ترتیب دے کر عوام کو علمی موضوعوں سے واقف ہونے کا ایک موقع پیدا کر دیا ہے۔

حسب ذیل کتابیں مرتب ہو چکی ہیں اور زیر طبع ہیں

بچوں کی کہانیاں۔ اردو زبان میں بچوں کے لئے تعمیری ادب کی کمی کا احساس روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ اور ان تمام خدمت گزاران ملک کے نزدیک یہ ایک ایسی کمی ہے جس کی تلافی کے لئے تیز رفتاری کے ساتھ ساعی کا آغاز ہونا چاہیے۔ میر حسن صاحب نے شستہ اور سلیس کہانیوں کا مجموعہ بچوں کے لئے مرتب کیا ہے جو عنقریب شائع ہوگا۔

تہذیب و تمدن کے اجزائے لطیف۔ صنفِ لطیف کے مسائل پر صنفِ لطیف کے افکار کا مجموعہ۔ میر حسن صاحب نے ملک کی صاحب فکر خواتین کے مضامین ایک مقدمہ کے ساتھ مرتب کئے ہیں۔ ان مضامین میں خواتین کے مسائل پر خواتین نے عام فہم اور سلیس زبان میں روشنی ڈالی ہے۔

تاریخ ادب انگریزی۔ اردو ادب کی ترقی کے لئے یہ ضروری ہے کہ اردو داں مختلف ترقی یافتہ زبانوں کی تاریخ سے واقف ہوں۔ انگریزی ادب نے جو ترقی کی ہے وہ اردو ادب کی ترقی کے لئے مشعلِ راہ بن سکتی ہے۔ اسی تعمیری احساس کے تحت میر حسن صاحب کئی سال سے انگریزی ادب کی تاریخ مرتب کر رہے ہیں۔ توقع ہے کہ یہ قابلِ قدر کتاب جلد شایع ہو جائے گی۔

پروین۔ "پروین" ایک دلچسپ ڈراما ہے جس میں نفسیاتی نقطۂ نظر سے زندگی اور محبت کے ایک نازک مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ محبت کی بے اختیاری جذبۂ ایثار کو پامال نہیں کر سکتی۔ محبت اور ایثار دراصل ایک ہی جذبہ ہے۔ محبت کی انتہائی شکل ایثار کی تعبیر کرتی ہے۔ اس ڈرامے میں اسی کو بے ساختگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

"حق محبوب" اور دوسرے ڈرامے۔ زندگی کی سنجیدگی بعض وقت قہقہوں کا ماحول ڈھونڈتی ہے۔ میر حسن صاحب ایک ڈراما نویس کی حیثیت سے کافی مشہور ہیں۔ اس کتاب میں ان کے مزاحیہ مختصر ڈرامے جمع کئے گئے ہیں۔ ان ڈراموں میں تبسم اور قہقہہ زندگی کے نازک پہلوؤں سے ہم آہنگ نظر آئے گا۔

اللہ نے بچا لیا۔ جدید ادب میں مختصر قصوں کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے۔ میر حسن صاحب مختصر قصے لکھنے میں ہمیشہ کامیاب رہے ہیں۔ "اللہ نے بچا لیا" کتاب کا جس قدر دلکش نام ہے' اسی قدر دلچسپ افسانے اس میں ملیں گے۔

مہتمم "سب رس"

کون کیا ہیں

وقت کی اس ضرورت کو محسوس کرکے کہ ملک کی مشہور اور قابل شخصیتوں کے حالات کا یکجا جمع ہو جانا ازبس ضروری ہے "دکن نیوز" کی مجلس انتظامی نے طے کیا ہے کہ "کون کیا ہیں" کے نام سے ایک نہایت ہی عظیم الشان کتاب ترتیب دیجائے جو زمانہ حاضرہ کی معیاری تاریخ سمجھی جاکر۔

اس کتاب میں ملک کے قابل اہل قلم قومی کارکن، علماء و مشائخین امراء جاگیردار و وکلاء حکماء شعراء اور عہدہ داران سرکاری غرض ہر طبقہ کی ایسی شخصیتوں کے حالات ان کی تصاویر کے ساتھ ہوں گے۔ جن کی زندگیاں قابل تقلید نمونہ بن سکتی اور جو اپنی ایک انفرادی حیثیت رکھتی ہیں۔

جملہ مراسلت مجلس انتظامی "دکن نیوز" بازار ستی عنبر سے کیجائے

روغن گیسو سنگھار رجسٹرڈ (۱۱۱) دولت آصفیہ

کے

متعلق محقق و مستند اطباء و تجربہ کار نامور ڈاکٹروں کا اظہار خیال ملاحظہ فرمایئے

عالیجناب ڈاکٹر نواب ارسطو یار جنگ بہادر

یہ فرماتے ہیں کہ ۔ روغن گیسو سنگھار رجسٹرڈ نمبر (۱۱۱) کے نسخہ کو میں بطور خود دیکھا اور تیل کی آزمایش بھی کیا یہ روغن دماغ کے لئے مفید اور بالوں کی درازی و سیاہی اور پائیداری کے لئے فائدہ مند ہے جسکی میں تصدیق کرتا ہوں ۔

عالیجناب الحاج حکیم محمد محمود خاں صاحب دلبر (ساکن نامپلی)

یہ فرماتے ہیں کہ ۔ روغن گیسو سنگھار میری تجویز سے ہے جو مقوی دماغ اور سر کے بالوں کی درازی و دائمی سیاہی کا ضامن ہونے کے علاوہ خوشگوار عطریت بھی رکھتا ہے جو میرا مجرب ہے اور ہر موسم میں استعمال عورت و مرد کے لئے مفید ہے ۔

عالیجناب ابن منصور حکیم محبوب علی خاں صاحب اول مددگار

نظامیہ شفاخانہ سرکار عالی ۔ یہ فرماتے ہیں یہ تیل نہایت اچھا رنگین و خوشبودار اور فرحت بخش ہے امید ہے کہ استعمال کرنے کے بعد تجربہ بتلادیگا کہ موجد کا انتخاب ضرور قابل ستایش ہے خدا کرے جلد غیر ممالک میں بھی روغن گیسو سنگھار ہر دلعزیز ثابت ہو ۔

علامۂ وقت مولانا حکیم ابو الفدا محمد محمود احمد صاحب مرحوم

سابق معتمد انجمن اطباء دکن و طبی بورڈ و ممتحن طبیہ کالج سرکار عالی کی یہ رائے یادگار رہیگی ۔ روغن گیسو سنگھار جسکو غلام قادر صاحب صدیقی و قاضی غلام محی الدین صاحب نے خاص اہتمام سے تیار کیا ہے اسکے نسخہ کو میں نے دیکھا تمام عمدہ اجزاء ہیں اور ترکیب بھی خاص ہے دماغ کی قوت اور بالوں کے لئے سب اچھی چیزیں ہیں امید کہ اسکی اہل ملک قدر کریں گے اور اس سے ضرور فائدہ اٹھائیں گے ۔

قیمت شیشہ کلاں عہ ـــــ شیشہ خورد ۱۲

تیار کردہ محمد غلام قادر صدیقی و قاضی غلام محی الدین کارخانہ معطر گھر جوہری گلی حیدرآباد دکن سے خرید فرمایئے

(مندرجہ ذیل مقامات سے بھی دستیاب فرما سکتے ہیں)

دوا خانہ الحاج حکیم محمد محمود خاں صاحب نامپلی ۔ انجمن صمدانی سرکار عالی حیدرآباد بوٹ ہوز پتھر گٹی ۔ صدر مخزن کا خانہ روغن گیسو سنگھار معطر گھر جوہری گلی حیدرآباد دکن

نور اللغات

ہماری اردو زبان کی ترقی کے ساتھ ساتھ ایک مفصل اور مستند لغت کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی تھی۔ شکر ہے کہ ملک کے نامور ادیبوں نے اس طرف توجہ کی۔ امیر الشعراء حضرت امیر مینائی کے بعد حضرت سید احمد دہلوی نے فرہنگ آصفیہ کے نام سے کئی جلدوں میں ایک مفصل لغت لکھا اس کے ایک عرصہ کے بعد حضرت نیر کاکوروی نے برسوں کی تلاش و تحقیق کے بعد ایک نہایت ضخیم لغت تیار کیا ہے جو چار حصوں پر مشتمل ہے اس میں اردو زبان کے ایک ایک حرف کے متعلق بہت خوبی اور خوش اسلوبی سے داد تحقیق دی گئی ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ اتنا بڑا کام ایسے اچھے پیمانے پر ایک فرد واحد سے کیسے انجام پا گیا بعض بعض جگہ ایک ایک لفظ کی تشریح و تحقیق میں کئی کئی صفحے بھرے ہوئے ہیں انداز بیان بہت سادہ لیکن عالمانہ اور حکیمانہ بغرض لغت کے سلسلے میں اب تک یہ آخری اور مستند کوشش ہے اور حامیان اردو کی قدر دانی کی مستحق۔

دو رائیں

مرتبہ مولوی نور الحسن صاحب نیر بی اے ال ال بی

بڑی تقطیع (۲۹۷۸) صفحات قیمت مجلد (للعہ)

اردو زبان کی لغات میں نور اللغات اپنے طرز کی تنہا لغت ہے جو بالکل جدید اصول پر مرتب کی گئی ہے اور الفاظ کے ذخیرے کے لحاظ سے بھی غالباً تمام دوسرے لغت سے افضل ہے مرتب نے اسے بیحد محنت جانفشانی کے بعد مکمل کیا ہے اس لغت کی اشاعت سے اردو زبان کی کتابوں میں ایک قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔ امید ہے کہ اہل علم و زبان داں حضرات اس کی قدر کماحقہ کریں گے اور مرتب کی محنت کی داد دیں گے۔

"زمانہ"

نور اللغات ..... جلد اول الف۔ ب صفحات (۷۴۲) قیمت عـہ

" " .. جلد دوم پ سے خ " (۵۱۴) " للعہ

مولوی نور الحسن صاحب نیر بی اے ال ال بی

بڑی تقطیع (۲۹۷۸) صفحات پر مشتمل ہے۔

اردو کے تمام مروجہ الفاظ محاورات ضرب الامثال دخیل کلمات کا پورا استقصا کیا گیا ہے اور شعراء و اساتذہ کے کلام نظم و نثر پر ہر جگہ استناد کیا گیا ہے دیباچہ میں متروک الاستعمال سے بھی دلچسپ بحث کی گئی ہے اور قواعد کے لحاظ سے الفاظ کی فصاحت پر جس قدر اثر پڑتا ہے متعدد مثالوں سے سمجھایا ہے۔

"نگار"

نور اللغات ... جلد سوم د سے ق صفحات (۶۹۲) قیمت عـہ

" " .. جلد چہارم ک سے ی " (۱۰۳۲) " عـہ ۱۴

صدر دفتر:۔ مکتبہ جامعہ قرول باغ، نئی دہلی

شاخیں:۔ (۱) جامع مسجد دہلی (۲) لوہاری دروازہ لاہور (۳) پرنسس بلڈنگ مے جے اسپتال بمبئی

تمام یونانی مرکبات کا مخزن
(یہ یونانی طبی بورڈ قائم شدہ ۱۳۳۸ف)
خصوصیات
یہاں کے ادویہ ملک کے نامور اطباء کی زیرنگرانی تیار ہوتی ہیں۔ اس دواخانہ میں عالیجناب حکیم محمد ہبتہ اللہ صاحب مولوی فاضل و حکیم کامل طبیہ کالج دہلی پروفیسر نظامیہ طبیہ کالج معتمد انجمن اطباء یونانی صبح ۸ تا ۱۰ شام ۵ تا ۷ مطب فرماتے ہیں
جمعہ اور یکشنبہ کو ۴ سے ۶ تک ملک کے مشہور اطباء مریضوں کا معائنہ و علاج کرتے ہیں۔
تفصیلی فہرست ادویات طلب فرما کر مفت حاصل کیجئے
یونانی طبی بورڈ افضل گنج حیدرآباد دکن
قلموں کا خزانہ
ہر قسم کے فونٹن پن کم سے کم زیادہ سے زیادہ قیمتوں میں دکن پن اسٹور شاہراہ عثمانی عابد روڈ سے طلب فرمائیے نیز ہمہ اقسام کے فونٹن پن کی درستگی گیارنٹی کیساتھ کیجاتی ہے
حیدرآباد کا ممتاز مقام
چوراہا افضل گنج روڈ
مجسٹک ریڈیو ہوس
جہاں تجربہ کار ماہرین ریڈیو موجود ہیں۔ ریڈیو سٹ اور لا برقی ریڈیو کی خریداری اور ہمہ اقسام کے ریڈیو کی مرمت کیلئے ہماری خدمات حاصل فرمائیے
ہر گھر میں آج کل یہی چرچا ہے
کیونکہ خوش رنگ خوشبودار ذائقہ میں بیمثال ہونیکے علاوہ فرحت بخش ہے
آپ بھی ایکبار آزمائش فرمائیے
رجسٹرڈ آصفیہ
گولکنڈہ اسپیشل مکسچر چائے
حمید اینڈ کمپنی
ایجنٹ شاہ علی بنڈہ حیدرآباد دکن
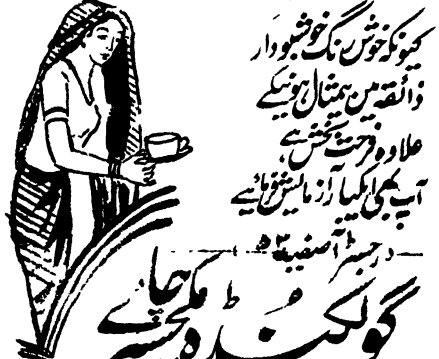
آپکی قوتِ ارادی کا بہترین حل

روغن آملہ (براق مارک)

تقویتِ دماغ درازئ گیسو۔ بالوں کو سیاہ، نرم و چمکدار بنانا۔
گرتے ہوئے بالوں کو ازسرنو پیدا کرنا۔ یہ اسکی بہترین خصوصیات ہیں۔ ہمیشہ استعمال فرمائیے

قیمت شیشہ کلاں ۱۴/ ہر گھر میں اس کی ضرورت ہے شیشہ خورد ۱۲/

تیار کردہ روح تازہ کمپنی چمن گولیگوڑہ شاخ مچھلی کمان حیدرآباد دکن

آجکل

امراء۔ روساء۔ حکام۔ پروفیسر۔ بیرسٹر۔ وکلاء۔ طلباء اور دیگر دماغی کام کرنے والے حضرات و سیٹھ۔ ساہوکار اور معزز بیگمات سکندرآباد کو فرحت و سکون اور اصلاح عوارض دماغی کیلئے نہایت مرغوبیت سے استعمال فرما رہے ہیں۔ یہ نہ صرف تیل کی جملہ خصوصیات کا حامل ہے بلکہ ایک مستند خوشبودار دوائی بھی ہے۔ اپنی پسند کے تیل کا استعمال ترک نہ کیجئے بلکہ اسکے صرف دس قطرے اسمیں شامل کر لیجئے حکمت کی ایک نئی دریافت کا کرشمہ ملاحظہ فرمائیے۔ یہ ایک خاص چیز ہے رجسٹر سرکار آصفیہ (۲۷۸) قیمت فی بکس ۸

ملنے کے مقامات شاپ سید عبدالرزاق گلزار حوض۔ شاپ میر حسن عابد روڈ۔ جے ۱ اے کریم سکندرآباد۔
شفاخانہ ڈاکٹر بنجارہ عقب دیوڑھی اقبال الدولہ و چھتہ بازار (حیدرآباد دکن)

SPECIAL OFFER
خصوصی پیشکش
۱۵ فیصد رعایت
پوری جیول سے مرصع لیور۔ اعلیٰ درجہ کے نمونے نہایت مضبوط
خوش نمایاں سوئیاں و ہندسے تین سال کی گیارنٹی، گولڈ۔
رولڈ گولڈ۔ اور کرومیم۔ میں مل سکتی ہیں۔
جلال اینڈ سنس
گورنمنٹ وریلوے سپلایرس ماہرین مرمت
عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن (صدر دفتر مدراس)